

# شیر

اقبال خانو





قارئین کرام!

”شیشہ گر“ میرا پہلا ناول ہے جو ماہنامہ ”دوشیزہ“ کراچی میں مسلسل بیس ماہ تک شائع ہوا۔ یہ ناول میں نے ”دوشیزہ“ کی ایڈیٹر عنافاروقی کے پُر زور اصرار پر لکھا۔ میں ابھی ناول لکھنا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ اس وقت تک صرف میرے پانچ چھ افسانے شائع ہوئے تھے اور ناول کا تو سان و گمان بھی نہ تھا کہ اتنی جلد لکھوں گی۔ میری فیلڈ افسانہ تھی مگر رونا کے کہنے اور عظمت عزمی (مرحومہ) کے ہمت دلانے پر میں نے یہ ناول لکھا۔ اسے آپ میرا ”سویٹ سکسٹین“ (Sweet sixteen) کا ناول بھی کہہ سکتے ہیں۔

”دوشیزہ“ میں یہ مسلسل بیس ماہ شائع ہوا اور قارئین نے بے حد پسند کیا۔ پرچے میں قارئین کے جو پسندیدگی کے خطوط شائع ہوئے انہوں نے مجھے ایک نیا حوصلہ عطا کیا۔ میں ان قارئین کی ممنون ہوں۔

”دوشیزہ“ سنجیدہ قارئین کا پرچہ ہے اور قارئین ڈنکے کی چوٹ پر تنقید کرتے ہیں۔ اس کے ایک کردار چودھری شوکت علی کے بارے میں محترم مشفق خواجہ نے تبصرہ کرتے ہوئے محترم سہام مرزا سے کہا تھا۔

”یہ اردو ادب کا پہلا کردار ہے جو دلن ہوتے ہوئے بھی ہیرو ہے۔ اس کردار کی برائیوں پر بھی پیارا آتا ہے اور مظالم پڑھ کر بھی اس سے نفرت محسوس نہیں ہوتی۔“  
میرے لئے مشفق خواجہ صاحب کے یہ جملے کسی اعزاز سے کم نہیں۔

اب کتابی شکل میں اس خوب صورت ناول کو ”القریش پبلی کیشنز“ کے جناب محمد علی قریشی صاحب شائع کر رہے ہیں۔ میں محمد علی قریشی صاحب کی انتہائی ممنون ہوں کہ قارئین کی نذر وہ یہ ناول کر رہے ہیں۔ آپ لوگ یہ ناول پڑھیے اور اپنی رائے سے ضرور نواز دیے گا۔ قارئین کی رائے رائٹر کے لئے بہت اہم ہوتی ہے۔ میں آپ کی رائے کی منتظر رہوں گی۔ شکریہ۔

اقبال بانو



شام پوری طرح درختوں پر جھک آئی تھی۔ نیلے آکاش پر ڈوبتے سورج کی سرخی نہایت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ آسمان نے کسی کے ارمانوں کا سارا ہوا اپنے اوپر پھیلا لیا ہو۔ تمام پنکھ پکھیر و ٹولیوں کی صورت میں قطار در قطار اپنے آشیانوں کی طرف جا رہے تھے۔ فضا میں پرندوں کی آوازوں کا شور مچا تھا۔ دُور آٹا پیسنے کی چکی کی ٹک..... ٹک..... ٹک..... اس سے نہایت بھلی لگ رہی تھی۔ پھر ایک آواز نے اس سناٹے کو چیر کر رکھ دیا۔ چکی کی ٹک..... ٹک..... ٹک بھی اسی شور میں دب کر رہ گئی۔

یہ آواز ایک جیپ کی تھی، جو کچی سڑک پر اونچے نیچے راستوں پر تیزی سے دوڑی چلی جا رہی تھی اور اپنے پیچھے مسلسل گرد کا ایک ایسا طوفان چھوڑ رہی تھی کہ ہر شے گرد میں اٹ کر رہ گئی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیپ میں بیٹھے ہوئے افراد جلد از جلد احمد پور پہنچنا چاہتے تھے۔ یہ کچی سڑک احمد پور کے چھوٹے سے اسکول پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔

ہارن کی مسلسل آواز سے کچی سڑک پر احمد پور کی طرف جانے والی بھینسیں بدک کر کھیتوں میں گھس گئی تھیں اور ان کا نگران کیکر کے تنے سے ٹکا ہٹکا بٹکا کھڑا تھا۔ وہ ایک دس سالہ بچہ ہی تو تھا۔ جیپ اُس کے بالکل قریب سے زوں کرتی نکلتی چلی گئی تھی۔ اگر وہ تیزی سے ہٹ نہ جاتا تو یقیناً جیپ کے نیچے آ جاتا۔ وہ دُور تک اڑتی دھول کو ایک ٹک دیکھتا رہا اور پھر بھینسوں کی تلاش میں آگے بڑھ گیا۔

سڑک کے ایک جانب چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی اور اس کے پار لہلہاتے سرسبز و شاداب کھیت دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔

وہ ڈیڑھ گھنٹے سے مسلسل سفر میں تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر احمد پور پہنچ جائیں۔ جیپ تو وہ اتنی تیز چلا رہے تھے کہ اگر وہ ایسی تیزی کا مظاہرہ بڑے شہر کی سڑکوں پر کرتے تو اب تک اگلے جہان پہنچ گئے ہوتے۔ حالانکہ ابھی صرف ساڑھے پانچ بجے تھے، پھر بھی دن مکمل چھینے والا تھا کیونکہ سردیوں کے دن تھے۔ انہوں نے اوور کوٹ، جرسی پہنی ہوئی تھی، کانوں کے گرد اچھی طرح مفطر لپیٹا ہوا تھا، اس کے باوجود بھی ہوا تیز نشتر کی طرح



جسم کے پار ہوئی جا رہی تھی۔ اُن کی نظریں مسلسل سامنے جی ہوئی تھیں۔ اور پھر جب ان کی نظریں احمد پور کے چھوٹے چھوٹے مکانوں پر پڑیں تو وہ بے اختیار مسکرا دیئے۔ دل محبت سے لبریز جذبوں سے شدت سے دھڑکنے لگا اور انہیں ایک گونا گونا اطمینان کا احساس ہوا۔

”شکر ہے، دیر نہیں ہوئی۔“ وہ دھیرے سے بڑبڑائے۔

وہ چار بجے گھر سے چلے تھے اور اب ایک سوسات میل کا سفر طے کر کے یہاں پہنچے تھے اور ڈیڑھ گھنٹے میں اتنا طویل سفر کوئی معمولی بات نہ تھی۔ صرف ملتان شہر سے گزرتے ہوئے انہیں جیب آہستہ چلائی پڑتی تھی۔

جیب ایک جھٹکے سے اپنی مخصوص جگہ احمد پور کے چھوٹے سے پرائمری اسکول کے نزدیک برگد کے درخت کے نیچے رک گئی۔ انہوں نے انجن بند کیا اور فرنٹ سیٹ پر رکھا ہوا تھیلا اٹھا کر جیب سے اتر آئے۔ اندھیرا پھیلنے ہی والا تھا۔ وہ تیزی سے گاؤں میں داخل ہو گئے۔ تنگ و تاریک گلیوں سے گزرتے، گندی نالیوں کو پھلانگتے ہوئے وہ آگے بڑھے جا رہے تھے۔ وہ یہاں پہلی مرتبہ نہیں آئے تھے، بلکہ آتے ہی رہتے تھے۔ ہر منگل کو وہ ان راستوں پر محو سفر ہوتے کیونکہ وہ ان کے انتظار کی قدیلیں آنکھوں میں روشن کئے، گاؤں کے پچھواڑے باغ میں بیٹھی ہوئی ہوتی تھی۔ ان کی نظریں باغ کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ تب ہی ایک موٹر پر وہ بری طرح کسی سے ٹکرا گئے۔ یہ ایک بڑی بی تھی، جس کی لاشی گر گئی تھی اور وہ دیوار کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئی تھی۔

”وے اتا ایس؟ (اندھے ہو)“ وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔

”معاف کرنا، اماں!“ انہوں نے اس کی لاشی اٹھا کر دی۔

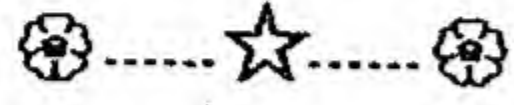
”وے شرم نہیں آندی..... اونٹ کی طرح منہ اٹھائے ٹر پڑتے ہو۔ پٹ پیریں۔“

وہ اپنے پوپلے منہ سے گالیاں بکنے لگی۔

”اماں! معافی تو مانگ لی ہے۔ کیا کروں، اس وقت اپنے آپ میں نہیں ہوں۔“

انہوں نے کہا اور پھر جلدی سے بغل میں دبائے ہوئے تھیلے میں سے دو سیب اور کیلے نکال کر بڑی بی کے جھریوں بھرے ہاتھوں میں تھا کر تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ بڑی بی گم صمسی رہ گئی اور اس نے ادھر ادھر چور نظروں سے دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا، پھر سیب اور کیلے کو دوپٹے کے پلو میں باندھ کر بغل میں دبایا اور لاشی ٹیکتی ہوئی آگے چل دی۔ وہ سوچ رہی تھی، ایک ٹکر میں یہ سودا بڑا نہیں ہے۔ کتنے سالوں بعد وہ یہ پھل کھائے گی۔ اُسے یاد تھا کہ جب اُس کی شادی ہوئی تھی تو رمضو، شادی کے تیسرے روز سیب لایا تھا اور پھر اس کے بعد آج تک اس نے سیب نہیں کھائے تھے۔ بھلا زمینداروں کی غلامی اور غربت میں، جہاں دو وقت کی روٹی اور تن کا کپڑا بھی مشکل سے نصیب ہوتا ہو، وہاں بھلا پھلوں کا کیا کام؟ زمین

سے سونا اگانے والے، پیٹ بھر کر کھا بھی نہیں سکتے۔ ہزاروں ٹن کپاس پیدا کرنے والوں کو ڈھنگ کے کپڑے نصیب نہیں ہوتے۔ کئی کئی پوند لگے ہوئے ہوتے ہیں، مگر جی بھر کر محنت کرتے ہیں، اس اُمید پر کہ کبھی ہماری قسمت بھی تو بدلے گی۔ خدا تو سب دیکھ رہا ہے۔ وہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔ ہم اگر سیکھی نہیں تو کیا ہے، شاید ہماری آئندہ نسلیں سیکھی ہوں۔ تب ہم اپنے تمام غم، تمام دکھ بھول جائیں گے۔ وہ اسی آس پر مزید محنت کئے جا رہے ہیں اور نہ جانے کب تک کرتے رہیں گے؟



گاؤں کے پچھواڑے آکر انہوں نے ایک طویل سانس لی۔ سامنے ہی وہ باغ تھا، جہاں انہیں جانا تھا۔ باغ کے چاروں طرف مٹی اور گارے کی چھوٹی چھوٹی دیوار تھی۔ شاید یہ حد بندی کی نشانی تھی، یا پھر یہ کہ کوئی اندر نہ جاسکے۔

گیٹ عبور کر کے وہ اندر چلے گئے اور ایک طرف سے ہوتے ہوئے اپنی مخصوص جگہ پر پہنچ گئے۔ پھر ان کی آنکھوں میں ایک مخصوص چمک نمودار آئی، جیسے کسی نے ڈھیر سارے جگنو آنکھوں میں بھر دیئے ہوں۔ وہ سامنے جامن کے درخت سے ٹیک لگائے، آنکھیں موندے بیٹھی تھی، یوں لگتا تھا، جیسے انتظار سے تھک کر اس نے آنکھیں موند لی ہیں۔

وہ دبے قدموں آگے بڑھے، لیکن اس کی پوزیشن میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ یونہی بیٹھی رہی۔ پھر وہ ایک دم چونک سے گئے۔ دل میں درد کی ایسی لہر اٹھی، جو کہ پورے وجود پر مسلط ہو گئی۔ انہوں نے دل میں اٹھتی درد کی لہروں کو دباتے ہوئے خود کو سنبھالا۔ اب وہ ایک ٹک اُسے تکے جا رہے تھے۔ کتنی کمزور ہو گئی تھی وہ۔ گالوں کے گلاب مرجھا گئے تھے اور ان مرجھائے ہوئے گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں نمایاں تھیں۔ وہ سوچ رہے تھے کہ صرف ایک ماہ، ہاں صرف ایک ماہ میں نہیں آیا تو اس کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ یہ ادھر بے چین اور مضطرب و بے قرار تھی، ابھی مجھے وہاں چین نہ آتا تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے کوئی میرا دل مٹھی میں لے کر مسل رہا ہو۔

اُن کا دل درد سے بھر گیا اور آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ وہ جب بھی اس سے ملنے آتے، یونہی ہوتا تھا۔ شاید اس نے اپنے چہرے پر ان کی نگاہوں کی تپش محسوس کر لی تھی یا پھر دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ اُس نے ایک دم پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ انہیں سامنے کھڑا دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے چمک لہرائی، پھر معدوم ہو گئی۔ اُس کے چہرے پر خفگی کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو اُس کے پاؤں کی پازیب جھنجھا اٹھی۔ ننھے ننھے، بے شمار گھنگھرو بول پڑے۔ اس نے ان کی طرف سے رخ موڑ لیا۔ یہ بھی ناراضگی کا اظہار تھا۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیئے اور آگے بڑھ کر اس کے



کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ مگر اس نے ان کے ہاتھ جھٹک دیئے۔  
 ”اب کیوں آئے؟ بس چلے جائیں آپ۔“  
 ”بری بات..... میں نے سمجھایا تھا نا، کہ کسی سے ملتے ہیں تو پہلے سلام کرتے ہیں۔“  
 وہ اس کے سامنے آگئے۔

”السلام علیکم!“ وہ بولی۔ اُس کا منہ اب بھی پھولا ہوا تھا۔  
 ”وعلیکم السلام!“ وہ ہنس دیئے۔ تب اس نے آنکھیں پٹ پٹا کر انہیں دیکھا، مگر بولی  
 کچھ نہیں۔ لیکن یہ چغل خور آنکھیں تو ہر راز اُگل دیتی ہیں، دل کی ہر بات بتا دیتی ہیں۔ اور  
 انہوں نے بھی اس کے دل کی تحریر اس کی آنکھوں میں پڑھ لی، جو وہ زبان سے نہ کہہ سکتی  
 تھی، مگر اس کی آنکھیں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں۔ کتنے ہی سوال اس کی سیاہ چمک دار، جھیل  
 جیسی آنکھوں میں تیر رہے تھے۔

”آپ اتنے دن کہاں رہے؟..... میرا خیال بھی نہ آیا؟ اب کیوں آئے ہیں؟ اب  
 بھی نہ آتے اور میں ہر منگل کی طرح آج بھی انتظار کر کے چلی جاتی۔ آخر پچھلے تین منگل  
 بھی تو میں نے انتظار کی صلیب پر لٹک کر گزار دیئے ہیں؟“  
 وہ شرمندہ سے ہو گئے اور انہوں نے بے اختیار ہانپیں پھیلا دیں۔ اُسے منانے کا اور  
 اپنے دل کی تڑپ کرنے کا ایک ہی طریقہ تو تھا اُن کے پاس۔  
 ”مومو.....!“ ان کے لب کپکپائے اور بازو پھیلے ہی رہے۔ مگر وہ ہمیشہ کی طرح اُن  
 کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں دوڑ کر نہیں سمائی، ان کے سینے سے لگ کر اور چھوٹے چھوٹے  
 مکے مار کر ناراضگی کا اظہار نہیں کیا۔ بس خالی خالی، اداس اداس سی نظروں سے انہیں تکتی  
 رہی، پھر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ تب وہ ایک قدم آگے بڑھے۔

”میرے پاس آؤ، جان! مجھے پتہ تھا کہ تم انتظار کر رہی ہو گی۔ مگر میں بیمار ہو گیا تھا،  
 میری زندگی! میں تم سے ملے بغیر بھلا رہ سکتا تھا بیٹا؟“ وہ بڑی شکستہ سی آواز میں بول رہے  
 تھے۔

”آپ جب بھی نہیں آتے تو بیماری کا بہانہ کر دیتے ہیں۔“ اس نے آنکھوں میں آئے  
 آنسوؤں کو تھیلی سے پونچھا۔

”بیٹا! میں بہانہ نہیں کر رہا ہوں، سچ کہہ رہا ہوں۔ تمہیں کیا خبر کہ ہر منگل کا میں کتنی  
 شدت سے منتظر رہتا ہوں۔ اور اب بھی بیماری کے دوران منگل کے دن میری حالت بُری ہو  
 گئی تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ میری سوہنی سے دھی میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ جو تڑپ میں محسوس  
 کرتا تھا، وہ تمہیں کیسے بتاؤں؟“ انہوں نے خاموش ہو کر اُس آٹھ سالہ بچی کو دیکھا، جواب  
 بھی ٹکڑ ٹکڑ انہی کو دیکھے جا رہی تھی۔

”اپنے بابا کو معاف نہیں کرو گی، بیٹا؟..... دیکھو، میں کتنی دُور سے آیا ہوں چاند۔  
 صرف تم سے ملنے، تمہیں پیار کرنے۔ کیا اپنے بابا کو پیار کرنے کو تمہارا جی نہیں چاہتا؟“  
 انہوں نے بڑی آس سے پوچھا۔

”بابا!“ وہ اُن سے لپٹ گئی۔ اُسے خود پر اختیار نہ رہا تھا۔ اس نے خود پر کتنا جبر کیا تھا،  
 باپ کو سامنے دیکھ کر دل کتنا مچل اُٹھا تھا۔ جی چاہا تھا کہ دوڑ کر اس سے لپٹ جائے اور اپنی  
 تمام کسک مٹا ڈالے۔ وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ اس کی زبان پر ایک ہی جملہ تھا۔  
 ”آپ اتنے دن کیوں نہیں آئے؟“

”پُتر! بتایا تو ہے کہ میں بیمار تھا۔“ وہ اسے بے تحاشا چوم رہے تھے۔ اور وہ تھی کہ روئے  
 جا رہی تھی۔

”میں بیمار ہوتی ہوں، تب بھی آتی ہوں۔ آپ کیوں نہیں آ سکتے؟“ وہ ہار ماننے والی  
 نہیں تھی۔

”بیٹا! یہ بھی دیکھو، کتنی دُور سے آتا ہوں۔“  
 ”پھر مجھے ساتھ لے چلو، بابا!..... میرا دل یہاں نہیں لگتا۔ لے چلو گے نا؟“  
 ”بیٹا! تم نے خود ہی تو میرے ساتھ چلنے سے انکار کیا تھا۔ اب میں کیسے تمہیں لے  
 جاؤں؟“ انہوں نے نہایت آہستگی سے کہا۔

”بابا! اب میں خود کہہ رہی ہوں، مجھے لے چلو۔ چاچا اور اماں مجھے بہت مارتے ہیں۔“  
 ”کیسے لے چلوں؟“ وہ ایک آہ بھر کر بولے۔

”بابا! وہ مارتے ہیں اور میں بہت روتی ہوں۔ اگر میں رو کر مر گئی تو.....؟“ وہ  
 ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔

”نہ پُتر! ایسی بات نہیں کرتے۔ تُو تو میری زندگی ہے۔ تُو نہ ہو گی تو میں کیسے زندہ  
 رہوں گا؟ تُو تو میری روح ہے، میرا دل ہے۔ اور اگر دل نہ ہو تو انسان زندہ نہیں رہتا۔ پھر  
 بتا، میں کیسے روح کے بغیر زندہ رہوں گا؟ ان آنکھوں کی روشنی تیری ہی وجہ سے تو قائم ہے۔  
 اگر تُو ہی نہ رہی تو میرے لئے یہ دنیا اندھیر ہو جائے گی۔ میں تو اندھا ہو جاؤں گا۔ بیٹا!  
 مرنے کے متعلق مت سوچا کر، ابھی تو تُو بہت چھوٹی ہے۔“ انہوں نے اُس کے مرجھائے  
 ہوئے گال چوم لئے۔ وہ تو جیسے بے خود ہوئے جا رہے تھے۔ کبھی اس کے ننھے ننھے ہاتھ  
 چومتے، کبھی پیشانی پر بوسوں کی بھرمار کر دیتے۔ پھر وہ نیچے بیٹھ گئے اور اُسے گود میں بٹھالیا۔  
 ”بیٹا! دیکھو، میں تمہارے لئے سیب لایا ہوں۔“ انہوں نے تھیلے سے سرخ سیب نکالا  
 اور جیب سے ننھا سا چاقو نکال کر اسے چھیلنے لگے۔ وہ ہمیشہ اس کے لئے ڈھیروں پھل لایا  
 کرتے تھے اور اپنے ہاتھ سے کھلاتے تھے۔



”بابا! ہمارا باغ اس سے بھی خوب صورت ہے؟“ مریم نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں پتر! ہمارے سب باغ بہت خوب صورت ہیں۔ کبھی تم دیکھنا چاند! ایک وقت ایسا آئے گا، جب وہ سب کچھ تم دیکھ سکو گی۔“ وہ سیب کاٹ کر اس کی ایک قاش مریم کے منہ میں ڈالتے ہوئے بولے۔

”بابا! آپ منہ کھولیں۔“ اُس نے دھیرے سے کہا تو انہوں نے ہنستے ہوئے منہ کھول دیا اور اس نے سیب کی ایک پھانک ان کے منہ میں ڈالی اور بے اختیار ہنس دی اور انہیں یوں لگا، جیسے نقرئی گھنٹیاں بج اُٹھی ہوں، یا پھر ننھے ننھے چاندی کے گھنگھر و بج اُٹھے ہوں۔

”میری سوہنی دھی!“ انہوں نے اسے اپنی بانہوں میں بھیج کر اس کے سنہرے گھنگھریالے بال چوم لئے۔ ”جان! تم اسکول میں پڑھو گی؟“ ایک دم انہوں نے پوچھا۔

”ہاں بابا! میں پڑھوں گی۔ میں نے اماں سے کہا تو وہ خاموش رہیں، مگر چاچا.....“ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا، جیسے کوئی غلط بات منہ سے نکلنے والی ہو۔

”پتر! بتا، کیا کہا چاچا نے.....؟“

”وہ..... وہ، بابا.....!“ مریم بتاتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

”مومو! تو بتا، مجھ میں سب سننے کا حوصلہ ہے۔“ انہوں نے اس کے بالوں میں اُنکلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

”بابا! وہ کہہ رہے تھے کہ کون سی تیرے باپ کی کمائی ہے، جو کہ تیری پڑھائی پر خرچ کروں؟ شکر کر کہ تجھے روٹی بھی دے دیتا ہوں۔“ مومو نے من و عن سب کچھ بتا دیا۔ ”وہ کہہ رہا تھا کہ تیرا باپ ذلیل ہے، جس نے تجھے میرے پاس چھوڑ رکھا ہے..... پھر اماں نے اُسے چپ کرادیا۔“

”ذلیل، کمینہ، بے غیرت۔“ ان کے ہونٹ کپکپائے اور مٹھیاں بھیج گئیں۔ ”اس کی یہ مجال کہ وہ چودھری شوکت علی آف حسن پور کو ذلیل بتائے؟..... میں ٹوٹے کر دوں گا اُس کے۔“ مارے غصے کے ان کا جسم کانپنے لگا اور غصے کی شدت سے چہرہ سرخ ہو گیا۔

”بابا! آپ اسے کچھ نہ کہیں، ورنہ.....“

”ورنہ کیا؟“ چودھری شوکت علی نے مومو کے سر پر ٹھوڑی ٹکا کر کہا۔

”وہ..... مجھے مارے گا، بابا!..... اماں کو مارے گا۔“ مومو ہاتھی لہجے میں بولی۔

”اچھا چھوڑو، گولی مارو۔ لو، یہ کیلے کھاؤ۔“

مومو بہت سمجھ دار لڑکی تھی۔ ابھی وہ صرف آٹھ برس کی تھی، مگر اپنی عمر سے زیادہ ہوشیار۔ وقت نے اسے اتنی چھوٹی عمر میں ہی دنیا شناس بنا دیا تھا اسے سب کچھ سکھا دیا تھا۔

ابھی تو اسے زندگی میں کتنے ہی نشیب و فراز دیکھنے تھے۔ وہ گھر میں ہونے والی تمام تلخیوں کو گھونٹ گھونٹ حلق میں اتارتی رہتی اور جب ہر منگل کو اس کا بابا اسی باغ میں اس سے ملنے آتا تو وہ اس کے سینے سے لگ کر، پلکیں موند کر سب کچھ بھول جاتی۔ وہ گزشتہ آٹھ ماہ سے اپنے باپ سے اسی طرح چھپ چھپ کر ملتی تھی۔ اس کی ماں یہی سمجھتی کہ وہ چودھری دلاور کے ہاں کام کر رہی ہو گی۔ ہر روز تو وہ کام کرتی تھی، مگر صرف منگل کے روز وہاں سے غائب ہو جاتی تھی اور پھر اُس کی پناہ گاہ یہ چھوٹا سا باغ ہوتا، جہاں وہ اپنے بابا کی منتظر رہتی۔ پتا بھی کھڑکتا تو اُس کا ننھا سادل سینے میں بے طرح دھڑک اُٹھتا۔ اس نے تو خود کو ہوش سنبھالتے ہی انتظار کرتے پایا تھا۔ اپنے باپ کا انتظار۔

اُس کی محبتوں کا انتظار

اُس کی چاہتوں کا انتظار

بانہوں میں سمانے کا انتظار

اور اُس کے سینے سے لگ جانے کا انتظار..... وہ پورا ہفتہ اسی انتظار کی سولی پر لٹ کر گزارتی اور جوں جوں چودھری شوکت علی کے آنے کا وقت قریب ہوتا، وہ بے چین ہو جاتی۔ اور جب وہ آجاتے تو ”بابا“ کہہ کر، دوڑ کر اُن سے لپٹ جاتی اور وہ خود بھی تو بہت بے چین ہوتے اور اُسے بھیج بھیج لیتے۔ شروع شروع میں وہ اپنے گاؤں سے باہر چودھری شوکت علی کا انتظار کرتی تھی اور روز شام کو وہ اسکول کے پاس برگد کے درخت کے نیچے آ جاتی تھی۔ آخر ایک روز چودھری شوکت علی نے منگل کا دن مخصوص کر لیا۔ کیونکہ اب وہ روز روز اس سے ملنے نہیں آ سکتے تھے۔ پھر وہ منگل کا انتظار کرنے لگی۔ چودھری شوکت علی کی گاڑی وہ دُور سے آتے دیکھتی اور پھر دوڑ کر باغ میں آ جاتی، جہاں دونوں باپ بیٹی گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔

”اب میں چلوں..... تم بھی گھر جاؤ، گھر میں تمہاری ماں تمہارا انتظار کر رہی ہو گی۔“ چودھری شوکت علی نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”وہ انتظار نہیں کرتی۔ اُس کا خیال ہو گا، میں چودھری دلاور کے گھر.....“ مومو ایک دم خاموش ہو گئی۔

”تم وہاں کیا کرنے جاتی ہو؟“ انہوں نے چونک کر پوچھا۔

”وہ..... وہ بابا! اُس کی بیٹی ہے نا، وہ میری سہیلی ہے۔ اُس کے ساتھ کھیلتی رہتی ہوں نا۔“ مومو گھبرا کر بولی۔ الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر اُس کے لبوں سے ادا ہو رہے تھے۔

”مومو پتر!..... میں نے کہا ہے نا، کہ تم جھوٹ کبھی نہ بولا کرو۔ اس لئے کہ تمہاری آنکھیں تمہارے جھوٹ کا ساتھ نہیں دیتیں۔ مجھے پتہ ہے کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔ میں سچ



کہہ رہا ہوں نا؟“ شوکت علی نے اس کی ٹھوڑی انگلی سے پکڑ کر ہلائی۔ تب وہ دھیرے سے، نہایت معصومیت سے بولی۔

”ہاں بابا! آپ سچ کہہ رہے ہیں۔“ مومو نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ چودھری شوکت علی بے اختیار ہنس دیئے۔ مگر اسی ہنسی کے ساتھ ان کا دل لہو لہو ہو گیا تھا۔ مومو..... چودھری شوکت علی کی اکلوتی بیٹی اور چودھری دلاور کے گھر کام کرے۔ وہ راجا کی مالی حیثیت سے واقف تھے اور انہیں یہ بھی پتہ تھا کہ مومو کی ماں کبھی گاؤں میں دانے صاف کرنے جاتی ہے، کبھی سوت کاٹی ہے اور اس طرح ان کا خرچ پورا ہوتا ہے۔ راجا، چودھری دلاور کی زمینوں پر کاشت کرتا تھا۔ مومو نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ چودھری کے گھر کام کرتی ہے، مگر اُس کے جھککنے کا انداز چغلی کھا رہا تھا۔ چودھری شوکت علی بچہ نہیں تھے کہ ان کی چھوٹی سی بچی انہیں باتوں سے بہلا دیتی۔

چودھری شوکت علی کی، چودھری دلاور سے چوگنی حیثیت تھی۔ وہ چودھری دلاور جیسے زمینداروں کو کھڑے کھڑے خرید سکتے تھے۔ دلاور جیسے زمیندار تو انہیں سلام کرتے تھے اور یہ قسمت نے کیا دکھایا تھا کہ اُن کی بیٹی چودھری دلاور کے ہاں کام کرتی تھی۔ انہوں نے اپنا چکرا تا سر تھام لیا، ذہن میں بگولے سے اُٹھ رہے تھے، جی چاہ رہا تھا کہ ابھی مومو کے سامنے چودھری دلاور کی بلند و بالا عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں اور اس کی بیٹی کو اُٹھا کر اپنی حویلی میں لے جائیں اور جتنا عرصہ مومو نے چودھری دلاور کی حویلی میں کام کیا ہے، اتنا ہی عرصہ وہ دلاور کی بیٹی کو اپنے ہاں رکھیں۔ مگر ضمیر نے سرزنش کی۔ ”شوکت! تم نے تو عہد کیا تھا کہ آئندہ کبھی غلط قدم نہیں اُٹھاؤ گے اور تم نے غلط کام کر کے ہمیشہ ٹھوکر کھائی ہے۔“ انہوں نے ذہن کو جھٹکا دیا۔ ”اُف! کہاں وہ عہد..... اور یہاں میری بیٹی، مومو۔“

مگر چودھری دلاور کو یہ تو پتہ نہیں کہ وہ تمہاری بیٹی ہے۔“ نہ جانے کہاں سے ایک آواز آئی۔ شاید یہ دل کی آواز تھی اور وہ اپنے دل کی آواز پر سر جھکانے پر مجبور ہو گئے۔ یہ حقیقت بھی تھی کہ وہ جب بھی احمد پور آتے، چھپتے چھپاتے آتے۔ برگد کے درخت کے نیچے جیپ کھڑی کرنے کے بعد وہ منہ پر مفلر لپیٹے اس قدر تیزی سے گلیوں میں گھستے کہ کوئی اُن کا چہرہ نہ دیکھ سکتا۔ پھر آنکھوں پر سیاہ شیشوں کی عینک بھی ہوتی تھی۔ آج تک کوئی بھی انہیں پہچان نہ پایا تھا اور نہ یہاں کے لوگ ان سے واقف تھے، سوائے مومو کی ماں اور راجا کے۔ ان سے بھی ٹکراؤ ہوا ہی نہ تھا کہ انہیں علم ہوتا کہ وہ احمد پور آتے ہیں۔ اور ویسے بھی اب ان کا آپس میں کیا رشتہ رہ گیا تھا اور وہ بھی اتنی دُور سے، یہ ناممکن تھا۔ شوکت علی ہر ہفتے احمد پور آتے تھے، بلکہ گزشتہ آٹھ ماہ سے آرہے تھے کیونکہ یہاں پر اُن کے جگر کا ٹکڑا، مومو تھی۔ اُن کی بیٹی اور وہ بھی اکلوتی بیٹی، جس کی خاطر وہ میلوں کا سفر طے کر کے آتے تھے اور کسی کو خبر

نہیں تھی کہ غریب مزارعے، راجا کی سوتیلی بیٹی مومو بہت بڑے زمیندار کی اکلوتی بیٹی ہے۔ ”بابا!“ مومو کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

”جی پتر!“ چودھری شوکت جلدی سے بولے۔

”بابا! اب کب آئیں گے آپ؟“ اس نے باپ کی طرف دیکھا۔ اس کی سیاہ بھونرا سی آنکھوں میں نمی تھی اور ڈھیروں سوال چل رہے تھے۔

”جب کہو، جان!“ انہوں نے نہایت محبت سے کہا۔

”بابا! کیا آپ میری ایک بات مانیں گے؟“ اس نے معصومیت سے آنکھیں

پٹنائیں۔

”ہاں، ہاں۔“ وہ ہنس دیئے۔

”کل آجائیں گے؟“ مومو نہایت آہستگی سے بولی۔

”ضرور پتر! کل آجاؤں گا۔ لیکن کیا کوئی خاص بات ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے سر کونٹی میں جنبش دی۔ ”اچھا، چھوڑو بابا! آج ہی کے دن آ جانا۔“

وہ بے پروائی سے بولی۔

”یہ اچانک فیصلہ کیوں بدل دیا؟“ چودھری شوکت علی نے اُس کے بالوں میں انگلیاں

پھیرتے ہوئے کہا۔

”کل زبیدہ کا بھائی آرہا ہے نا۔“ مومو نے دھیرے سے کہا۔

”کون زبیدہ؟“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”چودھری دلاور کی بیٹی۔“

”مومو.....؟“ چودھری شوکت علی نے حیرت سے پوچھا۔

”جی بابا!“

”تو چودھری دلاور کے گھر نہ جایا کر۔“ انہوں نے بات اٹک اٹک کر کہی۔

”اگر نہ جاؤں تو اماں مارے گی۔“

”نہیں مارے گی۔ چودھری دلاور جیسے زمیندار تو تیرے باپ کی جیب میں ہر وقت

پڑے رہتے ہیں۔“

”دکھاؤ بابا!“ مومو نے نہایت معصومیت سے کہا تو چودھری شوکت علی ہنس دیئے۔

”دکھاؤ نا، بابا!“ وہ مچل اُٹھی۔

”بیٹا! اگر دکھانے کی چیز ہوتی تو ضرور دکھاتا۔ بس، تُو وہاں نہیں جائے گی۔“ انہوں

نے کہا۔

”اگر نہیں جاؤں گی تو زبیدہ ناراض ہو جائے گی۔ آخر اُس کا بھائی شہر سے آرہا ہے نا،



بابا؟

”اچھا، ضرور جانا۔ مگر وہاں کسی کام کو ہاتھ نہ لگانا۔“ انہوں نے تنبیہ کی۔  
”کام نہیں کروں گی تو رات کا کھانا بھی نہیں دے گی چودھرائی۔ پھر سب بھوکے سوئیں گے۔“

”اُف، مومو! مجھے یہ سب کچھ نہ بتا۔“ چودھری شوکت کے دل میں درد کا ایک طوفان چل اٹھا۔

”آپ نے خود ہی تو پوچھا ہے۔ اچھا بابا! اب میں چلوں گی۔ روٹی بھی لے جانی ہے۔“ مومو ایک دم اُن کی گود سے اُچھل کر کھڑی ہو گئی اور اپنی چھری کو سر پر جمانے لگی۔  
”بس پُتر!“ چودھری شوکت علی آہستگی سے بولے اور اُن کی نظریں پھسکتی ہوئی مومو کی چھری پر پڑیں، جو کئی جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔

”مومو!..... مومو! اسے اتار دے۔“

”پھر بابا! سر پر کیا ڈالوں؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”کچھ نہیں..... میں تجھے اور لا دوں گا۔“

”اماں کو پتہ چلے گا تو مار ڈالے گی۔“ اس نے یاد دلایا۔

اُف!..... میں کس قدر مجبور ہوں کہ اپنی بیٹی کو بیٹی نہیں کہہ سکتا، کسی کے سامنے۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود اسے کوئی آسائش مہیا نہیں کر سکتا۔ لوگو! کبھی تم نے اتنا مجبور و بے بس باپ بھی دیکھا ہے؟..... اگر نہیں دیکھا تو چودھری شوکت علی کو دیکھو، حسن پور کے مالک کو دیکھو، جو اپنی بے شمار دولت کے باوجود بھی اپنی بیٹی پر ایک پائی خرچ نہیں کر سکتا۔ اتنی دولت کے باوجود بھی اس کی بیٹی کا گزارا ایک پھٹی ہوئی چھری پر ہے۔ وہ اپنی بیٹی کو ایک چھری تک نہیں دلا سکتا..... کیا قائدہ ایسی دولت کا؟..... شوکت علی کا جی چاہا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں نکل جائیں، تاکہ کوئی غم، کوئی دکھ نہ رہے۔

”اچھا بابا!.....؟“ مومو اُن سے لپٹ گئی۔

”اچھا پُتر!“ انہوں نے اسے اٹھالیا اور بے تحاشا چومنے لگے۔

”بابا! ایک پی۔“ مومو نے کہا اور یہ کہتے ہی اُس نے اُن کے گال چوم لئے۔ کتنی محاسن تھی اُس کے اس بو سے میں، چودھری شوکت علی کی روح تک سرشار ہو گئی تھی۔

”اچھا بابا! رت راکھا۔“ مومو نے ان کے ہاتھ چومے اور آنکھوں سے لگائے تو شوکت علی ہمیشہ کی طرح تڑپ کر رہ گئے۔ ان سے پھڑتے وقت مومو کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جب اس نے ان کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگایا تو کتنے ہی موتی ان کے ہاتھ پر بکھر گئے۔

”پُتر! روتے نہیں۔“

”بابا! میں رو تو نہیں رہا نا۔“ مومو مسکرائی۔ ایک بھگی بھگی سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر بکھر گئی تھی۔ پھر وہ تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

”مومو پُتر! میں چھوڑ آؤں..... دیکھ، اندھیرا ہو گیا ہے۔“

”نہ بابا! میں چلی جاؤں گی۔“ مومو نے وہیں سے جواب دیا۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ گیٹ سے نکلتی چلی گئی۔ تب وہ چند لمحوں کے کھڑے کچھ سوچتے رہے، پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔

ٹھیک ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ واپس اسی راستے پر ٹھوس سفر تھے، جس راستے سے آئے تھے۔ جیب اسی راستے پر دوڑ رہی تھی مگر اب اس کی رفتار کم تھی اور چودھری شوکت علی کے لب مسکرا رہے تھے۔ ہونٹوں میں دبا سگریٹ مسکراہٹ کی وجہ سے کپکپا رہا تھا۔ یہ مسکراہٹ مومو کی معصوم باتیں یاد کر کے ہونٹوں پر پھسل آئی تھی۔ ورنہ ہمیشہ تو یہ ہوتا تھا کہ وہ جب بھی مومو سے ملنے آتے تو بہت خوش ہوتے اور واپسی پر ان کے عجیب سے احساسات ہوتے۔ انہیں یوں لگتا، جیسے وہ اپنا زخمی دل ”احمد پور“ چھوڑ آئے ہوں۔ آج بھی انہیں بہت دکھ ہو رہا تھا اور اچانک ہونے والے انکشافات دل کو بے حد دکھی کر دیتے ہیں اور یہ کم دکھ کی بات نہ تھی کہ ان کی بیٹی چودھری دلاور کی حویلی میں ملازمہ کی حیثیت سے کام کرتی ہے۔ کس قدر شرم کا مقام تھا، ان کے لئے۔ مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکتے تھے، سوائے دل مسوس کر رہ جانے کے۔ جیب حسن پور کی طرف رواں دواں تھی اور چودھری شوکت علی اپنی بیٹی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ اُن کے ذہن میں صرف مومو تھی۔

☆.....☆.....☆

گاڑی جیسے ہی خانیوال اسٹیشن پر رکی، وہ بیگ اٹھائے گاڑی سے اتر آیا۔  
شام کا ہلکا دھندلا پھیل چکا تھا اور سورج مغرب کی پناہ گاہوں میں ڈوب جانے کی کوشش میں مصروف تھا۔

”جی، تانگہ چاہئے؟“ ایک دیہاتی نوجوان گھٹنوں سے اُونچی دھوتی، میلے سے کرتے میں ملبوس اُس کے قریب آیا۔ پرندہ دانل کا کپڑا اُس نے کندھے پر ڈال رکھا تھا اور ایک ہاتھ میں چھری تھی، جو تانگے والوں کی خاص نشانی ہوتی ہے۔ اُس کے پیروں کی جوتی اپنی اصل رنگت بھی کھو چکی تھی، یوں لگتا تھا، جیسے سالوں سے وہ اُس کے پاؤں کی زینت ہو۔

”باؤ جی! نیسی جواب نہیں دتا۔“ تانگے والا اُس کے ساتھ چلتا ہوا بولا۔

”ہاں، تانگہ تو چاہئے۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”کتنے جانا ہے جی؟“ تانگے والے نے پوچھا۔



”حسن پور۔“ اس نے جواب دیا۔  
”تے فیر آؤ جی۔“ تانگے والے نے بیگ اُس کے ہاتھ سے لیا اور بولا۔ ”او جی، حسن پور کس کے گھر جاؤ گے جی؟“

”اپنے گھر۔“ وہ نہایت اطمینان سے بولا۔  
”تھاڈا گھر.....؟“ تانگے والے نے حیرت سے اُسے دیکھا تو وہ آنکھ مار کر مسکرا دیا اور تانگے والا بھی کھسیانا ہو گیا۔ پھر وہ تانگے پر بیٹھ گیا اور تانگے والا بھی اچک کر اپنی مخصوص جگہ جا بیٹھا اور چھڑی ہوا میں لہراتا ہوا بولا۔

”چل میری شہزادی! رات ہونے سے پہلے پہلے باؤ اپنے گھر پہنچ جائے تو مزہ ہی آ جائے۔“

”تیراناں کیا ہے؟“ اُس نے تانگے والے سے پوچھا۔  
”باؤ جی! ہے تو فضل دین، پر سب فضلو کہتے ہیں۔“ وہ گردن موڑ کر بولا۔ ”اور تھاڈا ناں؟“

”میراناں..... اچھا تو بتا کیا ہونا چاہئے؟“ اس نے شوخی سے پوچھا۔  
”نئی باؤ ہو جی..... تھاڈے ناں اتنے اوکھے ہوتے ہیں جی کہ زبان پہ چڑھتے ہی نہیں۔“ فضلو ہنس کر بولا۔

”یار! اوکھا تو ناں نہیں ہے میرا اور نہ ہی میں باؤ ہوں۔ میں حسن پور ہی میں پیدا ہوا، اسی سرزمین پر میرے قدموں کے چھوٹے چھوٹے نشان ہیں اور ہر چھ سات ماہ بعد چکر لگاتا رہتا ہوں۔“

”باؤ جی! میں حسن پور میں تھوڑا رہتا ہوں؟ وہاں سے آگے دو کوس پہ چھوٹا سا گاؤں ہے، وہاں رہتا ہوں۔“ فضلو اُس کی بات کاٹ کر بولا۔ شاید وہ اُس کی تفصیل سے پریشان ہو گیا تھا۔

”میراناں شعیب علی ہے۔“ نوجوان نے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا کر مسکراہٹ چھپا لی۔

”او جی، تم طالب علی چودھری کے بیٹے ہو؟“  
”اب آیا تیری سمجھ میں!“ شعیب، فضلو کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔  
”ہاں، تم پڑھن گئے ہوئے ہو شہر کراچی۔ سب کو پتہ ہے۔“  
”ہاں یار! کیا کریں، پڑھنا بھی ضروری ہے۔“ شعیب ایک طویل سانس لے کر بولا۔  
”اتنی زمیناں ہیں تھاڈیاں، فیر کیا لوڑ ہے پڑھنے کی؟“  
”مجھے وہی اچھی نہیں لگتی۔“ شعیب منہ بنا کر بولا۔

”کیوں؟“  
”بس، دل نہیں کرتا۔“ شعیب علی نے کندھے اُچکائے اور سڑک کے اطراف لگے لیکر اور شیشم کے درختوں کو دیکھنے لگا، جو سڑک پر یوں سر جھکائے کھڑے تھے، جیسے اس تارکول کی سیاہ سڑک پر محو سفر لوگوں کے نگہبان ہوں۔ گھوڑے کی ”ٹک، ٹک، ٹک“ سڑک پر گونج رہی تھی اور نہایت بھلی لگ رہی تھی۔

”باؤ جی! کراچی میں بھی تانگے ہوتے ہیں؟“ فضلو نے پوچھا۔  
”ہاں..... مگر مخصوص لوگ اس میں بیٹھتے ہیں اور وہ بگھیاں ہوتی ہیں۔“  
”او کون لوگ جی؟“ فضلو نے مڑ کر حیرت سے پوچھا۔

”تو نہیں جانتا انہیں..... وہ میمن ہوتے ہیں، یا پھر جو سیاح ہوتے ہیں، وہی ان میں سفر کرتے ہیں۔ مقامی لوگوں کو شرم آتی ہے ان میں بیٹھتے ہوئے۔“  
”باؤ جی! سنا ہے کہ کراچی میں بہت کمائی ہے۔“ اس نے عجیب سے انداز میں کہا تو شعیب کو ہنسی آ گئی۔

”کمائی ہر جگہ ہے، بس محنت کرنی چاہئے۔“  
”او ایہو گل لالی بھی کہتی ہے۔“ وہ مڑ کر بولا۔  
”یہ لالی کون ہے؟“ شعیب نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔  
”جی، میری گھر والی۔“ فضلو بری طرح شرما گیا۔

”یار! بڑی جلدی شادی کر لی۔ ایسی بھی کیا جلدی تھی؟“ شعیب علی نے شوخی سے کہا۔  
”باؤ جی! کیا کروں، گھر والے کر دیتے ہیں۔ گھر میں کام کرنے کے واسطے کوئی عورت نہیں تھی۔ اٹھارہ سال کا تھا کہ اماں نے شادی کر دی۔ اب تو جی، دو بچے بھی ہیں۔“

”شادی کو کتنے سال ہوئے؟“  
”جی، تین سال۔“

”بہت ترقی کی تم نے۔“ شعیب علی نے اس قدر برجستہ جملہ کہا کہ فضلو جھینپ گیا۔  
شعیب علی، چودھری طالب کا بیٹا اور چودھری شوکت علی کا بھتیجا تھا۔ شوخ و شریر سا شعیب، کراچی یونیورسٹی میں بی ایس سی آنرز کا طالب علم تھا۔ وہ نچلا بیٹھنا تو جانتا ہی نہ تھا اور نت نئی شرارتیں کرنا اُس کا مشغلہ تھا۔ ہاسٹل میں بھی رات گئے تک اپنے کمرے میں دھماچوٹری مچائے رکھتا۔ تقریباً تمام لڑکے اس کے کمرے میں آ جاتے اور جب وہ واپس جاتے تو کمرے کا نقشہ ہی بدلا ہوا ہوتا۔ کوئی چیز بھی ٹھکانے پر نہ ہوتی۔ وہ جلدی جلدی سب چیزیں سمیٹتا اور اپنے بستر میں دبک کر سو جاتا۔ وہ بہت ہی خوش مزاج تھا۔ کئی لڑکیوں سے بھی دوستی تھی، مگر کبھی کسی کے لئے سنجیدہ نہ ہوا تھا۔ لڑکیاں تو دوستی میں آگے بھی بڑھ



جائیں، مگر وہ جہاں سے دوستی کرتا، دوستی کا اختتام بھی وہیں ہوتا۔ لڑکیوں میں یہ بہت بُری عادت ہے کہ اگر کوئی لڑکا ان سے بہت قریب آجائے تو وہ اُسی کے سینے دیکھنے لگتی ہیں۔ اُس کے ساتھ مل کر ایک خوب صورت گھر کے سینے اور خوب صورت بچوں کے خواب۔ لیکن جب آنکھ کھلتی ہے تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ خوب صورت سپنوں کی بے حد بھیانگ تعبیر ملتی ہے۔

شعیب علی میں ایک بُری عادت یہ تھی کہ جب بھی وہ خواب میں اپنی ماں جی کو دیکھتا تو فوراً زحمت سفر باندھ لیتا۔ اب پرسوں یہی ہوا تھا۔ اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ فاطمہ بی بی، یعنی اُس کی ماں جی اُسے بلا رہی ہیں۔ بس صبح وہ اسٹیشن گیا اور سیٹ ریزرو کرائی۔ حالانکہ دوستوں نے منع بھی کیا تھا۔ اشعر درانی نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا۔

”فرض کرو، تمہاری ماں مرجائے اور پھر خواب میں تم کو بلائے، تب؟“

”تب میں کسی بھی گاڑی کے آگے کود جاؤں گا، تاکہ اس کے پاس پہنچ جاؤں۔“

شعیب نے نہایت اطمینان سے جواب دیا تھا۔

”باؤ جی! کب تک رہو گے؟“ فضلُو نے اُسے چونکا دیا۔

”یہی، دو چار دن۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔

”اتنی دُور سے دو چار دن رہنے آئے ہو؟“ فضلُو نے طنز کیا۔

”ماں جی سے ملنے آیا ہوں، بس۔“

”اچھا.....“ اس نے گردن ہلائی۔

”ویسے تین روز بعد آنا، میں اسٹیشن تک تمہارے ہی تانگے پر جاؤں گا۔“

”بہتر باؤ جی!..... مہربانی۔“ فضلُو کا چہرہ مارے خوشی کے تہمتا اٹھا۔ وہ دل سے چاہ بھی

یہی رہا تھا۔ شعیب علی نے اُس کے دل کی بات کہہ دی تھی۔

جب رات کا اندھیرا اچھا چکا، تب شعیب علی ”حسن پور“ پہنچا۔

”یہ لو!“ شعیب علی نے پرس میں سے دس کانوٹ نکال کر فضلُو کی طرف بڑھایا۔

”جی، یہ تو بہت ہیں چودھری!“

”کوئی بات نہیں۔ تُو لے لے۔“ شعیب علی نے زبردستی نوٹ فضلُو کی مٹھی میں دبا دیا

اور تانگے سے اتر آیا۔ اُس کے قدم تیزی سے اپنی حویلی ”رنگ محل“ کی طرف بڑھ رہے

تھے، جو کہ حسن پور کی سب سے بڑی، خوب صورت، بلند و بالا اور وسیع و عریض عمارت تھی

اور اس کے چاروں طرف مزارعوں کے چھوٹے چھوٹے کچے مکان تھے۔ ”رنگ محل“ قدیم

اور جدید طرز تعمیر کا خوب صورت نمونہ تھی۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے انجان آدمی

ایک لمحے کے لئے تو ضرور ٹھٹک کر رہ جاتا تھا۔ حویلی کے چاروں بلند و بالا دروازوں کے

باہر سنہری چمکتی ہوئی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی، جس پر موٹے موٹے حروف میں ”رنگ محل“ لکھا ہوا تھا اور واقعی وہ حویلی محل جیسی تھی۔ بڑے بڑے کمرے، طویل روشیں، گول ستونوں والے برآمدے۔ حویلی کے باہر لان میں ہر قسم کے موسمی پھول تھے، جن کی مہک نہ صرف حویلی کو مہکائے رکھتی بلکہ حویلی کے آس پاس بھی پھیل جاتی۔

شعیب علی جیسے ہی رنگ محل کے نزدیک پہنچا، ایک جیب تیزی سے رنگ محل کے دروازے پر آکر رُکی۔ شعیب نے حیرت سے دیکھا اور پھر اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا، جو رات کے نو بج رہی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ آنے والا شخص جیب سے اتر رہا تھا۔

”اوہ، چاچا شوکی!“ شعیب دوڑ کر اُن سے لپٹ گیا۔

”اوئے شیطان! تُو کب آیا؟“ چودھری شوکت علی نے اُس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

”بس، ابھی آرہا ہوں۔“

”گھر نہیں گیا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جا تو رہا ہوں۔“

”اچھا سن! اگر تیری چاچی مجھے کچھ کہے تو تُو کہہ دینا کہ میں تجھے لینے اسٹیشن گیا تھا۔“

”یہ جھوٹ کیوں؟“ شعیب نے شرارت سے کہا۔

”بس یار! وہ ذلیل عورت مجھ پر پابندیاں لگاتی رہتی ہے۔ ابھی وہ لڑائی کے لئے تیار

بیٹھی ہوگی، اچھا ہوا تم آگئے۔“ شوکت علی نے اس کے شانے ٹھکرتے ہوئے کہا۔

”بہتر چاچا! مگر پہلے میں ماں کے پاس جاؤں گا۔“ اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے، چل گیٹ کھول، میں جیب اندر لے چلوں۔“

”ہارن دیں، کوئی آجائے گا۔“ اُس کے اندر کا چودھری بول پڑا۔

”یار چھوڑو۔ سب سوئے ہوئے ہوں گے، سوائے تمہاری چاچی کے۔ کیوں نیند حرام

کروں سب کی؟“ چودھری شوکت علی نے دوستانہ انداز میں کہا۔

شعیب نے بڑا سا آہنی گیٹ کھول دیا اور شوکت علی جیب اندر لئے چلے گئے اور شعیب

علی اپنی والدہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ شوکت علی انجن بند کر کے نیچے اتر آئے۔ گول

ستونوں والا برآمدہ عبور کر کے وہ اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھ گئے۔





مومو ایک ہاتھ میں چنگیر اٹھائے ہوئے تھی اور دوسرے ہاتھ میں اس کے چھوٹی سی سلور کی بالٹی تھی، جس میں سالن تھا اور چنگیر میں روٹیاں تھیں۔ وہ چودھری دلاور کے ہاں سے کھانا لے کر جا رہی تھی۔ گلی میں آوارہ کتے بھونک رہے تھے اور وہ سبھی سبھی، دیوار کے ساتھ چپکی ہوئی چل رہی تھی۔ مارے خوف کے اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ اُسے دنیا میں صرف تین چیزوں سے ڈر لگتا تھا۔ ایک اپنی ماں نوران سے، دوسرا سوتیلے باپ راجا سے اور سب سے زیادہ کتوں سے۔ اس نے سنا تھا کہ اگر کتا کاٹ لے تو اس جگہ پر زہر مارنے کے لئے سرخ مرچیں زخم میں بھر دی جاتی ہیں اور مرچیں تو ویسے بھی مسالا پیستے وقت بھی ہاتھوں پر لگ جائیں تو کس قدر جلن ہوتی ہے۔ اسی خوف کی وجہ سے وہ کتوں سے بہت ڈرتی تھی۔ کتوں نے بھی سالن اور روٹی کی بو سونگھ لی، بھی تو کئی کتے اس کے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ اچانک اس کے ہاتھ سے سالن کی چھوٹی سی بالٹی گر گئی تو کتے اُس بالٹی پر پل پڑے اور مومو گھبرا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ گلی کا موڑ مڑتے ہوئے وہ کسی سے بُری طرح ٹکرا گئی۔

”کیا ہے؟..... کون ہے؟“ ٹکرانے والے نے اُسے دونوں بازوؤں سے تھام لیا۔

”کک..... کک..... کتے۔“ وہ ہکا کر بولی۔

”اوہ، تُو مومو ہے؟..... میں تُو ہوں۔ شجاع۔“ وہ بولا۔

”تُو بھائی! مجھے گھر پہنچا دے۔ اماں مارے گی مجھے۔“ وہ منمنائی۔

”کیوں؟“ تُو نے حیرت سے پوچھا۔

”سالن کی بالٹی گر گئی ہے نا۔“

”شکر کر، جان بچ گئی۔ چل تجھے گھر چھوڑ آؤں۔“

”واپس آتے ہوئے تُو ڈرے گا تو نہیں؟“ مومو نے کہا۔

”ارے نہیں پگی!“ اُس نے مومو کے ہاتھ سے چنگیر لے لی اور دوسرے ہاتھ سے

اس کا ہاتھ تھام کر اندھیرے میں آگے بڑھ گیا۔

تُو بھی گاؤں کا ہی بچہ تھا۔ بیوہ ماں اور چھوٹی سی بہن کا واحد سہارا۔ گاؤں کے اسکول

میں چوتھے درجے میں پڑھتا تھا۔ دوپہر کو اسکول سے آنے کے بعد شہر چلا جاتا۔ اُس کی ماں اور بہن ازار بند اور بیڈ شیٹ بناتی تھیں، لیکن بے حد نفیس اور خوب صورت بیل بوٹے بنانے والی مائی رحمت اور اس کی ننھی بیٹی شکراں خود ان چیزوں کو استعمال نہیں کر سکتی تھیں۔ شجاع شہر جا کر انہیں بیچ آتا۔ رات کو آ کر ماسٹر جی کی جھگی میں چلا جاتا اور اُن سے پڑھتا۔ ابھی اُس کی عمر ہی کیا تھی، صرف گیارہ برس کا تو تھا، مگر وقت نے اُسے بہت سمجھ دار بنا دیا تھا۔ گاؤں میں کبھی کسی سے لڑائی جھگڑا نہ کیا تھا۔ عام بچوں کی طرح کبھی وہ گلی ڈنڈا بھی نہیں کھیلا تھا۔ اصل میں وقت ہی ایسا پڑا تھا کہ اس نے شرارتیں کرنے کا تو سوچا بھی نہ تھا۔ اُس کی بہن شکراں پندرہ روز کی تھی اور وہ خود تین سال کا تھا، جب ایک روز اُس کا باپ چودھری دلاور کی پٹنٹی لے کر شہر گیا تھا اور پھر زندہ واپس نہ آیا۔ وہ سڑک پر ایک کیکر تلے کھڑا سستا رہا تھا کہ ایک لاری جو نہایت تیزی سے کسی عفریت کی طرح بڑھی چلی آرہی تھی، اُس کے اوپر چڑھ گئی تھی اور کیکر کا درخت اُس پر آ رہا۔

دو روز بعد اُس کی مسخ شدہ لاش، کیکر کو آرے سے کاٹ کر نکالی اور گاؤں لائی گئی۔ مائی رحمت کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ وہی تو تھا، خدا کے بعد اُن کا سہارا۔ تُو کے باپ کو پنا نہلائے دفنا دیا گیا۔ رحمت بہت غیرت مند عورت تھی، سلائی کڑھائی میں طاق تھی۔ اس نے گاؤں کی عورتوں سے سلائی کا کام لیا اور ہاتھ کی باریک باریک سلائی سے کرتے سی کر دیتی اور ایک کرتا دو روز میں بنتا۔ اُسے کرتے کے صرف چار آنے ملتے تھے، پھر بھی وہ خدا کا شکر ادا کرتی تھی۔ عورتیں اُسے چادریں بھی دیتیں کہ ان کی بیٹیوں کے جہیز کے لئے خوب صورت گل بوٹے بنا دے۔ اور وہ رات کو بھی دیا جلانے کڑھائی کرتی رہتی۔ اُس کی انگلیوں میں چھید ہو گئے تھے، مگر اُسے بچوں کی خاطر سب کرنا تھا۔

احمد پور میں اسکول کھلا تو شہر سے ایک ماسٹر جی آ کر گاؤں میں ٹھہرے۔ انہیں شجاع بہت پسند آیا اور انہوں نے مائی رحمت سے کہا کہ وہ تُو کو پڑھائے، پڑھائی کا خرچ وہ خود برداشت کریں گے۔ مائی رحمت نے ماسٹر مراد کی بات مان لی اور یہ اُنہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ تُو چوتھے درجے کا طالب علم تھا۔ اُنہی نے بسوں کے اڈے کے پاس تُو کو ایک ٹھیلا لے کر دے دیا تھا، جہاں تُو اسکول کے بعد چادریں اور ازار بند بیچتا تھا۔

مائی رحمت کو اُس کی محنت کا صحیح پھل نہیں ملتا تھا۔ لوگ زلا زلا کر پیسے دیتے۔ تب ماسٹر مراد نے اُسے سمجھایا کہ وہ بجائے گاؤں کی عورتوں کا کام کرنے کے، الگ سے چادریں بنا کر شہر میں بیکو ادے تو زیادہ آمدنی ہوگی۔ تب مائی رحمت نے اپنے کنگن بیچ دیئے اور مل سے سستے داموں کپڑا منگوا کر چادریں بنائیں۔ تُو، ماسٹر مراد کے ساتھ شہر جا کر انہیں بیچتا۔ دو ماہ تو ماسٹر، تُو کے ساتھ گئے، پھر تُو اکیلا ہی جانے لگا اور اب تقریباً ڈیڑھ سال سے اُس



کا یہی معمول تھا۔ اب اُن کا وقت اچھا گزرنے لگا تھا۔ ماسٹر مراد کو دعائیں دیتے اُس کی زبان سوکھتی تھی۔ اُس کے لئے گو ماسٹر مراد ایک فرشتہ تھا۔ اب تو ٹچو کی کتابوں کا خرچہ بھی مائی رحمت خود برداشت کرنے لگی تھی۔ اُس کی خواہش تھی کہ ٹچو پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن جائے اور شاید یہی خواہش ہر ماں کی ہوتی ہے۔

”چل جا اندر، مومو!“ شجاع نے اُس کے گھر کے دروازے کے سامنے رُک کر چنگیر اُس کی طرف بڑھائی۔

”ٹچو بھیا! سالن تو گر گیا۔ اماں مارے گی۔“ مومو نے خوف زدہ آواز میں کہا۔  
 ”نہیں مارے گی۔ تُو بتا دینا۔“ ٹچو نے اُسے دلاسا دیا۔ ”چل جا، اب بہت رات ہو گئی ہے۔“ ٹچو نے کہا اور پلٹ گیا۔ مومو کی آنکھوں میں مارے خوف سے آنسو آ گئے۔ شام کو وہ کس قدر خوش تھی، جب اپنے بابا سے ملنے گئی تھی۔ مسکراہٹ آپ ہی آپ لبوں پر پھیل گئی تھی، تب زبیدہ نے پوچھا تھا۔

”بہت خوش نظر آرہی ہے مومو!“

”ہاں بی بی! وہ شے بٹی تھی نا۔“

”شے ملنے کی اتنی خوشی؟“ زبیدہ اُس کی بات کاٹ کر بولی۔

”جو لوگ کئی دنوں بعد کھائیں، انہیں تو خوشی ہونی ہے نا۔“ مومو نے کہا اور چودھرائی کے پاس چلی گئی تاکہ اُس کے پیر دبا دے۔ رات کو سونے سے پہلے وہ مومو سے پاؤں ضرور دبواتی تھی اور مومو تصور میں یوں محسوس کرتی، جیسے اپنے باپ یا ماں کے پاؤں داب رہی ہو۔ مومو نے سر جھٹکا اور گھر میں داخل ہو گئی۔

”بی بی اب آرہی ہے۔“ ماں نے اسے دیکھتے ہی طنز سے کہا۔

”اماں! دیر ہو گئی ہے تو کیا کروں؟ چودھرائی کے پیر دبائے تھے۔“ مومو نے دل کڑا کر کے جواب دیا۔

”مغرب کے وقت وہاں سے کہاں چلی گئی تھی؟ حویلی میں تو نہیں تھی؟“ راجا نے کڑک کر پوچھا تو مومو کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا۔

”بتا، کہاں گئی تھی؟“ اماں نے اُس کی چوٹی پکڑ کر جھٹکا دیا۔

”اماں! زبیدہ نے بھیجا تھا۔“ وہ منمنائی۔

”کہاں؟“

”دکان پر شے لینے۔“ مومو کی آنکھوں سے آنسو ایک تو اتر سے بہہ رہے تھے۔

”چل دفع ہو، اور اس سُر کی بچی کا ذکر چھوڑ۔ لا، روٹی دے تاکہ میں کھا کر سو جاؤں۔“ راجا منجی پر بیٹھا ہوا بولا۔ تب اماں نے مومو کی چوٹی چھوڑ دی اور چارپائی کی پائنتی

پر رکھی ہوئی چنگیر اٹھالی۔

”سالن کہاں ہے ری؟“ ماں نے روتی ہوئی مومو سے پوچھا۔

”ماں! وہ گر..... رہا..... وہ، اماں! آج چودھرائی نے دیا ہی نہیں۔“ وہ سچ بولتے

بولتے ایک دم جھوٹ بول گئی۔

”کیوں؟“ ماں غرائی۔

اُن کے پروہنے آ گئے تھے تو سالن ختم ہو گیا تھا۔“ مومو نے آنکھیں مسلتے ہوئے

جواب دیا۔

”گولی مارا نہیں اور تُو مجھے دودھ سے روٹی دے دے۔“ راجا چارپائی پر آلتی پالتی مار

کر بیٹھ گیا۔ تب مومو کی ماں نے اُسے سلور کے بڑے سے گلاس میں دودھ ڈال کر دے دیا

اور روٹی کی چنگیر سامنے رکھ دی۔

”اماں! مجھے۔“ اشو روتے ہوئے بولا۔

”کلیجہ کھا لے میرا، کم بخت! ایک اس مردود نے جان کھا رکھی ہے اور ایک تُو جان کا

عذاب ہے۔“ اماں نے اُسے جھڑک دیا تھا۔ وہ زور زور سے رونے لگا۔

”اشو!..... آ میرے ویر! میں دوں تجھے شے۔“ مومو نے لپک کر بھائی کو گود میں اٹھا

لیا اور اندر کمرے میں چلی گئی۔

”بی بی! بھٹک لگی اے۔“ اشو نے اُس کے کندھے سے سر ٹیک دیا۔

”یہ میں تیرے لئے چھپا کر لائی تھی۔“ مومو نے بغل میں سے دوپٹے کا پلو کھینچا، جس

میں تنوری روٹی، مکھن اور دو بوٹیاں تھیں۔

”بیٹھ میرے ویر!“ اُس نے اشو کو چارپائی پر بٹھا دیا اور دیے کی کو بڑھا دی، دوپٹہ

چارپائی پر رکھا اور اشو کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

”یہ زبیدہ بی بی نے دیا تھا مجھے کھانے کو، میں نے تیرے لئے رکھ لیا۔“ مومو اپنے

بھائی کے بال سنوارتے ہوئے بولی۔

اشرف صرف پانچ برس کا تو تھا ہی اور مومو کا سوتیلا بھائی تھا۔ مگر مومو اُسے بہت چاہتی

تھی۔ اشو بھی اُس کے بغیر بہت اُداس ہو جاتا۔ رات کو جب مومو واپس آتی تو وہ جاگ رہا

ہوتا۔ پھر دونوں ساتھ کھانا کھاتے۔ مومو کو باہر سے ذرا سی چیز بھی ملتی تو وہ اشو کے لئے

چھپائے پھرتی، چتری کے پلو میں باندھ لیتی۔

”دیکھ، اماں کو نہ بتانا اشو!“ مومو نے کہا تو اشو نے انکار میں گردن ہلا دی۔

”اری مومو! ابھر آ۔“ باہر سے اماں کی کرخت آواز آئی تو وہ جلدی سے کمرے سے

نکل گئی۔



”کیا اماں؟“

”وہ سلور کی بالٹی کہاں ہے؟“ ماں نے کہا۔

”کون سی؟“ وہ انجان بن گئی۔

”وہی جس میں سالن لاتی ہے نامراد۔“ وہ ہونٹ چبا کر بولی۔

”وہ چودھرائی نے رکھ لی تھی، کہنے لگی، کل تجھے پھر لانی پڑے گی۔“ مومو نے فوراً

جھوٹ گھڑا۔

”اس چودھرائی کو خدا غارت کرے۔“ اماں بڑبڑائی، پھر وہ چونک پڑی۔ اُس کی نظر

مومو کے کپڑوں پر پڑ گئی تھی۔

”یہ کیا ہوا ری؟“ اماں نے اُس کی قمیض پکڑ کر اُسے گھسیٹ لیا۔

”کہاں..... اماں؟“ مومو کے سینے چھوٹ گئے۔

”یہ۔“ اماں نے اُس کی قمیض سونگھی۔ ”ہوں.....“ اُس نے ایک ہنکارا بھرا اور

تڑاخ، تڑاخ مومو کے گالوں پر پھٹھر اس طرح پڑنے لگے، جیسے گھاٹ پر دھوبی کپڑوں کو پٹختا

ہے۔ ”بتا کمینی! تُو نے جھوٹ کہاں سے سیکھ لیا؟..... اپنے حرامی باپ پر گئی ہے۔ اس نے

بھی ہمیشہ دُکھ ہی دیئے مجھے اور تُو بھی۔“ زبان کے ساتھ ساتھ اماں کے ہاتھ بھی چل رہے

تھے۔ بے چاری مومو اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے بچاؤ کر رہی تھی۔ مگر کہاں تک؟ ادھر راجا

مسلسل اشتعال دلائے جا رہا تھا۔

”لگا کم بخت کو..... سالن گرا کر آ گئی اور جھوٹ بول رہی تھی۔ آج تک تو چودھرائی

نے سالن کا ناغہ نہیں کیا۔ کھٹ دے اس کی قبر۔ مرے اور جان چھوڑے۔“

”اماں!..... اماں! کتے لگ گئے تھے میرے پیچھے۔“ مومو نے حقیقت بتائی۔

”تیرے کو کھانا نہ گئے، جو سالن تُو انہیں کھلا آئی نامراد۔“ اماں نے اُسے اور دو تھپڑ جڑ

دیئے۔ تب وہ تیزی سے کمرے میں جا گھسی، اندر سے کنڈی چڑھالی اور دروازے سے

پشت لگا کر رونے لگی۔ تب ہی اشو اُس کے قریب آ گیا۔

”بی بی!..... اماں، ابا بہت گندے ہیں۔ بی بی! تجھے مارتے ہیں نا؟“ اشو اپنے

ہاتھوں سے اس کے گالوں پر بکھرے ہوئے آنسو صاف کرنے لگا، پھر اُسے لا کر چارپائی پر

بٹھا دیا۔ ”بی بی! چپ ہو جائیں، ورنہ میں بھی رو دوں گا۔“

”نہ، ویر!..... نا۔“ مومو تڑپ کر رہ گئی اور اُسے خود سے چمٹا لیا۔ وہ سوچ رہی تھی۔

”چاچا تو پھر بھی غیر ہے، مگر اماں تو میری اپنی ہے۔ لیکن یوں لگتا ہے، جیسے دونوں ہی

میرے نہیں ہیں۔ مجھے صرف پالنے کے لئے لیا ہوا ہے انہوں نے۔ اگر اتنی ہی غربت ہے تو

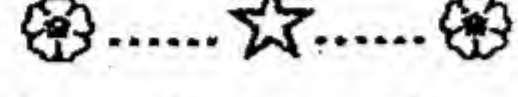
مجھے واپس بھیج دیں۔ میں تو روٹی بھی دو جوتے کھائے بغیر نہیں کھا سکتی۔ اب کے بابا آیا تو

میں اسی کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ مجھ میں سکت نہیں ہے مار کھانے کی۔ اگر وہ نہ لے گیا تو

کنوئیں میں چھلانگ لگا دوں گی۔“

مومو نے مصمم ارادہ کر لیا، پھر اشو کے پہلو میں لیٹ کر اندھیرے میں چھت کی کڑیاں

دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔



چودھری شوکت علی، گرین بروکیڈ کے پردے ہٹا کر خواب گاہ میں داخل ہوئے تو وہ

زہرہ سے لڑائی جھگڑے کے لئے خود کو ذہنی طور پر تیار کر چکے تھے۔ انہیں علم تھا کہ ہمیشہ کی

طرح دیر سے آنے پر زہرہ سے ٹوٹو، میں میں ہوگی۔ زہرہ سامنے ہی مسہری پر گاؤ تکیے سے

ٹپک لگائے بیٹھی تھی اور بڑے کڑے تیوروں سے انہیں گھور رہی تھی۔

زہرہ ادھیڑ عمر کی خاتون تھی۔ جوانی میں خوب صورت رہی ہوگی۔ وہ چودھری شوکت علی

سے پورے دس سال بڑی تھی اور رشتے میں شوکت کی چچا زاد بہن بھی تھی۔ زہرہ اور شوکت

کے والدین یہ نہیں چاہتے تھے کہ زہرہ کے حصے کی زمین اور دولت کہیں باہر جائے اور گھر کی

دولت گھر ہی میں رہے۔ شوکت، جو زہرہ کو آپا کہتے تھے، بزرگوں کے غلط فیصلے کی بھینٹ

چڑھ گئے۔ اب زہرہ اُن کی بیوی کم اور سرپرست زیادہ تھیں۔ ان کے ہر قدم پر بڑی کڑی

نظر رکھتیں اور سچ بات تو یہ کہ شوکت اُن سے دبتے بھی تھے۔ شروع دن سے انہوں نے ایسا

رعب رکھا تھا کہ شوکت علی اُن سے نظریں ملا کر بات نہ کر سکتے۔ اندر ہی اندر گڑھتے رہنے

والا لاوا پکتا رہتا اور باہر کے لوگوں پر نکلتا رہتا تھا۔ آتش فشاں گھر میں بنتا اور باہر پھٹتا تھا۔

شوکت جب بھی دیر سے گھر آتے، زہرہ ان کی اچھی طرح خبر لیتی۔ عمر سے بڑی بیوی ہونا

بھی ایک عذاب ہے۔

شوکت علی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے رنگین کرسی پر آ بیٹھے۔ زہرہ اب بھی انہیں دیکھ رہی

تھیں اور شوکت سگریٹ کے کش پہ کش لئے جا رہے تھے۔

”کہاں سے آرہے ہیں چودھری صاحب؟“ زہرہ نے انہیں نہایت اطمینان سے

بیٹھے دیکھ کر کہا۔

”شعب کو لینے اسٹیشن گیا تھا۔“ انہوں نے سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے

کہا۔

”مجھے بتائے بغیر؟“

”ہر بات آپ کو بتانی ضروری ہے؟“ شوکت علی نے ان کی طرف دیکھا۔

”میں نے آپ سے بارہا کہا ہے چودھری شوکت! کہ مجھ سے جھوٹ نہ بولا کریں۔

کیونکہ میں آپ کے چہرے پہ لکھے جھوٹ اور سچ کو پڑھ سکتی ہوں۔ آخر گودوں میں کھلایا ہے



آپ کو زہرہ نے وار کیا اور اسی جملے سے چودھری شوکت علی کی جان جل جاتی تھی۔ وہ یہ ضرور جتا دیا کرتی تھیں کہ انہوں نے اپنے شوہر کو گودوں کھلایا ہے، تاکہ وہ وعب نہ جما سکے۔

”میں نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ آپ مجھے کھلائیں۔“ چودھری شوکت علی پھٹ پڑے۔ ”یہ آپ کا قصور ہے۔ اگر آپ کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی تو آپ شادی نہ کرتیں مجھ سے، میں نے آپ کو مجبور نہیں کیا تھا، ہاتھ پیر تو نہیں جوڑے تھے۔“ دل میں پکتا لاوا بہہ نکلا۔ چودھری شوکت علی کے تو زہرہ جلدی سے بولیں۔

”یہ کام آپ بھی کر سکتے تھے، آپ ہی انکار کر دیتے۔“

”میں..... میں اور انکار؟“ وہ دکھ سے ہنس دیے۔ ”زہرہ بیگم! میری عمر تو صرف تیرہ برس کی تھی، آپ تو تیس چوبیس سال کی بھرپور دوشیزہ تھیں۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں اپنی شادی پر بہت خوش تھا۔ دُلہا بننے کا ارمان کس لڑکے کے دل میں نہیں ہوتا؟ اسی ارمان کو دل میں بسائے میں نے سہرا باندھا تھا، مگر مجھے کیا خبر تھی کہ پھولوں کی بیج، کانٹوں کا بستر بن جائے گی اور تمام عمران کانٹوں کی چھن اپنے دل میں محسوس کرتا رہوں گا۔“

چودھری شوکت علی نے سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا۔ تب زہرہ بیگم نے سوچا۔ ہم دونوں کے دکھ ایک جیسے ہیں۔ ہمارے اندر تو ایک ہی زخم ہے، جواب ناسور کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اس میں نہ تو شوکت کا قصور ہے، نہ ہی میرا کوئی دوش۔ یہ تو مقدر کے کھیل اور قسمت کی باتیں ہیں۔ جوڑے تو آسمانوں پر ہی بن جاتے ہیں۔ جب میں شوکت کو اٹھا کر گلی میں سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی ہوں گی تو تقدیر مجھ پر کس قدر ہنستی ہوگی۔ مگر شوکت علی! تم کیا جانو کہ میں نے تمہاری سنگت میں یہ سترہ سال کس طرح گزارے ہیں، ہر رات مرنی ہوں اور ہر صبح جیتی ہوں۔ بھلا تم سوچو کہ ایک بھر پور لڑکی، جس کا دل اُمنگوں، آرزوؤں، جذبات و احساسات کی آماجگاہ ہو اور اُسے تیرہ سالہ نٹ کھٹ سے لڑکے کی بیج کی زینت بنا دیا جائے، جو دلوں کی اُمنگوں کو نہ جانتا ہو، جسے آرزوؤں کا مطلب ہی پتہ نہ ہو، جس کے جذبات جوانی کی اُمنگوں سے محروم ہوں اور جو بیوی کے مفہوم سے بھی نا آشنا ہو، وہ بھلا اس لڑکی کے دلی جذبات کو کیا سمجھ سکتا تھا؟ اسی طرح زہرہ بیگم کی تمام اُمنگیں اور آرزوئیں سینے ہی میں گھٹ کر رہ گئیں۔ اُن کے ذہن میں شوہر کا جو خاکہ تھا، اس سے شوکت علی مطابقت نہ رکھتے تھے۔ شوکت کے والد چودھری سرفراز علی انہیں ڈانٹ دیتے تو وہ بچوں کی طرح روتے ہوئے زہرہ کے پاس آ جاتے۔ تب وہ پچکار تیں، انہیں بچوں کی طرح بہلاتیں تو وہ خاموش ہو جاتے اور زہرہ دل ہی دل میں گھٹ کر رہ جاتیں۔ ان کا کتنا جی چاہتا تھا کہ وہ شوہر سے ناز اُٹھوائیں، رُوٹھنے اور

منانے کے سلسلے ہوں، مگر یہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ ہر طرف سرد جہنم تھا، جس کے درمیان وہ گیلی لکڑی کی مانند سلگ رہی تھیں اور دھواں ان کی آنکھوں میں چھا جاتا تھا اور اس چھن سے ان کی آنکھوں کے سوتے اُبل پڑتے۔ مگر وہ شوکت علی کے سامنے کبھی نہ روئی تھیں۔ وہ اپنی کمزوری کا اظہار نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ اسی کش مکش میں دو سال گزر گئے۔ ایک روز اُن کی جیٹھانی فاطمہ نے کہا۔

”بھرجانی! کیا بات ہے، تمہارا دل نہیں چاہتا، ماں بننے کو؟“

یہ سن کر اُن کے دل میں ایک ہوک اُٹھی اور ایسا درد ہوا، جو پورے وجود پر چھا گیا، مگر وہ مسکرا کر بولیں۔

”شوکت نہیں چاہتا۔ وہ کہتا ہے کہ ابھی تو کھیلنے کے دن ہیں۔“

”شوکت تو بے وقوف ہے۔ اولاد شروع کی ہی اچھی ہوتی ہے۔ جب ماں باپ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو جوان اولاد سہارا بنتی ہے۔“ فاطمہ بولی۔ ”تم شوکت کو چھوڑو اور جلد از جلد اپنی گود بھرو۔ جب بچہ ہو جائے گا تو وہ خود بھی خوش ہو گا۔“ وہ بڑی دیر تک انہیں سمجھاتی رہیں۔ زہرہ دل ہی دل میں اُن کی باتوں پر ہنستی رہی۔ اُس کا جی چاہا، وہ چیخ چیخ کر کہے۔ ”تم لوگ بھی عجیب ہو، ماں بننا تو عورت کا پیدائشی حق ہے۔ جب تک عورت ماں نہ بنے، وہ ادھوری رہتی ہے۔ دنیا کا خوب صورت رشتہ ماں کا ہے، جس کے پاؤں تلے جنت ہے۔ اور کون بد نصیب عورت ہوگی، جو نہ چاہے گی کہ ماں بن کر اپنے قدموں تلے جنت نہ پالے۔ مگر میں کیا کروں، کوئی مجھے مجھے ماں بھی بنائے۔ اُسے تو یہ بھی علم نہیں کہ میں اُس کے کمرے میں کیوں سوتی ہوں۔ ہم دونوں کی دھڑکنیں کبھی ہم آہنگ نہیں ہوتیں۔“

پھر وقت بدلا اور اُن کی بھی خدا نے سن لی۔ شادی کو ساڑھے تین برس ہو چکے تھے۔ پتہ نہیں، شوکت کے دل میں کیا آئی کہ اچانک ایک رات وہ سب کچھ ہو گیا، جس کی ہر عورت کو خواہش ہوتی ہے۔ وہ سہاگ رات جو عورت کی زندگی میں ایک مرتبہ آتی ہے، جب ان کی بیج پھولوں سے سجی ہوتی ہے اور پھولوں کی خوشبو اُن کی رُوح کو سرشار کر رہی تھی اور اس خوشبو سے ان کا جی کسی کی قربت کا خواہش مند تھا، تب تو کچھ نہ ہوا تھا اور اس رات اچانک شوکت علی نے انہیں کلی سے پھول بنا دیا۔ پھر سترہ طویل برس بیت گئے، مگر شوکت انہیں عورت سے ماں نہ بنا سکے۔ کتنے ہی علاج کروائے، کتنی فیتیں مانگیں لیکن کچھ نہ ہوا۔ زہرہ بیگم چڑچڑی ہوتی چلی گئیں۔ جب وہ اپنی دیورانی، جیٹھانی کو بچوں کے جھرمٹ میں دیکھتیں تو انہیں سینے میں کوئی چیز ٹوٹی ہوئی محسوس ہوتی۔ ماں بننے کی ازلی خواہش عود کر آتی۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ اولاد تو نصیبوں سے ملتی ہے، ان کی قسمت میں ماں کہلوانا تو لکھا



ہی نہ تھا، پھر ماں کیسے بنتی؟ پھر وہ شوکت علی کی کڑی نگرانی کرنے لگیں اور اب تک یہی عالم تھا۔

زہرہ بیگم نے خیالات کی یورش سے چونک کر سر اٹھایا تو چودھری شوکت علی، میز پر جوتوں سمیت دونوں پاؤں رکھے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے، آنکھیں موندے بیٹھے تھے۔ اُن کے لبوں پر بڑی سُندری مسکان تھی، جیسے ذہن پر بڑے ہی خوب صورت خیالات کی یلغار ہو۔ زہرہ بیگم کو وہ ایک دم سے اچھے لگنے لگے۔ گئے دنوں میں جیسے شوہر کا اُن کے ذہن میں خاکہ تھا، چودھری علی اب اس پر پورے اُترے تھے۔ سلیقے سے سنورے ہوئے بال، ہونٹوں سے اوپر گھنی سیاہ مونچھیں، سرخ و سفید رنگت، گرتے کے گریبان سے جھانکتے ہوئے چھاتی کے بال، سفید گرتے اور سنہرے بارڈر والے تہد نے ان کی شخصیت میں اور بھی نکھار پیدا کر دیا تھا۔ واقعی، وہ بھی چاہے جانے کے قابل۔

زہرہ بیگم مسہری سے اُنھیں اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اُن کے قریب ہی قالین پر بیٹھ کر ہولے سے اُن کی جوتی اُتارنے لگیں۔ جیسے ہی انہوں نے ہاتھ لگایا، چودھری شوکت علی چونک کر سیدھے ہو گئے اور پھٹی پھٹی نظروں سے زہرہ بیگم کو دیکھنے لگے، جن کے ہونٹ مسکرا رہے تھے اور گالوں پر حیا کی سرخی بکھری ہوئی تھی۔ چودھری شوکت علی نے ایک ٹک انہیں دیکھا۔ وہ دل میں سوچ رہے تھے کہ صرف ایک بار سختی سے بول پڑا تو یہ اتنی فرمانبردار ہو گئی ہیں۔ یا الہی! یہ خواب ہے یا حقیقت؟

زہرہ بیگم نے اُن کے مسلسل دیکھنے پر نظریں جھکا لیں اور اُن کی جوتی اُتارنے لگیں۔ ”زہرہ! آپ.....؟“ شوکت علی کیا کہنا چاہتے تھے، اس کی خود انہیں خبر نہ تھی۔

”شوکت! میں نے سوچا ہے کہ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، اس لئے کیوں نہ ہم سمجھوتہ کر لیں۔ کچھ گزر چکی ہے، باقی بھی یونہی گزرا لیں۔ کیا خیال ہے آپ کا؟“ انہوں نے سر اٹھا کر شوکت علی کو دیکھا۔

”ہاں زہرہ! آپ نے صحیح سوچا ہے۔ ہم بزرگوں کے غلط فیصلوں کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں، یہ دولت بھی ہم سے قربانی مانگتی ہے۔ آپ نے جو کچھ سوچا، درست سوچا۔ اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہے۔“ چودھری شوکت علی نے انہیں دونوں بازوؤں سے تھام کر اٹھایا۔ ”آپ نے بہت اچھا کیا۔“ وہ زہرہ بیگم کی کمر کے گرد بازوؤں کا حلقہ تنگ کرتے ہوئے بولے اور انہیں لئے مسہری کی طرف بڑھ گئے۔ مگر دروازے پر ہونے والی دستک نے انہیں اس خواب ناک ماحول سے جگا دیا۔

”وہی شیطان ہو گا۔“ شوکت علی مسکرائے۔ زہرہ بیگم جلدی سے مسہری پر بیٹھ گئیں اور شوکت علی کرسی کی طرف بڑھ گئے۔

”آ جاؤ شعیبی!“ شوکت علی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”السلام علیکم، چاچی!“ شعیب علی پردہ ہٹا کر اندر آتے ہوئے بولا۔

”علیکم السلام!“ زہرہ بیگم مسکرائیں۔ پھر وہ اُنہی کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ زہرہ بیگم نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

”کب آئے؟“

”چاچا نے نہیں بتایا؟“ اس نے شرارت سے چودھری شوکت علی کو دیکھا۔

”بتایا تھا کہ تمہیں لینے گئے تھے۔“ زہرہ بیگم بولیں۔ ”اور سناؤ، ٹھیک ٹھاک تو رہے

نا؟..... پڑھائی کیسی چل رہی ہے شعیبی؟“

”بالکل ٹھیک، چاچی! بس پڑھائی چل ہی رہی ہے۔“ شعیب سر جھکاتے ہوئے بولا۔

”کراچی کا موسم کیسا ہے؟“ چودھری شوکت علی نے پوچھا۔

”وہ تو بس بگڑا ہوا صم ہے۔ کبھی بادل خوب گھر گھر کرتے ہیں اور کبھی اس قدر تپش،

جیسے تھور میں کھڑے ہوں۔ عجیب موڈ ہے کراچی کے موسم کا۔“

پھر وہ لوگ کافی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ زہرہ بیگم اور چودھری شوکت

علی کو شعیب علی اپنی باتوں سے ہنساتا رہا۔

”اچھا چاچا، چاچی! اب آپ لوگ آرام کریں اور میں بھی آرام کرنے جاؤں۔ کیونکہ

سفر کی تھکن کے مارے بدن ٹوٹ رہا ہے۔“ شعیب علی انگڑائی لیتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

”اچھا جاؤ، شب بخیر!“ چودھری شوکت علی ہاتھ اٹھا کر بولے۔

”شب بخیر!“ شعیب علی چلا گیا تو شوکت علی نے دروازہ بند کر دیا۔ زہرہ بیگم کی

آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں، اس لئے وہ لیٹ گئیں۔

”زہرہ! اگر ناگوار نہ گزرے تو تھوڑی دیر کے لئے لائٹ جلتی رہے؟“

”کوئی کام ہے؟“

”ذرا حساب کتاب کے کھاتے دیکھنے تھے۔ منشی دوپہر کو دے گیا تھا نا!“

”بہتر ہے۔ مجھے تو نیند آرہی ہے۔“ زہرہ بیگم کروٹ لے کر پڑ گئیں اور چودھری

شوکت علی اپنے کھاتے چیک کرنے لگے۔ نہ جانے کتنا وقت بیت گیا۔ انہوں نے رجسٹر بند

کر کے کمرے میں نظر دوڑائی۔ کمرے میں سکوت طاری تھا۔ مگر زہرہ بیگم کے ہلکے ہلکے

خرائے اس سکوت کو توڑ رہے تھے۔ عمر ڈھلنے کے باعث اب وہ خرائے بھی لینے لگی تھیں۔

چودھری شوکت علی نے کرسی کی پشت سے سر ہٹا کر پلکیں موند لیں تو ایک دم سے

آنکھوں کے سامنے مومو آ گئی۔ پھو لے پھو لے گالوں، بڑی بڑی سیاہ آنکھوں، ہلکے

بھورے بالوں والی پیاری سی مومو..... اُن کے جگر کا کٹڑا، جس سے ملنے کے بعد اُن کی بے



چینی کو قرار آ جاتا تھا۔ وہ، جو بچوں کے خواہش مند تھے، جنہیں بچوں کو بازوؤں میں سمیٹنے اور انہیں پیار کرنے کی ہمیشہ خواہش رہی تھی، اپنی بچی ہونے کے باوجود وہ اُسے اپنا نہیں کہہ سکتے تھے۔ زمانے کا خوف آڑے آتا تھا۔ قدرت کے کھیل بھی نرالے ہوتے ہیں۔ وہ بعض مرتبہ سوچتے کہ اتنے بڑے زمیندار نہ ہوتے، بلکہ معمولی سے آدمی ہوتے۔ اپنے بچوں کی، اپنے چمن کی رکھوالی کرتے۔ پھر اُن کا ذہن بہت پیچھے چلا گیا.....

یہ اُن دنوں کی بات تھی، جب رنگ محل میں ہر طرف سکوت طاری تھا اور حویلی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ صرف ایک کمرے کی لائٹ جل رہی تھی اور اسی کمرے میں سب جمع تھے۔ چودھری سرفراز علی کی طبیعت آج بہت خراب تھی۔ وہ کئی سالوں سے علیل تھے اور اکیلے سو ہی نہیں سکتے تھے۔ چودھری سرفراز علی اپنے وقت کے بہت ظالم و جابر زمیندار تھے۔ اُن کے تین بیٹے چودھری طالب علی، چودھری شجاعت علی اور چودھری شوکت علی تھے۔ اُن کے اپنے کوئی بیٹی نہیں تھی۔

غریب مزارعوں کا خون چوس چوس کر خوب عیش کئے جاتے۔ شہر سے طوائفیں بلوائی جاتیں اور رات گئے تک مجرے ہوتے۔ سرخ و سبز نوٹوں کی بہاریں ہوتیں، مجرا کرنے والیوں پر نوٹوں کی اس طرح بارش ہوتی، جیسے کہ رم جھم کا سماں ہو۔ بیوی کو تو انہوں نے 55 مربع زمین کے وارث پیدا کرنے کے لئے رکھا ہوا تھا۔ چودھرائی کو اُن کی اپنی زندگی میں کبھی بھی شوہر کی محبت نہ ملی۔ رات ہوتی تو چودھری سرفراز کا دن نکل آتا اور وہ پوری رات گھر سے باہر گزارتے۔ صبح ڈیرے پر دیر تک سوتے رہتے اور سہ پہر کو گھر میں آگھستے۔ چودھرائی کھل کھل کر آدھی بھی نہ رہی تھی۔ اور جب شوکت علی چھ سات سال کے ہوئے تو اُن کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔

رنگ محل میں ملازمین کی کمی نہ تھی۔ مائی بھراواں نے شوکت علی کو سنبھالا، کیونکہ بڑے دونوں لڑکے تو سیانے تھے، بس شوکت ہی ایسے تھے، جو ماں کے لئے روتے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ وہ بھی بہل گئے۔ چودھری سرفراز علی نے دوسری شادی نہیں کی اور ویسے انہیں بیوی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے لئے عورتوں کی کمی بھی نہ تھی۔ اور چودھرائی کی زندگی میں ہی وہ عورتوں کے جھرمٹ میں رہتے تھے۔ زمینوں پر سونا اُگانے والے روٹی اور کپڑے کو ترستے اور چودھری سرفراز علی کی تجوریاں نوٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ”حسن پور“ کے مالک کے سامنے سر اٹھا سکے۔ مزارعے نسل در نسل کے مزارعے تھے اور چودھری سرفراز پشت ہا پشت کے زمیندار۔ وہ، جو ایک نسبت آ رہی تھی، وہ ابھی تک ٹوٹی نہ تھی۔

پھر انہوں نے بچوں کی شادیاں کر دیں اور پُر سکون ہو گئے۔ طالب اور شجاعت کے

بچوں سے ڈیرے پر کھیلتے رہتے۔ شجاعت کے ہاں بیٹی ہوئی تو انہی دنوں ایک رات جشن کے بعد وہ ایسے سوئے کہ پھر اپنے قدموں پر کھڑے نہ ہو سکے۔ اُن کے آدھے دھڑ پر فاج گر گیا تھا۔ اس کے بعد تو حسن پور کے مالک پر خدا کا قہر نازل ہوتا چلا گیا۔ رات کو وہ اکیلے سو نہ سکتے۔ اپنے پرانے خدمت گار رو کو بلایا ہوا تھا، رات کو سوتے تو ایک دم چیخنے لگتے۔ انہیں یوں لگتا جیسے بے شمار جوان، خوب صورت لڑکیاں آنکھوں میں آنسو لئے، لرزتے ہونٹ اور بکھرے بالوں کے ساتھ اُن کی طرف بڑھ رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں۔

”ہم تمہارا گلا گھونٹ دیں گے۔“

”تم قاتل ہو، ہماری عزت کے..... ہماری آرزوؤں کے، ہمارے دل کے چلتے ارمانوں کے۔ تم قاتل ہو، چودھری سرفراز علی!..... ہماری پامالی کے تم ہی ذمے دار ہو۔ ہم تمہیں ختم کر دیں گے۔“ اور چودھری سرفراز ان لڑکیوں کے ہاتھ اپنے گلے کی طرف بڑھتے دیکھ کر چیخ پڑتے۔

”رؤ! مجھے ان سے بچاؤ..... یہ مجھے مار ڈالیں گی۔“ وہ خوف زدہ ہو جاتے۔ ان کی آنکھوں میں ایسی دہشت اور اتنی سفیدی ہوتی کہ روح تک کپکپا اٹھتی۔

کبھی اُنہی آنکھوں میں سرخ ڈورے لہراتے تھے۔ لڑکیوں کو دیکھ کر آنکھوں کی وحشیانہ چمک بڑھ جایا کرتی تھی، اب وہی مارے خوف کے پھٹی رہتیں۔ وہ رات کو چیختے چلاتے رہتے اور پچھلے پہر سوتے بھی تو رو سے لپٹ کر سوتے۔ وہ رو سے اس طرح لپٹ جاتے، جیسے بچہ ماں سے لپٹ کر سوتا ہے۔ رو ایک غریب آدمی تھا۔ اُس نے تو کبھی چودھری کے ساتھ بیٹھ کر پانی بھی نہ پیا تھا، اور اب چودھری سرفراز اُس کے بغیر سو نہ سکتا تھا۔ چودھری سرفراز کہتا تھا۔ ”یہ کمی لوگ اس قابل نہیں کہ انہیں اپنے پاس بٹھایا بھی جائے۔ ان پہ حکومت کرنی ہو تو صرف اور صرف ان کی گردن پر پیر رکھو اور جب یہ سر اٹھانے لگیں تو ان کا سر کچل دو۔“ مگر قدرت نے اسے زندگی میں ہی دکھا دیا تھا کہ جہاں اس کے بیٹے بھی کام نہ آئے، وہاں ایک کمی ہی کام آیا۔ رو کئی سالوں سے اس کی چیخیں سن رہا تھا۔ یہ اُسی کا دل گردہ تھا اور آج چودھری سرفراز علی واقعی سرفراز ہو رہے تھے۔ کیونکہ زندگی کی ڈور ٹوٹ رہی تھی اور موت سے نانا جڑ رہا تھا۔ اُن کے کمرے میں پٹواری، وکیل، اُن کے بیٹے اور بہوئیں موجود تھیں اور رو اُن کے سر ہانے کھڑا تھا۔

”چودھری صاحب! کاغذات بالکل تیار ہیں۔“ وکیل وسیم خان نے جھک کر ادب سے کہا۔

”اچھا! مگر میں انہیں جائیداد کی تقسیم سے پہلے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“

”ہم باہر چلے جائیں؟“ پٹواری بولا۔



”نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔“ چودھری سرفراز علی بولے۔ پھر انہوں نے اپنے بیٹوں کی طرف دیکھا، جو رنگین کرسیوں پر بڑی شان سے بیٹھے تھے۔

”میرے بچو! میرے باپ نے جب ہم بھائیوں میں جائیداد تقسیم کی تھی تو ایک ہی جملہ کہا تھا۔ ”کبھی کبھی کو اتنا منہ نہ لگانا کہ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کریں۔ اگر کبھی ایسا وقت آئے کہ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کریں تو ان کی آنکھیں نکلوا دینا۔ اس کے بغیر تم کبھی ان پر حکومت نہ کر سکو گے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے ہمیں ہمارے کاغذات دیئے تھے۔ مگر میں تمہیں یہ نہیں کہوں گا۔ تم نئے دور کی پیداوار ہو، تم کو تو یہی نصیحت کروں گا کہ تم ان حزاروں اور اپنے گاؤں کے لوگوں سے محبت سے پیش آنا کیونکہ خدا نے ان پر ہمیں حکمراں بنایا ہے اور ان پر کوئی ظلم نہ کیا جائے کیونکہ میں نے اپنے باپ کے حکم پر چل کر بہت بڑی سزا پائی ہے۔ آخری وقت میں رتو نے میرا ساتھ دیا، حتیٰ کہ میری اولاد بھی میری چیخوں سے ڈر گئی مگر نہ ڈرا تو رتو..... ان سے محبت کرو گے تو یہ اپنا تن من دھن سب کچھ لٹا دیں گے۔ میں نے اپنی جائیداد میں سے رتو کا حصہ بھی نکالا ہے۔ اس کی خدمتوں کا صلہ تو میں دے بھی نہیں سکتا، مگر پھر بھی.....“

چودھری سرفراز ذرا دیر کے لئے رُکے، پھر بولے۔

”وکیل صاحب! اب آپ کو اجازت ہے۔“

”شکر یہ چودھری صاحب!“ وکیل وسیم خان کھڑے ہو گئے۔

”چودھری سرفراز علی ولد چودھری دولت علی آف حسن پور اپنی وصیت کے مطابق اپنے بچوں میں زمینوں کی تقسیم اس طرح کرتے ہیں کہ چودھری طالب علی کو اٹھارہ مربع اور تین باغات، جن میں سے تین مربع حسن پور کے گرد و نواح کے ہیں اور باقی گیارہ شہر سے دور متی تل میں۔ چودھری شجاعت کو بھی اتنی ہی زمین اور تین باغ، چودھری شوکت علی کے بھی اٹھارہ مربع تین باغات۔ یہ سب کے سب ”دنیا پور“ میں ہیں۔ یعنی دنیا پور کی پوری زمین چودھری شوکت علی کی ہے۔ اور رتو کو حسن پور ہی میں ایک مربع زمین اور ایک آموں کا باغ۔“

وکیل صاحب نے خاموش ہو کر سب کی طرف دیکھا۔ سب خاموش تھے۔ بس رتو، چودھری کے ہاتھ پر سر ٹیکے کہہ رہا تھا۔

”چودھری جی! یہ بہت ہے، میری حیثیت سے بڑھ کر آپ نے دیا ہے۔ مجھے یہ نہیں چاہئے۔ دولت آنے کے بعد انسان ظالم ہو جاتا ہے۔“

”اوائے پگے! جن کا خون اچھا ہو، وہ کبھی ظالم نہیں بنتے۔“ انہوں نے رتو کی پیٹھ پٹکی۔

”پھر آپ.....؟“ رتو کچھ پوچھتے پوچھتے رُک گیا۔

”میرا بیوی بہت ظالم تھا، رتو! خون کا کچھ تو اثر آتا تھا۔“

پھر چودھری سرفراز علی خاموش ہو گئے۔ وہ دل میں سوچ رہے تھے کہ میں رتو کو کیا بتاؤں کہ میرے باپ نے مجھے جیتے جی جہنم میں دھکیل دیا تھا۔ خون کا بھی اثر ہوتا ہے اور ماں کی بیٹیں دھاروں کا بھی۔ میری ماں ایک کجری تھی، نت نئے مردوں کی ہانہوں میں سمانے والی۔ اور پھر جب چودھری دولت علی کی ان پر نظر پڑی تو وہ ان کی بیوی بن کر ”رنگ محل“ میں آ گئی۔ مگر اثر تو باقی رہتا ہی ہے نا۔ سنا تھا کہ جب چودھری سرفراز علی صرف چھ ماہ کا تھا تو وہ بھاگ گئی تھی۔ کیونکہ ایک ہی آدمی کے پاس رہتے رہتے وہ اوب گئی تھی۔ بھلا آزاد پنچھی کبھی پنچروں میں قید ہوئے ہیں؟ یوں ماں کے دودھ کے ساتھ کیننگی کے جراثیم بھی سرفراز کے خون میں سرایت کر گئے اور وہ نت نئی عورتوں میں ہی سکون پایا کرتے۔

”اور چودھری صاحب! یہ حویلی؟“ پٹواری کی آواز نے انہیں خیالات سے چونکا دیا۔

”یہ..... یہ حویلی..... اس میں میرے تین بچے رہیں گے۔ یہ رنگ محل میرے باپ

نے میری ماں کی فرمائش پر بنوایا تھا، اس لئے یہ حویلی میرے سارے بچوں کے استعمال میں رہے گی۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا۔ پھر اشارے سے شوکت علی کو قریب بلایا۔ وہ شوکت کو اپنے اور بیٹوں کی نسبت زیادہ چاہتے تھے۔ شوکت علی قریب پہنچے تو آہستہ سے بولے۔

”پتر اوئے!..... تُو دل چھوٹا نہ کر، مجھے بڑا شوق تھا تیرے بچے دیکھنے کا، ان کو گود میں کھلانے کا۔ مگر چار سال سے اوپر ہونے کو آئے ہیں، تُو نے مجھے پوتا نہیں دیا۔“ انہوں نے شوکت علی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”بابا.....!“ شوکت علی صرف اتنا کہہ کر رہ گئے۔

”تُو اُداس نہ ہو، اگر بچے نہ ہوں تو تُو دوسری شادی کر لینا۔ میرے خاندان میں کبھی بھی کسی نے دوسری شادی نہیں کی، سوائے میرے باپ کے۔ لیکن تجھے اجازت ہے میرے پتر!“ چودھری سرفراز کہتے رہے اور وہ سر جھکائے سنتا رہا۔ ”سب بھائی مل جل کر رہنا، طالب اور شجاعت! یہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے اور چھوٹا بھائی اولاد کے برابر ہوتا ہے۔ اس کا خیال رکھنا، پتر!“

”بہتر بابا!“ دونوں نے سر جھکا کر جواب دیا۔

رات ہوئے ہوئے گزری اور دن طلوع ہو گیا۔ وہ پوری رات انہوں نے چودھری سرفراز علی کے کمرے میں گزاری تھی۔ اور پھر جن کی زندگی اللہ تعالیٰ نے مشکل بنا رکھی تھی، ان کی موت اس قدر آسان ہو گئی کہ پتہ بھی نہ چلا۔ ٹھیک دو روز بعد چودھری سرفراز علی دنیا سے کوچ کر گئے۔ رتو نے بتایا تھا کہ آج پہلی رات وہ اُس کے پنا سونے تھے اور چیخے



چلائے بھی نہیں تھے۔ رات کے دو بجے انہوں نے ساتھ کی مسہری پر سوائے رتو کو جگایا اور کہا کہ اُن کا قبیلے کی طرف منہ کر دے۔ رتو نے قبیلے کی طرف اُن کا منہ کیا تو انہوں نے اشارے سے نماز پڑھی، دعا مانگتے ہوئے روتے رہے اور کلمہ پڑھتے ہوئے ایک دم پُرسکون ہو گئے۔ رتو نے انہیں ہلایا جھلایا بھی، مگر روح تو عالم بالا کی طرف کوچ کر گئی تھی۔

بے شمار لوگوں نے اُن کے جنازے میں شرکت کی اور وہ سب کئی ہی تھے، کوئی رئیس نہیں تھا، اُن کے جنازے میں۔ چودھری آج تک کسی کے جنازے میں شریک نہ ہوئے تھے اور پھر کسی کئی کے جنازے میں شرکت کرنا تو اُن کی شان کے خلاف تھا اور آج وہی کئی تھے، جو اُن کے جنازے کو کندھا دیئے ہوئے قبرستان لائے تھے اور انہی نے اُن کے بیٹوں کے ساتھ مل کر لحد میں اتارا تھا۔

گاؤں میں کئی روز تک سوگ منایا گیا۔ غریب لوگوں میں پیسے، کپڑے اور اناج تقسیم کیا گیا۔ قُل، دسویں اور چہلم پر لاتعداد غرباء کو کھانا کھلایا گیا۔

مرنے والوں کے ساتھ کوئی مر نہیں جاتا اور نہ ہی وہ اتنے یاد آتے ہیں۔ ان کے مرنے کے بعد سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ شجاعت اور طالب اپنی اپنی زمینوں پر چلے گئے۔ رنگ محل میں صرف شوکت علی رہ گئے۔ جب دو ہفتے بعد دونوں بھائی لوٹے تو شوکت علی نے بھی ”دنیا پور“ جانے کی تیاریاں کر لیں۔

”مجھے بھی لے چلیں چودھری!“ زہرہ بیگم نے کہا۔  
”پھر کبھی زہرہ! ابھی نہیں۔ ابھی تو نیا نیا کام ہے نا۔“ انہوں نے صاف انکار کر دیا اور زہرہ دل مسوس کر رہ گئیں۔ وہ تو اُن کی کڑی نگرانی کرنا اور سائے کی طرح لگی رہنا چاہتی تھیں، مگر شوکت علی نے صاف انکار کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

دینو ایک غریب کارندہ تھا، جو چودھری شوکت علی کے ہمیشہ ہی ساتھ رہتا تھا۔ وہ دونوں دنیا پور صبح نور تڑکے ہی پہنچ گئے تھے۔ دنیا پور میں بھی ان کی سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی، خوب صورت سی حویلی تھی، جس کے بڑے بڑے دروازے اور بلند چوہارے تھے۔ حویلی کا مٹن کچا تھا اور مٹن میں شیشم اور نیم کے درخت لگے ہوئے تھے۔ یہ حویلی، جہاں وہ آئے تھے، اُن کا ہیڈ کوارٹر تھی۔ یہاں صرف چار خاندان آباد تھے جو کہ ان کی زمینوں پر کاشت کرتے تھے۔ ایک کوس کے فاصلے پر ایک کنواں تھا، جہاں مزید تین چار خاندان آباد تھے۔ بس یونہی دو دو، چار چار گھر پوری زمینوں پر پھیلے ہوئے تھے اور چودھری شوکت علی کو ہر جگہ جانا تھا۔ اتنی زمین تھی کہ سب سے ملنے چلنے کے لئے انہیں پورا ہفتہ درکار تھا۔ شام کو جتنے بھی لوگ ان کی زمینوں پر کام کرتے تھے، وہ سب حویلی میں جمع تھے۔ سب سے پہلے تو

بڑے چودھری سرفراز علی کی وفات پر تعزیت کی اور چودھری شوکت علی کو خوش آمدید کہا۔ پھر وہ سب ان سے وفادار رہنے کا عہد کر کے لوٹ گئے۔

چودھری شوکت علی گھوڑے پر بیٹھ کر دینو کے ہمراہ روز اپنی زمینوں کا چکر لگاتے۔ وہ بہت خوش تھے۔ جدھر نظر اٹھاتے، ہریالی ہی ہریالی اور سبزہ ہی سبزہ نظر آتا۔ مست ہوا کی چھینر چھاڑ سے جھومتے ہوئے پودے، حد نظر تک اُن کی زمینیں تھیں۔ وہ پہلے بھی یہاں آتے تھے، مگر اتنی خوشی کبھی نہ ہوئی تھی۔ شاید اپنے مالک ہونے کا احساس انہیں خوشی بخش رہا تھا، اپنی چیز کا غرور اور اپنی ملکیت کا احساس۔

چودھری شوکت علی کو دنیا پور آئے پورے پانچ روز ہو چکے تھے۔ وہ شام کو گھوڑے پر سیر و تفریح کے لئے نکل جاتے تھے۔ دینو بھی ان کے ہمراہ ہوتا تھا۔ وہ تفریح کے بعد حویلی کی طرف واپس آ رہے تھے کہ ایک دم ٹھٹھک سے گئے۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ دینو نے بھی گھوڑا روک کر اُن کی نظروں کا تعاقب کیا۔ نہ جانے وہ کون تھی، اکہرے بدن کی نازک سی لپکتی ہوئی شاخ کی طرح، کچی کھنار کی مانند..... اُس نے دوپٹے کو بالوں کی سیاہ ناگن میں لپیٹ کر کمر پر چھوڑ رکھا تھا اور کنوئیں سے گھڑوں میں پانی بھر رہی تھی۔ چودھری شوکت علی آہستہ سے گھوڑے سے اترے، جیسے خواب سے جاگ جانے کا خدشہ ہو، سینا بکھر جانے کا ڈر ہو۔ گھوڑے کو وہیں چھوڑ کر وہ کنوئیں کی جانب بڑھ گئے۔

وہ بڑے موڈ میں تھی اور ہولے ہولے بابا فرید کی کافی گنگنا رہی تھی۔

پیلو پکیاں وے..... آچنڑوں رل یار

چودھری شوکت علی دھیرے سے مسکرا دیئے۔ اُس کی آواز واقعی خوب صورت تھی، جیسے کہ سرسراتی ہوئی ہوا۔ آہٹ پر اُس نے پلٹ کر دیکھا اور اُس کی آنکھوں میں حیرت کا طوفان موجزن ہو گیا۔ دوپٹے کے بل کھل گئے۔ وہ حیرت سے پلکیں جھپک رہی تھی۔ پھر اُس کے ہونٹ کپکپائے۔

”تم کون ہو؟“

”نہیں پہچانا؟“ وہ مسکرائے۔

”ناں۔“ اس نے نہایت معصومیت سے گردن ہلا دی۔

تب چودھری شوکت علی کا دل چاہا، وہ کہیں۔ ”تم نے نہیں پہچانا، حیرت ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے، جیسے ہماری جنم جنم کی جان پہچان ہو، ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے ہی پیدا ہوئے ہوں۔ اے میرے خوابوں کی حسین شہزادی! میں تو زہرہ کے پاس ہونے کے باوجود بھی خیالوں میں تم سے مخاطب رہتا ہوں۔ لوگ کس طرح کہتے ہیں کہ خیال صرف خیال ہوتے ہیں، ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا؟ اگر وہ خیال تھا، وہ خواب تھے تو پھر یہ



حقیقت کیسی؟ تم بالکل وہی ہو، میرے خیالوں کی ملکہ، میرے ذہن کا تراشا ہوا صنم.....  
میرے من کی دیوی۔“  
”گھور گھور کر کیا دیکھ رہے ہو؟..... کون ہو؟“ اس نے نہایت کڑک دار آواز میں پوچھا۔

تب وہ خیالوں سے حقیقت کی دنیا میں آ گئے۔ حالانکہ انہوں نے اسے دیکھا ہی کب تھا۔ وہ تو اب اسے دیکھ رہے تھے۔ گندی، پرکشش سی رنگت، گول چہرہ، جس پر سیاہ آنکھیں اور لابی لابی پلکوں کی جھال، گلاب کی پتھریوں جیسے ہونٹ، جن پر قدرتی لالی تھی۔ ناک میں چھوٹی سی سرخ نگ والی لوٹک اور بے شمار پسینے کے قطرے، جو موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ نازک سابدین، چھینٹ کی چولی، پھول دار لالچے اور رنگ برنگی چٹری میں وہ اُن کے دل میں کبھی جا رہی تھی، اندر ہی اندر اُتری چلی جا رہی تھی۔

پھر وہ کچھ نہ بولی، جھک کر گھڑا اٹھایا اور اُسے سر پر رکھا، دوسرے کو ایک ہاتھ سے اٹھا کر کمر پر رکھ لیا اور آگے بڑھ گئی۔ تب اُس کی پازیب بچ اُٹھی۔ شوکت علی کو یوں محسوس ہوا، جیسے پازیب کے ننھے ننھے گھنگھرو اُن کے دل کے آنگن میں بچ رہے ہوں اور وہ ان کی جھنکار سے مدہوش ہوئے جا رہے تھے۔

”سنو“ چودھری شوکت علی اُس کی طرف بڑھے۔ جھنکار ایک دم رُک گئی۔

”کیا ہے؟“ اُس نے ابرو چڑھا کر کہا۔

”تم کون ہو؟“ انہوں نے پُر شوق نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
”کوئی مطلب ہے؟..... پہلے میں نے تیرے سے پوچھا تھا کہ تُو کون ہے؟“ اُس کا لہجہ بالکل خشک تھا۔

”کب پوچھا تھا؟“ چودھری شوکت علی نے ہونٹ دانتوں تلے دبائے۔

”جھوٹ بول لے۔ خدا بخشے گا نہیں۔“ اُس نے نصیحت آمیز لہجے میں کہا۔

”تُو بخش دے گی تو وہ بھی بخش دے گا۔“ شوکت علی مسکرا دیے۔

”تو بہ کر..... کیا کفر بولتا ہے تُو۔“

”اچھا بتاؤ، تم کون ہو؟“ چودھری نے اصرار کیا۔

”پہلے تُو بتا؟“ وہ اڑ گئی۔

”شرمندگی تو نہیں ہوگی؟“

”شرمندہ ہو میری جوتی۔“ وہ تنک کر بولی۔

”میں شوکت علی ہوں۔“ انہوں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا۔

”یعنی شوکت علی چودھری.....؟“ اُس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا، گھڑا چھوٹ

کر نیچے جا رہا اور متعدد دنگڑوں میں بکھر گیا۔

”ڈر گئی؟“ چودھری شوکت علی نے جھک کر پوچھا۔

”واہ..... میں کیوں ڈروں؟“ وہ اکڑ کر بولی۔ مگر اُس کے گالوں کی زردی بتا رہی تھی کہ وہ واقعی خوف زدہ ہو گئی ہے۔ اُس کا چہرہ دلی جذبات اور خوف کو چھپانے میں ناکام رہا تھا۔

”مجھے پتہ ہے کہ تُو ڈر گئی ہے۔ چاہے تُو نہ بتا۔“ چودھری شوکت علی نے اُسے چھیڑا۔  
”چل اب بتا، تُو کون ہے؟“

”حیرت ہے، مالکوں کو پتہ نہیں کہ ان کی زمینوں پر کون کون رہتا ہے؟“ اس نے طنز کیا۔

”تم بتاؤ تو پتہ چلے۔“ وہ اس کے طنز کو نظر انداز کر گئے۔

”میرا بابا نشی ہے تمہارا۔“

”اوہ..... تم چاچا دتہ کی بیٹی ہو؟“

”بڑی مشکل سے پہچانا ہے تم نے۔“ وہ ہونٹ چبا کر بولی۔

”نہیں، میں نے تو آسانی سے پہچان لیا تھا۔ اچھا اب ناں بھی بتا دے۔“ چودھری شوکت علی بولے۔

”نوراں۔“

”بہت خوب صورت۔ تم بھی تو سراپا نور ہو۔ تمہارا نام بھی تمہاری ہی طرح خوب صورت ہے۔“ انہوں نے نہایت لگاؤ سے کہا اور نہ جانے کیوں، وہ اس تعریف پر سرخ ہو گئی، اُس کے گال تہمتا اُٹھے۔

”چودھری! اب اس گھڑے کا ہر جانہ کون دے گا؟ بابا تو میری ہڈیاں توڑ دے گا۔“ اس نے ٹوٹے ہوئے گھڑے کی طرف اشارہ کیا۔

”میں دے دوں گا۔“ چودھری شوکت علی آگے بڑھے۔

”مہربانی کی ضرورت نہیں۔ میں تو محول کر رہی تھی۔“ نوراں نے جلدی سے سر سے گھڑا اتارا اور کمر پر رکھ لیا۔ پھر وہ رُکی نہیں، تیز تیز چلی گئی۔ چودھری شوکت علی اُسے جاتا دیکھتے رہے۔ پازیب کے ننھے ننھے گھنگھروؤں کی چھن چھن اُن کے کانوں میں امرت گھولنے لگی تھی۔ نہ جانے وہ کتنی دیر اسی پوزیشن میں کھڑے رہتے، اس راستے کو تکتے رہتے، جہاں سے وہ گئی تھی، مگر دینو نے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”چودھری! اب تو وہ ظالم چلی گئی۔“

”ہاں دینو! ٹھیک کہتے ہو۔ واقعی، وہ بہت ظالم تھی، جو ایک ہی نظر میں چودھری شوکت



علی جیسے آدمی کا دل لے گئی، اسے کنگال کر گئی..... مگر اس ہار میں بھی مزا آ رہا ہے، بہت لذت ہے اس ہار میں۔“ وہ دھیرے سے بولتے رہے اور دینو کے ساتھ حویلی واپس آ گئے۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ بہت مضطرب تھے۔ بڑی دیر تک ٹہلتے رہے، پھر انہوں نے مغرب کی سمت کی کھڑکی کھول دی اور پردے ہٹا دیئے۔ ڈوبتے سورج کی لالی بے حد خوشنما اور بھلی معلوم ہو رہی تھی مگر ان کے ذہن میں تو نوران تھی۔ نرم و نازک سی نوران۔ ان کے خیالوں کی ملکہ، اُن کے دل کی رانی..... شوکت علی کا دل نوران سے مل کر نئی نئی خواہش کرنے لگا تھا۔ بڑے نرم و نازک سے احساسات پیدا ہو گئے تھے۔ دل نوران کے نام کی مدھرنے پر رقص کر رہا تھا۔ ایسا تو کبھی بھی نہ ہوا تھا۔ وہ زہرہ کے پاس ہوتے، تب بھی اتنے لطیف و شدید احساسات ان کے دل میں پیدا نہ ہوتے تھے۔ زہرہ، جو کہ اب بالکل سرد ہو چکی تھیں اور اب چودھری شوکت علی بیوی کے ساتھ ساتھ ایک محبوبہ کی بھی خواہش رکھتے تھے، جو بیوی بھی ہو اور محبوبہ بھی..... وہ شروع ہی سے زہرہ بیگم سے دبتے تھے۔ اس لئے کہ وہ اُن سے بڑی تھیں۔ آپا سے بیوی بن گئی تھیں۔ اور اتنی چھوٹی سی عمر میں انہیں پتہ ہی نہ تھا کہ بیوی کیا ہوتی ہے۔ مگر اب شادی کو اتنے سال ہو گئے تھے اور انہوں نے اسے بیوی بھی بنا لیا تھا۔ لیکن دل کے کچھ اور ہی تقاضے تھے۔ مرد کی یہ فطرت عجیب ہے کہ عورت پسند نہ ہو، تب بھی اسے دھوکا دیتا ہے اور ظاہر کرے گا کہ وہ دنیا میں سب سے زیادہ اسے ہی چاہتا ہے، چاہے باہر کہیں بھی منہ مارتا رہے۔

نوران بالکل اسی طرح تھی، جیسا کہ ان کا بیوی کے لئے تصور تھا۔ اسے دیکھ کر جس انداز میں ان کا دل دھڑکا تھا، اس نے ان پر عجیب سی کیفیت طاری کر رکھی تھی۔ دل اسے اپنانے اور اس کے قرب کے لئے مچلا جا رہا تھا۔ تب ہی دینو کھانے کی ٹرے اٹھائے اندر آ گیا۔

”چودھری جی! کھانا کھالیں۔“ اس نے میز پر ٹرے رکھ دی۔ چودھری شوکت علی پلٹے اور دینو کو مسکرا کر دیکھا، جو انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”بھوک نہیں ہے۔“

”کیوں؟“ دینو نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیوں بھوک نہیں؟“

”بھوک تو وہ لے گئی۔“ چودھری شوکت علی کے ہونٹوں پر تبسم مچل گیا۔

”چودھری! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟..... کہاں وہ گئی اور.....“

”دینو.....!“ شوکت علی غرائے۔ ”تُو مجھے سبق نہ پڑھا۔ وہ گئی نہیں ہے۔ وہ اس

دل میں ہے۔“ انہوں نے سر سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”اور جو لوگ چپکے سے دل میں بسیرا کر لیں، ان کی پہچان نہیں رہتی کہ وہ گئی ہیں یا اونچے۔“ وہ بے خودی کے سے عالم میں بولے گئے۔

زہرہ بیگم کی کڑی نگرانی سے وہ باہر نکل آئے تھے اور ویسے بھی دل پر تو کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ دل کے فیصلوں پر ذہن کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ دل کے فیصلے ذہن کو مفلوج کر کے رکھ دیتے ہیں۔

”جیسی مرضی مالک کی!“ دینو نے سر جھکا لیا۔

”میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ چودھری شوکت علی نے ایک دم سے دھماکا کر دیا۔ دینو اس دھماکے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس نے سر اٹھا کر اپنے مالک کو دیکھا، جو قیمتی ایرانی قالین پر ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔ دینو کی آنکھوں میں ان گنت سوالات تھے۔ وہ بڑی مشکل سے بولا۔

”مالک! آپ.....؟“

”ہاں دینو!“ چودھری شوکت علی نے اس کی بات کاٹی۔ مدھرمدھرم مسکان ان کے ہونٹوں پر مچل رہی تھی۔ ”میں نے ابھی ابھی فیصلہ کیا ہے۔ کنوئیں پر دیکھتے ہی اُسے میں دل کی رانی بنا چکا تھا اور اب اُسے اس حویلی کی زینت بنانا چاہتا ہوں..... وہ سراپا نور ہے۔ وہ آسمان پر چمکنے والا میری قسمت کا ستارہ ہے، اس لئے یہ ستارہ میرے آنگن میں ضرور چمکے گا۔ میں اب تک اسی کی تلاش میں تھا۔ میں آج تک اسے خیالوں ہی خیالوں میں چاہتا رہا ہوں۔ آج وہ خیالوں سے حقیقت کا روپ دھار چکی ہے۔ اب میں اُسے شدت سے چاہوں گا۔ وہ میری ہے اور صرف میری۔“ چودھری شوکت علی کہتے رہے اور دینو منہ کھولے حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتا ہوا انہیں تکتا رہا۔





”مالک! جب میں لیٹا تھا تو آپ کھڑکی میں کھڑے تھے۔“ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔  
 ”ہاں، ہاں.....!“ چودھری شوکت علی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”جاؤ، ناشتے کا انتظام کرو۔“

دینو جلدی سے کمرے سے نکل گیا۔ چودھری شوکت علی اٹھے اور کھڑکی کی طرف آئے، جہاں رات بھر وہ کھڑے رہے تھے، رات کے مسافر چاند کو تکتے رہے تھے، جو کبھی شیشم اور کبھی نیم کے درختوں کے نیچے چھپ جاتا اور پھر نکل آتا۔ یہ آنکھ پھولی انہیں بہت بھلی لگی تھی۔ بعض مرتبہ تو انہیں چاند میں ایک ہنستا مسکراتا چہرہ بھی نظر آتا اور یہ چہرہ نوراں کا ہوتا، جیسے وہ پوچھ رہی ہو۔

”ارے چودھری! بڑے دل پھینک معلوم ہوتے ہو۔ ایک مرتبہ دیکھا اور دل ہار گئے۔“

”تمہیں کیا معلوم نوراں! کہ پہلی نظر کیا ہوتی ہے۔ یہ دل کے آر پار ہو جاتی ہے۔ آدمی اپنے اختیار میں نہیں رہتا۔ تم نے تو ہماری نیندیں تک چرا لی ہیں۔“ یہ سوچتے ہوئے انہوں نے مسکرا کر پردے گرا دیئے اور نہانے کے لئے غسل خانے کی طرف بڑھ گئے۔  
 غسل کے دوران بھی وہ مدہوش سے تھے۔ ٹھنڈا پانی ان کے اندر کی تپش کو کم کرنے میں معاون ثابت ہو رہا تھا۔ پھر وہ خواجہ غلام فرید کا کلام گنگنانے لگے۔

”ایہ نازک نازک جلیاں — راتیں کرن شکار دلاں دے — ڈیہناں ولوڑن میاں“

وہ نہا کر غسل خانے سے نکلے ہی تھے کہ دینو ناشتے کی ٹرے سجائے کمرے میں آ گیا۔  
 ”اوئے دینو! کیا پکایا ہے تُو نے؟“ چودھری شوکت علی نے اُس کی پیٹھ پھکی۔  
 ”مالک!“ دینو ہنسا اور ٹرے میز پر رکھ کر نیچے بیٹھ گیا۔ ”چودھرائی نے مکھن دیا تھا، وہ ہے اور آپ کو آلو بھری روٹیاں پسند ہیں نا، بس وہی پکائی ہیں۔ مکھن سے کھالیں، پھر لسی پی لیں۔“ دینو نے بیسی نکال دی۔

”دینو!“ انہوں نے نہایت نرم لہجے میں پکارا۔

”جی مالک؟“

”یہ ناشتہ ہے؟“ انہوں نے چیگر میں پڑی دو روٹیوں اور ان پر رکھے مکھن کی طرف اشارہ کیا۔

”مالک! یہ گھر نہیں ہے، جہاں درجنوں قسم کے کھانے بڑی میز پر رکھے جاتے ہیں۔ یہ تو ایک سرائے ہے مالک!“ وہ نہایت انکساری سے بولا اور گلاس میں لسی اٹھ پلنے لگا۔  
 ”اسی لئے میں اس حویلی کو بھی گھر بنانا چاہتا ہوں، دینو! اس کو تم نے سرائے بنا دیا ہے

کتنی سہانی تھی دنیا پور کی صبح۔  
 کھڑکی کے شیشوں سے چھن چھن کر آنے والی سورج کی نرم نرم، سونے کے تاروں جیسی روشن کرنوں نے جب چودھری شوکت علی کے جسم کو چھوا تو انہوں نے کسمسا کر کروٹ بدل لی۔ وہ بہت حسین پسندا دیکھ رہے تھے۔ ایسا پسندا کہ جی چاہتا تھا، اسی میں کھوئے رہیں۔ مگر جب کرنوں کی یورش بڑھتی چلی گئی تو انہیں اٹھتے ہی بنی۔ بدن ٹوٹ رہا تھا اور یوں لگتا تھا، جیسے وہ پوری رات نہ سوئے ہوں۔ یہ حقیقت بھی تھی کہ وہ سونہ سکے تھے۔ بہت رات گئے نیند آئی تو خیالوں میں بس جانے والی وہ کافر ادا نوراں بھی ساتھ ہی خوابوں میں آ گئی۔ انہوں نے اس سے ڈھیروں باتیں کی تھیں، اُس کے سنگ پورے ”دنیا پور“ کے کھیت دیکھ ڈالے تھے، مگر پھر بھی نہ تھکے تھے۔ اور جب جاگے تو مارے ٹھکن کے برا حال تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے خواب کی حالت میں نہیں بلکہ حقیقت میں وہ نوراں کے ساتھ بہت دُور تک چلے گئے تھے۔ انہوں نے مسہری کی پشت پر لگے بڑے سے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا، ادھوری نیند کا خمار آنکھوں میں سرخ ڈورے بن کر تیر رہا تھا اور ہونٹوں پر بڑی سُندر مسکان پھیلی ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے گردن گھما کر دینو کی طرف دیکھا، جو نیچے قالین پر سکڑا سمٹا بے خبر سویا ہوا تھا۔

”بڑے خوش نصیب ہو، دینو! کتنی سکھ کی نیند سو رہے ہو۔ تمہاری ذرا سی غلطی نے میری نیند خراب کر دی، میرا پسندا توڑ دیا۔ اگر رات کو تم کھڑکی کے پردے گرا دیتے تو.....“ بس وہ آگے کچھ نہ سوچ سکے۔

”دینو! اٹھ جا..... دیکھ کتنا دن چڑھ آیا ہے۔“ انہوں نے کہا تو دینو ہڑبڑا کر آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

”رات تُو نے کھڑکی کے پردے کیوں نہیں گرائے؟“ چودھری شوکت علی نے کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا، جہاں سے اب کرنوں کا ریلا اندر آ رہا تھا۔



اور نورائے خوب صورت ہاتھ اسے جنت بنا دیں گے۔“ چودھری شوکت علی بے خود ہو کر بولے گئے اور دینو کے ہاتھ سے لسی کا بھرا ہوا جگ چھلک گیا۔

”مالک!.....!“ دینو منمنایا۔

”دینو! میں بہت پریشان ہوں۔ بتاؤ، وہ مجھ سے شادی کرنے پر راضی ہو جائے گی نا؟“ انہوں نے دینو کو جھنجھوڑ ڈالا۔

”مالک! آپ فضول ہی پریشان ہوتے ہیں۔ وہ لڑکی آپ کے شایان شان نہیں ہے۔“

”کیوں نہیں ہے؟“ وہ غرائے۔

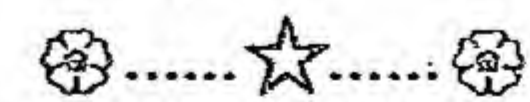
”آپ چاہیں گے تو وہ یہاں آجائے گی۔“ دینو ہولے سے آنکھیں چرا کر بولا۔

”دینو!.....!“ چودھری شوکت علی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کی آنکھیں آگ برسا رہی تھیں۔ دینو بھی گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”دینو! اگر تو میرا بچپن کا یار نہ ہوتا تو قسم رب کی، میں تیرے ٹوٹے کر دیتا اور تیری بوٹیاں کتے نوچتے پھرتے۔ او پاگل دے پتر! میں اُسے بیوی بنانا چاہتا ہوں۔“

”بیوی تو آپ کی چودھرائی ہیں۔“ دینو نے دل کڑا کر کہا۔

”کیا دیا ہے اُس نے مجھے؟ ہمیشہ گود میں کھلانے کا طعنہ، تلخ باتیں۔ اور کیا دیا ہے اُس نے؟ ایک بچہ تو دے نہ سکی کہ میں کہوں اس نے مجھے کچھ دیا ہے۔ مجھے باپ تک تو بنا نہ سکی۔ دینو! تجھے کیا پتہ، میرا کتنا دل چاہتا ہے کہ میں گھر جاؤں تو کوئی ننھی ننھی ہانپیں پھیلا کر ”بابا“ کہہ کر مجھ سے لپٹ جائے۔ باپ بننے کا میرا ازلی حق ہے، مجھے اپنا کمرہ قفس لگتا ہے، جس میں میرا دم گھٹتا ہے۔ زہرہ کے پہلو میں لیٹ کر یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ مجھے لوریاں دے رہی ہو۔ مجھے بیوی چاہئے، آیا نہیں۔ مجھے اپنی جائیداد کا وارث چاہئے، سمجھے تم..... اور اگر نورائے میری بن جائے تو مجھے بیوی بھی مل جائے گی اور وارث بھی۔ کیا خیال ہے تمہارا، میں نے ٹھیک کہا ہے نا؟“ چودھری شوکت علی نے دینو کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”جی مالک!..... آپ مختار ہیں۔“ دینو نے سر جھکا لیا۔ وہ تو صرف نوکر تھا۔ جو کچھ چودھری نے کہا تھا، اس کے جواب میں اُسے ہاں ہی کہنا تھا۔ حالانکہ اس کا دل نہیں مان رہا تھا۔



اُفق پر سونا پگھل رہا تھا۔ چودھری شوکت علی، دینو کے ہمراہ پیدل ہی کھیتوں کی طرف نکل آئے تھے۔

”مالک! دھوپ بڑھنے والی ہے۔ گھوڑا لے لیتے تو اچھا تھا۔“ دینو ہانپتے ہوئے بولا۔

”او یونہی ٹھیک ہے دینو! مزہ آتا ہے۔“ انہوں نے چھوٹی سی کسی پھلانگتے ہوئے جواب دیا۔ دینو نے بھی اُن کی تقلید کی، مگر اُس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا حقہ نیچے جا رہا۔ چلم گر چکی تھی اور انگارے ادھر ادھر بکھر گئے تھے۔ کچھ پانی میں بھی گرے تھے، جس کی وجہ سے شوشوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

”ہاتھوں میں کیا جان نہیں ہے دینو؟“ انہوں نے حقے کی ایک جھٹکے سے پھینک دی۔

”مالک! پیر پھسل گیا۔“ دینو نے گھبرا کر کہا اور چلم کو پھر سے حقے پر جما دیا۔

”اوئے تمباکو بھی ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی، میری جیب میں تھیلی ہے۔“ وہ گھبرا کر بولا۔

”اور آگ کدھر سے لائے گا.....؟“ چودھری شوکت علی نے اپنی سیاہ سیاہ آنکھوں کو گھماتے ہوئے کہا۔

”مالک! بس میں یوں گیا اور یوں لے کر آیا۔ آپ فکر نہ کریں۔“ دینو نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ ”آپ ذرا پھریں ٹریں، میں ابھی آیا۔“ اس سے پہلے کہ چودھری شوکت علی کوئی جواب دیتے، وہ ٹھسک گیا۔ شوکت علی آگے بڑھ گئے۔ اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے انہیں بڑا لطف آ رہا تھا۔ حالانکہ پہلے بھی وہ انہی راہوں پر کئی بار چل چکے تھے۔ ان منڈیروں سے کئی بار گزرے تھے، مگر آج بات ہی کچھ اور تھی۔ پہلے وہ اپنے والد کی نمائندگی کرتے تھے، لیکن آج وہ ان سارے سرسبز و شاداب کھیتوں کے تنہا مالک تھے۔

یہ ایک انہوں نے گئے کے کھیت میں آہٹ سنی۔ کٹ، کٹ، کٹ۔ جیسے کوئی گتے توڑ رہا ہو۔ چودھری شوکت بغیر آواز کئے اس جگہ پہنچے اور اندر کا منظر دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہاں گیدڑوں کا ایک غول تھا۔ ایک گیدڑ نے اپنی دُم کو گتے کے گرد لپیٹا اور ایک زوردار جھٹکا دیا تو گناٹوٹ گیا۔ انہیں بے ساختہ ہنسی آگئی۔ گیدڑوں نے انہیں دیکھا تو بھاگ نکلے۔ تب انہوں نے نظام قدرت کو سراہا کہ اس نے بے زبان جانور کو بھی کتنی عقل سے نوازا ہے۔ پھر انہوں نے آگے بڑھ کر ایک گناٹوڑا اور دانتوں سے اُسے چھیل چھیل کر چوسنے لگے۔ آخر دینو کے انتظار میں وقت بھی تو کاٹنا تھا۔ ویسے انہیں اس طرح بہت مزہ آ رہا تھا۔ کتنی آزاد زندگی تھی اُن کی، جہاں زہرہ کا خوف نہیں تھا۔ تنہائی تھی اور سکون تھا۔

اچانک ہی ہوا کے دوش پر ہنسی کی مترنم آواز اُن کی سماعت سے ٹکرائی اور وہ چونک پڑے۔ ہنسی تھی کہ چاندی کے ننھے ننھے گھنگھریلے اُٹھے تھے۔

”لالی! بس کر، زیادہ باتیں نہ بنایا کر۔“ ایک نسوانی آواز ابھری اور یہ آواز اُن کی جانی



پہچانی تھی۔ حالانکہ وہ ایک ہی مرتبہ دل سے چپک کر رہ گئی تھی۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا، سامنے ہی پگڈنڈی پر نوراًں کسی لڑکی کے ساتھ جا رہی تھی۔ چودھری شوکت علی کھیت کے اندر کھڑے تھے، اس لئے ان کی نظر شوکت علی پر نہیں پڑی تھی، مگر ان کی نگاہیں نوراًں پر مرتکز ہو کر رہ گئیں۔ نوراًں کا بدن یوں ٹپک رہا تھا، جیسے بید مجنوں۔ اُس کی ساٹھی لڑکی کے ہاتھ میں مٹی کا برتن تھا، جس میں یقیناً لسی تھی اور اس پر ایک چنگیر رکھی ہوئی تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے چھوٹے چھوٹے کھالے پھلانگ رہی تھیں۔

”واہ دینو! تجھ سے تو یہ لڑکیاں ہی اچھی ہیں کہ تجھ سے حقہ بھی نہیں سنبھالا۔“ شوکت علی آپ ہی آپ مسکرا دیئے۔ وہ بہت خوش تھے کیونکہ جس کے ملنے کی اُمید بھی نہ تھی، وہ یوں اچانک سامنے آ گئی تھی۔ پھر وہ دونوں سامنے جوار کے کھیت کے پیچھے غائب ہو گئیں۔ چودھری نے سوچا، نوراًں یقیناً اپنی سہیلی کے باپ یا بھائی کو روٹی دینے جا رہی ہوگی، ورنہ اس کا باپ تو فشی ہے اور کھیتی باڑی نہیں کرتا۔ ویسے بھی اسے تو میں نے تین روز ہو گئے، حساب کتاب کے لئے دوسرے کنوؤں پر بھیجا ہوا ہے۔ تب ہی انہوں نے دیکھا، دینو تیز بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ ہنس دیئے۔ ویسے بھی جب دل خوش ہو تو بے سبب بھی ہنسنے کو جی چاہتا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی کہ دینو ان کی طرف تیزی سے آ رہا تھا۔ ان کے مزارعے ان کے ایک ہی حکم پر گھبرا جاتے تھے۔ کسی کو بلایا جاتا تو وہ سر کے بل چلا آتا تھا۔ مزارعے نسل در نسل مزارعے تھے اور چودھری شوکت علی نسل در نسل مالک یعنی زمیندار۔ وہ مسلسل ہنسے جا رہے تھے۔

”لیجئے مالک!..... کر دیا حقہ تازہ۔“ دینو نے قریب آ کر حقہ زمین پر رکھ دیا اور نال انہیں پکڑا دی۔

”دینو! آئندہ دھیان سے چلنا۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے۔

”مالک! تھک گیا ہوں..... حقہ بہت بھاری ہے۔ یوں لگتا ہے، جیسے گندم کی بوری اٹھا کر لایا ہوں۔ سانس تو درست کر لینے دیں۔“

”اوتے یہ نئی بات ہے کہ تُو تھک گیا ہے؟“ چودھری شوکت علی نے مونچھ پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

”مالک! پہلے ہو لے ہو لے چلتا تھا نا۔“ دینو نے جواز پیش کیا۔

”اچھا، اچھا..... اب باتیں نہ بنا۔ چل۔“ چودھری شوکت علی نے آگے قدم بڑھا دیئے۔ ظاہر ہے، دل نہ چاہتے ہوئے بھی دینو کو ان کا ساتھ دینا پڑا۔

دن خاصا چڑھ آیا تھا اور سورج کی شعاعیں جسم کے پار ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ دونوں آگے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ دینو کا تھکن کے مارے برا حال تھا۔ تھوڑی ہی دُور ایک

نوجوان منڈیر پر بیٹھا ستارہا تھا۔ سورج کی روشنی میں اس کا مضبوط جسم تانبے کی مانند چمک رہا تھا۔

”اوتے دینو! انہوں نے حقہ گڑ گڑاتے ہوئے کہا۔

”جی مالک! وہ نہایت ادب سے بولا۔

”یہ فشی اللہ دتہ کب تک آجائے گا؟“

”جب کام ختم کرے گا، تو۔“

”کب ختم کرے گا؟“ وہ زور سے پاؤں زمین پر مار کر بولے۔

”مالک! مجھے کیا خبر؟“ دینو سہم گیا۔

”تُو تو بالکل پاگل ہی ہے۔“ چودھری شوکت علی مسکرا دیئے اور دینو کھیانا ہو کر ہنس دیا،

پھر بولا۔

”مگر مالک! آپ کو کیا جلدی ہے؟ آپ اللہ دتہ کے متعلق اتنے بے چین کیوں

ہیں؟“

”میں اس سے نوراًں کو مانگنا چاہتا ہوں۔“ انہوں نے دل کی بات کہہ دی۔

”مالک! آپ نے سوچ لیا ہے؟“ دینو نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”ہاں۔“ انہوں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

”صرف ایک دن بہت نہیں ہوتا۔ ابھی آپ اور سوچیں۔“ دینو نے ہولے سے مشورہ

دیا۔

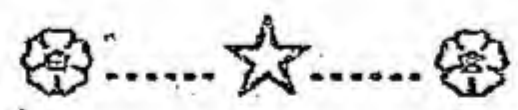
”تُو مجھے عقل سکھانے والا کون ہوتا ہے، دینو؟“ چودھری شوکت علی دھاڑے۔ ”اپنی

کھال میں رہ۔ میرے فیصلے پتھر کی لکیر ہوتے ہیں۔ اگر تیرا دُڈا چودھری بھی قبر سے اٹھ کر آ

جائے تو بھی میرا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔“ وہ مضبوط اور فیصلہ کن لہجے میں بول رہے تھے۔ دینو

سر جھکائے ان کے پیچھے حقہ پکڑے چلتا رہا۔ بالکل ایسے، جیسے پتھر کی مورتی ہو۔ اور پھر بڑی

مشکل سے چودھری شوکت علی کا موڈ درست ہوا تو وہ واپس حویلی کی جانب پلٹے۔



شام گہری ہو چلی تھی۔ شیشم اور کیکر کے درختوں کے لمبے لمبے سائے ڈھلتے جا رہے

تھے، ابھی چودھری شوکت علی نے محفل برخاست کی تھی۔ تمام مزارعے آئے تھے اور انہوں

نے اپنے اپنے مسائل سے انہیں آگاہ کیا تھا۔ کسی کو مکان کی پریشانی تھی کہ بارش کے دنوں

میں کوٹھوں میں پانی آ جاتا ہے، کسی کے پاس ایک بیل تھا اور وہ بیل کے لئے دوسرا بیل بھی

چاہتا تھا۔ چودھری نے کہا کہ کل سے تمہارے مسائل حل کرنے شروع کر دیئے جائیں گے۔

بس ذرا فشی آجائے۔ پھر چودھری شوکت علی اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئے تھے۔ رات



بھر جانے کے سبب طبیعت سخت بوجھل تھی اور ذہن و جسم اتنے تھک چکے تھے کہ پلنگ پر لیٹے ہی نیند نے انہیں اپنی آغوش میں لے لیا۔ پھر نیند اس وقت اچٹ گئی، جب حویلی کے پچھواڑے شور اٹھا۔ سب کی سب نسوانی آوازیں تھیں۔ وہ جھنجلا کر اٹھ بیٹھے۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو ہر سو چاندنی چٹکی ہوئی تھی اور نرم نرم چاندنی نہایت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ جھلا کر پکار بیٹھے۔

”دینو!..... اودینو! کدھر مر گیا، مردود۔“

”جی مالک!..... آیا۔“ کہیں دور سے دینو کی گھبرائی ہوئی آواز آئی، پھر وہ کمرے میں آگیا۔ دروازے کی چوکت پر لڑکھڑایا، مگر سنبھل گیا۔

”کدھر مر گیا تھا؟ یہ شور کیسا ہے؟“ چودھری شوکت علی دھاڑے۔

”او مالک! گڑیاں آنکھ مچولی کھیل رہی ہیں، وہی دیکھ رہا تھا۔“ دینو گڑ بڑا گیا۔

”لگ چھپ کے دیکھ رہا تھا؟“ چودھری شوکت علی نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا۔

”جی..... جی مالک!“ دینو ہکا گیا۔

”اوائے، تُو نے رات بھی یہ کھڑکی بند نہیں کی تھی، اور اب بھی اسی کی وجہ سے آنکھ کھل گئی تھی۔“ انہوں نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

”مالک! بھول ہو گئی۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”چل، نظروں سے دور ہو جا مردود!“ چودھری شوکت علی غصے میں آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ دنیا میں انہیں سب سے زیادہ نیند ہی تو پیاری تھی۔ بیچ و تاب کھاتے ہوئے وہ اٹھے، غصے سے ان کا سفید چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور نتھنے پھڑک رہے تھے۔ وہ کھڑکی میں آئے اور ایک آواز پر چونک پڑے۔

”پکڑی گئی..... نوری پکڑی گئی۔“ ایک شور سا مچ گیا۔

”اب نوری کی اکھاں بند کرو۔“ دوسری لڑکی نے کہا۔ یہ وہی لڑکی تھی، جسے صبح انہوں نے نوراں کے ساتھ دیکھا تھا، یعنی لالی۔ ایک دم ہی ان کی تمام جھنجلاہٹ، بے زاری اور غصے کی کیفیت ختم ہو گئی۔ وہ خود کو تازہ دم محسوس کرنے لگے۔ حویلی کے پچھواڑے آم اور جامن کا یہ وسیع باغ بھی انہی کا تھا۔ انہیں خود پر اختیار نہ رہا اور انہوں نے کھڑکی سے ہی ایک دم باغ میں چھلانگ لگا دی۔ لڑکیاں ادھر ادھر چھپتی پھر رہی تھیں۔ وہ خراہاں خراہاں چلتے ہوئے آم کے درخت تلے چلے گئے، جہاں ہوا کے نرم جھونکے جب پتوں سے سرگوشیاں کرتے ہوئے گزرتے تو ایک عجیب سا ساز بج اٹھتا۔

چودھری شوکت علی ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے بڑی دلچسپی سے پتوں کے چرمر ہونے کی آوازیں سن رہے تھے، جو لڑکیوں کے ادھر ادھر بھاگنے کی وجہ سے ان کے پیروں تلے دب کر

شور مچا رہے تھے۔ کوئی لڑکی بھی ان کی سمت نہ آرہی تھی۔ جب وہ کھڑے کھڑے بور ہو گئے تو آم کے ایک درخت پر چڑھ کر بیٹھ گئے اور پاؤں نیچے لٹکا لئے، اس آس میں کہ شاید نوراں ادھر آجائے۔

کچھ دیر بعد ایک لڑکی ادھر آنکی اور تنے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ شوکت علی کچھ سوچ کر دم سے نیچے کودے تو وہ ایک دم گھبرا گئی، مگر اس کی آواز نہ نکل سکی۔ مارے خوف کے، اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اچھی قبول صورت لڑکی تھی۔

”تم کون ہو؟ گھبراؤ نہیں۔“ چودھری شوکت علی نے نہایت نرم لہجے میں کہا۔

”معافی چاہتی ہوں، چودھری جی! پر کیا کریں؟ ہم گڑیاں کہاں کھیلنے جائیں؟“ وہ گھبرا کر بولی۔

”میں منع تو نہیں کر رہا۔ تم نے اپنا نام نہیں بتایا؟“ انہوں نے نہایت آہستگی سے پوچھا۔

”صغراں جی۔“ وہ تھوک نکل کر بولی۔

”ایک کام کرو، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔“ وہ نہایت لجاجت سے بولے۔

”آپ..... آپ مالک ہیں۔ ہمارے لئے جو حکم۔“ وہ سعادت مندی سے بولی۔

”دیکھو، کسی کو بتانا مت۔“

”نہیں مالک! یہ دل تو کھوہ ہے۔ سمجھیں کہ جو کچھ آپ بولیں گے، کھوہ میں چلا جائے گا۔“ صغراں بولی۔ حالانکہ وہ پیٹ کی بہت ہلکی تھی۔

”تمہارے ساتھ نوراں بھی ہے نا؟..... نشی اللہ دتہ کی بیٹی۔“

”جی..... جی چودھری جی!“ اس نے ہکا کر کہا۔

”اے کسی طرح یہاں لے آؤ۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی؟“ اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”صاف سی بات ہے۔ اُسے میرے پاس لاؤ، یعنی مجھ سے ملو آؤ۔“ چودھری شوکت علی رعب دار آواز میں بولے تو صغراں سہم گئی۔

”جب اس کی باری آئے گی تو میں اسے ادھر ہی لے آؤں گی۔“ صغراں نے جلدی سے کہا۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ جاؤ، لڑکیاں آواز دے رہی ہیں۔“ انہوں نے کہا۔

اس جملے کے زبان سے نکلنے کی دیر تھی کہ وہ تیر کی طرح نکلتی چلی گئی۔ انہیں کھڑے کھڑے کافی دیر ہو گئی تھی اور دل تھا کہ دھڑک دھڑک کر بے حال ہوا جا رہا تھا۔ دل میں عجیب سے احساسات انگڑائیاں لے کر بیدار ہو رہے تھے۔ پتا بھی کھڑکتا تو وہ چونک



اُٹھتے۔

خاصی دیر بعد انہوں نے دیکھا، نوراً آنکھوں پر دوپٹہ باندھے ادھر ادھر ہاتھ چلاتی ہوئی آرہی ہے۔ وہ ہولے ہولے چلتے ہوئے اُس کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ وہ ہاتھ پھیلائے پھیلائے ٹوٹتی ہوئی اُن کے قریب آئی اور لپٹ گئی۔

”پکڑ لیا..... پکڑ لیا۔“ وہ چیخی۔ ”اری تُو کون ہے، جو اتنی موٹی موٹی ہے؟“ نوراً نے ان کے شانے پر ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا مگر وہ خاموش اور گم صم کھڑے رہے۔ نوراً کے کنارے بدن کی مہک انہیں مدہوش کئے دے رہی تھی اور اس کے ہاتھوں کا لمس بدن میں برقی رو بن کر دوڑنے لگا تھا۔ پھر مدہوشی ایک دم ٹوٹ گئی، جسم میں دوڑتی برقی رو رک گئی۔ وہ آسمانوں سے زمین پر آ رہے۔ نوراً نے آنکھوں سے دوپٹہ کھول لیا تھا اور کڑے تیوروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ پھر بھی اس کی زبان سے نہایت شیریں الفاظ ادا ہو رہے تھے۔

”معاف کیجئے، چودھری صاحب! خبر نہیں تھی کہ آپ یہاں کھڑے ہیں۔ آپ نے ہی ٹوک دیا ہوتا۔ میری آنکھوں پر تو پٹی بندھی تھی۔“ اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

”نوراً!“ چودھری شوکت علی جذبات سے چور لہجے میں بولے۔

”جی۔“ نوراً نے نہایت حیرت سے انہیں دیکھا۔

”کیا میرے بے نام جذبات کی تپش تم تک نہیں پہنچی؟ کل سے میں جس آگ میں جل رہا ہوں، تمہیں خبر نہیں؟“ انہوں نے دل کڑا کر کے کہنا شروع کیا۔

”میں سمجھی نہیں، چودھری صاحب!“ نوراً نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت سمیٹ کر کہا۔

”پتہ نہیں، تم کیوں نہیں سمجھ رہیں۔ حالانکہ بات صاف ہے۔“ انہوں نے پُر شوق نظروں سے اُسے دیکھا۔

”چودھری صاحب! بچی میں بھی نہیں۔ آپ نے کل مجھے دیکھا اور اب آپ اس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے آپ سے نہ کوئی دلچسپی ہے اور نہ کبھی ہو سکتی ہے۔ ہم غریب لوگ اپنے ہی جیسوں کو پسند کرتے ہیں۔ آپ آسمان ہیں، پھر زمین پر کیوں آنا چاہتے ہیں؟“

”صرف تمہاری خاطر نوراً!..... صرف تمہاری خاطر۔“ وہ جھک کر بولے۔

”میری خاطر..... ہونہ۔“ نوراً تسخر سے ہنسی۔

”میں تمہیں اپنے گھر کی رونق بنانا چاہتا ہوں۔“ وہ گہمیر لہجے میں بولے۔

نوراً نے کوئی جواب نہ دیا تو انہوں نے کہا۔

”کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں نوراً؟“

چاند کی مدھم مدھم روشنی میں وہ انہیں آہستہ آہستہ دل میں اُترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”چودھری صاحب! اتنی جلدی کوئی فیصلہ نہ کریں۔ جذباتی فیصلے ہمیشہ ناپائیدار ہوتے ہیں۔ جب ہانڈی کا اُبال ختم ہو جاتا ہے تو انسان کو پچھتانا پڑتا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ ”دنیا پور“ کا مالک پچھتاؤں کی آگ میں جلتا رہے۔“ نوراً نہایت ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہی تھی۔ ”دیے بھی مجھے آپ جیسے زمینداروں سے سخت نفرت ہے، جو دوسروں کی عزت کو عزت نہیں سمجھتے۔“

چودھری شوکت علی نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ وہ لڑکی، جو مسلسل اُن کی اکڑی ہوئی گردن کو جھکانے کی کوشش کر رہی تھی، جو اُن کی عزت کو اپنے طنزیہ جملوں سے ملیا میٹ کر رہی تھی۔

”نوراً! تمہیں علم نہیں کہ میں اپنے فیصلے نہیں بدلا کرتا۔ میں جو کرنا چاہتا ہوں، کر گزرتا ہوں اور تُو میرے دل کی اولین تمنا ہے۔ تجھے میں ضرور اپناؤں گا۔“ چودھری نے اُسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ پھر اُسے ایک جھٹکے سے چھوڑ کر تیزی سے مڑے اور چند لمحوں میں وہ کھڑکی پر سے ہوتے ہوئے اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ نوراً حیران و ششدر انہیں جاتا دیکھتی رہی۔ تب ہی صغراں اور لالی آ گئیں۔

”کیا ہوا، نوراً؟“ لالی نے پوچھا۔

”میں نے پہلے ہی تم لوگوں کو منع کیا تھا کہ چھوٹا چودھری آیا ہوا ہے، آج لگ چھپ نہ کھیلیں۔ مگر تم مانی ہی نہیں۔“ اس نے غصہ ان پر اتارا۔

”ہوا کیا؟“ لالی نے اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔

”شادو، کنیر اور نندیراں کہاں ہیں؟“ نوراً نے بات پلٹ دی۔

”وہ گھر چلی گئی ہیں۔ ہم نے ان سے کہہ دیا کہ تُو بھی گھر چلی گئی ہے۔ صغراں نے مجھے بتایا تھا کہ چودھری نے اس سے تمہیں یہاں بھیجنے کو کہا تھا۔“

”کیسی! تُو نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“ نوراً نے لالی کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی صغراں کی خبر لے ڈالی۔ ”تم لوگ بہت خراب ہو، بہت ہی ذلیل ہو۔“ نوراً نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونا شروع کر دیا۔

”بات کیا ہے نوری؟ بتانا؟“ لالی نے اسے لپٹا کر کہا۔

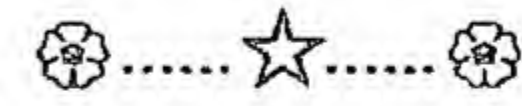
”تمہیں پتہ ہے، ان چودھریوں کا۔ وہ بہت غصے میں تھا۔“ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔

”آخر ہوا کیا؟“



”وہی جوازل سے ہم غریبوں کا مقدر ہے۔“ نوراً نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔  
 ”کیا تجھے حویلی بلا کے گیا ہے؟“ صفراں نے پوچھا۔  
 ”نہیں صفراں! لگتا ہے جیسے وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“  
 ”مگر اُس کی تو پہلے ہی ایک بیوی ہے؟“ لالی نے حیرت سے کہا۔  
 ”ایک پرگزار نہیں ہوتا نا، ان جیسے لوگوں کا۔“ نوراً بولی۔ اس کے لہجے میں نفرت ہی نفرت تھی۔  
 ”تو..... تو راجا کو بلا لے۔ کسی طرح بھی اُسے جلد بلا لے۔“ لالی نے اُسے مشورہ دیا۔

”وہ پچھلے جمعہ تو گیا ہے، اپنی ماسی کے گھر..... اب تک کوئی خبر نہیں آئی اس کی۔“ نوراً نے کہا۔  
 ”میں کریہ کو بھیجوں؟“ لالی نے کہا۔  
 ”چھوڑ پرے۔ پتہ نہیں، اُس کی ماسی کچھ زیادہ ہی بیمار ہو گئی ہو۔ اگر وہ آ بھی گیا تو کیا کرے گا؟“ نوراً دھیرے سے بولی۔  
 ”ہاں، اور کیا؟ ابھی شادی تو کرنے سے رہا۔ اُن کی جوان بہن بیٹھی ہے، ابھی پہلے اُسے بیاہے گا، پھر اپنی فکر کرے گا۔“ صفراں سوچتی ہوئی بولی۔  
 ”تیرا بابا کب آئے گا؟“  
 ”پتہ نہیں، اس کمینے نے اُسے کہاں بھیج دیا؟“ نوراً نے آنکھیں ہتھیلی سے رگڑتے ہوئے کہا۔  
 ”چھوڑ، گولی مار۔ جو رت کرے گا، بھلا ہی کرے گا۔“ لالی نے دسالا دیا۔ مگر اندر ہی اندر وہ بھی سہم گئی تھی۔ اُسے اپنی سہیلی کے دکھ کا احساس تھا۔



ابھی اُجالا بھی نہیں پھیلا تھا اور چودھری شوکت علی کی جیب ”حسن پور“ کی طرف دوڑی چلی جا رہی تھی رات کے پچھلے پہر حسن پور سے گاما اُن کے بڑے بھائی طالب حسین کے ایکسیڈنٹ کی اطلاع لے کر آیا تھا۔ شوکت علی کو اپنے بھائی سے بہت محبت تھی، وہ اسی وقت تیار ہو گئے۔ گاما اپنی سانس بھی درست نہ کر پایا تھا کہ ان کی جیب حسن پور کی طرف تیز رفتاری سے دوڑنے لگی۔ اگرچہ وہ جسمانی طور پر حسن پور کی طرف جا رہے تھے، مگر ان کا دل دنیا پور میں رہ گیا تھا اور اس وقت بھی ان کی سوچوں کا مرکز نوراً تھی۔ نوراً کے اس قدر تلخ رویے کے باوجود بھی دل چاہتا تھا کہ اُسے اپنائیں۔ اور پھر جب وہ ان کی بانہوں میں کچی کچنار کی مانند آ جائے گی تو اس کا تلخ رویہ شیریں ہو جائے گا۔ اتنے بڑے زمیندار

کی بیوی بن کر وہ یقیناً خوش ہو گی۔ مگر اس نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے ہی جیسے غریبوں کو پسند کرتی ہے۔ چودھری شوکت علی کے ذہن میں یہ جملہ آیا۔ ہونہہ..... سب لڑکیاں ایسے ہی سوچتی ہیں۔ کون لڑکی ایسی ہے، جو دولت کے، آسائشوں کے، نوکروں کے، مالکن بننے کے سہرے خواب نہیں دیکھتی۔ اور یہ تمام خواب صرف دولت ہی پورے کر سکتی ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ بغیر دولت کے وہ ہمیشہ یونہی پستیوں میں پڑی سکتی رہیں گی۔ وہ دھیرے سے بڑبڑائے۔ ساتھ بیٹھے دینو نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا، پھر سر جھکا لیا۔  
 ”ٹھیک کہہ رہے ہو، چودھری! کہ دولت سارے خواب پورے کر سکتی ہے۔ مگر تمہارا باپ بننے کا خواب اس دولت نے اب تک پورا نہ کیا۔ کس کام کی یہ دولت؟ کیسا غرور اس ہاتھ کے میل پر؟“ وہ سوچتا رہا، مگر کچھ کہہ نہ سکا۔

”دینو!“ انہوں نے خیالات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے دینو کو پکارا۔  
 ”جی مالک!“ وہ خیالات کی پورش سے چونک پڑا۔  
 ”طالب بھائی یا شجاعت بھائی سے کوئی ذکر نہ کرنا۔“  
 ”کیسا ذکر مالک؟“ دینو بے خیالی میں بولا۔  
 ”او بے وقوف! نوراً کے بارے میں۔“ انہوں نے جھک کر سرگوشی کی۔  
 ”سمجھ گیا جی..... آپ بے فکر رہیں۔“ دینو نے زور زور سے سر ہلا دیا۔  
 جب ان کی جیب حسن پور کی حدود میں داخل ہوئی تو کافی دن چڑھ آیا تھا۔ دھوپ ناقابل برداشت ہو رہی تھی اور مارے تھکن کے چودھری شوکت علی کی حالت بُری تھی۔ حسن پور کے چاروں طرف لہلہاتے باغات اور کھیت تھے۔ اونچی نیچی پگڈنڈیاں اور چھوٹی بڑی نہریں تھیں۔ یوں لگتا تھا، جیسے قدرت نے لہلہاتے کھیتوں کو حسن پور کا نگہبان بنا دیا ہو۔ یہ سرسبز کھیت ہی تو حسن پور کا حسن تھے۔ اسی سے تو حسن پور کی خوب صورتی تھی۔  
 جیب رنگ محل کے گیٹ پر پہنچی تو دینو اور گاما جلدی سے اتر گئے۔ دینو نے آہنی گیٹ کھولا۔ تب چودھری شوکت علی بولے۔

”اب تم لوگ اپنے گھروں کو جاؤ، شام کو ڈیرے پر آ جانا۔“ پھر وہ جیب اندر بڑھالے گئے۔  
 ”ارے شوکی چاچا آ گئے۔“ پانچ سالہ شعیب علی دوڑتا ہوا آیا اور اُن کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ شوکت علی نے اُسے گود میں اٹھا کر اُس کے گال چوم لئے۔ طالب علی کے بچوں میں اُسے سب سے زیادہ شعیب ہی پسند تھا۔ شاید اُس کی عادات اپنے شوکی چاچا سے ملتی تھیں۔

”تیرا بابا کیسا ہے شعیبی؟“



”ٹھیک ہیں۔“ شعیب نے ان کے گال سے گال رگڑتے ہوئے کہا۔ وہ اُسے لئے طالب علی کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ انہیں پتہ بھی نہ چلا کہ اپنی خواب گاہ کے درتچے میں پھول دار سائٹن کے پردے تھامے زہرہ بیگم کھڑی بڑی حسرت سے ان کو طالب علی کے کمرے کی طرف جاتے دیکھ رہی تھیں۔ وہ طالب علی کے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر اندر چلا گیا۔

چودھری طالب علی بڑی سی مسہری پر مخمل کی رضائی سینے تک اوڑھے چت لیٹے تھے۔ ان کی بیوی قریب ہی بیٹھی ان کے ہاتھ سہلا رہی تھی۔ شوکت علی کو دیکھ کر انہوں نے جلدی سے شوہر کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ شوکت، شعیب کو نیچے اتار کر تیزی سے مسہری کی طرف لپکے۔ یہ حادثہ کیسے ہوا طالب بھائی؟“ انہوں نے بھائی کا ہاتھ تھام لیا۔

”بس یار! تانگے پر آ رہا تھا کہ اس کا پہیہ نکل گیا۔“

”زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟ حکیم جی کو دکھایا؟..... اگر کہیں تو شہر ڈاکٹر کے پاس لے چلوں؟“ شوکت علی جلدی جلدی بول رہے تھے۔

”او نہیں پگلے! میں بالکل ٹھیک ہوں..... تو فکر نہ کر۔ زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ بس اُلے ہاتھ کا انگوٹھا اتر گیا تھا۔ پٹی کرا دی ہے۔“ طالب علی نے بھائی کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔ ”اور سناؤ، کیسا کام چل رہا ہے؟ سب لوگ ٹھیک کام کرتے ہیں؟ تو ٹھیک تو رہا نا؟“

”ہاں طالب بھائی! سب ٹھیک ہے۔“ شوکت علی ان کا ہاتھ چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”شوکت! تو ابھی بچہ ہے، بس ذرا دھیان رکھنا، کسی کی باتوں میں نہ آنا۔ اپنی عزت اور ساکھ مت خراب کرنا۔ کوئی مشکل ہو تو بتا دینا۔ آخر میں تیرا بڑا بھائی ہوں۔“ انہوں نے شوکت علی کو سمجھایا۔

”طالب بھائی!“ چودھری شوکت علی ان کے قریب آ گئے۔ ”آپ تو اب بابا کی جگہ ہیں۔ میں آپ سے اپنی مشکل بیان نہیں کروں گا تو اور کس سے کروں گا؟“ چودھری شوکت علی نے طالب علی کا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگا لیا۔

”تیری یہی سعادت مندی میرا خون بڑھاتی ہے شوکی!“ چودھری طالب علی کا لہجہ محبت کا غماز تھا۔ اس لہجے میں بھائی کی شفقت بھری ہوئی تھی۔ آنکھوں میں بھائی کی محبت کے دیے روشن تھے۔

”شوکی چاچا! میرے لئے کیا لائے؟“ وہ ماں کو چھوڑ کر ان کی طرف لپکا، مگر اس کی ماں نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔

”شوکی کو آرام بھی کرنے دے شعیب پتر! وہ تھکا ہوا آیا ہے۔“ یہ سن کر شعیب رک گیا۔

بھابی کا یہ جملہ شوکت کے دل میں گھب کر رہ گیا۔ سوچوں نے بے اختیار ان کا گھیراؤ کر لیا۔ اگر میرا اپنا بچہ ہوتا تو کبھی یوں نہ ہوتا۔ میں جو بچوں کے لئے ترستا ہوں، شعیب تو لگتا ہے جیسے میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ اور جگر کے ٹکڑے بہت پیارے ہوتے ہیں۔ مگر بھر جانی کیا جانے؟“

”چاچا! بتاؤ نا۔“ شعیب پھر ماں کی گود میں مچلا تو شوکت علی خیالات سے چونک پڑے۔

”پتر! میں شہر سے نہیں آیا۔ اگر آتا تو ضرور کچھ لے کر آتا۔ ویسے بھی طالب بھائی کی طبیعت کا سن کر جلدی آنا پڑا، اپنے پتر کے لئے کچھ بھی نہ لے سکا۔“ چودھری شوکت علی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے شعیب کے قریب آئے اور اس کی پیشانی چوم لی۔ ایسا کرتے ہوئے نجانے کیوں ان کی آنکھوں میں شبنم جننے لگی تھی۔

”اچھا طالب بھائی! میں زہرہ کے پاس جا رہا ہوں۔ صبح بغیر ناشتہ کئے چلا تھا، اب سخت بھوک لگی ہے۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے بڑے ندیدے پن سے کہا تو طالب علی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”ہاں جاؤ، زہرہ تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔“ طالب علی مسکرا کر بولے۔

”ہونہہ..... انتظار..... کوئی نئی بات کرنی ہوگی، کوئی نیا طعنہ دینا ہوگا۔“ چودھری شوکت علی نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”اچھا، رب راکھا۔“

”رب راکھا!“ چودھری شوکت علی گول ستونوں والے برآمدے کا چکنا فرش طے کرتے ہوئے تھکے تھکے قدموں سے چلتے ہوئے سائٹن کے پردے ہٹا کر اندر داخل ہوئے تو دروازے ہی میں رک گئے۔ زہرہ بیگم ڈرینگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی بال سنوار رہی تھیں۔ انہوں نے آئینے ہی میں شوہر کو دیکھا اور بالوں ہی میں ان کا ہاتھ رہ گیا۔ ادھر چودھری شوکت علی اب بھی دروازے میں کھڑے تھے۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ جب بھی اپنے کمرے میں آتے، ان کے قدم لڑکھڑا جاتے۔ وہ گم صم سے ہو جاتے، سہم جاتے۔ یوں لگتا، جیسے کمرے میں کسی آسیب کا بسیرا ہے اور زہرہ بیگم ان کے لئے آسیب ہی تو تھیں۔ زہرہ بیگم سامنے ہوتیں تو ان کا دل دھڑک دھڑک کر بے حال ہو جاتا اور اس دھڑکن میں کسی خوشگوار بات کی دھڑک نہیں ہوتی تھی، بلکہ اک خوف سا تھا، جو ان کے لاشعور میں بس گیا تھا۔ چھٹ پن میں زہرہ انہیں کھلایا کرتی تھیں اور ظاہر ہے، مارتی بھی تھیں۔ بس وہی مار کا خوف اب تک ان کے ذہن سے نہ نکلا تھا۔ حالانکہ اب وہ صرف طنزیہ جملوں پر ہی اکتفا کرتی تھیں۔ ظاہر ہے، اپنے راکھ راکھ خوابوں، چور چور ارمانوں اور روندی گئی آرزوؤں کا قاتل وہ شوکت علی ہی کو سمجھتی تھیں اور جب دل میں اُبال بہت جوش مارتا تو وہ تمام لاوا زبان



کے رستے بہادیتیں اور شوکت علی ان کے ہر تیر کو برداشت کرتے رہتے۔

”رک کیوں گئے شوکت؟“ زہرہ بیگم نے کنگھار کھا اور مڑ کر ان کی طرف دیکھا  
”کچھ نہیں..... آپ کو دیکھ رہا تھا۔“ شوکت علی آگے بڑھ آئے۔

”یہ کوئی نئی بات تو نہیں، مجھے تو آپ اس وقت سے دیکھ رہے ہیں، جب اس دنیا میں  
آنکھ کھولی تھی۔ مولوی صاحب نے اذان دی تھی، آپ کے کان میں تو اس کے بعد انہوں  
نے آپ کو میری ہی گود میں ڈال دیا تھا۔“ انہوں نے نہایت سفاکی سے ان کے سینے میں  
ایک تیر پیوست کر دیا۔

”زہرہ! آپ.....“ چودھری شوکت علی نے نہایت دکھی نظروں سے انہیں دیکھا۔

”سچ سننے کی تاب نہیں؟“ انہوں نے اپنے سیاہ ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے  
نہایت تمسخر سے کہا۔

”آپ کی بھی تو ایک حد ہوتی ہے، زہرہ بیگم! اور آپ ہمیشہ ہی ایسی باتیں کرتی ہیں۔“  
وہ سر جھکا کر نہایت بے بسی سے بولے۔

”مجھے بھی تو دیکھیں کہ گودوں کو کھلائے شوہر کو برداشت کر رہی ہوں۔“ زہرہ بیگم نے  
اپنے ترکش سے ایک اور تیر نکالا۔ تب شوکت علی کا جی چاہا کہ تھپڑوں سے زہرہ بیگم کا چہرہ  
بگاڑ دیں، مگر بعض مرتبہ جو جی چاہتا ہے، ہم نہیں کر سکتے۔ منصوبے بنا سکتے ہیں، عمل نہیں کر  
سکتے۔ اور یہی حال چودھری شوکت علی کا بھی تھا۔ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے کرسی پر بیٹھ  
گئے۔

”کھانا کھائیں گے؟“

”نہیں، بھوک نہیں ہے۔“ چودھری شوکت علی بولے۔

”لگتا تو نہیں کہ آپ کھانا کھا کر آئے ہیں۔“

”ہاں، کھا کر نہیں آیا۔ مگر بھوک بھی نہیں ہے۔“ انہوں نے زہریلی نظروں سے انہیں  
دیکھا۔

”میں نہیں مان سکتی۔ اور شوکت! میں آپ کو بتلا دوں کہ آپ مجھ سے جھوٹ مت بولا  
کریں۔ میں آپ کے چہرے پر لکھی ہر تحریر پڑھ سکتی ہوں، آپ کے دل کا حال جان سکتی  
ہوں۔ آخر گودوں کھلایا ہے میں نے۔ خیر، آپ غسل کریں، میں کھانا لاتی ہوں۔“ زہرہ بیگم  
بل کھاتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں اور چودھری شوکت علی تمللا کر رہ گئے۔ ان کی تو جان ہی  
جل جاتی تھی، جب وہ انہیں گودوں کھلانے کا طعنہ دیتی تھیں۔

”کہاں پھنسا گئے بابا؟“ انہوں نے نہایت دکھ سے سوچا، پھر الماری سے کپڑے  
نکالے اور غسل خانے میں گھس گئے۔ غسل کے دوران دھم سے خیالوں میں نوراں آ گئی اور

ذہن میں چھائی ہوئی کہرا ایک دم چھٹ گئی۔

”زہرہ بیگم! میں آپ کے طلسم سے جلد آزاد ہو جاؤں گا۔“ وہ مسکرا دیے۔  
کھانا ٹیبل پر چنا ہوا تھا اور زہرہ بیگم بڑی شان و تمکنت سے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے  
مسہری پر بیٹھی تھیں۔

”آپ نہیں کھائیں گی میرے ساتھ؟“ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔  
”نہیں، میں ناشتہ کر چکی ہوں۔“ وہ بے پروائی سے بولیں۔  
”بہتر.....!“

وہ ناشتہ کر رہے تھے، مگر انہیں علم تھا کہ زہرہ بیگم ان کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے  
رہی ہیں۔ بالکل ایسے، جیسے ایک ماں، بچے کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتی ہے۔ یکا یک  
چودھری شوکت علی کے خیالات کی روح دنیا پور کی طرف بہک گئی۔ چاندنی رات کی لگ  
چھپ، نوراں کا ان سے لپٹ جانا۔ وہ مسکرا دیے۔ آنکھوں میں ایک دم بہت سی چمک ابھر  
آئی، جیسے کسی نے بہت سے جگنو ان کی آنکھوں میں بھر دیئے ہوں اور ان کی آنکھوں کی یہ  
چمک، زہرہ بیگم کے سامنے شعلہ بن کر لپکی، جس کی تپش کو انہوں نے اپنے وجود میں محسوس  
کیا۔

”شوکت!“ زہرہ بیگم نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

”ہوں!“ انہوں نے زہرہ کی طرف دیکھا۔

”آپ بہت خوش ہیں؟“

”میں تو ہمیشہ خوش رہتا ہوں۔“ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

”آج تو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی معلوم ہو رہے ہیں۔ اتنا خوش میں نے آپ کو  
پہلے کبھی نہیں دیکھا، سوائے شادی سے پہلے۔ مجھے بتائیں، اس قدر خوش ہونے کا کوئی تو  
سبب ہوگا۔ کیا دنیا پور ایسی جگہ ہے، جو کھوٹی ہوئی خوشیاں دے دیتی ہے؟“  
”شاید۔“ چودھری شوکت علی کے لب کپکپائے۔

”پھر مجھے بھی لے چلئے۔ میں بھی اپنی خوشیاں واپس لانا چاہتی ہوں۔ گئے دنوں کی  
زہرہ بننا چاہتی ہوں، جس کی اُمنگیں جوان تھیں، جس کی آرزوئیں پامال نہیں کی گئی تھیں،  
جس کی آنکھوں میں خواب ہی خواب تھے اور اتنی بھیا نک تعبیر کی اُسے اُمید نہ تھی۔“ زہرہ  
بیگم بول رہی تھیں اور ان کے ایک ایک لفظ سے دکھ صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے  
وہ اپنے شوہر کے سامنے دل کھول کر رکھنا چاہتی ہوں۔ انہیں سب کچھ بتا دینا چاہتی ہوں۔

”زہرہ بیگم! اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ خواب نہیں دیکھنے چاہئیں۔ جب خواب ٹوٹے  
ہیں تو ان کی کرچیاں آنکھوں میں چھ چھ کر انہیں لہو لہان کر دیتی ہیں، انسان اندھا ہو جاتا



ہے اور اپنے بکھرے خوابوں کا قصور وار دوسروں کو ٹھہراتا ہے۔ کوئی تمنا نہیں کرنی چاہئے، زہرہ بیگم! جب تمنا پوری نہیں ہوتی تو انسان خود ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ ہم مقدر کے تابع ہیں، مقدر ہمارا تابع نہیں۔“ چودھری شوکت علی نے آہستگی سے کہا اور زہرہ بیگم حیرت سے انہیں دیکھتی رہیں۔ اپنی ازدواجی زندگی میں آج وہ پہلی بار زہرہ بیگم سے اس طرح کھل کر بات کر رہے تھے۔ نجانے اتنی ہمت کیسے آگئی تھی ان میں۔ شاید نوراء کی محبت نے پیدا کر دی تھی۔

زہرہ بیگم انہیں دیکھ رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں۔

”یہ کل کا بچہ ایسی باتیں سوچ سکتا ہے اور پھر کر بھی سکتا ہے۔“

مگر وہ کل کے بچے نہیں تھے، وہ اب کڑیل جوان تھے۔ دنیا پور کے مالک تھے اور ان پر بڑی بڑی ذمہ داریاں آن پڑی تھیں۔ اب انہیں بچہ سمجھنا زہرہ کی بھول تھی۔

☆.....☆

”بابا! بس میں نے کہہ دیا نا کہ مجھے ٹو ماسی جنت کے گھر چھوڑ آ۔“ اس کا بابا جیسے ہی گھر آیا تھا، کھانا دینے کے بعد نوراء نے ماسی کے یہاں جانے کی ضد شروع کر دی تھی۔ ”آخر کیوں پُتر؟“ منشی اللہ دتہ نے یہ سوال اس سے کشی ہی مرتبہ کیا تھا۔ ”کہہ تو دیا ہے کہ میں عرصے سے ماسی سے نہیں ملی ہوں..... میرا انہیں دیکھنے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔“

”پُتر! پہلے تو تجھے کبھی ایسی محبت نہیں آئی۔“ منشی محبت سے بولا۔

”آخر وہ میری ماسی ہے۔“ نوراء نے گلاس میں لسی اُٹھالیتے ہوئے کہا۔

”پہلے میں حساب کتاب دے دوں چودھری کو، پھر تجھے چھوڑ آؤں گا۔“

”نہیں، پہلے مجھے چھوڑ آ۔“ وہ ٹھنک کر بولی۔

”پُتر! تُو سمجھ نا۔“ منشی منمنایا۔

”بابا! تُو بھی سمجھ نا۔“

”جھلے! تجھے میرا بالکل خیال نہیں کہ تُو نہیں ہوگی تو میرا کیا حال ہوگا، مجھے کھانا کون پکا کر دے گا۔“ اس نے بات پٹی۔

”اوہ، بابا! بس میں جلدی واپس آ جاؤں گی۔“ نوراء نے منشی کے گلے میں بازو جھانک کر دیئے۔ وہ سوچ رہی تھی۔

”بابا! تجھے کیا خبر کہ مجھے تیرا کتنا خیال ہے۔ تیری عزت ہی کی خاطر تو میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں، ورنہ تیرے چودھری کے ارادے بہت خطرناک ہیں۔“

”اچھا تیار ہو۔ دن ڈھلے چلیں گے۔ اب میں چودھری کی طرف جا رہا ہوں۔“ منشی

اللہ دتہ گھر سے نکلا ہی تھا کہ لالی آگئی۔ نوراء ٹرک سے کپڑے نکال رہی تھی۔

”اری نوری! ایک بات سن۔“ وہ دروازے میں گھستے ہی آوازیں لگانے لگی۔

”کیا ہے؟“ نوراء کھولی سے باہر آئی۔

”تیرے لئے خوشی کی بات ہے۔“ لالی اس سے لپٹ گئی۔

”کیا راجا آ گیا؟“ نوراء کے چہرے پر کئی دھنک رنگ پھیل گئے۔

”دھت تیرے کی۔ تیرے تو سر پر وہی سوار ہے۔“ لالی نے اس کی پیٹھ پر دھپ

لگائی۔

”لالی! میرے لئے وہی خوشی ہے۔ میری سب خوشیاں اُسی کے دم سے ہیں۔“ وہ

اُداس لہجے میں بولی۔

”بہر حال، یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ چودھری چلا گیا۔“

”تجھے کیسے معلوم ہوا؟“ نوراء مارے خوشی کے چیخ پڑی۔

”میرے لالہ کریمو نے سویرے اُسے جاتے دیکھا تھا۔ وہ جیب پر تھا۔ کریمو ہل

چلانے کھیتوں میں جا رہا تھا۔“ لالی نے کہا۔

”سچ کہہ رہی ہے؟“ نوراء نے بے قراری سے اُسے دیکھا۔

”اور کیا جھوٹ ہے؟ لالہ کریمو آیا تو اس نے بتایا۔ چودھری نے اسے دیکھ کر خود ہی

جیب روک لی تھی۔

”کیا کیوں؟“ نوراء نے کہا۔

”کیوں، تُو اُداس ہوگئی؟“ لالی نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

”لعنت ہے تیری دوستی پر۔“ نوراء نے اُسے گھر کا۔

”لالہ کہہ رہا تھا، چودھری کا بڑا بھائی بیمار ہے۔“ لالی نے کہا۔

”یا خدا! تیرا شکر ہے۔“ نوراء نے اطمینان کی سانس لی۔

”ہاں، اب تو شکر کر۔ آج پھر حویلی کے پچھواڑے باغ میں لگ چھپ کھیلیں گے۔“

”اگر وہ آ گیا تو؟“ نوراء نے خدشہ ظاہر کیا۔

”اب تو مہینوں نہیں آئے گا۔ تجھے خبر نہیں، بڑا چودھری بھی فصل کے زمانے میں آتا

تھا۔“ لالی نے اُسے یاد دلایا۔

”ہاں، ہاں۔“ نوراء نے گردن ہلا دی۔

”اچھا، میں چلوں۔ اماں انتظار کر رہی ہوگی۔ تنور جلا آئی تھی، روٹی پکانی ہے۔“ لالی

جانے کو مڑی۔

”کچھ کھانی تو لے۔“ نوراء نے کہا۔



”نہیں، میں تو اب مٹھائی کھاؤں گی۔ راجا آجائے تو منگوا لیتا۔ اور اس سے کہہ، اب جلدی شادی کر لے۔“ لالی شرارت سے بولی۔

”کہوں گی۔“ نوراًں نے شرما کر سر جھکا لیا اور پھر لالی نے مسکراتے ہوئے اس کی کر پر ایک دھپ جھائی اور ہنستی ہوئی چلی گئی۔

”یا اللہ! تیرا شکر ہے، اُس مردود سے جان چھوٹی۔ میں اس کی وجہ سے اپنے بوڑھے بابا کو چھوڑ کر ماسی جنت کے گھر جا رہی تھی۔ بابا کو روٹی کی تکلیف ہوئی۔“ نوراًں بہ سب سوچتی ہوئی اپنی کھولی میں آئی اور جو کپڑے نکالے تھے، وہ واپس ٹرنک میں رکھنے لگی۔ گھڑوں میں پانی بھی نہیں تھا۔ صبح وہ چودھری کے ڈر کے مارے گھر سے بھی نہ نکلی تھی کہ کہیں اس سے ٹکراؤ نہ ہو جائے۔ سہی ہوئی ہرنی کی طرح گھر میں پڑی رہی تھی۔ گھر کے آنگن کے کونے میں کھڑی بھینس رینگ رہی تھی۔ شاید اُسے بھوک لگی تھی اور نوراًں نے اُسے چارہ بھی نہیں ڈالا تھا۔

”بس، بس..... ابھی تیرا بھی انتظام کرتی ہوں۔“ نوراًں نے ٹرنک کو تالا لگاتے ہوئے کہا اور درانتی اٹھا کر باہر آ گئی۔

اُسے دُور تک بھینس کے رینگنے کی آواز سنائی دیتی رہی۔ چند لمحے بعد وہ گھاس لے آئی اور بھینس اور اس کے چھوٹے سے کٹے کو ڈال دی، پھر گھڑوچی سے گھرے اٹھائے اور پانی بھرنے کوئیں پر آ گئی۔

نوراًں پانی لے کر گھر آئی تو اس کا بابا واپس آچکا تھا۔ وہ کیکر کے درخت تلے بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔

”میں تو سمجھا تھا، تُو تیار ہو گی۔“ وہ حقہ گڑ گڑاتے ہوئے بولا۔

”میں نہیں جاؤں گی، ماسی کے گھر۔“ نوراًں نے گھرے گھڑوچی پر رکھ دیے۔

”میں سمجھا نہیں؟“ نشی اللہ دتہ حیرت سے اُسے تکے جا رہا تھا۔

”بس، میں نہیں جاؤں گی۔“ نوراًں نے مصومیت سے کہا۔

”ابھی سویرے تو تُو کہہ رہی تھی، بس میں جاؤں گی۔“ نشی نے اس کے لہجے کی نقل کی۔

”بابا! میں نے سوچا، تُو میرے پیئر کیسے رہے گا؟“

”تُو میری فکر نہ کر۔“

”بابا! میری بھوری کیسے رہے گی میرے پیئر؟“ اس نے کونے میں بندھی بھینس کی طرف دیکھا، جو چارہ کھانے میں مصروف تھی۔

”اچھا، تو بھوری کی وجہ سے نہیں جا رہی ہے تُو۔“ نشی اللہ دتہ ہنس دیا۔ خوش تو وہ بھی

بہت تھا۔ نوراًں اُس کی اکلوتی بیٹی تھی، بیوی کے مرنے کے بعد اُس نے اُسے ماں اور باپ دونوں کی محبتیں دی تھیں۔ نوراًں صرف دو سال کی تھی، جب تاباں چچک میں مبتلا ہو کر مر گئی تھی۔ صبح نگہداشت نہ ہونے کی وجہ سے وہ بھری جوانی میں ہی اگلے جہاں پہنچ گئی۔ پھر اللہ دتہ نے خود کو نوراًں کے لئے وقف کر دیا۔ نوراًں اُس کی بیٹی ہی نہیں، بیٹا بھی تھا۔ نوراًں نے اُسے کتنا مجبور کیا تھا کہ وہ شادی کر لے، مگر اس نے انکار کر دیا۔ وہ اپنی نوری کو سوتیلی ماں کے عتاب سے بچانا چاہتا تھا۔

نوری بڑی ہوتی گئی اور نشی اللہ دتہ بوڑھا۔ اپنے خون جگر سے اس نے نوراًں کو پروان چڑھایا تھا۔ جوانی بھی اس پر ٹوٹ کر آئی تھی۔ کچھ گاؤں کی آب و ہوا کا اثر تھا کہ اچھا نہ کھانے کے باوجود بھی اس کے گندمی رنگ میں سرخی، آنکھوں میں چمک اور بدن میں چمک تھی۔ نازک سی آم کے کپے بور کی مانند تھی۔ راجا اُس کے بچپن کا ساتھی تھا اور اب اُس کا پگھلا من ہمیشہ کا ساتھ چاہتا تھا۔ پگھٹ اُن کی محبت کا گواہ تھا۔ لہہاتے سرسوں کے پیلے پھول اُن کی محبت کے رازداں تھے۔ چاندنی راتیں ان کی محبت کی امیں تھیں۔ اور پھر نشی اللہ دتہ بھی ان کی محبت سے واقف ہو گیا تھا۔ بھلا عشق اور مشک کہیں چھپا کرتے ہیں؟ جب راجا بھنری کی مدھرتا نہیں بکھیرتا تو اس کے پاس بیٹھی نوراًں آنکھیں بند کر لیتی اور بانسری کی آواز اس کے اندر ہی اندر شہنائی کی آواز بن جاتی۔ کبھی دونوں ندی کے پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھ جاتے۔ تب نوراًں کہتی۔

”راجا! گیت سناؤ۔“

وہ محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیتا اور دھیمے سُر میں گانا شروع کرتا۔

سارے جگ کون پیار سکھیں (تمام دنیا کو پیار سکھائیں گے)

تیدیاں مند ریاں، میڈے چھلے (تیری انگوٹھیاں میرے چھلے)

یہ بول سن کر وہ نہ جانے کیوں پیر ہوئی ہو جاتی۔ وہ گاتا رہتا اور اُس کی پلکیں اُس کے سرخ سرخ کشمیری سیبوں جیسے گالوں پر تھرکتی رہتیں۔ پھر وہ کہتا۔

دل دا حال ہے اینویں جیویں (دل کا حال ایسے ہے جیسے)

تیز ہوا وچ ڈیوا چلے (تیز ہوا میں دیا چلے)

تب نوراًں اُسے شاکی نظروں سے دیکھتی رہ جاتی۔ یہ شعر اُس کے دل میں مایوسی کی ایک لہری دوڑا دیتا یوں لگتا، جیسے راجا کہہ رہا ہے، ان کی محبت کا دیا ٹٹمنا رہا ہے، جو جلد ہی بجھ جائے گا۔ مخالف ہوا کے پھیڑے اُسے بچا دیں گے۔ وہ تو اپنی محبت کے دیے ہمیشہ جلانے رکھنا چاہتی تھی۔ اس کی روشنی میں اسے آگے بڑھنا تھا۔ راجا کے سنگ قدم ملا کر چلنا تھا۔



”تم یہ شعر نہ گایا کرو راجا!“ نورماں راجا کے شانے سے سر نکا دیتی۔

”بھئی یہ تو گانے میں آتا ہے۔“ راجا اُس کے ریشمی بالوں کو چوم لیتا۔

یہ قصبے جب ششی اللہ دتہ کے کانوں تک پہنچے تو اُس نے نورماں کی شگنی راجہ سے کر دی۔ راجا کی ایک بہن بھراواں ابھی کنواری تھی اور جب تک اُس کی شادی نہ ہو جاتی، بھلا راجہ کیسے شادی کر سکتا تھا؟ ویسے بھی ابھی دونوں کو چل دی نہیں تھی۔ راجا آج کل اپنی ماسی کے ہاں گیا ہوا تھا، جو بٹے میں رہتی تھی اور بہت بیمار تھی۔ اور ادھر نورماں تھی کہ سہم کر رہ گئی تھی۔ اُسے چودھری شوکت علی کا خطرہ تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ راجا جلد آ جائے تاکہ وہ تمام باتیں اس سے کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لے اور اُسے خطرے سے آگاہ کر دے۔

☆.....☆

دو روز بعد چودھری شوکت علی ”دنیا پور“ آنا چاہتے تھے، مگر ایک دم زہرہ بیگم کی طبیعت خراب ہو گئی۔ نجانے کیا ہوا تھا۔ اس روز بھی وہ حسب معمول درختے میں کھڑی تھیں، چودھری شوکت علی لیٹے ہوئے تھے اور شعیب علی کو سینے پر بٹھا رکھا تھا۔ وہ ان کے سینے پر اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے مکے مار رہا تھا اور وہ اس کے ہاتھ پکڑ رہے تھے۔ پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑتے، جب شعیب ان کے پاس ہوتا تو وہ ہر پریشانی اور ہر دکھ سے تھوڑی دیر کے لئے آزاد ہو جاتے تھے۔

”شوکت!“ کمرے کے شور میں ایک نہایت مدہم سی آواز ابھری۔ ”شوکت!“ یہ زہرہ بیگم کی آواز تھی۔ چودھری شوکت نے فوراً شعیب کو سینے سے اتارا اور اٹھ بیٹھے۔ انہوں نے زہرہ بیگم کی طرف دیکھا، جو درختے کی چوٹ تھامے دھری ہوئی جا رہی تھیں۔ ان کا جسم بالکل سرد ہو گیا تھا۔ شوکت علی گھبرا گئے۔

”زہرہ! کیا ہوا آپ کو؟“

”بہت..... درد.....“ زہرہ بیگم نے سینے پر ہاتھ رکھ کر صرف اتنا ہی کہا۔

”چاچا! اماں کو بلا لاؤں؟“ شعیب نے گھبرا کر پوچھا۔

”ہاں جاؤ، فوراً بلا لاؤ۔“ انہوں نے کہا اور زہرہ بیگم کو بازوؤں پر اٹھا کر پٹنگ پر لا کر لٹا دیا۔ وہ بہت گہرے گہرے سانس لے رہی تھیں۔

”زہرہ! آپ بتائیں، آخر ہوا کیا؟“ انہوں نے زہرہ بیگم کی ہتھیلی مسلتے ہوئے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔“ اُن کا چہرہ لمحہ بہ لمحہ زرد ہوتا جا رہا تھا۔ تب ہی شعیب اپنی ماں کے ساتھ آ گیا۔ شعیب کی بہن نسرین اور بھائی صفدر بھی تھے۔

”کیا ہو گیا بھرجائی کو؟“ شعیب کی ماں سیکڑنے لگی۔

”پتہ نہیں بھرجائی! مجھے خود خبر نہیں۔ یہ تو پہلی مرتبہ ہوا ہے۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔“

انہوں نے جواب دیا۔

”ہاں شاید.....“ دینو کو بھیجیو، جا کر حکیم جی کو بلا لائے۔“ چودھری شوکت نے صفدر سے کہا اور وہ ”اچھا چاچا!“ کہتا ہوا کمرے سے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد حکیم جی آ گئے۔

”چاچا کا پردہ کرا دو۔“ صفدر نے کہا۔ سیکڑنے دوسری طرف چلی گئی، چودھری شوکت علی نے زہرہ پر بھی ریشمی چادر ڈال دی، صرف ہاتھ ہی باہر تھا۔

”آجائیں حکیم جی!“ صفدر نے ہانک لگائی۔

”کوئی فکر کی بات تو نہیں؟“ چودھری شوکت علی نے بے چینی سے پوچھا۔

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ کسی کو بھیج دیجئے، میں دوا دے دوں گا۔ گائے کے مکھن میں دوا ملا کر کھلائیے، فوراً آرام آ جائے گا۔“ حکیم جی بولے اور صفدر کے ساتھ چلے گئے۔

”بیوی!“ چودھری شوکت علی نے ہانک لگائی۔

”آئی چودھری جی!“ بیوی سر پر دوپٹہ بھاٹی ہوئی آ گئی۔ یہ زہرہ بیگم کی خاص ملازمہ تھی، جو شادی کے وقت زہرہ کے ساتھ آئی تھی اور ہر وقت خدمت میں لگی رہتی تھی۔

”چودھری جی! یہ حکیم جی کیوں آئے تھے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں خبر نہیں، زہرہ کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔“

”پھر وہی؟“ بیوی نے چونک کر زہرہ بیگم کے زرد چہرے کی طرف دیکھا۔

”کیا پہلے بھی ہو چکا ہے؟“ انہوں نے اس کے چونکنے پر اس سے پوچھا۔

”ہاں، کبھی کبھی دل ڈوبنے لگتا ہے ان کا۔“ بیوی نے کہا۔

”پھر تو نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ انہوں نے گھر کا۔

”چودھرائی نے منع کیا تھا۔ پھر جب آپ ہوتے ہیں تو میں کمرے میں آتی ہی نہیں۔“

”مجھے علم ہے۔“ چودھری شوکت علی اس کی وضاحت پر مسکرا دیئے، پھر بیوی زہرہ کے پاؤں دبانے لگی۔ صفدر دوا لے کر آیا تو بھابی سیکڑنے مکھن میں ملا کر وہ دوا زہرہ کو کھلا دی، پھر چوڑھوں بعد زہرہ پر سکون ہو کر سو گئی اور چودھری شوکت علی نے اطمینان کی سانس لی۔

دو تین روز بعد زہرہ بالکل ٹھیک ہو گئیں۔ اب پھر وہی طعنے تھے اور چودھری شوکت علی۔ انہیں تو اتنا بھی لحاظ نہ تھا کہ شوکت نے یہ تین روز ان کے سر ہانے گزار دیئے تھے، ایک بلی نہ سوائے تھے۔ آخر وہ ان کی بیوی تھیں، چچا زاد تھیں..... ”رنگ محل“ کی عزت تھیں۔ چاہے کچھ بھی تھا، ان کی شریانوں میں ایک ہی خون دوڑ رہا تھا۔



”زہرہ!“

”جی.....“ وہ آہستہ سے بولی۔

”میں دنیا پور جا رہا ہوں۔“

”کیوں؟“ زہرہ بیگم نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”زمینوں کا کام دیکھنا ہے نا۔“ انہوں نے رخ موڑے بغیر جواب دیا۔

”اور اتنے دن جو رہ کر آئے ہیں؟“ انہوں نے باز پرس کی۔

”جب..... جب نشی کو میں نے بھیجا ہوا تھا، اور جگہ۔“ چودھری شوکت علی ایک دم گہرا

کئے۔

”شوکت! آپ پھر جھوٹ بول رہے ہیں۔“ زہرہ بیگم نے انہیں تنبیہ کی۔

”یقین کریں زہرہ! میں غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا۔ نشی واقعی گیا ہوا تھا۔“

”بہتر، چلے جائیں، میں آپ کو منع نہیں کرتی۔“ زہرہ نے نہایت بے نیازی سے کہا۔

”شکریہ! اچھا، رب راکھا۔“ انہوں نے زہرہ کے شانوں پر اپنے بھاری ہاتھ رکھ کر

دباؤ ڈالا۔

”رب راکھا۔“ زہرہ کے لب کپکپائے۔

وہ جلدی سے باہر آگئے کہ کہیں زہرہ کوئی نصیحت نہ شروع کر دیں۔

”چاچا! مجھے بھی لے چلونا۔“ وہ برآمدہ عبور کر رہے تھے کہ شعیب آگیا۔

”اوہ چاند! پھر کبھی سہی۔ ابھی نہیں۔“ انہوں نے اس کے گال چوم لئے۔

”اچھا بتاؤ، لاؤں کیا تمہارے لئے؟“ چودھری شوکت علی نے اسے پچکارا۔

”جو دل چاہے۔“ اس نے نہایت بے پروائی سے کہا تو شوکت علی ہنس دیئے اور اسے

لپٹا کر بھینچ لیا۔

☆.....☆.....☆

چودھری شوکت علی کے جانے کے صرف دو روز بعد ہی تو راجا ”بے“ سے آگیا تھا اور

پہلی فرصت میں اپنی نوراں کے پاس آیا تھا۔ نوراں ہانڈی بھون رہی تھی۔

”نوری!“ وہ تیزی سے باورچی خانے میں آگیا۔

”ہائے راجو! تو کب آیا؟“

”بس، ابھی آیا ہوں۔ میں نے سوچا کہ تجھ سے مل لوں۔ تو اُداس تو نہیں ہوئی؟ پتہ

ہے، میری ماسی مر گئی اس لئے زیادہ دن لگ گئے۔“ وہ چوکی پر بیٹھ گیا اور جلدی جلدی

بولنے لگا۔

”ہائے راجو! تجھ پر تو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہوگا۔“ وہ اُس کے دُکھ پر بے تاب ہو گئی۔

”اوہ، چھوڑ میری ہیر! وہ تو بوڑھی عورت تھی، اس کا وقت آگیا تھا۔ اماں تو بس رو رو کر

ادھ مٹائی ہو گئی۔“ راجا بے پروائی سے بولا۔

”تجھے افسوس نہیں ہوا؟“ نوراں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”بھئی ہوا تھا۔ کیوں نہ ہوتا؟ آخر ماسی تھی میری۔ اب اتنا بھی نہیں کہ میں وہیں

قبرستان میں دھرنادے کر بیٹھ جاتا۔“ راجو نے شوخی سے کہا تو نوراں ہنس دی۔

”رات کو آئے گی نا، کھوہ پر؟“ اس نے جھک کر پوچھا۔

”بابا گھر پہ ہے۔ ہڈیاں تو زردے گا۔ پہلے بھی منع کرتا ہے کہ رات کو نہ نکلا کر۔“ نوراں

بولی۔

”او، چھوڑ۔ اُسے پتہ نہیں چلے گا۔ میں تیرے لئے چوڑیاں لایا ہوں۔ تو آئے گی تو

دوں گا۔ بٹے سے شہر نزدیک ہے، میں چلا گیا تھا۔ تیرے لئے چٹیا بھی لایا ہوں۔ بڑے

خوب صورت، سنہری پاند ہیں اس کے۔“ راجا اُس کو بتا رہا تھا۔

”ہاں، آؤں گی راجو! ایک کام ہے تجھ سے۔“ نوراں نے آہستگی سے کہا۔

”اچھا، میں جا رہا ہوں۔ اماں لڑے گی ورنہ۔ یاد سے آنا۔“ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

”کھانا کھالے۔“ نوراں نے اسے اتنی جلدی جاتے دیکھ کر کہا۔

”تجھے دیکھ کر بھوک مٹ گئی ہے۔“ راجا نے اس کے گال تھپتھپائے تو وہ شرما گئی اور

پھر انتظار کی صلیب پر لٹکی رہی۔ رات گئی کہ آنے کا نام نہ لے رہی تھی اور وقت تھا کہ رینگ

رینگ کر گزر رہا تھا۔ وہ بے چین ہو ہو کر سارے گھر میں پھر رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ

رہا تھا کہ وہ چودھری کے متعلق راجا کو کیسے بتائے گی؟ کیا بتائے گی؟

عشاء کی نماز پڑھ کر نشی اللہ دتہ سو گیا۔ نوراں نے آہستہ سے کھولی کا دروازہ کھولا اور

اسے بھیڑ کر دبے پاؤں باہر آگئی۔ کھوہ پر آئی تو راجا اس سے پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ چار

سوانہ ہیارا تھا، آوارہ کتے بھونک رہے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ راجا نے

چپ چاپ اس کا ہاتھ تھام لیا اور دونوں کپاس کے کھیت کی طرف آگئے اور وہاں نرم نرم

گھاس پر بیٹھ گئے۔ راجہ نے نہایت محبت سے اس کی گوری گوری کلائیوں میں چوڑیاں پہنا

دیں۔ جب چوڑیاں کھنکیں تو نہ جانے نوراں کیوں شرما گئی۔ تب اس نے آہستہ آہستہ راجا کو

چودھری شوکت علی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

”اُس کہنے کی ہمت کیسے ہوئی یہ بات کرنے کی۔“ بارے غصے کے راجا کے نتھنے پھول

گئے، مٹھیاں بھینچ گئیں۔

”اب میں کیا کہہ سکتی ہوں؟“ نوراں مُردہ سی آواز میں بولی۔

”اگر میں اماں کو شادی کے بارے میں کہوں بھی تو وہ کہے گی، ابھی بہن مری ہے اور



بیٹے کو شادی کی جلدی ہے۔" راجا ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

"پھر کیا کریں؟" نوری زور دے۔

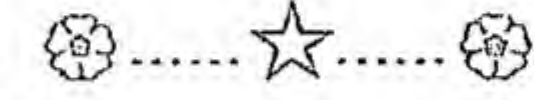
"ہم تو دونوں طرف سے ہی پھنسے ہوئے ہیں۔ ویسے تو فکر نہ کر، میں جلد ہی کوئی انتظام کر لوں گا۔ ابھی تو وہ اس طرف آئے گا بھی نہیں۔" راجا نے اس کا سراپے سینے سے لگا کر اسے دلاسا دیا۔

"راجا! مجھے یوں لگتا ہے، جیسے وہ مجھے تجھ سے چھین لے گا۔"

"ارے پگلی ہے تو تو۔"

"بہت برے سپنے آتے ہیں مجھے۔" نوراں نے کہا۔

"یہ سب تیری سوچوں کا نتیجہ ہے۔ تو پریشان نہ ہو۔" اس نے نوراں کو لپٹا لیا اور وہ اس کے سینے سے لگی آنسو بہاتی رہی۔



جب چودھری شوکت علی "دنیا پور" کی حدود میں داخل ہوئے تو شام کا دھند کا پھیل چکا تھا اور پنکھ پکھیر واپس اپنے آشیانوں کی طرف قطار در قطار جا رہے تھے۔ انہوں نے حویلی پہنچتے ہی دینو سے کہا۔

"دینو! تو جا اور فوراً منشی کو بلا لا۔"

"بہتر مالک!" دینو جیب سے چھلانگ لگا کر فوراً باہر آ گیا۔ چودھری شوکت علی بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔ بیٹھک میں وہ بے چینی سے منشی کے منتظر تھے۔ وہ عہد کر کے آئے تھے کہ وہ نوراں کو منشی سے مانگ لیں گے۔ کتنے ہی دن تو انہیں نوراں کے تھوڑی دیر کے قرب نے بے چین رکھا تھا۔

چند لمحوں بعد ہی دینو کے ساتھ منشی آ گیا۔

"سلام چودھری!" وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اور ذرا جھک کر بولا۔

"وعلیکم السلام۔ بیٹھو۔" انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا، مگر منشی نیچے قالین پر بیٹھ گیا۔

"اوپر بیٹھ منشی!"

"نہیں مالک! ہم اپنی جگہ ہی ٹھیک رہتے ہیں۔" وہ انکسار سے بولا۔

"نہیں منشی! تو بھی انسان ہے اور ہم بھی۔ میں ساری بڑائی چھوٹائی کو مٹانا چاہ رہا ہوں۔" انہوں نے منشی کا بازو پکڑ کر اٹھایا اور صوفے پر بٹھا دیا۔

"جا دینو! کوئی دودھ لے لے آ۔" منشی ہمارا مہمان ہے۔" انہوں نے دینو کو کہا اور بے

چارے منشی کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ مارے حیرت کے، اس کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں

اور دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔

"کھلا ڈالا ہو کر بیٹھ منشی!" چودھری شوکت علی اس کے سامنے ہی بیٹھ گئے۔ دینو دو گلاس

دودھ لے آیا۔ چودھری نے منشی کو ایک گلاس دیا اور دوسرا خود لے گیا۔ دودھ پی کر وہ

موچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

"ہاں منشی! اب بتا کیا ہوا؟"

منشی نے تمام کھاتے کھول کر رکھ دیئے اور سب بتا دیا۔

"میرے تیرے کام سے بہت خوش ہوں منشی! اور میرا باپ بھی بہت خوش تھا تجھ

سے۔" انہوں نے منشی کا کندھا تھپکا۔

"ہم تو جی آپ کے غلام ہیں۔" منشی اللہ دتہ نہایت انکسار سے بولا۔

"منشی! تم سے ایک کام تھا۔" چودھری شوکت علی صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور

ٹہلنے لگی۔

جی، حکم کرو۔" منشی بھی کھڑا ہو گیا۔

"تو مانے گا نا؟" چودھری شوکت علی نے پوچھا۔

"چودھری! آپ کا حکم نہ مانوں گا تو اور کس کا مانوں گا۔" منشی ہاتھ مسلتے ہوئے بولا۔

"تو سن منشی!..... نوراں تیری بیٹی ہے نا؟"

"ہاں، ہاں چودھری!" منشی کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا۔

"وہ مجھے پسند آگئی ہے۔" چودھری شوکت علی نے گویا دھماکا کر دیا۔

"چو..... د..... ہری....." منشی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"اور میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" چودھری شوکت علی ایک دم پلٹے۔ "تیری

کیا رضا ہے؟ چودھری شوکت علی آف دنیا پور کو اپنا داماد بنائے گا نا؟" چودھری شوکت علی

کے ہونٹوں پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

"نہیں۔" منشی کے لب کچپا گئے۔

"کیوں..... کیوں؟" انہوں نے منشی کو جھنجھوڑ ڈالا۔ اس کے صرف ایک لفظ نے اُن

کی آرزوؤں کا محل چکنا چور کر دیا تھا۔ ان کی محبت میں نوراں کی محبت کے دیے ٹھٹھانے لگے

تھے۔ "بتا! منشی! کیا میں اس قابل نہیں؟" وہ چیخے۔

"چودھری! آپ شادی شدہ ہیں آپ کی خاندانی بیوی ہے۔ ہم غریبوں کو زمین پر رہنے

دیں، آپ آسمان سے نیچے مت جھکیں۔" منشی ہولے سے بولا۔

"جب آسمان خود جھکنا چاہے تو تم کیا کرو گے؟"

کچھ نہیں چودھری! میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ سے اپنی بیٹی بیاہ سکوں۔ مجھے



صاف کر دو چوہری! خدا کے واسطے میرے منہ پر کالک نہ ملے۔“ منشی نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ آنسو اس کی بوڑھی آنکھوں سے نکل نکل کر اس کے جھریوں زدہ چہرے پر پھیل رہے تھے۔ اس کے بندھے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

”منشی! تجھے خبر ہے کہ ہم ہر عورت کو بیوی کا درجہ نہیں دیتے۔ اور میری بیوی ہے تو کیا ہوا، میں نورائیں کو بھی تو بیوی بنانا چاہتا ہوں۔ کیا اسلام میں چار شادیاں جائز نہیں؟ شرع اجازت دیتی ہے۔“ چودھری شوکت علی نرم لہجے میں بولے۔ ”میرا ہر بے ہودگی سے پاک ماضی تیرے سامنے ہے۔“

”مگر چودھری! آپ اپنے ہی جیسوں میں جائیں، ہم غریبوں کو حویلیاں راس نہیں آتیں۔ آپ لوگ ہماری لڑکیوں کی جوانیوں سے کھیل کر انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اندھے کنوؤں میں دھکیل دیتے ہیں، جہاں وہ گھٹ گھٹ کر سکتی رہتی ہیں۔ نہ مر سکتی ہیں، نہ جی سکتی ہیں۔“ منشی اللہ دتہ گڑگڑا رہا تھا۔

”دیکھو منشی! ٹھنڈے دل سے غور کرو، میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ تمہاری نورائیں کو کبھی کوئی دکھ نہیں دوں گا، اسے وہی مقام ملے گا، جو ہماری خاندانی بیویوں کو ملنا ہے۔ وہ ہمیشہ ہنستی ہوئی تمہارے گھر آئے گی۔ اپنے فیصلے پر کبھی نہیں پچھتانا پڑے گا۔“ چودھری شوکت علی نہایت نرم لہجے میں کہتے رہے اور منشی اللہ دتہ کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ اسے تو یوں لگ رہا تھا، جیسے آج اُس کی نورائیں مر گئی ہے۔ آج وہ اس جہاں میں ہی نہیں رہی اور وہ اس کی کچی قبر پر بیٹھا اپنے آنسوؤں سے چھڑکاؤ کر رہا ہے۔

”منشی! پھر کیا خیال ہے؟“ وہ اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر بولے۔

”چودھری جی! اُس کی تو منگنی ہو گئی ہے۔“

”منگنی؟“ چودھری شوکت علی نے حیرت سے اس لفظ کو دہرایا اور پھر ایک خیال ان کے ذہن میں آیا، شاید کہ منشی نے کوئی چال چلی ہو۔ اس ایک لفظ منگنی نے ان کے دل میں ہلچل مچا دی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

”منشی! تو جھوٹ تو نہیں کہہ رہا؟“ انہوں نے خود پر قابو پا کر کہا۔

”نہیں..... بالکل صحیح ہے۔ راجا اس کا منگیتر ہے۔ دونوں ایک دوجے کو پسند بھی کرتے ہیں۔“ منشی نے اپنی گھڑی کے پتوں سے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔

”منشی! چاہے کچھ بھی ہو جائے، دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے، میں نے نورائیں سے شادی کرنا ہے۔ اب وہ میری ضد ہے اور میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔“ انہوں نے کرسی پر ٹکا مارا۔

”مگر وہ پسند کرے گی یا نہیں؟“ منشی نے کہا۔

”مجھے اس کی پسند کی ضرورت نہیں۔ میں تو یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ میرا دل کیا چاہتا ہے،“

مجھ کیا پسند ہے۔ میں اس کی یا تیری پسند کا تابع نہیں ہوں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے، تو اس پر غور کر اور یاد رکھ، فیصلہ میرے حق میں ہونا چاہئے، ورنہ میں تجھے زندہ گروادوں گا۔ تیری دھبی کو تیری ہڈیاں بھی نہیں ملیں گی۔“ چودھری شوکت علی نے منشی کا گریبان پکڑ کر جھٹکا دیا۔ ”تم کئی لوگ محبت کی زبان تو سمجھتے ہی نہیں ہو۔ پیر کی جوتی پیر ہی میں اچھی لگتی ہے۔ دیکھ منشی!“ انہوں نے اے ایک اور جھٹکا دیا۔ ”اگر میں چاہتا تو میرے آدمی نورائیں کو اٹھا لاتے اور تجھے خبر بھی نہ ہوتی۔ میں نے تو شرافت سے تجھ سے رشتہ مانگا ہے اور تو انکار کر رہا ہے۔ تو جا اب۔ کل تیری خبر لوں گا۔“ چودھری شوکت علی نے ایک جھٹکے سے اس کا گریبان چھوڑ دیا اور منشی اللہ دتہ آنکھیں ملتا ہوا، ڈولتے قدموں سے بیٹھک سے نکل گیا۔ دینو بڑی حسرت سے اس بوڑھے کو تک رہا تھا جو ایک باپ تھا، مگر کئی تھا اور کئی لوگوں کی، بڑے لوگوں کی نظر میں کوئی عزت نہیں ہوتی۔ وہ ایک جوان لڑکی کا باپ تھا اور لڑکی پر چودھری شوکت علی کی نظر تھی۔ چودھری شوکت علی کے ہونٹوں پر بڑی سفاکانہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی اور آنکھوں میں عجیب سی مکارانہ چمک تھی۔ دینو نے ان کی طرف دیکھ کر سر جھٹکا لیا۔ دینو کی نظروں کے سامنے اس کی اپنی تین ماہ کی بیٹی گھوم گئی تھی۔ وہ بھی تو ایک بیٹی کا باپ تھا، جسے کل جوان ہونا تھا۔ دینو کا جی چاہا، ابھی جا کر اس منشی سی جان کا گلا گھونٹ دے۔



منشی اللہ دتہ نے اپنے گھر کی دہلیز پار کی ہی تھی کہ دل میں عجیب سا درد اٹھا اور وہ وہیں بیٹھ گیا۔ نورائیں بھینس کو چارہ ڈالتے ہوئے گنگنا رہی تھی۔ اس کی گنگناہٹ نے منشی کا دل چیر کر رکھ دیا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ اس کے اندر کی چیخیں باہر نہ نکلیں مگر وہ اپنی چیخوں پر قابو نہ پاسکا اور گھٹنوں میں سر دے کر جھوٹ جھوٹ کر رو دیا۔ اس کی چیخیں چھوٹے سے آنگن میں پھیل گئیں۔ کام کرتے کرتے نورائیں کے ہاتھ ایک دم رک گئے۔ اس نے مڑ کر آواز کی سمت دیکھا، وہ اپنے باپ کو دہلیز میں گھٹنوں کے بل بیٹھا دیکھ کر چونک پڑی۔ اس کا دل انجانے خدشوں سے دھڑکنے لگا۔ وہ دوڑتی ہوئی آئی۔

”بابا!..... میرے بابا! کیا ہوا، سچے سچے کیا ہوا؟“ وہ اس کے سر کو گھٹنوں سے اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔

”بابا! مجھے بتا، چودھری نے تجھے بلایا تھا، کیا کہا ہے اس نے؟ کیوں بلایا تھا اس فرعون نے، بتا مجھے۔“ اس نے اپنے بابا کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ منشی کی آنکھیں ساوین بھادوں بنی ہوئی تھیں۔

”میرے سوئے بابا! مجھے بتا۔“ نورائیں کی آواز رنڈھ گئی۔

”کیا بتاؤں میری دھبی! کیا بتاؤں؟ اب تو رت سے دعا کرتا ہوں کہ تو پیرا ہی نہ ہوئی



ہوتی۔ کاش! تو اپنی ماں کے ساتھ ہی مر گئی ہوتی تو مجھے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں سوچ سکتا، کچھ نہیں سوچ سکتا۔“ نوراًں سب کچھ سمجھ گئی۔ بابا کے آنسوؤں نے اسے سب کچھ بتا دیا کہ چودھری نے اس سے کیا کہا ہو گا اور کیوں وہ اس کی موت کی دعائیں مانگنے لگا ہے۔ نوراًں نے اپنے بوڑھے باپ کو اٹھایا اور اسے کھری چار پائی پر لا کر بٹھا دیا۔

”تو فکر نہ کر بابا! وہ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔“ نوراًں نے کہا مگر اس کا دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی، باپ کی تسلی کے لئے کہہ رہی تھی ورنہ اسے بھی علم تھا کہ چودھری کیسا بندہ ہے۔ واقعی ہم غریبوں کی کوئی زندگی نہیں۔ اے خدا! غریبوں کو تو بیٹیاں ہی نہ دیا کر۔ اگر دیتا ہے تو پھر ایسے ظالم چودھریوں کا تابع نہ بنایا کر۔“ آنسو اندر ہی اندر موتیوں کی طرح اس کے دل کے آنگن میں گرتے رہے۔

”میں راجے کی ماں کے پاس جاتا ہوں۔“ نشی نے پگڑی سر پر جماتے ہوئے کہا۔

”کیوں بابا؟“ نوراًں نے حیرت سے باپ کی طرف دیکھا۔

”میری عزت صرف اسی طرح بچ سکتی ہے نوراًں! اسی طرح بچ سکتی ہے۔“ نشی کی آنکھوں میں پانی بھر آیا اور نوراًں کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

”بابا!..... میں بہت بُری ہوں..... بہت بُری، گھونٹ دے میرا گلا۔ میری وجہ سے تو رو رہا ہے، میری ہی وجہ سے تجھے یہ دن دیکھنے نصیب ہوئے ہیں۔ مار دے بابا! مجھے مار دے۔“ وہ نشی اللہ دتہ کے سینے سے لگی اس طرح رو رہی تھی جیسے آنسوؤں میں خود بھی بہ جائے گی۔ نشی اللہ دتہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دلاسا دیا۔

”میرے ہوتے ہوئے تو پریشان نہ ہو۔ پھر راجا ہے میرے بعد۔ جھلی دھی نہ ہو دے تھے۔“ نشی نے نوراًں کے آنسو اپنی پگڑی سے صاف کئے اور اس کی پیشانی چوم لی۔ ”تو پریشان نہ ہو، میں ابھی آیا۔“ نشی نے ایک بار پھر دلاسا دیا اور چلا گیا۔ نوراًں اس کے نقش پا دیکھتی رہ گئی۔ کتنا دکھی ہو گیا تھا اس کا بابا، صرف اسی کی وجہ سے۔ یہ بیٹیاں واقعی مصیبت ہوتی ہیں۔

کافی دیر ہو گئی تھی مگر بابا نہ لوٹا تھا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ راجا کی ماں نے کیا کہا، اس کے دل میں برے برے خیالات آرہے تھے۔ چار سو رات کا اندھیا ہوا چھا جانے کے بعد اس کا بابا اور راجا گھر میں داخل ہوئے۔

”نوراًں! تو تیار ہو جا۔“ بابا نے آتے ہی اس سے کہا۔

”کیوں بابا؟ کس لئے؟“ اس نے حیرت سے باری باری دونوں کو دیکھا۔

”زیادہ سوال جواب نہ کر، تجھے بچانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے، تو رات کے

اندھیرے میں چپ چاپ راجا کے ساتھ چلی جا۔“ ”بے“ میں اس کی ماسی کا چالیسواں ہو جائے گا تو تیرا نکاح کر دیا جائے گا۔“ نشی اللہ دتہ نے کہا۔

”نہیں بابا! میں تجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔“ نوراًں باپ سے لپٹ گئی۔

”تو سمجھ جھلی دھی! اسی میں ہم سب کی بہتری ہے۔“ بابا نے اسے سمجھایا۔

”پھر تو بھی میرے ساتھ چل۔“ اس نے باپ کے سینے سے سر رکڑتے ہوئے کہا۔

”میں بھی آ جاؤں گا۔ تو فکر نہ کر اور تیاری کر لے۔ کسی کو بھی خبر نہ ہو گی۔ جا، شاہاں!“

نشی اللہ دتہ نے بیٹی کی پیٹھ تھپکتے ہوئے محبت سے کہا اور پھر وہ روتی ہوئی اپنی کھولی میں جا گھسی۔ باپ کے حکم سے انکار بھی نہیں کر سکتی تھی اور ویسے بھی چودھری شوکت علی تو ایک شکاری کتا تھا اور اس کتے سے اسی طرح ہی بچا جاسکتا تھا۔

رات کے پچھلے پہر جب وہ راجا کے سنگ جا رہی تھی تو آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے، جنہیں وہ چادر میں جذب کر رہی تھی۔ اپنی بھوری سے لپٹ کر وہ بہت روتی تھی اور جب وہ گھر سے نکلی تو بھوری کتنی شدت سے ڈکرا رہی تھی، جیسے اسے علم ہو کہ اس کی ساتھی، اس کی مالکن اب کبھی نہیں آئے گی۔ اس کے ڈکرانے کی آواز اسے دُور تک سنائی دے رہی تھی۔ بابا کی سسکیاں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں اور اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا تھا۔

اس نے راجا کے سنگ اس طرح جانے کے تو خواب نہ دیکھے تھے۔ اسے تو یہ خبر تھی کہ اس کے سنگ اسے جانا ہے مگر کاش! یہ یوں نہ ہوا ہوتا۔ اس کے خوابوں کا شہزادہ سہرا باندھ کر، گھوڑے پر بیٹھ کر براتیوں کے ساتھ اُسے پیانے آتا، تب اس کے خواب پورے ہوتے۔ سرخ جوڑا پہنتی، ڈولی میں بٹھتی۔ یہ خواب تو ازل سے ہی لڑکیاں دیکھتی ہیں۔ مگر بعض کے خواب پورے نہیں ہوتے۔ انہی لڑکیوں میں نوراًں بھی تھی۔ دنیا پور کی الہڑ پوشیزہ۔ دونوں اپنے گھوڑے پر خاموش بیٹھے تھے، صرف گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دے رہی تھیں۔

”میں نے لالی کو بتا دیا ہے کہ ہم ”بے“ جا رہے ہیں۔“ آخر راجا نے اس سکوت کو توڑا۔

”کیوں؟“ نوراًں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”تاکہ وہ حالات سے ہمیں باخبر رکھے۔“ راجا نے کہا۔

”کیا یہ ضروری تھا؟“

”ہاں..... چاچا جو یہاں ہے، اس کے بارے میں اطلاع ملنی ضروری ہے۔“

”تم کتنے اچھے ہو راجا! حالانکہ مجھے پریشانی میں خیال ہی نہ آیا۔“ اس نے راجا کی

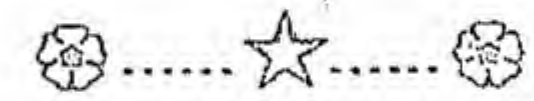


پیٹھ پر سر ٹکا دیا۔  
”یہی تو فرق ہے عورت اور مرد کی عقل میں۔“ راجا نے مزاحیہ انداز میں کہا تو وہ صرف سسرا کر رہ گئی۔

صبح جب بے کی چھوٹی سی مسجد سے اذان کی آواز آرہی تھی تو وہ بے پہنچ چکے تھے۔ راجا کی ماسی کی بہو اور بیٹے نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور راجا نے انہیں سب کچھ بتا دیا تھا۔ شادو پوری بات سن کر نہایت افسوس کر رہی تھی۔ شادو، راجا کے خالہ زاد بھائی نذیر احمد کی بیوی تھی۔

”اچھا ہوا جو اسے لے آیا۔ پتہ نہیں وہ ظالم کیا سلوک کرتا اس کے ساتھ۔“ شادو نے نوران کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا اور نہ جانے کیوں، نوران رو دی۔ شادو اسے تسلیاں دینے لگی۔

”جتنے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی نوران!“ نذیر احمد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا اور نوران کو یوں لگا، جیسے وہ واقعی کسی پناہ گاہ میں آگئی ہو، جہاں چودھری جیسا بھڑیا نہیں آ سکتا تھا۔ اس کے آنسو ٹھم گئے۔



صبح کا سورج نشی اللہ دتہ کے لئے کل سے بھی زیادہ مصیبتیں لے کر آیا تھا۔ چودھری شوکت علی کے آدمی صبح سویرے اس کے گھر پہنچ گئے۔ رات بھر تو وہ سو نہیں سکا، روتا رہا تھا اور اس کا تکیہ آنسوؤں سے بھیکا ہوا تھا۔ صبح ہی تو آنکھ لگی تھی اور وہ آگئے۔ یہ تینوں کڑیل جان تھے۔

”اٹھ اوٹھی!“ ایک نے اسے جھنجھوڑ ڈالا تو وہ ایک دم آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔  
”کیا بات ہے؟“

”چودھری نے حویلی میں بلایا ہے۔“ دوسرے آدمی نے جلدی سے کہا۔  
”مگر کیوں؟“ نشی جان کر انجان بن گیا۔

”تیرے کو خبر نہیں؟ چل۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ نشی ان کے ساتھ ہو لیا۔ بھلا انکار کر کے بھی کیا کرتا۔

حویلی کے آہنی گیٹ سے وہ اندر داخل ہوا۔ اس گیٹ سے وہ کئی بار حویلی میں داخل ہو چکا تھا، مگر آج اسے یوں لگ رہا تھا، جیسے یہ اس کا مقبرہ ہو۔ تینوں آدمی اسے بیٹھک کے دروازے پر چھوڑ کر چلے گئے۔ نشی نے خود کو سنبھالا اور ڈمگاتے قدموں سے اندر داخل ہو گیا۔ چودھری شوکت علی صوفے پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا اس کا اونچا شملہ اس کی گردن کی طرح اکڑا ہوا تھا۔ نشی کو جھکا جھکا سا دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”نانشی! کیا سوچاؤ نے؟“ چودھری نے پاؤں ہلاتے ہوئے کہا۔  
”چودھری! میں تیری بات نہیں مان سکتا۔“ نشی نے سر جھکا کر کہا۔  
”کیوں؟“ چودھری نے غصے سے جتنے کی جتنے پرے پھینک دی۔  
”بس، کہہ جو دیا۔“ نشی نے بے پروائی سے کہا۔

”دیکھ نشی! شرافت سے مان جا، ورنہ میں نوران کو اٹھوا لوں گا۔“ چودھری شوکت کی آنکھوں میں شعلے لپک رہے تھے۔  
”میں تیری یہ بات مرنے دم تک نہیں مان سکتا۔“ نشی نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

”پھر اپنی موت کے لئے تیار ہو جا۔ میں نے بڑے غیرت مند دیکھے ہیں۔ اوئے کدھر مر گیا تھا! ادھر آ۔“ مارے غصے کے اس سے جملے بھی صحیح ادا نہیں ہو رہے تھے۔  
”جی چودھری جی!“ وہی تینوں آدمی جو نشی کو لائے تھے، بیٹھک میں داخل ہوئے۔  
”جاؤ اور نوران کو اٹھا لاؤ۔ میں اس کے سامنے ہی اس سے شادی کروں گا، جاؤ۔“ چودھری شوکت علی نے کہا اور وہ تینوں تیزی سے چلے گئے۔

”نشی! میں تیرے ٹوٹے کر کے کھیتوں میں ڈلوا دوں گا۔ تُو نے میرا غصہ نہیں دیکھا، تیری سات پشتیں بھی یاد کریں گی۔“ مارے غصے کے وہ دیوانے ہو رہے تھے۔ ”بلا نا اب دہی کے مگیترو۔ دیکھوں گا اُسے میں۔“ انہوں نے نشی کے ٹھوکر ماری۔ ”ذلیل، کتے، نمک حرام!“ گالیوں کا ایک نوارہ تھا، جو ان کے منہ سے پھوٹ نکلا تھا۔  
تھوڑی دیر بعد چودھری کے بھیجے ہوئے تینوں آدمی واپس آگئے، مگر وہ خالی ہاتھ تھے۔  
”نوران کہاں ہے؟“ چودھری شوکت دھاڑے۔

”چودھری جی! وہ تو ہے ہی نہیں گھر میں۔“ نتھونے کہا۔

”کیا کہہ رہے ہو؟ ادھر ادھر دیکھو، کہیں لگی ہوگی۔“ وہ بل کھا کر رہ گئے۔

”گھر میں ٹریک کھلا پڑا تھا، جیسے کوئی افراتفری میں گھر سے گیا ہو۔“ گاما بولا۔

”ہوں!..... تو اس کا مطلب ہے تُو نے اسے دنیا پور سے کہیں باہر بھیج دیا ہے، نشی! کبھی میں کہوں تُو اتنے سکون سے کیوں بیٹھا ہے۔ کل کی طرح گڑگڑا کیوں نہیں رہا، رو کیوں نہیں رہا۔ بتا، کہاں بھیجا ہے تُو نے اُسے؟“ چودھری شوکت علی نے اسے گریبان سے پکڑ کر جھکا دیا۔ ”بتا؟“ وہ گرجے۔ نشی کے لب کپکپائے، لیکن وہ خاموش رہا۔

”ذلیل بڑھے! میں تیری بوٹیاں اڑا دوں گا۔“ انہوں نے سپٹر اس کے منہ پر مارا اور وہ بوڑھا شخص ان کا پیٹر برداشت نہ کر سکا اور نیچے گر گیا۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔  
”بتاؤ نے پڑھے!“ چودھری شوکت علی دانت پیستا ہوا اس کی طرف بڑھا۔



”تو مجھے ختم کر دے، مگر تجھے کچھ نہیں بتاؤں گا۔“ نشی نے چہرے سے خون پونچتے ہوئے کہا۔

چودھری شوکت علی نے اس پر مکوں، لائقوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ چودھری شوکت علی ہانپ گئے مگر نشی نے زبان نہ کھولی۔

”دینو! دوپہر کو اسے گھوڑے کے پیچھے باندھ دینا اور کھیتوں میں گھسیٹنا جب تک نہیں بتائے گا۔ اور دوسرے لوگوں کو بھی یہ تماشا دکھایا جائے۔ اب اسے کمرے میں بند کر دے۔“ چودھری نے ایک ٹھوکر نشی کے سر پر رسید کی۔ نشی بے ہوش ہو چکا تھا۔

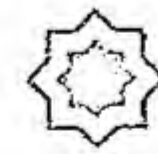
پتلی ہوئی دوپہر تھی، پورے گاؤں کے لوگ جمع تھے۔ چودھری شوکت علی گھوڑے پر سوار تھا اور دیو نے باگ پکڑی ہوئی تھی۔ ایک گھوڑے کی دم سے رستا باندھ کر نشی کے تخی سے وجود کو اس سے باندھ دیا گیا تھا اور پھر ایک شور مچ گیا۔ نشی کو روڑوں میں گھسیٹا جا رہا تھا، وہ چیخ رہا تھا۔ ”بچاؤ..... بچاؤ“ کی آوازیں اس کے گھسٹتے ہوئے جسم سے اٹھ رہی تھیں، مگر کوئی بھی نہ تھا جو اسے بچانے کے لئے آگے بڑھتا۔ چودھری گھوڑے پر بیٹھا تھبتہ لگا رہا تھا۔ نشی اللہ دتہ لہو لہان ہو گیا۔ اس میں زندگی کی کوئی رمت باقی نہ رہی تھی۔ پھر اسے حویلی کے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔

چودھری نے اس پر مظالم کی انتہا کر دی تھی۔ رات کو بھی اس نے بوڑھے نشی کے ناخن موچنے سے نکلوا دیئے تھے اور اس کی چیخیں پورے کمرے میں گونج کر رہ گئی تھیں۔ کوئی نہیں تھا جو اسے بچاتا۔ پھر چودھری نے اس کی ہتھیلی میں میٹھی ٹھکڑا دیں اور اس کی چیخوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

”نشی! بتا دے، نوراں کہاں ہے؟“ اس نے نشی کے بال پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کیا۔ ہر وار کے بعد ان کا یہی سوال ہوتا۔ وہ نوراں کی خاطر دیوانے ہو رہے تھے۔

”نہیں۔“ اس نے نہایت زخمی نظروں سے چودھری کو دیکھا اور انکار میں گردن ہلا دی۔

”میں تیری بوٹی بوٹی کر دوں گا۔“ چودھری نے اسے ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا۔



گھوڑا سرپٹ ”جے“ کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔

یہ لالی کا بھائی کریمو تھا، جو جلد از جلد جے پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہ چودھری کا ظلم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا، جب اس نے نشی کو گھوڑے سے باندھ کر گھسٹوایا تھا۔ پھر لالی نے اسے بتا دیا تھا کہ نوراں کہاں ہے۔ وہ جے پہلے بھی جایا کرتا تھا۔ اس کے اپنے بھی رشتے دار وہاں تھے۔ وہ راجا کی ماسی کا گھر بھی جانتا تھا۔

ٹھیک اس وقت جب چودھری شوکت علی نے نشی کے ہاتھ میں کیل ٹھوکی تھی، اس وقت کریمو، راجا کی ماسی کا دروازہ کھٹکٹا رہا تھا۔ نذیر باہر آیا، وہ کریمو کو پہلے سے جانتا تھا، اس سے بغلیں ہو گیا۔

”کیسے آنا ہوا کریمو؟“

”میں راجا سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”وہ تو یہاں.....“

”جھوٹ نہ کہنا۔ بہت ضروری کام ہے۔ وہ میری بہن کو بتا کر آیا تھا۔“ کریمو نے اس کی بات کاٹ دی۔

”اندر آ جاؤ۔“ نذیر اسے اندر لے آیا۔ تب ہی راجا آ گیا۔

”کیسے آئے؟“

”راجا! غضب ہو گیا ہے۔ میں یہ بتانے آیا ہوں کہ چودھری نے نوراں کے باپ پر مظالم کی انتہا کر دی ہے، نہ اسے مرنے دیتا ہے اور نہ جینے۔“ کریمو بولا۔

”میں سمجھا نہیں؟“ راجا نے کہا۔ پھر کریمو نے ہولے ہولے سب کچھ بتا دیا۔

”نہیں، نہیں.....“ اندر سے نوراں دوڑتی ہوئی باہر نکلی۔ ”مجھے لے چلو کریمو بھائی!“

مجھے لے چلو۔ میرا بوڑھا باپ کس طرح برداشت کرے گا یہ ظلم؟ مجھے لے چلو، خدا کے واسطے۔“ نوراں نے کریمو کے ہاتھ تھام لئے۔

”مجھے لے چلو، کریمو بھائی! مجھے لے چلو۔“

میرا بوڑھا باپ کس طرح برداشت کرے گا یہ ظلم؟ مجھے لے چلو، خدا کے واسطے۔“ نوراں نے کریمو کے ہاتھ تھام لئے۔

”میرے بابا..... بابا کے پاس لے چلو..... مجھے لے چلو۔“



مجھے لے چلو کاورد کرتی ہوئی وہ بے ہوش ہو کر کمرہ کے بازوؤں میں جھول گئی۔

☆.....☆

نشی اللہ دتہ سرخ حویلی کے تہ خانے میں سوکھی گھاس پر زنجیروں سے بندھا، ستون سے ٹپک لگائے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور زخموں میں ہونے والے درد کی ٹپسیں اُسے بے حال کر رہی تھیں۔ دو روز سے اس نے کچھ کھایا بھی نہ تھا اور پیٹ کا دوزخ اس سے ایندھن کا مطالبہ کر رہا تھا اور وہ مجبور تھا۔ چودھری شوکت علی ہر قیمت پر نوراں کو حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ نشی بھوک پیاس سے بڑھال ہو جائے گا تو اصل روز اُگل دے گا۔ بھوک چیز ہی ایسی ہے کہ اس کی طلب پر آدمی اپنی عزت بھی داؤ پر لگا دیتا ہے اور چودھری اس وقت کا منتظر تھا، جب نشی بھوک سے بے حال ہو جائے۔ مگر یہ اس کی بھول تھی۔ نشی اپنی اکلوتی بٹی کی خاطر ظلم سہنے کو تیار تھا۔ روٹی کی خاطر وہ اپنی بٹی کا سودا نہیں کر سکتا تھا کہ بغیر اس مالک حقیقی کے حکم کے پتا نہیں ہلتا ہے، پھر وہ اپنی سانسوں کی آمد و رفت پر کیوں دھیان دے۔ وہ صبر و شکر سے اپنی موت کا انتظار کرنے لگا۔

پتیلی میں جوکیل ٹھونکی گئی تھی، اب بھی موجود تھی اور پورا ہاتھ سوج گیا تھا۔ نشی نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح وہ کیل نکال لے۔ دانت تو اس کے تھے نہیں، اور جو تھے، اُن میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ کیل کو کھینچ لیتے۔ تکلیف سے نشی کی روح تک کراہ اُٹھی تھی، اس لئے اس نے کیل کو بھی ہاتھ کا ایک حصہ سمجھ کر اپنی کوششیں ترک کر دیں۔ آنکھوں میں عجیب سی سوزش ہو رہی تھی۔ وہ اتنا رویا تھا کہ آنکھوں میں آنسو ہی باقی نہیں رہے تھے۔ رو لینے سے شاید یہ سوزش کم ہو جاتی، اس آگ پر تو پانی پڑ جاتا۔ مگر من میں جو اگنی سداگ رہی گی، اس پر کون پانی کے چھینٹے دیتا؟..... اس کے باوجود اس کا دل مطمئن تھا، اسے کوئی بے گلی نہیں تھی۔

”چودھری! تیرے شکاری کتے بھی میری بٹی کی طرف رخ نہیں کر سکتے۔“ نشی نے نہایت جی سے سوچا۔ ”اب وہ مضبوط ہاتھوں کی پناہ میں ہے، تیری جاگیر سے بہت دور، جہاں اسے کوئی دکھ اور پریشانی نہیں ہوگی، وہ سکون سے ہوگی۔ تیرا خوف بھی نہ ہوگا۔“ نشی اللہ دتہ نے آنکھیں موند لی تھیں اور وہ خیالوں میں اپنی نوراں کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے نوراں بہت خوش ہے۔ تب ہی ہلکے سے کھٹکے کی آواز پر اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا، اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی اور آنکھیں اتنی مشکل سے کھلیں جیسے انہیں چیر کر کھولا گیا ہو۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آنکھوں میں زخم ہو گئے ہوں۔ بالکل دیسے ہی، جیسے اس کے بوڑھے جسم پر تھے اور یہ اس کے آقا چودھری شوکت علی کی

نہایت تھی۔ اس نے دیکھا سامنے ہی تہ خانے کی سیڑھیوں پر دیوہو لے ہو لے قدم رکھتا ہوا اتر رہا تھا۔ وہ سخت سہا ہوا لگ رہا تھا۔ پھر وہ سیڑھیاں اتر کر سوکھی گھاس پھوس پر سے ہوتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔

”نشی!.....!“ دیوہو نے ہو لے سے اسے پکارا اور اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ نشی نے اسے کوئی جواب نہ دیا، بس ایک ٹپک اسے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں بے شمار سوالات تھے اور آنکھیں اداسیوں کے گہرے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ دیوہو اس کی آنکھوں کی تاب نہ لا سکا اور کپکپا کر رہ گیا۔

یہ بوڑھی آنکھیں اُس سے کچھ پوچھ رہی تھیں۔ کیا؟ یہ اسے بھی پتہ نہ تھا۔ اس لئے اس نے نظریں جھکائیں اور بٹل میں دبی ہوئی پوٹلی نکالی، اُسے کھولا اور نشی اللہ دتہ نے دیکھا، اس پوٹلی میں روٹی تھی۔ پیٹ کی آگ بجھانے کا ایندھن، جو دیوہو اپنے ساتھ لایا تھا اور نشی کے اس قدر نزدیک کہ ہاتھ بڑھا کر وہ لے سکتا تھا۔ مگر اس نے منہ پھیر لیا۔ وہ اس طرف دیکھنا بھی نہ چاہتا تھا۔

”نشی! میں تیرے لئے روٹی لایا ہوں۔ یہ کھا لے۔“ دیوہو آہستہ سے بولا۔

”کیوں لایا ہے تُو؟“ نشی غرایا۔

”ابھی تجھے ظلم سہنے ہیں نا۔“ دیوہو نے کہا۔

”ہاں، مجھے معلوم ہے۔“ نشی بے پردائی سے بولا۔

”تُو یہ کھا لے۔“ دیوہو نے اصرار کیا۔

”میں نہیں کھاؤں گا۔“ نشی نے ضدی بچے کی طرح کہا۔

”پھر ظلم کیسے سہے گا؟“ دیوہو نے اس کی طرف دیکھا۔

”جیسے اب تک سہتا آیا ہوں۔ اور ان شاء اللہ اسی طرح ثابت قدم رہوں گا۔“ نشی کے لہجے میں نوجوانوں جیسا عزم تھا۔

”خدا کے واسطے نشی! تجھے تیری دھبی کا واسطہ۔“ دیوہو تجنی لہجے میں بولا۔

”تجھے چودھری نے تو نہیں بھیجا؟“ نشی نے اسے گھورا۔

”بالکل نہیں۔ تُو اس بات کی فکر نہ کر۔ اسے تو پتہ بھی نہیں۔ میں چھپ کر آیا ہوں۔“

نشی! میں بھی تو تیری طرح غریب مزارع ہوں۔ چودھری کے قدموں میں پڑا ایسا روڑا ہوں، خنہ چودھری جب چاہے ٹھوکر مار دے۔ آج تجھ پر یہ وقت پڑا ہے اور کل یہی وقت تجھ پر بھی آ سکتا ہے۔ پتہ نہیں ہم لوگوں کی مصیبت کے دن کب ختم ہوں گے؟ ہماری تو نسلیں ان زمینداروں کے ظلم سہتے سہتے ختم ہو گئی ہیں، مگر نہ ظلم کم ہوئے اور نہ ظالم ختم ہوئے۔“ دیوہو کے لہجے میں ہزاروں آنسوؤں کی ٹپکی تھی۔ دل میں درد کا طوفان تھا، جو اُڑا چلا



آ رہا تھا اور دینو اس طوفان کو دباتے دباتے پریشان ہو گیا تھا۔  
 ”دینو! چودھری شوکت تو اپنے باپ سے بھی نمبر لے گیا، ظلم کرنے میں۔ ظالم وہ بھی تھا، مگر اتنا ظالم نہ تھا۔“ نشی نے کہا۔

”سانپ کے بچے بھی سنپو لیے ہوتے ہیں نشی! اور وہ بھی تو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرا ہے، اس کا بھی یہی حال ہو گا۔ تم دیکھنا کہ مولا بڑا انصاف والا ہے۔“ دینو نے کہا۔  
 ”انصاف والا ہے، تبھی تو ان کی رستی ڈھیلی چھوڑی ہوئی ہے۔“ نشی بڑبڑایا۔

”کب تک آخر؟..... اُس کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔ کبھی تو ہمارے بھی دن بدلیں گے نشی! ہم بھی سکھی ہوں گے، ہماری لڑکیاں بھی آزادانہ پھریں گی، کوئی بڑی نظر نہیں ڈالے گا۔ وہ وقت ضرور آئے گا..... ضرور آئے گا۔“ دینو نے نشی کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا اور نشی درد کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ اس کے کندھے پر تو بہت گہرا زخم تھا۔

”بھاف کرنا۔“ دینو اس کی سسکاری پر شرمندہ ہو گیا۔ ”مجھے خیال ہی نہ رہا کہ تیری تو بوٹی بوٹی زخمی ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ نشی ہولے سے بولا۔ درد کی ٹیسیں اُسے بے حال کئے دے رہی تھیں اور وہ ہونٹوں کو دانتوں تلے دبائے ان ٹیسوں کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”لے، اب روٹی کھالے۔ ساتھ میں بھاجی ہے۔“ دینو نے کہا۔  
 تب نشی نے روٹی کی طرف دیکھا۔ وہ تذبذب کا شکار تھا، مگر روٹی کو دیکھتے ہی اس کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ روٹی کی خوشبو سے اس کے خون کی گردش تیز ہو گئی اور پھر اس نے منہ کھول دیا۔ دینو نوالے بنا بنا کر اس کے منہ میں ڈالنے لگا۔

”اُف مالک! یہ وقت بھی آنا تھا کہ میں اس قدر لاغر ہو جاؤں گا کہ کسی دوسرے کا محتاج ہو جاؤں۔ اپنے ہاتھ ہوتے ہوئے بھی خود اپنی مرضی سے انہیں کام میں نہ لاسکوں۔“ نشی اللہ دتہ نے نوالہ چباتے ہوئے نہایت دکھ سے سوچا۔

روٹی کھانے کے بعد وہ خود میں ایک نئی توانائی محسوس کرنے لگا۔ چودھری کے ظلم سہنے کا اُس میں نیا ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔ درد کی ٹیسوں میں بھی کمی آ گئی تھی۔

”دیکھ نشی! تو چودھری کو نہ بتانا کہ میں تیرے پاس آیا تھا۔“ دینو بڑے ہنسی لہجے میں بولا۔

”میں پاگل نہیں ہوں۔“ نشی دھیرے سے مسکرایا۔  
 ”اچھا نشی! اب میں چلا ہوں۔“ دینو نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ گھاس پھر کڑا کر رہ گئی۔

”تیری مہربانی دینو!“ نشی نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

”اپنے جیسے غریب بھائی کی مدد کرنا میرا فرض ہے نشی! جو بھی مجھ سے ہو سکتا تھا، میں نے کیا۔“ دینو نے کہا اور پھر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ تب نشی اپنی زخمی آنکھوں سے اُسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ”واقعی دینو! ہم مزارع لوگ بہت مجبور ہیں..... ہماری نسلیں سستی رہیں، ظلم سہتی رہیں۔ مجھے یاد ہے، جب میں چھوٹا سا تھا اور جب اس حویلی کے قریب سے گزرا کرتا تھا تو کبھی گھنگھروں کی جھنکار سنائی دیتی، کبھی نسوانی چیخیں اور شراباں شراب ہنر کی آوازیں..... یہی حویلی ہی چودھری سرفراز علی کی عیاشی کا اڈا تھی۔ پھر اس نے دلشاد پور کو اپنا مسکن بنایا۔ ایک جواری احمد حسن اس سے جوئے میں دلشاد پور ہار گیا تھا۔ اس نے اپنی کل جائیداد جوئے کی نذر کر دی تھی۔ اور جب اُس نے دلشاد پور کی ملکیت کے کاغذات چودھری سرفراز کے حوالے کئے اور چودھری سرفراز علی نے نہایت غرور سے کاغذات لئے۔ اور دوسرے روز جب عورتیں کنویں پر پانی بھرنے گئیں تو کنویں کے پانی کی سطح پر تیرتی ہوئی لاش دیکھ کر چیخ پڑیں۔ پھر وہ لاش نکلائی گئی۔ وہ احمد حسن تھا، جس نے اپنا گاؤں جوئے میں ہار دیا تھا، اپنے گاؤں کے لوگوں کو ایک اور ظالم کے ہاتھوں جوئے میں ہار گیا تھا اور اس نے کتنی زند گیوں کا جوا کھیلا تھا، کتنی زند گیوں کو داؤ پر لگایا تھا۔ اور پھر چودھری سرفراز علی دلشاد پور منتقل ہو گیا۔ دلشاد پور کی زمین چودھری شجاعت علی کے قبضے میں آئی تھی۔ کبھی کبھی وہ فصل کے زمانے میں دنیا پور کا بھی چکر لگایا کرتا تھا اور اس کے نہ ہونے پر سب نے سکھ کی سانس لی تھی۔ کافی عرصہ دنیا پور میں سکون رہا، مگر چودھری شوکت علی کی آمد نے یہاں کی پرسکون زندگی میں ہلچل مچا دی۔ واقعی دینو! تم نے سچ سوچا ہے۔ اُس کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں..... مگر اے بخشنے والے! اے پاک پروردگار! ابھی اور کتنے امتحان باقی ہیں ہمارے؟..... ابھی کتنے مظالم باقی ہیں؟ اور کتنے چودھری شوکت جیسے ظالم لوگوں کو ہم پر اپنا تسلط قائم رکھنا ہے؟ کب تک یہ ہم پر حکومت کریں گے؟“

نشی اللہ دتہ، خدا کے حضور گرگڑا رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور اس بننے والے نمکین پانی نے جب پلکوں کا بند توڑا اور گالوں پر آ گیا تو نشی کے گال سلگ اٹھے جیسے کسی نے چہرے پر تیزاب ڈال دیا ہو اور پورے چہرے پر آگ لگ گئی ہو۔ آنسو اُس کے زخموں پر شعلے بن کر سلگ اٹھے تھے اور نشی کے دل کی عیش گہرائیوں سے چیخیں باہر نکلنے کو بے تاب تھیں۔ مگر اس نے ہونٹوں کو دانتوں تلے بچھ کر بہت مشکل سے حلق سے نکلنے والی چیخوں کو روکا۔



دن بڑی ہی مست خرامی سے بیدار ہوا تھا۔ ٹھنڈی پروا کے مست جھونکے درختوں کو لہکاتے پھر رہے تھے..... جب یہ جھونکے شیشم کے درختوں کے پتوں اور اس پر



پھلیوں میں سے گزرتے تو پھلیوں کے باہمی ملاپ سے عجیب قسم کا سازمٹھوٹ جاتا۔ اس درخت کے نیچے چار پائی پر نوران لپٹی تھی۔ اس کی کل رات سے بڑی حالت تھی۔ ہوش اب اور پھر بے ہوش ہو جاتی۔ ساری رات کریو، راجا، نذیر اور شادو نے جاگ کر گزاری تھی۔ اب بھی وہ بے ہوش تھی۔ راجا اس کی ہتھیلیاں مسل رہا تھا۔ نذیر اور کریو بھی اسے ہر ممکن طریقے سے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ شادو، نوران کا مخصوص چہرہ دیکھتی تو کتنے ہی آنسو، مالا کے موتیوں کی طرح آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگتے۔ سفید تکیے پر اس کے سیاہ ریشمی پال بکھرے ہوئے تھے، اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور گالوں پر آنسوؤں کی بے شمار لکیریں تھیں..... وہ بے ہوشی میں بار بار ”بابا، بابا“ پکار رہی تھی۔ سہ پہر ڈھل چکی تھی اور نوران نے اب تک کچھ بھی نہ کھایا تھا۔ بس شادو زبردستی کسی نہ کسی طرح چچ سے اس کے منہ میں دودھ ڈال رہی تھی۔

”میرا خیال ہے، حکیم جی کو بلا لو۔“ راجا نے نذیر سے کہا۔  
 ”پاگل ہوا ہے؟..... حکیم کہے گا لڑکی کہاں سے آئی؟“ نذیر نے گھر کا۔  
 ”وہ کیوں پوچھے گا، بھائی نذیر؟“ کریو نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔  
 ”نوران کو یہاں کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔“ شادو دھیرے سے بولی۔  
 ”تو کوئی بہانہ کر دینا۔“ راجا نے جلدی سے کہا۔  
 ”نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ بدنای ہو گی۔ لوگ کہیں گے، نذیر کا خالہ زاد بھائی کسی لڑکی کو بھگالایا ہے۔“ نذیر نے سر کو متنی جنبش دیتے ہوئے کہا۔  
 ”تو پھر کیا کریں بھائی نذیر؟“ راجا رو ہانسا ہو گیا۔  
 ”اسے ہوش میں لانے کی کوشش۔“ نذیر نے بے پروائی سے کہا، جیسے اُسے کوئی فکر ہی نہ ہو۔ مگر نہیں، اُسے فکر تھی۔ آخر وہ ایک جوان لڑکی تھی۔ کل کلاں کو کوئی بات ہوتی تو اس کا پوزیشن خراب ہو جاتی۔ وہ جو ہمیں، اسی جگہ پیدا ہوا، پلا بڑھا، بیابا گیا اور جو گردن اٹھا کر چلتا تھا، بدنای سے تو اس کی گردن جھک جاتی اور وہ بدنام ہونا نہ چاہتا تھا۔ اسے ابھی یہیں رہنا تھا۔

کئی پہر گزر گئے اور یہ پہر صدیوں پر محیط لگ رہے تھے۔ وہ سب ہی پریشان تھے۔ طویل بے ہوشی خطرناک بھی تھی اور نوران تو دو پہر سے بے ہوش ہوئی تھی تو اب تک ہوش نہ آیا تھا۔ نہ تھوڑی تھوڑی دیر پہلے تو اسے ہوش آ جاتا تھا۔ مغرب کا وقت تھا، شادو نے نماز پڑھی اور پھر خدا تعالیٰ کے حضور گڑ گڑا کر دعا مانگنے لگی۔

”اے پاک پروردگار! یا غفور الرحیم! تو غفار ہے یا رب! تو رحیم ہے، تو رحمان ہے، تو رحیم ہے، تو ان داتا ہے۔ یا میرے سونے رب! تو ہی ہماری کوتاہیوں کو درگزر کرنے والا

ہے۔ اے میرے باری تعالیٰ! تو ہی عزت دیتا ہے اور تو ہی ذلت دیتا ہے۔ میرے رب! میں بہت گناہ گار ہوں، مگر ہم گناہ گاروں کی سننے والا تو صرف تو ہی ہے۔ ہماری عزت تیرے ہاتھ ہے۔ تو نوران کو ہوش دے، ہمیں بدنای کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔ تو عزت دے میرے مالک!..... یہ لڑکی خیریت سے اپنے گھر چلی جائے۔ یہ امانت ہے ہمارے پاس اور امانت میں خیانت نہ ہو۔“  
 شادو رو رو کر دعائیں مانگ رہی تھی، گڑ گڑا رہی تھی اور جائے نماز اس کے آنسوؤں سے تر ہو رہی تھی۔

ادھر کریو، نوران کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دے رہا تھا۔ پھر شادو بھی جاء نماز تہہ کر کے رکھ آئی اور نوران پر کچھ پڑھ پڑھ کر پھر نکلتے گی۔  
 نوران کی پلکوں میں جنبش ہوئی۔ شادو نے چچے سے اس کے منہ میں پانی ڈالا۔ کتنے ہی لمحے وقت کی قید سے آزاد ہونے لگے اور ان گزرتے لمحوں میں نوران کو مکمل ہوش آ گیا۔ شادو کی دعائیں مستجاب ہو گئی تھیں اور کتنے ہی سوال اس کی آنکھوں میں چل رہے تھے۔ کریو پر نظر پڑتے ہی وہ اٹھ بیٹھی اور پھر چار پائی سے اترنے کی کوشش میں لڑکھڑا گئی۔ شادو نے اسے تھام لیا۔

”کریو بھائی! مجھے لے چلو..... تمہیں خدا کا واسطہ مجھے لے چلو۔“ نوران ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑا رہی تھی۔  
 ”دیکھو، اب تم مت روؤ، پھر طبیعت خراب ہو جائے گی۔“ کریو جلدی سے آگے بڑھا۔

”پھر تم مجھ لے چلو نا، کریو بھائی!“ وہ منمنائی۔  
 ”ضرور لے جاؤں گا۔“ کریو نے کہا۔  
 ”چلو پھر۔“ نوران سر پر چنری جھاتے ہوئے جلدی سے بولی۔  
 ”پہلے کچھ کھاؤ، پھر۔“ نذیر نے کہا۔  
 ”پتہ نہیں، میرے بابا نے بھی کچھ کھایا ہو گا یا نہیں۔ نہیں نذیر بھائی! میں نہیں کھاؤں گی کچھ۔“ نوران کی آنکھیں چھلک پڑیں۔  
 ”پھر میں تمہیں نہیں لے جاؤں گا۔“ کریو نے کہا تو نوران ڈبڈبائی نظروں سے کریو کو دیکھ کر رہ گئی۔

”اچھا لے آؤ، شادو بھائی!“ نوران ہار کر چار پائی پر بیٹھ گئی۔  
 چند لمحے یونہی گزر گئے۔ راجا قریب ہی کھڑا اسے بڑی گہری گہری نظروں سے تک رہا تھا، مگر نوران نے اس سے تو کوئی بھی بات نہیں کی۔ وہ تو بس، جانے کے لئے بے چین



تھی۔

”نوراں!“ راجا نے دھیرے سے پکارا۔ تب نوراں نے گردن موڑ کر دیکھا، راجا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نوراں کچھ نہ بولی۔

”تیرے بابا نے کہا تھا، ہم یہیں رہیں گے۔“ راجا نے یاد دہانی کرائی۔

”چاہے وہ ظالم اُدھر میرے بابا پر ظلم کر کر کے اُسے ختم کر دے۔ راجا! اُس کی بوڑھی ہڈیوں میں اتنی جان نہیں ہے۔ میں ضرور جاؤں گی دنیا پور۔ میں خود چودھری سے بات کروں گی۔“ نوراں ایک عزم سے بولی۔

”مجھے اسی سے تو بچانے کے لئے نشی چاچا نے یہاں بھیجا ہے۔“ راجا نے کہا۔

”اب میں اسے بچانے کے لئے جاؤں گی۔ آخر ہم دونوں باپ بیٹی کا دکھ سا بٹھا ہے۔“ نوراں کے لہجے میں دکھ ہی دکھ تھا۔ ہزاروں آرزوؤں کی پامالی کی گردن تھی اور اس کی آنکھیں بار بار آنسو بہانے کے لئے تیار رہتیں۔

”تو شیر کی کچھار میں ہاتھ دے رہی ہے۔“ راجا نے اُسے تنبیہ کی۔

”بابا کو نکالنے کے لئے مجھے شیر کی کچھار میں جانا ہوگا، راجا!“ وہ سر جھکا کر بولی۔

”تو نہیں جائے گی۔“ راجا نے اپنے لہجے میں محکم پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”تم..... تم مجھے روکنے والے کون ہو؟“ جب راجا کا لہجہ بدلتا تو نوراں کے بھی ثور بدل گئے۔ اسے راجا کے اس انداز پر بے حد دکھ ہوا تھا۔ بجائے اسے تسلی دینے اور اس کا ساتھ دینے کے، اُس پر رعب جمار ہا تھا۔

”نوراں! تیرے بابا نے تجھے میرے حوالے کیا تھا۔“ راجا چیخ کر بولا۔

”تیرے حوالے کیا تھا نا، کوئی خدا کے حوالے تو نہیں کیا تھا۔“ نوراں تڑ سے بولی۔ ”تو کچھ بھی کہہ، میں ضرور جاؤں گی۔“ نوراں نے کہا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ چودھری کے چنگل سے بابا کو کس طرح چھڑائے گی۔ وہ تو بہت ظالم ہے۔ یا خدا! غریبوں کو بیٹیاں نہ دیا کر۔ کاش! میں بابا کا بیٹا ہوتی۔ پھر نہ چودھری کی نظر مجھ پر پڑتی اور نہ بابا کو اذیتیں برداشت کرنا پڑتیں۔ نوراں دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو دی۔ نڈیر اور کریمو گھبرا گئے۔

”خدا کے واسطے نوراں! تُو نہ رو۔ پھر حالت بگڑ جائے گی اور میں تجھے نہیں لے جاؤں گا۔“ کریمو اُس کا سر تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

”کریمو بھائی! مجھے ضرور لے جانا۔“ نوراں بچوں کی طرح آنکھیں رگڑتی ہوئی بولی تو کریمو کو یوں لگا، جیسے کسی نے اس کے دل پر چھری چلا دی ہو۔ نوراں بھی اسے لالی کی طرح پیاری تھی۔ وہ دونوں کو ہی بہت چاہتا تھا۔ اسے یوں لگتا جیسے اس کی ایک نہیں بلکہ دو

بہنیں ہیں۔ تب ہی شادو آگئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چنگیر تھی اور دوسرے ہاتھ میں جگ تھا، جس میں دودھ تھا۔

”لے، اب جلدی سے کھا لے۔“ شادو نے چنگیر اس کے سامنے رکھ دی اور جگ سے دودھ گلاس میں اُٹھایا۔ پورے دن کا، ہلکی ہلکی آگ پر کاڑھا ہوا دودھ سرخ ہو چکا تھا۔ پھر شادو نے راجا، کریمو اور نڈیر کو بھی روٹی، دودھ دیا۔ کھی شکر بھی بنا کر لائی تھی، وہ بھی سامنے رکھ دیا۔

نوراں نے بہت مشکل سے آدھی روٹی کھائی اور تھوڑا سا دودھ پیا۔

”بس بھائی!“ نوراں نے گلاس شادو کی طرف بڑھایا۔

”جھٹی ہوئی ہے۔ پوری روٹی کھا۔ کل سے بھوکی ہے۔“ شادو نے کہا۔

”کل سے.....؟“ نوراں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”ہاں، ہاں۔“ شادو نے سر ہلا دیا۔

”یعنی کریمو بھائی کل آیا تھا، اور میں تھوڑی دیر پہلے تک بے ہوش رہی..... اُف بھائی! اُس ظالم نے تو بابا کی ہڈیاں بھی سُرمہ کر دی ہوں گی۔“ نوراں بے چین ہو گئی، جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔

”چلو کریمو بھائی!“

”نوراں! میں نے تجھے روکا نہیں۔“ راجا نے گھر کا۔

”ضروری نہیں کہ میں تیری بات مانوں۔“ نوراں نے چادر اوڑھتے ہوئے کہا۔

”اب تک تو مانتی آئی ہے۔“ راجا کا لہجہ نہ جانے کیوں طعنیہ ہو گیا۔

”تُو یہ چاہتا ہے کہ میں غلط بات بھی مانوں۔ آج پتہ چلا، راجا! اگر تُو میرے بابا کا بیٹا ہوتا تو یوں چین سے نہ بیٹھتا۔“ نوراں نے کہا۔

”میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔“ راجا نے کہا۔

”نہیں..... میں اکیلی ہی جاؤں گی۔“

”میں جاؤں گا۔“ راجا مضبوط لہجے میں بولا۔

”بھائی! روک لے اسے۔ نظیر بھائی! منع کریں اسے۔“ نوراں نے کہا۔

”نوراں! ٹھیک کہتی ہے راجا!“ نظیر نے کہا تو راجا نے تہر آلود نظروں سے نڈیر کو دیکھا۔

”مجھے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ نوراں آئی بھی میرے ساتھ تھی اور میرے ہی ساتھ جائے گی۔ میں اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔“

”راجا! تجھے میری قسم، اُس محبت کی قسم، جو تجھے مجھ سے ہے۔ مجھے اکیلے ہی جانا



دے۔“ نوراً نے راجا کے ہاتھ تھام کر نہایت ناجی لہجے میں کہا۔  
 ”لیکن.....“ راجا نے کچھ کہنا چاہا مگر نوراً نے بات کاٹ دی۔  
 ”لیکن دیکھیں کچھ نہیں راجا! بس تو نہیں جائے گا میرے ساتھ، ورنہ قسم رب پاک کی،  
 میں کبھی تیری شکل نہیں دیکھوں گی۔“ نوراً نے مضبوط لہجے میں کہا تو راجا نے اس کے  
 ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لئے۔

”میں نہیں چاہتا کہ زندگی کے کسی موڑ پر ہم ملیں تو تو منہ پھیر لے۔ مجھے پتہ ہے کہ  
 اب تو جائے گی تو میری نہیں رہے گی۔“ راجا دھیرے دھیرے سے کہتا رہا اور پھر نوراً نے  
 محسوس کیا کہ اس کے ہاتھوں پر نمی پھیل رہی ہے۔ نوراً نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لئے۔  
 ”اتنے بڑے ہو کر روتے ہو؟ مرد کبھی نہیں روتے، راجا!“ نوراً نے ایک طویل  
 سانس لے کر کہا۔

”چاہے کتنے ہی گھاؤ دل پر لگیں؟“ راجا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا، مگر اس نے  
 کوئی جواب نہ دیا۔ پھر وہ کریمو سے بولی۔  
 ”چلو، ویسے بھی خاصا اندھیرا پھیل گیا ہے۔“

کریمو، نذیر اور راجا سے گلے ملا۔ نوراً، شادو سے لپٹ گئی اور نہ جانے کیوں اپنی  
 بے بسی پر اس کی آنکھیں جل تھل ہو گئیں۔ پھر وہ سر جھکائے باہر آ گئی وہ تینوں بھی انہیں  
 باہر تک چھوڑنے آئے۔ ایک درخت سے کریمو کا گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ کریمو کو دیکھ کر وہ  
 ہنہانے لگا۔ کریمو نے زمین کی اور پھر وہ دونوں گھوڑے پر بیٹھ گئے۔

”رب را کھا!“ نذیر اور شادو بولے مگر راجا کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ تو بس نوراً کو دیکھ رہا  
 تھا، جو کریمو کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ اور پھر گھوڑا ان دونوں کو لے کر اندھیرے میں گم ہو  
 گیا۔ راجا کو اپنے دل کی دھڑکنیں اور گھوڑے کی ٹاپیں صاف سنائی دے رہی تھیں اور پھر وہ  
 آوازیں بھی آہستہ آہستہ اندھیروں میں گم ہو گئیں۔

”چل راجا!“ نذیر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”بھائی نذیر.....!“ راجا کے لب کپکپائے۔

”ہاں راجا!..... وہ تیرے مقدر کا ستارہ نہ تھی۔ مجھے لگتا ہے، اسے چودھری کی حویلی  
 میں چمکنا ہے، راجا!“

”نہیں بھائی نذیر! یہ نہ کہہ۔“ راجا ٹپ کر رہ گیا۔

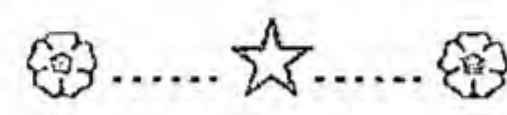
”مقدر سے کوئی نہیں لڑ سکتا، راجا!“ شادو نے کہا۔

”مقدر صرف میرے لئے ہی رہ گیا ہے۔ گاؤں میں اور بھی تو لڑکیاں تھیں، چودھری  
 کی نظر میرے مقدر کے ستارے پر کیوں پڑی؟ کیا اس کی چمک زیادہ تھی؟ اسی لئے اس کی

حویلی میں اجالا ہونا تھا؟“ راجا، نذیر کی بانہوں میں سر چھپا کر رو دیا۔  
 ”پلگے! مرد روتے نہیں ہیں۔“ نذیر اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا۔  
 ”کیا مرد، انسان نہیں ہوتے؟..... ان کے سینے میں دل نہیں ہوتا؟..... وہ بھی یہی  
 کہتی تھی۔“ راجا چیخ پڑا۔

”ہوتے ہیں دل بھی۔ مگر مرد کی شان آنسو بہانے میں نہیں ہے۔ اوئے پلگے! تو  
 عورتوں سے بھی بدتر ہے۔“ نذیر نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔

”چل اندر۔“ شادو نے اس کا بازو تھاما اور پھر وہ اسے تھامے تھامے گھر کی طرف لے  
 گئے۔ راجا کو یوں لگ رہا تھا کہ اپنے بہت ہی قریبی عزیز کو دفن کر قبرستان سے واپس جا رہا  
 ہو۔ اور یہ حقیقت بھی تھی کہ اس نے اپنے اربابوں کے لاشے کو، اپنی آرزوؤں کے جنازے  
 کو کریمو کے ساتھ گھوڑے پر بٹھا کر بھیجا تھا۔ وہ لٹا لٹا سا نذیر کے گھر میں داخل ہوا۔



”شراب..... شراب..... شراب.....“ ہنر کی آواز چودھری کی بیٹھک میں گونج  
 رہی تھی اور چودھری شوکت علی، بڑی سی رنگین کرسی پر بیٹھے نشی پر پڑنے والے ہنروں کی  
 آوازوں سے محظوظ ہو رہے تھے۔ نشی ہنر کھا کر دُہرا ہوا جاتا۔ اب تو مارے تکلیف کے، اس  
 کے منہ سے آواز بھی نہ نکل رہی تھی۔

”نشی! اب بھی وقت ہے، تو بتا دے کہ نوراً کو کدھر چھپایا ہے؟“ چودھری شوکت علی  
 نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ مگر نشی نے کوئی جواب نہ دیا۔ چودھری ہولے ہولے قدم  
 اٹھاتا ہوا نشی کے قریب آیا، جو فرش پر زخموں سے چور پڑا ہوا تھا۔ چودھری شوکت نے اپنا  
 پاؤں نشی کی گردن پر رکھ دیا اور نشی درد سے کراہ اٹھا۔ نشی کی ٹھوڑی کے زخم پر چودھری کی  
 ملتان جوتی کی نوک لگ رہی تھی اور تکلیف میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔

”نشی! بتا دے۔ میرے بندوں نے آس پاس کے گاؤں کھنگال ڈالے ہیں، مگر اس کا  
 پتہ نہیں چلا۔ تو نے ایک رات میں اسے کدھر بھیج دیا؟..... نشی میں تیری ہمت کی داد دیتا  
 ہوں کہ تیرا دماغ مجھ سے بھی تیز نکلا۔ اگر میں اُسی روز ہی نوراً کو اٹھوا لیتا تو آج یہ دن نہ  
 دیکھنا پڑتا۔ بتا دے نشی!“ چودھری نے اس کی گردن پر پاؤں کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔  
 نشی نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور چودھری مارے طیش کے پیچھے ہٹ گیا۔ اسے نشی کی  
 آنکھوں میں اپنے لئے نفرت اور حقارت کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

”اوئے تھو! ادھیڑ دے اس کی چٹری۔“ چودھری شوکت علی نے ایک زوردار ٹھوکر نشی کو  
 ماری اور کھولتے ذہن کے ساتھ پھر کرسی پر بیٹھ گیا اور دینو سے کہا۔

”اوئے دینو! اب تو آجا۔ تھو تھک گیا ہے، اس کی سانس بھی پھول گئی ہے۔“ چودھری



نے اُسے حکم دیا تو دینو کپکپا کر رہ گیا۔  
 ”او آگے آبد بخت!“ چودھری نے گردن موڑ کر اُسے دیکھا اور وہ جلدی جلدی آگے  
 بڑھ آیا کہ کہیں یہی ہنتر اسی پر نہ پڑنے لگے۔  
 ”مالک!“ دینو گھکیا۔

”کیا ہے؟“ چودھری نے حقہ کڑکڑاتے ہوئے اُسے گھر کا۔  
 ”مالک! آج بیل کو چھڑی ماری تھی نا، تو یہ تیسری انگلی نکل گئی۔ بہت تکلیف ہو رہی  
 ہے۔“ دینو نے ایک دم بات بتائی۔

”تو تُو نے سویرے کیوں نہ بتایا؟“ چودھری شوکت علی نے حقہ کڑکڑاتے ہوئے کہا۔  
 ”مالک! معمولی سی بات تھی۔“ دینو بولا۔

”اگر معمولی سی بات ہے تو پھر اٹھا لے ہنتر!“ چودھری نے کہا۔  
 ”مالک! سچا (سیدھا) ہاتھ ہے نا۔“ دینو جلدی سے بولا۔

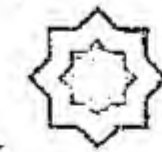
”اُلٹے ہاتھ کو کام میں لے آ۔“ چودھری شوکت علی ہنس کر بولا۔  
 ”مالک! اُلٹے ہاتھ سے کام نہیں ہوتا میرے سے۔“ دینو نے چنچا چاہا۔

”تُو زرا بدھو ہے۔“ چودھری نے ہاتھ جھٹکے۔ ”چل بخشو! تُو آجا۔“  
 بخشو بغیر کسی پس و پیش کے بڑھ آیا۔ تھو اور بخشو، یہ دونوں تو چودھری سرفراز علی کے بھی

وفادار تھے اور اب اس کے بیٹے کے بھی، انہیں تو اپنی وفاداری نبھانی تھی اور انہیں یہ بھی پتہ  
 تھا کہ ایسا وقت ان پر بھی آسکتا ہے۔ مگر وفاداری کی وجہ سے مجبور تھے۔ کل تک تو ٹنٹی اللہ

دنتہ بھی چودھری کے وفاداروں میں سے تھا۔ جو چودھری کہتے، وہ کرتا تھا اور آج اُسے اپنی  
 وفاداریوں کا صلہ یہ مل رہا تھا کہ وہ فرش پر پڑا تھا اور چودھری اس کی وفاداریوں کا خزانہ

وصول کر رہا تھا۔ وہ زخموں سے چور چور تھا اور اس کے بوڑھے جسم پر مزید زخموں کا اضافہ کیا  
 جا رہا تھا۔  
 بخشو نے ہنتر سنبھال لیا اور پھر شراب، شراب کی آوازیں آنی شروع ہو گئی تھیں!



رات کے پچھلے پہر، سرخ حویلی کے گیٹ پر ایک گھوڑا آ کر رکا اور وہ دونوں اس پر  
 سے اتر پڑے۔ یہ نورائیں اور کریمو تھے۔

”اب تُو جا، کریمو بھائی!“ نورائیں نے کہا۔  
 ”میں بھی ساتھ ہی جاؤں گا۔“ کریمو جلدی سے بولا۔

”کیا تجھے لالی پیاری نہیں؟“ نورائیں نے ایک دم اُس سے سوال کر دیا۔  
 ”ہے پیاری۔ تُو بھی تو لالی ہے نا۔“

”نہیں کریمو بھائی! یہ سمجھنا کہ تیری صرف ایک بہن ہے، دوسری مر گئی ہے۔ یہ جو سرخ  
 حویلی ہے نا، کئی لڑکیوں کے خون سے اس پر یہ سرخی آئی ہے اور آج اس میں میری تمناؤں،

آرزوؤں اور اُمنگوں کا خون بھی شامل ہو جائے گا۔“ نورائیں دکھ سے بولی۔  
 ”نورائیں بہن.....!“ کریمو کے لب کپکپائے۔

”یہ حویلی ایسی دلہل ہے، جس میں جانے والی ہر لڑکی دھنس جاتی ہے، اور پھر وہ کبھی  
 باہر نہیں آتی۔ میں بھی انہی میں شامل ہونے جا رہی ہوں۔“ اچانک نورائیں کی آواز بھرا

گئی۔ کریمو اُسے دیکھتا رہ گیا اور پھر وہ حویلی کے آہنی گیٹ سے اندر چلی گئی۔ خاموش  
 خاموش، بوجھل قدموں سے جیسے کوئی چھانسی کے تختے پر جا رہا ہو۔

”شراب، شراب، شراب!“  
 اس آواز پر نورائیں چونک گئی۔ اُس کا دل دھڑک دھڑک کر بے حال ہوا جا رہا تھا۔ وہی

آواز پھر آئی تو وہ ٹھٹھک گئی اور تیزی سے بھاگ کر اس طرف بڑھی، جہاں سے یہ آوازیں آ  
 رہی تھیں اور پھر وہ دروازے پر پہنچ کر رک گئی۔

”بتا دے نشی! کہاں ہے تیری دھی؟“ چودھری شوکت علی کی آواز اس کی سماعت سے  
 ٹکرائی۔ اس آواز کے جواب میں کوئی آواز سنائی نہ دی۔ نورائیں کا دل رکرچی رکرچی ہو گیا۔

اس کا پورا وجود کانپ گیا۔ شراب، شراب..... اُسے یہ کڑے اپنے دل پر پڑتے محسوس ہو  
 رہے تھے۔ اور پھر وہ پردہ ہٹا کر اندر چلی گئی۔ ”شراب، شراب کی آوازوں میں اُس کی



آہٹ دب کر رہ گئی تھی۔ کمرے کا منظر نورائیں کا دل ہلانے کے لئے کافی تھا۔ اُس کا باپ، فرش پر گھڑی بنا پڑا تھا۔ ظالم حکم دے رہا تھا اور حکومت اس حکم پر عمل کر رہا تھا۔ اور جب بخشو نے ہنسر اوپر اٹھایا تو وہ دوڑی اور ”بابا“ کہہ کر نشی کے زخمی وجود پر ڈھیر ہو گئی۔ بخشو کا ہنسر، نورائیں کی کمر پر پڑ چکا تھا۔ وہ بلبلا کر رہ گئی۔

”بس کر، بخشو!“ چودھری شوکت علی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سب حیران رہ گئے تھے۔ ”جس کا انتظار تھا، وہ خود ہی آگئی ہے۔ میرے کارندوں کو نہیں ملی، خود چل کر آگئی ہے۔ بتا نشی! ستارے کس کے اچھے ہیں؟“ چودھری شوکت علی بڑے غرور سے نشی سے پوچھ رہا تھا۔ نشی نے نورائیں کی طرف دیکھا اور نورائیں نے اس کی آنکھوں کا سوال پڑھ لیا۔ ”تُو کیوں آئی ہے؟“

”بابا!..... بابا! میں کیا کروں؟..... مجھے خود پر اختیار نہیں رہا۔ بابا! تجھے میری خاطر یہ ظلم برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ بابا! میں نے سوچا کہ اس طرح تُو بچ جائے گا۔ مگر بابا! طالبوں نے تو تیری بوٹی بوٹی الگ کر دی ہے۔ بابا! کاش تُو میرا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دیتا اس وقت جب میں پیدا ہوئی تھی۔“

نورائیں باپ کی حالت دیکھ کر تڑپ تڑپ کر رہی تھی۔ چودھری شوکت علی نے نورائیں کو بازو سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

”نشی! اب میں تیرے سامنے نورائیں سے شادی کروں گا اور تجھے اجازت دینی ہوگی۔ جاؤ دینو! مولوی کا انتظام کرو۔“ چودھری نے ہستے ہوئے کہا اور دینو تیزی سے باہر چلا گیا۔ نشی نے کوئی جواب دینے کے بجائے آنکھیں موند لی تھیں جس کا مطلب تھا کہ وہ اجازت نہیں دینا چاہتا، وہ اُس سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا۔

”بخشو! شروع ہو جاؤ۔“ چودھری سانپ کی طرح بل کھا کر بولا۔ اور بخشو نے ہنسر تو لا۔

”نہیں چودھری!..... خدا کے واسطے چودھری! یہ ظلم نہ کرو..... میں تجھ سے شادی کروں گی۔ میرا بابا مزید ظلم برداشت نہیں کر سکے گا۔ وہ مر جائے گا۔“ نورائیں، چودھری شوکت علی کے پیروں سے لپٹ گئی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ نشی کی تو اب روح بھی زخمی ہو چکی ہے اس کے آنے سے۔

”جھیلے! تیری جگہ یہاں نہیں، ادھر ہے۔“ چودھری نے اپنے سینے پر ایک ہاتھ رکھ کر پیروں سے نورائیں کو اٹھایا اور خود سے لپٹا لیا۔

”بڑا پ، بڑا پ!“

”چودھری! روک اسے۔“ نورائیں اُس کے بازوؤں میں چلی۔

”نورائیں! پھر اپنے باپ سے کہہ کہ وہ اجازت دے تجھے۔“ چودھری شوکت علی نے نہایت سفاکی سے کہا۔

”بابا!..... بابا! تُو کہہ دے..... بابا! ہم کئی لوگ مجبور ہوتے ہیں۔ تُو ہی کہتا تھا کہ ہم لوگ بہت مجبور ہوتے ہیں، ہمیں مالکوں کی ہر بات ماننی پڑتی ہے۔ اب تُو اپنی باتوں سے انحراف کیوں کر رہا ہے؟ تُو کہہ دے۔ اگر تُو نہیں کہے گا تو پھر بھی.....“ نورائیں رو دی۔ مگر نشی نے کوئی جواب نہ دیا، وہ ہنسر کھاتا رہا۔

”چودھری! روک دے اسے۔ میں نے تجھے کہہ تو دیا، میں شادی پر راضی ہوں۔“ نورائیں تڑپ کر بولی۔ اُسے یوں لگ رہا تھا، ہنسر اس کے بابا کی پیٹھ پر نہیں، بلکہ اُس پر برس رہے ہوں۔

”بس کر بخشو! میں اب اس سے پوچھتا ہوں۔“ چودھری شوکت علی آگے بڑھا اور پھر نشی کا پاؤں ہلا کر بولا۔

”نشی! اب بھی وقت ہے۔“

مگر نشی کچھ نہ بولا۔ وہ یہاں تھا ہی کب؟..... اس نے تو جب یہ سنا تھا کہ ”چودھری! میں تجھ ہی سے شادی کروں گی۔“ تو اس ایک جھلے نے اسے سانس کی زنجیر سے آزاد کر دیا تھا۔ ڈوری ایک دم ہی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ، جو دو روز سے مسلسل ظلم سہہ رہا تھا اور موت اُس کے قریب نہیں آ رہی تھی، نورائیں کی صرف ایک ہی بات پر زندگی سے موت کا فاصلہ طے کر گیا تھا۔ نشی اللہ دتہ اس دنیا سے ناتا توڑ گیا تھا۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ اس کی بیٹی نے اپنا سہارا ڈھونڈ لیا ہے..... اب اس کے زندہ رہنے کا کوئی جواز نہ تھا۔

”اوئے بخشو!“

”جی چودھری جی؟“ بخشو سر جھکا کر بولا۔

”اود دیکھنا، نشی ٹمک تو نہیں گیا؟“ چودھری شوکت علی نے نہایت ہی تمسخر آمیز لہجے میں کہا اور نورائیں کی طرف بڑھ گیا، جو ایک طرف کھڑی دہشت زدہ نظروں سے اپنے بابا کو دیکھ رہی تھی۔ درد کا ایک طوفان تھا، جو اس کے سینے سے اٹھ کر پورے وجود پر مسلط ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سوتے خشک ہو چکے تھے، مگر دل رو رہا تھا۔ اس کا لہو بوند بوند ٹپک رہا تھا۔ نورائیں کو اپنی آنکھوں میں دل کی کرچیاں چھتی محسوس ہو رہی تھیں اور وہ اس چھین سے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔

”نورائیں! ادھر بیٹھ جا۔“ چودھری شوکت علی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ کچھ بھی نہ بولی، بس صرف چودھری کو دیکھ کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا کہ لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والا چودھری شوکت علی، آنکھیں جھکانے پر مجبور ہو گیا۔ اس



کا ہاتھ اب بھی چودھری کے ہاتھ میں تھا اور نظریں بخشو پر مرکوز تھیں جو اس کے بابا کے سینے سے کان لگا کر شاید دھڑکن سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اُس نے سر اٹھا کر چودھری کی طرف دیکھا۔

”اُوئے کیا بات ہے بخشو؟“ چودھری شوکت علی نے مونچھ کو مروڑا دیتے ہوئے کہا۔  
”چودھری جی! یہ تو مک گیا۔“ بخشو ہچکچا کر بولا۔ اس سے پہلے کہ چودھری کچھ کہتا، نورائے نے ایک جھٹکے سے اس سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی، مگر چودھری کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

”ناں، ناناں..... یہ جھوٹ ہے۔“ نورائے زور زور سے سر ہلا رہی تھی۔

”مجھے چھوڑ دے چودھری!..... مجھے چھوڑ دے۔“ نورائے کے لہجے میں چٹانوں جیسی سختی تھی۔ ”میرا بابا نہیں مر سکتا..... یہ جھوٹ ہے..... میں اپنی جان دے کر اسے زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔“ اچانک اس میں نہ جانے کیسے اتنی ہمت آگئی کہ اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا اور دوڑتی ہوئی نشی اللہ دتہ کے پاس پہنچ گئی۔ وہ فرش پر بے حس و حرکت پڑا تھا اور فرش اس کے خون سے سرخ ہو چکا تھا۔ نورائے ساکت کھڑی چند لمحوں کے بعد بکھرتی رہی، پھر ہولے ہولے اس کے قریب بیٹھ گئی اور اس کا زخمی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

”بابا!..... بابا! تُو اپنی نوری سے ناراض ہو گیا ہے..... تُو کیوں رُوٹھ گیا ہے، اپنی نوری سے بابا!..... میں بہت بری ہوں۔ بہت بری ہوں، بابا!..... میں تو تیری خاطر وہاں سے آئی تھی۔ مجھے تو جیسے ہی پتہ چلا کہ میری خاطر تجھ پر ظلم ہو رہے ہیں، تو میں آنے کو چل گئی۔ بابا! یہ زخم چودھری نے تیرے جسم پر نہیں، بلکہ تیری نوری کے دل پر لگائے ہیں۔ دیکھ بابا! میرا دل کیسے لہو کے آنسو رو رہا ہے۔ میں تجھے کیسے اپنا سینہ چیر کر دکھاؤں؟..... بابا! تُو کیوں چلا گیا؟..... تُو کیوں چلا گیا، مجھے ان خالوں میں تنہا چھوڑ کر؟..... بھرے سنسار میں، میں اکیلی کیسے رہوں؟ میری چھایا کہاں گئی؟ بابا! دھوپ سے تو میں جھلس جاؤں گی۔ بابا! تُو کیوں چلا گیا؟ کیوں چلا گیا؟..... مجھے بھی لے جاتا۔ میں بھی تیرے ساتھ جاؤں گی۔“ نورائے باپ کی زخموں سے چور لاش سے لپٹ کر روتے ہوئے بولے جا رہی تھی۔

”میں بہت بری ہوں، بابا!..... بہت بری۔ میں نے تیرا کہا نہیں مانا اور واپس شیر کی کچھار میں آگئی ہوں۔ مجھے بھی ساتھ لے جا بابا!..... میں اماں سے بھی مل لوں گی۔ وہ تجھ سے پوچھے گی کہ نوری کو کہاں چھوڑ آئے۔ بولو، پھر کیا جواب دو گے بابا؟ اماں کے سامنے شرمندہ ہو گے۔ مجھے بھی لے چلو۔ مجھے یہاں کس کے سہارے چھوڑ کر جا رہے ہو؟ بابا! میں کیسے رہوں گی تیرے بغیر؟“ نورائے، بابا کی موت پر نوحہ کننا تھی۔ نشی کی اس بے وقت

موت نے نورائے کی ذات کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے۔ وہ پتھرے میں بند پنچھی کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ وہ رو رہی تھی، بین کر رہی تھی۔ اور..... اور چودھری شوکت علی چپ چاپ کھڑا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا، ایک لمحے کے لئے اُسے بھی بہت دکھ ہوا تھا۔ نورائے کا دکھ اُسے اپنے دل میں اترنا محسوس ہوا تھا۔ مگر اس نے سوچا۔

”اگر نشی میری بات مان جاتا اور شرافت سے نورائے کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا دیتا تو آج اُسے یہ دن نہ دیکھنے پڑتے۔ خود اپنی جان سے گیا اور نورائے کو بھی دکھی کر گیا۔ کیا ملا دونوں کو؟ نشی کے ہاتھ کیا آیا؟ نورائے کو تو ہمیشہ دکھ دے گیا، ساری عمر کی جدائی دے گیا۔

تب چودھری شوکت علی اس کے قریب گیا اور ہولے سے اپنا لرزتا ہاتھ نورائے کے کندھے پر رکھ دیا۔ اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا بوجھ محسوس کر کے بین کرتی نورائے ایک دم خاموش ہو گئی۔ گردن موڑ کر دیکھا تو چودھری شوکت علی اُسے اپنی محبت پاش نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ ناگن کی طرح ہلکھا کر اُٹھی، اُس کی آنکھوں میں شعلے لپک رہے تھے اور چودھری کے لئے ان آنکھوں میں قہر کی بجلیاں تھیں۔ نورائے پلکیں جھپکائے بنا ایک ٹک چودھری کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چودھری کے لئے نفرت ہی نفرت، حقارت ہی حقارت تھی۔

”نورائے!“ چودھری شوکت علی کے لب کپکپائے۔

”چودھری! میرا نام اپنی اس ناپاک زبان پر نہ لا، جس سے تُو میرے بابا پر ہتھ برسانے کا حکم دیتا رہا ہے۔“ نورائے پھنکاری۔

”نورائے! اس میں میرا قصور نہیں ہے۔“ چودھری نے کہا۔

”تو پھر کس کا قصور ہے؟“ نورائے ہلکی کی طرح غرائی۔

”اگر تیرا باپ میری بات مان جاتا تو کاہے کو اتنے جھنجٹ کئے جاتے؟ وہ سکھ چین سے رہتا، تمام مزارعوں میں اس کا رتبہ بلند ہو جاتا۔ وہ فخر کرتا خود پر۔ اور جب میں نے تمہیں اس سے مانگا تھا تو اسے خوش ہونا چاہئے تھا۔ آخر وہ دنیا پور کے چودھری کا ہونے والا سر تھا۔“ چودھری شوکت علی نے نہایت فخر و غرور سے کہا۔

”ہونہ!..... ہونے والا سر۔“ نورائے تسخّر سے انہی اور چودھری شوکت علی حیرت سے اسے ٹکنے لگے۔

”چودھری! یہ تیری انہونی سی خواہش کبھی پوری نہ ہوگی۔ زندہ رہتے ہوئے میرا بابا تیرا سر نہ بن سکا تو اب مردہ نشی بھی تیرا سر نہیں بنے گا۔ میں کبھی ایسا نہیں چاہوں گی۔“

”مگر نوری! تُو نے ہی تو کہا تھا کہ چودھری! میں تجھ سے شادی کروں گی۔“ چودھری شوکت علی نے اُس کی بات دہرائی۔



”وہ اور وقت کی بات تھی، جب میرا بابا زندہ تھا۔ اگر تو اُس کی جاں بخشی کر دینا تو شاید میں تیرے احسان کے بوجھ تلے دب کر اس کو منالیتی اور تجھ سے شادی کر لیتی۔ مگر اب تو یہ ناکس ہے۔ تو قاتل ہے، میرے بابا کا قاتل۔ اور کوئی لڑکی اپنے باپ کے قاتل کو اپنے من کا مالک نہیں بنے دیتی۔ اور میں بھی اور لڑکیوں سے مختلف نہیں ہوں۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

”تو..... تو اب انکار کر رہی ہے؟“ چودھری شوکت نے دانت کچکا کر کہا۔

”ہاں۔“ نورائیں نہایت اطمینان سے بولی

”نورائیں! میں بہت برا آدمی ہوں۔“ چودھری شوکت علی گرجے۔

”بتانے کی ضرورت نہیں۔ یہ تم نے اپنے ”اس کارنامے“ سے ثابت کر دیا ہے۔“ نورائیں نے اپنے بابا کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ نورائیں کی آنکھیں پھر آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ اس کے بابا کی لاش بے گور و کفن فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کی لاش پر سوائے نورائیں کے، رونے والا دوسرا کوئی نہ تھا۔ اور کوئی ایسا نہ تھا، جو نورائیں کو دلاسا دیتا، اسے تکی کے دو بول سناتا۔ چودھری سے تو ایسی اُمید ہی رکھنا فضول تھا۔ قتل کر کے جسم کا ایک ایک عضو علیحدہ کرنے والے کا نام چودھری شوکت علی تھا۔ نورائیں کی گہری آنکھوں کی تہ میں دھواں ہی دھواں پھیل رہا تھا اور اب وہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ وہ چودھری کے سامنے ڈٹ جانا چاہتی تھی، سنگلاخ چٹان کی طرح۔ وہ چودھری کے ناپاک ارادوں کو کامیاب نہ ہونے دے گی۔ نورائیں نے ایک عزم سے سوچا اور ہونٹوں کو دانتوں تلے کھلنے لگی۔ آنسو روکنے سے زیادہ آنسو پینا اندوہناک ہوتا ہے اور وہ بھی آنسو پیتے ہوئے ایک مسلسل کرب سے گزر رہی تھی۔

تب ہی دینو آ گیا اور بولا۔

”مالک!“

”کیا بات ہے؟“ چودھری شوکت علی شیر کی طرح دھاڑے۔

”اوجی! آپ نے کہا تھا کہ مولوی کو لے آؤں۔ مولوی تو دو روز کے لئے ”جھڑولا“

گیا ہوا ہے جی۔“ دینو نے سر جھکا کر کہا۔

”ٹھیک ہے، ابھی یہ بھی اپنے دھدے سے منکر گئی ہے۔ اسے لے جاؤ اور کسی کمرے

میں بند کر دو اور اسے مجھ سے شادی پر راضی کرو۔ جاؤ بخشو!..... تھو! پرے کر داسے میرے

سامنے سے۔“ چودھری شوکت علی نے چیخ کر کہا اور بخشو اور تھو نے نورائیں کو پکڑ لیا۔

”اور اسے چھوڑ کر آؤ تو منشی کی لاش کھیتوں میں پھینک دو، تاکہ کتے اور گدھ اپنا پتہ

بھر سکیں۔“ چودھری کی آنکھوں میں شعلے لپک رہے تھے۔

”چودھری! خدا کے خوف سے ڈر۔ لاش کی اتنی بے حرمتی؟“ نورائیں بخشو اور تھو کے درمیان چلتی ہوئی بولی۔ تب چودھری شوکت علی ہولے ہولے چلتے ہوئے اس کے قریب آئے اور بولے

”ہمارے ڈھور ڈنگر مر جاتے ہیں تو انہیں ہم کھیتوں ہی میں پھینک دیتے ہیں اور منشی ہمارے کسی اڑیل ڈھور سے کم نہیں تھا، کبھی سوہنڑیں؟“ چودھری شوکت علی اُس کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے نہایت تسخر سے بولے۔ ان کے ہونٹوں پر طعنیہ مسکراہٹ تھی ہوئی تھی اور اس مسکراہٹ نے نورائیں کے دل میں کئی زخموں کا اضافہ کر دیا۔ پھر وہ سر جھکائے تھو اور بخشو کے ساتھ باہر چلی گئی۔

”لے جا، دینو! اس مردود کی لاش پھینک آ، تاکہ سو پرے لوگ اُٹھ کر کچھ دیکھیں تو پہلے اسی پر نظر پڑے۔“ چودھری شوکت علی نے منشی کی لاش کو تھو کر پس مارتے ہوئے کہا۔

”اچھا مالک! آپ اپنے کمرے میں جا کر سوئیں، چلیں میرے ساتھ، میں اس کا انتظام کرتا ہوں۔“ دینو یہ دلخراش منظر دیکھ کر ضبط نہ کر سکا تھا۔

”ہاں..... مجھے نیند بھی آ رہی ہے۔ ساری رات جاگا ہوں نا۔“ چودھری نے دھیمی آواز میں کہا اور پھر دینو کا سہارا لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

”مالک! باہر سے تالا لگا دوں نا، تاکہ کوئی نہ آ سکے؟“ دینو نے کہا۔

”ہاں۔ مگر پہلے ادھر آ۔“ چودھری نے پلنگ پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

”جی مالک!“ دینو تیزی سے قریب گیا۔

”کیا میں بہت برا ہوں، دینو؟“ چودھری نے بچوں کی طرح پوچھا۔

”نہیں..... مالک! کون کہتا ہے؟“ دینو اس اچانک سوال پر ششدر رہ گیا۔ اس

کی زبان لڑکھرائی تھی اور اس کے اندر کا دینو چیخ پڑا تھا۔ ”دینو! بول دے کہ ہاں چودھری! تم بہت برے آدمی ہو۔“ مگر یہ الفاظ لبوں سے ادا کر کے اُسے منشی اللہ دتہ جیسا حشر کروانا

پڑتا، پھر اس کی بیوہ ماں، بہنوں، بیوی اور چند ماہ کی بچی کا کیا ہوتا؟

”پھر..... پھر بتا دے دینو! وہ مجھ سے شادی پر راضی کیوں نہیں ہوتی؟..... دینو! تو جانتا ہے، میں نے زندگی میں پہلی داری محبت کی ہے اور شاید آخری داری بھی۔“ چودھری شوکت علی نے بچوں کی سی مصحوبیت سے کہا۔

”چودھری! زہرہ جی.....“ دینو نے کہنا چاہا، مگر چودھری شوکت علی نے اُس کی بات کاٹ دی۔

”میری بیوی کم، جاسوس زیادہ ہے اور مجھے اس سے کبھی بھی محبت نہیں ہوئی، صرف

بھڑائی ہے۔ اور یہ بات تو بھی جانتا ہے، وہ بھی تو میرے جیسی ہے۔ ہم دونوں ایک



دوسرے کو کچھ بھی نہ دے سکے۔ اس کے ارمان بھی تو مٹی میں مل گئے نا؟ اور اب نوراًں میرے ارمانوں اور اُمنگوں کو ملیا میٹ کر دینا چاہتی ہے۔“ چودھری شوکت علی کی آنکھوں میں وحشت بھر گئی۔ ”یہ لڑکیاں اتنی ظالم کیوں ہوئی ہیں؟“ وہ دھیرے سے بڑبڑائے۔

”مالک! آپ زبردستی نکاح کر لیں۔ کیوں دل جلاتے ہیں؟“ دینو نے مشورہ دیا۔ ”اب مجھے بھی ضد ہو گئی ہے دینو! پہلے یہ ضد تھی کہ اس کا باپ راضی ہو۔ وہ مر گیا، مگر اڑیل ٹٹو کی طرح راضی نہ ہوا اور اب میری ضد ہے کہ نوراًں آپ کہے کہ وہ مجھ سے شادی کرے گی۔“ چودھری کی آنکھوں میں ضدی سی چمک تھی، اپنی بات منوانے کا غرور تھا۔

”مالک! اس ضد کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔“ دینو نے سر جھکا کر کہا۔

”کیا مطلب؟“ چودھری شوکت علی نے اُسے گھر کا۔

”مالک! اگر نوراًں بھی جان سے چلی گئی، تو؟“ دینو نے خدشہ ظاہر کیا۔

”تو دنیا پور کا مالک بھی کنویں میں چھلانگ مار دے گا۔“ چودھری نے مضبوط لہجے میں

کہا۔ ”اگر ایسا نہ کر سکا تو پھر دنیا پور، قبرستان بن جائے گا۔“

”نہیں، مالک! نہیں۔“ دینو کانپ کر رہ گیا۔ ایسا عزم، ایسی محبت، ایسا جنون، ایسا

پاگل پن!

”دینو! میں نے سنا تھا کہ نوراًں کا کوئی سنگیتر بھی ہے۔“ چودھری شوکت علی نے

اچانک کہا۔

”جی ہاں..... سنا ہے۔“ دینو بولا۔

”کون ہے وہ؟“

”پتہ نہیں مالک!“

”پتہ کر..... اور مجھے بتا۔“

”رات کو آ کر بتاؤں گا مالک!“ دینو نے کہا۔

”ہاں، ٹھیک ہے..... اب میں سوؤں گا، تُو جا۔“ چودھری شوکت علی نے کروٹ بدل

لی۔

”اچھا مالک!“ دینو نے کہا اور باہر چلا گیا اور چودھری نے باہر دروازے میں تالا لگنے

کی آواز سنی تو نہ جانے کیوں مسکراہٹ اس کے لبوں پر بیگ گئی۔

”نوراًں! تُو نہ ہے اور تیرا نور اس حویلی میں ضرور ہوگا۔ تُو میرے مقدر کا ستارہ

ہے۔“ چودھری شوکت علی سوچتے سوچتے نیند کی آغوش میں پہنچ گئے۔

کمرہ نہایت خوب صورتی سے سجا ہوا تھا۔ سرخ، بڑا سا پلنگ جس پر بہت خوب صورت

بچھی ہوئی سفید چادر چھٹی ہوئی تھی۔ کھڑکیوں اور دروازوں پر حریری پردے لہرا رہے تھے۔

فرش پر بڑا خوب صورت ایرانی قالین بچھا ہوا تھا کہ پاؤں دھنسنے جارہے تھے۔ نوراًں حیرت سے ایک ایک چیز دیکھ رہی تھی

”اف! یہ چودھری لوگ غریبوں کا خون چوس چوس کر اتنی عیاشیاں کرتے ہیں، ایسے افسانے ہیں۔ اُس نے تو زندگی میں پہلی بار یہ چیزیں دیکھی تھیں۔ وہ حیرت زدہ تھی۔ کبھی پردوں کو ہاتھ سے چھو کر دیکھتی اور کبھی بیڈ کور کے پھولوں پر ہاتھ پھیرتی اور پھر قالین پر ٹہلنے لگتی۔“

”یہ سب ہم لوگوں کی خون پسینے کی کمائی کے ہیں۔“ نوراًں نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر اچانک اس کا ذہن اپنے بابا کی طرف مڑ گیا جو مر گیا تھا، مگر ظالم کے سامنے جھکا نہ تھا۔

”میں بھی اُسی باپ کی بیٹی ہوں..... مر جاؤں گی، مگر اس کتے کے سامنے نہیں جھکوں

گی۔“ نوراًں نے ایک عزم سے سوچا اور پھر دیوار سے ٹیک لگا کر گہری گہری سانسیں لینے

لگی اور نہ چاہتے ہوئے بھی آنسو اُس کی پلکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گالوں پر بہنے لگے۔

صبح فجر کی اذان ہوئی تو نماز کے بعد نمازیوں نے گاؤں کی کچی مسجد میں ایک جنازے

کی نماز بھی پڑھی۔ یہ جنازہ نشی اللہ دتہ کا تھا۔ دینو نے بخشو اور تھو کو شریک کر لیا تھا کہ

چودھری کو پتہ نہ چلے۔ آخر ہم لاش کی بے حرمتی کیوں ہونے دیں؟ جیتے جی کون سا نشی کو

سکھ ملا ہے۔ وہ دونوں مان گئے۔ اور پھر نماز جنازہ پڑھا کر نشی کو قبرستان لے جایا گیا،

جہاں اُسے منوں مٹی تلے داب دیا گیا۔

صبح پورے گاؤں میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ چودھری کے تشدد سے نشی ہلاک ہو گیا

ہے۔ کوئی کچھ کہہ بھی نہ سکتا تھا کیونکہ کسی کو نشی جیسا حال تو نہ کر دانا تھا۔



نوراًں نے کھڑکی سے دیکھا، رات کا سیاہ اندھیرا سفیدی کو سیاہ آچل اور ہار ہا تھا۔ فضا

اُداس تھی۔ ویسے بھی انسان کا اپنا دل اُداس ہو تو ہر ایک چیز اُداس لگتی ہے۔ نوراًں نے پورا

دن روتے گزرا تھا اور اس کی آنکھیں بے تحاشا سوچ گئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ آنسو بہا بہا کر

زخم ہو گئے ہوں۔ وہ تصور ہی تصور میں اپنے بابا کی لاش پر گرہوں اور کتوں کی فوج دیکھ رہی

تھی۔ کوئی اُس کی آنکھیں لٹے جا رہا ہے، کوئی ہاتھ۔ اس تصور نے رونے پر مجبور کر دیا۔ ایک

مجبور باپ اپنی عزت کی خاطر ظلموں کی بھیشت چڑھ گیا تھا، مگر وہی عزت ظالموں کے پاس

تھی، جسے وہ بچانے کی خاطر ہر ظلم سہتا رہا تھا اور پھر آرام کی نیند سو گیا۔ تب ہی اس نے

کمرے کے باہر دروازے میں لگے تالے کے کھلنے کی آواز سنی تو جلدی سے کھڑکی سے ہٹ

آئی اور پھر دروازے پر دستک دے کر آنے والا اندر آ گیا۔ یہ دینو تھا۔ نوراًں نے اسے دیکھ



کر منہ پھیر لیا۔

”نوراں بھڑ! ایک بات کہنی تھی تجھ سے۔ میں بہت جلدی میں ہوں۔“ وہ سخت گہرا ہوا تھا۔

”کہو؟“ نوراں نے رخ پھیرے بغیر جواب دیا۔

”نوراں! تُو ضرر نہ کر، ورنہ.....“

”چپ کر اوئے چودھری کے چچے!“ نوراں پھری ہوئی شیرنی کی طرح لگ رہی تھی۔  
”میں اپنے بارے میں بہتر سمجھتی ہوں۔ تم کہنے والے کون ہوتے ہو؟“

”تیرے باپ نے مجھے اپنا دوست کہا تھا۔“ دینو نے سر جھکا کر کہا۔

”اور یہ صلہ دیا ہے اُسے؟“ نوراں تسخر سے ہنسی۔

”نوراں! چودھری کو تو پتہ بھی نہیں کہ ہم نے مل کر نشی کو قبرستان میں دفن کیا۔ وہ تو اس تصور سے خوش ہے کہ نشی کی لاش کو گدھ کھا رہے ہوں گے۔“ دینو نے راز سے پردہ اٹھایا۔  
”دینو چاچا!“ نوراں نے حیرت سے دینو کو دیکھا۔

”ہاں نوراں دگی! تُو مان جا۔ ورنہ چودھری تیرے منگیتر کے ساتھ بھی یہی حال کرے گا اور اس کی ماں بہنوں کے ساتھ بھی۔ نوراں! تیری ضد سے کتنی زندگیاں تباہ ہو جائیں گی۔ جھیلے! ضد نہ کر، آج اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ تیرے منگیتر کے بارے میں پتہ کروں۔ اب بتاؤ..... میں نے اُسے کہا ہے کہ وہ شہر نوکری کرنے گیا ہوا ہے۔ آخر کب تک نوراں؟ تم لوگ بھاگ بھی تو نہیں سکتے نا۔ اُس کے شکاری کتے تم کو پکڑ لیں گے۔“ دینو کہتا رہا اور نوراں حیران و ششدر کھڑی اُسے دیکھتی رہی۔

”اگر تُو نے اپنے مرنے کے متعلق سوچا نا، تو نوراں دگی! وہ دنیا پور کو قبرستان میں تبدیل کر دے گا۔“

”نن..... نہیں..... نہیں دینو چاچا! جا اُسے کہہ دے، نوراں راضی ہے۔ وہ اور ظلم نہیں دیکھ سکتی۔“ نوراں دوڑ کر دینو سے لپٹ گئی اور اس کے سینے سے لگ کر آنسو بہانے لگی۔ دینو کی بھی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُسے یوں محسوس ہوا، جیسے اُس کی چھوٹی بچی ایک دم بڑی ہو گئی ہو اور اس کی پناہ میں آ گئی ہو۔

”کہہ دے اُسے۔ کہہ دے کہ وہ نوراں کی لاش کو، اُس کے مردہ دل کو سرخ جوڑا پہنا دے۔“ نوراں دینو کے پیٹے پر چھوٹے چھوٹے ٹکے مارتے ہوئے کہہ رہی تھی اور آنسو ایک تو اتار سے بہہ رہے تھے۔

واقعی، بہت مجبور ہوتی ہیں بیٹیاں..... اور ان سے زیادہ مجبور اُن کے والدین! دینو آہ بھر کر رہ گیا۔

دو روز بعد ہی چودھری کی حویلی بقیہ نور بنی ہوئی تھی۔ وہ بہت خوش تھے۔ پورے گاؤں کی دھوٹ تھی۔ شہر سے ناچنے والیاں بلوائی گئی تھیں۔ بحرے ہو رہے تھے۔ دسترخوان سجائے جا رہے تھے۔ دنیا پور میں میلے کا سماں تھا۔ لوگ بے دلی سے شادی میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے، ورنہ ان کے دل رو رہے تھے۔ آخر نوراں ان کے گاؤں کی ہی بیٹی تھی اور بیٹیاں تو سب کی سناجھی ہوتی ہیں۔

اُدھر نوراں بخار سے تپ رہی تھی۔ ردو کر اس کی آنکھوں کا پانی بھی سوکھ گیا تھا اور وہ گزشتہ دو تین دنوں میں بالکل ہی زرد ہو گئی تھی۔ اس کی سہیلیاں بھی آئی تھیں اور کینر کے ذریعے اس نے لالی کو بھی بلوالیا تھا۔

لالی سے لپٹ کر وہ اس قدر روئی تھی کہ دیکھنے والوں کے کلیجے پھٹ گئے تھے۔

”لالی!..... لالی! میرا بابا چلا گیا۔“ اس ایک جملے میں کتنی حسرتیں پوشیدہ تھیں، یہ لالی جانتی تھی۔

سب نے مہندی لگائی، مگر دہن کو مہندی نہ لگائی گئی۔ اس لئے کہ اُسے بہت تیز بخار تھا۔ چودھری شوکت علی کو پتہ چلا تو وہ ہنس کر بولے۔

”او پھر بھی لگا دیں گے۔“ ان کے تو انگ انگ سے خوشی بھٹوٹ رہی تھی۔ رداں رداں مسکرا رہا تھا اور دل نوراں کے نام کی مدھرتانوں پہ رقص کر رہا تھا۔

”آخر میں نے اسے جیت لیا..... وہ میری تھی۔ صرف میری۔“ چودھری شوکت نے بڑے غرور سے سوچا اور مونچھوں کو تاؤ دینے لگے۔

اور پھر شام کو نوراں کو سرخ جوڑا پہنا دیا گیا۔ چودھری نے اسے سونے سے پیلا کر دیا تھا، گلے میں بہت بڑا کھملا اور گلوبند کے وزن نے تو نوراں کی گردن ہی جھکا دی تھی۔ کانوں میں بڑے بڑے کٹوری والے جھمکے، ناک میں نتھ، سر پر جھومر اور ٹیکا، ہاتھوں میں ٹنگن اور چپے۔ نوراں کو بے حد الجھن ہو رہی تھی اور لڑکیاں رشک سے اُسے دیکھ رہی تھیں۔ حالانکہ انہیں پتہ بھی تھا کہ یہ سب کچھ اسے اپنے ارمانوں کے قتل پر ملا ہے۔ اس کے جسم پر اتنے زیور سجے ہیں تو اس کا دل دیکھو، جو لہو لہو ہے۔ داغ داغ ہے۔

میض پہناتے ہوئے لالی نے اس کی پیٹھ پر بڑے سے نیلے نشان کو دیکھا تو چونک گئی۔ یہ نشان ڈیڑھ فٹ کا تھا۔

”نوری! یہ کیا ہوا؟“ اس نے نشان پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”یہ..... یہ میرے شوہر کی نشانی ہے۔“ نوراں تسخر سے ہنسی۔

”کیا مطلب؟“ لالی حیرت سے بولی۔

”مطلب یہ کہ بخشو، بابا کو ہنٹر مار رہا تھا، میں بابا پر گری تو مجھے بھی لگ گیا۔“



”اورہ.....“ لالی ایک آہ بھر کر رہ گئی۔

”لالی! تُو یہ نہ دیکھ، میرے دل کے زخم دیکھ، جو اس سے بھی بڑے ہیں۔ انہیں کوئی نہیں دیکھے گا۔“ نوراًں رو دی۔ لالی کی آنکھوں میں بھی شبنم جمنے لگی۔

”کوئی ایسی بھی دلہن دیکھنے میں نہ آئی ہوگی جس کے باپ کی موت کو دو روز گزرے ہوں اور اس کے ہاتھوں میں سہاگ کی چوڑیاں کھنک رہی ہوں، جسم پر نیگے لباس کی جگہ چم چم کرتا سرخ جوڑا ہو اور مانگ میں انشاں بھری ہوئی ہو۔ یہ دلہن نوراًں تھی، جس کا باپ ظلم سہتے سہتے مر گیا تھا اور اس کے مرنے کے دو روز بعد ہی اسے سہاگ کی چوڑیاں پہنا دی گئی تھیں۔

”ظالمو! تمہیں ذرا بھی رحم نہ آیا؟..... میرے بابا کا کفن تو میلا ہونے دیا ہوتا۔ ہائے، کوئی دیکھے تو..... دو روز کی یتیم بچی، بن ماں باپ کی بچی، بھرے سنسار میں تنہا رہ گئی اور ظالم شادی نے بجا رہے ہیں، خوشیاں منا رہے ہیں۔“ ان سوچوں کے ساتھ ڈھول کی دھمک، نوراًں کو اپنے دل پر پڑتی محسوس ہو رہی تھی۔

”یہ کیسی شادی ہے؟..... میری کوئی سکھی بھی تو خوش نہیں۔ کسی نے مجھے اُٹھن نہیں لگایا، کسی نے کوئی شرارت نہیں کی مجھ سے۔ کچھ بھی تو نہیں کہا۔ رات جگے نہیں ہوئے۔ اور پھر نوراًں کو گئے دنوں کی جھلک نظر آئی، جب بھی کسی سہیلی کی شادی ہوتی تو وہ پیش پیش رہتی۔ ساری ساری رات گانے گائے جاتے، دلہن کا چھیڑ چھیڑ کر ناک میں دم کیا جاتا۔ اُٹھن چھپا چھپا کر ایک دوسرے کے منہ پر ملا جاتا۔ لڑکی کی سسرال سے مہندی آتی تو پہلے خود لگالی جاتی اور بڑی بوڑھیاں سر پیٹ کر رہ جاتیں۔ لڑکیاں مگی مگی کرتی ہوئی کونوں کھدروں میں جا چھپتیں۔ ابھی ایک ماہ پہلے ہی تو شریف خاتون کی شادی ہوئی تھی۔ بڑا مزا آیا تھا..... شرارتوں پر نوراًں کو ہی ڈانٹ پڑتی تھی اور وہ ہنستی رہتی تھی۔ سکھیاں جب بیاہ کر جاتیں تو وہ دلہا کی جگہ راجا کو اور دلہن کی جگہ خود کو محسوس کرتی۔ آنکھوں میں ان گنت خواب انگڑائیاں لینے لگتے۔ دل دھڑک دھڑک کے بے حال ہو جاتا اور وہ دلہن بننے کے تصور ہی سے لجا جاتی۔

”مگر یہ کیسی شادی تھی؟ دل کو تو کچھ بھی محسوس نہ ہوا تھا۔ دل میں کوئی اُٹنگ نہ تھی، کوئی خواہش نہ تھی۔ آنکھوں کے تمام خواب آنسو بن کر بہہ گئے تھے۔ اب تو صرف خوابوں کا راکھ تھی، صرف دھول ہی دھول تھی گئے دنوں کی۔

تب ہی مولوی صاحب کے آنے کا شور مچ گیا۔ لڑکیاں ادھر ادھر ہو گئیں۔ صرف لالی ہی اس کے قریب تھی۔ اور جب مولوی صاحب نے منظر پر ہے؟ کہا تو نوراًں کا دل اندر سے چیخ پڑا۔ نہیں، نہیں کی صدا اُنہیں آنے لگی۔ اور پھر اس نے دل کی جیتی گہرائیوں سے اُٹنے

والی ان صداؤں کو دبا دیا اور ”جی ہاں“ کہہ دیا اور یہ کہتے ہی ہونٹوں کو دانتوں تلے کس کر دبا لیا سدا جیج نکل جائے۔ یوں صرف دو بولوں سے وہ چودھری شوکت علی کی ہو گئی۔ سب باہر جا چکے تھے اور وہ لالی سے لپٹی اپنی بند نصیبیوں پر نوحہ کناں تھی۔ پھر اُسے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆.....☆.....☆

جب ہوش آیا تو وہ کمرہ نہ تھا جس میں اُسے قید کیا گیا تھا، بلکہ ایک فقس سے نکال کر دوسرے میں ڈال دیا گیا تھا۔ بہت سجا ہوا کمرہ تھا اور پلنگ کے چاروں طرف پھولوں کی لڑیاں جھول رہی تھیں۔ لالی اب بھی اس کے قریب تھی اور اس کی ہتھیلیوں کو مسل رہی تھی۔

”لالی! یہ کون سی جگہ ہے؟“ اس نے اپنی سیاہ سیاہ آنکھوں کو پٹ پٹایا۔

”چودھری کا کمرہ۔“ لالی نے مختصر سا جواب دیا۔

”اچھا!“ نوراًں ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی، جیسے پلنگ میں اسپرنگ لگے ہوں۔

”چودھری آنے ہی والا ہو گا۔ ابھی مجرا ہو رہا ہے نا۔ ویسے میں نے دینو سے کہہ دیا

ہے، وہ اُس کی آمد کی اطلاع دے دے۔“ لالی نے کہا۔

”لالی!..... لالی! تُو نہ جا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ نوراًں نے نہایت ہنجی لہجے میں کہا۔

”کاش! ایسا ہو سکتا۔“ لالی آہ بھر کر رہ گئی۔

”لالی! میرے بابا کو کتنا ارمان تھا کہ وہ مجھے ڈولی میں بٹھاتا، میرے سر پر ہاتھ رکھ کر

نصیحتیں کر کے مجھے رخصت کرتا۔ وہ تو چپ چاپ تے ہی چلا گیا، مجھے دکھوں کے کنویں میں

دھکیل کر۔“ نوراًں کی آواز رندھ گئی۔

”نوری! میری جان! اب نہ رو۔ رونے سے چاچا واپس نہیں آئے گا، یا تُو یہاں سے

چھٹکارا نہیں پالے گی۔ بس تُو اسے اپنا لیکھ سمجھ کر قبول کر لے۔ یہی تیرے لئے اچھا ہے۔ تُو

دکھی ہوگی تو چاچا بھی دکھی ہو گا۔ اب اُسے قبر میں تو سکھ سے رہنے دے۔“ لالی نے اس کا

زرد چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ نوراًں نے آنکھیں موند کر ایک طویل سانس لی اور اس

کی بند پلکوں سے آنسو باہر آ گئے۔

تب ہی دینو نے دروازے پر دستک دی۔

”لالی! چودھری صاحب آرہے ہیں۔“

”اچھا چاچا! میں آئی۔“ لالی نے اپنی چنری سے اُس کے گالوں پر آئے موتیوں کو

صاف کیا۔ ”اچھا، سویرے آؤں گی۔“ لالی چپل پہنتے ہوئے بولی اور نوراًں نے پٹ سے

آنکھیں کھول کر بڑی حسرت سے اسے دیکھا۔ نگاہوں میں اسے روکنے کی التجا تھی، مگر یہ

ناممکن تھا۔ اور پھر لالی جاتے جاتے بولی۔



”گھبراٹا مات۔ میں سویرے آؤں گی۔“ اور پھر وہ کمرے سے نکل گئی۔ نوران کئی دیر تک بٹتے ہوئے پردے کو دیکھتی رہی۔

کمرے میں اک سکوت سا طاری تھا۔ پھولوں کی لٹکتی ہوئی لڑیاں اسے مشکلی ناک معلوم ہو رہے تھے، جو اسے بڑھ بڑھ کر ڈسنا چاہتے تھے۔ وہ کپکپا کر رہ گئی۔ اور پھر قدموں کی چاپ اُبھری تو اس نے گھبرا کر گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں سرد ہو رہے تھے اور دل میں نفرت کا ایک طوفان موجزن تھا، جو باہر نکلنے کو بے قرار تھا۔ مگر وہ اس طوفان کو اندر ہی اندر دبا ئے جا رہی تھی۔ آنے والا چودھری شوکت علی کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی اور پھر قدموں کی آواز بالکل نہ اُبھری کیونکہ پیروں تلے تو دبیز ایرانی قالین تھا۔ کمرے میں دو افراد کی موجودگی کے باوجود قبر کا سا ساٹا تھا۔ پھر نوران کو محسوس ہوا، کوئی اس کے قریب پلنگ پر بیٹھا ہے۔

یہ قاتل تھا۔ نوران کے باپ کا قاتل۔ نوران کی آرزوؤں کا قاتل۔ ان کی اُمیگوں، خواہشوں اور تمنائوں کا قاتل۔ کتنے قتل کئے تھے چودھری شوکت علی نے۔ نوران کا جی چاہا، ہاتھ بڑھا کر اس قاتل کی گردن اپنے ہاتھوں میں دبوچ لے، اس کو ختم کر ڈالے۔ مگر وہ کچھ نہ کر سکتی تھی، صرف سوچ سکتی تھی۔ اور سوچوں پر تو کوئی پہرے نہیں لگا سکتا۔ سوچیں تو ذہن کا کوئی بھی روزن کھلا دیکھتی ہیں تو در آتی ہیں۔ یہی حال نوران کا تھا۔ وہ کزور سی، ناتواں لڑکی ساڑھے چھ فٹ کے چودھری کا کیا باگاڑ سکتی تھی۔

”نور.....!“ کمرے کے سکوت کو چودھری کی آواز نے توڑا۔ نوران خاموش بیٹھی رہی کوئی جذبات اور احساسات تو اس کے تھے ہی نہیں، جو چل اُٹھتے۔ چودھری نے کوئی جواب نہ پا کر اپنی بات جاری رکھی۔

”میں بہت شرمندہ ہوں..... بہت ہی شرمندہ۔ مجھے تیرے بابا کے ساتھ برا سلوک نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مگر کیا کرتا میں، تُو ہی بتا۔ احساس شکست نے مجھے دیوانہ کر دیا تھا۔ نوران! وہ بہت ضدی تھا..... بہت ضدی۔ مجھ سے بھی زیادہ ضدی۔“

”ہونہہ..... تم سمجھتے ہو، تم ہی ضدی ہو دنیا میں۔“ نوران نے دل ہی دل میں تلخی سے سوچا۔

”نور! ہو سکے تو مجھے معاف کر دے۔ یقین کر، میں اپنی پہلی اور آخری محبت کے سامنے سخت شرمندہ ہوں۔“

نوران نے دوپٹے کی اوٹ سے دیکھا، چودھری کی اکڑی ہوئی گردن اس کے سامنے جھکی ہوئی تھی۔ احساس برتری اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔

”یہ سر جو شاید خدا کے سامنے بھی کبھی نہیں جھکا ہو گا، میرے سامنے کیسے جھک گیا؟“

نوران نے تلخی سے کہا۔

”نور!..... خدا کے سامنے بھی یہ سر بار بار جھکا ہے اور ہمیشہ جھکتا رہے گا۔ محبت بھی تو خدا ہے، دین ہے، ایمان ہے محبت۔ میں تو محبت کو بھی عبادت کا درجہ دیتا ہوں۔“ چودھری نے کہا، مگر نوران کچھ نہ بولی۔

”نور! تُو کہہ دے کہ تُو نے مجھے معاف کر دیا..... نور! خدا کے واسطے! ورنہ میں تڑپتا رہوں گا۔ میں تجھے اب کوئی دکھ نہ دوں گا۔ کبھی تجھے مجھ سے تکلیف نہیں پہنچے گی۔“

”چودھری! گلا بھی کاٹتے ہو اور کہتے ہو خون بھی نہ نکلے۔ دل بھی توڑتے ہو مگر کہتے ہو آواز نہ پیدا ہو۔ زخم بھی لگاتے ہو مگر چاہتے ہو کہ تکلیف نہ ہو۔ زخم اتنی جلدی تو نہیں

بھرتے۔ بہت سا وقت درکار ہوتا ہے، ان کے لئے۔ ظاہری زخم تو بھر جاتے ہیں مگر روح کے زخم زندگی کا روگ بن جاتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں بھرتے، ان میں ہمیشہ ٹیسس اٹھتی رہتی

ہیں اور یہ ناسور بن جاتے ہیں۔ اور چودھری! تم نے تو میری روح کو زخمی کیا ہے اور اب بھی یہی کہتے ہو، اور کوئی دکھ نہیں دو گے۔“ نوران کہتے کہتے تسخر سے ہنسی۔ ”اب تو شاید ہمت

بھی نہیں ہے کوئی اور دکھ سہنے کی۔ نیا جنم لینا پڑے گا تمہارے ظلم سہنے کے لئے۔“ نوران نے دل کا سارا زہر نکال کر چودھری شوکت علی پر پھینک دیا اور وہ تکتا کر رہ گئے۔

”نور! تجھے دکھ دے کے سکھایا میں بھی تو نہیں رہا۔“

”اچھا.....“ نوران ہنس دی۔ اک کھوکھلی سی ہنسی، جس میں ٹوٹے دل کی صدا تھیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

”نور!“ چودھری شوکت علی کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔

”چودھری! تمہارا میرا حساب کتاب روز حشر ہو گا۔ وہ بہت بڑا منصف ہے۔ میں تمہیں معاف کرتی ہوں۔ اگر روز حشر تمہارا گریبان میرے ہاتھ میں ہوا تو برا نہ مانا۔“

نوران نے تنبیہ کی مگر چودھری شوکت علی کہاں سن رہے تھے؟ مارے خوشی کے وہ مدھوش ہو گئے تھے۔ اتنے برے سلوک کے باوجود بھی نوران نے انہیں معاف کر دیا تھا۔ پھر انہوں

نے اپنے ہاتھ اس کے گھونگھٹ کی طرف بڑھائے اور لرزتے ہاتھوں سے ہولے ہولے اس کا گھونگھٹ الٹ دیا۔ نوران نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں اور اس کے چہرے پر غصے کی شدت سے جو سرخی آئی ہوئی تھی، اسے وہ شرم و حیا کی سرخی سمجھ رہے تھے۔

”نور.....!“ چودھری شوکت علی نے جذبات سے پُور پُور آواز میں اسے پکارا۔

”میں سچ ہی تو کہتا تھا کہ تمہارے آنے سے اس حویلی میں روشنی ہو جائے گی۔ اور دیکھو، آج میرا کمر اتنا خوب صورت لگ رہا ہے۔ کتنی خوشبو بستی ہے اس کمرے میں۔ میری محبت کی خوشبو، تمہارے وجود کی خوشبو۔“ وہ دھیرے دھیرے بولتے رہے اور ان کے ہونٹ، نوران



کے لرزے کانپتے ہونٹوں کی طرف بڑھنے لگے!

☆.....☆

رات کا چھلا پھر تھا۔ راجا کو نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ کمرے سے نکل آیا۔ زرد زرد چاند اپنی کرنیں بکھیرتا ہوا مشرب کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کی نرم نرم کرنیں راجا کے دھڑکنے والے سینے کی طرح پیوست ہوتی جا رہی تھیں۔

عجیب طرح کی بے چینی تھی۔ دل ڈوبا جا رہا تھا اور وہ مضحل دل کو سنبھالتے سنبھالتے پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا، باہر صحن میں نذیر اور شادو دنیا دانیہا سے بے خبر گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ اور ایک وہ تھا بے سکون، جسے نیند ہی نہیں آرہی تھی۔ بار بار اس کا ذہن نوران کی طرف چلا جاتا تھا۔ کوئی اطلاع بھی نہ ملی تھی اس کی کہ کیا ہوا؟ کیسی ہے وہ؟

اُس کا دل چاہا، اُڑ کر اپنی نوران کے پاس پہنچ جائے۔ پھر دل اتنا بے چین ہوا کہ صحن کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ آوارہ کتوں اور گیدڑوں کی آوازیں پوری فضا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ایک سرسبز پگڈنڈی پر ہولیا۔ کافی دُور نکل آیا۔ مگر دل کی بے قراری کم نہ ہوئی۔ اب اُسے کیا خبر تھی کہ یہ بے قراری تو اب ہمیشہ کے لئے اس کا مقدر بن گئی ہے۔

جس کے سنگ اس نے آنے والے دنوں کے اُن گنت خواب دیکھے تھے، آج اُس کی تو شبِ عروسی تھی۔ وہ تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُس سے چھڑ گئی تھی اور وہ اپنی محبت کے اُڑنے کا ماتم بھی نہ کر سکا تھا۔ پتہ ہوتا تو شاید کرتا بھی۔ وہ کافی دیر تک ادھر ادھر بھٹکتا پھرا اور پھر واپس گھر آ گیا۔ نذیر بھائی اور شادو اب بھی بے خبر سوئے ہوئے تھے۔ کمرے میں آ کر وہ بھی تھکا تھکا سا بستر پر لیٹ گیا۔

”میں صبح ہوتے ہی دنیا پور چلا جاؤں گا۔“ راجا بڑبڑایا۔ اور پھر یہ عزم کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆.....☆

”دنیا پور“ میں یہ صبح بہت سہانی تھی۔ چودھری شوکت علی نے اپنی سن پسند شادی کی خوشی میں تمام مزارعوں کو ایک ایک سو روپے اور ان کے بال بچوں کے لئے کپڑے دیئے تھے۔ سب لوگوں نے تجھے ہوئے دل کے ساتھ یہ سب کچھ قبول کر لیا اور پھر دینے والی بنی تو نوران تھی۔ اور چودھری شوکت گاؤں کے لگے سے ٹیک لگائے بڑی شان سے پہنچے تھے۔ خوشی اُن کے چہرے سے بھٹوٹ رہی تھی۔ دینوں نے پیسوں کا تھال اٹھایا ہوا تھا۔ بخشو کے پاس مردانہ کپڑے اور ننھو کے پاس زنانہ کپڑوں کے تھال تھے۔ چودھری شوکت علی ان سے لے کر نوران کو دیتے اور نوران مزارعوں کو یہ سوغات اپنے ہاتھ سے دیتی۔ کل تک وہ بھی انہی غریب لوگوں کی صف میں کھڑی تھی، انہی کی طرح ذرا سی بات پر خوش ہونے والی۔ صرف

نکاح کے دو بولوں نے ان کے درمیان دیوار چین حائل کر دی تھی، جسے اب کوئی بھی نہ پار کر سکتا تھا۔

اور جب راجا کی ماں اور بہنیں آئیں تو نوران نے ایک نظر انہیں دیکھ کر نظریں جھکا لیں۔ کتنی خواہش تھی مائی جنت کی کہ نوران اس کی بہو بنے، مگر بیٹیوں کے لیکے تو اسی وقت لکے دیئے جاتے ہیں، جب بیٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔ پھر مقدر سے لڑا بھی تو نہیں جاتا۔ کپڑے اور پیسے لینے کے بعد مائی جنت جانے لگی تو نوران جلدی سے بولی۔

”دھڑھو ماسی!“

مائی جنت کے قدم رک گئے۔

”دے تو دیا۔“ چودھری شوکت علی نے حیرت سے نوران کو دیکھا۔

”اس کے بیٹے کے لئے بھی ایک جوڑا دے دیں۔“ نوران نے کہا تو چودھری شوکت علی نے سر ہلا دیا۔ مگر مائی جنت کو یوں لگا، جیسے نوران نے اسے بھری پنچائیت میں ذلیل کر دیا ہو مگر وہ کچھ بھی نہ بول سکی، صرف خالی خالی نظروں سے نوران کو دیکھ کر رہ گئی، جو چودھری کے پہلو میں بیٹھی واقعی چودھرائی لگ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا، جیسے وہ جہنم جہنم سے چودھرائی ہے۔ زیورات سے لدی ہوئی نوران بیش قیمت لباس میں ملبوس شیشی اللہ دتہ کی نوران تو نہیں لگ رہی تھی۔

پھر راجا کی ماں بھی چلی گئی۔

نوران بیٹھے بیٹھے تھک سی گئی تھی۔ ویسے بھی اُس پاس کے گاؤں سے بھی چودھری کے تمام مزارعے آئے تھے۔ سب نے اُسے مبارک باد دی تھی، پاؤں چھوئے تھے۔ مگر اُسے تو ذرا بھی خوشی نہ ہوئی تھی اتنی عزت و تکریم کی اُسے نہ کبھی خواہش رہی تھی، جو اُسے خوشی ہوتی۔

پھر وہ آرام کی غرض سے لالی کے ساتھ اپنی خواب گاہ میں آ گئی۔ صبح سے اب موقع ملا تھا دونوں کو تنہائی کا۔

”لالی!“ وہ پلنگ پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

”ہوں۔“ لالی نے آنکھیں میٹکاتے ہوئے کہا۔

”چاچا دینو سے پوچھ میرے بابا کی قبر کہاں بنائی گئی ہے؟ میں وہاں جانا چاہتی ہوں۔“ نوران نہایت سنجیدگی سے لپچے میں بولی۔

”مجھے معلوم ہے، لیکن کچھ روز صبر کر۔“

”بابا کہے گا، میں اس کے پاس آئی ہی نہیں۔ لالی! وہ میرا منتظر ہو گا۔ مجھے لے چل۔“ نوران بچوں کی سی مصحومیت سے بولی۔



”پاگل ہے تو تو۔ اگر چودھری کو پتہ چل گیا کہ چاچا کو کھیتوں میں پھینکنے کے بجائے قبرستان میں دفن کر دیا گیا ہے تو چاہے وہ تیری خاطر خوش بھی ہو جائے مگر اس کا اعتقاد چاچا پارہ پر سے اٹھ جائے گا۔“ لالی نے اُسے سمجھانے کے انداز میں کہا تو نوراً نے اثبات میں ہلا دیا۔

”تو ٹھیک کہتی ہے۔“ نوراً نے نہایت آہستگی سے بولی۔ تب ہی لالی نے بات پلٹی۔  
”تو خوش تو ہے نا؟..... چودھری پسند آیا؟“

”نہیں۔ اور جس بندے سے نفرت کی جائے، وہ کبھی پسند نہیں آ سکتا، لالی! اسی طرح میں چودھری کو مرتے دم تک پسند نہیں کر سکتی۔ یہ زیور مجھے ناگ بچھو لگتے ہیں، چونہ جانے مجھے کب تک ڈنتے رہیں گے۔ وہ میرے تن کا مالک تو بن گیا ہے، مگر میرے من پر کبھی قابض نہیں ہو سکے گا۔ چاہے وہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ بن جائے۔ میں اپنے بابا کی موت کا منظر نہیں بھلا سکتی، خواہ وہ مجھ سے کتنی ہی معافی مانگے، میرے زخموں کو سہلائے، پیٹھ کے نشان کو چومے، کچھ بھی کرے، میرے دل میں ایسا کوئی خانہ نہیں، جہاں میں اُسے فٹ کر سکوں۔ میں اُسے محبت نہیں دے سکتی۔“ نوراً دھیمے دھیمے لہجے میں بول رہی تھی اور خالی خالی، اُداس نظروں سے لالی کو دیکھتی رہی۔

”تو کیا تو راجا.....“ لالی نے کہنا چاہا۔

”ہاں لالی! شاید میں راجا کو کبھی بھی نہ بھول سکوں۔“ نوراً نے اس کی بات کاٹ دی۔

”اُسے بتا دینا لالی! کہ اس کی نوری بے حد مجبور ہو گئی تھی، اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔“ نوراً نے دُکھ سے کہا۔

تب ہی کھٹکے کی آواز پر وہ دونوں چونک پڑیں۔ چودھری شوکت علی اندر آ گئے تھے۔ لالی ایک دم کھڑی ہو گئی۔

”حال احوال پوچھتے جا رہے ہیں۔“ چودھری شوکت علی ہنستے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے۔  
”جی، جی۔“ لالی گھبرا گئی۔

”بیٹھ گئی۔ تو کھڑی کیوں ہو گئی؟ تو تو نور کی پکی سہیلی لگتی ہے۔“ انہوں نے پاؤں ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں چودھری صاحب! ہم دونوں کی چھوٹے پن سے ہی دوستی ہے۔“ لالی نے کہا۔  
”نورا! چودھری شوکت علی، نوراً کی طرف متوجہ ہوئے۔

”جی؟“ نوراً نے ہولے سے کہا۔

”بھئی یہ تمہاری پکی سہیلی ہے تو کوئی انعام اسے دونا۔“

”آپ جو چاہیں دے دیں۔“ نوراً نے سر جھکا دیا۔  
”تم جو کہو۔“ وہ مسکرائے۔

”بس اسے یہاں آنے کی اجازت دے دیجئے کہ یہ آتی رہے۔“ نوراً نے ان کی

طرف دیکھا۔  
”او یہ بھی کوئی بات ہے؟ ضرور آئے گی یہ۔ بھئی لالی! تو روز آیا کر یہاں۔“ چودھری شوکت علی مونچھ کو مردڑا دیتے ہوئے بولے۔

”جی بہتر چودھری جی!“ لالی نے کہا۔ ”میں جاؤں، پھر آؤں گی۔“ لالی نے کہا اور سلام کر کے تیزی سے باہر چلی گئی۔

”بڑی بزدل ہے تمہاری سہیلی۔“ چودھری شوکت علی اس کے قریب آ کر بیٹھ گئے۔  
”شریر بھی اور موقع شناس بھی۔“ انہوں نے ہنستے ہوئے نوراً کا ہاتھ تھام لیا۔ نوراً خاموش رہی، کچھ بھی نہ بول پائی اس کا ذہن تو الجھا ہوا تھا کہ کس طرح بابا کی قبر پر جائے اور چودھری کو بتائے بغیر۔ اُس کا بہت دل کر رہا تھا، جانے کو۔

☆.....☆.....☆

چودھری شوکت علی بیٹھک میں بیٹھے حساب کتاب چیک کر رہے تھے کہ دینو نے کہا۔  
”مالک! ایک بات کہوں؟“

”کہو!“ وہ خوش دلی سے مسکرائے۔

”برا تو نہیں منائیں گے؟“

”نہیں بھئی۔“ وہ ہنس دیئے۔

”مالک! حسن پور چلے جائیں آپ۔“ دینو نے جلدی سے ایک سانس میں کہا۔  
”کیوں؟“ وہ غمرائے۔

”مالک! اس لئے کہ آپ کو یہاں آئے پورے تیرہ دن ہو گئے ہیں۔ چودھرائی زہرہ کوئی شک نہ کریں۔ اب نوراً بالکل ٹھیک ہو گئی ہے نا۔“ دینو نے کہا۔

”ہاں ٹھیک کیسے ہوتی؟ آخر میں بھی چودھری شوکت ہوں۔“ وہ فخر سے بولے۔  
”مالک! پھر کیا سوچا؟“

”ہاں، تو ٹھیک کہتا ہے۔ میں آج شام کو ہی چلا جاتا ہوں۔ ایک دو روزہ کر آ جاؤں گا۔“ چودھری شوکت علی نے ایک دم فیصلہ کر لیا۔  
”بالکل ٹھیک جی۔“ اس طرح چودھرائی کو شک بھی نہ پڑے گا۔

”نوراً کو پتہ نہ چلے کہ میں حسن پور گیا ہوں۔ آخر عورت ہے نا۔ حسن اور جلن۔ تو تو آپ سیانا ہے، دینو!“ انہوں نے دینو کی طرف دیکھا۔



”آپ فکر نہ کریں جی۔ میں کہہ دوں گا کہ آپ شہر گئے ہیں۔“ دینو نے سر ہلاتا دیا مگر دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ چودھرائی! تم کو کیا خبر کہ نوراً تمام عورتوں سے مختلف ہے۔ شک اور حسد تو وہ عورتیں کرتی ہیں، جو دل و جان سے شوہروں کو چاہتی ہیں۔ نوراً تو ایک مجبوری کے باعث تمہارے ساتھ شب و روز بسر کر رہی ہے۔ اس کے سامنے ہی تم دل عورتوں کو لا کر رکھو تو وہ بجائے جلنے کے، خوش ہوگی۔ میں اُسے سمجھتا ہوں۔

”ٹھیک ہے، تو میرا سامان درست کر۔ اور ہاں، تو یہیں رہنا، نوراً کے پاس۔ مجھے تیرے علاوہ اور کسی پر اعتبار نہیں ہے۔ اُسے منایا بھی تو تُو نے تھا۔“ چودھری شوکت علی نے دینو کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا کر رہ گیا۔

پھر چودھری شوکت علی اٹھ کر اپنی خواب گاہ میں آگئے۔ نوراً الماری میں کپڑے تہہ کر کے رکھ رہی تھی۔ سبز سادہ سے سلکی سوٹ میں بالوں کو کھلا چھوڑے وہ اپنے کام میں مصروف تھی۔ بالوں کی نوکوں سے پانی کے قطرے موتیوں کی طرح گر کر قالین میں جذب ہو رہے تھے۔ وہ اپنے کام میں مصروف تھی، اسے چودھری کے آنے کی خبر ہی نہ ہوئی۔ چودھری ہولے ہولے چلتے ہوئے اُس کے قریب آگئے اور آہستہ سے اُس کے گیلے بالوں کو تمام لیا۔ وہ چونک کر پلٹی اور چودھری کو دیکھ کر دھیرے سے مسکرا دی۔ زبردستی کی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر پھیل گئی تھی۔

”تم آرام کرتیں۔ مائی شرفاں آ کر کپڑے تہہ کر جاتی۔“ انہوں نے نہایت محبت سے کہا۔

”میں فالتو نہیں بیٹھ سکتی۔ شروع سے عادت ہے نا، کام کرنے کی۔ آخر پرانی عادتیں تو نہیں چھوڑتیں نا۔“ نوراً پھر کام میں مصروف ہو گئی۔

”بھئی چھوڑو بھی۔ میں سب کام چھوڑ کر تمہارے پاس آیا ہوں اور تم کام میں لگی ہوئی ہو۔“ انہوں نے نوراً کی کمر کے گرد بانہوں کا حصار کر دیا اور اسے لئے پلنگ پر آگئے۔

”یہاں بیٹھو!“ وہ مسکرائے۔

”بال گیلے ہیں۔ چادر بھی گیلی ہو جائے گی۔“ نوراً بولی

”ہونے دو۔“ چودھری شوکت علی بے پردائی سے بولے۔ ”اچھا سنو، میں آج جانا ہوں۔“

”کہاں؟“ نوراً نے جلدی سے پوچھا۔

”جھوٹ بولنے کی عادت نہیں ہے، حسن پور جا رہا ہوں۔“ انہوں نے ایک دم فج بولنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ دن تو آگے چل کر بھی آنے تھے، اس طرح نوراً کا اعتماد مجروح ہونے کا ڈر تھا۔

”سب تک رہیں گے وہاں؟“ نوراً سپاٹ لہجے میں بولی۔ حالانکہ ان کے جانے کا سن کر اُسے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ شادی کے بعد یہ پہلی خوشی تھی، جو اسے ملی تھی۔ اب وہ پھر رک ٹوک اپنے بابا کی قبر پر جا سکتی تھی۔

”نور.....!“ انہوں نے پھر لہجے میں پکارا۔

”ہوں۔“ نوراً نے آہستہ سے گردن ہلا دی۔

”پتہ نہیں، میرا دل انجانے خدشوں سے ڈرتا رہتا ہے، سہا رہتا ہے۔ سن، اگر میں حسن پور چلا جاؤں تو تُو..... تو تُو کہیں چلی تو نہیں جائے گی؟“ چودھری شوکت علی دل کا خدشہ زبان پر لے آئے۔

”تم مجھے ایسا سمجھتے ہو؟“ نوراً نے شکوہ کیا مگر دل میں سوچ رہی تھی، پہلے تو ارادہ تھا چودھری! کہ تم ادھر ادھر ہوئے تو میں کہیں اور چلی جاؤں گی، مگر اب نہیں..... میں تم سے انتقام لوں گی۔ اور اسی انتقام لینے کی خاطر تو میں نے اپنا آپ تم کو سونپا ہے۔ تمہاری نسلیں بھی یاد کریں گی کہ عورت کا انتقام کیسا ہوتا ہے۔ کسی کی آرزو میں، اُنہیں کچلنے والوں کا انجام کیسا ہوتا ہے، اگر خدا نے مجھے حوصلہ دیا تو۔

”تو پھر میں اطمینان سے جاؤں؟“ چودھری شوکت علی نے اُسے سوچوں میں غلطیاں دیکھ کر پوچھا تو اس نے اثبات میں گردن ہلا دی اور چودھری شوکت علی نے بے خود ہو کر اُسے لپٹا لیا۔ وہ کسمسا کر رہ گئی۔

☆.....☆.....☆

”ماں!..... یہ کیا ہو گیا؟ تُو کسی کو بھیج کر مجھے تو بتاتی..... ظالموں نے یہ کیا کیا؟“ راجا چارپائی کے پائے پر زور زور سے ہاتھ مار رہا تھا۔

”قسمت کا لکھا تھا، پتر!“ مائی جنت نے بیٹے کو دلا سا دیا۔

”قسمت..... قسمت صرف میرے لئے رہ گئی تھی؟“ راجا اتنا کڑیل نو جوان ہو کر رو دیا۔

”صبر کر، پتر!“ اماں نے کہا۔

”صبر کروں؟..... اماں! میں سرخ حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ میں نوراً کو لے آؤں گا۔ میں چودھری کا خون پی جاؤں گا۔“ راجا پھرے ہوئے شیر کی طرح دھاڑا۔

”پھر اپنی بہنوں کو قتل کر کے جانا پتر!“ مائی جنت نے کہا تو راجا حیرت سے ٹکر ٹکر ماں کو دیکھتا رہ گیا۔ چھوٹی بہن صفیہ اُسے بڑی حسرت ناک نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اُس نے اُسے کھینچ کر سیتے سے لگا لیا اور سوچا، تم سب میری مجبوریاں ہو..... سب مجبوریاں ہو۔



نوراں بھی۔ مگر تم ماں جانی ہو، بہت اہم ہو۔ بہت اہم۔

وہ رو دیا۔ روتا رہا اور باتیں اس کے ذہن میں گونجتی رہیں۔ پتھر لئے پہلے کا خیال اُسے آیا۔

وہ آج ہی تو لوٹا تھا، دنیا پور۔

نذیر بھائی اپنے چودھری کے کام سے شہر چلا گیا تھا اور اسے شادو کے پاس چھوڑ گیا تھا کیونکہ شادو اکیلی تھی۔ اس لئے راجا کو شادو کے پاس رکنا پڑا۔ حالانکہ کیا کرتا تھا وہ۔ سارا دن درخت کے نیچے منجی ڈالے پڑا رہتا۔ اگر دھوپ آ جاتی تو منجی کو سائے میں لے جاتا اور بھابی شادو کہتی۔

”وے راجے! تُو تو بالکل رانجھا ہی ہو گیا ہے۔ وے کئے! (پاگل) جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے، ضرور ہوتا ہے۔ کریمو آ جائے گا خیر خیر لے کر۔ تُو اٹو وں کی طرح پڑا نہ رہا کر۔ مگر وہ کیا کرتا؟ وہ اٹو وں کی طرح پڑا رہتا۔ نوراں کے ساتھ گزرے ہوئے بچن کے، جوانی کے دن فلم کے مانند اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتے رہتے اور وہ اپنے خیالوں میں کھویا رہتا۔ آج جب وہ واپس آیا تو سیدھا نوراں کے ہاں گیا تھا۔ گھر کے کواڑ بند پڑے تھے، کونے میں بھوری بھی نہیں تھی۔ گھڑوچی پر گھرے بھی اونڈھے پڑے تھے اور بے شمار گراؤن پر جم چکی تھی، جیسے کئی روز سے گھر کے مین گھر میں رہے ہی نہ ہوں۔ اور یہ حقیقت بھی تھی۔ پھر وہ دل پر بوجھ لئے، ذہن میں انجانے اندیشوں کی چھن لئے گھر آ گیا۔ اماں نے اُس کی بلائیں لیں، لپٹا کر خوب خوب پیار کیا۔

”اماں! نوراں کہاں ہے؟“ راجا نے اچانک سوال کیا تو اماں گھبرا گئی، پھر خود پر قابو پا کر بولی۔

”پتھر! تُو آرام تو کر۔ پہلے روٹی کھالے، پھر بتاتی ہوں۔ اری شیو! روٹی لاویر کے لئے۔“

اماں نے شیو کو آواز دی اور پھر وہ شادو اور نذیر کی خیریت پوچھتی رہی۔ وہ اُلے سیدھے جواب دیتا رہا۔ وہ جس کی خیریت کے بارے میں پریشان تھا، اماں اُسے تو بتاتی نہ رہی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد اس نے پھر پوچھا۔

”صبر تو کر پتھر! تُو تو بہت بے صبرا ہے۔“ مائی جنت ہنس دی۔

”اماں! آخر تُو بتا کیوں نہیں دیتی؟“ راجا نے اماں کو جھنجھوڑ ڈالا۔

”پتھر! تُو اب اُس کو بھول جا۔“ مائی جنت نہایت دکھ سے بولی۔

”کیوں اماں؟“ خدشے کا ناگ اُس کے دماغ کو ڈسنے لگا۔

”وہ..... وہ.....“ مائی جنت میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ بتا سکتی۔

”کیا وہ مر گئی؟ اُسے مار دیا گیا؟“ وہ چیخ پڑا۔

”تیرے اور ہمارے لئے وہ مر چکی ہے، پتھر! اب وہ دنیا کی چودھرائی بن گئی ہے۔“

اماں نے ایک دم کہہ دیا۔ وہ حیران و ششدر ماں کو دیکھتا رہ گیا اور پھر چیخ پڑا۔

”نہیں ناں! یہ جھوٹ ہے۔ یہ جھوٹ ہے۔“ وہ ماں سے لپٹ کر رو دیا۔

”یہ سچ ہے۔“ مائی جنت زور دے کر بولی۔

”اماں! یہ کیا ہو گیا؟..... یہ کیا ہو گیا؟ تُو نے مجھے بلوایا کیوں نہیں؟..... خالوں نے

یہ کیا کیا؟“ راجا اپنی چھوٹی بہن صفیہ کے بالوں میں چہرہ چھپائے رو رہا تھا اور اس کے آنسو بہن کے بالوں میں جذب ہو گئے تھے۔

”لالہ! نہ رو۔“ صفیہ نے سر اٹھایا اور بھائی کے آنسو اپنے دوپٹے سے صاف کرنے

لگی۔ اور راجا آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر لئے اپنی بہن کے معصوم اور پاکیزہ چہرے کو تکتا رہا اور پھر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگا لئے۔





یہ باتوں پر ہرگز آگیا۔  
 چھپکروں اور بھی کبھی مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازیں رات کے سناٹے میں گونج رہی  
 تھیں اور وہ غیر ارادی طور پر سرخ حویلی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ سرخ  
 حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دے۔ اُسے طبع کے ڈھیر میں تبدیل کر دے۔ دل کا درد سو سو  
 بل لے کر بیدار ہوتا تو اُسے خود کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ تب بے اختیار اس کے دل میں  
 خواہش پیدا ہوتی کہ جا کر اپنی نوراں کو وہاں سے نکال لائے۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے  
 نوراں کو کسی دیو نے قید کر رکھا ہو اور وہ اپنے شہزادے کی منتظر ہو، جو اسے قید سے رہائی  
 دلوائے اور اپنے ساتھ لے جائے۔ میں حویلی جاؤں گا، چودھری تو حسن پور گیا ہوا ہے۔“

اس نے سوچا۔  
 ”لیکن اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟“ ذہن نے دلیل پیش کی۔ ”کوئی نہیں دیکھے گا۔“ دل  
 جمل اٹھا۔ ”میں صرف ایک بار اپنی نوراں کو ضرور دیکھوں گا۔ صرف ایک بار..... آخر  
 چودھری سے شادی کے بعد اُس پر کیسا روپ آیا ہے؟“

اور پھر اُسے ماں کی بات یاد آ گئی۔ ”پُتر! حویلی جانے سے پہلے اپنی بہنوں کی طرف ضرور دیکھ لینا۔“ راجا کے ذہن میں یہ جملہ گونجنے لگا۔ اُف! ایک تو ان مجبوریوں نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ میں نہیں جاؤں گا اُدھر..... نہیں جاؤں گا۔ اماں کی خاطر، بہنوں کے لئے۔ پھر وہ دوسری پگڈنڈی کی طرف مڑ گیا۔ دُور کوئی ہماری زمینوں کو پانی دیتے ہوئے اونچی آواز میں ماہیا گارہا تھا۔

نہ توں پیس میڈا، نہ میں ہاں پیڈا، نہ کوئی کہیں دا

(نہ تُو ہے میرا، نہ میں ہوں تیرا، نہ کوئی کسی کا)

ایہ لہڑی لہڑی ضرورتاں دے تبادلے ہن

(یہ اپنی اپنی ضرورتوں کے تبادلے ہیں)

راجا ٹھک گیا اور پھر اس کی بنسری بھی ہونٹوں سے جا گئی۔ بڑا خوب صورت نغمہ و بجلی کی تان پر گونجتے لگا۔ راجا، و بجلی بجاتا ہوا آگے بڑھا جا رہا تھا۔ اسے یہ خبر نہ تھی کہ کہاں جا رہا ہے۔ وہ بے منزل بڑھا چلا جا رہا تھا۔

چودھری شوکت علی کو حسن پور گئے آج تیسری رات تھی اور اس کے جانے سے نوراں بہت خوش تھی۔ چودھری کا ساتھ تو اسے یوں لگتا، جیسے ایک ناگ اس کے ساتھ ہے جو لمحہ بہ لمحہ اسے ڈستار رہتا ہے۔ وہ شوکت کے قریب ہونے کے باوجود راجا کے خیالوں میں گم رہتا۔ کیسے کیسے خواب، دیکھ، جیتے، دلوں، ..... پہتہ نہیں، کس کی نظر لگ گئی کہ ان کے

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ کتوں کے بھونکنے کی آواز پر آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا، جہاں لاتعداد ستارے اور رات کا شہنشاہ چاند جگمگا رہا تھا۔ چاند کی نرم نرم کرنیں اُس کے من میں اگنی سی سلگا رہی تھیں۔ وہ تین روز سے نہ سو سکا تھا۔ اس کی حالت دیوانوں کی سی ہو گئی تھی۔ اس نے یہ کب سوچا تھا کہ اس کے خواب یوں بکھر جائیں گے اور اس کی جہنم جہنم کی ساٹھی نوریاں ایک دم ہی پرانی ہو جائے گی۔ چودھری شوکت علی نے اس کی محبت پر اس طرح شب خون مارا تھا کہ اب زندہ رہنے کے لئے اس کے پاس کوئی آس، کوئی اُمید بھی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اماں اُسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھی، اُٹھتے بیٹھتے وہ صرف یہی کہتی۔

”چھوڑ پُتر! اب تُو اُسے بھول جا۔ مقدر سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔ جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔ اور نور اں کا جوڑا بھی چودھری سے بنایا گیا ہو گا۔“

”پھر مقدر نے مجھے آس کیوں دلائی تھی، اماں؟ میری اُس سے منگنی کیوں ہوئی تھی؟ تو نے منگنی کے لٹو کیوں پائے تھے، اماں! بتا؟“ راجا نے ماں کو جھنجوڑ ڈالا۔

”اُس کے بھیر، وہی جانے پُتر!“ مائی جنت نے آسمان کی طرف حیرت آمیز نظر دلا سے دیکھتے ہوئے راحہ کو دلاسا دیا۔ وہ دلاسا دینے کے سوا اور کر بھی کیا سکتی تھی۔

”ہاں اماں! جو کام غلط ہو جائیں، ہم یہیں کہتے ہیں کہ نیلی چھتری والا جانے۔ تیرا بہن مر گئی تھی تو کیا ہوا تھا۔ ہمارا نکاح ہی ہو جاتا تو کیا فرق پڑتا تھا۔ یہ سب کچھ تیری ذمہ سے ہوا ہے۔“ راجا جانے ماں کو مورد الزام ٹھہرایا۔

سے ہوا ہے۔ ”راجا نے ماں کو موردِ انعام ٹھہرایا۔  
 ”راجا! تو نوراًں کی محبت میں پگلا ہو گیا ہے۔ اپنی ماں سے بات کرنے کی تیزبی  
 کھو بیٹھا ہے۔“ جنت کو غصہ آ گیا۔

”اماں!..... اماں! بتائیں کیا کروں؟“ اور وہ کڑیل جوان ماں سے لپٹ کر ننھے بچے کی طرح رو پڑا۔ اب تو رونا ہی مقدر تھا کیونکہ یہ بھی نیلی چھتری والے نے لکھ دیا تھا۔ کچھ دیر بعد جب اس کا دل کچھ ہلکا ہوا تو اس نے تکیے کے نیچے سے اپنی ہنسنی نکالی، جوتی پہنی



خوابوں کا رنگ محل ایک ہی جھٹکے سے زمیں بوس ہو گیا۔ ایسا تو انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ نور اس سوچتی۔ راجا کو بھی تو معلوم ہو گیا ہو گا، اس کا کیا حال ہوا ہو گا؟ مجھ جیسا پھر وہ خوش ہوا ہو گا کہ اچھا ہے، جان چھوٹی نہیں، نہیں۔ وہ ایسا نہیں سوچ سکتا۔

نور اس بڑی بے چینی سے بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ عجیب سی بے چینی مسلط تھی۔ اس سے اس کا ذہن ڈوبتا اور ابھرتا رہتا۔ وہ کہیں جا بھی نہ سکتی تھی۔ دینو، جو اس کی نگرانی پر مامور تھا، دروازے سے باہر برآمدے میں چارپائی ڈالے سویا رہتا، تاکہ وہ رات میں بھی باہر نہ جاسکے۔ یہ چودھری کا حکم تھا اور دینو اس حکم سے سرتابی کی مجال نہ تھی۔

تب ہی ونجلی کی تان نے نور اس کے دل میں ایک ہلچل مچا دی۔ وہ ایک دم بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے کھڑکی کے پردے ہٹا دیے۔ اب ونجلی کی آواز نمایاں طور پر سنائی دے رہی تھی۔ اور پھر اس نے کچھ بھی نہ دیکھا، وہ دیوانی سی ہو گئی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ کھڑکی سے کود گئی۔ اندھیرے اور سنائے میں دھب کی آواز گونجی۔ یہ وہی بارگ تھا، جہاں نور اس آنکھ چھو لی کھلتے ہوئے چودھری شوکت سے لپٹ گئی تھی۔

وہ تیزی سے دوڑتی چلی جا رہی تھی، جدھر سے ونجلی کی آواز آرہی تھی۔ اُسے کچھ ہوش نہ تھا۔ ونجلی کی آواز میں ایسا مقناطیس تھا، جس کی طرف وہ کھنچی جا رہی تھی۔ پھر وہ ٹھک گئی۔ چاند کی مدھم روشنی میں اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر چلتی ہوئی وہ وہاں تک پہنچ گئی تھی۔ اس کی ساری حسیات آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں۔ سامنے ہی شیشم کے درخت کے تنے سے ٹک لگائے راجا، ونجلی کے سر بکھیر رہا تھا۔ نور اس نے دیکھا، اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ لباس بے حد مسلا ہوا اور شبیو بڑھا ہوا تھا۔ وہ، جو بہت صفائی پسند اور خوش پوش تھا، آج اپنی جون ہی بدل چکا تھا۔

”تُو بھی دُکھی ہے، راجا! میری طرح۔ خوش کوئی بھی نہیں، سوائے چودھری کے۔“ نور اس نے نہایت دُکھ سے سوچا۔ دل کا لہو قطرہ قطرہ آنکھوں سے بہنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور جھپٹ کر راجا سے ونجلی لے لی۔ تان ایک دم ٹوٹ گئی۔ سر بکھر گئے۔ راجا نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور انہیں پٹپٹا کر نور اس کو دیکھنے لگا۔

”نوری!..... نہیں، نہیں..... وہ کیسے آسکتی ہے؟“ وہ بڑبڑایا۔ کیونکہ تصور میں کئی بار وہ نور اس کو اپنے زور و کھڑے دیکھ چکا تھا اور اُسے اب بھی یہی خیال تھا کہ یہ صرف تصور ہے، مگر یہ تو حقیقت تھی۔ چمکنے چاند کی مانند سچی حقیقت۔

”راجا!“ نور اس کے لب کپکپائے۔ تب راجا نے آنکھیں مل کر دیکھا، یہ تصور نہیں بلکہ حقیقت تھی۔ تب بے اختیار راجا کے بازو داہو گئے۔ نور اس پہلے تو کچھ جھجکی، مگر چند لمحوں بعد اس کی کھلی ہاتھوں میں سا گئی۔ راجا

اُسے سینے سے لپٹائے ہوئے تھا اور الفاظ اس کے لبوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے، چھوٹی مالا سے موتی تواتر سے گر رہے ہوں۔

”نوری! میری جان!..... تُو..... تُو نے..... میری بات کیوں نہ مانی؟..... نوری!“ تُو نے مجھے دُکھی کیوں کیا؟“ آنسو راجا کی آنکھوں کا حصار توڑ کر نکلے اور نور اس کے سیاہ بالوں میں جذب ہو گئے۔

”راجا!..... راجا!“ نور اس کچھ بھی نہ بول پائی، بس اُس کے سینے سے سر رگڑتے ہوئے روئی رہی۔

”نوری!“ راجا کے لب کپکپائے۔ وہ دونوں کتنی ہی دیر تک یوگی ایک دوسرے سے لپٹے کھڑے رہے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ یہ آنسو ناکام آرزوؤں کے اور تشنہ خواہشوں کے تھے۔ یہ پامال کئے گئے آرمائوں کے آنسو تھے۔ بھلا یوں انجانے میں بھی کوئی لٹا ہو گا؟..... یوں بھی کسی نے کبھی کسی کو لوٹا ہو گا، دن بتائے، دن کہے۔

”نوری!“ راجا نے کچھ دیر بعد دھیرے سے اُسے خود سے علیحدہ کیا اور اپنی انگلیوں کے پوروں سے نور اس کے آنسو چُسن لئے۔ ”نہ رو..... نہ رو نور! یہ ہمارے مقدر کا لکھا تھا۔ ہم تاعمر روتے ہی رہیں گے۔“ راجا نے دھیرے سے کہا اور روئی ہوئی نور اس کو نیچے بٹھا کر خود بھی قریب ہی بیٹھ گیا۔

”راجا! مجھے یہاں سے دُور لے چل..... جہاں صرف ہم دونوں ہوں۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ چودھری کی حویلی میرے لئے ایک پنجرہ ہے۔ میں آزاد فضاؤں میں اُڑنے والا بن چکی تھی۔ بتا راجا! بتا، پھر میں بھلا قید میں کیسے رہ سکتی ہوں؟“ نور اس نے راجا کا ہاتھ تھام کر کنبی لہجے میں کہا۔

”نوری! میں تجھے آج ہی لے جانے کو تیار ہوں، مگر مجھے خطرہ ہے کہ چودھری پورے گاؤں کو قبرستان میں تبدیل نہ کر دے۔ پھر ہماری خاطر کتنے لوگ اُس کے ظلم و ستم کا نشانہ بنیں گے؟“

”ہاں راجا! ہم مجبور ہیں۔ خدا مجبور بندوں کو کیوں پیدا کرتا ہے؟“ نور اس سک پڑی۔

”اپنے کام وہی جانے۔“ راجا چاند کو تکتے ہوئے بڑبڑایا۔

”ہاں..... مجھے پتہ ہے۔ راجا!“ نور اس ایک آہ بھر کر بولی۔

”کیا؟“ راجا نے اس کی طرف دیکھا۔

”جو چودھری نے میرے باپا کے ساتھ کیا۔“ نور اس کی آواز بھرا گئی۔ آنسو حلق میں



پھندا بن کر رہ گئے۔ اُسے اپنے بابا کی موت کا منظر یاد کر کے جھرجھری سی آگئی۔

”ہاں، مجھے پتہ ہے نوری!“ راجا نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

”کاش! بابا کا کوئی پُتر ہوتا۔ ٹوٹے کر دیتا وہ چودھری کے۔“ نورال لفظ چبا چبا کر بولی۔

”اگر چاچا کا کوئی پُتر ہوتا تو وہ یقیناً چودھری سے انتقام لیتا، مگر.....“

”مگر کیا؟“ نورال نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ زرد چاندنی میں وہ راجا کے چہرے کے تاثرات نہ دیکھ سکی۔

”مگر وہ پہلے تیرے ٹوٹے کرتا، پھر چودھری کے۔ تو بھی تو اپنے بھائی کی مجبوری ہوئی۔

جس طرح بی بی بھراواں اور صفیہ، شبو میری مجبوریاں ہیں۔ میں چودھری سے انتقام لینا چاہتا

ہوں، مگر میری ماں کا بوڑھا چہرہ، میری بہنوں کی رنگ برنگی چیزیاں آنکھوں کے سامنے آ

جاتی ہیں اور میں مجبور ہو جاتا ہوں۔ بہنوں کی چیزیاں ہی تو مجھ غریب کی عزت ہیں۔ اگر وہ

اُتر گئیں تو ان کے نیگے سر کے ساتھ ساتھ میں بھی برہنہ ہو جاؤں گا۔ تو سمجھ رہی ہے نا، میری

مجبوری، نوری؟“ راجا نے نورال کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے کٹورے میں تمام لیا۔ اُتر

نورال کی آنکھوں سے موٹی بن بن کر ٹپک رہے تھے۔

”واقعی راجا! ہم مجبور ہیں۔“ وہ سسکی۔

”مجبور.....“ راجا ہنسا۔ ”پگلی! بہت ہی مجبور۔“ راجا نے وضاحت کی۔

”راجا! گیت سنا۔“ نورال نے اپنی ازلی فرمائش کر دی۔

اور راجا بھلا اُس کی یہ فرمائش کیسے ٹال سکتا تھا؟..... اس کی محبت نے اس سے

فرمائش کی تھی۔ اُس کی دھجلی سے بڑا خوب صورت مگر درد بھرا اُترہ ابھرا، جس نے نورال کے

رنجی دل کے ٹانگوں کو اُدھیڑ کر رکھ دیا۔ وہ راجا کے گھٹنے پر سر رکھے، آنسوؤں کے خزانے نکال

رہی اور راجا اُس کا سر تھپکتا رہا۔ جب صبح کا سایہ اُفتی پر ابھرا تو دونوں کو ہوش آ گیا۔

”اب حویلی جاؤ نورال!“ راجا نے گھبرا کر کہا۔

”ڈر گئے؟“ نورال نے طنز سے کہا۔

”ڈرتا نہیں ہوں، مگر تجھے اپنی مجبوری بھی تو بتانی ہے۔“

”کل یہاں آئے گا نا؟“ نورال نے بڑی آس سے پوچھا۔

”ہاں..... ضرور آؤں گا۔“

نورال کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ انہی راستوں پر ہوتی ہوئی واپس حویلی کی

طرف چل دی اور کھڑکی سے کود کر کمرے میں آ گئی۔ اُسے کوئی گھبراہٹ نہ تھی۔ راجا سے

مل کر اُسے ایک گونہ سکون محسوس ہوا تھا۔ کئی روز بعد اُس نے راجا کو دیکھا تھا، اُس سے

اتنی کی تھیں۔ وہ مطمئن ہو کر بستر پر لیٹ گئی اور خیالات کے تانے بانے بگڑے ہوئے اُسے

پہنچ گئی۔ آخر ساری رات کی جاگی ہوئی تھی۔

ساون ٹوٹ کر برساتا اور اب بھی وقفے وقفے سے بارش ہو رہی تھی۔ باغ میں کوئل کی

لوک دل میں عجیب سا درد جگا رہی تھی۔ گلی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو روح میں اُتری جا

رہی تھی۔ چودھری شوکت علی رنگین کرسی پر پلکیں موندے حقے کی نے منہ سے لگائے بیٹھے

تھے۔ زہرہ بیگم پلنگ کی پٹی سے ٹکی انہیں ہلک ہلک دیکھے جا رہی تھیں۔ وہ کتنی دیر سے اسی

پوزیشن میں بیٹھے ہوئے تھے، ذرا بھی تو نہ ہلے چلے تھے۔ حقے کی نے تو اک بہانہ تھا، منہ

سے لگے رہنے کا اور کافی دیر سے انہوں نے حقہ نہ گڑ گڑایا تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے بہت ہی

حسین سپنوں میں کھوئے ہوئے ہوں۔ زہرہ بیگم محسوس کر رہی تھیں کہ گزشتہ ماہ سے شوکت

علی بہت خوش رہنے لگے تھے۔ آپ ہی آپ کبھی مسکرانے لگتے، کچھ یاد کر کے اُن کی آنکھوں

میں قدیلیں سی جل اُٹھتیں اور ان قدیلوں کی روشنی زہرہ بیگم کو یوں لگتی کہ جیسے ان کا اپنا

آپ جلا جا رہا ہو۔

پچھلے ایک ہفتے سے چودھری شوکت علی رنگ نکل ہی میں تھے اور جب سے آئے تھے،

بارش کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ایک دو بار انہوں نے جانے کا قصد بھی کیا، مگر زہرہ بیگم نے

انہیں روک لیا کیونکہ اتنی شدید بارش میں جیپ چلانا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا

اور شوکت علی بھی نہ جانے کیوں ان کی بات مان گئے تھے۔ زہرہ بیگم اٹھ کر، آہستہ آہستہ

قدم اٹھاتی ہوئی چودھری شوکت علی کے قریب آ گئیں۔ انہیں بالکل احساس نہ ہوا کہ کوئی ان

کے قریب آیا ہے۔ وہ اسی طرح بیٹھے رہے، بے خود اور مدہوش سے، اپنے ہی خیالوں میں

گم۔ زہرہ بیگم کو وہ اتنے اچھے لگے کہ بے اختیار انہوں نے شوکت علی کی پیشانی پر اپنے

کیکپاتے ہونٹ رکھ دیئے اور چودھری شوکت علی نے ایک دم انہیں پرے دھکا دیا تو وہ

لڑکھڑا کر رہ گئیں۔

”اُدھ..... میں سمجھا کہ.....“ چودھری شوکت علی ایک دم ہی گھبرا گئے اور اٹھ کر زہرہ

بیگم کو بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

”شوکت! آپ کیا سمجھے؟“ زہرہ بیگم ان سے اپنا آپ چھڑاتے ہوئے بولیں۔

”وہ..... وہ، کچھ نہیں..... میں سمجھا، ختمی ہی ہے۔ اگر حقہ گر جاتا تو۔“ اُن سے اور کوئی

جواب نہ بن پڑا۔ وہ یونہی زہرہ بیگم کو لپیٹائے کھڑے رہے۔ ”آپ بھی عجیب ہیں۔ اگر پیار

کرنا ہی تھا تو پھر کسی وقت۔“ چودھری شوکت علی نے ان کی گردن پر ہونٹ رکھتے ہوئے

سراوٹ کی۔

”آپ تو جب سے پیدا ہوئے ہیں، میں آپ کو پیار ہی کر رہی ہوں، اور.....“ زہرہ



بیگم نے ترکش سے ایک تیر چھوڑا۔

”اوہ!“ چودھری شوکت علی نے ایک طویل سانس لی اور زہرہ بیگم کے گرد ان کے بازوؤں کا حصار نرم پڑنے لگا۔ اس جملے نے ہمیشہ کی طرح آج بھی ان کے دل پر چھری چلا دی۔ ڈھکے چھپے لفظوں میں زہرہ بیگم نے پھر انہیں گود میں کھلانے کا طعنہ دے دیا تھا۔

”میں آج دنیا پور جانا چاہتا ہوں۔“ چودھری شوکت علی واپس کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

”کیوں؟“ زہرہ غرائیں۔

”آخر زمینوں کا نیا نیا معاملہ ہے۔ نہیں رہوں گا تو سب کھا پی جائیں گے، مگر۔“ نظریں چرا کر بولے۔

”پہلے بھی تو چلتا تھا کام، اب اتنا ضروری کیوں ہے؟“ انہوں نے کڑے پوروں سے گھورا۔

”ضروری ہے۔ جی تو جا رہا ہوں۔“ شوکت علی آہستہ سے بولے۔

”میں اس لمحے میں بات سننے کی عادی نہیں ہوں۔“ زہرہ بیگم نے سرزنش کی۔

”زہرہ! آپ سمجھتے نا۔“ چودھری شوکت علی ایک دم ہی گھبرا کر رہ گئے۔

”بس، میں نے کہہ دیا، آپ نہیں جائیں گے۔“ انہوں نے نہایت رعب سے کہا۔

”اگر نہیں جاؤں گا تو.....“

”کچھ نہیں ہوگا..... یہ میرا حکم ہے۔“ وہ غرور سے بولیں۔

”بہتر۔“ انہوں نے سر جھکا لیا۔ زہرہ بیگم کے سامنے انہیں سر جھکانا ہی پڑتا تھا۔ وہ

جو نوراں کو حاصل کرنے کے لئے نشتی اللہ دتہ پر ہر قسم کا ظلم کر چکے تھے۔ دنیا پور کے لوگوں

میں ظالم چودھری شوکت علی مشہور ہو چکے تھے۔ زہرہ بیگم کے سامنے بیگی بی بی بن جاتے۔

یوں لگتا جیسے کسی نے روح کھینچ لی ہو جسم سے۔ زہرہ بیگم کا ایک ایک لفظ انہیں نثر لگتا۔ آخر

میں کیوں اتنا ڈرتا ہوں زہرہ سے؟ انہوں نے خود سے سوال کیا۔ میں اس سے کہہ دیتا ہوں

کہ میں ضرور جاؤں گا، دنیا پور۔ کر لے جو کرنا ہے۔ تبھی انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا، زہرہ

بیگم میز پر رکھی دواؤں کی شیشیوں کو درست کر رہی تھی۔ یہ تمام دوائیں زہرہ بیگم ہی کی تھیں۔

شہر کے ایک ڈاکٹر سے علاج ہو رہا تھا اور اب تک پتہ نہ چلا تھا کہ زہرہ بیگم کو کیا مرض ہے،

بس دواؤں پر دوائیں کھائے جا رہی تھیں۔

”میں جاؤں گا دنیا پور۔“ آخر چودھری شوکت علی نے دل کڑا کر کے تھوک نفلتے ہوئے

کہا، حالانکہ انہوں نے آواز کو رعب دار بنانے کی بہت کوشش کی تھی، مگر اپنی آواز کی

کپکپاہٹ پر قابو نہ رکھ سکے تھے۔

”آپ جائیں گے؟“ زہرہ بیگم نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا۔

”ہاں!“ چودھری شوکت علی کے ماتھے پر پسینے کے بے شمار قطرے پھیل گئے۔

”تو جائیے..... ضرور جائیے۔“ زہرہ بیگم ہسٹریائی انداز میں چیخیں اور پھر میز پر تکی

شیشیاں ایک ایک کر کے کھڑکی سے باہر پھینکنے لگیں۔ ”میری آپ کو ضرورت نہیں۔ آپ

جائیں۔“ زہرہ بیگم نے روتے ہوئے کہا اور سینڈل اٹھا کر سنگھار میز کے شیشے پر دے مارا۔

شیشہ چھناکے سے ٹوٹ گیا اور اس کی بکریاں ادھر ادھر بکھر گئیں۔ وہ بالکل دیوانی ہو کر رہ

گئی تھیں۔ چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینک رہی تھیں اور چودھری شوکت علی ایک طرف کھڑے تھے

اور ان کا دل کسی ننھی سی چڑیا کی طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ زہرہ بیگم نے چاندی کا گلدان

اٹھا کر ان کی طرف پھینکا تو وہ تیزی سے ایک طرف ہو گئے ورنہ ان کے سر کے ٹکڑے ہو

جاتے۔

”زہرہ! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“ چودھری شوکت علی ہمت کر کے آگے بڑھے اور ان

کے ہاتھ تھام لئے۔

”میں اس کمرے کو تھیں نہیں کر دوں گی، جہاں میری خواہشیں دفن ہیں... جہاں میری

آرزوئیں روندی گئی ہیں۔“

”ہوش میں آئیں، زہرہ!“

”آپ مجھے چھوڑ دیں۔ آپ کو میری ضرورت نہیں ہے۔ آپ جائیں، جہاں جانا

چاہتے ہیں۔“ زہرہ بیگم کی آنکھیں چمک چمک برسنے لگیں اور وہ اپنے ہاتھ چھڑانے کے لئے

زور آزمائی کرنے لگیں۔

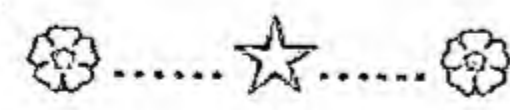
”میں نہیں جاؤں گا، زہرہ! آپ سنیں تو۔“ چودھری شوکت علی کی گرفت ان کی کلائیوں

پر پڑ گئی۔

”نہیں، آپ جائیں..... آپ جائیں۔“ زہرہ بیگم نے اپنی جدوجہد ختم کر دی اور

چودھری شوکت علی کے سینے میں منہ چھپا کر ننھی سی بچی کی طرح رونے لگیں۔ چودھری

شوکت علی ان کی پیٹھ تھپکنے لگے۔



نوراں اور راجا، ندی کے پانی میں پاؤں ڈالے بیٹھے ایک دوسرے کو تیک رہے تھے۔

تب ہی راجا نے دھیرے سے کہا۔

”تمہارا چودھری نہیں آیا؟“

”اچھا ہے، نہ آئے ناگ۔“ نوراں منہ بنا کر بولی۔ ”راجا! میرا دل چاہتا ہے کہ میں

چودھری سے انتقام لوں۔“ نوراں راجا کے برابر آ بیٹھی۔



”وہ کیسے لے گی تو؟“ راجا نے حیرت سے دریافت کیا۔

”تم میرا ساتھ دو۔“ نوراًں بولی۔

”کس قسم کا انتقام ہوگا؟“

”ہم چودھری کو قتل کر دیں اور پھر بھاگ جائیں۔“ نوراًں نے منصوبہ بنایا۔

”یہ تو بزدلوں کا کام ہے۔ پھر اماں اور بہنیں.....؟“ راجا نے کہا۔

”اوہ..... میں تو تیری مجبور یوں سے پریشان ہوں۔“ نوراًں جھنجھلا کر بولی۔

”پھر تو بتا، کیا کروں؟“ راجا ڈکھ سے بولا۔

”اچھا، مجھے سوچنے دو، پھر بتاؤں گی۔“ نوراًں بے زاری سے بولی۔ راجا خاموشی سے اُسے ہنسنے لگا۔

”راجا! لالی کا کچھ پتہ ہے تجھے؟“

”ہاں! تمہارے پاس نہیں آتی؟“

”نہیں، کریمو نے شاید اسے منع کر دیا ہے۔“ نوراًں نے کہا۔ ”اب تو لوگ مجھ سے بھی ڈرنے لگے ہیں، شاید میں ان کی لڑکیوں کو کھا جاؤں گی۔ کہاں پہلے سب نوراًں کے پاس اپنی بیٹیوں کو بھیج دیتے تھے اور اب.....“ وہ غمی سے ہنس دی۔

”پہلے تو نوراًں تھی، ششی اللہ دتہ کی دہلی۔ اور اب تو چودھرائی ہے۔ کتنا فرق ہے پہلے میں اور اب میں۔“ راجا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ نوراًں کچھ نہ بولی، بس چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

اور اچانک ہی وہ دونوں ایک ساتھ چونک پڑے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، بے شک یہ جیپ کی آواز تھی۔

”شاید چودھری آگیا۔“ راجا بولا۔

”مگر رات کے اس وقت؟“ نوراًں نے حیرت سے کہا۔

”اب تو جلدی سے حویلی چلی جا۔“ راجا نے کہا تو نوراًں کو اچانک ہوش آگیا کہ وہ تو حویلی سے باہر ہے۔

”راجا! اب ہم کیسے پلیس گئے؟“ نوراًں کے لہجے سے بے قراری عیاں تھی۔

”جس طرح بھی ممکن ہوگا۔“ راجا جلدی سے بولا۔

”پھر بھی۔“

”میں باغ میں آجایا کروں گا، تو کھڑکی میں آجانا۔“ راجا نے کہا۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“

”اچھا، رت راکھا۔“ راجا بولا۔

”رت راکھا!“ نوراًں نے کہا اور پھر وہ تقریباً بھاگتی ہوئی باغ میں پہنچی، وہاں کھڑکی سے اپنے کمرے میں گزشتہ دس دنوں کی طرح کود گئی اور جلدی سے بستر پر لیٹ گئی۔ اس کی سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی اور پیشانی پر بے شمار ننھے ننھے قطرے جگمگا رہے تھے۔ اس کا پورا جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ ندی میں پاؤں لٹکائے رکھنے کی وجہ سے شلوار کے پانچے بھی بھج گئے تھے اور اُسے ہوش ہی نہیں تھا کہ کپڑے ہی بدل لیتی۔ بڑی مشکل سے اس کی سانس اعتدال پر آئی۔ پھر چند لمحوں بعد ہی اسے اپنے کمرے کے قریب ہی قدموں کی چاپ سنائی دی۔ نوراًں کا دل عجیب انداز میں دھڑک رہا تھا۔

”اوئے دینو!..... تو اب تک جاگ رہا ہے؟“ یہ چودھری شوکت علی کی آواز تھی، جو اس کے کانوں تک پہنچی تھی۔

”سلام مالک!“ دینو کی آواز آئی۔

”چل سو جا..... سو جا۔“ چودھری ہنس دیے۔ پھر نوراًں کو دروازے پر دستک سنائی دی۔ وہ پڑی رہی اور تھوڑی دیر بعد اس نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔

”کیا بات ہے دینو؟“ نوراًں نے آنکھیں مسلتے ہوئے ٹینڈ میں ڈوبی ہوئی آواز بنانے کی کوشش کی۔

”چودھرائی جی! مالک آگئے ہیں۔“ دینو کی چہکار سنائی دی۔

”اچھا!“ نوراًں ایک دم دروازے سے پلٹ آئی۔ چودھری شوکت علی نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

”نورا“ وہ پلنگ کے قریب کھڑی نوراًں کے قریب آئے اور اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

”نورا! تم مجھ سے ناراض ہو؟“ انہوں نے پوچھا، مگر نوراًں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ”بھئی، میں معافی چاہتا ہوں کہ جلد نہ آسکا۔ حسن پور میں تو خوب بارش ہو رہی تھی اور بارش میں کیسے نکلتا؟ پھر زہرہ کی طبیعت بھی خراب ہو گئی تھی۔ آج بھی شام کو وہاں سے چلا ہوں، تب اس وقت پہنچا ہوں۔ معاف کر دنا اپنے مجرم کو۔“ چودھری شوکت علی اس کے سامنے آ گئے اور ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ”معاف کر دنا اپنے مجرم کو۔“ وہ مسکرائے۔ تب نوراًں نے سوچا۔

”چودھری! تم اپنے کون سے جرم کی معافی مانگ رہے ہو؟ تم نے تو بہت سے جرم کئے ہیں۔ مجھ پر کئی ظلم توڑے ہیں۔ تم مجرم ہو، تم قاتل ہو میرے بوڑھے بابا کے۔ تم نے مجھے باپ کی محبت و شفقت سے محروم کر دیا۔ اب تم کس جرم کی معافی چاہتے ہو؟“ نوراًں کا جی چاہا وہ چیخ چیخ کر پوچھے، چودھری شوکت علی کا گریبان پکڑ کر اسے جھجھوڑا لے، مگر وہ کچھ بھی



نہ کہہ سکی۔  
کمرے میں سکوت طاری تھا۔ بس دونوں کی سانسوں کی آواز آرہی تھی۔ آخر اس سکوت کو چودھری شوکت علی کی آواز نے توڑا۔ وہ نورائیں کی خاموشی سے پریشان ہو گئے تھے۔

”نورا! کیا تم مجھے معاف نہیں کرو گی؟ دیکھو، میں اتنی رات کو صرف تمہاری خاطر یہاں آیا ہوں۔ مجھے علم تھا کہ تم میری منتظر ہو گی، تبھی تو تم اب تک جاگ رہی تھیں۔“ وہ رے! کتنی خوش فہمی تھی انہیں۔

”چودھری! آپ کس بات کی معافی مانگ رہے ہیں؟ میں تو اب تک یہی سوچ رہی ہوں۔“ نورائیں کے لب کپکپائے۔

”پورے تیرہ روز تم تنہا رہی ہو، اس بات کی۔ آخر تم نئی ٹیلی دھن ہونا۔“ چودھری شوکت نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔

”ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے چودھری!“

”نورائیں! خدا کے واسطے اتنے اجنبی لہجے میں بات نہ کیا کر۔ میں تیرا شوہر ہوں اور اؤ مجھے چودھری کہتی ہے۔ آئندہ مت کہنا۔“ انہوں نے نورائیں کے سر پر ٹھوڑی ٹکا کر کہا۔

”تو اور کیا کہوں؟“ نورائیں نے ہنس کر پوچھا۔ اس ہنسی میں کتنی ہی کٹنگی ہوئی تھی۔ ”صرف شوکت۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”آپ دنیا پور کے مالک ہیں اور میں آپ کو صرف شوکت کہوں، یہ ناممکن ہے چودھری صاحب!“

”کیا ممکن ہے اور کیا ناممکن، یہ میں خوب سمجھتا ہوں۔ میں تمہارا شوہر ہوں۔“ انہوں نے تھوڑے ترش لہجے میں کہا۔

”زبردستی کے شوہر، ہونہر۔“ نورائیں دل ہی دل میں بولی۔

چودھری شوکت علی اُسے بستر پر بٹھاتے ہوئے دھیرے دھیرے کچھ کہہ رہے تھے اور ”سر ہلا رہی تھی۔

☆.....☆

دن خاصا چڑھ آیا تھا اور کھڑکی کے شیشوں سے چھن چھن کر آنے والی روشنی نے چودھری شوکت علی کے جسم کو چھوا تو ان کی آنکھ کھل گئی۔ طبیعت نہایت کسلندری ہو رہی تھی۔

ایک تو رات کی تھکاوٹ تھی اور دوسرے نورائیں کی قربت۔ وہ رات گئے تک جاگتے رہے تھے۔ نورائیں کی گیلی شلوار کے پانچے جب ان کے پیروں سے لگے تو وہ چونک سے گئے۔

استفسار پر نورائیں نے بتایا کہ گرمی کی وجہ سے وہ کپڑوں سمیت ہی نہالی تھی۔ باقی لباس تو

سوکھ گیا تھا، مگر پانچے گیلے رہ گئے تھے۔ مگر وہ مطمئن نہ ہوئے تھے۔ سوچتے رہے کہ آخر کیا معاملہ ہو سکتا ہے؟ نورائیں سو گئی تھی، مگر ان کا ذہن جاگتا رہا تھا۔ پھر تھکن کی وجہ سے انہیں نیند آ گئی اور اب بھی وہ گیلے پانچوں کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ نورائیں ان کے برابر ہی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی سیاہ کھنٹی پلکیں گرمی ہوئی تھیں، اس کا ایک ہاتھ گال کے نیچے تھا اور وہ سوتے ہوئے نہایت بھلی لگ رہی تھی۔ اس حسین مجسمے کو پانے کے لئے انہوں نے کتنے بار پڑیلے تھے، نشی کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا، تب یہ مرمریں جسم ان کا ہوا تھا۔ مگر انہیں یقین تھا کہ اس مرمریں مجسمے کا دل ان کا نہیں ہے۔ تب وہ آہستہ سے اُٹھے تاکہ نورائیں کی نیند میں خلل نہ پڑے اور جوتی پہن کر کمرے سے باہر آ گئے۔ چند لمحے بعد وہ باورچی خانے میں موجود تھے، جہاں دینو ناشتہ تیار کر رہا تھا۔

”دینو!“ چودھری شوکت علی کی آواز پر وہ گھبرا گیا۔  
”جی مالک؟“

”تم نے پوری طرح نگرانی کی تھی؟“ وہ ناگ کی طرح پھنکارے۔

”ہاں مالک! میں تو دروازے پر ہی سوتا تھا جی۔“ دینو نے کہا۔

”تجھے یقین ہے کہ وہ کہیں نہیں جاتی تھی؟“ چودھری شوکت علی اسے کڑے تیروں سے گھور رہے تھے۔

”ہاں مالک!“

”رات کو نورائیں نہائی تھی؟“ چودھری شوکت علی نے بے ٹکاسا سوال کر دیا۔

”پتہ نہیں مالک.....!“ دینو نے کہا۔ وہ دل میں سوچ رہا تھا، وہ بھلا کون سا میرے سامنے نہائی ہے۔

”اُلو کے پٹھے! پھر اس کے پانچے کیوں گیلے تھے؟“ وہ غصے سے بولے۔

”شاید مالک! وہ نہائی ہو۔ مگر مجھے کیا خبر؟“ دینو گھبرا گیا۔

”تو تو ادھر کیا کرتا رہا تھا، میرے پیچھے؟“

”مالک! میں غسل خانوں میں تو نہیں جھانکتا پھرتا۔“ آخر دینو نے بھی دل کڑا کر کے کہہ دیا۔

”دینو! کسی سے پوچھ، نورائیں کا منگیتر واپس آ گیا ہے شہر سے یا نہیں؟“ چودھری شوکت علی دھیرے سے بولے۔

”اچھا جی۔“ دینو بولا۔ ”اور اگر وہ آ گیا ہو تو؟“

”تو اسے میرے پاس لے آنا“ انہوں نے ہونٹ چبا ڈالے۔

”آپ اسے بھی.....؟“ دینو نے خدشہ ظاہر کرنا چاہا۔



”اومیں اوجھلے! میں نے اب تو بہ کر لی ہے کہ کسی کی زندگی سے نہیں کھیلوں گا۔“ وہ اس دیکھے۔

”تو پھر جی کیا انجام دیں گے؟“ دینو نے پٹھر سے پوچھا۔

”شاید۔“ چودھری شوکت علی اس کے بہت قریب آگئے اور اس سے سرگوشیاں کرنے لگے۔

”بہتر جی۔“ دینو نے سب کچھ سن کر سر ہلایا۔

”اب تو فوراً ناشتہ تیار کر، میں نوراں کو جگانا ہوں۔“ چودھری شوکت علی نے کہا اور کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

”یارب! تو خیر ہی کرنا، غریب پٹری۔“ دینو نے صدقِ دل سے راجا کے لئے دعا مانگی اور تیزی سے ناشتہ تیار کرنے لگا۔ ”ہونہ! مالک تو کہتے تھے نوراں آگئی تو یہ حویلی جنت بن جائے گی۔ یہ تو اب بھی سرائے ہے۔ وہ تو کوئی بھی کام نہیں کرتی، سارے کام مجھ کو ہی کرنے پڑتے ہیں۔“ دینو بڑبڑانے لگا۔

☆.....☆.....☆

چودھری شوکت علی سرخ حویلی سے دو کوس کے فاصلے پر اپنے ایک کنویں پر ایک ہزار سے کے گھر میں بیٹھے تھے۔ یہ ایک کھلا گھر تھا، جس کا گھن تو تھا ہی مگر چار دیواری نہیں تھی۔ دُور دُور تک کے منظر صاف دکھائی دیتے تھے۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ نرم نرم پُر دھاک کے مست جھونکے پودوں کو جھونے پر مجبور کر دیتے تھے۔ ہر طرف ہریالی تھی اور میدان کے درمیان میں یہ ایک کنواں تھا، جس پر صرف تین گھرانے آباد تھے۔ نسلِ داد بھی انہی ہزاروں میں سے تھا، جس کے گھر وہ بیٹھے تھے۔ گھن میں اس کے بچے کھیلنے پھر رہے تھے اور چودھری شوکت علی رنگین پالیوں کی بڑی سی چارپائی جس پر چاندنی چٹھی ہوئی تھی اور خوب صورت کڑھے ہوئے ٹکے رکھے ہوئے تھے، پر براجمان فضلہ کے بچوں کو کھیلنے دیکھ رہے تھے۔ کبھی کبھی ان کی نظر چکی سڑک پر بھی بھٹکتی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ تیزی سے حقہ گڑ گڑانے لگتے۔ بخشتوان کے کندھے دھار ہاتھ اور فضلہ بھی قریب ہی بیٹھا تھا۔

”فضلہ! تیرے کتنے بچے ہیں؟“ گھن میں کھیتے بچوں کو دیکھتے ہوئے چودھری شوکت علی نے فضلہ سے پوچھا۔

”آپ کی دعا سے پانچ ہیں جی۔“ فضلہ اکھار سے بولا۔

”بہت پیارے ہوں گے تجھے۔“ انہوں نے کہا۔

”بس جی، ماں پیر کو تو ہر اولاد ہی بہت پیاری ہوتی ہے۔“ فضلہ بولا۔

”فضلہ! ایک بات بتا۔“ چودھری شوکت نے کہا۔ فضلہ ان کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ ”مگر

میں تجھ سے کہوں کہ اپنا ایک بچہ مجھے دے دے تو تو دے گا؟“ فضلہ چند لمحے خاموش رہا، پھر دھیرے سے بولا۔

”مالک! یوں تو سب کچھ آپ کا ہے، مگر۔“

”مگر.....؟“ چودھری شوکت علی نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

”شاید اولاد دنیا کی وہ واحد چیز ہے، جو کسی کو دی یا کسی سے لی نہیں جاسکتی۔ یہ تو دل کے ٹوٹے ہوئے ہیں جی۔ ایک بھی ٹوٹا علیحدہ ہو جائے تو کچھ نہیں بچتا۔ بس درد ہی درد رہتا ہے۔“

”تو ٹھیک کہتا ہے..... میں بھی چاہتا ہوں کہ میرے بھی دل کا کوئی ٹوٹا ہو۔“ وہ ایک دم نرم پڑ گئے۔

”مالک! خدا سے اچھی اُمید رکھیں جی۔“

”ہاں ہے تو..... یہ دینو اب تک نہیں آیا۔“ انہوں نے بات پلٹ دی۔

”بس جی، آتا ہی ہوگا۔“

”بہت دیر لگا دی۔“ چودھری شوکت علی پھر حقہ گڑ گڑانے لگے۔ وہ سوچ رہے تھے، میں اس سے کیا کہوں گا؟ یہی کہ کیا وہ اب بھی نوراں سے ملتا ہے اور اگر اس نے جواب ہاں میں دیا تو؟..... اس مثبت جواب میں میرے لئے سوائے تضحیک کے کچھ اور نہ ہوگا، پھر میں اس سے اور کیا کہوں گا؟ کیوں بلایا ہے میں نے اُسے۔ وہ حقہ گڑ گڑاتے ہوئے مسلسل سوچے جا رہے تھے۔ ان کی پیشانی پر فکر کی لکیریں ابھرائی تھیں۔ تب ہی کھوڑے کی ٹاپوں کی آواز ان کی سماعت سے ٹکرانی اور وہ خیالات کے سمندر سے باہر آگئے۔ دُور گرد و غبار نظر آرہا تھا۔ چند لمحوں بعد غبار چھٹ گیا اور گھوڑا نظر آنے لگا۔ پھر اس کے سوار بھی نظر آ گئے۔ چودھری شوکت علی نے انہیں پہچان لیا۔ آگے دینو تھا اور اس کے پیچھے یقیناً راجا تھا۔ انہوں نے راجا کو کبھی نہ دیکھا تھا، مگر یہ صرف ان کا اندازہ تھا جو کہ صحیح ثابت ہوا کیونکہ اسی کو لینے کے لئے تو انہوں نے دینو کو بھیجا تھا۔ چند لمحے بعد ہی دینو درخت کے تنے سے گھوڑا باندھ کر وہاں آ گیا۔

”سلام مالک!“ دینو سر جھکا کر بولا۔

”سلام مالک!“ راجا بھی جھک گیا۔

”وہم السلام!“ چودھری شوکت علی نے حقے کی نے بخشتو کو پکڑا دی اور بڑی تنقیدی نظر دل سے راجا کا جائزہ لینے لگے۔ راجا لیلین کی سفید چادر اور بوسکی کی میض میں لبوٹ تھا۔ کندھے پر بڑا سا رو مال پڑا تھا۔ سانولا سلوانا سا راجا، جس کے ہونٹوں کے اوپر گھنی موہنچیں نہایت بھلی لگ رہی تھیں، وہ سر جھکائے، ہاتھ باندھے ان کے سامنے ہی کھڑا تھا۔



”ہوں..... تو تُو ہے راجا؟“ چودھری شوکت علی، مونچھ کو مروڑا دیتے ہوئے بولا۔  
 ”جی چودھری جی!“ راجا نے اسی طرح سر جھکائے جواب دیا۔  
 ”فضلو! بخشو! تم لوگ جاؤ..... میں نے اس سے اک گل کرنی ہے۔“ چودھری شوکت  
 علی کی عقابانی نظریں اب بھی راجا پر کڑی ہوئی تھیں۔ فضلو اور بخشو کھسک گئے جبکہ دیوان کے  
 پاس ہی رہ گیا۔

”ہوں، تو تُو راجا ہے۔“ انہوں نے کڑے تیوروں سے راجا سے کہا۔  
 راجا نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ دونوں نے زندگی میں پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھا  
 تھا۔ چودھری کی نظریں بڑی ٹٹولنے والی تھیں۔ نہ جانے کیوں راجا کی نظریں جھک گئیں۔  
 ”راجا!“

”جی چودھری جی!“ راجا کے لب کپکپائے۔  
 ”تم اور نوراں اب بھی ملتے ہو؟“ انہوں نے ایک دم ہی سوال پوچھ لیا۔  
 پھر کتنی ہی ساعتیں گزر گئیں، راجا سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ  
 وہ کہہ دے، ہاں! ہم ملتے ہیں۔ تُو ہمیں ملنے سے نہیں روک سکتا۔ مگر پھر اس کے ذہن نے  
 دلیل دی، اگر چودھری نے نوراں کو کوئی نقصان پہنچایا تو؟..... ابھی اُسے یہ تو اُمید تھی کہ  
 نوراں زندہ ہے، اس سے ملتی ہے اور شاید ہمیشہ ملتی رہے گی۔

”میں جواب میں اتنی دیر کا عادی نہیں ہوں راجا!“ چودھری شوکت علی غرائے۔ راجا  
 صرف ان کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔  
 ”مجھے نوراں نے سب کچھ بتا دیا ہے، پھر تُو کیوں جھوٹ بولے گا؟“ چودھری شوکت  
 علی نے اندھیرے میں تیر پھینکا، مگر یہی تیر پلٹ کر ان کے دل میں پیوست ہو گیا۔ راجا کہہ  
 رہا تھا۔

”جب آپ کو اس نے بتا دیا ہے تو آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟ عورت اپنے  
 مرد سے ہر بات چھپاتی ہے۔ اصولاً تو نوراں کو بھی یہ بات چھپانی چاہئے تھی، مگر اس نے بتا  
 دی تو اب پوچھنے کو کیا باقی رہ گیا ہے؟“ راجا نے کہا۔  
 ”ہاں، اب کیا باقی رہ گیا ہے۔“ چودھری شوکت علی اس کا جواب سن کر جزیب ہو گئے،  
 پھر بھی اپنی اکڑ اور شان سے کہنے لگے۔

”تُو دنیا پور چھوڑ کر چلا جا راجا!..... کہیں اور.....“  
 ”کیوں؟“ راجا نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ان کی بات کاٹی۔  
 ”وجہ تُو جانتا ہے۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ اب کوئی ظلم نہیں کروں گا اور میں نہیں چاہتا  
 کہ تیرے خون سے ہاتھ رنگوں۔ تُو چپ چاپ یہاں سے چلا جا..... ورنہ.....“ چودھری

شوکت علی نے کہا۔  
 ”کہاں؟“ راجا نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ اس کی نظروں کے سامنے بہنوں کی  
 ہنسیاں اُہرائے گی تھیں۔

”کہیں بھی! دنیا پور کو چھوڑ دے۔“ چودھری شوکت علی بے پروائی سے بولے۔  
 ”مگر چودھری صاحب.....!“ راجا نے کہنا چاہا۔  
 ”اگر مگر کچھ نہیں۔“ وہ تھکسانہ لہجے میں بولے۔  
 ”میری گل دی تو سنو۔“ راجا انکسار سے بولا۔  
 ”کیا؟“ چودھری نے اُسے ٹھہکا۔

”میری بڑی بہن بھراواں کی ایک ہفتے بعد شادی ہے، اس سے پہلے تو میں کہیں بھی  
 نہیں جاسکتا۔“ راجا نے دل کڑا کر کے جواب دیا۔  
 ”بھراواں.....؟“ چودھری نے حیرت سے اس نام کو دہرایا۔

”جی.....“ اُس کی شادی ہو جائے تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا جی!“ راجا آہستہ  
 سے بولا۔

”بھراواں.....“ یہی نام تو ان کی آیا کا تھا، جس نے انہیں گودوں کھلایا تھا۔ ماں کے  
 مرنے کے بعد انہیں ماں کی کمی کا احساس کبھی نہ ہونے دیا تھا۔ بھراواں کے ہی تو ہاتھ انہیں  
 تھکیاں دیا کرتے تھے اور وہ نیند کی گہری دادیوں میں کھو جاتے تھے۔ وہی تو صبح سویرے  
 اُٹھ کر اُن کا منہ دُلو کر انہیں نہایت محبت سے ناشتہ کرواتا تھی۔ چودھری شوکت علی کا تو جی  
 چاہ رہا تھا کہ وہ راجا سے کہیں کہ وہ ایک ہفتے کیا، ایک دن بھی اس کے دنیا پور میں رہنے کی  
 اجازت دینے کو تیار نہیں ہیں، مگر وہ مجبور ہو گئے۔ ان کی ماں، ان کی آباد کی ہم نام، راجا کی  
 بہن تھی جس کی شادی ہوئی تھی اور بھائیوں بغیر بہنوں کی ڈولیاں اُٹھتی اچھی نہیں لگتیں۔  
 انہیں تو بھائیوں کی منتظر رہتی ہیں۔

”ٹھیک ہے راجا! میں تجھے ڈیڑھ ہفتے کی مہلت دیتا ہوں، پھر تیرا پر چھاواں بھی مجھے  
 دنیا پور میں نظر نہ آئے۔“ وہ سخت لہجے میں بولے۔

”بہتر جی۔“ راجا نے سر جھکا دیا۔ اماں کا جھریوں زدہ چہرہ سامنے آ گیا اور راجا کا سر  
 تڑپ جھک گیا۔

”راجا! تُو یاد رکھنا، مجھ سے فراری کرنے والے زندہ نہیں رہتے۔“ چودھری شوکت علی  
 نے راجا کو تنبیہ کی۔

”مجھے خبر ہے۔“ راجا نے کہا۔  
 ”اب تُو جاسکتا ہے۔“ چودھری شوکت علی نے حقے کی منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔



راجا نے وہاں سے چلے جانے میں عافیت جانی، سر جھکا کر سلام کیا اور اُلٹے قدموں واپس ہو گیا۔

”مالک! اگر راجا چلا بھی گیا تو پھر.....“ دینو نے کچھ کہنا چاہا۔

”پھر کیا؟“ انہوں نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے پوچھا۔

”نوراں پوچھنے کی تو سہی آپ سے۔“

”اُسے کیا خبر؟“ وہ بے پردائی سے بولے۔

”راجا اُسے بتائے گا تو.....“

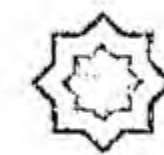
”بتاتا ہے تو بتائے..... اس میں اتنی ہمت نہیں کہ مجھ سے پوچھ سکے۔ اپنے پیر کا اثر

ابھی نہیں بھولی وہ۔“ چودھری شوکت علی غرور سے بولے۔

”اگر راجا نہ گیا تو؟“ دینو نے خدشہ ظاہر کیا۔

”تو..... تو سوچوں گا۔“ چودھری شوکت علی کی پیشانی پر تفکر کی لکیروں کا جال بن

گیا اور دینو انہیں دیکھتا رہ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا، چودھری کے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے ضرور ہے جو وہ مجھے بھی نہیں بتانا چاہتا۔



رات خاصی بیت چکی تھی۔ چودھری شوکت علی اب تک نہ لوٹے تھے اور نوراں بے قراری سے اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی کیونکہ دینو نے اسے بتایا تھا کہ چودھری نے راجا کو بلوایا ہے اور تب سے اب تک اسے کسی کروٹ چین نہ آرہا تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے دل کو کوئی مسئلہ ڈال رہا ہے۔ وہ پریشان تھی کہ کہیں راجا کو چودھری کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ وہ اپنے باپ کا حشر دیکھ چکی تھی اور سب سے زیادہ پریشانی تو اُسے اس بات کی تھی کہ چودھری کو ان کی ملاقاتوں کا علم کیسے ہوا۔ آج چوتھا دن تو تھا انہیں دنیا پورا آئے ہوئے۔ کس نے خبری کی؟ لیکن ہم دونوں کے علاوہ کسی تیسرے کو اس بات کا علم نہیں ہے۔ ایک سوالیہ نشان تھا، جو نوراں کی نظروں کے سامنے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ کمرے کی دیواروں کی طرف حیران حیران نظروں سے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کہیں ان دیواروں نے تو چودھری کو کچھ نہیں بتا دیا؟ یہی تو امین تھیں اس کی دھڑکنوں کی۔ جب وہ راجا سے مل کر آتی تو کتنی سرور رہتی۔ اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا، جہاں دبیز پردہ پڑا ہوا تھا اور جہاں سے گود کر وہ راجا سے ملنے جایا کرتی تھی۔

”اُف! ابھی تک نہ دینو چاچا آیا ہے، نہ چودھری۔ یا خدا! کیا کروں؟“ نوراں بستر سے اٹھ گئی۔ اُسے بستر کانٹوں کا لگ رہا تھا۔ وہ اب بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ کس نے بتایا چودھری کو؟..... وہ اپنی سوچوں میں بڑبڑاتی۔ اب اسے کیا خبر تھی کہ پہلے تو اس کی شلوار کے گیلے پانچے دیکھ کر چودھری کے دل میں گرہ پڑ گئی اور پھر دوبارہ وہ خود دیکھ چکا تھا، جب بھری دوپہر میں نوراں اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس کھڑی تھی اور کچھ کہہ رہی تھی۔ یقیناً دوسری طرف راجا ہی تھا۔

”راجا! آج رات میں نہیں آؤں گی۔ تجھے تو خبر ہے، رات چودھری آ گیا ہے۔ تو میری مجبوری سمجھ نا۔ اچھا، شام کو باغ میں۔“ باہر کھڑے شخص کی آواز چودھری نہیں سن سکتا تھا اور کل شام ہی جب کالی گھٹائیں گھر گھر آئیں اور ہلکی سی پھوڑا ہی پڑی تھی۔ زمین پر چھڑکاؤ ہو گیا تھا اور مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو روح تک کو سرشار اور دماغ کو معطر کر رہی تھی۔



درختوں کے پتے ڈھل کر کچھ اور سبز ہو گئے تھے۔ تب ہی نوراًں نے چودھری شوکت سے پوچھا۔

”چودھری! میں ذرا باغ میں جا رہی ہوں۔“

”کیوں؟“ چودھری شوکت علی کا دل ایک دم دھڑک اٹھا۔

”دیکھو کتنا اچھا موسم ہے اور میں اس موسم میں ہمیشہ جھولا جھولتی تھی، اپنی سکھوں کے ساتھ۔ مگر آج اکیلی ہی جھول لوں گی۔“ وہ اک آہ بھر کر بولی۔

”چلو، دونوں ہی چلتے ہیں۔“ چودھری شوکت علی نے جوتی پہنتے ہوئے کہا۔ نوراًں پہلا تو گھبرا گئی، پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ تب ہی دینو آ گیا۔ وہ نئے نشتی کے آنے کی اطلاع لے کر آیا تھا۔

”اچھا، تو تم جاؤ۔ میں آ جاؤں گا۔“ چودھری شوکت علی نے خود ہی ذرا ڈھیل دینا چاہی۔ نوراًں نے یہ سن کر سکھ کی ایک طویل سانس لی۔ چودھری شوکت علی بڑے کمرے میں چلے گئے اور نوراًں بجائے سیدھے راستے کے، کھڑکی سے ہی باغ میں کود گئی۔

جامن کے بڑے سے درخت کے نیچے راجا اس کا منتظر تھا۔

”نوری!..... نوری!“ وہ بے تابانہ آگے بڑھا۔

”دیکھ راجا! اب چودھری آ گیا ہے۔“ نوراًں نے اس سے کہا۔

”یہ تو مجھے پتہ ہے۔“

”پھر بھی تو.....“ نوراًں اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

”میں تجھے یہ بتانے آیا ہوں کہ بی بی بھراواں کی شادی ہو رہی ہے۔“

”کب؟..... کہاں؟“ نوراًں نے بے قراری سے پوچھا۔

”چاند کی پندرہ تاریخ کو..... نذیر بھائی کا چھوٹا بھائی ہے نا نذر، اس سے۔“ راجا

نے بتایا۔

”مبارک ہو۔“ نوراًں جلدی سے بولی۔ ”اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے کہنا۔“

”نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ راجا نے نہ جانے کیوں سر جھکا لیا۔

”راجا! تو مجھے غیر سمجھنے لگا ہے اب۔“ نوراًں کے لہجے میں شکوہ تھا۔ راجا خاموش رہا۔

”اگر تجھے رقم کی ضرورت ہو تو تو فکر نہ کر، میں تجھے دوں گی۔“

”ہاں، تو تو اب چودھرائی ہے۔“ راجا نے ہنس کر بظاہر اس سے مذاق کیا تھا، مگر نوراًں

کو یوں لگا، جیسے وہ اس پر طنز کر رہا ہو۔

”خدا کے واسطے راجا! مجھے یہ طعنہ نہ دیا کر۔“ نوراًں نے راجا کے سامنے ہاتھ جوڑ

دیئے۔ اس کی آنکھوں میں شبنم جننے لگی تو راجا ہنس دیا۔

پھر جب وہ اپنے کمرے میں آئی تھی تو چودھری شوکت علی، کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ بار بار چھپاں بچھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے بہت غصے میں ہوں۔ نوراًں تیر کھائی ہوئی ہرنی کی طرح سہم گئی۔

”کہیں چودھری کو پتہ تو نہیں چل گیا؟“ وہ کپکپا کر رہ گئی۔

”جھول آئیں پیٹک.....؟“ چودھری نے مڑے بغیر اس سے پوچھا۔

”ہاں..... ہاں.....“ نوراًں ہکلا کر رہ گئی۔

”اچھا، اچھا۔“ چودھری نے اور کچھ نہیں کہا اور کمرے سے چلے گئے۔ پھر وہ رات کو بھی کمرے میں نہ آئے تھے۔ نوراًں ساری رات پریشان رہی تھی کہ کہیں راجا کو وہ کوئی

نقصان نہ پہنچا دے۔ ساری رات اس کا ذہن اُبھرتا ڈوبتا رہا تھا۔ صبح اذان کے وقت اس نے نماز پڑھی اور نہایت دلچسپی سے نماز ادا کی۔ کتنی ہی دیر تک راجا کی خیریت اور اپنے

سکون کی دعائیں مانگتی اور اشکوں کے موتی لٹا رہی۔

نماز کے بعد باہر آئی تھی اور بیٹھک کی بتی جلتی دیکھ کر وہ وہیں چلی آئی۔ اس نے جو کچھ دیکھا، وہ اسے سکون کی ایک طویل سانس لینے کے لئے بہت تھا۔ سامنے ہی صوفے پر

چودھری شوکت علی جوتوں سمیت لیٹے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا، جیسے بیٹھے بیٹھے ہی سو گئے ہوں۔ نوراًں چند لمحے ایک ٹک انہیں دیکھتی رہی، پھر اس کے دل میں نفرت کی ایک ایسی لہر

اٹھی جو پورے وجود پر چھا سی گئی۔ یہی وہ کمرہ تھا، جہاں چودھری شوکت نے نشتی اللہ دتہ پر اپنے مظالم کی انتہا کر دی تھی۔ یہیں زخموں سے چور چور نشتی نے جان دی تھی۔ نوراًں بے

ذہن میں وہی منظر گھوم گیا..... اُسے یوں لگا جیسے یہ سب کچھ دوبارہ اس کی نظروں کے سامنے ہو رہا ہو۔ کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں اور وہ چیخ پڑی۔

”نا..... نا..... نہیں۔“ پھر وہ تقریباً بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ چودھری اور دینو بھاگے ہوئے آئے، دروازہ کھولنے کو کہا، مگر وہ تو

کمرے میں بند اپنے نصیبوں پر آنسو بہا رہی تھی۔ اس نے دروازہ نہیں کھولا۔ چودھری شوکت علی دایوں ہو کر چلے گئے۔ کہاں؟ یہ نوراًں کو معلوم نہ تھا۔

دوبارہ کو جب دینو آیا تو اس وقت بھی وہ یونہی سر جھاڑ، منہ پہاڑ بیٹھی تھی۔ تب دینو نے اسے بتایا تھا کہ چودھری شوکت علی، نشتی کے گھر گئے ہیں اور انہوں نے راجا کو بلوایا ہے،

میں اسے لینے آیا ہوں۔ اس سے پہلے کہ نوراًں کوئی جواب دیتی، دینو جا چکا تھا، اسے ایک بے نام سی غلط دے کر۔ تب سے اب تک وہ بے چین تھی۔ اسے کسی پہلو قرار نہ آ رہا تھا۔

چودھری شوکت علی اب تک نہ لوٹے تھے۔ وہ کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ پردہ ہٹا کر باہر دیکھا تو نیلے آسمان پر بے شمار ستارے چمک رہے تھے اور رم جگم چاندنی کائنات پر پھیل رہی تھی۔



پتہ نہیں، ان تاروں میں کوئی میرے مقدر کا تار بھی ہے یا نہیں۔ نوراًں نے نہایت دکھ سے سوچا۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ نوراًں تیر کی طرح دروازے کی طرف چھٹی اور دروازہ کھول دیا۔

چودھری شوکت علی اندر آ گئے۔

”بڑی جلدی کھولا.... کیا کسی کا انتظار تھا؟“ انہوں نے مسکراتے ہوئے نہایت طنز سے پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ نہایت اطمینان سے بولی۔

”راجا کا؟“ چودھری شوکت علی بستر پر بیٹھتے ہوئے پوچھے۔

”نہیں، تمہارا چودھری!..... میں راجا کے قاتل کا انتظار کر رہی تھی۔“ نوراًں نے لفظ چبا چبا کر ادا کئے۔

”قاتل!“ انہوں نے نہایت حیرت سے نوراًں کو دیکھا۔

”ہاں چودھری! تم نے پہلے راجا کی آرزوؤں کو روندنا، پھر اس کی تنہاؤں کو کچلا، خواہشوں کو پامال کیا اور آک اُسے جان سے بھی مار دیا۔“

”مجھ سے کس نے کہا ہے کہ میں نے راجا کو مار دیا ہے؟“ چودھری شوکت علی پلنگ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”تمہارا یہ آنے کا وقت ہی بتا رہا ہے کہ تم اپنے ظلم کی انتہا کر کے آ رہے ہو۔“ نوراًں نے کہا۔

”مگر نور!“ وہ اس کے قریب آ گئے اور اسے بانہوں میں بھر لیا۔

”مجھے مت چھو چودھری!“ نوراًں چکنی مچھلی کی طرح ان کے بازوؤں سے نکل گئی۔

”نور! تجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ اگر تجھے پتہ چل گیا ہے کہ میں نے اسے بلوایا ہے تو یہ صحیح ہے۔ میں نے تو اسے بات چیت کر کے واپس بھیج دیا تھا۔ تو یقین کر۔“

”پھر تم اتنی دیر تک کہاں رہے ہو چودھری؟“ نوراًں نے انہیں کڑے تیروں سے گھورا۔

”میں زمینوں پر رہا ہوں۔“ چودھری شوکت علی نہایت اطمینان سے بولے۔

”پہلے تو کبھی اتنی دیر تک نہیں رہے۔“ نوراًں نے طنز کیا۔

”اگر تم یقین نہ کر دو تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ مجھے عورت کے سامنے گڑگڑانا نہیں آتا اور وہ بھی تم جیسی عورت، جو اپنے مرد کی وفادار نہیں ہے۔“ چودھری شوکت علی دل کی بات زبان پر لے آئے۔ نوراًں کچھ نہ بولی، وہ بس خاموشی سے چودھری کو تنگ کرتی رہی۔

سوچ رہی تھی کہ میں تو اتنی احتیاط کرتی تھی، پھر تمہیں کیسے پتہ چل گیا چودھری؟ کس نے

خبری کی ہے؟ کچھ بھی ہو، وہ اس کا شوہر تھا اور نوراًں چودھری سے ڈرتی تھی۔ چودھری کے نظام کی انتہا دیکھ چکی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ چودھری وہی اذیتیں راجا کو دے جو اس کے بابا کو دی تھیں۔ پھر اس نے لمحے کے ہزار دیں حصے میں ایک فیصلہ کر لیا اور یہ فیصلہ کر کے وہ مطمئن ہو گئی۔ یہ فیصلہ تھا چودھری کو اپنی محبت دینے کا، چاہے جھوٹی ہی سہی۔ اس سے

محبت و خلوص سے بات کرنے کا فیصلہ کر کے اس نے سکون کی سانس لی، ورنہ چودھری شرکت علی غصے میں کیا نہ کر گزرتے۔ نوراًں نے سوچا، اب تو انہوں نے راجا کو دیکھ بھی لیا ہوگا اور اسے پہچاننا کوئی مشکل نہ تھا۔ آخر دل کی لگی بڑی ہوتی ہے۔ راجا کچھ بھی تھا، نوراًں

کا محبوب تھا، اس کی پہلی محبت تھا اور پہلی محبت بہت ہی پیاری، بہت ہی عزیز ہوتی ہے، جو کبھی بھی نہیں بھلائی جاسکتی، چاہے کتنے ہی درد کے طوفانوں سے گزرنا پڑے۔ وہ خود کو

ایک اور درد کے دریا سے گزرنے کے لئے تیار کر رہی تھی۔ یہ درد کا دریا ہی تو تھا، جس میں وہ بلا سوچے سمجھے کود رہی تھی۔ وہ راجا کو بچانے کی خاطر چودھری شوکت علی سے اپنی جھوٹی

محبت اور جھوٹی وفا جتانے کی چاہ کر رہی تھی تاکہ چودھری شوکت علی سب کچھ بھول جائے۔

چودھری شوکت علی پلنگ پر اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کئے بیٹھے، نوراًں کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا بخور جائزہ لے رہے تھے۔ کیا سوچ رہی ہے آخر؟ انہوں نے دل ہی دل میں

سوچا۔ حالانکہ نوراًں انہی کو دیکھ رہی تھی، مگر انہیں اتنا اندازہ تھا کہ وہ خیالوں ہی خیالوں میں کہیں اور پہنچی ہوئی ہے۔ کیا راجا کے پاس؟ ایک خیال ان کے ذہن میں بجلی کی مانند کوندا

اور چیل کی طرح اپنے نیچے گاڑ کر بیٹھ گیا۔ ان کا جی چاہا کہ نوراًں کو مار مار کر اس کی شکل ہی بگاڑ ڈالیں، تاکہ کل کو کوئی بھی شخص، حتیٰ کہ راجا بھی اس کی طرف دیکھنا گوارا نہ کرے۔ مگر وہ

بہت ضبط والے انسان تھے۔ زہرہ بیگم کی رفاقت میں اگر کچھ سیکھا تھا تو یہی ضبط ہی سیکھا تھا۔ نہ جانے پھر کیسے انہوں نے اس ضبط کے حصار کو توڑ ڈالا تھا اور نوراًں کے حصول کے

لئے ہر تھکنڈا استعمال کر لیا تھا۔ انہوں نے اپنے ذہن سے سارے خیالات کو جھٹکا، لبوں پر اپنی مخصوص مسکراہٹ بجا کر بولے۔

”نور!“ انہوں نے محبت سے چور لہجے میں پکارا تو نوراًں ایک دم چونک گئی اور آنکھیں پٹ پٹا کر چودھری شوکت علی کو دیکھنے لگی۔ وہ بار بار پلکیں جھپک رہی تھی اور اس کی اٹھتی

گرتی پلکوں کی چمکن اس سے چودھری شوکت علی کو بے حد ہی پیاری لگی۔ تہہ در تہہ دل میں اترتی ہوئی۔ چند لمحوں کے لئے دل میں جو خفگی پیدا ہوئی تھی، اس پر نوراًں کی اس ادا نے

پانی پھیر دیا تھا۔

”نور! یہاں آؤ۔“ انہوں نے اسے دوبارہ پکارا اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ تب وہ دیر سے دیر سے چلتی ہوئی شوکت علی کے قریب آئی اور پھر آہستہ آہستہ نیچے جھکتی چلی گئی۔



چودھری شوکت علی حیرت سے اسے تک رہے تھے۔ وہ نیچے بیٹھ گئی۔ نوران نے چودھری شوکت علی کی دونوں ٹانگیں اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیں اور گٹھنوں سے سر کا کر بری طرح رو دی۔ چودھری شوکت علی پریشان ہو گئے۔

”نور!..... کیا ہوا نور؟“

”چودھری! مجھے معاف کرو۔ چودھری! میں اب کبھی بھی راجا کا نام نہیں لوں گی، کبھی تم پر شک نہیں کروں گی۔ میں تاحیات تمہاری وفادار رہوں گی، مجھے معاف کر دو۔“ نوران کے لبوں سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔

”آخر ہوا کیا نور؟..... میں نے تو تجھے کچھ بھی نہیں کہا جان؟“ چودھری شوکت علی نہایت عبت سے اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولے۔

”چودھری! ابھی اور بھی تم کچھ کہو گے؟ یہی بہت کچھ کہہ دیا تم نے کہ تم جیسی عورت مرد کی وفادار نہیں۔“

”مجھے برا لگا.....؟“ انہوں نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر کیا تو اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

”او جھلے! تو نے مجھے غصہ بھی تو دلا دیا تھا۔“ چودھری شوکت علی نے دالہانہ انداز سے اس کی بھگی بھگی آنکھیں چوم لیں۔

”اب تم مجھے کبھی راجا کا طعنہ نہ دینا۔“ نوران کسمائی۔

”کیوں؟“ چودھری شوکت علی نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے برابر بٹھا لیا۔

”وہ میرا گزرا وقت تھا اور گزرے وقت کو بھول جانا اچھا ہوتا ہے چودھری! چاہے وہ اچھا ہو یا برا۔ میں بھی گزرے وقت کو بھول جانا چاہتی ہوں۔“ نوران نے کہا تو چودھری شوکت علی گنگ رہ گئے۔ اتنی جلدی تو انہوں نے کیا پلٹتے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ انسان اتنی جلدی بھول جاتے ہیں، یہ تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ مگر انہیں کیا خبر تھی کہ نوران یہ سب کچھ راجا کی زندگی اور دنیا پور کی سلامتی کی خاطر کر رہی ہے۔

”چودھری! تمہیں یقین نہیں آیا؟“ نوران نے ان کی طرف دیکھا۔

”ہاں..... ہاں، تم کہو اور یقین نہ آئے؟ نور! ایک بات سچ سچ کہو۔“ انہوں نے نہایت سچی لہجے میں کہا۔

”کیا؟“ حیرت سے نوران نے پوچھا۔

”دیکھو جان! جھوٹ نہ کہنا۔“ وہ بولے۔

”بالکل نہیں بولوں گی جھوٹ۔“ نوران گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

”کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے؟“ چودھری شوکت علی نے پوچھا۔ نوران خاموش رہی، کچھ نہ بولی۔ ”بول نا، نور!“ وہ بے تابی سے بولے۔

”کیا بولوں؟“ نوران جان کر بھی انجان بن گئی۔

”تمہیں مجھ سے محبت ہے؟“ انہوں نے جھک کر پوچھا۔

”ہاں..... ہاں..... آخر تم میرے سر کا تاج ہو چودھری!“ نوران نے بڑی مشکل سے سر جھکا کر جواب دیا۔ جب اس کی زبان چودھری کی محبت کا اقرار کر رہی تھی، اس کے اندر چیخ چیخ کر کوئی ”نہیں، نہیں“ کہہ رہا تھا مگر اس نے اندر کی آواز دبا کر ذہن کو قابو میں رکھتے ہوئے ہاں کہی تھی کیونکہ یہی مصلحت کا تقاضا تھا۔

”اوہ، نور!“ چودھری شوکت علی خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ انہوں نے نوران کو چمٹا لیا۔ ”نور! ایک بار پھر کہو۔“ انہوں نے نوران سے سرگوشی کی۔

”مجھے واقعی تم سے محبت ہے۔“ نوران ہولے ہولے کہتی رہی اور چودھری شوکت علی کو یوں محسوس ہوا، جیسے کوئی ان کے کانوں میں امرت گھول رہا ہو، شہد پٹکا رہا ہو اور وہ اس آواز سے، اس جملے سے مدہوش ہوئے جا رہے تھے۔ ”مجھے تم سے محبت ہے۔“ اس جملے نے ان کے دل کی کئی کلیوں کو چمک کر پھول بن جانے پر مجبور کر دیا ان پھولوں کی مہک نے ان پر عجیب سی کیفیت طاری کر دی تھی۔ وہ نوران کے اس شہد آگئیں جملے میں ڈوبتے چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

شام کا وقت تھا۔ پنکھ پکھیر اپنے آشیانوں کو واپس جا رہے تھے۔ آسمانوں پر چھوٹے چھوٹے بادل رُوئی کے گالوں کی طرح ہوا سے نجانے کہاں اڑے جا رہے تھے۔ زہرہ بیگم ٹھنڈے ستون سے ٹیک لگائے جانے کب سے آسمان پر کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں تو آسمان پر اڑتے ہوئے بادلوں پر تھیں، مگر ذہن کہیں اور تھا۔ وہاں، جہاں اُن کا سرتاج تھا۔ دل و ذہن تو دنیا پور میں اٹکا ہوا تھا۔ پورے بائیس روز ہو گئے تھے، چودھری شوکت علی کو دنیا پور گئے ہو حالانکہ جب وہ گئے تھے، تب بھی زہرہ بیگم کی حالت پوری طرح نہیں سنبھلی تھی۔ اصولاً تو انہیں نہیں جانا چاہئے تھا۔ اگر چلے بھی گئے تھے تو جلد لوٹ آنا تھا، کام نمٹا کے۔ اور زہرہ بیگم یہ سوچ رہی تھیں کہ ایسا کون سا حساب کتاب ہے، جواب تک نہیں نکلا۔ ان کا دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا، چھٹی جس انہیں کچھ اور محسوس کرنے پر مجبور کر رہی تھی، مگر کیا؟..... ایک سوالیہ نشان آنکھوں کے سامنے ابھرا کر رہ جاتا۔ چودھری شوکت علی کچھ بھی تھے، مگر تھے ان کے شوہر، اُن کا مان تھے۔ وہ اپنے خیالوں میں بہت دور جا چکی تھیں، تب ہی ایک گیند اس ستون سے آ کر ٹکرائی اور اُچھلتی ہوئی کیاریوں میں چلی گئی۔ وہ چونک کر پیچھے ہٹ گئیں۔



”آہا، چاچی ڈر گئیں!“ شعیب تالیاں پیٹتا ہوا اور ہنستا ہوا ان کے قریب آگیا۔  
 ”بیٹا! اگر گیند مجھے لگ جاتی، تو.....؟“ زہرہ بیگم نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔  
 ”کیوں لگتی؟ میں نے نشانہ ہی ستون کا لیا تھا۔“ شعیب فخر سے بولا۔  
 ”اچھا، تم نے تاک کر پھینکی تھی شیطان!“ انہوں نے شعیب کے ہتھولے ہتھولے کال چوم لئے۔

”چاچی! بھلا کیسا ہے میرا نشانہ؟“ شعیب نے کہا۔  
 ”بہت اچھا۔“

”بڑا ہو کر میں نشانے بازی کروں گا۔“ شعیب نے انہیں اطلاع دی۔  
 ”کس کا نشانہ لو گے؟“ انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔  
 ”عورتوں کا۔“ شعیب جھٹ بولا اور زہرہ بیگم کو ہنسی چھوٹ گئی۔  
 ”آپ کیوں ہنس رہی ہیں چاچی؟“

”تمہاری بات پر۔“ زہرہ بیگم نے کہا مگر وہ دل میں سوچ رہی تھیں کہ آخر کو ہوا اس دادا کے پوتے، جس نے ساری زندگی عورتوں کو نشانہ بنایا، اپنی ہوس کا نشانہ، اپنی کینگی کا نشانہ اور اپنی ذلیل خواہشات کا نشانہ صرف عورتوں کو بنایا اس نے اور تمہارے ذہن میں بھی یہی ہے کہ عورتوں کا نشانہ لو گے۔ معلوم نہیں، تمہارا نشانہ کس قسم کا ہو گا؟  
 تب ہی سیکینہ بیگم آگئیں۔

”یہ یہاں بیٹھا ہے اور ادھر ماسٹر جی ڈھونڈ رہے ہیں۔“  
 ”اماں! میں نہیں پڑھوں گا۔“ وہ ٹھنکا۔  
 ”وہ کیوں؟“ سیکینہ نے حیرت سے پوچھا۔

”بس، مجھے ماسٹر جی اچھے نہیں لگتے۔ کوئی اور ماسٹر رکھیں۔“ وہ نہایت بے پردائی سے بولا۔

”آخر اور بچے بھی تو پڑھتے ہیں انہی سے۔“ انہوں نے گھر کا۔  
 ”میں اکیلا پڑھنا چاہتا ہوں۔“

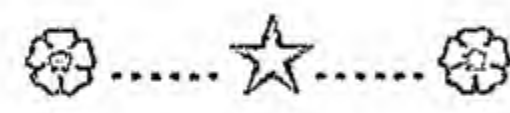
”اچھا، اب تو پڑھ لو، پھر اور رکھ دیں گے۔“ زہرہ بیگم نے جلدی سے کہا۔  
 ”نہیں چاچی!“

”بھڑ! انکار نہیں کرتے۔“ زہرہ بیگم نے پچکارا۔  
 ”اچھا، اگر تم کہتی ہو تو ٹھیک ہے۔“ شعیب نے گیند اٹھائی اور پھر زکا نہیں۔  
 ”تم یہاں کیوں بیٹھی ہو، زہرہ؟“ سیکینہ بیگم نے پوچھا۔  
 ”کچھ نہیں، بھر جانی! دل گھبرا رہا تھا تو باہر آگئی۔“ وہ بے پردائی سے بولیں۔

”دل کا کچھ کرو، بہت گھبرانے لگا ہے۔“ وہ شوخی سے بولیں۔  
 ”کیا کروں بھر جانی؟“  
 ”شوخی کا کچھ پتہ نہیں کب آئے گا؟“ سیکینہ بیگم نے پوچھا۔  
 ”نہاں۔“ زہرہ بیگم نے انکار میں سر ہلا دیا۔  
 ”تو اُسے مٹھی میں رکھ۔“

”تم طالب بھائی کو بھیجو دنیا پور۔ وہ پتہ کریں، آخر ایسا کون سا کام ہے، جو اس کا دل ہی نہیں کرتا آنے کو۔“  
 ”اب کیا کہہ سکتے ہیں، زہرہ!“ سیکینہ آہ بھر کر بولیں۔  
 ”بھابی! میرا تو دل گھبراتا ہے بہت۔ یوں لگتا ہے، جیسے شوکت کو کسی نے مجھ سے چھین لیا ہو۔“

”ارے تو تو جھلی ہے۔ اُسے کوئی چھین لے گا تو اس سے زمینیں چھین لی جائیں گی۔ اور جو کوئی بھی اسے چھینے گا، دولت کی خاطر ہی ایسا کرے گا۔ جب دولت نہ رہی تو کیا ہو گا۔“ سیکینہ بیگم نے دیورانی کو دلاسا دیا، تب زہرہ بیگم کے دل کو ڈھارس بندھی۔  
 ”کہتی تو تم ٹھیک ہی ہو۔“ انہوں نے دل ہی دل میں سیکینہ بیگم کو داد دی اور ان کے ہمراہ اندر آگئیں۔



سردیاں اپنے شباب پر تھیں۔ ندیوں میں کھڑا پانی بھی صبح برف بنا ہوا ہوتا۔ کھیتوں میں کھراجم جاتا۔ پگڈنڈیوں پر اُگی گھاس پر شبنم کے بے شمار قطرے موتیوں کی طرح چمکتے۔ صبح صادق بیلوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی آوازیں نوراں کے دل میں عجیب سی گدگدی پیدا کر دیتیں اور وہ چودھری شوکت علی کے پہلو میں چل چل اٹھتی۔ اس کا جی بے اختیار باہر جانے کے لئے چل اٹھتا۔

چودھری شوکت علی سے اُس کی شادی کو سات ماہ بیت چکے تھے۔ اس نے اب اپنے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ جب چودھری شوکت علی مہینے میں حسن پور کے تین چار چکر لگا لیتے تھے، تب وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرتی۔ اس کا جی بے اختیار راجا سے ملنے کو بے تاب ہو جاتا۔ مگر دینو نے بتایا تھا کہ بھراواں کی شادی کے بعد راجا شہر چلا گیا ہے، اس کی وہاں نوکری لگ گئی ہے اور وہ مہینے کا خرچ اپنی ماں کو بھیج دیتا ہے۔ تب نوراں نے خود کو سمجھا لیا تھا۔

آج بھی بلا کی سردی تھی۔ وہ اپنی تھمیلیں رضائی میں دبی پڑی تھی، تب ہی بیلوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی آوازیں نے اسے چونکا دیا۔ اتنی شدید سردی کے باوجود وہ رضائی



پھونک کر اٹھ بیٹھی۔ چودھری شوکت علی بھی چوک کر اٹھ بیٹھے۔  
 ”کیا ہوا نور؟..... طبیعت تو ٹھیک ہے تیری؟“ انہوں نے بے قرار ہو کر پوچھا۔  
 ”ہاں، ٹھیک ہوں..... میں..... ذرا باہر.....“ نوراًں نے کہنا چاہا۔  
 ”اس قدر ٹھنڈ ہیں؟“ انہوں نے اس کا بازو تھام لیا۔  
 ”میرا دل چاہ رہا ہے، چودھری!“ نوراًں نے لہجے میں بولی۔  
 ”بہت ٹھنڈ ہے، آ جاؤ ادھر۔“ انہوں نے اپنے پہلو میں اشارہ کیا۔  
 ”چودھری! پچھلے سال یہی موسم تھا، جب میں صبح سویرے اٹھ کر بھوری کو چارہ ڈال رہی تھی، پھر ناشتہ پکا کر بابا کو دیتی اور خود بھی کھا کر اپنی سکھیوں کے ساتھ کھیتوں میں کپاس پٹنے چلی جاتی۔ کیا پہلے کی اور اب کی نوراًں میں اتنا فرق ہو گیا ہے کہ وہ اپنے علاقے کے سرد گرم بھی برداشت نہیں کر سکتی؟“ نوراًں نے چودھری شوکت علی کی طرف دیکھا۔  
 ”ہاں نور! اب بہت فرق ہو گیا ہے۔ پہلے تو صرف نوراًں تھی اور اب چودھرائی نوراًں ہے۔“ چودھری شوکت علی اک غرور سے بولے۔  
 ”چودھری! اب تو مجھے اپنی سکھیوں میں جانے دیا کرو۔ قسم سے چودھری! میں اکیلا کر پاگل ہو جاؤں گی۔“ نوراًں نے ان کے ہاتھ تھام کر نہایت سنجیدگی سے کہا۔  
 ”نور! تو ان کو بلا لیا کر۔“

”کوئی نہیں آتی۔“ نوراًں نے ان کی بات کاٹ دی۔

”کیسے نہیں آتی۔ میں آج ہی.....“

”ناں چودھری! کہیں مجھیں اور آنا جانا بھی زبردستی ہوا ہے؟“ نوراًں نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”اوہ!“ انہوں نے طویل سانس لے کر نوراًں کا ہاتھ چوم لیا۔

”مجھے اجازت دو چودھری! کہ میں کپاس چھنے جاؤں۔“ اس نے نہایت مصومیت سے پوچھا۔

”پوچھا۔“

”پتلی ہوئی ہے۔“

”چودھری!“ نوراًں منمنائی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”ارے، اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ اچھا، چلی جانا، بس۔“ انہوں نے نوراًں کے آنسو ننگی کی پیر سے صاف کئے۔

”دائیں؟“ وہ بے یقینی سے بولی۔

”مگر ایک شرط پر۔“

”وہ کیا چودھری؟“

”وہ شرط یہ ہے کہ تو مجھے آئندہ چودھری نہیں بولے گی۔“ انہوں نے کہا۔ جب بھی نوراًں کا موڈ درست ہوتا وہ یہ بات ضرور کہتے کہ مجھے چودھری نہ کہا کر۔

”چودھری..... مجھے یہی کہنا اچھا لگتا ہے۔ تمہارا نام میرے منہ پر چڑھتا ہی نہیں۔“ نوراًں نے ہمیشہ کی طرح مصومیت سے کہا۔

”کیوں نہیں چڑھتا؟..... تم پکارو تو خود بخود زبان پر آ جائے گا۔“

”چودھری! تم میرے شوہر ہو، اور.....“ نوراًں نے کہنا چاہا۔

”شوہر کو شوہر کے نام سے پکارا جاتا ہے، نہ کہ عہدے سے۔“ انہوں نے شوخی سے کہا۔

”مجھے یہ اچھا لگتا ہے۔ کیا کروں، مجھ سے نہیں لیا جاتا، تمہارا نام۔“ نوراًں زچ ہو کر بولی۔

”پھر بھی۔“ چودھری شوکت علی نے کہا۔

”تمہیں میری خوشی عزیز نہیں؟“ نوراًں نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

”تمہاری خوشی تو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔“ انہوں نے اُسے گھسیٹ کر اپنے اوپر گرالیا تو نوراًں نے ان کے سینے میں چہرہ چھپا لیا اور چودھری شوکت علی نے اوپر سے رضائی ڈال لی۔



سورج خاصا نکل آیا تھا۔ نوراًں ناشتے کے بعد چھت پر آ گئی۔ چودھری شوکت علی زمینوں پر جا رہے تھے۔ دینو بھی ان کے ہمراہ تھا۔ نوراًں نے چھت پر ہی سے دیکھا کہ چودھری شوکت علی اور دینو کے گھوڑے آگے پیچھے کھیتوں کی طرف جا رہے تھے۔ آج پہلا دن تھا، کپاس چھنے کا اور دُور دُور تک نوراًں کو کھیتوں میں رنگ برنگی چیزیاں متحرک نظر آرہی تھیں۔ نوراًں کے دل میں اک ہوک سی اٹھی۔ کبھی اُس کا شمارھی انہی لڑکیوں میں ہوتا تھا اور جس روز پہلا دن ہوتا پٹنٹی چھنے کا تو رات کو نیند ہی نہ آتی تھی۔ ساری رات وہ لوگ منصوبے بناتیں، چیزیاں رنگی جاتیں، سب اپنی اپنی ہانگتیں۔ کوئی کہتی، پٹنٹی کے پیسے جمع کر کے میں تو تلے والی جوتی بنواؤں گی۔ لالی کو کپڑے بنانے کا بہت شوق تھا اور وہ ہر سال نخل کی قمیض خریدنے کے لئے پٹنٹی کے پیسے جمع کرتی، مگر وہ گھر کی ضرورتوں میں ختم ہو جاتے اور لالی آئندہ موسم کا انتظار کرتی۔ نوراًں کی خواہش ہوتی کہ اپنا کوٹھا پکا کر دے گی، مگر کوٹھا پکانہ بن سکا اور وہ خود ایک کچی حویلی میں آ گئی۔

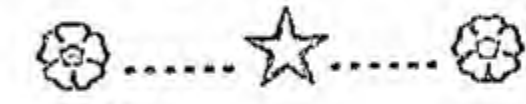
”اللہ میاں! میں نے تو صرف اپنے بچے کو ٹٹے کی خواہش کی تھی، نہ کہ اتنی بڑی، کچی حویلی کی۔“ نوراًں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات اُڑ آئی۔



لڑکیاں کپاس چنتے ہوئے اونچے سروں میں وہی صدیوں پرانا گیت گارہی تھیں۔ پھر ان سب میں نوران کی آواز سب سے اونچی ہوتی تھی۔ کتنا پسند تھا اُسے یہ گیت۔

موسم آئی دواڑ دی چٹرن پیاں بھولیاں  
(موسم آیا کپاس کا، چن رہی ہیں بھولی لڑکیاں)  
جمن پروسی ٹساں گھن آؤ ڈولیاں  
(جمن پروسی تم لے آؤ پالکیاں)

نوران کتنی ہی دیر تک انہیں دیکھتی رہی۔ اس کے لب بھی آپ ہی آپ گنگنائے رہے۔ دل کھیتوں میں جانے کو چل چل اٹھا۔ گو، چودھری شوکت علی نے اُسے جانے کی اجازت دے دی تھی، لیکن وہ چاہتی تھی کہ چودھری اُسے اجازت نہ دے، تب وہ ان سے لڑے اور کہے، میں زبردستی جاؤں گی۔ مگر انہوں نے فوراً اُسے اجازت دے دی تھی۔ اب بھلا وہ کیسے نہ جاتی۔ اُسے شبنم سے ترپٹوں سے کپاس کے پھول چنتے ہوئے بڑا حرا آتا تھا۔ وہ منٹوں میں ڈھیروں کپاس چن لیتی تھی اور جب بٹائی ہوتی تو سب سے زیادہ اُس کی پھٹتی ہوتی تھی۔ سب لڑکیاں حسرت سے دیکھتی تھیں۔ اس کے بعد لالی کا نمبر آتا تھا۔ قرہی کنوؤں سے بھی لڑکیاں، عورتیں آیا کرتی تھیں، لیکن نوران اتنی زندہ دل تھی کہ سب سے اس قدر گل مل جاتی، جیسے برسوں کی جان پہچان ہو۔ وہ انہیں خوب مایے سناتی تھی۔



اور اب بھی کپاس کے کھیت میں لالی اور شادو اکٹھی کپاس چن رہی تھیں۔ شادو مظہر گڑھ سے آئی تھی، وہ لوگ گندم کی کٹائی کے زمانے میں بہاولپور چلے جاتے تھے اور کپاس کی چٹائی کے زمانے میں دنیاپور آ جاتے تھے۔ اس کی تین بہنیں اور ماں دو ماہ دنیاپور ہی میں گزارتے۔ وہ لوگ گزشتہ تین سال سے آرہے تھے۔ شادو کی نوران سے بھی گہری دوستی تھی۔ کل ہی شام کو وہ لوگ دنیاپور آئے تھے۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اُس نے لالی سے کہا۔

”نوران نہیں آئی؟“

”نہیں۔“ لالی نے ہولے سے جواب دیا۔

”کیوں؟“ شادو نے حیرت سے کہا۔

”میں کی شادی ہو گئی ہے۔“ لالی نے کہا۔

”واقعی، بڑی خراب ہے۔ وہ تو کہتی تھی کہ مجھے ضرور اپنی شادی میں بلوائے گی، مگر نہیں بلایا۔“ شادو نے لالی سے شکوہ کیا۔

”بس، جلدی میں ہوئی ہے اس کی شادی۔“ لالی بات ٹاٹنے کے انداز میں بولی۔

”کہاں گئی ہے بیاہ کر؟“ شادو نے پوچھا۔

”یہیں ہے۔“ لالی بدستور کپاس چنتی رہی۔

”پھر آئی کیوں نہیں؟“ شادو کو تو جیسے کھوج لگی ہوئی تھی۔

”وہ سرخ حویلی دیکھ رہی ہو؟“ لالی نے ہاتھ روک لئے اور حویلی کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں..... یہ تو تمہارے چودھری کی حویلی ہے۔“

”وہ اُس حویلی میں سمجھ لو، قید ہے۔“ لالی نے دکھ سے کہا۔

”کیا مطلب؟“ شادو نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”چودھری نے اس سے زبردستی شادی کر لی تھی اور اب اس کے باہر آنے پر پابندی ہے۔ کہیں جاتی ہے تو چودھری ساتھ ہوتا ہے۔“ لالی نے تفصیل سے بتایا۔

”اوہ! مگر یہ کیوں.....“

”پھر بتاؤں گی۔“ لالی نے اس کی بات کاٹ دی۔

پھر شادو سے تو بالکل کپاس چن ہی نہ گئی۔ وہ تو بس یونہی ہاتھ چلا رہی تھی۔ اُس کا

ذہن نوران میں اٹکا ہوا تھا وہ سوچ رہی تھی، ہائے! اتنی پیاری اور نازک سی نوران اس

بڑھے کے ساتھ کیسے گزر کر رہی ہو گی؟ وہ یہی سمجھی تھی کہ چودھری سرفراز سے اس کی شادی

ہوئی ہے۔ سارا دن اس کا ذہن ابھرتا ڈوبتا رہا اور جب عصر کی اذان ہو رہی تھی تو وہ سب

گھریاں باندھے ڈیرے کی طرف چل پڑیں۔ عورتوں کا ایک قافلہ تھا، جو قطار کی صورت

میں سروں پر گھریاں اٹھائے ڈیرے کی طرف رواں دواں تھا۔ بالکل ایسے، جیسے بارش سے

پہلے چوٹیاں ایک لائن میں سوراخوں سے نکلتی ہیں۔ سب اپنی اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئیں اور

کپاس صاف کرنے لگیں۔ شادو، لالی کے قریب کھسک آئی۔

”لالی! بتانا، نوران.....“

”دیکھ، تو یہاں بات نہ کر۔ کسی کو خبر ہو گئی تو میں بھی جان سے جاؤں گی۔ گھر چل کر

بتاؤں گی۔“ لالی نے سہم کر ادھر ادھر دیکھا۔

”اوہ، شادو! تُو نے کتنی پھٹٹی چچی؟“ شادو کی ماں نے اس سے پوچھا۔

”یہ ہے اماں!“ شادو نے اشارے سے بتایا۔

”اوہ بخت! بس اتنی ہی؟..... اس سے تجھے کیا حصہ ملے گا؟ کیا ہو گیا تھا تجھے؟“

ماں نے اُسے گھر کا۔

”اماں! سر میں درد تھا۔“ شادو سر جھکا کر بولی۔ تب اس کی ماں اُسے گھورتی ہوئی اپنی

”دوسری بیٹی نذیراں کی طرف چلی گئی۔

”جلدی صاف کر لے، شادو! چودھری آنے والا ہے۔“ لالی نے اسے ٹھوکا دیا۔



ہمیشہ سے یہ روایت تھی کہ پہلے دن کی ہنسی چودھری خود تقسیم کرتا تھا۔ مگر گزشتہ کئی سال سے تو کسی نے بھی تقسیم نہیں کی تھی بس امیر علی اور نئی اللہ رتہ بٹائی کر دیتے تھے۔  
”تمہارا چودھری تو بہت بڑھا ہے، وہ کیسے آئے گا؟“ شادو نے کہا۔

”تو دیکھنا تو۔“ لالی نے کہا۔

تب ہی چودھری شوکت علی آگئے۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی بھی تھی۔ شادو تو حیرت سے گنگ ان دونوں کو دیکھتی رہ گئی

”چودھری اور نوراً.....“ اُس کے لب کپکپائے۔

چودھری شوکت علی سفید شلوار کرتے میں تھے۔ اُن کے ساتھ نوراً تھی، جو آسمانی رنگ کے شلوار سوٹ میں بالکل کوئی شہری لڑکی لگ رہی تھی اور پیچھے دینو تھا، جس نے چودھری کا بڑا ساتھ اٹھا رکھا تھا۔ چودھری ڈیرے کے بڑے سے احاطے میں بیٹھی ہوئی عورتوں سے باتیں کر رہے تھے۔ نوراً بھی ان کے ہمراہ تھی۔

”یہ تو جوان ہے تمہارا چودھری۔“ شادو نے لالی کا کندھا ہلایا۔

”وڈا چودھری سر گیا تھا تو یہ چودھری بنا ہے۔“ لالی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”چنگا۔“ شادو نے کہا۔ ”نوراً تو ہُن دڈے آدمی کی دوہٹی بن گئی ہے۔ اب اصر دیکھتی بھی نہیں۔“

”آئے تو دیکھے۔“ لالی نے اُس کی حمایت کی۔

پھر نوراً نے جیسے ہی لالی اور شادو کی طرف دیکھا، تیر کی سی تیزی سے ان کی طرف لپکی۔

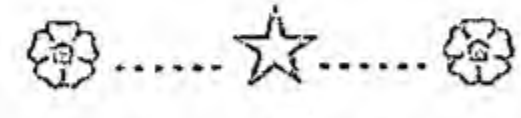
”شادو!..... لالی!.....!“ اُس کا چہرہ کھل اٹھا اور بازو پھیل گئے۔ مگر وہ دونوں اپنی جگہ ہی کھڑی رہیں، جیسے ان کے قدم زمین نے جکڑ لئے ہوں۔ نوراً نے حیرت سے انہیں دیکھا، اُس کی آنکھوں میں نمی جنے لگی اور نوراً کی بائیں ٹوٹی ٹہنیوں کی طرح گر گئیں۔

”شادو! میں وہی نوری ہوں..... تمہاری ساتھی، تمہاری سکھی۔ تم بھول گئیں مجھے؟“ نوراً کی آواز رندہ لگی۔

”نوری! کیا خبر چودھری پسند نہ کرے ہمارا میل جول۔“ شادو نے لب کشائی کی۔  
”مگر وہ پندرہ گنا تو بڑے ہیں یہاں نہ بیچتا، اپنے ساتھ ہی رکھتا۔“ نوراً نے کہا اور وہاں سے ہٹ گئی۔ پھر وہ ادھر کی نہیں، بلکہ تیزی سے حویلی آگئی۔ اُس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا، لالی اور شادو کے اتنے سرور دیتے پر..... ایسا تو اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ شادو جب بھی دنیا پورا آتی، پہلے نوراً سے ملتی اور دوڑ کر اس سے لپٹ جاتی۔ اور آج..... آج تو

وہ دُور کھڑی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں نوراً کو دیکھ کر وہ مخصوص چمک نہیں ابھری تھی، جو دوستوں کے تلاب پر آنکھوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔

”اُف خدا! یہ وقت بھی آنا تھا۔“ نوراً نے بڑبڑاتے ہوئے کرسی کی پشت سے سر ہٹ کر پلکیں موند لیں۔ ”چودھری! تم نے مجھے کہیں کا بھی نہیں چھوڑا۔ تم نے مجھے میری سسکیوں سے بھی جدا کر دیا، ان کی محبتیں بھی میرے لئے ختم ہو گئی ہیں۔ بھلا میں تمہاری محبت پر کیسے زندہ رہوں، جبکہ یہ محبت یک طرفہ ہے۔ محبت تو جذبوں کے تبادلے کا نام ہے اور یہاں تو تبادلے ہی نہیں ہوئے، پھر دل کیسے ملتے؟“ وہ اپنے حالات پر کافی دیر تک اشک بہاتی رہی۔



دن بیتے، رتیں بدلیں، بہار و خزاں کا چکر چلتا رہا اور وقت مانند طائر پر پھیلانے اڑتا رہا۔ نوراً اور چودھری شوکت علی کی شادی کو پورے چار سال بیت گئے۔ ان چار سالوں میں ان کی محبتوں میں کوئی کمی نہ آئی۔ چودھری شوکت علی، نوراً کا بچوں کی طرح خیال رکھتے، اس کے آرام کا خیال، اُس کے ہر دکھ سکھ کے وہ ساتھی تھے۔ صبح نہایت محبت سے اُسے جگاتے اور پیار سے اُسے ناشتہ کراتے۔ مگر نجانے پھر بھی وہ نوراً کے دل میں جگہ نہ پا سکے تھے۔ نوراً انہیں اپنی اوپری محبت کا یقین دلائے ہوئے تھی اور وہ اسی طرح خوش تھے۔ حسن پور جاتے تو ان کا دل نہ لگتا اور وہاں سے جلد از جلد دنیا پورا آنے کی کوشش میں لگے رہتے۔ زہرہ بیگم طفر کے سارے تیر اپنے ترکش سے نکال لیتی اور چودھری شوکت علی کو یوں لگتا، جیسے یہ دل کے آر پار ہوئے جا رہے ہوں۔ وہ کچھ بھی نہ کہتے، بس سر جھکائے ان کی سنتے رہتے۔ نوراً سے شادی کا ابھی تک کسی کو بھی پتہ نہ چلا تھا، اس لئے وہ مطمئن تھے۔ مگر کبھی کبھی شعیب اور دوسرے چھوٹے بچوں کو دیکھ کر ان کے دل میں اک ہوک سی اٹھتی۔ کاش! میرے بھی بچے ہوتے۔ مگر وہ کیا کر سکتے تھے۔ شاید قسمت میں انہیں باپ بننا ہی نہ تھا۔ اور اولاد تو مقدر اور مرد کی قسمت سے ہوتی ہے۔ ان کے مقدر میں اولاد ہی نہ تھی۔ ان دنوں چودھری شوکت علی، زہرہ بیگم کی بیماری کی وجہ سے حسن پور آئے ہوئے تھے، اس رات گھر میں عجیب سی ہلچل دیکھ روہ پریشان ہو گئے۔

”زہرہ! کیا ہو گیا ہے؟“ انہوں نے زہرہ بیگم کو اٹھایا۔

”پتہ نہیں، جا کر دیکھتی ہوں۔“ زہرہ بیگم نے کہا اور باہر چلی گئیں۔ چودھری شوکت علی بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے رہے۔ چند لمحے بعد ہی زہرہ بیگم آ گئیں۔

”کیا ہوا تھا زہرہ؟“ وہ تیزی سے ان کی طرف لپکے۔

”آپ تو چودھری شجاعت سے بھی زیادہ بے چین ہیں۔“



”کیا مطلب؟“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”مطلب یہ ہے کہ شجاعت کے ہاں بیٹی ہوئی ہے۔“ وہ منہ بنا کر بولیں اور بستر پر لیٹ گئیں۔

”اوہ..... تو یہ بات تھی۔“ انہوں نے طویل سانس لی، پھر زہرہ بیگم کی طرف دیکھا، جو دیوار کی طرف منہ کئے لیٹی تھیں۔ ”کاش! زہرہ بیگم! آپ یا نوراًں مجھے بھی اسی بے چینی سے نوازتیں۔ آپ دونوں عورتیں تو شاید اس قابل ہیں ہی نہیں۔“ انہوں نے سوچا اور پھر آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ سونے کو ان کا جی نہ چاہتا تھا۔ وہ مسلسل کچھ سوچے جا رہے تھے۔

☆.....☆

نوراًں کی ان دنوں طبیعت بڑی گری گری سی رہنے لگی تھی۔ ہر وقت سوئے رہنے کو ہی کرتا، کسی کام میں بھی دل نہ لگتا۔ اب تو وہ چودھری شوکت علی کی محبت کا جواب بھی بڑی سرد مہری سے دینے لگی تھی مگر وہ پھر بھی خوش رہتے، کبھی شکوہ نہ کیا انہوں نے اس سے۔ دن خاصا چڑھ آیا تھا، چودھری شوکت علی کھیتوں میں نکل گئے اور ہوا خوری کے بعد واپس بھی آگئے تھے، مگر نوراًں اب تک سوئی ہوئی تھی۔

”نوراً!..... اٹھ جاؤ۔ دیکھو کتنا دن چڑھ آیا ہے۔“ انہوں نے اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا مگر اُس نے کسمسا کر کروٹ بدل لی۔ ”اٹھو جان!“ چودھری شوکت علی نے اس کے گال چومتے ہوئے کہا۔

”اوہو، کیا مصیبت ہے؟“ وہ جھنجھلا کر اٹھ بیٹھی۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں آخر؟..... اتنی چڑچڑی کیوں ہو گئی ہو؟“ انہیں بھی ایک دم تاؤ آ گیا۔ آخر برداشت کی بھی تو ایک حد ہوتی ہے۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“ وہ ہونٹ سکیڑ کر بولی۔

”کیا ہوا ہے طبیعت کو؟ چلو میرے ساتھ شہر، ڈاکٹر کو دکھا دوں۔“

”ایک تو تم چودھری! حد سے زیادہ انجان ہو۔“ نوراًں ”جھڑو“ کہتے کہتے رک گئی تھی۔ ”میں سمجھا نہیں؟“

”اب میں کس طرح سمجھاؤں؟“ نوراًں نے گھٹنوں میں سر چھپا لیا۔

”یتاؤ نوراً کیا بات ہے؟“ ان کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا تھا۔

”خود بخود چاؤ۔“ نوراًں کے لبوں پر مسکراہٹ رہینگئی۔

”نوراً!..... نوراً! تم کیا کہہ رہی ہو؟ اگر میں غلط نہیں سمجھا تو..... تو یہی بات ہے کہ تم مجھے ایک نیاروپ دے رہی ہو۔“ انہوں نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

نوراًں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ ممتا کی خوشی سرخی بن کر اس کے گالوں پر دوڑ گئی۔

”اوہ نوراً!..... پھر کہو..... پھر کہو کہ میری ازلی مراد پوری ہونے والی ہے۔ کہو نوراً!“ چودھری شوکت علی نے مارے خوشی کے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

”ہاں چودھری! یہ سچ ہے کہ میں.....“ نوراًں کی آواز رُندھ گئی۔ دل چاہ رہا تھا، کہہ دے کہ تم ایک سانپ ہو، جس کا سنبولیا میرے وجود میں پرورش پا رہا ہے مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ لیکن چودھری شوکت علی تو مارے خوشی کے دیوانے ہو گئے تھے۔ اسے گود میں لئے پورے کمرے میں چکر لگاتے پھر رہے تھے۔

”اوہ..... دینو! کہاں ہے؟..... ادھر آ۔“ وہ نوراًں کو بستر پر بٹھاتے ہوئے چیتے۔

”جی مالک!“ دینو ہاتھ میں صافی لئے آمو جو دو ہوا۔

”اوئے دینو! جاؤ، مٹھائی بانٹو۔ شادیانے بجاؤ..... جاؤ!“

”مگر کیوں مالک؟“ دینو نے حیرت سے چودھری شوکت علی کی طرف دیکھا، جن کا چہرہ مارے خوشی کے سرخ ہو رہا تھا۔

”اوئے بے وقوف! میں وی پیو بنوں گا..... میرا بھی ایک وارث ہو گا۔ تُو جا۔“ انہوں نے دینو کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”مبارک ہو مالک!“ دینو نے کہا اور نوراًں کی طرف دیکھنے لگا، جو جلدی سے لیٹ گئی تھی اور اوپر چادر لے لی تھی۔

”ہائے، کیا سوچتا ہو گا دینو چاچا۔ چودھری بھی بس ایویں ہے۔“ نوراًں مارے شرم کے سرخ ہو گئی تھی۔ پھر دینو ہنستا ہوا چلا گیا۔

تب چودھری شوکت علی پٹنگ کے قریب آئے اور چادر کا کونا ہٹا کر نہایت محبت سے پُور لہجے میں سرگوشی کی۔

”نوراً!..... اتنی بڑی خوشخبری سنا کر بھی تُو منہ چھپا کر پڑ گئی ہے۔“

”بس، مجھے شرم آتی ہے چودھری!“ نوراًں نے دھیرے سے کہا۔

”مجھ سے بھی؟“ انہوں نے جھک کر پوچھا۔ نوراًں نے کوئی جواب نہ دیا اور چودھری شوکت علی ہنس دیئے۔ خوشی تو ان کے روم روم سے پھوٹ رہی تھی۔

پھر چودھری شوکت علی تین ماہ تک دنیا پور ہی میں رہے۔ وہ نوراًں کو اٹھ کر پانی بھی نہ پینے دیتے۔ اس کی ذرا ذرا سی ضرورت کا خیال رکھتے۔ اسے انہوں نے شیشے کی گڑیا بنا کر رکھا تھا، جیسے ذرا سی ٹھیس سے چور چور ہو جائے گی۔

اُس روز وہ بیٹھک میں بیٹھے نشی سے حساب کتاب کر رہے تھے کہ دینو گھبرایا ہوا آیا۔

”مالک!..... مالک! بڑے مالک، چودھری طالب آگئے ہیں۔“

”اوہ!“ چودھری شوکت علی ایک دم گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور دینو کو ایک طرف لے



گئے۔ ”نوراں اپنے کمرے میں ہوگی، اسے کھڑکی کے راستے باہر لے جائے۔ ذرا بھوک پڑے لالہ کو۔ فوراً“ انہوں نے سرگوشیوں میں دینو کو سمجھایا اور وہ سر ہلاتا ہوا تیزی سے پیشک سے نکل گیا۔ اگر ذرا دیر اور ٹھہر جاتا تو یقیناً چودھری طالب علی کے ہتھے چڑھ جاتا اور نوراں کو نہ نکال سکتا۔ وہ تیزی سے نوراں کے کمرے میں پہنچا۔

”نوراں! جلدی کرو، یہاں سے نکل چلو۔“

”وہ کیوں؟“ نوراں نے حیرت سے دینو کو دیکھا۔

”چودھری طالب آگئے ہیں جی۔“ دینو گھبرا کر بولا۔

”تو اُن کو پتہ چل جائے کہ ان کے بھائی نے کیا حشر پیا کئے ہیں۔“ نوراں طہرے ہنس دی۔

”نہیں نوراں! یہ نہیں ہونا چاہئے۔ ورنہ چودھری شوکت علی دنیا پور کو قبرستان بنادیں گے۔ وہ غصے کے بہت تیز ہیں۔“ دینو نے اُسے سمجھایا۔

”نہیں..... یہ نہیں ہونا چاہئے۔ آخر یہ بات کب تک چھپے گی؟“ نوراں دل کڑا کر کے بولی۔

”نوراں! یہ دیکھ، میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔“ دینو نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”نہ..... چاچا دینو!..... میں تو تیری احسان مند ہوں، جس نے میرے بابا کو دنا دیا۔ ورنہ تو مجھے اس کی یادگار کی تلاش میں پتھ پتھیر وڈوں کو ڈھونڈنا پڑتا۔“ نوراں نے اس کے ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگا لئے۔ ”تُو تو میرا احسن ہے چاچا!“ نوراں نے کہا اور چادر اٹھا کر اوپر لی۔ پہلے دینو کھڑکی سے باغ میں کودا، پھر نہایت احتیاط سے نوراں کو بھی اُتار لیا۔ چند لمحے بعد وہ لالی کے گھر میں تھے۔ لالی کی بھی شادی ہو چکی تھی اور اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ کریم کو صرف ایک بیٹا تھا۔ لالی نے اسے دروازے میں داخل ہوتے دیکھا تو تیرا سے اس کے قریب آئی۔

”نوری!..... میری جان! کیا ہوا تجھے؟“

”آج میں یہاں پناہ لینے آئی ہوں۔ وہ حویلی بھی مجھے پناہ نہیں دے سکتی۔“ نوراں تسخّر سے بولی۔

”کیا مطلب؟“ کریم بھی نزدیک آ گیا تھا۔

”مطلب یہ ہے کہ چودھری جی کے بڑے بھائی آگئے ہیں، اُن کو تو خبر نہیں۔ اب جب تک وہ یہاں رہیں گے، نوراں ادھر ہی رہے گی۔“ دینو نے ایک جملے میں بات ختم کر دی۔

”یہ ہماری خوش قسمتی ہے۔“ لالی نے نوراں کو تھام لیا تو دینو واپس چلا گیا اور وہ لالی کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ لالی کی ماں نے نیم کے درخت کے نیچے چار پائی پر صاف ستھری چاندنی بچادی اور تکیے لگا دیئے۔

”ماسی! کیا میں اتنی بدل گئی ہوں؟“

”پتر! اب تجھے عادت نہیں رہی ہوگی، بان کی منجی پر بیٹھنے کی۔“

”نہیں ماسی! میں اپنی عادت، اپنی اوقات نہیں بھولی۔“ نوراں ایک آہ بھر کر بولی، پھر چاندنی بٹادی اور کھری چار پائی پر بیٹھ گئی۔ حالانکہ لالی اور اس کی ماں منع کرتی رہیں۔

دونوں سکھیاں کافی عرصے بعد ملی تھیں۔ نوراں تو لالی کی شادی میں آ بھی نہ سکی تھی حالانکہ لالی نے بلوایا تھا۔ مگر وہ آ کر کیا کرتی؟ لڑکیاں تو اس سے یوں بھاگتی تھیں جیسے وہ چودھری کی بیوی بن کر کوئی ماورائی مخلوق بن گئی ہو اور یہ اوپر اپن نوراں کو پسند نہ آتا تھا۔

جب لالی کی ماں اور بھابی ادھر ادھر ہو گئیں تو نوراں نے لالی سے کہا۔

”لالی! راجا نہیں آیا ابھی شہر سے؟“

”نہیں۔“ لالی نے کہا۔

”کیوں؟“ نوراں نے پوچھا۔

”تُو نے پہلے تو کبھی نہیں پوچھا۔“

”جب تُو حویلی آتی ہے تو تجھے پتہ ہے کہ میں کوئی بات نہیں کر سکتی۔ یوں لگتا ہے، دیواریں بھی میری باتیں سن رہی ہیں۔ مجھے خوف آتا تھا کہ چودھریں کہیں تجھے پیغام رساں نہ سمجھ لے۔ حالانکہ میں نے راجا کو پورے چار سال سے نہیں دیکھا، نہ اس سے ملی۔ مگر لالی! میں اسے بھول نہیں پائی۔ آخر ایسا کیوں ہے؟..... مجھے چودھری سے بالکل بھی محبت نہیں ہوئی، میں کیا کروں لالی؟“ نوراں کی آواز بھر ا گئی۔

”تُو اب چودھری کی ہے نوری! اب تُو راجا کے متعلق سوچا بھی نہ کر اور پتہ نہیں اب وہ کہاں ہوگا۔ ماسی جنت اور رشتہ، صفیہ بھی بھراواں کی شادی کے بعد ہی بٹے چلی گئی تھیں۔“ لالی نے تفصیل بتائی۔

”اور تُو نے مجھے بتایا بھی نہیں۔“ نوراں نے شکوہ کیا۔

”تُو نے پوچھا ہی کب تھا؟“ لالی بولی۔

”اچھا..... جہاں رہے، خوش رہے۔“ نوراں آہ بھر کر بولی تو لالی اُسے دیکھتی رہ گئی۔ کیا یہ وہی نوراں ہے، جو بات بے بات تھمتھے لگاتی تھی، جس کے ہونٹوں پر کبھی سوگوار مسکراہٹ بھولے سے بھی نہیں آتی تھی۔ چودھری نے تو اُس کی مسکراہٹیں بھی چھین لیں۔ کیا رکھا ہے اس میں۔ اب سب کچھ تو اس نے چھین لیا ہے اس سے۔ تمام شوخیاں، شرارتیں اور



مسکرائیں۔ ہمارے گاؤں کی یہ چنچل اور شوخ لڑکی، اپنی مثال آپ تھی۔

چودھری طالب علی جب بیٹھک میں داخل ہوئے تو چودھری شوکت علی بدستور نشی کے ساتھ کام میں مصروف تھے بلکہ کچھ زیادہ ہی یوں مصروف تھے، جیسے انہیں خبر ہی نہ ہو کہ چودھری طالب علی آئے ہیں۔ چودھری طالب علی نے انہیں متوجہ کرنے کے لئے ہلکا سا ہاتھ مارا تو چودھری شوکت علی نے پلٹ کر دیکھا۔

”اوہ، طالب بھائی!“ چودھری شوکت علی بچوں کی طرح چیتے ہوئے مارے خوشی کے ان سے لپٹ گئے۔

”تجھ میں اور شعیبی میں کوئی فرق نہیں۔“ چودھری طالب علی نے ان کی پیٹھ تھپکتے ہوئے نہایت محبت سے کہا۔

”نہیں..... میں یہ دیکھنے آیا تھا کہ ایسی کون سی مصروفیت ہے، جس نے تجھے روک رکھا ہے۔ پورے تین مہینے ہو گئے ہیں۔“ انہوں نے چودھری شوکت علی کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”بس لالہ! اب بھی دیکھئے، نشی کے ساتھ بیٹھا سر کھپا رہا ہوں۔“

”یہ نشی ہے۔“ انہوں نے تعارف کرایا۔

”سلام مالک!“ نشی رت نواز کھڑے ہو کر، سر جھکا کر بولا۔

”ولیکم!“ طالب علی نے سر کو خفیف سی جنبش دی۔

”اوہ، اللہ رتہ کر رہ گیا؟“

”وہ، لالہ!..... وہ تو شواہر گیا۔ تین چار سال ہو گئے۔ جب سے یہ نواز ہی ہے میرا

نشی۔“

”مگر تُو نے مجھے نہیں بتایا۔“

”یاد نہیں رہا ہو گا۔“

”بہت اچھا آدمی تھا..... بڑا ہی وفادار۔ بابا بہت خوش رہتے تھے اُس سے۔“

چودھری طالب علی اُس کی تعریفیں کر رہے تھے۔

”رت نواز! تُو جا، باقی کام کل ہو جائے گا۔“ چودھری شوکت علی نے رت نواز کو اٹھا

دیا اور وہ سلام کرتا ہوا چلا گیا۔

”ہاں لالہ! کیسے آئے؟“

”زہرہ بہت پریشان تھی تیرے لئے۔ کہتی تھی، عجیب عجیب طرح کے خواب آتے

ہیں۔ پتہ نہیں، کیا حالت ہو۔ وہ تو خود آتی، مگر اُس کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ اس لئے میں

نے روک دیا۔“

”اوہ!..... اب کیسی ہے؟“ چودھری شوکت علی نے اپنے لہجے میں بے قراری پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”فکر مند نہ ہو۔ اب وہ ٹھیک ہے۔ ویسے تیری صحت بہت اچھی ہو گئی ہے، کیا بات

ہے؟“ چودھری طالب نے بھائی کی طرف دیکھ کر شوخی سے پوچھا۔

”نہیں تو لالہ! ویسا ہی ہوں۔“ چودھری شوکت علی جھینپ گئے۔

”کہیں تُو نے شادی تو نہیں کر لی؟“ انہوں نے ایک دم گولی داغ دی۔

”توبہ کریں لالہ! مجھ سے ایک نہیں سنبھلتی تو دوسری کا کیا کروں گا؟ آپ کو کیسے غلط لگتی

ہوئی؟“ چودھری شوکت علی نے تو کافی عرصے سے خود کو اس سوال کے جواب کے لئے تیار

کر رکھا تھا۔ اب بھلا کیسے اس سوال کا جواب اطمینان سے نہ دیتے۔

”ویسے آپ نے یہ سوال کیوں کیا؟“ انہوں نے طالب علی کو دیکھا۔

”تیرے چہرے کی شگفتگی اور تیری صحت چنچل کھا رہی ہے۔“

”کیا یہ سب کچھ صرف شادی سے حاصل ہوتا ہے؟ یہاں کی کھلی آب و ہوا ہے نا، اس

لئے۔“

”کھلی ہوا تو حسن پور کی بھی ہے۔“ چودھری طالب علی بغور اس کے چہرے کی طرف

دیکھتے ہوئے بولے۔

”وہ تو لالہ بستی ہے نا! یہاں پر تو صرف گنے چنے مکان ہیں۔“ وہ بھی راہ دینے والوں

میں سے نہ تھے۔

”دیکھ شوکی! تُو کبھی ایسا کام نہ کرنا، جس سے کچی اور مالک کا فرق کم ہو جائے۔ کچیوں

کی عورتیں ہمارے دل تو بہلا سکتی ہیں، مگر ہم انہیں اپنے بچوں کو بہلانے کا موقع نہیں دے

سکتے۔“

”لالہ! میں بھلا کوئی پاگل ہوں؟“ چودھری شوکت علی زور سے ہنس دیے۔

”میں اب بابا کے بعد گھر کا بڑا ہوں شوکت! اور میں کسی کو یہ اجازت نہیں دوں گا کہ

وہ اولادیں بانٹتا پھرے۔“ چودھری طالب علی کے لہجے میں تنبیہ تھی۔

”لالہ! آپ کو شکایت نہیں ہو گی۔“ چودھری شوکت علی نے سر جھکا کر جواب دیا۔ مگر

انجانے اندیشوں سے ان کا دل دھڑک اٹھا تھا۔ اگر لالہ کو پتہ چل گیا تو پھر کیا ہو گا؟

اچھا..... جب تک میں کچھ کر لوں گا۔“ انہوں نے انجانے غدشوں کو سر جھٹک کر رفع کر

دیا۔ تب تھوڑا دینو آ گیا۔

”سلام مالک!“ دینو نے سر جھکا کر کہا۔

”کیا حال ہے دینو! کہاں تھے؟“ چودھری طالب علی نے ہنس کر پوچھا۔



”بس جی، کام کر رہا تھا۔“ دینو نے ہنسی نکال دی۔

”دینو! جلدی سے پانی گرم کر، لالہ نہیں گے اور پھر کھانا تیار کر۔“

”بہتر مالک!“ دینو باہر چلا گیا۔ پھر وہ دونوں بھائی باتیں کرنے لگے، ٹھیک سی۔

”بہت ضد کر رہا تھا آنے کی۔ مگر میں نے کہا کہ گھر رہو۔“ چودھری طالب علی نے بتایا۔

”لے آتے۔“ وہ بولے۔

”وہ بہت شیطان ہے، تو نہیں جانتا۔“ چودھری طالب علی ہنس کر بولے۔

”بچے تو شیطانیاں کرتے ہوئے ہی اچھے لگتے ہیں لالہ!“ شوکت علی بھی ہنس دیے۔

دینو پانی گرم کر چکا تھا۔ چودھری طالب علی غسل خانے میں چلے گئے اور جب نہا کر

واپس بیٹھک میں آئے تو چودھری شوکت علی کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اتنی تیز کہ ان

کی آوازیں چودھری کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ چودھری طالب علی ہاتھ میں کوئی چیز لے

ان کی طرف بڑھے آ رہے تھے اور چودھری شوکت علی حیران و ششدر ان کی طرف دیکھ

گئے۔

”یہ کہاں سے آیا شوکت؟“ انہوں نے گرج کر پوچھا اور چودھری شوکت علی کی توجہ

سانسیں ہی رک گئیں۔



چودھری شوکت علی کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ وہ سخت حیران تھے کہ دینو سے یہ غفلت کیسے ہو گئی۔ انہوں نے تو نظروں ہی نظروں میں اسے سب کچھ سمجھا دیا تھا کہ کوئی بھی ایسی نشانی باقی نہ رہے، جس سے یہ پتہ چل سکے کہ حویلی میں کوئی عورت بھی موجود ہے یا نہیں۔

چودھری طالب علی اُن کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا بخور جائزہ لے رہے تھے۔ وہ اس وقت چودھری شوکت علی کی ذہنی کشمکش سے بھی آگاہ تھے، جو سر جھکائے بالکل مجرموں کی طرح کھڑے تھے۔

”شوکت! میں نے پوچھا تھا کہ یہ کہاں سے آیا؟“ وہ ان کے بالکل قریب آ گئے۔

چودھری شوکت علی نے سر اٹھا کر چودھری طالب علی کو دیکھا اور ان کے چہرے سے نظریں پھسلتی ہوئی چودھری طالب علی کے ہاتھ میں پکڑے اودے دوپٹے پر جم گئیں۔

”آخر میں اتنا ڈر کیوں رہا ہوں؟ اس طرح تو انہیں اور شک پڑے گا۔ اور ویسے بھی

میں اس راز سے پردہ نہیں اٹھانا چاہتا۔ اس راز سے پردہ اس وقت اٹھاؤں گا، جب دنیا پور

کے مالک کا وارث گود میں ہو گا۔ تب میں فخر سے بھائیوں سے کہہ سکوں گا کہ اب میرا بھی

وارث ہے، میں بھی باپ بن گیا ہوں، تب یقیناً سب خوش ہوں گے۔“ چودھری شوکت علی

کا دل انجانی خوشیوں کے تصور سے دھڑکنے لگا۔ انہوں نے چودھری طالب علی کی آنکھوں

میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس کے لبوں پر تبسم چل چلا گیا۔

”لالہ!“ وہ مسکرائے تو چودھری طالب علی نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”لالہ!

آپ میرے بڑے بھائی ہیں۔ میرے بابا کی جگہ ہیں۔ مگر میں آپ سے یہ بات کرنے

کوئے شرم محسوس کرتا ہوں کہ.....“ چودھری شوکت علی نے سر جھکا لیا اور خاموش ہو گئے۔

”کہ کیا؟“ چودھری طالب علی کی پاٹ دار آواز گونجی۔

”کہ لالہ! یہی آپ نے تو ابھی کہا تھا کہ کسی کی لڑکیاں ہمارے دل تو بہلا سکتی ہیں،

مگر ہمارے بچے نہیں بہلا سکتیں۔ بس کسی لڑکی کا رہ گیا ہو گا یہ دوپٹہ۔“ انہوں نے اٹھا



درجے کی بے پروائی سے کہا۔

”مگر غسل خانے میں کیوں؟..... وہ تو بڑی اجڑی ہوئی، تھکے تھکے قدموں سے واپس جاتی ہیں۔“ چودھری طالب علی کے دل سے اب بھی شک دور نہ ہوا تھا۔

”لالہ!..... وہ لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں، جن کو زبردستی اٹھوایا جاتا ہے۔ تب وہ اجڑی ہوئی واپس جاتی ہیں۔ یہاں تو بعض ایسی آتی ہیں جو آم کے کچے پور کی طرح جھولی میں جاتی اور نہادھوکرو واپس جاتی ہیں۔“ چودھری شوکت علی بے حیائی سے ہنسے۔

”اور چیزیاں لے جانا بھول جاتی ہیں۔“ چودھری طالب علی نے ان کی بات کاٹی۔  
”او، لالہ! اب میں کس طرح سمجھاؤں آپ کو۔ وہ تو چادروں میں منہ چھپا کر آتی ہیں۔ بس خیال نہ رہا ہوگا۔“ چودھری شوکت علی زچ ہو کر بولے۔ انہیں یہ اُمید نہیں تھی کہ چودھری طالب علی ان سے اتنے سوال کریں گے۔ مگر وہ ان سے بڑے اور بہت ہی کاہل تھے۔

”تو سچ کہہ رہا ہے، شوکی؟“ چودھری طالب علی کا لہجہ اب قدرے نرم تھا۔

”لالہ! آپ سے کوڑ کیسے بول سکتا ہوں؟ بھلا پیو سے بھی کسی نے کوڑ بولا؟“ چودھری شوکت علی نے نہایت لاڈ سے بڑے بھائی کے گلے میں بازو جمائل کر دیے۔

”شوکی! مجھے پتہ ہے، تو کوڑ نہیں بول رہا۔ مگر پتہ! مرد کے بہکتے دیر نہیں لگتی۔ ہم کہاں اپنے خاندان میں کچڑے کوٹانوں کو شریک کریں؟ یہ ہماری عزت ہے شوکی!..... تو ابھی بچہ ہے اور تجھے یہ خبر نہیں۔“ چودھری طالب علی ان کا کندھا تھکتے ہوئے نہایت پیار سے بولے۔ اکیس بائیس سال کے چودھری شوکت علی ان کی نظروں میں ابھی بچے ہی تو تھے۔

”لالہ! آپ فکر نہ کریں۔ لائیے، دوپٹہ دیجئے۔ جس کا ہوگا، جب آئے گی، لے جائے گی۔“ چودھری شوکت علی نہایت خباثت سے بولے اور انہوں نے چودھری طالب علی کے ہاتھ سے دوپٹہ لے کر فضا میں اچھالا تو وہ قالین پر آ رہا۔

دینو نے دسترخوان بچھا کر جلدی میں جو اس سے پک سکا تھا، چن دیا تھا۔ چودھری طالب علی اور شوکت علی کھانے کے لئے بیٹھ چکے تو دینو قریب ہی کھڑا ہو گیا۔

”دینو! اب تو تو بھی اچھا پکانے لگا ہے۔“ چودھری طالب علی نے اس کی تعریف کی۔  
”کیا کروں گی۔ مالک کے ساتھ رہتے ہوئے سکھ گیا ہوں۔“ دینو انکسار سے بولا۔

”تیری بیوی کو بڑی آسانی رہے گی۔ اب اسے بھی یہیں بلا لے۔“

”مالک! وہ ادھر ہی ٹپک ہے۔“ دینو نے کہا۔

”کیوں؟“ چودھری طالب علی نے حیرت سے پوچھا۔

”ایویں تنگ کرے گی جی!“ دینو سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

”کیا تو بھی شوکی والی حرکتیں کر رہا ہے؟“ انہوں نے ایک دم سوال کیا۔

”نہ جی..... میں تو جی.....“ دینو گھبرا گیا۔

”دینو! ذرا نمک لے آ۔“ چودھری شوکت علی نے جلدی سے بات پلٹ دی اور دینو کی

بات ادھوری رہ گئی۔ وہ جلدی سے باہر چلا گیا۔ چودھری شوکت علی کو خطرہ ہو گیا تھا کہ دینو سچ نہ اُگل دے۔

”بہت اچھا ہے دینو..... بہت وفادار۔“ چودھری طالب علی نے کہا۔

”ہاں لالہ!..... میری قسمت اچھی ہے کہ اتنا اچھا ملازم ملا۔“ چودھری شوکت علی ہنس

رہے۔

کھانا کھاتے کھاتے اچانک چودھری شوکت علی کی نظر قالین پر پڑے ہوئے اودے

دوپٹے پر جا پڑی۔ ان کے دل میں ایک عجیب سی ہوک اُٹھی۔ ابھی تین روز قبل ہی تو انہوں

نے نوراں کو اودے رنگ کا ایک سوٹ سلوا کر دیا تھا، جس کے ساتھ کا یہ دوپٹہ تھا۔ جب وہ

اس دوپٹے کے ساتھ کا سوٹ پہن کر ان کے سامنے آئی تھی تو وہ دم بخود رہ گئے تھے۔ اس

کے بھرے بھرے جسم پر سوٹ خوب فٹ رہا تھا۔ اس دوپٹے نے اس کے صبیح چہرے کے گرد

بالہ کیا ہوا تھا اور وہ انہیں دل میں اتر جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔ انہوں نے اسے

لپٹا کر بھیج بھیج لیا تھا..... ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس سے نوراں کو دل میں چھپالیں،

اس کے وجود سے اُٹھنے والی مہک نے انہیں مدھوش کر دیا تھا۔ شاید آج ہی اس نے وہ جوڑا

اتارا تھا اور دوپٹہ غسل خانے میں بھول گئی تھی۔ اس سے یہ غلطی ہوئی اور دوسری غلطی دینو

سے ہوئی جس نے چودھری طالب علی کو بھی اسی غسل خانے میں بھیج دیا۔ حالانکہ ایک اور بھی

غسل خانہ تھا، جو عرصے سے بند پڑا تھا۔ اگر دینو چاہتا تو اسے کھلوا دیتا۔ آخر اتنی مصیبت تو

مول نہ لینی پڑتی۔

چودھری شوکت علی مسلسل سوچے جا رہے تھے اور نوالہ ان کے ہاتھ میں جوں کا توں

تھا۔

”شوکی! کیا سوچ رہا ہے؟..... روٹی کھانا۔“ چودھری طالب علی نے انہیں ٹھوکا دیا تو

وہ خیالات کی پورش سے باہر آ گئے۔

”اُدوہ..... کچھ نہیں لالہ! بس ذرا زہرہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔“ انہوں نے ایک

دہائی بھائی کو مطمئن کر دیا۔

”اُدوہ..... تو فکر نہ کر، اللہ اچھائی کرے گا۔ اور وہ تو اب بالکل ٹھیک ہے۔“ چودھری

طالب علی نے دلاسا دیا۔

”پھر بھی لالہ! فکر تو ہے نا۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو آخر میں اس سے دور ہوں۔“ وہ



اُداس لہجے میں بولے۔

”اوٹو بڑا کہینہ ہے۔ تجھے فکر ہوتی تو یہاں ایسے دھندے کرنا؟“ چودھری طالب علی نے سرزنش کی۔

”کیا کروں لالہ؟“ وہ کھسیانے ہو گئے۔

”تُو اسے یہاں لا کر رکھ۔ آخر وہ تیری بیوی ہے۔“ چودھری طالب علی نے انہیں مشورہ دیا۔

”لالہ! میں تو اسے بیوی ہی سمجھتا ہوں، مگر وہ مجھے ایک ایسا بچہ سمجھتی ہے، جسے اس نے گودوں کھلایا ہے۔ اور اب بھی ڈانٹ ڈپٹ اپنا فرض سمجھتی ہے۔“ انہوں نے دل کا پکٹا لاد بھائی کے سامنے کر دیا۔

”میں سمجھا نہیں۔ کیا مطلب ہے تیرا؟“ چودھری طالب علی حیرت سے بولے۔  
”وہ مجھے گود کھلانے کے طعنے دیتی ہے۔ لالہ! بتا، اس میں میرا کیا قصور ہے؟“ وہ ہر جھکا کر بولے۔

”تُو نے پہلے کیوں نہ بتایا؟“ انہوں نے کہا۔

”کیا بتاتا؟..... کس طرح بتاتا؟ وہ میرے تقاضے پورے نہیں کر سکتی۔ اس کی دھڑکنیں کبھی میری دھڑکنوں سے ہم آہنگ نہیں ہوتیں..... مجھے یوں لگتا ہے، جیسے میں برف کی بسل کے ساتھ رہ رہا ہوں۔“ چودھری شوکت علی نے خوب دل کی بھڑاس نکالی۔  
چودھری طالب علی ان کی سنتے رہے، مگر ان کا ذہن کچھ اور سوچ رہا تھا۔ جب شوکت علی خاموش ہوئے تو انہوں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ سوچے جا رہے تھے۔ یہ شوکی، جسے میں اپنے شعبی کی طرح سمجھتا ہوں، اس میں اور نو سالہ شعبی میں مجھے کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ یہ ایسی باتیں بھی کر سکتا ہے؟

پھر بھی انہوں نے شوکت علی کا جوش کم کرنے کو کہا۔

”وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ تُو اُسے بھرپور محبت دے اور دل چھوٹا نہ کر۔“ انہوں نے

شوکت علی کا کندھا تھپکا۔

”اب تک تو ٹھیک نہیں ہوئی۔ آخر کتنی محبت دوں؟“ چودھری شوکت علی منہ بنا کر بولے۔

”کچا پھل توڑ کر نہیں کھانا چاہئے، کیونکہ یہ بد مزہ ہوتا ہے۔ پکنے کا انتظار کرنا چاہئے تاکہ کھانے میں لذت بھی آئے۔“ چودھری طالب علی نے انہیں دلیلوں سے قائل کرنے کی کوشش کی۔

”کیا اب بھی وہ کچا پھل ہے لالہ؟..... آپ بھی کمال کرتے ہیں۔“ چودھری شوکت

علی ہنسنے۔  
”دیکھ شوکی!.....“

”چھوڑیں لالہ! اس قصے کو۔ کوئی اور بات کریں۔“ چودھری شوکت علی نے پیراری سے باتوں کا رخ موڑ دیا۔



نیلے آسمان پر بے شمار ستارے جگمگا رہے تھے۔ نیم کے درخت کے پتوں سے چاندنی چھن چھن کر دھرتی پر پڑ رہی تھی۔ نوراں اور لالی اپنی اپنی چار پائیوں پر خاموش لیٹی تھیں۔ شام کو کچے آنگن میں چھڑکاؤ کر کے چار پائیاں بچھا دی گئی تھیں اور مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو، روح تک کو سرشار کر رہی تھی۔ لالی کے برابر چار پائی پر لیٹی نوراں آج بہت خوش تھی۔ کھلے آسمان تلے شادی کے بعد نوراں پہلی بار لیٹی تھی۔ کنوارے پٹے میں تو وہ اپنے صحن میں دو چار پائیاں بچھاتی تھی۔ ایک اپنے بابا کے لئے اور دوسری اپنی۔ منشی اللہ دتہ بیٹی کو کہانیاں سناتا۔ پھر جب وہ ذرا بڑی ہوئی تو اس کی ماں کے قصے سناتا اور نوراں نیند کی آغوش میں پہنچ جاتی۔

بابا کو یاد کر کے نوراں کی آنکھوں میں آنسو لڑنے لگے اور پلکوں سے ٹوٹ کر تیکے میں جذب ہونے لگے۔ لالی کن اکھیوں سے نوراں کو دیکھ رہی تھی۔ مدھم چاندنی میں وہ اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہی تھی۔ لالی نے سوچا۔

”نوری! تُو آسمان پر اپنے مقدر کا ستارا کیوں تلاش کر رہی ہے؟..... تجھے تو مل چکا، پھر کیوں تلاش کر رہی ہے؟“

مگر وہ نوراں سے کچھ نہ کہہ سکی۔ پھر چونک کر اٹھ بیٹھی۔ نوراں کی گھٹی گھٹی سی سسکیوں نے اُسے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

”کیا ہوا نوری؟“ لالی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

”کچھ..... کچھ نہیں، لالی!“ نوراں گھبرا سی گئی۔

”پھر تُو کیوں رو رہی ہے؟“

”بابا یاد آ گیا تھا۔ میں تو اُس کی موت پر آنسو بھی نہیں بہا سکی..... میں تو اس کا چہرہ بھی نہ دیکھ سکی۔ میرے ذہن کے پردے پر اب بھی وہی نقش ہے لالی! جب بابا نے مجھے راجا کے ساتھ رخصت کیا تھا۔ یہ سب تو مجھے ایک بھیا نک خواب لگتا ہے۔ پتہ نہیں، کب میری آنکھ کھلے گی اس خواب سے۔ کب میں اپنے بابا سے مل سکوں گی۔“ نوراں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ ہولے ہولے لالی سے کہہ رہی تھی۔ ان کی آوازیں کوئی نہیں سنا رہا تھا کیونکہ لالی نے چار پائیاں سب سے دُور ڈالوائی تھیں۔ باقی افراد ناں، سانولی،



کریمو بھائی اور بھابی اتنے تھکے ہوئے تھے کہ بے سدھ پڑے تھے۔ انہیں ہوش ہی نہ رہا کہ کوئی ان کی باتیں سنتا اور لالی کو پہنچتا تھا کہ نورائے دل میں گزشتہ سوا چار سال سے نور لالا پک رہا تھا، وہ آج پھوٹ نکلے گا۔ کیونکہ نورائے دل بات لالی سے کہنے کی عادی تھی۔ نور اسی بات بھی ہوتی تو وہ لالی کو بتائے بخیر چین نہ پاتی تھی تو پھر اب کیسے اُسے قرار آتا؟

”نوری! تو گزرے وقت کو بھول جا۔ کیا دیا ہے تجھے گزرے وقت نے؟“ لالی نے محبت سے کہا۔

”دیا تو کچھ بھی نہیں۔ میرا تو سب کچھ گزرتے وقت کے دریا نے بہا لیا ہے۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں بچا۔“ نورائے دل نے لہجے میں بولی۔

”نوری! قسمت کے لکھے کو کوئی نہیں ٹال سکتا..... جو کاتب تقدیر نے لکھ دیا، وہ ہرگز رہتا ہے۔“ لالی نے سمجھایا۔

”میری ہی تقدیر ایسی کیوں لکھی تھی اُس نے؟ چودھری کی قسمت ایسی لکھ دیتا۔ اے مزارع بنا دیتی قسمت۔ یہ ظلم ہمارے ہی لئے کیوں تھا؟ بتا لالی!“ نورائے دل نے اُسے جھوٹا ڈالا۔

”اپنے کام وہی جانے۔“ لالی نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”لالی! مجھے کہیں دُور لے چل۔ سچ، میں آج بہت خوش ہوں۔ بہت دنوں بعد ملنے خوشی ملی ہے۔ یوں لگا ہے، جیسے میرا جسم اور میری روح آج آزاد ہو گئے ہیں۔ آواز چلیں۔“ نورائے دل اٹھ بیٹھی۔

”کہاں جائیں گے؟“ لالی نے حیرت سے پوچھا۔

”دُور تک کھیتوں میں جائیں گے، ندی کے پانی میں نہائیں گے۔ لالی! میں گزرتے وقت کو آواز دینا چاہتی ہوں۔“ وہ بے خود ہو گئی۔

”نوری! تو ایسی حالت میں ہے، اگر اونچا نیچا پیر پڑ گیا تو چودھری ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ آخر اس نے بہت عرصے بعد خوشی دیکھی ہے۔“ لالی نے اُسے سمجھایا۔

”کچھ نہیں ہوتا، لالی!..... کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے ہر قسم کی کوشش کر لی ہے۔ آخر ایک جونک کی اولاد ہے، جو چمٹ گئی ہے۔ بھلا کیسے جان چھوڑے گی؟“ وہ تسخّر سے کہی۔

”میں سمجھی نہیں۔“ لالی نے حیرت سے کہا۔

”لالی! میں نہیں چاہتی کہ چودھری کو وارث دوں۔ مگر تو ہی تو کہہ رہی تھی، جو قسمت میں ہوتا ہے وہی ملتا ہے۔ اور وہی ہوا۔ میں نے درختوں سے بھی گود کر دیکھ لیا، مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ ندی پھلانگتے ہوئے میرا گٹھا (مخنہ) نکل گیا، مگر اس جونک کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ تب میں بار بار بیٹھ رہی اور آخر کار میں نے چودھری کو بھی سب کچھ بتا دیا۔ ورنہ پہلے میں

نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کی دلی خواہش پوری ہونے والی ہے۔“ نورائے دل نے آہستہ آہستہ سب کچھ بتا دیا۔

”نوری! تو ایسی سنگ دل تو نہ تھی۔“ لالی نے کہا۔

”انتقام..... لالی! میرا رواں رواں چیتا ہے۔ انتقام انتقام..... اپنے بابا کا انتقام..... اپنی جوان اُمنگوں کا بدلہ میں چودھری سے لینا چاہتی ہوں۔“ نورائے دل کے ہونٹ بیچ گئے۔ ”اور اب بھی میں نے سوچا ہے کہ اگر لڑکا ہوا تو میں اس کا گلا گھونٹ دوں گی۔“ نورائے دل ہونٹ بیچ کر بولی۔

”نہیں..... نہیں نوری! تو ایسا نہیں کرے گی۔“ لالی نے اُسے جھنجھوڑ دیا۔

”کون روکے گا مجھے؟..... سانپ کے بچے بھی سنو لیے ہوتے ہیں، لالی! اور میں نہیں چاہتی کہ آنے والے کل میں کوئی منشی اللہ دتہ، اپنی بیٹی کی عزت بچاتے بچاتے موت کی داپوں میں گم ہو جائے۔ کوئی نورائے دل قیامت انتقام کی بھیٹی میں سلگتی رہے۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے، تیری تربیت اُسے شریف بنا دے۔“ لالی نے کہا۔

”کبھی نہیں..... خون کے اثرات ہمیشہ رہتے ہیں۔ وڈے چودھری کا تجھے پتہ ہے، کیسا تھا۔ چیخ چیخ کر مرا ہے۔ موت بھی مشکل ہو گئی تھی۔ جو ظلم اس نے کئے تھے، ان کی بھی دنیا کو خبر ہے۔ تجھے یاد ہے، جب ہم لوگ چھوٹے چھوٹے تھے، تب چودھری نے رمضان ترکھان کو گنجا کر دیا تھا۔ وہ لوگ دنیا پور سے ایسے گئے کہ پھر پلٹ کر نہ آئے۔“

”ہاں، مجھے یاد ہے۔ مگر یہ پتہ نہیں کہ اسے گنجا کیوں کروایا تھا چودھری سرفراز نے۔“ لالی نے کہا۔

”تم باہر چلو، پھر بتاؤں گی۔“ نورائے دل اٹھ کھڑی ہوئی تو لالی بھی اٹھ گئی۔

”میں اماں کو بتا آؤں، تاکہ وہ اٹھیں تو پریشان نہ ہوں۔“ لالی نے کہا۔ نورائے دل کچھ نہ بولی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ لالی اپنی ماں کی طرف چلی گئی۔



دنوں اونچی اونچی پگڈنڈیوں پر چاند کی مدھم روشنی میں آگے بڑھ رہی تھیں۔ ہوائیں کھیتوں میں سے سرسراہٹ ہوئی گزر رہی تھیں اور عجیب سا مدھم سراز، درختوں اور کھیتوں کے پتوں کے پتے پیدا کر رہے تھے۔ نورائے دل آگے گئی اور لالی اُس کے پیچھے۔ اچانک نورائے دل کر بولی۔

”لالہ شیدا تجھے لینے آیا تھا، تو چلی جاتی۔“

شام کو الٹی کا شوہر اُسے لینے آیا تھا، مگر اس نے سرگوشیوں میں نورائے دل



متعلق بنا دیا تھا اور ویسے بھی وہ نوراں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ آخر انہی کے گاؤں کی لڑکی تھی۔ کیا تھا، جواب چودھری نے بن گئی تھی۔ اس لئے وہ اکیلا ہی واپس چلا گیا۔  
”تجھے چھوڑ کر؟“ لالی ہنس کر بولی۔

”اس بے چارے کو بھی تو تُو نے چھوڑ دیا۔“ نوراں نے شوخی سے کہا۔  
”اُس کا اور میرا تو روز کا ساتھ ہے۔ تُو تو کبھی کبھی ملے گی۔ آج کتنے عرصے بعد مل رہی ہے۔“ لالی محبت سے بولی۔

”ہاں..... پتہ نہیں، پھر کب چودھری طالب آجائے اور چودھری شوکت علی بیٹے چھپاتا پھرے۔ لالی! اگر وہ اتنا ہی ڈرتا ہے اپنے بھائی سے تو مجھ سے شادی کیوں کی اس نے؟ کیا مل گیا اُسے؟“ نوراں نے دکھ سے پوچھا۔

”پیاری سی بیوی۔ اور بیوی بھی ایسی، جو اسے دنیا پور کا وارث دے گی۔ اسے تو سب کچھ مل گیا۔“ لالی نے کہا۔

”میرا سب کچھ لوٹ کر، مجھے بے گھر کر کے اس نے سب کچھ لے لیا۔“ نوراں خواب کی سی کیفیت میں بولی۔ ”لالی! میری بھوری مجھے بہت چاہتی تھی۔ پتہ نہیں، اب کہاں ہو گی۔“

”رات کے وقت کوئی اُسے کھونٹے سے کھول کر لے گیا تھا اور وہ بے تحاشا رینک رہی تھی۔ سب سمجھے کہ چودھری نے ہی کھلوا لیا ہو گا۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ چودھری کو تو خبر بھی نہیں، کوئی اور ہی ہاتھ صاف کر گیا۔“ لالی نے کہا۔

”ہاں، دوسرے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔“ نوراں بڑبڑائی۔ لالی ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئی۔

”نوری! اب تُو بھی بیٹھ جا، میں تھک گئی ہوں۔“

”میں تو نہیں تھکی۔“ نوراں بولی۔

”تیری بات اور ہے۔ تُو کافی عرصے بعد ان راستوں پر چلی ہے نا، تو جی چاہتا ہو گا کہ چلتی رہے۔“ لالی نے کہا۔

”ہاں..... یہی بات ہے۔“ نوراں ایک طویل سانس لے کر اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

”نوری! وہ بات بتانا کہ وڈے چودھری نے کیوں رمضان کو گنجا کر دیا تھا؟“ لالی جیسے فکر لگی ہوئی تھی۔

”بابا نے مجھے بتایا تھا۔“ نوراں نے ہولے سے کہا۔ باپ کے ذکر پر اُس کی آنکھیں رندھ گئی۔ ”چودھری سرفراز علی کا حکم تھا کہ کوئی شخص ننگے سر گاؤں میں نہ گھومے پھرے۔ کوئی

بے والا شملہ سر پر نہیں باندھ سکتا تھا۔ یہ صرف چودھری کو اختیار تھا کہ وہ چاہے ننگے سر گاؤں میں پھر سکتا ہے۔ غریب لوگ سر پر پگڑی باندھیں یا رومال۔ خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزا دی جاتی تھی۔ رمضان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اس کی بیوی نے کہہ دیا کہ رضو! تمہارے اتنے خوب صورت کندلوں والے بال ہیں، پیشانی پر پڑے اچھے لگتے ہیں، تم پگڑی نہ باندھا کرو۔ نئی نوپلی بیوی کی بات بھلا وہ کیوں نہ مانتا۔ اس نے پگڑی باندھنا چھوڑ دی۔ چودھری سرفراز علی سے اس کا ایک روز ٹکراؤ ہو گیا تو وہ غصے سے لال پیلے ہو گئے کیونکہ انہوں نے بھی شملہ نہیں باندھا ہوا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ رمضان ان کی برابری کی کوشش کر رہا ہے اور وہ اُسے کچل دینا چاہتے تھے۔ آخر شام کو اُسے ڈیرے پر بلایا گیا۔ میرا بابا بھی وہیں تھا۔“ نوراں رک گئی۔

”پھر کیا ہوا نوری.....؟“ لالی نے بے چینی سے پوچھا۔

”پھر وہی ہوا، چودھری نے پہلے تو اپنے کارندوں سے رضو کو خوب پٹوایا، اس کے سر پر استرا پھروایا اور حکم دیا کہ اب وہ بھی ننگے سر نہ پھرے۔ گاؤں والوں کو پھر کبھی رمضان نظر نہ آیا۔ وہ اپنی بوڑھی بیوی کے ساتھ دنیا پور ہی چھوڑ گیا تھا۔“

”بڑا ظالم تھا سرفراز علی۔“ لالی بولی۔

”تو کیا چودھری شوکت کم ظالم ہے؟“ نوراں نے کہا۔

”ہاں..... یہ تو ہے۔“ لالی نے اس کی تائید کی۔

”اور اب چودھری شوکت کا بچہ بھی ظالم ہی ہو گا۔ کیونکہ ظلم کرنا اس خاندان کا وطیرہ ہے۔ پشت پشت سے رئیس اور ظالم ہیں۔ جب تک دولت ہو گی، یہ ظلم بھی کرتے رہیں گے۔ اس لئے میں یہی چاہوں گی کہ میں اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھوں ختم کر دوں تاکہ آنے والی کل کو وہ ظلم کرے تو کوئی اس کی مان لیتی مجھے نہ کوئے۔“ نوراں نے اپنی کنپٹیاں دباتے ہوئے کہا۔ مسلسل باتیں کرنے سے اس کی کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔

”نوراں! بچوں کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ یہ تو تربیت کی بات ہوتی ہے۔“ لالی نے کہا۔

”لالی! تُو مجھے سبق نہ پڑھا۔ میں نے بہت مشکل سے یہ فیصلہ کیا ہے اور اس طرح اگر ایسی بات ہے تو تُو چودھری کو ٹھکانے لگا۔ بچے کا کیا قصور؟“ لالی نے مشورہ دیا۔

”چودھری مر کر چند چھڑا جائے گا۔ مگر میں اس سے ایسا انتقام لینا چاہتی ہوں کہ ساری ساری اس کے بیٹے کا گھانا گھونٹ کر مار دیا ہے تو وہ پاگل ہو جائے گا۔ اس کی آرزوؤں کا محل تباہ و برباد ہو جائے گا۔ پھر وہ مجھ سے نئی امید باندھے گا۔ مگر پہلے بیٹے کی کک اُسے



تاحیات چین نہ لینے دے گی۔ بالکل اسی طرح، جیسے میرے دل میں درد اٹھتا ہے۔ مجھے چودھری کے قرب سے بھی کراہت محسوس ہوتی ہے۔ مگر مجبور ہوں، جو میرے اختیار میں ہے، وہ تو کروں گی ہی۔“ نوراً نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا تو لالی اُسے دیکھتی رہ گئی۔ اس نے سوچا، کیا یہ وہی نوراً ہے جو کسی کی ذرا سی تکلیف پر بے چین ہو جاتی تھی، آج وہی انتہاء کی آگ میں بھسم ہوئی جا رہی ہے اور اپنے جگر کے ٹکڑے کو بھی ختم کرنے سے باز نہیں آئے گی، جس کی تخلیق کا درد سہے گی، اُسے مار ڈالے گی۔ عورت ناگن بن جائے گی۔ حالانکہ اسے تو عورت سے ماں بننا چاہئے۔ پھر یہ ناگن کیوں بنے گی؟ آخر اسے کس طرح روکا جائے؟ پھر ایک خیال اُس کے ذہن میں بجلی کی مانند کودا۔

”نوری!“ لالی نے دھیمے سے پکارا۔

”ہوں۔“

”ایک خیال میرے ذہن میں آیا ہے۔“

”وہ کیا؟“ نوراً نے پوچھا۔

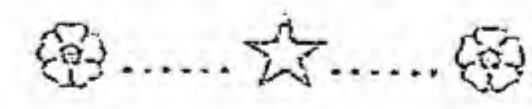
”دیکھ! مرنے والوں کا تو صبر آ جاتا ہے۔ مگر جو زندہ ہوں اور نظروں سے اوجھل ہوں ان کا صبر نہیں آتا۔ ایسے لوگ، جن کے بارے میں علم ہو کہ وہ زندہ ہیں، مگر جنہیں وہ دیکھ چکے ہیں وہ نہیں ملتے تو دل بہت ہی بے قرار رہتا ہے۔ ملنے کی تڑپ بڑھ جاتی ہے۔“

”میں سمجھی نہیں۔“ نوراً نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

تب لالی نے ادھر ادھر دیکھا، جیسے کسی کے دیکھ لئے جانے کا ڈر ہو یا کوئی ان کی باتیں سن رہا ہو۔ پھر وہ نوراً کی طرف جھک کر گویا ہوئی۔

”نوری دیکھ۔“ وہ دھیرے دھیرے سرگوشی کے انداز میں بولے جا رہی تھی اور نوراً اس کی ہر بات کے جواب میں سر ہلا رہی تھی، جیسے لالی کی ہر بات سے اسے اتفاق ہو۔ اس کا چہرہ پھول کی طرح کھل گیا تھا۔

”اوہ، لالی! بہت اچھا منصوبہ بتایا ہے تو نے۔“ نوراً اس سے لپٹ گئی۔



چودھری طالب علی کو دنیا پورا آئے دو روز گزر چکے تھے اور چودھری شوکت علی سخت بے چین تھے۔ ان کا جی تو چاہتا کہ جلد از جلد چودھری طالب چلے جائیں مگر دو روز میں انہوں نے حسن پور جانے کا نام بھی نہ لیا تھا۔ چودھری شوکت علی، نوراً کی وجہ سے سخت پریشان تھے۔ انہیں تو اس کے بغیر نیند ہی نہ آتی تھی۔ اب وہ اپنی خواب گاہ میں سو رہے تھے۔ اسے کہہ کر وہاں تالا ڈلوادیا تھا تاکہ کہیں حویلی دیکھتے دیکھتے چودھری طالب اس کمرے سے نہ گھس جائیں اور حرام کئے پر پانی پھر جائے۔ کیونکہ کمرے میں تو ایک ایک چیز

نوراً کی چھاپ تھی۔ وہ باقاعدہ ایک عورت کا کمرہ لگتا تھا۔ حالانکہ حویلی میں کئی کمرے ہیں جنے پڑے ہوئے تھے۔ چودھری طالب علی نے کہا بھی کھلوا دو مگر چودھری شوکت یہ کہہ کر انجان بن گئے کہ دو کمرے کافی ہیں۔ کیا ضرورت ہے زیادہ جگہوں میں پڑنے کی۔ اپنے اس انداز بے پردائی سے وہ بچ گئے تھے۔

اس شام چودھری شوکت علی، تالا کھول کر اپنے کمرے میں آ گئے۔ چودھری طالب علی، رینو کے ہمراہ کھیتوں کا چکر لگانے گئے تھے۔ چودھری شوکت علی اپنی خواب گاہ میں آئے تو بے قراریاں مزید بڑھ گئیں۔ دل کی دھڑکنیں شدت اختیار کر گئیں۔ وہ تیزی سے پلنگ کی طرف بڑھے اور دھم سے اونڈھے ہو کر لیٹ گئے۔ تکیے میں منہ دیئے وہ مدہوش ہوئے جا رہے تھے۔ تکیوں سے نوراً کی خوشبو آ رہی تھی، جو انہیں بے خود کئے جا رہی تھی۔ اس خوشبو سے ان کی روح سرشار ہوئی جا رہی تھی۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ نوراً کے سیاہ بالوں میں چہرہ چھپائے اس کی خوشبو اپنے اندر سمونے کی کوشش کر رہے ہوں۔ چودھری شوکت علی کا رواں رواں، نوراً کی تکرار کرنے لگا۔ ان کی بانہیں نوراً کو سمیٹنے کے لئے بے چین ہونے لگیں اور دل اس کی قربت کے لئے مچلنے لگا۔

”اُف! یہ مجبوریاں میری نوراً! جنہوں نے مجھے تم سے دو روز کے لئے علیحدہ کر دیا ہے۔ مجھے تو لگ رہا ہے جیسے دو صدیاں بیت گئی ہیں۔ نوراً!..... میں کیا کروں؟ کیا کروں؟“ انہوں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ کتنی ہی دیر تک نوراً کی مدہوش کن یادوں میں کھوئے رہے، پھر خواب گاہ میں تالا لگا کر بیٹھک میں آ گئے۔ ان کی طبیعت عجیب سی ہو رہی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر حقہ کڑا کرنے لگے۔ ان کی نظریں کسی انجانے نقطے پر مرکوز تھیں اور ہونٹوں میں حقے کی نے دبی ہوئی تھی۔ شام دھیرے دھیرے رات کا آچل اوڑھ رہی تھی اور انہیں کوئی ہوش نہ تھا۔ ایسے میں کتنے لمبے چپکے چپکے بنا آہٹ کے گزرتے چلے گئے۔ وہ اس وقت چونکے، جب دینو شمع دان لئے بیٹھک میں داخل ہوا۔ حقے کی نے منہ سے جھوٹ گئی۔ دینو نے میز پر شمع دان رکھ دیا۔

”دینو! طالب لالہ کہاں ہیں؟“

”اوجی، اوہ تے سیدھے کمرے میں چلے گئے، مالک!“

”ہوں۔“ چودھری شوکت علی نے ہنکارا بھرا، پھر گویا ہوئے۔ ”دینو! نوراً کی بھی کوئی خبر ہے؟“

”ہاں مالک!“ دینو ان کے قریب آ گیا اور جھک کر سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔ ”مالک! میں کل دی گیا تھا اور سویرے دی۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔ لالی اس کی بڑی خدمت کر رہی ہے۔ ظاہر ہے، سہیلیاں جو ہوئیں۔“



”میرے بارے میں بھی پوچھ رہی تھی؟“ انہوں نے بڑی آس سے پوچھا۔  
”جی..... جی ہاں مالک! کہہ رہی تھی، چودھری صاحب کا خیال رکھنا۔“  
”سچ کہہ رہے ہو تم؟“ وہ بے قرار ہو گئے۔

”ہاں جی، مجھے کیا لوڑ جھوٹ بولنے کی جی۔“ دینو نے سر جھکا لیا۔ اسے ضرورت تھی  
جیسی تو اس نے جھوٹ بولا تھا۔ نوران نے تو اس سے چودھری شوکت علی کے بارے میں  
ایک لفظ بھی نہ پوچھا تھا۔

”اور کچھ دینو!“ چودھری شوکت علی بے قرار ہو گئے۔

”لالی بتا رہی تھی کہ نوران دو راتوں سے بالکل نہیں سوئی، آپ ہی کا ذکر کرتی رہتی  
ہے۔“

”اوہ..... دینو! اس کا مطلب ہے وہ واقعی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اس نے غلامی  
کہا تھا۔ میں سمجھا تھا کہ مجھے بہلانے کی خاطر اس نے ایسا کہا تھا کہ وہ مجھے چاہتی ہے۔  
واقعی، دُوری سے پتہ چلتا ہے کہ کون کس کو کتنا چاہتا ہے۔ دُوری محبتوں کو نکھار دیتی ہے۔  
بڑی شرتیں آ جاتی ہیں اس محبت میں۔ ہے نا، دینو؟“ انہوں نے دینو کو جھنجھوڑ ڈالا۔

”ہاں مالک!“ دینو نے ہولے سے سر جھکا لیا۔ ”آپ تو محبتوں کے پیچھے بھاگ رہے  
ہیں اور یہ محبتیں سراب کے سوا کچھ نہیں۔ خاص طور پر آپ کے لئے۔“ دینو یہ سوچتا تھا  
کیا۔

”چل، اب کھانا تو کھلا۔ میں کب سے بھوکا بیٹھا ہوں۔ لالہ کو بھی بلا لا۔“  
”اچھا مالک!“ دینو جلدی سے کمرے سے نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

”شوکی! میں سوچ رہا ہوں کہ اب میں حسن پور چلا جاؤں۔“  
”اچھا۔“ چودھری شوکت پُر جوش لہجے میں بولے، پھر ایک دم خود کو سنبھال لیا۔  
”اچھا..... کیوں لالہ! کیا یہاں دل نہیں لگا؟“  
”او ایسی تو کوئی بات نہیں۔ زہرہ بھی تو پریشان ہو گی کہ میں جلدی کیوں واپس نہ  
آیا۔“

”اچھا، اچھا.....“ چودھری شوکت علی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اور تُو بھی اب میرے نال ہی چل۔“ چودھری طالب علی بولے۔

”لالہ! میں ایک دو روز تک آ جاؤں گا۔“

”تُو ابھی کیوں نہیں چلتا میرے ساتھ؟“ انہوں نے گھر کا۔

”لالہ! آپ سمجھیں نا۔ فصل کا زمانہ ہے۔ جب تک میں نہ ہوں، کوئی کام نہ ہوگا۔“

نہیں ہوگا۔“ چودھری شوکت علی نے جواز پیش کیا۔

”مجھے نہ بتا۔ میں سب تیری عادتیں سمجھتا ہوں۔ مجھے پٹی نہ پڑھا۔ میں تیری رگ رگ  
سے واقف ہوں۔“ چودھری طالب علی نے انہیں گھر کا۔

”لالہ! کچھ بھی ہو، میں آج تو نہیں جاؤں گا۔“ وہ اڑ گئے۔

”اچھا، جو تیری مرضی۔“ وہ ایک دم نرم ہو گئے۔ وہ جانتے تھے کہ سختی کے بجائے محبت  
سے کام لینا چاہئے۔ آخر چودھری شوکت علی جو ان تھے، پُر جوش خون تھا ان کا۔

”دیکھ شوکی! تُو جو بھی کچھ کر، بکر میری جان! زہرہ کی طرف بھی توجہ دیا کر۔ آخر وہ تیری  
پوری ہے۔ ہفتہ پندرہ دن میں چکر لگالیا کرو۔ وہ تجھ پر شک کرنے لگے گی۔“

”میں آپ کی بات پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔“ چودھری شوکت علی بے زاری  
سے بولے۔

”تُو ابھی بچہ ہے۔ کہیں پھسل نہ جانا۔ خاندان کی عزت کو مٹی میں نہ روندنا۔ عزتیں اور  
مقام بڑی مشکل سے ملتے ہیں شوکی!“ چودھری طالب علی نے چودھری شوکت علی کے  
کندے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نہایت مضبوط لہجے میں کہا۔

”مجھے پتہ ہے لالہ! آپ فکر نہ کریں۔“ چودھری شوکت علی سرد سے لہجے میں بولے اور  
وہ چھوٹے بھائی کو دیکھتے رہ گئے۔

تقریباً رات کے گیارہ بجے چودھری طالب علی ”حسن پور“ روانہ ہو گئے۔ چودھری  
شوکت علی نے سکھ کی سانس لی۔ وہ کچی سڑک تک چودھری طالب علی کو چھوڑنے گئے تھے۔  
واپس اُن کی بڑی برق رفتاری سے ہوئی تھی۔

”دینو!..... او دینو!“ چودھری شوکت علی، حویلی کے آہنی گیٹ سے داخل ہوتے ہی  
پوری قوت سے چیخے۔

”جی مالک!“ دینو دوڑتا ہوا اُن کے قریب آیا۔

”جا اور فوراً نوران کو لے کر آ۔“

”مالک! اس وقت؟“ دینو حیرت سے بولا۔

”ہاں..... ابھی اور اسی وقت۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولے۔

”مالک! وہ لوگ تو سوئے ہوں گے۔“

”تُو کیا ہوا؟“

”نیند خراب ہو جائے گی، ان کی۔“ دینو نے کہا۔

شوکت علی نے اُسے گھورا۔ ”اور دو راتوں سے مجھے جو نیند نہیں آئی، اس کا کوئی احساس نہیں تجھے؟“ چودھری



”ہے مالک!..... احساس ہے۔“ دینو سٹپٹا گیا۔

”جا..... اور جلدی سے لے کر آ۔“ چودھری شوکت علی اس کا جواب نہ لے سکا۔  
خواب گاہ کی طرف بڑھ گئے اور دینو آہنی گیٹ سے باہر چلا گیا۔  
پچھلے کے قریب آوارہ کتوں کی فوج موجود تھی اور ان کے بھونکنے کی آوازیں دور دور  
تک پھیل رہی تھیں۔ چاند کی مدھم روشنی میں دینو اونچے نیچے راستوں سے کریمو کے گھر کی  
طرف بڑھا جا رہا تھا اور دل ہی دل میں خود کو کوس بھی رہا تھا کہ فضول ہی حسن پور میں پیرا  
ہو گیا، جو چودھری جیسے کینے آدمی کی غلامی کرنی پڑ گئی۔

اچانک وہ ٹھٹھک کر رُک گیا۔ کسی کے گانے کی آواز نے اس کے پاؤں روک دیے  
شاید وہ کوئی کسان ہی تھا، جو زمینوں کو پانی لگا رہا تھا اور ندی کا جائزہ لیتے ہوئے چوڑے  
سے کنارے پر چلا جا رہا تھا۔ اُس کی آواز عجیب دل کش ساں پیدا کر رہی تھی۔ بہت خوب  
صورت ماہیا وہ گا رہا تھا، جس میں اس نے محبوب سے شکوہ کیا تھا۔ محبوب نے اُسے اک  
دیئے تھے اور اس نے انہیں الفاظ میں ڈھال کر آواز کا روپ دے دیا تھا

او ڈھولا اچے تے نہ کر میڈی مہربانی  
(اے محبوب ایسے تو نہ کر تیری مہربانی)  
ساکوں رنج تے نہ کر میڈی مہربانی  
(ہمیں غمگین تو نہ کر تیری مہربانی)  
اکھ سمجھ گئی، دل جان گیا  
(آنکھ سمجھ گئی، دل جان گیا)  
ٹساں کنڈ کیٹی ساڈا مان گیا  
(تم نے رخ موڑا، ہمارا مان گیا)

دینو بے خود سا ہو کر رہ گیا۔ کتنا دکھ تھا، کتنا شکوہ تھا اس کی آواز میں۔ پھر وہ آواز دور  
ہوتی چلی گئی۔ دینو آواز اور گیت کے سحر سے باہر نکلا اور چند لمحے بعد وہ کریمو کا دروازہ کھٹکے  
رہا تھا۔ کریمو آنکھیں ملتا ہوا آیا اور دروازہ کھول کر بولا۔

”کون ہے؟“ اس کی آواز نیند کے خمار میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”میں ہوں، دینو۔“

”او، دینو چاچا!..... کیا بات ہے؟“ کریمو کی نیند غائب ہو گئی اور دل انجان  
اندیشوں سے دھڑک اٹھا۔

”مالک نے نوراًں کو بلوایا ہے۔ چودھری طالب علی پلے گئے ہیں۔“

”مگر وہ تو سوئی ہوئی ہے۔“ کریمو نے کہا۔

”اب اٹھا دے اُسے کسی طرح۔ کیونکہ یہ چودھری جی کا حکم ہے۔“

”اچھا..... اندر آ جا۔“ کریمو نے کہا تو دینو اندر آ گیا۔ سب دروازہ کھٹکٹانے کی  
آواز سے اٹھ گئے تھے۔ لالی اور نوراًں بھی جاگ گئی تھیں۔

”نوری بہن! دینو تجھے لینے آیا ہے..... چودھری نے بلایا ہے۔“ کریمو نے کہا۔  
”مگر اس وقت کیوں؟“ نوراًں بولی۔

”یہ ان کا حکم ہے۔“ دینو بولا۔

”کہہ دو چاچا! کہ صبح آئے گی۔“

”وہ مجھے ساری رات ادھر ادھر دوڑاتا رہے گا، نوراًں! تو بھی بے آرام ہوگی اور میں  
بھی۔ کیا فائدہ دھیے!“ دینو نہایت تلخی لہجے میں بولا اور نوراًں اس کی مجبوری جان کر اٹھ  
کھڑی ہوئی۔ اسے پتہ تھا کہ دینو جو کچھ کہہ رہا ہے، وہ حقیقت ہے۔

اسے کسی نے بھی نہ روکا۔ وہ کریمو اور دینو کے ہمراہ پھر واپس اسی قفس میں آ گئی۔ بس  
اُسے دو روز کی آزادی ملی تھی۔ اب پھر وہی سرخ حویلی تھی، جلا دھند عالم چودھری شوکت  
علی تھا اور وہ پنجرے میں پھڑ پھڑاتی ہوئی رنگین پروں والی چڑیا تھی۔ وہ نہایت تھکے تھکے قدم  
اٹھاتی ہوئی خواب گاہ کی طرف بڑھ گئی۔ پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئی تو شمع دان میں موی  
شمعوں کی روشنی پورے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ بڑا خواب ناک سا ماحول تھا۔ چودھری  
شوکت علی بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ آہٹ پر وہ پلٹے۔ دروازے میں نوراًں  
پردہ تھامے کھڑی تھی۔ موی شمعوں کی روشنی میں وہ پھول دار سوٹ میں نہایت ہی بھلی لگ  
رہی تھی۔ آنکھیں نیند کے خمار سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ چودھری شوکت علی کی آنکھوں میں  
اسے دیکھ کر عجیب سی چمک پیدا ہو گئی۔ انہیں بالکل ایسا لگا، جیسے نوراًں کو وہ پہلی بار دیکھ رہے  
ہوں۔ نوراًں دروازے ہی میں کھڑی ان کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں  
ڈھیروں سوالات چل رہے تھے۔ مگر چودھری شوکت علی یہی سمجھے کہ اس کی کیفیت بھی میری  
طرح ہے، جمی تو اتنی بے قراری سے مجھے دیکھ رہی ہے۔ واہ رے خوش فہمی۔ وہ دیکھتے  
رہے، مدہوش ہوتے گئے۔ پھر وہ تیزی سے آگے بڑھے۔

”نورا!..... نورا!“ انہوں نے نوراًں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ ”نورا! مجھے یوں  
لگا، جیسے میں تم سے دو روز نہیں، دو صدیاں الگ رہا ہوں۔ نورا! میری زندگی! میری روح!  
مجھے معاف کر دو۔ میں کیا کروں؟ مجبور تھا۔ کیونکہ لالہ طالب کچھ غصے میں تھے۔ میں نہیں  
چاہتا تھا کہ وہ تمہیں کچھ کہہ دیں، اس لئے میں نے تمہیں بھجوا دیا تھا۔ دینو بتا رہا تھا، تم بھی  
بہت بے قرار رہی ہو۔ ہے نا؟“

انہوں نے جھک کر نوراًں کے لب لعلیں چوم لئے۔ نوراًں کچھ بھی نہ بولی۔ بول کر



آخر اُسے کیا مل جاتا؟ فضول اپنا ہی خون جلانا تھا۔ اس لئے وہ چودھری شوکت علی کے بازوؤں کا سہارا لئے پلنگ پر آ گئی۔ وہ بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گئے۔

”چودھری! ایک بات پوچھوں، بتائیں گے؟“ نوراًں پلنگ پر تکیے کے سہارے بیٹھ ہوئے بولی۔

”ایک کیا، دس پوچھو!“ چودھری شوکت علی محبت سے چور لہجے میں بولے۔

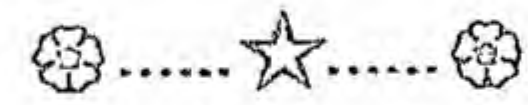
”آپ نے اپنے خاندان میں کسی کو بھی میرے متعلق نہیں بتایا۔ حالانکہ ہماری شادی کو چار سال سے اوپر ہونے کو آئے ہیں۔ پھر آپ مجھے اور میرے بچے کو اپنے خاندان میں کوئی مقام کیسے دلائیں گے؟“

”وقت آنے پر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”کیا ٹھیک ہو جائے گا؟ آپ اتنا تو ڈرتے ہیں۔“ نوراًں نے کہا۔

”اوجھلے!“ چودھری شوکت علی نے نوراًں کی کمر میں بازو ڈال کر اپنے قریب کر لیا۔ ”میں اُن سے نہیں ڈرتا، میں تو تجھ سے ڈرتا ہوں۔ اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کوئی تجھے کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا دے۔ تجھے وہی مقام ملے گا، جس کی تُو مستحق ہے۔ تجھے فکر نہیں کرنی چاہئے، نوراً!“

”مگر.....“ نوراًں نے بولنا چاہا لیکن اس کے ہونٹوں پر چودھری شوکت علی کے ہونٹوں کا قفل لگ چکا تھا۔



چودھری شوکت علی سخت بے زاری کے عالم میں جیب ڈرائیو کر رہے تھے۔ حالانکہ نوراًں کو تنہا چھوڑ کر جانے کو ان کا بالکل جی نہ چاہتا تھا، مگر انہوں نے چودھری طالب علی سے وعدہ کیا تھا کہ دو تین روز بعد آئیں گے۔ اور اب وہ پورے ایک ہفتے بعد حسن پور جا رہے تھے۔ انہیں خطرہ تھا کہ چودھری طالب علی پھر نہ آجائیں اور نوراًں کو گھروں کے گھر بھیجنا پڑ جائے۔ اسی لئے حسن پور بھی جانا ضروری تھا۔ دینو کو وہ دنیا پور ہی چھوڑ آئے تھے۔ حالانکہ اس نے کہا بھی تھا کہ مالک! مجھے لے چلیں، نوراًں کے پاس۔ لالی رہ جائے گی۔ میرا دل بھی اپنے بیوی بچوں کو دیکھنے اور ملنے کو کرتا ہے۔ مگر چودھری نے اُسے جھڑک دیا تھا کہ چند دن بیوی کے بغیر نہیں رہ سکتا تُو؟..... جب وہ خاموش ہو گیا۔ اب چودھری شوکت علی سوچ رہے تھے کہ کوئی امیر ہو یا غریب، بیویاں اگر من پسند ہوں تو ان سے چند روز کیا، چند لمحے بھی دور نہیں رہا جا سکتا۔ انہوں نے ایک دم ہی فیصلہ کر لیا کہ واپس جاتے ہی وہ دینو کو ایک ماہ کی چھٹی دے دیں گے۔

جب وہ حسن پور پہنچے تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔ رنگ محل کے گیٹ پر انہوں نے گاڑی

رنگ دی اور ہارن دیئے ہی لگے تھے کہ ٹھٹھک سے گئے۔ وہ بے شک ایک گیارہ بارہ سال کی بچی ہی تھی، جو رنگ محل کے آہنی گیٹ سے ٹیک لگائے پلکیں موندے بیٹھی تھی۔ اس کا لباس تلکجا اور بال اُلجھے ہوئے تھے اور گالوں پر سرخ سرخ سے نشان تھے، جو اُس کی سفید رنگت پر نمایاں نظر آ رہے تھے اور ان نشانوں پر آنسوؤں کی بے شمار لکیریں تھیں، جیسے وہ کئی گھنٹے روئی رہی ہو اور آخر تھک کر بیٹھ گئی ہو۔ آنسوؤں کے سوتے خشک ہو گئے ہوں۔ چودھری شوکت علی کا دل درد سے بھر گیا۔ وہ کود کر جیب سے اترے۔ دھم کی آواز پر اس بچی نے ایک دم آنکھیں کھول دیں اور پلکیں جھپکاتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کی آنکھوں میں خوف اور دکھ کے ملے جلے تاثرات تھے۔

”کیا ہوا بیٹے؟“ چودھری شوکت علی نے نہایت محبت سے اس کے قریب جا کر پوچھا اور آگے بڑھے تو وہ سہمی ہوئی ہرنی کی طرح گیٹ سے چھٹ کر کھڑی ہو گئی۔

”بتاؤ شاباش! کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں..... تم کون ہو؟“ اس نے ایک دم سوال کیا۔

”میں چودھری شوکت ہوں۔“

”اچھا جی، معاف کر دیں۔ میں یہاں بیٹھ گئی تھی۔“ آنسو اس کی آنکھوں میں لرزنے لگے۔

”میں نے کچھ کہا تو نہیں۔“ انہوں نے نہایت شفقت سے کہا۔

”چودھرائی زہرہ کو بھی نہ بتانا جی کہ میں یہاں بیٹھی تھی۔“ وہ سہمی ہوئی تھی۔

”نہیں بتاؤں گا۔ مگر بتاؤ، ہوا کیا؟ تم یہاں کیوں بیٹھی تھیں اور روئی کیوں؟“

”کسی لڑکی کا پیو مر جائے تو وہ روئے گی بھی نہیں، چودھری جی؟“

”کیا مطلب؟“ چودھری شوکت علی کو یوں لگا، جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔

”ہاں چودھری جی! آج صبح میرا بابا مر گیا۔“ وہ رو دی۔

”تو تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”میں تمہارے گھر کا کام کرتی ہوں چودھری جی!..... اس رنگ محل میں کام کرتی ہوں۔ میرا بابا سخت بیمار تھا اور ماں اندھی ہے۔ پرسوں میں نے چھٹی کر لی تو چودھرائی زہرہ نے مجھے سارا دن کام سے لگائے رکھا اور یہ بھی کہہ دیا کہ آئندہ چھٹی نہ کرنا، چاہے تیرا بابا بھی مر جائے۔ اور چودھری جی!.....“ وہ لڑکی دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

”اور تمہارا بابا آج مر گیا، پھر بھی تم نوکری پر آئیں، کام کرنے آئیں۔“ چودھری شوکت کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا۔

”ہاں چودھری جی! صبح اذان کے وقت میرا بابا مر رہا ہے جی، ہمارے گھر میں کفن کے



”چاچا! میں اپنی کلاس میں اول آیا ہوں..... کل نتیجہ نکلا تھا۔ مجھے انعام دو۔“ شعیب علی خوشی بتانے لگا۔

”اچھا، اب کون سی کلاس میں گئے ہو؟“

”اپنے اسکول کی بڑی کلاس میں۔ یعنی پانچویں کلاس میں۔“ وہ فخر سے بتانے لگا۔

”اوہ..... میں سمجھا، تم بڑی کلاس میں ہو گے۔ میں تمہارے جتنا تھا تو دسویں میں تھا۔“

”چاچا! جھوٹ بولنے والوں کو اللہ محاف نہیں کرتا۔ مجھے پتہ ہے، آپ نے صرف بل تک پڑھا ہے۔“ شعیب نے کہا۔

”اچھا..... تمہیں کس نے بتایا؟“ چودھری شوکت علی نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

”آپ نے ایک روز خود ہی بتایا تھا۔“

”اوہ..... میں نے تو مذاق کیا تھا۔“

”ہو گا۔“ شعیب بے پردائی سے بولا۔

تب ہی چودھری شوکت علی کی نظر اپنے اور زہرہ کے مشترکہ کمرے کی کھلی کھڑکی پر پڑ گئی اور انہیں یوں محسوس ہوا، جیسے ان کی نظر اٹھتے ہی کوئی وہاں سے ہٹ گیا ہے۔ انہیں یقین تھا، یہ زہرہ بیگم ہی ہوں گی۔

”شعیب! تیری چاچا کیسی ہے؟“ انہوں نے جھک کر شعیب سے سرگوشی کی۔

”بہت خراب ہے۔ آج پتہ ہے، ہاجرہ کو بہت مارا۔ میری اماں بھی بہت خراب ہے۔“

انہوں نے چھڑایا ہی نہیں۔ ”وہ منہ بنا بنا کر بتانے لگا۔ چودھری شوکت علی کا دل شعیب کی

موصوم باتوں اور محبت سے بہل گیا تھا اور وہ گیٹ پر ہونے والے واقعے کو تقریباً بھول چکے

تھے۔ مگر انہیں پھر وہ المیہ یاد آ گیا..... اُن کا دل غم و غصے سے بھر گیا۔ وہ بڑے غصے ہی

میں شعیب علی کو وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھے۔ پھول دار چائنا، ساٹن کے

پرے ہٹا کر وہ کمرے میں داخل ہوئے تو زہرہ بیگم کرسی پر بیٹھی میز پوش کاڑھ رہی تھیں۔

انہوں نے نظر اٹھا کر بھی دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور آرام سے اپنے کام میں مشغول

رہیں۔ چودھری شوکت علی جو نہایت غصے میں اپنے کمرے کی طرف زہرہ سے باز پرس کے

ارادے سے آئے تھے، ان کا تمام غصہ دودھ کے اُبال کی طرح بیٹھ گیا۔ صرف زہرہ بیگم کی

بے نیازی دیکھ کر وہ خود میں اتنی ہمت نہ پا رہے تھے کہ زہرہ سے باز پرس کرتے۔ وہ سدا

کے ڈر پوک تھے۔ خصوصاً زہرہ بیگم کے سامنے ان کی کھلم کھلا جاتی تھی۔ ایک خوف تھا،

توان کا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ زہرہ بیگم نے ایسا ڈر دل میں بٹھایا تھا کہ وہ چاہتے ہوئے بھی

اس ڈر کو دل سے نہ نکال سکے تھے۔ وہ بعض مرتبہ سوچتے کہ نشی اللہ دتہ پر ظلم ڈھانے والے

لئے بھی پیسے نہیں ہیں۔ کام پر آئی اور میں نے صرف چودھرائی جی سے یہی کہا کہ میرے باپ کے لئے کفن منگوا دو، مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ انہوں نے زینوں اور مردوں کے لئے کفن نہیں لے رکھا۔ اب بتاؤ چودھری جی! میں یہاں نہ بیٹھتی تو کہاں جاتی؟..... گھر جاتی تو بابا کی بغیر کفن کی لاش کیسے دیکھتی؟ غریبوں کے لئے تو موت بھی مشکل اور زندگی بھی مشکل۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر روتی اور چودھری شوکت علی حیران حیران کی نظروں سے اسے دیکھتے رہ گئے۔ یہ ذرا سی بچی اور اتنی بڑی باتیں کرتی ہے۔ مگر انہیں یہ ظم نہ تھا کہ غربت اور بھوک انسان کو سب کچھ سکھا دیتی ہے۔

”پتھر! یہ لے..... اور نہ رو میری دھی!“ چودھری شوکت علی نے اُسے کھینچ کر پیٹ سے لگا لیا۔ کوئی مہربان ملا تو دل شق ہو کر رہ گیا۔ وہ بچی اور زیادہ روتی لگی۔

”دھی! اے کچھ آنسو اپنے باپ کی مٹی کے لئے بھی رکھ لے۔“ چودھری شوکت علی نے

انگلی کی پور سے اس کے آنسو صاف کئے اور پھر مٹی میں پکڑے ہوئے سو سو کے پانچ نوٹ

اُسے دے دیئے۔ ”کسی سے منگوا لے بابا کا کفن۔ پھر میں اور دے دوں گا۔“ قل اور چہلم کی

ٹو فکر نہ کرنا، میری رانی!“ چودھری شوکت علی نے اُس کی پیشانی چوم لی اور وہ ڈبڈبا

نظروں سے چودھری شوکت علی کو دیکھتی اور سوچتی رہ گئی کہ لوگ تو کہتے ہیں کہ مرد بڑے

سخت دل ہوتے ہیں، مگر یہ وہی چودھری شوکت علی ہے جس کی بیوی زہرہ نے چند گھنٹے قبل

میرے گالوں پر پتھروں کی بارش کر دی تھی۔ جرم کیا تھا، صرف یہی کہ بابا کے لئے کفن مانگا

تھا۔ اور یہ چودھری..... نرم دل کون ہوا، مرد یا عورت؟

”میری دھی نے اپنا ناں نہیں بتایا۔“ چودھری شوکت علی کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

”ہاجرہ۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”اب تُو جا، شاباش!“ انہوں نے نہایت پیار سے کہا تو ہاجرہ انہیں تشکر آمیز نظروں

سے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ پھر انہوں نے خود ہی گیٹ کھولا اور جیپ اندر لے گئے۔ جیپ کا

آواز سننے ہی پر آمدے میں بیٹھا شعیب علی شور مچاتا ہوا ان کے قریب آ گیا اور ان سے لپٹ

گیا۔

”اوہ، شوکی چاچا آ گئے۔“

چودھری شوکت علی نے اسے گود میں اٹھالیا اور اس کے گال چومتے ہوئے شوخی سے

بولے۔

”یارا اب تو تم مجھے سوئے ہو گئے ہو۔“

”آپ بھی تو سوئے ہو گئے ہیں، شوکی چاچا!“ وہ بھلا کب چوکے والا تھا۔

”شریر!“ کہہ کر چودھری شوکت علی نے اُس کے بال بگاڑ دیئے۔



چودھری شوکت علی اور زہرہ بیگم کے شوہر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ آج تک جان پائے تھے کہ آخر وہ زہرہ بیگم سے کیوں ڈرتے ہیں؟..... وہ جتنا سوچتے، اتنا اُلجھتے جاتے اور انہیں کوئی بھی سراپا تھ نہ آتا۔

”شوکت! کیا سوچ رہے ہیں آپ؟..... وہاں کیوں رک گئے؟ اندر آ کر بھی سہا سکتا ہے۔“ زہرہ بیگم کی آواز پر وہ مشینی انداز میں آگے آگے اور ان کے سامنے ہی رک کر سی پر بیٹھ گئے، جیسے اگر انہوں نے زہرہ بیگم کی حکم وردی کی تو تھپڑ پڑ جائے گا۔ وہ ایک دم سہم سے گئے۔ زہرہ بیگم ان کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ اُن کے بولنے کا انتظار کرتی رہیں، آخر بول پڑیں۔

”اس قدر خاموش کیوں ہیں شوکت؟“

”نہیں تو..... بس ایسے ہی۔“

”آپ مجھ سے جھوٹ نہ بولا کریں۔ آپ کو ظلم ہے کہ میں آپ کا جھوٹ اور کافرا پکڑ لیتی ہوں۔ آخر آپ کی رگ رگ سے واقف ہوں۔“

”مجھے ظلم ہے۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ چودھری شوکت علی نے بات پلٹی۔

”بہت جلد خیال آیا۔“ وہ طنز سے باز نہ آئیں۔ تب چودھری شوکت علی نے دل میں سوچا۔

”شکر کرو، زہرہ بیگم! خیال آ گیا۔ اگر نہ آتا تو تم کیا کر لیتیں؟“

”دنیا پور بہت خوب صورت جگہ ہے، چودھری صاحب!“ زہرہ بیگم کے لہجے میں گلی کی اور زہری زہر تھا، جو وہ قطرہ قطرہ لفظوں کے تیروں پر لگا کر چودھری شوکت علی کے دل میں پیوست کر رہی تھیں۔

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

”پھر کیا بات ہے کہ آپ مہینوں خبر نہیں لیتے۔ کوئی مرے یا جیے، آپ کو کیا۔“ زہرہ بیگم طنز یہ لہجے میں بولیں۔

”کچھ ہے، جیسی تو پوچھ رہا ہوں۔“ وہ دل کڑا کر کے بولے۔

”اگر آپ کو اتنا ہی خیال ہوتا تو لالہ طالب کے ساتھ ہی فوراً آ جاتے۔“

”چاہے کام رک جاتا۔“

”کام..... کام..... کام..... مجھے چڑ ہو گئی ہے اس لفظ ہے۔“ زہرہ بیگم ایک دم چیخ پڑیں۔ چاچا سرفراز علی کے زمانے میں بھی تو سارے حرازے کام کرتے تھے، تم مالک کا بنے ہو کہ پورے پورے حقوق مسلط کر رہے ہو۔“ غصے میں وہ عزت و احترام تک کے الفاظ گنوا بیٹھتی تھیں۔

”ہر کام حرازوں پر نہیں چھوڑا جاتا۔“

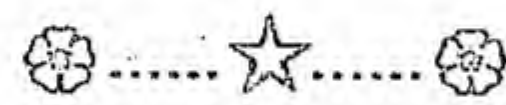
”کیوں نہیں چھوڑا جاتا؟“ زہرہ بیگم بحث کرنے لگیں۔

”بھئی اس بحث کو ختم بھی کریں۔“ چودھری شوکت علی کرسی سے اٹھ کر قریب آئے اور ان کے ہاتھ تمام کرلیوں سے لٹا لٹے۔ ”اتنے دن بعد آیا ہوں اور آپ نے لڑنا شروع کر دیا۔ کچھ تو احساس کیا کریں۔“

”آپ کون سا احساس کرتے ہیں؟“

”احساس ہے، جیسی تو بھاگا آتا ہوں۔“ انہوں نے جھک کر سرگوشی کی اور انہیں لپٹا لیا۔

”جی آپ تو.....“ زہرہ بیگم نے کہنا چاہا، مگر چودھری شوکت علی نے ان کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو زہرہ بیگم نے خاموش رہنے ہی میں مافیت جانی۔ انہیں یوں شوکت علی کے سینے سے لگے ہوئے بہت شرم آرہی تھی۔ نقد پر بھی کیسے اُلے فیصلے کرتی ہے۔ میری گود میں کھیلنے والا بچہ اب میرے جسم و جاں کا مالک ہے، میرا مجازی خدا ہے۔ زہرہ بیگم نے سوچا اور پلکیں موند کر سر چودھری شوکت علی کے سینے سے ٹکا دیا۔ شرم چھپانے کا یہی ایک طریقہ تھا۔



صبح چودھری شوکت علی منہ اندھیرے ہی شعیب کو ساتھ لئے کھیتوں کی طرف نکل گئے۔ ہادی اپنے بیلوں کو ہانکتے ہوئے کھیتوں میں جا رہے تھے۔ بیلوں کے گلے میں پڑی گھنٹیاں بجا کر فضا میں عجیب سا ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔ چڑیوں کی چھبھاہٹ اور کنوئیں کے رہٹ کی کرر کرنے لگ کر ماحول کو بڑا پراسرار بنا دیا تھا۔ وہ شعیب علی کی انگلی تھامے آگے، بہت ہی آگے بڑھے چلے گئے۔ اور جب مشرق کے شہنشاہ کی روشن کرنوں نے ان کا حصار کیا تو شعیب علی اس عظیم سرخ گولے کی طرف دیکھ کر بولا۔

”چاچا! اب گھر چلیں۔“

”کیوں؟“

”دھوپ ہو رہی ہے نا۔“ شعیب آنکھوں پر ہاتھ سے جھجھکے بناتے ہوئے بولا۔

”تیز دھوپ کی عادت ڈالنی چاہئے۔“

”جب بڑا ہوں گا تو عادت ڈالوں گا۔“ وہ منہ بنا کر بولا۔ ”مجھے اسکول بھی تو جانا ہے۔“

”آج مت جانا۔“ شوکت علی نے مشورہ دیا۔

”دل تو میرا بھی نہیں کر رہا۔“ شعیب ہنس کر بولا۔

”بہت شریک ہے۔“ چودھری شوکت علی نے اُسے گود میں لے لیا۔



پھر دونوں واپس آ گئے۔

رنگ گل کے گیٹ پر چودھری شوکت علی نے شعیب کو اتار دیا اور اس کی انگلی تمام اندر بڑھ گئے۔ سرخ روش طے کر کے جیسے ہی انہوں نے گول ستونوں والے برآمدے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا، ٹھٹھک کر رہ گئے۔ سامنے ہی ہاجرہ چکنے فرش پر پوری مار رہی تھی۔ تیزی سے آگے بڑھے۔

”ہاجرہ! تو کام پہ کیوں آ گئی؟“ انہوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ ایک دم گھبرا سی گئی، مگر بولی کچھ نہیں۔

”تو کیوں آئی ہے ہاجرہ؟ ابھی تو تیرے باپ کا کفن میلا بھی نہ ہوا ہو گا۔“  
”مجھے پتہ ہے چودھری جی! اگر نہ آتی تو پھر کام کون کرتا؟“ وہ ڈر رہی تھی کہ اس کی باتیں زہرہ بیگم نہ سن لیں۔

”اوہ..... تو کیا باقی لوگ مر گئے ہیں؟ تو فوراً واپس جا۔“

”نہیں چودھری جی!“

”آخر آپ اسے کیوں جانے پر مجبور کر رہے ہیں؟ اگر نہیں جانا چاہتی تو نہ جائے۔“ زہرہ بیگم بھی باہر آ گئیں۔ انہیں ایک کئی لڑکی سے چودھری شوکت علی کی ہمدردی اچھی نہیں لگی۔  
”زہرہ! اس لڑکی کا باپ کل مر گیا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“

”اور تم نے اسے چھٹی نہیں دی۔ کفن کے پیسے بھی نہیں دیے۔“ انہوں نے خلاف توڑ کر زہرہ بیگم سے سوال کر دیا تو وہ سٹپٹا کر رہ گئیں۔

”آپ..... آپ کو کس نے بتایا؟“ زندگی میں پہلی بار وہ چودھری شوکت علی سے دب گئی تھیں۔ اب تک وہ چودھری کو دباتی آئی تھیں۔ آج..... اصل میں پہلی ہی بار تو انہوں نے اتنے سخت لہجے میں زہرہ بیگم سے بات کی تھی۔

”مجھے.....“ اب سٹپٹانے کی باری چودھری شوکت علی کی تھی۔ ہاجرہ کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید ہو رہا تھا۔

”میں نے بتایا تھا، چاچی! آپ نے کل ہاجرہ کو مارا بھی تھا نا؟“ شعیب علی نے چودھری کی مشکل حل کر دی۔ چودھری شوکت علی نے سکون کی ایک طویل سانس لی۔

”ہاں، مجھے کل ہی شعیب نے بتا دیا تھا۔ مگر میں نے آپ سے نہیں پوچھا تھا۔ مجھے افسوس ہے، آپ نے ایسی گری ہوئی حرکت کی کہ اپنے آپ کو گرا لیا۔ شرم کی بات ہے۔“  
”تم جاؤ ہاجرہ!“ زہرہ بیگم نے ہاجرہ کو جانے کا حکم دیا۔ انہیں بہت غصہ آیا تھا کہ چودھری شوکت علی پہلی بار ان سے اونچا بول رہے تھے اور وہ بھی ایک کئی لڑکی کے سامنے۔

ہاجرہ نے تو فوراً ہی جانے میں عافیت جانی اور زہرہ بیگم، چودھری شوکت علی کو گھورتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ چودھری شوکت علی بیٹھک میں آ گئے، جہاں چودھری طالب علی اور چودھری شجاعت علی پہلے سے موجود تھے۔ پھر تینوں بھائی آپس میں باتیں کرنے لگے اور چند لمحے پہلے چودھری شوکت علی کے ذہن پر زہرہ بیگم کی باتوں سے جو دھل پڑی تھی، وہ دھل گئی۔

زہرہ بیگم بہت غصے میں تھیں اور نہایت بے قراری سے چودھری شوکت علی کا انتظار کر رہی تھیں۔ ازدواجی زندگی میں پہلی بار چودھری شوکت علی نے ان سے اتنے سخت لہجے میں بات کی تھی اور وہ بھی ایک کئی لڑکی کے سامنے۔ انہیں یوں لگا، جیسے ان کا رعب اور دبدبہ اچانک ختم ہو جائے گا اور ان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہے گی۔ جبکہ اسی حیثیت کی خاطر ہی تو چودھری شوکت علی کو دبائے رکھا تھا، ورنہ انہوں نے چودھری شوکت علی کو دیا کیا تھا، یہ ان کو خود بھی احساس تھا۔ وہ مٹھیاں بچھتی ہوئی کمرے میں بے قراری سے ٹہل رہی تھیں اور چودھری شوکت علی کو سرزنش کرنے کے لئے ان کی منتظر تھیں مگر وہ تو بیٹھک میں اپنے بھتیجوں کے جمرٹ میں خوش کیوں میں مصروف تھے۔

چودھری طالب علی کا بڑا بیٹا جو شہر میں دسویں درجے میں پڑھتا تھا، امتحان دے کر گاؤں آیا ہوا تھا۔ وہ بھی اپنے چاچا شوکی کو بہت چاہتا تھا اور چاچا شوکی تھے کہ شعیب پر جان چڑھتے تھے۔ شجاعت علی کی بھی تین بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ بڑی بیٹی بیٹا، دوسری بیٹا، پھر دو بیٹے امین علی، معین علی اور سب سے چھوٹی بیٹا تھی۔ طالب علی کی بڑی بیٹی نسرین کے بعد صغدا، امجد علی، شعیب علی اور آخر میں پروین۔ اس وقت چودھری شوکت علی کے پاس بیٹا، امین، صغدا اور نسرین بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سب قالین پر آلتی پالتی مارے ناش کھیل رہے تھے۔ شعیب علی، چودھری شوکت علی کے کندھے پر چڑھا بیٹھا تھا اور شوکت علی کے کان میں جھک کر سرگوشی کر دیتا تھا۔

”چاچا! آپ اسے نیچے اتاریں، ہمارے ناش آپ کو بتا دیتا ہے، تبھی تو آپ ہار نہیں رہے۔“ صغدا چیخ پڑا۔ پھر تو سب ہی باری باری احتجاج کرنے لگے۔

”ارے، یہ مجھے تو کچھ نہیں بتا رہا۔“ چودھری شوکت علی ہنس کر بولے۔

”نہیں، پہلے اس بندر کو اتاریں، میں نہیں کھیلتا۔“ امین نے پتے پھینک دیئے۔

”جل یارا! اتر۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں، تیرے چاچا کو ہرا دیں گے۔ میں کرنا ہوں، دو دو ہاتھ۔“ چودھری شوکت علی نے اسے اپنے کانٹھوں سے اتار دیا۔

”مجھے تو یارا! تقدیر بھی نہیں ہرا سکتی۔“ چودھری شوکت علی نے نہایت غرور سے پتے پھینکتے ہوئے کہا تو وہ سب ہنسنے لگے۔ شعیب علی منہ بسور کر ایک کونے میں جا بیٹھا۔



”شیشی پتر! ادھر آنا۔“

”میں نہیں بولتا۔“ اس نے منہ پھیر لیا۔

”چلو شیطانو! جھاؤ تم اوگ، میں نہیں کیلتا۔ تم نے میرے بیٹے کو ناراض کر دیا ہے۔“

چودھری شوکت علی پتے پھینک کر اٹھ کھڑے ہوئے اور شعیب کو گود میں لے کر اس کے بھٹو لے بھٹو لے گال چوم لئے۔

”چاچا ہار سے ڈر گئے۔“ امین نے شور مچا دیا۔ مگر چودھری شوکت علی، شعیب کو لئے بیٹھک سے نکل گئے۔

وہ اپنے کمرے میں آئے تو ٹھنک گئے۔ وہ سمجھ رہے تھے، زہرہ بیگم کام میں مصروف ہوں گی مگر وہ تو ابھی تک کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہی تھیں۔ چودھری شوکت علی کی ساری خوشی کافور ہو گئی۔ دل انجانے اندیشوں سے ڈرنے لگا۔ اس کی دھڑکنیں اتنی تیز ہو گئیں کہ وہ اس کی آواز با آسانی سن رہے تھے۔ شعیب اب بھی ان کی گود میں تھا۔ اپنی چاچا کے کڑے تیور دیکھے تو بولا۔

”چاچا! مجھے بھوک لگی ہے..... میں جا رہا ہوں۔“ وہ پھسل کر اتر اور جلدی سے باہر چلا گیا۔ چودھری شوکت علی دل کڑا کر کے آگے بڑھے اور کرسی پر بیٹھ گئے۔

”کیا بات ہے زہرہ! آپ پریشان ہیں؟“

”چودھری صاحب! میں آپ سے یہ پوچھتی ہوں کہ آپ نے ایک کچی لڑکی کے سامنے میری بے عزتی کیوں کی؟“

”آخر اس میں بے عزتی کی کیا بات ہے؟ میں نے تو یونہی آپ سے کہہ دیا تھا۔“

”یونہی کہہ دیا تھا..... مجھے پتہ ہے، اس وقت آپ کے دل میں کیا تھا۔ حاکمت کا غرور۔ مگر یاد رکھیں کہ میں آپ سے بڑی ہوں اور میں اپنے سے چھوٹوں کو اتنا حق نہیں دیتی کہ وہ مجھ سے کسی معاملے میں باز پرس کریں۔“ زہرہ بیگم کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

”زہرہ! میں اسی لئے حسن پور نہیں آتا۔ میں وہاں تنہا رہتا ہوں تو سکون سے رہتا ہوں۔ یہاں کی نت نئی باتیں اور آپ کی لڑائیاں میرا سکھ برباد کر دیتی ہیں۔“

”تو نہ آتے آپ!“

”بھئی کرنا پڑے گا۔“ چودھری شوکت علی نہایت اطمینان سے بولے تو زہرہ بیگم سن کر

رہ گئیں۔ وہ تو سمجھ رہی تھیں کہ چودھری شوکت علی کہیں گے، زہرہ! کیوں نہ آئے؟ آپ کا

خاطر آیا ہوں۔ آخر آپ میری بیوی ہیں۔ ہمارا دکھ سکھ سا بچا ہے۔ مگر انہیں اس قدر

کودے جواب کی توقع نہ تھی۔

شدت غم اور غصے سے زہرہ بیگم کی طبیعت ایک دم بگڑنے لگی۔ چہرہ زرد ہوتا گیا اور

ہاتھ رکھے دھری ہوتی چلی گئیں۔ چودھری شوکت علی ان کی اس کیفیت سے گھبرا گئے۔ جلدی سے اٹھے اور زہرہ بیگم کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

”چھوڑ دیں مجھے..... چھوڑ دیں شوکت! مجھے اکیلا رہنے دیں۔ مجھے مرنے دیں۔“

زہرہ بیگم ایک ایک کر بول رہی تھیں۔ دکھ اور تکلیف کی شدت سے ان کی آنکھیں جھم جھم

نہا رہی تھیں۔ چودھری شوکت علی نے انہیں بستر پر لٹایا اور جلدی سے گلاس میں پانی لے

کر پلانے کے لئے زہرہ بیگم کے سر کے نیچے بازو ڈال کر انہیں اٹھانے کی کوشش کی۔

”مجھے نہیں ضرورت شوکت! مجھے مر جانے دیں۔“ زہرہ بیگم گلو گیر آواز میں بولیں۔

”پانی پییں۔ فضول باتیں نہ کریں۔“ چودھری شوکت علی نے کہا۔ حالانکہ ان کا دل کہہ

رہا تھا۔ ”پانی پی لو، بعد میں مر جانا۔ میری جان تو چھوٹے۔“

زہرہ بیگم نے دو گھونٹ پانی کے حلق سے اُتارے۔ ابھی چودھری شوکت علی جھکے ہوئے

انہیں لٹا ہی رہے تھے کہ جیوی کمرے میں داخل ہوئی۔ چودھری شوکت علی کو زہرہ بیگم کے

اتنے قریب دیکھ کر وہ جانے ہی لگی تھی کہ چودھری شوکت علی نے اسے دیکھ لیا۔

”جیوی! یہاں آؤ۔“ وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

”جی مالک!“

”زہرہ کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ بتاؤ اب کون سی دوائی دینی ہے؟“ انہوں نے میز

پر رکھی بے شمار دواؤں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ زہرہ بیگم آنکھیں بند کئے لیٹی تھیں۔ ان

کے چہرے پر زردی سی پھیلی ہوئی تھی۔

”مالک! یہ دینی ہے۔“ جیوی نے ایک شیشی اٹھائی۔

”ٹھیک ہے، تم جاؤ۔“ انہوں نے شیشی جیوی کے ہاتھ سے لے لی اور دوائی سے چمچ

یوں لگا، جیسے چودھری شوکت علی کی آواز ان کے کانوں میں امرت گھول رہی ہو۔ وہ

پکارتے رہیں اور وہ سنتی رہیں۔

”اٹھو بھئی۔“ چودھری شوکت علی نے لگاؤٹ آمیز لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ تب

زہرہ بیگم نے پلوں کی چلمن ہٹا کر انہیں دیکھا اور نہ جانے کیوں ان کے لب مسکا اٹھے۔

انہوں نے لیٹے ہی لیٹے منہ کھول دیا۔ چودھری شوکت علی انہیں دوا پلا کر پلٹے تو زہرہ بیگم

نے نہایت نحیف آواز میں انہیں پکارا۔

”شوکت!“ زہرہ بیگم کے لب کپکپائے۔

”ہوں!“ چودھری شوکت علی نے ان کے قریب آ کر ان کا سر دھاتھ تھام لیا اور زہرہ

بیگم کے پورے وجود میں چودھری شوکت علی کے ہاتھوں کی گرمی سرایت کر گئی۔



”آپ مجھ سے ناراض ہیں؟“

”نہیں تو۔ یہ خیال کیوں آیا آپ کو؟“ چودھری شوکت علی بولے۔

”آپ کا دل مجھ سے بھر گیا ہے شوکت!“ زہرہ بیگم کی آواز رنڈھ گئی۔ شوکت علی کا چاہا کہ کہیں ”آپ سے دل لگا ہی کب تھا جو بھر جاتا۔ یہ تو بزرگوں کی پابندی ہوئی ایک ہے، جس سے میں بندھا ہوا ہوں۔“

”آپ نے جواب نہیں دیا، شوکت!“ زہرہ بیگم انہیں سوچوں میں گم دیکھ کر ہنسنے لگی۔

”اوہ..... آپ بھی عجیب باتیں کرتی ہیں۔ بولا کسی بیوی سے بھی شوہر کا دل بھر گیا ہے؟“ انہوں نے والہانہ پن سے زہرہ بیگم کی بھگی بھگی آنکھیں چوم لیں اور ٹھیک اسی وقت بے اختیار چہم سے خیالوں کی دنیا میں نوراں آ گئی، جیسے پوچھ رہی ہو ”چودھری جی! یہ وہ عجیبی تم کیسے بھگتا لیتے ہو؟ بیک وقت دو عورتوں کو کیسے بے وقوف بنا رہے ہو؟ کچھ کا تھنا تمہاری سچی محبت زہرہ سے ہے یا مجھ سے؟“

”میں تم سے سچی محبت کرتا ہوں۔“ چودھری شوکت علی نے زہرہ بیگم کا ہاتھ چھوڑ دیا اور بے خودی میں نوراں سے مخاطب ہو کر بڑبڑائے۔

”سچ شوکت؟“ زہرہ بیگم پھول کی طرح کھل اٹھیں۔ ”سچ شوکت! تم مجھ سے سچی محبت کرتے ہو؟“

چودھری شوکت علی نے سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ زبان اس بات کا اقرار نہ کر سکی۔

☆.....☆.....☆

اسی طرح کئی ماہ گزر گئے۔ چودھری شوکت علی اب جلدی جلدی حسن پور کے پھر لگا اور پھر دنیا پور آ جاتے۔ وہ نوراں کے لئے بھی پریشان رہتے اور زہرہ کے لئے بھی۔ کہ وہ جب بھی حسن پور جاتے، زہرہ ضد کرتیں کہ وہ وہیں رہ جائیں۔ مگر وہ اُسے منالیا کرتے تھے۔ اس لئے جلد جلد جا کر زہرہ بیگم کو مطمئن کر دیتے۔

رات بے حد سرد اور تاریک تھی۔ چودھری شوکت علی بے قراری سے برآمدے میں رہے تھے۔ اندر کمرے میں سے کبھی کبھی نوراں کے سسکنے کی آواز آ جاتی، جو ان کا دل اڑا کر رکھ دیتی۔ آج نوراں تخلیق کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ اس کے پاس لالی تھی اور انہیں ناں..... لالی کی ماں دایہ کا کام بھی کرتی تھی اور اس وقت دونوں بیٹیاں اندر موجود تھیں۔

”چودھری جی! حقہ تازہ کر لایا ہوں۔“ دینو حقہ لئے ان کے قریب آ گیا۔ آج تو حقہ بھی بے تحاشا پی رہے تھے حالانکہ رات میں انہوں نے کبھی حقہ نہیں پیا تھا۔ نوراں کو نہ تھا اور اس کی پسند ہر حال میں عزیز تھی۔ مگر آج تو وہ حقہ گڑ گڑائے ہی جا رہے تھے۔

انہوں نے دروازے پر دستک دی، لالی نے دروازہ کھولا۔

”لالی! خطرے کی تو کئی بات نہیں؟ اگر ایسی ویسی بات ہو تو میں شہر لے جاؤں؟“

چودھری شوکت علی بولے۔

”نہیں چودھری جی! ابھی وقت نہیں آیا۔“

”مجھے ایک نظر نور کو دیکھنے دو۔“ انہوں نے نہایت بے قراری سے کہا۔

”آجائیں۔“ لالی دروازے سے ہٹ گئی اور وہ تیزی سے اندر آ گئے۔

نوراں نیچے چٹائی پر لیٹی تھی۔ موی شمعوں کی روشنی میں اس کی آنکھوں میں دیرانی اور چہرے کی زردی شوکت علی کو صاف نظر آ گئی۔ لالی کی ماں اور لالی وہاں سے ہٹ گئی تھیں۔

”نور.....!“ چودھری شوکت علی نے بے تابانہ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”اگر تو کہے تو شہر لے چلوں؟“

”ناں.....“ نوراں نے زور زور سے سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے، جنہیں چودھری صاحب نے اپنے ہاتھوں سے صاف کیا اور باہر آ گئے۔

وقت بھی رینگ رینگ کر گزر رہا تھا اور سحر تھی کہ ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ ہر طرف موت کا سناٹا تھا۔ ایسے میں اچانک ایک باریک سی رونے کی آواز نے سناٹے کو چیر کر رکھ دیا۔ چودھری شوکت علی نے ٹھٹھا بند کر دیا اور دینو کی طرف دیکھا۔ وہ بھی انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”مبارک ہو، مالک!“ دینو جلدی سے بولا۔ وہ بوکھلا سا گیا تھا یہ آواز سن کر۔

”خیر مبارک ہو..... خیر مبارک!“ ان کا رواں رواں خوشی سے ناچ اٹھا۔ انہوں نے دروازے پر دستک دی۔

”ابھی زکیں چودھری صاحب!“ اندر سے لالی کی آواز آئی۔ چودھری شوکت علی پرے ہٹ گئے اور دینو سے باتیں کرنے لگے۔ اندر ہلکی ہلکی سرگوشیاں ہو رہی تھیں، جن کی آواز باہر نہیں آرہی تھی۔

”نوری! تیری ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہوا ہے۔“ لالی نے کہا۔

”دو بچے؟“ نوراں کے چہرے پر عمتا کا نور پھیل گیا۔

”ہاں!“ لالی بولی۔

”اب تو چاہے تو بیٹے کا گلا گھونٹ دے۔“ لالی نے کہا۔

”نہ..... نہ لالی! تو نے کیسے کہہ دیا، میں گلا گھونٹ دوں؟..... نہیں لالی! میں نے تو ان کی تخلیق کا درد سہا ہے۔ یہ مجھ سے نہ ہو گا۔“ نوراں رو دی۔

”پھر اب دونوں ہی۔“



”میں چودھری کو وارث دینا نہیں چاہتی۔ ٹو لڑکے کو لے کر چلی جاؤں۔ ٹو نے بڑے سے وعدہ کیا تھا کہ اگر لڑکا ہوا تو ٹو لے گی۔ اب ٹو اسے لے لے۔“ نوران تکلیف سے کہہ کر رہ گئی۔

”اگر چودھری کو پتہ چل گیا تو؟“ لالی نے خدشہ ظاہر کیا۔

”نہیں پتہ چلے گا۔ ٹو لے لے لالی! میرے بیٹے کو۔ یہ انتقام کا پہلا مرحلہ ہے۔“ نوران نجف سی آواز میں بولی۔ لالی نے لڑکے کو پرانے کپڑوں میں لپیٹا اور جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

”چودھری جی! بیٹی ہوئی ہے۔“ لالی نے آہستگی سے کہا۔

”او خدا کا شکر ہے..... اللہ کی رحمت آئی ہے میرے گھر۔ نور کیسی ہے؟“ انہوں نے بے تابگی سے پوچھا۔

”آپ اندر چلے جائیں۔“ لالی ہٹ گئی اور چودھری کمرے میں داخل ہوئے اور لالی پوٹلی سنبھالے چپکے سے باہر چلی گئی۔

”نور!..... نور! مبارک ہو، ہمارے بیٹی ہوئی ہے۔ ہماری محبت کی پہلی نشانی۔“ انہوں نے دیوانہ وار نوران کو چوم لیا۔ وہ بے حد خوش تھے۔ وہ باپ بن گئے تھے۔ ان کی ازلی تمنا پوری ہو گئی تھی۔

لالی کی ماں بچی کو نہلا دھلا کر لے آئی اور پلنگ پر لیٹی نوران کے پہلو میں لٹا دیا۔ چودھری شوکت علی نے بے اختیار رُودنی کے گالے جیسی بچی کو اٹھا لیا اور اس کے سرخ سرنا ہونٹ چوم لئے۔ لالی کی ماں یہ دالہانہ پن دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ چودھری کو پتہ چل جائے کہ وہ دو بچوں کو بیک وقت باپ بنا ہے تو اس کا کیا حال ہوگا؟ حالانکہ جب لالی اور نوران کی چاندنی رات میں بات ہوئی تھی تو دونوں نے منصوبہ بنایا تھا اور لالی نے دوسرے روز ماں کو بتایا تھا تو ماں نے سخت مخالفت کی تھی۔ مگر اس سے تو بہتر ہی تھا کہ وہ گلا گھونٹ دیتی۔ اور اب وہ بچہ لالی کے پاس تھا۔ بچی کو چودھری دالہانہ پن سے چوم رہے تھے۔

”مائی! کیا مانگتی ہے، بول۔ آج جو بھی مانگو گی، ملے گا۔ خدا نے مجھے بہت بڑی خوشی سے نوازا ہے۔“ مارے خوشی کے ان کے لبوں سے لفظ بھی صحیح طرح ادا نہیں ہو رہے تھے۔

”چودھری جی! جو مرضی دے دو۔ اگر لڑکا ہوتا تو منہ سے مانگتی۔“

”یہ بات نہ کر مائی! یہ میری بیٹی گیارہ بیٹوں پر بھاری ہے۔ میرا سب کچھ اسی کی خاطر ہے، اسی کا ہے۔“ انہوں نے دایہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

”جو مرضی آئے گی۔“

”لے کر دیئے۔“ باقی صبح لینا۔“

”یہ تو بہت ہیں جی۔“ اس نے جھولی میں پڑے نوٹوں کو دیکھا۔

”اب ٹو جا، باقی پھر سہی۔“ وہ نوران کی طرف پلٹے جو لیٹی ہوئی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

”نور! میں نے بہت منہیں مانی تھیں، تیرا صدقہ مانا تھا، جو صبح ہوتے ہی دے دوں

“۔“ انہوں نے نوران کا ہاتھ سہلاتے ہوئے نہایت محبت سے کہا۔ ان کی آنکھوں میں تڑپیں روشن تھیں۔

”دینو!..... او دینو!“

”جی مالک!“ دینو تو اندر آنے کا منتظر ہی تھا۔

”دینو! میں نے تجھ سے کہا تھا نا کہ نوران مجھے مل جائے گی اور وارث بھی۔ اب دیکھ،

پورے ساڑھے چار سال بعد نوران نے مجھے بیٹی دے دی ہے..... میں نے غلط تو نہیں کہا تھا، دینو؟“ انہوں نے دینو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے زور دیا۔

”خدا مبارک کرے، مالک!“ دینو بولا۔

”کل پورے گاؤں میں جشن منایا جائے، حویلی کو سجایا جائے، غریبوں کو کھانا اور کپڑے تقسیم کئے جائیں۔ کل سب کا کھانا میری طرف سے ہے۔ کسی گھر میں چولہا نہ جلے۔ دینو! ٹو اعلان کرادے، پورا ہفتہ حویلی سے کھانا جایا کرے گا۔ سن رہا ہے نا ٹو دینو؟“

”جی مالک!“

”سویرے میری دھبی کے پیدا ہونے کی خبر پورے دنیا پور میں پھیل جائے اور دنیا پور کے لوگ ایک ہفتے تک میرے مہمان رہیں گے۔ سب کنوؤں پر اطلاع بھجوا دے، سمجھا؟“ چودھری شوکت علی نہایت جوش میں بول رہے تھے۔

”بہتر مالک!“ دینو سر جھکا کر باہر چلا گیا۔

چودھری شوکت علی بچی پر جھک گئے اور اس کی نازک نازک انگلیوں سے کھینے لگے۔

”نور!.....!“ انہوں نے محبت سے چور لہجے میں نوران کو پکارا۔

”جی۔“

”ہم اپنی دھبی کا کیا نام رکھیں، نور؟“

”جو دل کرے۔“ نوران نے اٹھی پر بات چھوڑ دی۔ انہوں نے کبھی آپس میں ناموں کے بارے میں تو بات کی ہی نہ تھی۔

”نور! میں نے بہت پہلے ایک نام سوچا تھا۔“ وہ چھت کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”کون سا؟“

”پتہ نہیں، تمہیں پسند آئے یا نہیں۔“



”اچھا ہوا تو کیوں پسند نہیں آئے گا۔“

”نورا! میں سوچا کرتا تھا کہ میری دہلی ہوئی تو اس کا نام مریم رکھوں گا۔ مریم کی طرف پاک۔ اتنا پاکیزہ نام۔ حالانکہ میرے ذہن میں ہزاروں نام آئے، مگر دل کو صرف مریم ہی بھایا۔ کیا خیال ہے؟“ چودھری شوکت علی نے نورا کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے ہوئے کہا۔

”بہت اچھا نام ہے۔“

”اوہ، نورا! شکر ہے تجھے پسند آیا۔ ورنہ میں تو ڈر رہا تھا۔“ چودھری شوکت علی بے خودہ گئے۔

”اچھا تو تم بھی ڈرتے ہو چودھری!“ نوراں دل ہی دل میں ہنس دی۔

”نورا! ہم مریم کو مومنو کہہ کر پکاریں گے۔ کتنی مٹھاس ہے اس نام میں.....“ ”مومنو“..... ہے نا؟“ انہوں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔

”ہاں۔“ نوراں نے جواب دیا۔

”مومنو بالکل تمہارا دوسرا روپ ہے نورا!“ چودھری شوکت علی بچی سے کھینچے لگے۔

”خدا نہ کرے کہ کسی کا مجھ سا روپ ہو اور وہ بھی میری دہلی کا۔“ نوراں کا منہ سارا دل کانپ گیا۔ پھر اس کا ذہن اپنے بیٹے کی طرف پلٹ گیا۔ ایک ہی ڈالی پر دو پھول کھلتے تھے اور اس ڈالی نے ایک پھول کو گرا دیا اور دوسرے کو چمٹائے رکھا تھا۔ نوراں نے یہی کچھ تو کیا تھا۔ چودھری سے انتقام کے نشے میں چور اس نے اپنی ممتا کو شکست دی تھی۔ اس نے اپنے جگر کے ٹکڑے کو کاٹ کر پھینک دیا تھا، اس کا دل ٹوٹے ہو گیا تھا۔ بیٹے کی یاد میں اس کی آنکھوں سے دو آنسو بہہ نکلے اور بالوں ہی میں جذب ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

”لالی! تُو نے بہت برا کیا۔“ لالی کی ماں نے چار پائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”نہیں ماں! یہ بہت اچھا ہوا۔ نوراں تو انتقام کی آگ میں اندھی ہو رہی تھی۔ وہ یقیناً بچے کا گلا گھونٹ دیتی۔“ لالی نے اس ننھے سے فرشتے کے معصوم چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ ایسا کبھی نہ کرتی۔ وہ ماں ہے۔ لالی! تُو ماں کا دل نہیں جانتی کہ کیسا ہوتا ہے۔ اگر تُو ماں ہوتی تو تجھے پسند ہوتا۔“ ماں نے لالی کو سمجھایا۔

”ماں!..... میں ماں نہ ہوتے ہوئے بھی اس کی ماں ہوں۔ دیکھ، میرا دل اس کی محبت سے لبریز ہو گیا ہے۔ میرے سینے میں درد ہونے لگا ہے ماں! تُو کیا ماں کے جذبات مجھ سے مختلف ہوتے ہیں۔ میں اس کی ماں ہوں۔ میں نے تخلیق کار کو نہیں سہا، مگر ماں!

میں نے اس کا اس طرح انتظار کیا ہے، جیسے کہ نوراں نے کیا ہو گا۔ ماں! دیکھ، میں نے اس کے لئے کتنے کپڑے بنائے ہیں، میں اس کا انتظار کرتی رہی ہوں۔“ لالی نے چار پائی پر بکھرے ہوئے کئی ننھی مٹی فراکوں اور لنگوٹوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ..... تُو نے.....؟“ ماں نے حیرت سے کہا۔

”ہاں! میں نے اور شیدے نے، ہم دونوں کو انتظار تھا ایک پیارے سے پُتر..... سوچنے پُتر کا، جو رب نے ہمیں دے دیا ہے۔“ لالی نے بچے کو چمکنے لیا۔ تب ہی شیدا بھی آگیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں سلور کی بالٹی میں دودھ اور دوسرے ہاتھ میں شہد کی بوتل تھی۔

”لالی! دے میرے پُتر کو۔ میں اسے دودھ پلاؤں۔“

”تھوڑی پیچھے گا؟“ لالی ہنس دی۔ ”ابھی اسے ماکی چٹا دے۔“

”ہاں، یہ ٹھیک ہے۔“ لالہ مجھے دے۔“ شیدا چار پائی پر بیٹھ گیا اور لالی نے بچے کو اس کی گود میں دے دیا۔ لالی مٹی کے پیالے میں شہد ڈال کر لے آئی۔ شیدا انگلی کی پور سے بچے کو شہد چٹانے لگا اور وہ بھی بڑے مزے سے شہد کی انگلی چوس رہا تھا۔

”لالی! اس کا نام بھی سوچا ہے تُو نے؟“

”ہاں شیدے! میں اس کا نام سکندر رکھوں گی۔ ہمارے ہاں یہ آیا ہے تو خوشیاں ہی خوشیاں ہمیں ملیں گی، شیدے! کیا خیال ہے تمہارا؟“

”ہاں لالی! ہمیں خوشیاں ہی ملیں گی۔ سکندر ہمارا ہی بیٹا ہے۔ ہمارا بیٹا۔“ شیدے نے دالہانہ پن سے اس کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

☆.....☆.....☆

دنیا پور خوشیوں کا گہوارا بن گیا تھا۔ مریم کی پیدائش پر خوب خوشیاں منائی گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ مریم کے والدین کے ساتھ ساتھ دنیا پور کا بچہ اس خوشی میں شریک ہے۔ فضا میں اور ہوائیں بھی مدھوش تھیں۔ چودھری شوکت علی، مومنو کے دیوانے تھے۔ وہ ذرا سا روزی تو وہ اسے بازوؤں میں لئے ٹھہرتے تھے۔ رات کو بھی وہ نوراں کو نہ جگاتے، بس خود ہی بھلاتے رہتے۔ وہ نوراں کے آرام کا خیال پہلے سے بھی زیادہ رکھنے لگے تھے۔ پھر جب ہنگامے ختم ہو گئے اور زندگی اپنے معمول پر آگئی تو چودھری شوکت علی نے حسن پور کے لئے رخت سفر باندھا کیونکہ وہاں بھی جانا ضروری تھا۔ حالانکہ پورے اٹھارہ دن بعد جا رہے تھے، مگر دل تھا کہ ماں ہی نہ رہا تھا۔ دل تو پہلے بھی جانے کو نہ کرتا تھا، مگر اب تو کچھ زیادہ ہی زنجیر چاہ رہا تھا۔ پہلے وہ نوراں کی خاطر نہ جانتے تھے۔ نوراں کی محبت ان کے پیردوں کی بھی ضرورت تھی اور اب ایک نئی محبت زنجیر بن گئی تھی، جسے وہ نہ دیکھتے تو چھین نہ پاتے۔ مگر جانا بھی ضروری تھا۔ دینو کو انہوں نے جیپ صاف کرنے کو کہا اور خواب گاہ میں چلے گئے۔



نوراں، مومو کو دودھ پلا رہی تھی۔ چودھری شوکت علی بے خود ہو کر اُسے دیکھتے رہ گئے۔  
ماں بن کر تو وہ اور بھی نکھر گئی تھی، پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت ہو گئی تھی۔ اُس کے  
چہرے پر ہمتا کا نور پھیلا ہوا تھا۔ وہ محبت پاش نظروں سے مومو کو دیکھ رہی تھی۔  
”نورا!“ چودھری شوکت علی نے اس کے قریب جا کر سرگوشی کی۔  
”جی۔“ نوراں بدستور مومو کی طرف متوجہ تھی۔  
”بہت پیاری ہے نا ہماری بیٹی؟“

”ہاں مومو! بہت پیاری ہے۔“ نوراں نے ان کی بات سے اتفاق کیا۔

”نورا! میں حسن پور جا رہا ہوں۔“ انہوں نے دھیرے سے کہا۔

”کیوں؟“ نوراں نے حیرت سے انہیں دیکھا اور..... اور چودھری شوکت علی اس  
کے سوال پر گرتے گرتے بچے۔ جب سے انہوں نے نوراں سے شادی کی تھی، نوراں نے  
کبھی ان سے نہیں پوچھا تھا کہ وہ کیوں جا رہے ہیں حسن پور۔ اور آج پہلی بار اس نے پوچھا  
تھا۔ مارے مسرت کے اُن کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔

”نہ جاؤں؟“ انہوں نے نوراں پر جھک کر پوچھا۔

”مرضی ہے آپ کی۔“

”میں تمہاری مرضی پر بھی تو چل سکتا ہوں۔“

”آپ کو کوئی کام ہی ہو گا، جی تو جا رہے ہیں۔“ نوراں کو خود پر غصہ آ رہا تھا کہ اُس

نے ”کیوں“ کیوں کہا۔

”میں جلد آ جاؤں گا، تم فکر نہ کرو..... بس میری دلی کا خیال رکھنا۔“ انہوں نے مہر

پر جھک کر کہا۔

”بہتر۔“ نوراں نے کہا۔ وہ سوچ رہی تھی، چودھری! تم مردوں کی محبتیں بھی عجیب

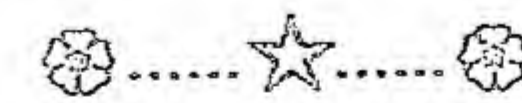
ہیں۔ پہلے جاتے تھے تو کہتے تھے، نورا! اپنا خیال رکھنا۔ اور آج کہہ رہے ہو، بیٹی کا خیال

رکھوں۔ وہ کسی سے مسکرا دی۔

”اچھا نورا! رت رکھا۔“

”رت رکھا۔“ نوراں کے لب کپکپائے۔ چودھری شوکت علی چلے گئے۔ نوراں دیر تک

ٹپٹے ہوئے پردے کو دیکھتی رہی۔



لالی اور شیدا منتظر رہتے کہ کب چودھری شوکت علی حسن پور جائے اور وہ نوراں سے  
سکندر کو ملوا سکیں۔ کیونکہ نوراں نے لالی سے کہا تھا کہ میرے بچے کو مجھ سے ضرور ملوانا۔ آج  
جب لالی چھت پر سے اُپلے اُتار رہی تھی تو اس نے سرخ حویلی سے چودھری کی جیب لٹکے

رہی۔ چودھری خود ہی جیب چلا رہا تھا، جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ واقعی حسن پور جا رہا  
ہے۔ کیونکہ وہ جب بھی دنیا پور میں اپنی سرزمینوں پر جاتے تھے تو دینو ساتھ ہوتا تھا اور وہ  
گھوڑے پر جاتے تھے۔ جیب تو انہوں نے صرف حسن پور جانے کے لئے رکھی ہوئی تھی۔

لالی جلدی سے نیچے آئی، کھولی میں شیدا بیٹھا سکندر سے کھیل رہا تھا۔

”شیدے! اسے مجھے دے۔ میں نوراں سے ملوا لاؤں۔ چودھری، حسن پور چلا گیا

ہے۔“ لالی نے سکندر کو اُس کے بازوؤں سے جھپٹ لیا۔

”لالی! فوراً واپس لے آنا۔ نوری کہے بھی تو نہ چھوڑنا۔ ہمارا دل نہیں لگے گا۔“

”تو فکر نہ کر۔ میں ابھی گئی اور ابھی لائی۔“ لالی نے سکندر کو کندھے سے لگاتے ہوئے

کہا۔ ”ہاں، تُو ذرا بھاجی پکا لے۔ میں آ کر روٹیاں پکالوں گی۔“ لالی جاتے جاتے بولی۔

”اچھا۔“ شیدے نے کہا اور لالی سکندر کو لے کر باہر چلی گئی۔

ادھر نوراں بھی کم بے قرار نہیں تھی۔ اس کا دل بے اختیار اپنے بیٹے سے ملنے کو کر رہا

تھا، اُس کی مانتا بے قرار تھی۔ وہ شدت سے دینو کی منتظر تھی کہ وہ آئے اور لالی کو بلا کر لائے

تاکہ وہ اپنے بیٹے کو دیکھ سکے، اُسے سینے سے لگا کر اپنی ہمتا کی پیاس مٹا سکے۔ تب ہی لالی

پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہوئی، اس نے ایک پوٹلی سی سینے سے لگا رکھی تھی۔

”اوہ، لالی! مجھے تیرا ہی انتظار تھا..... کیسا ہے میرا چہرہ؟“ نوراں بے تابانہ لالی کی

طرف بڑھی اور اس کے سینے سے لگی پوٹلی کو جھپٹ لیا اور اس کے چہرے سے کپڑا ہٹا کر

دیکھا تو دیکھتی رہ گئی۔ ہمتا کا نور اس کے چہرے پر پھیل گیا۔ وہ بھی اپنی گول گول، سیاہ

آنکھوں سے نوراں کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا، جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

”میں ہوں تیری ماں، میرے لال!..... میں ہوں تیری ماں۔“ نوراں اُس کے

چہرے پر سر رکھ کر سسک پڑی۔ وہ بے اختیار ہو کر کبھی اُس کے پٹھریوں جیسے ہونٹ چومتی

اور کبھی اُس کی پیشانی پر بوسوں کی بارش کر دیتی۔ تب ہی سکندر نے پریشان ہو کر رونا شروع

کر دیا۔ اس کے رونے سے نوراں کی چھاتیوں سے بے اختیار دودھ بہنے لگا۔ نوراں نے

اُس کا منہ اپنے سینے سے لگا لیا اور سکندر دودھ پینے لگا۔

”نہ نوری! نہ..... یہ عادت نہ ڈال۔“ لالی تڑپ کر آگے بڑھی۔

”پینے دے، لالی!..... یہ ہر بچے کا حق ہوتا ہے۔ قدرت اُنہی کے لئے تو ماں کے

شونہ سے دودھ بناتی ہے تو اُسے پینے دے تاکہ اُسے ماں کے دودھ کی پہچان ہو۔“ نوراں

سکندر کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی اور لالی ٹکر ٹکر اُسے دیکھے گی۔

پھر اسی طرح تین روز گزر گئے اور چودھری شوکت علی دنیا پور واپس آ گئے۔ ان تین

دنوں میں لالی روز سکندر کو ملانے نوراں کے پاس لے جاتی تھی اور جیسے ہی چودھری شوکت



علی آئے، لالی اپنے گھر پر ہی رہنے لگی۔ بس کبھی کبھار آ جاتی۔ چودھری نے ایک بار اس کو نہیں سکندر کو دیکھا تو پوچھا۔

”لالی! تیری دھڑی ہے یا پتھر؟“

”پتھر ہے چودھری جی!“ لالی گھبرا کر بولی۔

”اچھا..... لا، دکھا تو ذرا۔“ شاید اُن کا خون بھی اپنے خون کو سامنے پا کر بے قرار کر شریانوں میں تیزی سے گردش کرنے لگا تھا۔

لالی نے نوراًں کی طرف دیکھا تو نوراًں نے اُسے اشارہ کیا کہ دے دو۔ لالی آہستہ سے چودھری کی گود میں سکندر کو ڈال دیا۔

”بہت سونا ہے تیرا پتھر، لالی!“

”مو لا کا کرم ہے چودھری جی!“ لالی انکسار سے بولی۔

”ہاں، یہ تو ہے۔ مگر میری دھڑی سے سونا نہیں ہے۔“

”ظاہر ہے مالک! آپ کے اور ہمارے بچوں میں تو فرق ہوتا ہی ہے۔“ لالی طرے باز نہ آئی۔

”ہاں، ہاں..... یہ تو ہے۔“ چودھری شوکت علی ہنس دیئے۔

”تیرا آدمی کیا کرتا ہے؟“

”جی وہی کرتا ہے۔“ لالی بولی

”گزر چنگی ہو جاتی ہے؟“

”ہاں جی، اللہ کا شکر ہے۔“

”چل، آج سے تیرے پتھر کا خرچہ میں برداشت کیا کروں گا۔ مہینے کے بیچ سوردپ

خرچہ ٹھیک ہے نا؟“ چودھری شوکت علی نے سکندر کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

”مالک! یہ تو بہت ہے۔“

”نہ لالی! بہت کہاں؟ پھر بڑھا بھی دوں گا۔ آخر تو نور کی سہیلی ہے۔ کیوں نور ٹھیک

ہے نا؟“ انہوں نے نوراًں کی طرف فخر سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی ٹھیک ہے۔“ نوراًں نے ہمیشہ کی طرح سر جھکا کر دھیرے سے جواب دیا۔

”ہاں، لالی! اپنے مرد کو بھیج دینا میرے پاس۔“ شی کے پاس نام لکھوا دے گا۔“

”اچھا چودھری جی!“ لالی سر جھکا کر بولی اور تب ہی اس نے دیکھا کہ چودھری شوکت

علی کی موچھوں کے درمیان ناک کے نیچے ایک نمایاں تِل ہے، بالکل سیاہ اور ویسا ہی تِل

اسی جگہ پر سکندر کے بھی تھا۔ اس کی ہتھیلی پر بھی تِل تھے اور نوراًں نے بتایا تھا کہ چودھری

شوکت علی کی ہتھیلی پر بھی تِل ہیں۔

نوراًں نے کہا تھا کہ سکندر کا ایک ایک نقش چودھری شوکت علی کا ہے اور سکندر ہو وہ

اس کی تصدیق ہے۔

”او لالی! اٹھا بھی اپنے پتھر کو۔ اس نے پیشاب کر دیا ہے۔“ چودھری شوکت علی نے

ہنستے ہوئے کہا۔ پہلے تو لالی گھبرا گئی، پھر چودھری شوکت علی کا خوشگوار موڈ دیکھ کر ہنسنے لگی۔

نوراًں بھی مسکرا رہی تھی۔ اب چودھری نے مومو کو اٹھا لیا تھا۔

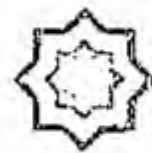
”تو بہ ہے..... چودھری تو دیوانہ ہے بچوں کا۔“ نوراًں نے زچ ہو کر سوچا۔ چودھری

شوکت علی، مومو کو بازوؤں میں جھولا جھلا رہے تھے۔ لالی اور نوراًں حیرت سے اس ظالم

چودھری کو دیکھ رہی تھیں، جس نے منشی اللہ دتہ کو ہر اذیت سے گزارا تھا کہ نوراًں کو حاصل کر

لے۔ اور واقعی، اگر وہ ایسا نہ کرتا تو آج اُسے مومو جیسی خوشی نہ ملتی۔ نوراًں کے دل میں ایک

ہوک سی اٹھی اور آنکھوں میں شبنم سی جھلکانے لگی۔





تھے۔ انہوں نے پہلی بار اتنے قریب اور نور سے زہرہ بیگم کو دیکھا، جن کی آنکھوں کے گرد  
چاندنی طبع پڑے ہوئے تھے۔ پیشانی پر شکنوں کا جال تھا۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے حالات کے  
تبدیلی نے ہانے پیشانی پر آ کر اُلجھ گئے ہوں، جیسے گالوں پر سرسوں پھیلی ہوئی ہو۔ چودھری  
شوکت علی نے زہرہ بیگم کا پلنگ سے جھولتا ہوا ہاتھ تھام لیا، جس کی پشت پر نیلی نیلی رگیں  
اُبھری ہوئی تھیں۔

”ہوں.....“ چودھری شوکت علی ایک طویل سانس لے کر سیدھے کھڑے ہو گئے۔ ”تو  
زہرہ بیگم! بڑھاپے نے آپ کے بھی دولت خانے پر دستک دے دی۔ آپ وقت سے پہلے  
ہی بوڑھی ہو گئی ہیں۔ ابھی تو آپ تخلیقی مراحل سے بھی نہیں گزریں، پھر یہ بڑھاپا کیوں  
آپ پر وارد ہوا؟ آپ نے اسے روکا بھی نہیں۔“ تب ہی چہم سے خیالوں میں نوراں آ  
گئی۔ خوب صورت خدو خال والی نوراں، ریلے ہونٹوں، پھولے حکنے گالوں، سڈول اور  
چکنے جسم والی نوراں جو اُن کے ہاتھوں میں چکنی پھولی کی طرح پھسلتی تھی تو بڑی مشکل سے  
ان کے مضبوط بازوؤں میں آتی تھی۔ بڑی دقت اور جدوجہد کے بعد وہ اسے ہاتھوں میں  
سمیٹ پاتے تھے۔

”آپ کا اور نوراں کا بھلا کیا مقابلہ، زہرہ بیگم!“ چودھری شوکت علی بڑبڑاتے ہوئے  
بڑی سی، رنگین کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کے لمبوں پر دھیمی دھیمی مسکان تھی ہوئی تھی۔ پلکیں موند  
کر انہوں نے سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ”بھلا کیا مقابلہ آپ کا  
اس کا فردا سے؟“ ان کے لب کھپکپائے۔ واقعی، چودھری شوکت علی کی یہ سوچ حقیقت پر  
بنی تھی۔

زہرہ بیگم بھلا کہاں اُن کی جنوں خیزیوں کا مقابلہ کر سکتی تھیں۔ چودھری شوکت علی کی  
جوان انگوں، دل میں مچلتی ڈھیروں خواہشوں اور جذبات کے ٹھانڈے مارتے سمندر کا  
مقابلہ تو صرف نوراں کا جوان جسم ہی کر سکتا تھا۔ وہی اس سرد گرم سمندر میں کود سکتی تھی۔  
وہی چودھری کے دل اور روح کے تمام تر تقاضے پورے کر سکتی تھی۔ وہ اب تک یہی تو کر  
رہی تھی۔ حالانکہ اسے چودھری شوکت علی سے کتنے دکھ ملے تھے۔ اُس کی بوٹی بوٹی زخمی تھی  
اور دل مرجھا گیا تھا۔ مگر چودھری کی قربت نے اس کی جوانی کے گلاب کو تروتازہ پھول کی  
طرح مہکا دیا تھا، جس کی خوشبو سے چودھری شوکت علی مدہوش ہو جاتے تھے۔ نوراں کے  
تانبے بالوں میں چہرہ چھپا کر وہ اُس کی خوشبو اپنی نِس نِس میں سونے کی کوشش کرتے اور  
ان کی روح تک معطر ہو جاتی۔ آخر ایسا کیوں نہ ہوتا۔ وہی تو تھی، جس نے ان کا ہر تقاضا  
اور ہر خواہش پوری کی تھی اور مومو کی شکل میں پیاری سی بیٹی کو جنم دے کر ان کے دل کی  
برسوں پرانی رُپ کو قرار بخشا تھا۔

رات خاصی بھیک چکی تھی۔ ابتدائی راتوں کا چاند کائنات پر اپنی نورانی کرنیں بکھیر  
رہا تھا۔ مست ہوا شیشم اور نیم کے پتوں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی اور چودھری شوکت علی  
درتچے کی چوٹ پر کہیاں ٹکائے اس دل فریب منظر میں کھوئے ہوئے تھے۔ چاند بھی  
بدلیوں میں چھپ جاتا، لیکن پھر بھی اس کی ہلکی ہلکی کرنیں درختوں کے سبز پتوں سے ٹھیلٹھیل  
تو عجیب ساں ہو جاتا۔ لمحے ہولے ہولے سرک رہے تھے۔ ماحول پر اک سکوت طاری  
تھا۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ چودھری شوکت علی کو اچانک یوں محسوس ہوا، جیسے چاند نے کسی  
کے چہرے کا روپ دھار لیا ہو۔ ان کے لب کھپکپائے۔ ”مومو!“ اور انہوں نے بے اختیار  
ہاتھوں کو پھیلا دیا۔ چاند میں انہیں مومو نظر آ رہی تھی..... پیاری پیاری، گول مٹول سی بیٹی۔  
ہستی کھلکھلاتی ہوئی، اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اپنی سمت بلاتی ہوئی..... بابا، بابا کی گردان  
کرتی ہوئی۔ ”جی، جی.....!“ شوکت علی کا رواں رواں جواب دینے لگا۔ دل کی گہرائیوں  
سے جی، جی کی صدا اُٹھنے لگیں۔ وہ سرشار سے ہوئے جا رہے تھے۔ ان پر ایک سرد مہ  
طاری تھا اور دل کی عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی۔

”شوکت!“ یہ آواز اُن کی سماعت سے ٹکرائی تو انہیں یوں لگا، جیسے کسی بچھونے ڈبک  
نار دیا ہو۔ مومو کا چہرہ چاند سے غائب ہو گیا۔ چودھری شوکت علی نے پلٹ کر غصے سے ال  
کی طرف دیکھا، جدھر سے آواز آئی تھی۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ زہرہ بیگم نے انہیں درتچے میں  
کھڑے دیکھ کر آواز دی ہے، مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ سامنے پلنگ پر سوئی ہوئی تھیں۔ شاید  
انہوں نے نیند میں انہیں پکارا تھا۔ جن حسین تصورات میں وہ کم تھے، زہرہ نے ان پر شب  
خون مارا تھا۔ وہ تھلا کر رہ گئے۔

چودھری شوکت علی نے دیکھا، زہرہ بیگم ان کی طرف ہی کروٹ لئے سوئی ہوئی تھیں۔  
ان کا ایک ہاتھ گال کے نیچے تھا اور دوسرا پلنگ کی پٹی سے نیچے جھول رہا تھا۔ نیچے پر بال  
بکھرے ہوئے تھے۔ تب چودھری شوکت علی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان کے قریب آئے  
اور ان کے چہرے پر جھک گئے۔ وہ بڑے نور سے زہرہ بیگم کے چہرے کی طرف دیکھ رہے



”مومو۔“ چودھری شوکت علی کا دل مزید مضطرب ہو گیا۔ بائیس مومو کو سینے کے لئے بے قرار ہو گئیں۔ دل اُسے بچنے کے لئے چلنے لگا۔ ہونٹ اُس کے نرم نرم گال اور چہرے پر جیسے لب چومنے کو لرزے لگے۔

”مومو!..... میری جان!..... میری روح!“ اُن کا روم روم پکار اٹھا۔

چودھری شوکت علی پورے چھ ماہ بعد حسن پور آئے تھے، وہ بھی زہرہ بیگم کی بیماری کی وجہ سے۔ ورنہ تو وہ مومو کو پا کر اور نوراں کی قربت میں رہ کر زہرہ بیگم کو بھلا ہی چکے تھے۔ دینو ایک ماہ کے لئے اپنے گھر والوں سے ملنے حسن پور آیا تھا اور جب وہ واپس گیا تو اس وقت چودھری شوکت علی اپنی خواب گاہ میں تھے۔ مومو پنگھوڑے میں سو رہی تھی اور وہ اُسے جھلا رہے تھے۔ دینو دستک دے کر اندر چلا آیا۔

”سلام مالک!“

”وعلیک السلام! ٹھیک تو ہے تو؟“ چودھری شوکت علی نے خوش دلی سے پوچھا۔  
”دعا ہے جی۔“ دینو انکسار سے بولا۔

”بڑا خوش نظر آ رہا ہے۔ بہت خدمت کی ہوگی تیری گھر والی نے۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا، نوری؟“ انہوں نے قریب بیٹھی نوراں سے پوچھا تو وہ مسکرا کر رہ گئی۔ تب دینو نے جواب دیا۔

”جی مالک!“

”اور کوئی نئی خبر؟“ چودھری شوکت علی، مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولے۔  
”مالک!.....!“ دینو جھجکا۔

”بول۔ بھلا نوراں سے بھی کسی بات کا پردہ ہے؟“ چودھری نے دینو کی جھک دیکھ کر شہ دی۔

”مالک! زہرہ چودھرائی بیمار ہیں۔“ دینو سر جھکا کر بولا۔

”او کوئی نئی گل کر، دینو! وہ تو ازل سے بیمار ہے۔“ چودھری شوکت نے منہ بنا کر کہا۔

”مالک! صدفرمیاں نے کہا ہے کہ آپ فوراً حسن پور پہنچیں۔“ دینو نے کہا۔

”او کیوں؟ کیا زہرہ کے جنازے کو کندھا دینا ہے؟“ چودھری شوکت علی کا بارے غصے کے پرا حال ہو گیا۔

”مالک! آپ تو غصہ ہو رہے ہیں جی۔ مگر چودھرائی جی منع کر رہی ہیں۔ کہتی ہیں کہ شوکت کو غرض ہوگی تو آپ ہی آجائے گا۔ میرا کہنا مانیں تو چلے جائیں۔ ورنہ ایسا نہ ہو۔“ چودھرائی جی بتائے بغیر ہی آجائیں اور بھاٹا اچھوٹ جائے۔“ دینو نے جلدی جلدی بات ختم کی۔

”ٹھیک کہتا ہے دینو!“ چودھری شوکت علی کی پیشانی پر فکر کی لکیریں نمودار ہو گئیں۔  
”میں صبح سویرے ہی چلا جاؤں گا۔ تو انتظام کر۔“ چودھری شوکت علی نے ایک دم ہی فیصلہ کر لیا۔

”توبہ سے پہلے میں جیب صاف کر دوں؟“ دینو نے پوچھا۔

”ہاں!..... اور سن، وہ کام بھی نہایت خوش اسلوبی سے کرنا نہ بھولنا۔“

”کون سا مالک؟“ دینو نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”او کھلے! وہی۔“ چودھری شوکت علی نے آنکھ کے اشارے سے دینو کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”اچھا!..... اچھا جی۔“ دینو نے زور زور سے سر ہلایا۔ وہ کافی دیر بعد سمجھا تھا اور پھر وہ خواب گاہ سے نکل گیا۔ نوراں حیرت سے چودھری شوکت علی کو تنک رہی تھی۔

”کون سا کام چودھری؟“

”او، آپس کی گل ہے۔“ چودھری شوکت علی بے پروائی سے بولے۔

”مجھ سے کیوں چھپاتے ہو، آپس کی گلیں؟“ نوراں کا لہجہ شکوے سے بھر پور تھا۔

”او جھپٹے! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے نشی نواز کو بیجا ہوا ہے نا چک میں۔ اس سے حساب کتاب کی بات کر رہا تھا۔“ انہوں نے ہستے ہوئے نوراں کا ہاتھ تمام لیا۔

”سچ؟“ نوراں نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

”بالکل سچ!“ چودھری شوکت علی نے اس کا ہاتھ ہونٹوں سے لگا لیا اور بولے۔ ”بس تین روز میں واپس آ جاؤں گا نور! تو پریشان نہ ہونا۔ مومو کا بھی خیال رکھنا۔ میری دلی بہت نازک ہے۔“ چودھری شوکت علی نے نوراں کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ چند لمحے بعد وہ پنگھوڑے میں سوئی ہوئی مومو پر جھکے ہوئے تھے اور اسے چومتے ہوئے مختلف القابات سے نواز رہے تھے۔

”میری مومو!..... میری مریم!..... مقدس دلی!..... سوہنی دلی!..... میرے جگر دا کلڑا۔“



دوسری صبح تڑکے ہی وہ حسن پور کی طرف روانہ ہو چکے تھے اور اب گزشتہ بائیس روز سے حسن پور ہی میں مقیم تھے۔ زہرہ بیگم کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ اگر وہ دو چار روز اور نہ آتے تو بقول چودھری طالب علی وہ انہیں خود دنیا پور سے کان پکڑ کر لے آتے۔ چودھری شوکت علی نے آتے ہی ڈاکٹر تبدیل کیا تھا۔ قیمتی سے قیمتی دوائیں زہرہ بیگم کے بلک کے قریب ہی میز پر رکھی ہوئی تھیں، مگر کسی ڈاکٹر کی بھی سمجھ میں ان کا مرض نہیں آتا تھا۔



چودھری شوکت علی سوچتے تھے، یہ سب ڈھکوسلے بازی ہے۔ کوئی بیماری نہیں ہے۔ وہ دوسرے کے لئے سخت بے قرار تھے اور کیوں نہ ہوتے؟ مومو تو ان کے جسم ہی کا ایک حصہ تھا۔ رات آتی تو وہ بے قرار ہو جاتے کیونکہ رات کو بھی مومو کو خود ہی سنبھالنے تھے، نورال کی نیند خلل نہ آنے دیتے تھے۔ اور اب وہ اپنی بیٹی سے کوسوں دور تھے۔ حالانکہ جب ایک دفعہ زہرہ بیگم کی طبیعت بالکل سنبھل گئی اور انہوں نے دنیا پور جانے کا ذکر کیا تو زہرہ بیگم ایک دم جیسے ہتھے سے ہی اکڑ گئی تھیں۔

”چھ ماہ وہاں رہے، آپ کا تو دل نہیں بھرا۔ کیا یہاں دل نہیں لگ رہا؟“

”دل کی بات نہیں ہے زہرہ!“ چودھری شوکت علی آہستگی سے بولے۔

”پھر وہاں کیوں جانا چاہتے ہیں آپ؟“ زہرہ بیگم نے مستی خیز اور چھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”کام.....“ چودھری شوکت علی نے کہنا چاہا۔

”کام..... کام..... مجھے چڑھ گئی ہے آپ کے اس لفظ سے۔“ زہرہ بیگم ان کی بات کاٹ کر چلیں۔ چودھری شوکت علی لرز کر رہ گئے۔

”وجہ؟“ چودھری شوکت علی نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”آخر چاچا کے زمانے میں بھی تو دنیا پور میں کام ہوتا تھا۔“ زہرہ بیگم لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ نچا کر بولیں۔

”آپ سمجھیں نا۔“ چودھری شوکت علی نہایت ہلکی لہجے میں بولے۔

”کیا اب وہاں کی زمینیں بھی مالک بدلنے سے تبدیل ہو گئی ہیں؟ کیا دنیا پور کے تمام تبدیل ہو گئے ہیں، جو گریووں اور سردیوں میں یکساں رہتے ہیں؟“

”آپ میری مجبوری سمجھیں۔“ چودھری شوکت علی کرسی کا ہتھکاڑا مضبوطی سے پکڑے ہوئے بولے۔ بھلا ضبط کی انتہا تھی یہ بھی۔

”کیا مجبوری ہے آپ کو؟..... سچ بتائیں شوکت! دنیا پور میں ایسی کون سی کشتی ہے جو آپ کو کھینچنے لئے جانی ہے؟“ زہرہ بیگم کا لہجہ نہایت دھیمہ تھا۔

”میں نے یہ تو نہیں کہا کہ وہاں کوئی کشتی ہے۔“ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جواب دیں۔

”پھر وہاں جانے کا مقصد؟“ زہرہ بیگم جرح کر رہی تھیں۔

”بس۔“ چودھری شوکت علی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

”شوکت! آپ مجھ سے جھوٹ نہ بولا کریں۔ کتنی بار کہا ہے کہ گودوں کھلایا ہے۔“ نے آپ کو۔ ہمیشہ کی طرح چودھری شوکت علی کے لئے انہوں نے اپنے ترکش سے آواز

تیر نکالا اور ہمیشہ کی طرح چودھری شوکت علی بھی تلملا کر رہ گئے، کچھ نہ کہہ سکے۔ بس سر جھکا لیا۔ انہیں زہرہ بیگم سے خاص طور پر اس وقت بہت شرم آتی اور ان کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے ایک دم ہی ابھر آتے۔

پھر یوں ہونے لگا کہ وہ روز دنیا پور جانے کا ذکر چھیڑتے مگر زہرہ بیگم کی ایک ہی جھڑکی انہیں چپ کرانے کو کافی ہوتی۔ اسی طرح آج پورے بائیس روز بیت گئے تھے اور نہ جانے وہ کیوں زہرہ بیگم کی اجازت کے بغیر دنیا پور نہیں جانا چاہتے تھے۔ بچپن میں بھی جب وہ کھیلنے کی ضد کرتے، باہر جانے کے لئے ٹھکتے اور اگر زہرہ بیگم منع کر دیتیں تو وہ نہ جاتے جب تک کہ وہ اجازت نہ دے دیتیں۔ اور اب تیس سال کے ہونے کو آئے تھے، مگر وہ عادت نہ گئی تھی۔ لاشعور میں زہرہ بیگم کا خوف بیٹھا ہوا تھا۔ راتوں کو انہیں نیند نہ آتی، وہ ٹھٹھکتے رہتے اور زہرہ بیگم سکون سے پلنگ پر سوئی رہتیں۔ تب ان کا جی چاہتا کہ وہ زہرہ بیگم کا گلا ربا دیں اور اس نفس سے آزاد ہو جائیں اور طائر کی مانند اڑتے ہوئے دنیا پور جا پہنچیں، مومو کو سینے سے لگالیں، اپنی تشنگی مٹالیں۔ انہیں یوں محسوس ہوتا، جیسے وہ انہیں پکار رہی ہے۔ ”بابا!..... بابا!“ کی گردان کر رہی ہے۔ دن تو کسی نہ کسی طرح کٹ جاتا، مگر رات کو دنیا جہاں کی بے قراریاں دل کے آنگن میں مچنے لگتیں۔ رات انہیں سیاہ ناگ کی طرح ڈسنے کے لئے آتی۔ مومو کی یاد دل میں سو سو کر ویں لے کر بیدار ہوتی اور وہ خود پر قابو پاتے پاتے بے حال ہو جاتے۔ آج بھی چودھری شوکت علی نے زہرہ بیگم کو نیند کی دوا دے کر سلا دیا تھا اور خود جاگ رہے تھے۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ زہرہ بیگم سو جاتیں اور وہ خیالوں ہی خیالوں میں اپنی مومو کے پاس پہنچ جاتے۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو جاتے۔ صبح زہرہ بیگم کی آنکھ کھلتی تو وہ چودھری شوکت علی کو کرسی پر سوتے دیکھ کر ڈکھی ہو جاتیں۔

”شوکت! آج رات بھی آپ کے قرب کے بغیر گزر گئی۔“ وہ خود سے کہتیں، مگر ان سے کچھ نہ پوچھتیں۔ حالانکہ ان کا انداز چیخ چیخ کر کہتا رہتا۔ ”چودھری شوکت علی! آپ میری خواب گاہ میں ہونے کے باوجود میرے بستر پر کیوں نہیں ہوتے؟ میرے قریب دوتے ہوئے آپ کا دل اور ذہن کہاں ہوتا ہے؟ میں نے آپ کے بچنے پر اپنی جوانی بچھا کر دی، مگر آپ اپنی جوانی میرے آنے والے بڑھاپے کے لئے وقف نہیں کر سکتے، مجھے اپنا قرب آپ تکل جانیں۔ چلے جائیں..... یا پھر مجھے جانے دیں۔“ مگر وہ چودھری شوکت علی سے بڑھ کر کہیں۔ اگر وہ اس طرح اپنے دل کی باتیں کہہ دیتیں تو ایک عام عورت اور چودھری شوکت علی کی جو ایک ڈر، ایک خوف کی دیوار دونوں کے درمیان حائل تھی، چودھری شوکت علی تو اسے کبھی



بھی نہیں گرا سکتے تھے اور زہرہ بیگم کو اس کا علم تھا۔ انہیں یہ احساس بھی شدت سے تھا کہ ان کی ایک کونجی اور بچہ زینب بھی ہری نہیں ہوئیں۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ چودھری شوکت علی بچوں کی بے حد خواہش ہیں اور اگر وہ ذرا سی نرمی برتیں تو وہ دوسری شادی کی اجازت مانگے اور مرد کے دل میں اگر ایک بار دوسری شادی کا خیال آجائے تو یوں سمجھ لیں کہ اس نے شادی کر لی۔ یہ خیال آکٹوپس کے بچوں کی طرح اس کے دل میں گڑ کر رہ جاتا ہے اور پھر مرد اس خیال کو غمکی جامہ پہنا کر ہی دم لیتا ہے۔ زہرہ بیگم انہیں کسی کمزوری سے کوئی فائدہ نہیں اٹھانے دینا چاہتی تھیں۔

حسن پور کی مسجد سے فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ امام صاحب کی پُرموز آواز نے ماحول کے سکوت میں عبودیت کا ایک خوشگوار تاثر پیدا کر دیا تھا۔ درختوں پر لاتعداد چڑیاں چہلنے لگی تھیں۔ تب ہی زہرہ بیگم نے کسمسا کر پہلو بدلا اور انجانے میں ان کا ہاتھ اپنے ساتھ لپیٹے ہوئے کسی وجود کو تلاش کرنے لگا، مگر ہمیشہ کی طرح جگہ خالی تھی۔ انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور پھر ان کی نگاہیں رنگین کرسی پر جم کر گئیں۔ کرسی خالی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ دل انجانے خدشات سے دھڑکنے لگا۔

”روز تو شوکت یہیں بیٹھے ہوتے تھے۔“ زہرہ بیگم نے سوچا۔ ”کہیں وہ مجھ سے پوچھے بغیر تو دنیا پور نہیں چلے گئے؟“ یہ خیال بجلی کے کوندے کی مانند ذہن میں لپکا۔ وہ تیزی سے بستر سے اتریں اور چپلیں پہن کر خواب گاہ سے باہر آ گئیں۔ وہ پورچ میں چودھری کی چپ دیکھنا چاہتی تھیں تاکہ ان کے خیال کی تصدیق ہو جائے۔ مگر باہر آتے ہی وہ کراہ کر رہ گئی۔ دُور برآمدے کے کونے میں چودھری شوکت علی کھڑے ڈوبتے چاند کو دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ آسمان پر اپنے مقدر کا تارا تلاش کر رہے تھے، جو نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ زہرہ بیگم ان کے قریب پہنچ گئیں مگر انہیں خبر نہ ہوئی اور وہ اپنے ہی خیالوں میں غلطاں بے حس حرکت ٹھنڈے ستون سے ٹیک لگائے کھڑے رہے۔

”شوکت!“ زہرہ بیگم نے نہات آہستگی سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ چودھری شوکت علی نے ایک دم پلٹ کر دیکھا، سامنے زہرہ بیگم کھڑی تھیں۔ بال اُلجھے ہوئے اور لباس شکن آلود تھا اور وہ بغیر دوپٹے کے ہی چلی آئی تھیں۔

”زہرہ بیگم! آپ کہیں تو مجھے تنہا چھوڑ دیا کریں، اپنے آپ میں مست رہنے دیا کریں مجھے۔“ چودھری شوکت علی، زہرہ بیگم کے چہرے پر نظریں جمائے یہ سوچے جا رہے تھے۔ ان کی نگاہوں میں نہ کوئی جذبہ تھا، نہ ہی جذباتی تپش۔ مگر پھر بھی ان کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس کر کے زہرہ بیگم کے گال تہمتا اٹھنے اور پلکیں لرزنے لگیں۔ دل عجیب انداز پر دھڑکنے لگا۔ یہ دھڑکن وہ بھی کبھی محسوس کرتی تھیں۔ سچ ہے، عورت مرد کی سرور گرم نظروں

نہیں کر سکتی۔ زہرہ بیگم نے سر اٹھا کر چودھری کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی انہیں دیکھ رہے تھے۔

”میں ہی تو نہیں شوکت!“ زہرہ بیگم نے شریکیں مسکراہٹ سے چودھری شوکت علی سے کہا۔

”نہیں..... ایسی بات تو نہیں۔“ چودھری شوکت علی اپنے خیالات سے باہر آ گئے۔

”آپ یہاں کیوں چلے آئے؟“ زہرہ بیگم نے پوچھا۔

”آپ کیوں چلی آئیں؟“ انہوں نے اُلٹا سوال کر دیا۔

”بس، ویسے ہی۔“ زہرہ بیگم سے جواب نہ بن پڑا۔

”بے فکر رہیں، میں آپ سے پوچھے بغیر دنیا پور نہیں جاؤں گا۔“ چودھری شوکت علی نے اپنے دونوں ہاتھ ان کے شانوں پر رکھ کر نہایت ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا، جیسے وہ ان کے آنے کا مقصد سمجھ گئے ہوں۔

اس لہجے میں بھرپور شکست تھی۔ دنیا پور کے مالک کی ہار تھی۔ وہ چودھری شوکت علی، جو ظلم و جور میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا، ایک عورت کے سامنے بے بس تھا۔ عورت بھی وہ، جو اس کی بیوی تھی۔ ایک بیوی نوران تھی، جسے پانے کے لئے اس نے جلاد کا روپ دھارا تھا۔ اور ایک بیوی یہ زہرہ بیگم تھیں، جو انہیں پا کر جلاد بن بیٹھی تھیں، انہیں اپنے خوف کے طلسم میں جکڑ رکھا تھا اور چودھری شوکت علی یہاں دنیا کے مظلوم ترین شخص نظر آتے تھے۔ اگر کوئی اس وقت دیکھ لیتا تو یہی کہتا کہ منشی اللہ دتہ پر مظالم ڈھانے والا یہ شخص دنیا پور کا چودھری شوکت علی نہیں بلکہ ایک سہا ہوا بچہ ہے۔

”چلے اندر۔ ٹھنڈ ہو رہی ہے یہاں۔“ زہرہ بیگم نے انہیں بازو سے تھاما۔

”مجھے یہیں اچھا لگ رہا ہے۔“ چودھری شوکت علی اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگے۔

”آپ رات بھر نہیں سوئے شاید۔“ زہرہ بیگم محبت پاش لہجے میں بولیں۔

”سو رہا تھا۔“ چودھری شوکت علی بے پروائی سے بولے۔

”جھوٹ مت بولے شوکت!“ زہرہ بیگم کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔

”جو کہہ گیا۔“ تب انہوں نے آگے قدم بڑھا دیا۔ زہرہ بیگم بھی ساتھ ہی چل دیں۔ وہ زہرہ بیگم کا مخصوص طعنہ نہیں سننا چاہتے تھے، جو ان کے دل کی چنگاری کو شعلے کا روپ دے دیا کرتا تھا۔ یوں لگتا، جیسے ایک دن وہ اس طعنے کی آگ میں جل کر راکھ ہو جائیں گے۔ اور جس مرتبہ تو وہ سوچتے کہ وہ اس آگ میں جل ہی جائیں۔ پھر زہرہ بیگم کے طعنہ دیں گی؟



دل مسوس کر رہ جائیں گی ان کی شکست پر میری روح سرشار ہو جائے گی۔ مگر ایسا صرف سوچنا آسان تھا۔ اب ہر سوچ اگر اس دنیا میں ہی پوری ہو جائے تو پھر کامیاں کہاں رہ کر رہیں گی، کس در پر دستک دیں گی؟“

☆.....☆

نوراں نے مومو کے کپڑے بدلے، پاؤڈر لگایا، آنکھوں میں سرمہ لگایا، جس سے مومو کی آنکھیں اور بڑی نظر آنے لگیں۔ پھر وہ اُسے اٹھائے اٹھائے باہر آگئی۔ باہرائی خیراں، آنگن میں جھاڑو لگا رہی تھی اور دینو چھڑکاؤ کرتا جا رہا تھا کیونکہ شام کے وقت وہ چھڑکاؤ ضرور کرتا تھا۔

”دینو چاچا!“ نوراں نے قریب جا کر اُسے پکارا۔ جب چودھری شوکت علی نہیں ہوئے تھے تو وہ دینو کو دینو چاچا کہتی تھی۔

”جی۔“ دینو چھڑکاؤ کرتے کرتے رُک گیا۔

”میں لالی کے ہاں جا رہی ہوں۔“

”کوئی پتہ نہیں، مالک کب آجائیں۔ آپ نہ جائیں۔“ دینو نے کہا۔

”ابھی آ جاؤں گی۔“ یہ کہہ کر نوراں آگے بڑھ گئی۔ دینو اُسے روک بھی نہ سکا۔

روزانہ لالی کے گھر جاتی تھی۔ چودھری شوکت علی کو اس بات کا علم نہ تھا۔ دینو کو خطرہ تھا کہ اچانک چودھری شوکت علی آگئے تو اُس کی تکا بولی کر دیں گے۔ وہ حیران تھا کہ آخر چودھری شوکت علی اتنے دن حسن پور کیسے رُک گئے؟ کہیں خدا نخواستہ چودھرائی زہرہ..... نہیں نہیں..... دینو اپنے خیال کو جھٹک دیتا۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ خبر دنیا پور میں بھی آتی۔ کوئی اور مجبوری ہوگی۔“ دینو خود کو تسلی دیتا۔ نوراں کو بھی وہ اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا حالانکہ اب وہ چودھری کی وفادار بیوی تھی۔ مگر دینو سوچتا، عورت کو بدلتے کوئی دیر نہیں لگتی۔ وہ پھر چھڑکاؤ میں مصروف ہو گیا۔

”ہائے نوری! میں تجھے ہی یاد کر رہی تھی۔ کیوں شیدے؟“ لالی نے نوراں کے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔

”ہاں..... لالی ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ شیدا جلدی سے بولا۔ لالی کمرے میں چلی گئی۔

”بس دل گھبرایا تو میں آگئی۔“ نوراں چار پائی پر بیٹھتی ہوئی بولی۔

شاید لالی ابھی کام سے فارغ ہوئی تھی۔ اس نے جھاڑو دے کر چھڑکاؤ کیا تھا اور پھر چار پائیاں آمنے سامنے بچھا دی تھیں۔ چھڑکاؤ سے مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو، روح کو سرشار کر رہی تھی۔ ایک کونے میں مٹی کے چولہے پر ہانڈی پک رہی تھی۔

”شیدے بھائی! سکندر کہاں ہے؟“ نوراں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”م بھی کر رہو بھائی اُسے اماں کے ہاں لے گیا ہے، منگواتی ہوں۔“ لالی شیدے کے بولنے سے پہلے ہی کمرے میں باہر آتے ہوئے بولی۔ اس کے ہاتھ میں چاندنی اور خوب صورت کڑھائی والا تکیہ تھا۔

”اٹھ ذرا! یہ بچھا دوں۔“ لالی نے کہا۔

”لالی! کیا میں کوئی مہمان ہوں؟“ نوراں دُکھ سے بولی۔

”مہمان ہی تو ہے۔“ لالی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اور پھر اب تم یہاں کی چودھرائی ہو، نوری بہن! یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ.....“

”لالہ شیدا! مجھے چودھرائی کہہ کر گالی مت دو۔“ نوراں چیخ پڑی۔ اس کی چیخ سے مومو ڈر کر رونے لگی۔

”شیدے! تُو تو بالکل جھلا (پاگل) ہے۔ جا، تُو سکندر کو لے آ۔“ لالی نے بات سنبھالی اور شیدا جلدی سے اٹھ کر چلا گیا۔

”نوری! میری بہن! مجھے معاف کر دے۔ تجھے تو پتہ ہے، شیدا بے وقوف ہے۔ اس کی بات کا خیال نہ کیا کر۔“ لالی نے روتی ہوئی مومو کو اس کی گود سے لے لیا اور نوراں کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ نوراں اس کے سینے سے سر ٹیکے اشکوں کے موتی لٹکتی رہی۔

”بس کر نوری!“ لالی نے اُسے دلاسا دیا۔

”لالی!..... لالی! تُو نے ایسی بھی کوئی چودھرائی دیکھی ہوگی، جس کی بوٹی بوٹی زخمی ہو؟ جسے چودھری کی قربت سے گھن آتی ہو؟ جسے چودھری کا قرب اپنے باپ کی موت کا واقعہ یاد دلاتا ہو؟..... میں ایسی چودھرائی ہوں لالی! مجھے دیکھ بہن! جو چودھری شوکت علی کی من پسند بیوی ہے، اس اولاد کے تر سے ہوئے شخص کو اولاد دینے والی، اس سانپ کے سنبولے کو نو ماہ تک اپنے وجود میں پالنے والی..... سخت نفرت ہے مجھے چودھری سے۔ میں تو اس کا نام بھی اپنے نام کے ساتھ نہیں سننا چاہتی۔ مجھے لفظ چودھرائی سے بھی نفرت ہے لالی! میں نے تو چودھری کی سرخ حویلی دیکھ کر اس میں رہنے کی خواہش کبھی نہیں کی تھی۔ تم لوگ گواہ ہو، میری سب سکھیاں گواہ ہیں، مجھے تو اپنا چھوٹا سا گھر بہت پیارا تھا۔ پھر یہ میری کون سی خواہش کی تکمیل ہے؟..... سرخ حویلی میں میرا دم گھٹتا ہے، مجھے سانس لینا دوپھر ہو جاتا ہے۔ میں اپنی سوچوں کے گھوڑے دُور تک دوڑاتی ہوں کہ مجھے معلوم ہو، کب میں نے اس حویلی کی خواہش کی تھی۔ مگر مجھے یاد نہیں آتا۔ تُو ہی بتا لالی! کبھی میں نے ایسا سوچا تھا؟“

نوراں نے روتے روتے یہ سب کچھ کہا۔

لالی کا دل، نوراں کے دُکھ نے ادھیڑ کر رکھ دیا۔

”نوری! بعض اوقات انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ اور بعض مرتبہ سوچی



خواہش پوری ہو جاتی ہے، ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ سب کچھ تو وہ نیلی چھت والا جانتا ہے۔  
تقدیریں لکھتا ہے۔ تیری تقدیر میں بھی یہی لکھا ہو گا۔“ لالی نے نورائے کے آنسوؤں کے  
دوپٹے سے صاف کئے، مگر آنسو تو اُڑے چلے آ رہے تھے۔ یہ نمکین پانی تو نہ تھا۔۔۔۔۔  
ایک ناسور تھا، جو آنکھوں کے راستے بہہ نکلا تھا۔

روتے روتے نورائے کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ ماں کو روتے دیکھ کر مومو بھی لالی کی گود  
میں چل رہی تھی۔ مومو کو بھی شاید اپنی ماں کے دکھ کی خبر ہو گئی تھی، جیسی تو وہ نا سمجھ بچی روئے  
چلی جا رہی تھی۔ لالی اُسے چپ کرانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

”لے، اے اُسے دودھ پلا۔ دیکھ تو، گلاسوکھ گیا ہے اس کا۔“ لالی نے مومو کو اس کی گود میں  
ڈال دیا۔ ”میں ذرا ہانڈی دیکھ لوں۔ اب مت رونا، بچی کہیں کی۔ اتنے سال بیت گئے ہیں،  
اب تو تجھے تقدیر پر شاکر ہو جانا چاہئے۔“ لالی نے نورائے کا منہ چوم لیا اور چولہے کی طرف  
بڑھ گئی۔ ہانڈی پکاتے ہوئے بھی وہ نورائے سے باتیں کرتی اور اُسے دلا سے دیتی رہی۔

”نوری بہن! ہم مقدر کے تابع ہیں، مقدر ہمارے تابع نہیں۔ اب تو یہ دیکھ کہ شید  
کا ہم سب کتنا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ سب سے زیادہ تو میں اور تو اُسے ستاتی تھیں، تب  
تقدیر مجھ پر کتنا ہنستی ہو گی۔ مگر اب جب میری اس سے شادی ہو گئی ہے تو وہی شید اب مجھے  
پیارا ہے۔ آخر سر کا سائیں جو ہوا۔ ماں باپ نے جو کیا، بھلا کیا۔ اسی طرح تو بھی ب  
باتیں بھول جا۔ آخر چودھری تیرا رکھوالا ہے۔“ لالی اُسے ہر ممکن طریقے سے سمجھانے کا  
کوشش کر رہی تھی۔

”میرے باپ کا قاتل وہ لشر، میرا رکھوالا کیسے ہو سکتا ہے لالی؟“ نورائے اس کی بات  
کاٹ کر بولی۔

”نوری! ایک بات تو میں بھی کہوں گی کہ اس نے تیرے باپ کی عزت کو پامال نہیں  
کیا۔“ لالی اس کے پاس ہی چار پائی پر آ کر بیٹھ گئی۔ مومو دودھ پیتے پیتے نورائے کی گود میں  
سو گئی تھی۔

”یہ تو کیسے کہہ سکتی ہے؟“ نورائے نے کہا اور مومو کو چاندنی پر لٹا دیا۔  
”وہ ایسے کہ اس نے جو کچھ بھی شروع کیا، دائرے میں رہ کر کیا۔ اس نے تجھے پونا  
بنایا ہے اور یہ اس کی شرافت ہے۔“ لالی نے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ تم اس کی پرانی کیسے کرو گی؟ آخر کو وہ تمہارا چودھری ہے۔“ نورائے نے  
سے کہا۔ لالی اُس کے لہجے کی گنجی کو صبر سمجھ کر حلق سے اتار گئی۔

”ایسی بات نہیں ہے۔ حق بات کہنے سے تو کوئی بھی نہیں روک سکتا کسی کو تو یہ  
اس نے جب تجھ سے شادی کی، کسی پر کوئی ظلم کیا؟ تجھے بھرپور محبت دی، ہر قسم کا چین دی۔

لالی کی بال کاٹ کر بولی۔

نورائے، لالی کی بال کاٹ کر بولی۔ اب تو راجا کو بھول جا۔“ لالی نے کہا۔

”یہ سب تیری سوچ ہے۔ اب تو راجا کو بھول جا۔“ لالی نے کہا۔  
”وہ طریقہ بتا دے، جس سے میں اسے بھول جاؤں۔“ نورائے ٹوٹے ہوئے لہجے میں

بولی۔ ”وہ تو ہر وقت، ہر دم میرا نال رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے نہیں بھولا ہو گا۔  
راجا کی محبت چاند کی چاندنی بن کر میرے دل میں ہمیشہ روشنی کرتی رہے گی۔“ نورائے ایک  
جذب کے عالم میں کہتی رہی۔ لالی حیرت سے اس کو نکلے جا رہی تھی اور سوچ رہی تھی کیا  
محبت کے نقش اتنے دیرپا اور امنٹ ہو سکتے ہیں؟

”کیا جدائی کے بعد بھی محبت ویسے ہی رہتی ہے؟“ لالی نے پوچھ ہی لیا۔

”جدائیاں تو محبتوں کو نکھار دیتی ہیں۔ اتنی شدتیں آ جاتی ہیں جدائی کے بعد محبتوں  
میں۔“ نورائے نے کہا اور اس سے پہلے کہ لالی کوئی جواب دیتی، شیدا سکندر کو لئے آ گیا۔  
اُسے دیکھتے ہی نورائے کے دل میں راجا کی محبت والے جذبات نجانے ایک دم کہاں روپوش  
ہو گئے۔ اب اس کے دل میں ممتا کا ایک سمندر موجزن تھا اور ممتا ہی کے نور سے اس کا چہرہ  
چمکنے لگا تھا۔

”لے نوری بہن!“ شید نے نورائے کے بازوؤں میں سکندر کو ڈال دیا۔

نورائے دیوانہ وار اُسے چوم رہی تھی۔ کبھی اس کے ننھے ننھے ہاتھ اپنے گالوں سے لگاتی  
اور کبھی اس کی چھوٹی سی پیشانی چوم لیتی اور وہ بھی تو اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے ایک ٹک  
نورائے کے چہرے کی طرف دیکھے جا رہے تھے، جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ دھیر  
سے مکرانے لگا اور اُس کے مسکرانے پر نورائے کا دل کھل اٹھا۔ سکندر کی غول غاں سے نورائے  
کے دل میں پھلھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں اور نہ جانے اس سے کیوں لالی اور شیدا بڑی  
حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ دونوں کے دل میں بیک وقت ایک ہی خیال آیا تھا۔

”آخر ماں، ماں ہوتی ہے۔ چاہے چودھری سے کتنی ہی نفرت کرے، مگر اُسے یہ تسلیم  
کرنا پڑے گا کہ اس نے اس چٹیلی کی شاخ کی طرح نازک نورائے کو ماں بنایا تھا۔ یہ روپ  
بخشے والی خدا کی ذات کریم ہے۔ مگر اس میں کچھ کردار چودھری شوکت علی نے بھی ادا کیا  
تھا۔ خدا نے وسیلہ تو اسے ہی بنایا تھا۔“

اگر وہ دونوں اپنی سوچ نورائے پر ظاہر کر دیتے تو وہ ہتھ سے اُکھڑ جاتی۔ چودھری کی  
طرف داری تو وہ کسی کی زبان سے سن ہی نہیں سکتی تھی، وہ چاہتی تھی کہ ساری خدائی چودھری  
شوکت علی کو برا کہے تاکہ اس کے دل کو ٹھنڈک پہنچے۔ ہاں، جب کوئی چودھری شوکت علی کے  
سامنے ان کی تعریف کرتا، نورائے دل پر جبر کر کے مسکراتی رہتی۔ بھلا وہ کبھی کیا سکتی تھی؟  
لالی اور شیدا اُسے تک رہے تھے۔

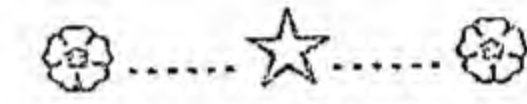


”اچھا لالی! میں چلوں۔“ نوراًں نے ایک دم ہی کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔  
”اتنی جلدی؟“ لالی حیرت سے بولی۔  
”بس، سکندر کو دیکھنا تھا، دیکھ لیا۔“

”اب روٹی کھا کے جانا۔ میں نے ساگ بنایا ہے۔ بس ابھی روٹی پکائی ہوں۔“ اسے بٹھاتی ہوئی بولی۔

”نہیں لالی! بہت دیر ہو جائے گی۔ مجھے جانے دو اس قفس میں۔ اب تو عادی ہوئی ہوں وہاں رہنے کی۔“ نوراًں دکھ سے مسکرائی۔

”دیکھ نوری! میں ناراض ہو جاؤں گی۔“ لالی نے اس سے کہا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھ گئی۔ لالی روٹی پکانے لگی اور جب پکا چکی تو دونوں نے مل کر روٹی کھائی اور پھر نوراًں نے قدم لال حویلی کی طرف بڑھنے لگے۔



شام پوری طرح درختوں پر جھک آئی تھی۔ تھوڑا تھوڑا سا اُجالا تھا۔ چمک پھیر، قطار قطار اپنے آشیانوں کی طرف جا رہے تھے۔ چودھری شوکت علی، سرسبز لان میں بید کی کڑی پر بیٹھے اُفتی پر اڑتے طائروں کو تک رہے تھے۔ اچانک ایک کوچ کی چیخ نے ان کا دل ادھیڑ کر رکھ دیا۔ وہ نیلے آسمان پر قلابازیاں کھاتی اور چنچنی ہوئی اڑی جا رہی تھی۔ شاید اس کا سانسی پھڑکیا تھا۔ تب بے اختیار چودھری شوکت علی کے لب گنگنا اُٹھے۔

کوچ دچھڑ گئی ڈاروں لہجہ دی سبحاں نوں  
اسی سے انہیں بے اختیار نوراًں اور مومو یاد آ گئیں۔ وہ خود بھی تو اس اُفتی پر چلتی کوچ کی طرح ایک کوچ ہی تو تھے، جو اپنی ڈار سے پھڑک کر یہاں حسن پور میں زہرہ بیگم کا دم سے ”مقید“ تھے۔ وہ اس کوچ کی طرح تڑپ سکتے تھے، چل سکتے تھے مگر ان سے مل نہیں سکتے تھے۔ چودھری شوکت علی کی آنکھوں میں دکھ کے سائے رقصاں ہو گئے اور آنکھوں میں شبنم کے موتی جھلکانے لگے۔

”شوکی چاچا!“ اس آواز پر انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ شعیب برآمدے میں کھڑا انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

چودھری شوکت علی کے دیکھنے پر وہ ستون کے پیچھے ہو گیا۔ وہ انہیں ستانا چاہتا تھا۔  
”شریر!“ چودھری شوکت علی اس کی مصوم حرکت پر بے اختیار ہنس دیئے۔  
”شوکی چاچا! مجھے ڈھونڈیں۔“ شعیب ستون کے پیچھے سے چلا آیا۔  
”بھئی تم خود آ جاؤ۔ میں تمہیں ڈھونڈ نہیں سکتا۔“ چودھری شوکت علی اٹھ کر جانے چاہتے تھے، اس لئے ہار مان لی۔

پھر کتنے ہی لمحے گزر گئے، شعیب نہ آیا۔ ان کا دل بے چین ہوا تھا۔ مڑ کر دیکھا تو وہ ستون کے پیچھے بھی نہ تھا۔ ”ناراض ہو گیا ہے شاید۔“ انہوں نے خود کو تسلی دی۔ حالانکہ وہ نہ جاننا چاہتے تھے مگر جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ تب کسی نے نہایت آہستگی سے ان کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور بھلا وہ اس کس کو نہ پہچانتے، یہ بھلا کیسے ہو سکتا تھا؟ وہ ان کا سب سے پیارا اور چہیتا بھتیجا تھا۔

”چاچا! بوجھو تو، کون آیا؟“ شعیب نے ان کی آنکھوں پر ہاتھ رکھے رکھے پوچھا۔ اس کی کھٹکتی ہوئی آواز چودھری شوکت علی کے کانوں میں رس کھول گئی۔  
”صنہر۔“ چودھری شوکت علی انجان بن گئے۔

”ناں۔“ شعیب نے زور زور سے سر ہلایا۔

”ائیں۔“ وہ بولے۔

”ناں۔“ شعیب نے کہا۔

”بھین۔“

”کٹ، کٹ۔“ شعیب نے اپنی مخصوص حرکت کی۔

”تو پھر میرا پتر شعیبی ہی ہو سکتا ہے۔“ چودھری شوکت علی پُر خیال لہجے میں بولے۔

”اوہ چاچا شوکی! بالکل ٹھیک۔“ شعیب ان کی گردن میں بازو ڈال کر جھول گیا۔

”یار! تم نے آواز خوب بدلی تھی۔“ چودھری شوکت علی نے اسے بازو سے پکڑ کر سامنے لاتے ہوئے کہا۔

”دیکھ لیں میرا کمال۔“ شعیب فخر سے سینہ پٹھلاتے ہوئے بولا۔

”ہے تو بھئی کمال ہی۔“ چودھری شوکت علی نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

”چاچا!“ شعیب ان کے سینے کے بالوں سے کھیلتا ہوا بولا۔

”ہوں۔“ چودھری شوکت علی کو پتہ تھا کہ اتنی محبت سے پکارنے کا کوئی مقصد ضرور ہوگا۔

”ایک کام تو کریں۔“ شعیب بولا۔

”کیا؟“ چودھری شوکت علی نے پوچھا۔

”پہلے وعدہ کریں۔ یعنی پراس۔“ وہ ٹھنکا۔

”اچھا وعدہ۔ مگر یہ تو بتا، پراس کسے کہتے ہیں؟“

”اوہ چاچا! آپ کو یہ بھی پتہ نہیں۔“ شعیب ہنسا۔

”نہیں یار!“ انہوں نے شعیبی کے گال چوم لئے۔

”آپ نے کتنی جھانسیں پڑھی ہیں؟“ شعیب نے پوچھا۔



”صرف پانچ، وہ بھی حساب کتاب کے لئے۔“

”پانچویں تو میں نے بھی پڑھی ہے۔ میرا مطلب ہے پڑھ رہا ہوں۔“

”یار! تو انگریزی سکول میں ہے نا۔“ چودھری شوکت علی اس کے سوال و جواب پر زچ ہو کر بولے۔

”ہاں یہ تو ہے۔“ شعیب نے بڑی تیزی سے گردن ہلائی۔

”بتانا، اس لفظ کا مطلب۔“ انہوں نے بچوں کی طرح ضرر کی۔

”وہ چاچا! پراس کا مطلب ہے وعدہ۔“ شعیب ان کے سینے پر اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے کے مارتا ہوا بولا۔

”اچھا، اچھا..... پراس۔“ چودھری شوکت علی نے بالکل جاٹوں کی طرح کہا۔

”او نہیں چاچا! آپ تو بالکل کند ذہن ہیں۔ پراس نہیں، پراس۔“ شعیب زور سے بولا۔

”پراس..... مس۔“

”ہاں، اب ٹھیک ہے۔ آپ یہاں رہیں تو میں آپ کو انگریزی سکھا دوں گا۔“ شعیب نے کہا۔

”او شیطان! تو اپنے چاچا کا استاد بنے گا؟“ چودھری شوکت علی نے پیار سے اس کے سر پر ہلکی سی چپٹ لگاتے ہوئے کہا۔

”اور کیا؟“ شعیب اکر گیا۔

”تو اپنے چاچا کی بیٹی کا استاد بن۔“ ایک دم ہی ان کے منہ سے نکلا۔

”آپ کی بیٹی چاچا؟“ شعیب نے حیرت سے کہا۔

”ہاں۔“ چودھری شوکت علی کے لب مومو کے خیال سے مسکا اٹھے۔

”جب بیٹی آجائے گی تو پھر میں اسے پڑھاؤں گا۔ چاچا! کب آئے گی بیٹی؟“ شعیب

پوچھ رہا تھا۔

”بیٹی؟“ چودھری شوکت علی کے لب کپکپائے۔ ”آگئی ہے..... میرا مطلب ہے آ

جائے گی۔“ چودھری شوکت علی نے ایک دم بات پلٹی۔ یہ کیا کہنے جا رہے تھے وہ؟ بھلا اس طرح بھی کوئی اپنے راز افشا کرتا ہے؟ انہوں نے خود کو ڈانٹا۔

”ہاں، تو کس بات کا وعدہ لے رہا تھا شعیبی؟“ انہوں نے شعیب کا ذہن بٹانا چاہا۔

”مجھے فلم دکھانا نہیں۔“

”فلم؟“ چودھری شوکت علی نے حیرت سے کہا۔

”ہاں چاچا! بہت اچھی فلم ہے ”ظلم و بدلہ“..... میرا ایک دوست بھی دیکھ کر آیا۔“

شعیبی ان سے لپٹ گیا۔

”ظلم و بدلہ.....“ یہ جملہ چودھری شوکت علی کے ذہن میں ہتھوڑے کی مانند ضربیں

لگانے لگا۔ ”ظلم و بدلہ۔“ کیا خدا مجھ سے بھی ظلم کا بدلہ لے رہا ہے؟ منشی پر کئے جانے والے

ظلم کا بدلہ، زہرہ بیگم سے دلوار رہا ہے خدا؟ کبھی بھی زہرہ نے مجھے اس طرح نہیں روکا دنیا پور

جانے سے، جس شدت سے اب منع کر رہی ہے۔ آخر کیوں؟ کیا یہ میرے مظالم کا بدلہ تو

نہیں ہے؟

”چاچا! چلیں نا۔“ شعیب کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

”پھر کبھی شعیبی! ان کا دل ادا ہو گیا۔“

”نہ چاچا! آج ہی..... کل اتر جائے گی وہ فلم۔“ شعیب ٹھنکا۔

”خدا نہیں کرتے۔“ چودھری شوکت علی نے دھیمے لہجے میں سرزنش کی۔

”بس میں آپ سے اب کبھی بھی بات نہیں کروں گا۔ میری گئی۔“ شعیب منہ بسور کر

بولا۔

تب ہی زہرہ بیگم ان کے قریب آگئیں اور سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

”شعیبی لال! یہ تمہارا منہ کیوں سو جا ہوا ہے؟“ انہوں نے نہایت محبت سے شعیب

سے پوچھا۔

”بس چاچی! میری لڑائی ہو گئی ہے چاچا شوکی سے۔“ وہ چودھری شوکت علی کو گھورتے

ہوئے بولا۔

”کیوں؟“ زہرہ بیگم نے دریافت کیا۔

جواب میں شعیب نے پوری بات بتا دی۔ چودھری شوکت علی ہونٹوں پر مسکراہٹ

بکائے شعیب کو زہرہ بیگم سے شکایت کرتے دیکھتے رہے۔

”جب آپ شعیب کی ہر بات مانتے ہیں تو یہ کیوں نہیں مان رہے؟“ زہرہ بیگم نے

پوچھا۔

”بس، دل نہیں کر رہا۔“ چودھری شوکت علی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بے

زاری سے بولے۔

”آخر آپ کے دل کو کیا ہو گیا ہے؟“ زہرہ بیگم تنک کر بولیں۔

”پہلے بھلا میں کون سی فلمیں دیکھتا رہا ہوں؟“ انہوں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

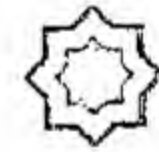
”نہ کبھی، پر بچے کا دل تو نہ توڑیں۔“

”میں پیسے دے دیتا ہوں، صفر کے ساتھ چلے جاؤ۔“ چودھری شوکت علی، شعیب سے

طالب ہوئے۔



چند لمحے بعد ان کی جیب رنگ محل کے آہنی گیٹ سے باہر جا رہی تھی اور زہرہ بیگم اسے باہر جاتا دیکھ رہی تھیں۔ پھر وہ شانوں پر پڑی ہوئی شال کو اچھی طرح لپیٹتی ہوئی اندر چل گئیں۔



”الک! ایک ہفتے سے یہیں ہوں۔ میرے نانکے رہتے ہیں نا، ان کے پاس آیا ہوا  
بھلا۔ بس جی، سوینے سے ہی واپس چلا جاؤں گا۔ محاف کر دیں جی، پوچھے بغیر آ گیا۔“ نشی



گڑبڑانے لگا۔

”کوئی بات نہیں۔ مجھے یہ بتاؤ، مومو اور نوراں تو ٹھیک ٹھاک ہیں نا؟“ چودھری شوکت علی اپنے مطلب کی بات پر آگئے۔

”جی ہاں بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کے آنے کے بعد مومو دو تین روز بیمار ہی ہے، اب بالکل ٹھیک ہے جی۔ دینو نے بتایا تھا۔“ نواز نے کہا اور چودھری شوکت علی، مومو کی پیارنی سن کر بے قرار سے ہو گئے۔

”زیادہ بیمار تو نہیں ہوئی تھی؟“ چودھری شوکت علی نے بے چینی سے پوچھا۔

”او جی، بچے اداں ہوتے ہیں نا۔ بس اسی وجہ سے بخار ہو گیا تھا۔“ رب نواز نے کہا۔

”سنو نشی! تم کل دنیا پر جاؤ گے تو دینو سے ضرور ملنا اور اس سے کہنا کہ میں جلد آنے کی کوشش کروں گا۔ زہرہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے نا، اس لئے مجھے دیر ہو گئی ہے۔ دینو سے کہنا کہ نوراں کو بھی بتا دے۔“ چودھری شوکت علی نے کہا۔

”بہتر جی۔“ رب نواز اکساری سے بولا۔ چودھری شوکت علی پلٹے اور رب نواز حیرت سے انہیں جاتا دیکھتا رہا۔

”چاچا شوکی! آپ کہاں چلے گئے تھے؟“ شعیب انہیں قریب آتے دیکھ کر جلدی سے بولا۔

”ایک کام سے گیا تھا۔“ چودھری شوکت علی جیب میں بیٹھتے ہوئے بولے۔

”دیکھا، اچھا ہوا نا، میرے ساتھ آنے سے آپ کا کام بھی ہو گیا۔“ شعیب علی نے خوشی سے لبریز لہجے میں کہا۔

”ہاں۔“ چودھری شوکت علی نے جیب اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

راتے بھر شعیب، پکچر کے بارے میں باتیں کرتا رہا اور چودھری شوکت علی خاموشی سے ڈرائیو کرتے رہے۔ رنگ گل پہنچے تو سب ان دونوں کا کھانے پر انتظار کر رہے تھے۔

”کہاں رہ گئے تھے شوکی؟“ چودھری شجاعت علی نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔

”بس لالہ! شعیبی کے ساتھ گیا تھا فلم دیکھنے۔“ چودھری شوکت علی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

میز پر کھانا پٹھا ہوا تھا۔

”شوکی! انٹو نے شعیبی کو بالکل خراب کر کے رکھ دیا ہے۔“ چودھری طالب علی نے انہیں عیت سے سرزنش کی۔

”روک لیں لالہ! ابھی وقت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ زیادہ بگڑ جائے اور آپ کو سدھانا مشکل ہو جائے۔“ چودھری شوکت علی کو ایک دم غصہ آ گیا۔ وہ کرسی دھکیلی کر اٹھے اور کمرے

”شوکت!“

وہ ٹپکتے ہوئے ایک دم رُک گئے اور مڑ کر زہرہ بیگم کی طرف دیکھا۔

”کیا بات ہے؟..... بہت پریشان ہیں آپ؟ کھانا بھی نہیں کھایا۔“ زہرہ بیگم نے پوچھا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولے۔

”کیوں، کیا کھا کر آئے تھے؟“ زہرہ بیگم نے پوچھا۔

”یہ بات آپ کو شعیبی بتا سکتا ہے۔“

”آپ نے تو اسے جھڑک کر بھگا دیا۔ آخر کیوں؟“ زہرہ بیگم نے پوچھا۔

اسے بگاڑ دیا ہے۔ آخر دوسروں کی اولاد جو ہوئی۔“ چودھری شوکت علی کے لہجے میں دکھ

سے نکل گئے۔ سب ہکا بکا انہیں جاتا دیکھتے رہ گئے۔

”زہرہ! کیا ہو گیا ہے اسے.....؟“ چودھری طالب علی نے حیرت سے زہرہ بیگم کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”بس لالہ! ایسا ہی موڈ ہے ان کا۔ پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔“ زہرہ بیگم نے دھیرے سے جواب دیا۔

”لالہ! اُسے برا لگ گیا ہے، آپ کاٹو کنا۔“ چودھری شجاعت علی نے کہا

”میں تو ہمیشہ ہی اس سے اسی انداز میں کہتا رہتا ہوں۔ یہ کوئی نویں کل تو نہیں تھی۔“

چودھری طالب علی نے کہا، پھر شعیب سے مخاطب ہوئے۔

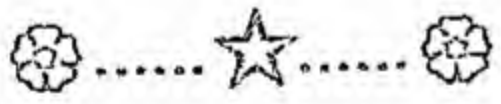
”جاشعیبی! اپنے چاچا کو بلا لا۔“

شعیب علی سے تو کہنے کی دیر تھی، وہ جلدی سے چلا گیا۔ سب چودھری شوکت علی کے بارے میں اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہے تھے۔ تب ہی شعیب روتا ہوا آ گیا۔

”کیا ہوا؟“ سیکنہ نے تڑپ کر پوچھا۔

”چاچا شوکی بہت غصے میں ہیں۔“ شعیب روتے ہوئے بولا۔ ”مجھے کہنے لگے، میرے پاس مت آیا کرو۔ میں نے تم کو خراب کر دیا ہے، بگاڑ دیا ہے۔ اور پھر بازو پکڑ کر کمرے سے نکال دیا اور دروازہ بند کر لیا۔“ شعیب نے آنکھیں رگڑتے ہوئے بتایا۔

”چل، نہ رو پٹر! چھوڑ، ہے تو تیرا چاچا۔ اگر ڈانٹ دیا تو کیا فرق پڑتا ہے؟ چاہتا بھی تو مجھے بہت ہے۔“ چودھری طالب علی نے اسے محبت سے پچکارا تو شعیب اپنے بابا کی گود میں بیٹھ گیا۔





نمایاں تھا۔

”مگر لالہ تو اکثر یہی جملہ کہتے رہتے تھے۔“ زہرہ بیگم پلنگ پر پہنچ گئیں اور چوہدری شوکت علی کو ٹٹو لے والی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ بالکل ایسے، جیسے تھانیدار کسی ملزم کو ٹٹو لے والی نظروں سے دیکھتا ہے۔ زہرہ بیگم خشم آلود نگاہوں سے انہیں گھور رہی تھیں اور نہ جانے کیوں وہ زہرہ بیگم کی تیز اور چھتی نظریں اپنے جسم کے آر پار ہوتی محسوس کر رہے تھے۔ بوکھلائے جا رہے تھے اور کمرے میں ایک سکوت طاری تھا۔

”شوکت! آپ کو جو بھی پریشانی ہے، مجھے بتادیں۔“ زہرہ بیگم نے کمرے کے سکوت کو توڑا۔

”تو زہرہ بیگم! سنیے۔ مجھے یہ پریشانی ہے کہ مجھے دنیا پور جانا ہے، گندم کی بوائی کرنا ہے۔ آخر یہ سب کس طرح ہو گا؟“ چوہدری شوکت علی نے بڑے اعتماد سے زہرہ بیگم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

”پھر آپ کی واپسی کتنے ماہ بعد ہو گی شوکت؟“ زہرہ بیگم نے آہستگی سے پوچھا۔

”بس، گندم کی بوائی کے فوراً ہی بعد..... میں جلد ہی آنے کی کوشش کروں گا۔“

چوہدری شوکت علی جلدی سے بولے۔

”ٹھیک ہے، آپ چلے جائیں۔“

”بہت بہت شکریہ، زہرہ! آپ نے میری مشکل حل کر دی۔“ چوہدری شوکت علی نے زہرہ بیگم کے ہاتھ تھام کر انتہائی تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

”اس میں شکریے کی کیا بات ہے شوکت! مجھے علم تھا کہ آپ کو جانا ہے۔“ زہرہ بیگم دھیرے سے بولیں۔ انہیں اپنی آواز کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

”شوکت! آپ.....“ اس سے پہلے کہ زہرہ بیگم کچھ اور کہتیں، چوہدری شوکت علی کے ہونٹوں نے ان کے ہونٹوں پر قفل لگا دیئے۔ وہ بے طرح شرما گئیں اور پلکیں موند کر چوہدری شوکت علی کی گرم گرم سانسیں اپنے اندر سمونے لگیں.....!

☆.....☆

رات کا پچھلا پہر تھا، جب کسی نے چوہدری طالب علی کی خواب گاہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

چوہدری طالب علی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ سیکڑہ بیگم کی بھی آنکھ کھل گئی۔

”نہ جانے کون ہے اس وقت؟“ چوہدری نے جوتا پہنتے ہوئے خود سے کہا اور پھر اپنے بڑھا کر ٹیبل لیپ چلا دیا۔

”پستول لے لیں، کوئی اچھا ہی نہ ہو۔“ سیکڑہ بیگم کا بپتی ہوئی آواز میں بولیں۔

”او جھیلے! کس مائی کے لال میں اتنی ہمت ہے کہ رنگ محل کا رخ کرے؟ تو فکر نہ کر۔“

”نہیں ہوتا۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھے۔ سیکڑہ بیگم کا چہرہ خوف سے سفید ہو رہا تھا۔ وہ کبھی قریب سونے ہوئے شععی کو دیکھنے لگتیں اور کبھی دروازے کی طرف۔

”کون ہے بھئی؟“ چوہدری طالب علی نے کنڈی اُتارتے ہوئے پوچھا۔

”میں ہوں لالہ!“ باہر سے آواز آئی۔

”اوہ، یہ تو اپنا شوکی ہے۔ سیکڑہ! تو پریشان نہ ہو۔“ چوہدری طالب علی نے بیوی کو تسلی دیتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

”خیر تو ہے شوکی؟“ چوہدری طالب علی نے دروازے سے ہٹ کر انہیں اندر آنے کے لئے راستہ دیا۔

”ہاں..... بالکل خیر ہے۔“ وہ ہستے ہوئے بولے۔

”میں شععی کے لئے آیا ہوں۔ وہ اپنے کمرے میں نہیں تھا، اس لئے میں نے آپ کو پریشان کیا۔“

”کیوں، اُداس ہو گیا تو؟“ چوہدری طالب علی ہنس دیئے اور کرسی کی طرف بڑھ گئے۔

”ظاہر ہے۔“ چوہدری شوکت علی بھی ہنس دیئے۔ ”کہاں ہے وہ؟“

”میرے پاس سویا ہوا ہے۔ جب سے تم نے جھڑکا، وہ روتا ہی رہا، پھر ضد کرنے لگا کہ میرے ساتھ سونے گا۔ تب میں اسے لے آئی۔“ سیکڑہ بیگم نے اپنے برابر سونے ہوئے شیب کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

چوہدری شوکت علی تیزی سے پلنگ کی طرف بڑھے، جہاں شیب علی، ماں کے پہلو میں شیل کی رضائی اوڑھے لیٹا تھا۔ چوہدری شوکت علی اس پر جھک گئے اور اس کی پیشانی سے بال ہٹا کر اسے چوم لیا۔

”شععی چاند!..... میری جان!..... پگلا، اپنے چاچا سے ناراض ہو گیا۔“ چوہدری شوکت علی نے اس کے گال چوم لئے، جہاں اب بھی آنسوؤں کے نشان تھے۔

”لالہ! پتہ ہے یہ مجھے سے کیا کہہ کر آیا تھا؟“ چوہدری شوکت علی نے شععی کے گال تپتپاتے ہوئے کہا۔

”کیا؟“ چوہدری طالب علی نے ان کی طرف دیکھا۔

”کہنے لگا۔“ چاچا! اب میں آپ سے ناراض ہو گیا ہوں، کبھی باپ نہیں کروں گا۔“

”تم دونوں ہی ایک سے ہو۔“ چوہدری طالب علی ہنسنے لگے۔ سیکڑہ بیگم بھی مسکرا دیں۔

”میں اسے جگا دوں، بھر جائی؟ اسے منالوں نا؟“ چوہدری شوکت علی بولے۔

”اب صبح منالینا۔“ سیکڑہ نے کہا۔

”سوسائے تو میں دنیا پور چلا جاؤں گا۔“



”کیوں؟..... زہرہ نے اجازت دے دی؟“ سیکینہ نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔  
 ”ہاں۔“ چودھری شوکت علی سر جھکا کر بولے۔  
 ”پھر کب آئے گا؟“ چودھری طالب علی نے پوچھا۔  
 ”گندم کی بوائی کے فوراً بعد۔“ وہ بولے۔

”پورے چھ ماہ نہ لگا کر آنا۔ ورنہ.....“ چودھری طالب علی کہتے کہتے رک گئے۔  
 ”ہاں، ورنہ وہ بیمار ہو جائے گی۔“ سیکینہ بیگم نے شوہر کا جملہ اچک لیا۔  
 ”لالہ! سارے ڈھکوسلے ہیں، اور کچھ نہیں۔ سچ، آپ لوگوں نے پھنسا دیا ہے مجھے۔“  
 چودھری شوکت علی نے بھائی سے شکوہ کیا۔  
 ”شوکی! یہ سب مقدر کے کھیل ہیں۔ نصیب کا لکھا ضرور پورا ہوتا ہے۔“ انہوں نے سمجھایا۔

”ہونہیں!..... نصیب اور مقدر صرف میرے لئے ہی رہ گئے تھے۔“ چودھری شوکت علی کے لہجے میں تلخی کھلی ہوئی تھی، جس سے ان کا حلق تک کڑوا ہو رہا تھا۔  
 ”شوکی! تیرا لالہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ سیکینہ نے شوہر کی حمایت کی۔  
 ”چھوڑ بھرجائی! کوئی اور بات کرو۔“ چودھری شوکت علی، چودھری طالب علی کے بار پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے۔

”سویرے چلے جاؤ گے اور زہرہ کو تنہا چھوڑ آئے ہو۔“  
 ”پھر وہی ذکر..... پوری ستائیس راتیں اس کچھار میں گزار آیا ہوں، جہاں کوئی حساس انسان سانس بھی نہیں لے سکتا۔ ہر وقت ماں کی طرح سر پر سوار رہتی ہے۔“ چودھری شوکت علی تلملا کر رہ گئے۔

”وہ تجھے بہت چاہتی ہے شوکی!“ سیکینہ بیگم نے کہا۔  
 ”یقیناً۔“ وہ تسخیر سے ہنس دیے۔ ”جیسی کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی، ڈانٹے ڈپٹنے کا۔ بس بھرجائی! رہنے دے۔ میں اس کے ساتھ رہتا ہوں، مجھے پتہ ہے وہ کسی عورت ہے۔“

”تُو اس سے لڑا کر، اسے ڈانٹا کر۔“ سیکینہ نے مشورہ دیا۔  
 ”بھرجائی! میں یہی سوچتا ہوں، مگر پتہ نہیں کیوں، جب میں اس کے سامنے جاتا ہوں تو یوں لگتا ہے، جیسے جو کچھ سوچا تھا، وہ بھک سے اڑ گیا ہے اور ذہن خالی خالی سا لگتا ہے۔ اب بتا، میں اس سے کیسے لڑوں؟ کیسے ڈانٹوں اسے؟ وہ تو اُلٹا بھی کر ڈانٹ دیتی ہے۔ ایک بات میں اچھی طرح جانتا ہوں، اگر وہ مجھ سے کہہ دے کہ شوکت! تم ساری رات کمرے کے ایک کونے میں، ایک ٹانگ پر کھڑے رہو تو میں کھڑا رہوں گا۔ پتہ نہیں، نہ

اس سے اتنا کیوں ڈرتا ہوں۔“ چودھری شوکت علی نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ان کی پیشانی پر سوچ اور فکر کی لکیریں نمودار ہو گئی تھیں۔  
 ”شوکی! کچھ بھی ہے، آخر وہ تمہاری بیوی ہے، تمہارا زندگی بھر کا ساتھ ہے اور تمہیں نباہ سکتی ہے۔“ چودھری طالب علی نے انہیں سمجھایا۔

”نہیں۔“ چودھری شوکت علی نے انہیں سمجھایا۔  
 ”تو سال سے نباہ تو کر رہا ہوں، اور کیا کر سکتا ہوں؟“ چودھری شوکت علی ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولے۔  
 ”بہت اچھا کر رہے ہو۔ اچھوں اور من پسند لوگوں سے تو سب نباہ کر لیتے ہیں، مگر تو جب ہے کہ جن سے نفرت ہو، ان سے بھی نباہ کیا جائے۔“ چودھری طالب علی نے ان کا کدھا تھپکتے ہوئے کہا۔

”لالہ! میں زہرہ سے نفرت نہیں کرتا۔ قسم خدا کی، ایسی بات نہیں ہے۔ اور نہ ہی میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ بس جس وقت وہ مجھے گودوں میں کھلانے کا طعنہ دیتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے میری بوٹی بوٹی ہوا میں تحلیل ہو گئی ہو۔ میرا بس نہیں چلتا کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ آخر میں مرد ہوں۔ آپ بتائیں، آپ کو سیکینہ بھرجائی یہ جملہ کہے تو آپ کی کیا حالت ہوگی؟“ چودھری شوکت علی نے چودھری طالب علی کی طرف دیکھا۔

”تیرا کہنا بھی درست ہے شوکی! مگر کیا کریں، یہ بزرگوں کے فیصلے ہیں۔ بابا نے خود تیری شادی کی تھی۔ اب کیا کریں؟“ بھائی کے دکھ پر چودھری طالب علی کا کلیجہ بھی شقی ہو گیا تھا۔ مگر وہ کیا کرتے، انہیں بھی تو اپنا خاندانی وقار عزیز تھا۔ وہی تو خاندان کے کرتا دھرتا تھے۔

”اچھا لالہ! میں چلوں، اب آپ آرام کریں۔“ چودھری شوکت علی کھڑے ہو گئے۔  
 ”سویرے ہی جائے گا نا؟“ چودھری طالب علی نے پوچھا۔  
 ”ابھی تین بجے ہیں، ایک گھنٹے بعد میں چلا جاؤں گا کیونکہ میں چاہتا ہوں، جلدی پہنچ جاؤں۔“ چودھری شوکت علی نے کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”ابھی تو بہت ٹھنڈ ہے۔ اور جیب میں تو اور زیادہ لگے گی۔“ سیکینہ نے کہا۔

”نہیں، میں نے اپنا انتظام کر لیا ہے۔“ چودھری شوکت علی نے ہنستے ہوئے کہا، پھر وہ شعیب علی کے پلنگ کے قریب آئے، اسے پیار کیا۔  
 ”اچھا لالہ! رت راکھا۔“

”رت راکھا۔“ چودھری طالب علی اور سیکینہ بیگم نے ایک ساتھ کہا اور پھر چودھری شوکت علی کمرے سے چلے گئے۔



جیب بڑی تیزی سے اپنے راستے پر دوڑ رہی تھی۔ سرد ہوائیں جسم کو کاٹنے لگی تھیں۔ چودھری شوکت علی کے ہاتھ ٹھنڈے سن ہو کر رہ گئے تھے۔ اسٹیز رنگ و ہیل پر ہانپنے کیسے انہوں نے ہاتھ رکھے ہوئے تھے کیونکہ انہوں نے سردی سے بچاؤ کا خاصا انتظام کر رکھا تھا۔ جرسی اور کوٹ پہن لیا تھا۔ کانوں کے گرد اچھی طرح مظفر لپیٹا تھا اور ہاتھوں میں دستانے بھی پہنے تھے۔ مگر سردی تھی کہ کہہ رہی تھی، بس میں ہی ہوں۔ لیکن مومو کی محبت کی گری انہیں جیب چلانے پر مجبور کر رہی تھی۔ پھر ہولے ہولے صبح کے آثار نظر آنے لگے۔ دُور سرسبز کھیتوں کے پار اُفتی پر لالی پھیلی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ آسمان نے سرخ رنگ کی چادر اوڑھ رکھی ہو۔ چودھری شوکت علی، اُفتی پر نظریں جمائے جیب ڈرائیو کرتے رہے۔ اپنوں سے ملنے کی خواہش میں دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔ مارے خوشی کے ان کے ہاتھ پکڑ کر رہ جاتے تھے۔ مومو کی معصوم قلقاریاں انہیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ بابا! بابا! کی صدائیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ تب ہی آسمان کا شہنشاہ ایک سرخ گولے کی شکل میں اُفتی مشرق پر نمودار ہوا۔ اُجالے کچھ اور بڑھ گئے، گھر چھٹنے لگی۔ چودھری شوکت علی نے دیکھا، کئی کسان کھیتوں میں ہل چلا رہے تھے۔

”اُف! یہ بھی تو ہیں، جو اس قدر سردی میں اُٹھتے ہیں۔ یہ جانور، جنہیں جوت کھیتوں میں لایا جاتا ہے، انہیں بھی تو ٹھنڈ لگتی ہوگی اور میں تو آج ہی نکلا ہوں۔ اس قدر ٹھنڈ میں تو تھکے چھوٹ گئے ہیں۔“ چودھری شوکت علی نے دُکھ سے بدچال مگر پھر انہوں نے تمام سوچوں سے اپنے ذہن کو ہٹا کر مومو کی طرف موڑ دیا۔ انہیں اب نوراًں سے زیادہ مومو یاد آتی تھی۔ یوں لگتا تھا، وہ اپنی چھوٹی چھوٹی بانہیں وا کئے انہیں بلا رہی ہو۔ خاصی دھوپ نکل آئی تھی، جب وہ دنیا پور کی حدود میں داخل ہوئے۔ کھیتوں میں رنگ برنگ چیزیاں نظر آ رہی تھیں۔ کچھ عورتیں مرچیں چن رہی تھیں اور کچھ سرسوں کے پیلے پھلے پھولوں میں گھری ساگ توڑنے میں مصروف تھیں۔ ہر کوئی اپنے کام میں مشغول تھا، کسی نے بھی ان کا طرف توجہ نہ دی۔ چند لمبے بعد وہ سرخ حویلی کے گیٹ میں سے جیب گزارے لئے جا رہے تھے۔

”مالک! بہت دن لگا دیئے۔“ دینو تیزی سے ان کے قریب آ گیا۔  
 ”ہاں یار! کیا کروں؟ تجھے تو پتہ ہے اس ثورت کا۔“ چودھری شوکت علی منہ ہانک کر بولے۔  
 ”یہ بتا، سب ٹھیک رہا؟“ انہوں نے نہایت رازداری سے پوچھا۔  
 ”بالکل ٹھیک مالک!“ دینو نے زور زور سے سر ہلایا۔  
 ”نوراًں اور مومو کہاں ہیں؟“ انہوں نے بے تابانی سے پوچھا۔  
 ”اپنے کمرے میں جی۔ مومو کو ابھی دے کر آیا ہوں۔“ دینو نے میرے پاس کھیل رہی

”دینو نے کہا۔“  
 ”اچھا۔“ چودھری شوکت علی اندر کی طرف بڑھ گئے، پھر برآمدے میں رک کر بولے۔  
 ”دینو! کھانے کا بندوبست کر، میں نے رات بھی کچھ نہیں کھایا۔“ اور دینو کا جواب سنے بخیر داند چلے گئے۔  
 اپنے کمرے کے قریب پہنچ کر ٹھٹک گئے، اندر سے مومو کے رونے کی آواز آرہی تھی، جس نے چودھری شوکت علی کا دل ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ وہ چائے ساٹن کا پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہو گئے۔ سامنے ہی نوراًں، مومو کو کندھے سے لگائے ہوئے چپ کرانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اسے چودھری شوکت علی کے آنے کا پتہ بھی نہ چلا۔  
 ”کیا موت آئی ہے تجھے، جو چپ نہیں ہو رہی؟“ نوراًں جھنجھلا کر بولی۔  
 ”لاؤ، مجھے دو۔“ چودھری شوکت علی اس کے قریب پہنچ گئے۔ اتنے قریب کہ نوراًں کا ہم ان کے بدن سے مس ہونے لگا۔ مومو اب بھی رو رہی تھی۔  
 ”کب آئے چودھری؟“ نوراًں نے ہولے سے کہا۔  
 ”آج..... بلکہ ابھی۔“ انہوں نے مومو کو اس سے لے لیا اور سینے سے لگا کر بھینچ لیا، بے تحاشا پیار کرنے لگے۔ ان کے تڑپتے مچھلتے دل کو ایک دم قرار آ گیا، وہ بہت سکون سا محسوس کر رہے تھے۔ مومو اب اور شدت سے رونے لگی۔ مومو کو بازوؤں میں لے کر انہیں اپنی ٹھکن کا احساس تک نہ رہا تھا۔

”نورا! کیا ہو گیا ہے اسے؟“ چودھری نے پریشانی سے پوچھا۔  
 ”معلوم نہیں۔“ نوراًں بے پردائی سے بولی۔

پھر چودھری شوکت علی، مومو کو لئے باہر آ گئے۔ وہ اُسے پہلانے کی ہر ممکن کوشش کرنے لگے اور نوراًں ہلتے ہوئے پردے کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔  
 ”ہوں..... تو چودھری! اتنے دنوں بعد تمہیں یہاں کا بھی خیال آ گیا۔ اور مجھے علم ہے کہ تمہاری دلچسپی مجھ سے تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ اب بھی تم صرف مومو کی وجہ سے آئے ہو۔ مگر میں نہیں چاہتی کہ اتنی جنونی محبت اتنی جلد ختم ہو جائے۔ پھر میں تم سے اپنے بابا کی موت کا بدلہ کس طرح لوں گی؟..... میں چاہتی ہوں، تم مجھ سے محبت کرتے رہو اور میں تم سے نفرت کرتی رہوں۔ اور جب دو مستوازی چیزیں آپس میں ٹکراتی ہیں تو یہ ٹکراؤ بڑا ہولناک ہوتا ہے۔ میں تمہیں اس ہولناک ٹکراؤ سے روشناس کرانا چاہتی ہوں۔“  
 اور پھر نوراًں کے خیالات کے موتیوں کی مالا ٹوٹ گئی۔ چودھری شوکت علی کمرے میں آ گئے تھے۔  
 ”مومو کہاں ہے؟“ نوراًں نے انہیں خالی ہاتھ آتے دیکھ کر پوچھا۔



”بھئی وہ تو دینو کے پاس جاتے ہی چپ ہو گئی ہے اس سے۔“ چودھری شوکت علی ہنستے ہوئے اس کے قریب آئے۔

”ہاں۔ دینو اُسے بہت چاہتا ہے۔“ نوران نے کہا۔

”نور.....!“ چودھری شوکت علی نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے، محبت سے پھور لہجے میں پکارا۔ ”تم نے مجھے یاد کیا تھا؟ میری کمی محسوس کی تھی؟“ انہوں نے نہایت بکھرے بکھرے لہجے میں پوچھا۔

”ہوں!“ نوران نے ہولے سے کہا۔

”اوہ، نور! مجھے یقین تھا۔“ انہوں نے نوران کو لپٹا لیا۔ نوران سٹ کر رہ گئی۔ چودھری شوکت علی کے جذبات میں ہلچل سی مچ گئی، دل کی دھڑکنیں بے ترتیب سی ہو گئیں۔ انہوں نے بے خود ہو کر نوران کا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اونچا کیا اور اس کے لب چوم لئے۔ ان کے دل میں نوران کے لئے پیار کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ نوران کے قرب نے ان کے رویں میں ایک سردی کیف کا احساس بھر دیا تھا۔ چودھری شوکت علی نے اس کا خوب صورت چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔ گلاب عارض، کانپتی سیاہ پلکیں، نازک لب۔ انہیں یوں لگا، جیسے نوران کے چہرے پر خود سپردگی کے تمام تر آثار موجود ہیں اور واقعی اس وقت ایسا ہی تھا۔ نوران انہیں اپنا دیوانہ بنائے رکھنا چاہتی تھی۔

”نور!“ انہوں نے گھیسر لہجے میں اُسے پکارا۔ نوران صرف پلکوں کی چلن اٹھا کر ان کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

”نور! تم دن اٹھائیں روز یوں گزارے ہیں، جیسے اٹھائیں صدیاں بیت گئیں۔“ انہوں نے دھیرے سے کہا۔

”سچ کہہ رہے ہیں؟“ نوران نے مسکرا کر پوچھا۔

”قسم لے لو۔“ چودھری شوکت علی جذبات سے بوجھل لہجے میں بولے۔ ان کی گرم گرم سانسوں سے نوران کے گال تپ اُٹھے۔

”پھر جلدی کیوں نہیں آئے؟“ آخر نوران نے عورتوں والی بات کر ہی دی۔

”زہرہ کی طبیعت خراب تھی۔“ وہ بولے۔

”اتنے دن تک؟“ نوران نے پوچھا۔ ”اب کیسی ہیں وہ؟“

”پرسوں اس کی طبیعت بہتر ہوئی ہے اور آج میں یہاں ہوں۔ یقین کرو کہ میں ان کے بستر پر سویا تک نہیں۔“ چودھری شوکت علی نے اپنی صفائی پیش کی۔

”کیوں؟“ نوران نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

”بس، دل نہیں چاہتا۔“ چودھری شوکت علی نے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھا۔

ہانے کیوں، نوران نے جھینپ کر نظریں جھکا لیں اور چودھری شوکت علی نے جذبات کی شرت سے مغلوب ہو کر اسے اپنی مضبوط بانہوں میں سمیٹ لیا اور پھر وہ دونوں ایک ساتھ ہی چوٹے۔

”مالک! مومو کو لے لیں یہ سو گئی ہے۔“ باہر سے دینو کی آواز آئی

نوران ایک دم چودھری کے پاس سے ہٹ گئی۔ چودھری شوکت علی نے کہا۔

”دینو! اندر ہی لے آؤ۔“ وہ نوران کو دیکھ کر مسکرائے جا رہے تھے، جو پلنگ پر دیوار کی طرف منہ کئے بیٹھی تھی۔

دینو اندر آ گیا اور مومو کو چاندی کے خوب صورت سے پنگھوڑے میں لٹا دیا۔

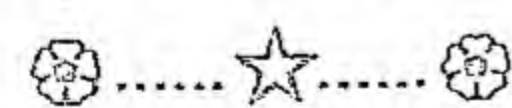
”مالک! میں نے پانی گرم کر دیا ہے، آپ نہا دھو لیں، پھر کھانا کھا لیجئے گا۔“ دینو نے کہا۔

”ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ مگر دینو! میری تو بھوک مر گئی۔“

”او کیوں جی؟“ دینو نے حیرت سے چودھری شوکت علی کی طرف دیکھا اور پھر اپنے سوال پر خود ہی شرمندہ ہو گیا۔ چودھری شوکت علی بڑی محبت پاش نظروں سے نوران کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نوران کی محبت کے لئے بے شمار جگنو جگمگا رہے تھے۔ دینو کو بے اختیار وہ دن یاد آ گیا، جب چودھری نے پہلی بار نوران کو دیکھا تھا اور تب بھی دینو نے ان سے کہا تھا۔ ”کھانا کھا لیں مالک!“ مگر انہوں نے کہا تھا۔ ”دینو! بھوک تو وہ لے گئی۔ اب بھوک نہیں ہے۔“ اور اب اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی ان کی محبت ویسی ہی تھی۔ وہ تو یہ کچھ بیٹھا تھا کہ چودھری کی محبت صرف دودھ کا اُبال ہے، مگر ایسا نہ تھا بلکہ دقت گزرنے کے ساتھ ان کی محبت میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا تھا۔

”تو کیا سوچ رہا ہے دینو؟“ چودھری شوکت علی کی آواز اُسے خیالات کے سمندر سے کھینچ لائی۔

”کچھ نہیں مالک!“ دینو گڑبڑا گیا اور جلدی سے کمرے سے نکل گیا اور چودھری شوکت علی ہنستے ہوئے، پنگھوڑے میں لیٹی ہوئی مومو پر جھک گئے۔



چودھری شوکت علی کا پورا دن نہایت مصروف گزرا۔ دینو کے ہمراہ انہوں نے کافی دور تک زمینوں کا معائنہ کیا۔ جب حویلی آئے تو چند لمحے بعد ہی نشی نواز بھی آ گیا۔ وہ چودھری شوکت علی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”چودھری جی! آپ آ گئے؟“

”ہاں..... مجھے بہت خوشی ہے کہ تُو نے مجھ سے آج دنیا پورا آنے کا کہا تھا اور تُو آج؟“



گیا۔ وعدے کا بہت پکا ہے ٹوٹتی! چودھری شوکت علی واقعی اس سے خوش تھے۔

”مہربانی آپ کی جو مجھ سے خوش ہیں۔“ نشی نوراز سر جھکا کر انکسار سے بولا۔

رات کو کھانے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک نشی کا حساب کتاب دیکھتے رہے۔ اور جب وہ اپنے کمرے میں آئے تو نوراز درتے چپے میں کھڑی شیشوں کے پار بچانے کیا دیکھ رہی تھی۔ وہ ہولے ہولے چلتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گئے اور اس کے سیاہ دراز بالوں کو ہاتھوں میں لے لیا۔ نوراز سونے سے پہلے اپنے بال کھول لیا کرتی تھی اور چودھری شوکت علی کو اس کے کھلے بال بہت اچھے لگتے تھے۔ نوراز ایک دم ہی پٹی۔

”نورا! انہوں نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے۔“ دیکھو، کتنے ٹھنڈے ہو رہے ہیں تمہارے ہاتھ۔“

”اب کیا کروں؟“ نوراز ایک دم ہی ہنس دی۔ چودھری شوکت علی کو یوں لگا، جیسے بے شمار چاندی کی گتھی گتھیاں بچ اٹھی ہوں۔ اس کی ہنسی میں بھی ایک عجیب سی شوخی اور دلربائی تھی اور چودھری شوکت علی اس کے دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔ وہ اس کی کمر میں بازو جمائل کر کے پٹنگ پر لے آئے۔ اس رات بھی نوراز، چودھری شوکت علی کی بانہوں میں سمٹ کر سوتے ہوئے گتھی ہی دیر تک چودھری سے انتقام کے منصوبے بناتی رہی۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا، جب نوراز کی آنکھ مومو کے رونے کی وجہ سے کھلی اور اسے ایک دم ہی چودھری شوکت علی کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ گتھی، کہیں ادھر ادھر ہوں گے۔ روتی ہوئی مومو کو اس نے اٹھایا اور پھر کندھے سے لگا کر اسے تھکنے لگی۔ چند لمحوں بعد مومو سو گئی۔ نوراز نے اُسے پگھوڑے میں لٹا دیا۔ کافی دیر گزر گئی تھی، چودھری شوکت علی اب تک نہیں لوٹے تھے اور اچانک ان کی نظر کھڑکی پر گئی۔ اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ نوراز کو اچھی طرح یاد تھا، اس نے خود کھڑکی بند کی تھی۔ پھر کس نے کھولی؟..... یہ خیال سوالیہ نشان کی طرح نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اچانک آہٹ ہوئی۔ نوراز کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا مارے خوف کے بُرا حال تھا۔ اس کے گلے سے چیخ بھی نہ نکل سکی اور اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئی۔ پھر کوئی گود کر اندر آیا۔ تب نوراز نے سکھر کی ایک طویل سانس لی۔ وہ چودھری شوکت علی تھے۔

چودھری شوکت علی نے ہولے سے اندر آ کر کھڑکی بند کی، پردے برابر کئے اور جب مڑے تو نوراز کو پٹنگ پر بیٹھا دیکھ کر گڑبڑائے۔ ان کی پیشانی پر اس ٹھنڈ میں بھی پسینہ گیا۔

”کہاں گئے تھے، چودھری؟“ نوراز اپنی گھبراہٹ اور خوف پر قابو پاتے ہوئے بولی۔  
”وہ..... وہ ذرا باغ میں گیا تھا“ چودھری شوکت علی اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے

”اس وقت؟“ نوراز نے پوچھا۔

”باغ میں کتے بھونک رہے تھے نا۔ میں نے سوچا، کہیں مومو ڈر نہ جائے، انہیں بھگانے گیا تھا۔“ چودھری شوکت علی ہولے ہولے چلتے ہوئے نوراز کے قریب ہی پٹنگ پر پہنچ گئے۔

”چلو، اب سو جاؤ۔ یہ کتے بھی رات کو پریشان کرتے ہیں۔“ چودھری شوکت علی پٹنگ پر لیٹ گئے اور رضائی اوڑھ لی۔ وہ چپ چاپ سو جانا چاہتے تھے۔ وہ نوراز کے سوالات کا جواب نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے سونے ہی میں عافیت جانی۔ ان کے قریب ہی لیٹی ہوئی نوراز سونے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے سوچے جا رہی تھی کہ اتنی رات گئے چودھری باہر کیوں گیا؟ ایسی کون سی بات تھی، جس نے اُسے اس ٹھنڈ میں گرم گرم بستر سے نکلنے پر مجبور کیا۔ کون سی بات ہے جو وہ مجھ سے چھپا رہا ہے؟..... نوراز جتنا سوچتی، ایک کے بعد دوسری گتھی اُلجھ کر رہ جاتی۔ اسے یقین تھا کہ چودھری نے کتوں کا تو بہانہ ہی کیا ہے، ورنہ حقیقت اس کے برعکس ہی ہے۔ ایک پھانس تھی، جو مسلسل دل میں کھلے جا رہی تھی۔ نوراز سوچتی رہی اور نہ جانے کب اُسے سوچتے سوچتے نیند آ گئی۔



پھر یکے بعد دیگرے ڈھیروں دن بیت گئے۔ لمحے سرکتے رہے، وقت بدلنا رہا، اپنے پردوں میں ہزاروں لوگوں کے آنسو، آہیں، آرزوئیں اور اُممکیں لئے وقت کا پرندہ اڑتا رہا۔ اور وقت تو ہوتا ہی گزرنے کے لئے ہے، بالکل نہیں دیکھتا کہ کتنے لوگ اس کی زد میں آ کر ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں، وقت کے بہتے سیلاب میں فنا ہو جاتے ہیں۔

چودھری شوکت علی نے اپنے سکون کی خاطر اپنا ایک خاص قسم کا ٹائم ٹیبل بنالیا تھا۔ وہ ایک ہفتہ دنیا پور میں اور تین چار روز حسن پور گزارتے۔ اس طرح انہیں بہت آرام تھا۔ زہرہ بیگم بھی پرسکون تھیں اور وہ خود بھی مطمئن تھیں۔

نوراز اب بھی رات کے پچھلے پہر اٹھتی تو دیکھتی کہ کبھی کبھی چودھری شوکت علی بستر سے غائب ہوتے مگر نوراز نے ایک دو بار کے بعد ان سے پوچھنا ترک کر دیا تھا۔ کیا فائدہ، وہ جھوٹ بولتے اور نوراز اپنے آپ کو پریشان کرتی رہتی۔ جب چودھری شوکت علی آتے تو وہ جاگتے ہوئے بھی سوتی بن جاتی اور چودھری شوکت علی چپ چاپ آ کر سو جاتے۔

مومو دو سال کی ہونے کو آئی تھی۔ سارا دن حویلی میں بھاگی پھرتی۔ چودھری شوکت علی اس کے ساتھ کھیلتے۔ دینو اور مائی خیراں کو بھی ساتھ لگا لیتے۔ کبھی آنکھ میچولی کیلی جاتی اور کبھی



باپ بیٹی ایک دوسرے کو پکڑنے کی کوشش میں آگے پیچھے بھاگتے۔ مومو بھی باپ سے ہاتھ مانوس تھی۔ نورائیں کی تو اسے بالکل پروا ہی نہ تھی۔ جب وہ چودھری شوکت علی کو ”بابا“ کہہ کر تو چودھری شوکت علی کا دل جھوم اٹھتا۔ روح کا ہر تار گنگناٹے لگتا اور ان کے من میں مومو سے جی کی صدا سنیں آتیں۔

تب چودھری شوکت علی کے لیے میں دنیا جہان کا پیارا اور شفقت اُڑا آئی اور وہ کہتے ”جی۔“ اور پھر اُسے گود میں اٹھا کر پوچھتے۔ ”مومو کس کا بیٹا ہے؟“

”بابا کا۔“ مومو ان کے کندھے سے سر ٹکا دیتی۔

”مومو کو بابا سے کتنا پیار ہے؟“ چودھری شوکت علی پوچھتے۔

مومو اپنے ننھے ننھے بازو پھیلا لیتی۔ ”اتنا۔“

پھر وہ دونوں ایک دوسرے کو چومنے لگتے، اتنا پیار کرتے کہ چودھری شوکت علی سوچتے پر سمجھور ہو جاتے۔ ”اتنا کی بیٹی نے باپ کو نہیں چاہا ہو گا۔ کوئی ہے، جو اس پیارے مثال دے اور نہ ہی کسی باپ نے اتنا بیٹی کو چاہا ہو گا۔“ چودھری شوکت علی اپنے سوال کا جواب بھی خود ہی دے دیتے۔

گر میوں کے دن تھے، سارا دن سورج سوائیز پر رہتا۔ اُو کے تھپڑے باہر نہ لگے دیتے۔ وہ سب دن بھر کمرے میں گھسے رہتے۔ شام کو جب تیش کم ہو جاتی تو باہر نکلتے۔ اس روز بھی سورج مغرب کی پناہ گاہوں میں چھپنے کی کوشش میں مصروف تھا، پورے آنگن میں چھڑکاؤ کر کے رنگین پاپوں والی بڑی بڑی چار پائیاں دیواروں کے سائے میں بچا دی گئی تھیں، ان پر خوب صورت چاندنیاں اور ساٹن کے خلاف والے بڑے بڑے گاؤ تکیے ٹرنے سے رکھے ہوئے تھے۔ چودھری شوکت علی، مومو کے پاس چار پائی پر آ بیٹھے۔ دینو نے وہ تازہ کر کے قریب ہی رکھ دیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں، چودھری شوکت علی اندر سے بے چین تھے۔ چھٹی جس بار بار کسی خطرے کا الارم بجا رہی تھی۔ مومو کی محسوس شراعتیں بھی ان کا دل بہلانے کے لئے ناکافی تھیں۔ مومو تکیے پر کڑھے ہوئے پھولوں سے کھیل رہی تھی اور چودھری شوکت علی حقہ گڑ گڑا رہے تھے۔ ان کی پیشانی پر فکر کی ڈھیروں لکیریں نمودار ہو گئی تھیں۔ سورج میں اتنے غلطان تھے کہ نورائیں کے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔

”کیا سوچ رہے ہو چودھری؟“ نورائیں ان کے سامنے والی چار پائی پر بیٹھتی ہوئی بولا۔

”آں..... کچھ نہیں۔“ انہوں نے بخیر اس کی طرف دیکھے کہا۔

”حسن پور یاد آ رہا ہے؟“ نورائیں نے شوخی سے کہا۔ تب انہوں نے نظر اٹھا کر نورائیں

دیکھا۔ وہ اس کا مطلب سمجھ گئے تھے۔

”اتنے چپ کیوں ہو؟“ نورائیں نے پوچھا۔

”جہیں فلفلی نہیں ہوتی ہے۔“ چودھری شوکت علی نے کہا۔

”ہو سکتا ہے۔“ نورائیں کندھے اچکا کر رہ گئی۔ پھر وہ مومو کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”چودھری! میں ذرا لالی کے ہاں ہو آؤں؟“

”او کیوں؟“ چودھری شوکت علی نے حقہ گڑ گڑاتے ہوئے کہا۔

”کئی روز سے نہیں گئی اور نہ ہی وہ آئی ہے۔“ نورائیں نے کہا۔ وہ سکندر کی وجہ سے پریشان تھی، روز لالی کا انتظار کر رہی تھی، مگر وہ نہ آئی۔

”ٹھیک ہے، چلی جاؤ۔ مگر ذرا جلدی آنا۔ دن چھپنے سے پہلے۔“ چودھری شوکت علی

اسے لالی کے ہاں جانے سے منع نہیں کرتے تھے۔

”میں جلدی آ جاؤں گی..... مومو تو یہیں کھیل رہی ہے۔“ نورائیں نے کہا۔

”ٹھیک ہے، اسے بھی تیری پروا نہیں ہے۔“ چودھری شوکت علی ہنس دینے اور نورائیں

بھی مسکرا دی۔ نورائیں کے جانے کے بعد انہوں نے دینو کو بلایا۔

”جی مالک!“

”مومو کا خیال رکھنا، میں ابھی آیا۔“ چودھری شوکت علی نے حقے کی نے ایک طرف

رکھے ہوئے کہا۔

”کہاں جا رہے ہیں مالک؟“ دینو نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”وہیں“ چودھری شوکت علی نے آنکھ کے اشارے سے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے جی۔ مگر اُجالے میں کوئی دیکھ نہ لے۔“ دینو نے خدشہ ظاہر کیا۔

”کوئی نہیں دیکھتا۔“ چودھری شوکت علی نے بے پروائی سے کہا۔

”بہتر جی۔“ دینو نے سر جھکا لیا۔ چودھری شوکت علی جانے لگے تو مومو بھی ساتھ

جانے کے لئے بچنے لگی مگر وہ اسے روتا چھوڑ کر حویلی کے آہنی گیٹ سے باہر چلے گئے۔

دینو نے بڑی مشکل سے اسے بہلایا، پھر وہ کھینے لگی اور دینو کام میں لگ گیا۔ ایک دم

یہ وہ مومو کے چھپنے پر بھاگا بھاگا آیا تو اس کے ہاتھوں کے طوطے ہی اڑ گئے۔ مومو نے

ثناید چار پائی سے دوسری چار پائی پر کودنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں نیچے آ رہی

تھی۔ نیچے پڑے حقے کی پیشانی کی صراحی اس کے سر پر لگی تھی اور خون بھل بھل پہنے لگا۔

”اُڑ خیراں! جلدی آ جا۔“ دینو نے مومو کو اٹھا لیا۔ جہاں سے خون بہہ رہا تھا، وہاں

باتھ رکھ دیا۔ اور وہ تھی کہ روئے چلی جا رہی تھی۔ خیراں بھی ہاتھ پر چھتی ہوئی آ گئی۔

”کیا ہے دینو؟“

”مومو کو پکڑ، میں مالک کو بلا لاؤں۔“ دینو نے مومو کو اس کے بازوؤں میں دیا۔

”نہ کا پورا ہاتھ خون سے بھر چکا تھا۔ وہ سرخ حویلی کے پچھواڑے آیا، جس سمت باغ تھا۔



دیوار کے قریب ہی ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی، جو صرف غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتی تھی۔ وہ کھڑکی کھول کر اندر داخل ہوا۔ یہ ایک تہہ خانہ تھا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ اسے پتہ نہ چودھری شوکت علی نہیں آئے ہیں۔

”مالک!..... مالک! جلدی چلیں۔ مومو کا سر پھٹ گیا ہے، خون بہہ رہا ہے۔“  
چچ چچ کر کہہ رہا تھا۔ تب ہی اندر ایک زوردار دھماکا ہوا، جیسے کوئی چیز گری ہو، پھر ہلکے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ دینو احتیاطاً دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

”کیا ہو گیا ہے دینو؟ کیسے پھٹا اس کا سر؟“ چودھری شوکت علی بے قراری اور تیزی سے باہر کی طرف آرہے تھے۔ پھر وہ اس چھوٹی سی کھڑکی سے باہر نکلے۔ ان کے پیچھے دینو بھی تھا۔ وہ تیزی سے سرخ حویلی کی طرف جارہے تھے اور دینو انہیں تفصیل بتا رہا تھا۔



رات کا ساٹا چار سو پھیلا ہوا تھا۔ قرب و جوار کے ندی نالوں اور کھیتوں سے میٹھکوں کے ترانے کی آوازیں سنائے میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔ جھینگروں کی جھانپیں جھانپیں اور گیدڑوں کی آوازیں رونگٹے کھڑے کر دینے کے لئے کافی تھیں۔ وہ دن چھپے سے اس جوار کے کھیت میں سہمے ہوئے پرندے کی مانند چھپا بیٹھا تھا۔ پیاس کی شدت سے اس کے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ کئی روز کی بھوک نے اس کا برا حال کر رکھا تھا اور اتنا چلنے سے اس کی رہی سہی توانائی بھی ضائع ہو گئی تھی۔ وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پا رہا تھا کہ چند ہی فرلانگ کے فاصلے پر پکی سڑک تک جاسکے۔ جبکہ اُسے بخوبی علم تھا کہ سڑک سے کوئی نہ کوئی سواری ضرور مل جائے گی، جو اسے یہاں سے بہت دور لے جائے گی۔ اس کی نشا بھی یہی تھی کہ جلد از جلد وہ دنیا پور کی حدود سے نکل جائے اور اسی میں اس کی بہتری تھی۔

اسے علم تھا کہ جیسے ہی چودھری شوکت علی کو اس کے فرار کی اطلاع ملے گی، وہ اپنے شکاری کتے اس کی تلاش میں دوڑا دے گا۔ چودھری شوکت علی کے کارندے اس کی تلاش میں زمین آسمان ایک کر دیں گے۔ وہ چاہتا تھا کہ چودھری شوکت علی سے اتنی دور چلا جائے، جہاں چودھری کے فرشتے بھی نہ پہنچ سکیں۔

وہ ہمت کر کے اٹھا، مگر چند قدم چلنے کے بعد ہی گر پڑا۔ اس کے گرنے سے جوار کے کتے ہی پودے ٹوٹ گئے اور ان پودوں کے ٹوٹنے سے کھیت میں ایک آواز سی پیدا ہوئی۔ اس نے بڑی حسرت سے آسمان کی طرف دیکھا، جہاں ڈھیروں تارے جگمگا رہے تھے۔ ابتدائی راتوں کا چاند اپنی مدھم سی چاندنی دنیا پر نچاؤ کر رہا تھا۔ اس کی ہمت جواب دے گئی تھی، پھر بھی اس نے اپنے ذہن کو بیدار رکھا اور آخری کوشش کے طور پر اپنی ہتھیلیاں زمین پر ٹکا کر اٹھا اور ہاتھوں سے جوار کے پودوں کے درمیان راہ بناتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ چند قدم چلنے کے بعد رک کر وہ اپنے چاروں طرف دیکھتا، سہمی سہمی اور خوف زدہ نظروں سے اطراف کا جائزہ لیتا اور کوئی آہٹ نہ پا کر آگے بڑھ جاتا۔ اب وہ ندی کے کنارے کیکر کے درخت سے ٹیک لگائے، پلکیں موندے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

”آف!..... میں تو تھک گیا۔“ وہ ہولے سے بڑبڑایا۔



”ارے ابھی سے تھک گئے؟ ابھی تو سفر کی ابتدا ہے۔ آگے کیسے بڑھو گے؟“  
 قریب ہی سے ایک سرکوشی ابھری تو اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے رگ و پھل میں خوف کی سردی ابرودھ گئی۔ مگر اس کے ارد گرد تو کوئی نہ تھا۔ یہ آواز تو اس کے دل کی آواز تھی۔ خود اس کے شعور نے اُسے ہمت دلانے کا بیڑا اٹھایا تھا اور وہ تھا کہ ابھی سے ہی جا رہا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ ندی پار کی اور پھر سڑک پر آ گیا، جس کا ایک ہر اتار کوڑا کی سڑک سے اور دوسرا دنیا پور کی سرخ حویلی کے آہنی گیٹ سے ملتا تھا۔ سڑک پر تیزی سے لاری گزری تو اس کے جسم میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ وہ سڑک سے صرف چند گز دور تھا۔

”جب میں سڑک تک پہنچ جاؤں گا تو پھر چودھری کی دسترس سے بہت دور چلا جاؤں گا۔“ اس نے سرشاری سے سوچا اور آزادی کے احساس سے بے خود ہو کر آگے بڑھا۔ اب اس کے قدم پہلے کی نسبت تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ وہ گڑھوں سے بچتا بچتا ہموار زمین پر کچی سڑک کے پچھوں بچے چلنے لگا اور اس وقت چونکا، جب بالکل اچانک اور ایک دم ہی کی گاڑی کی ہیڈ لائٹس اس پر پڑیں، تب ہی اس کا پاؤں پھسلا اور وہ گر پڑا۔

”آخر پکڑا ہی گیا۔“ اس نے دل میں سوچا اور پلکیں موند کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ گاڑی ایک جھٹکے سے اس کے قریب ہی رُک گئی۔

”ارے، میں اتنا ہلکا ہو گیا ہوں کہ یہ معمولی سا آدمی مجھے کسی پٹلے کی مانند اٹھائے ہوئے ہے۔“ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور ہنس دیا۔

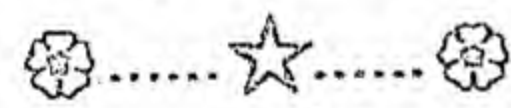
شرفو نے اُسے جیب کی چھچی سیٹ پر لٹا دیا اور خود بھی پاس ہی بیٹھ گیا۔

”شرفو! دیکھا، کسی نے گولی مار کر تو نہیں ڈال دیا؟ کہیں مصیبت میں نہ پھنس جائیں، ثواب نکاتے نکاتے۔“

”نہیں جی۔ کہیں بھی زخم کا کوئی نشان نہیں ہے۔ میں نے پہلے ہی اطمینان کر لیا تھا۔“

شرفو نے کہا۔

”چل، تُو کہتا ہے تو ٹھیک ہی ہو گا۔“ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شخص ہنس دیا اور جیب کو ریوس کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد جیب کی سڑک پر فرمائے بھرنے لگی۔



چودھری شوکت علی بہت بے قرار اور مضطرب تھے۔ مٹیاں بھینچتے اور غصے میں پیچ دتا ہوا کھا کر ہاتھ پر مکا مارتے ہوئے بیٹھک میں تیزی سے چکر لگا رہے تھے۔ ان کی بے قراری، ان کی ظاہری حالت سے بھی عیاں تھی۔

”اوہ..... یہ کیا ہو گیا؟“ وہ ٹہلٹہ ٹہلٹے تھک گئے تو کرسی پر بیٹھ کر انہوں نے اپنا چکر اتا ہوا سر تھام لیا۔ دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ یوں لگتا تھا، جیسے دماغ جھٹک سے اڑ جائے گا۔ سوچنے سمجھنے کی تمام تر صلاحیتیں مفقود ہو کر رہ گئی تھیں اور ان کی کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا۔ دیوار گیر گھڑی نے بارہ کا گھبر بجا دیا تو انہوں نے بڑی زخمی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ گھڑی کی ٹیک ٹیک ان کے دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

یہ مجھے وقت گزرنے کا احساس کیوں دلا رہی ہے؟..... میں چاہتا ہوں، دھڑکنے ختم ہوں، ہواؤں کی رفتار ختم ہو جائے اور دریاؤں کا بہاؤ رُک جائے۔ پھر یہ..... اس کی سوزناں آگے کیوں بڑھی جا رہی ہیں؟“ انہوں نے یہ سوچتے سوچتے حقے کی پیش کی چلم اٹھا کر زور سے گھڑی پر دے ماری۔ کمرے میں چند لمحوں کے ایک ایک زوردار چھٹکا ہوا اور

”کیا ہوا چودھری جی؟“

”شرفو! میرے خیال میں کوئی بندہ پڑا ہے یہاں۔ ذرا اتر کر دیکھا، کون ہے؟“

”اچھا جی۔“ شرفو نے جواب دیا۔

پھر گاڑی میں سے کوئی گودا، مگر وہ بے حس بنا لیٹا رہا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب تو میری قسمت میں موت ہی لکھی ہوئی ہے۔ پہلے تو مجھے چودھری شوکت علی کے مظالم بنے پڑیں گے اور بالآخر موت۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے قریب آیا اور اس کے پیچھے پر ہاتھ رکھ کر دھڑکن سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ پوچھی لیٹے لیٹے اس جگہ ہوئے شخص کی گردن دیوچ لے۔ مگر یہ سوچ کر اس نے ہاتھوں کو حرکت نہ دی کہ نامعلوم اس گاڑی میں اور کتنے آدمی ہوں۔ آخر میں کہاں تک بھوکا پیاسا ان لوگوں کا مقابلہ کر سکوں گا؟

”او شرفو! کون ہے؟“ ایک رعب دار آواز آئی۔ سڑک پر لیٹے شخص نے سوچا کہ یہ آواز چودھری شوکت علی کی تو نہیں ہے۔ پھر کون ہے یہ؟ اُسے یہ اجنبی آواز سن کر ایک گونا گون ہوا تھا۔

”چودھری جی! بندہ ہے کوئی۔ اور میرے خیال میں بے ہوش ہے۔ کیونکہ سانس تو آ جا رہی ہے۔“ شرفو نے زور سے جواب دیا۔

”اچھا، آ جاؤ۔ میں ہٹا کر جیب نکال لیتا ہوں۔“ چودھری نے کہا۔



پھر ماحول دوبارہ پرسکون ہو گیا۔ لیکن اب بھی چودھری شوکت علی کے دل کی بے قراری تھی۔

”مالک!“ دینو نے جیسے پرسکون پانی میں آواز کا پتھر پھینکا۔

”ہوں۔“ چودھری شوکت علی نے سرخ انکار جیسی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

”اب آپ آرام کریں جی۔“

”اُس کی کوئی خبر ملی؟“ چودھری شوکت علی نے پوچھا۔

”ل جائے گی۔ آپ بے فکر رہیں۔“

”بے فکر رہوں..... دینو! تُو نے مجھے کہیں کانٹیں رکھا۔ مجھے یوں لگ رہا ہے، جیسے میرے چاروں طرف آگ جل رہی ہے اور سرخ سرخ شعلے مجھے چاٹ رہے ہیں۔ دینو! تیری لاپرواہی نے مجھے یہ دن دکھایا ہے۔ میں اپنی ہی لگائی ہوئی آگ میں جھلسا جا رہا ہوں..... مجھے کوئی ایسی راہ نظر نہیں آتی کہ بچ کر نکل سکوں۔ صرف تیری وجہ سے یہ آگ میرے نصیب میں لکھی گئی ہے۔“ چودھری شوکت علی چیخ پڑے۔

”مالک! بھول ہو گئی..... مجھے خیال ہی نہ رہا۔“ دینو نے کہا۔

”اوئے مردود! تیری اس بھول نے میرے سارے کئے کرائے پر پانی پھیرا ہے..... تُو نے اور تیری اس بھول نے میرے جسم سے روح کھینچ لی ہے۔“ وہ شک خوردگی سے بولے۔

”میں سخت شرمندہ ہوں مالک! آپ آقا ہیں، کر دیں میرے ٹوٹے۔“ دینو نے کہا۔

”اگر تیرے ٹوٹے کرنے سے وہ میرے ہتھے چڑھ جاتا تو میں کب کا تیرے ٹوٹے کر چکا ہوتا۔ آخر وہ کہاں چلا گیا؟ اُسے زمین نکل گئی یا وہ آسمان پر چلا گیا ہے؟“

”مالک! میں نے بخشو اور تھو کو بھیج دیا ہے۔“

”کیا کہا.....؟“ چودھری نے حیرت سے دینو کو دیکھا۔

”جی مالک!..... اُس کی تلاش میں۔“

”دینو! یہ تُو نے کیا کیا؟“ چودھری شوکت علی نے جھپٹ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔

”تُو نے ان کو بھی لپٹا دیا؟“

”نہیں مالک! میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔“ دینو گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

”پھر تھو اور بخشو کو بھیجنے کا مقصد؟“

”میں نے تو انہیں صرف یہ کہا ہے کہ کھیتوں میں کوئی شخص چھپا ہوا ہو تو اُسے فوراً لائیں۔“ دینو نے کہا۔

”انہوں نے تجھ سے کچھ نہیں پوچھا؟“

”نہیں جی۔ میں نے کہا کہ یہ چودھری جی کا حکم ہے۔ پھر بھلا وہ کیوں پوچھتے؟“ دینو

”یہ تُو نے عقل مندری کا کام کیا ہے۔“ چودھری شوکت علی نے اس کا گریبان ایک جھٹکے سے چھوڑ دیا۔ دینو جھٹکا لگنے سے تھوڑا سا لڑکھڑایا، مگر پھر سنبھل گیا۔

”ابھی تک کوئی اطلاع نہیں آئی؟“

”نہیں مالک!“ دینو نے سر جھکا کر جواب دیا۔

”سن! نوراں نے تو کچھ نہیں پوچھا؟“ چودھری شوکت علی کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔

”پوچھا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ پٹواری اچانک آ رہا ہے اور کچھ حسابات درست نہیں ہیں۔ اس لئے چودھری جی کچھ پریشان ہیں۔ بس جی، وہ مطمئن ہو گئی۔“ دینو نے کہا۔

”شباباش!..... تیری عقل ایسے موقعوں پر بہت تیزی سے کام کرتی ہے۔“

”مہربانی ہے جی۔“ دینو انکسار سے بولا۔

”مومن کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

”ابھی تھوڑی دیر پہلے میں گیا تھا تو سوئی ہوئی تھیں، پھر میں نوراں کو بھی کہہ آیا کہ وہ سو جائے، آپ کا انتظار نہ کرے۔ کیونکہ حساب کرنا ہے ششی کے ساتھ مل کر، پٹواری کے آنے سے پہلے پہلے۔ اور جب میں باہر آیا تو اس نے درازہ بند کر لیا تھا۔“ دینو نے تفصیل بتائی۔

”ہوں۔“ چودھری شوکت علی نے ہنکارا بھرا، پھر بڑی گہری نظروں سے دینو کو دیکھنے لگے۔ ان کی نظریں جیسے اس کے دل میں اُتری جا رہی تھیں۔ وہ ان نظروں کی تاب نہ لا کر گڑبڑا گیا۔ اس نے محسوس کیا، جیسے وہ کچھ جاننا چاہتے ہوں، کچھ ٹٹولنا چاہتے ہوں۔

”دینو!“

”جی مالک؟“

”دینو! تُو میرا لازم ہی نہیں بلکہ بچپن کا یار بھی ہے۔ مانتا ہے نا؟“ انہوں نے اسے دیکھا۔

”جی.....“ دینو کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

”ایک بات سچ بتائے گا؟“

”مالک! میں نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اگر کوشش بھی کروں تو جھوٹ نہیں

”نہیں! میں نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ آپ جو چاہیں پوچھیں، میں حاضر ہوں۔“ دینو نے کہا۔

”دینو! تجھ پر مجھے بہت اعتماد ہے۔ اتنا اعتماد جتنا کہ انسان کو صرف اپنی ذات پر ہی

”ہوتا ہے۔ کوئی بھی بات میں تجھ سے نہیں چھپاتا۔ میں اپنے دل کا ہر راز تجھ سے کہہ دیتا



ہوں۔ لیکن میرے دل میں ایک پھانس سی کھٹک رہی ہے، تیری طرف سے۔ دماغ میں ہر ناگ پھن اٹھائے بیٹھا ہے، جو بار بار دس کر میرے اس خیال کو تقویت پہنچاتا ہے۔ چودھری شوکت علی رک گئے۔

”کیا خیال جی؟ آپ فوراً وہ سوال پوچھیں مالک!“ دینو بے قراری سے بولا۔  
چودھری شوکت علی نے دینو کو غور سے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ایسی تپش تھی کہ دینو اپنا آپ موم کی مانند پگھلتا ہوا محسوس ہوا۔ چودھری کی آنکھوں میں ایسے سوالات تھے، دینو ان کی زبان سے سنے بغیر ہی سمجھ گیا۔ وہ ان کے دماغ کے اس ناگ تک پہنچ گیا تھا، جو مسلسل انہیں دس رہا تھا وہ تو چودھری کی نس نس سے واقف تھا، پھر بھی اسے سہارا تھا کہ وہ کچھ سمجھ رہا ہے، شاید وہ نہ ہو۔ چودھری شوکت علی مسلسل دینو کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے اور دینو کسی زرد پتے کی مانند کانپ رہا تھا۔ وہ ان کی نظروں کی تپش برداشت نہ کر سکا اور دیر سے سر جھکا کر بولا۔

”مالک! آپ کچھ پوچھنا چاہ رہے تھے؟“

”ہاں..... میں یہ پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ کہیں تو نے مجھ سے غداری تو نہیں کی؟“  
چودھری شوکت علی کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے تو دینو کو یوں لگا، جیسے ہزار بار چھیاں ایک دم اس کے آہ پار ہو گئی ہوں۔

”مالک..... لک!“ دینو کی سرسراہٹ ہوئی آواز نکلی۔ یعنی جو میں نے سوچا، وہ سچ تھا۔ اُن چودھری شوکت علی! کاش تم نے یہ سوچا ہوتا کہ دینو تمہارے پاس اپنی تمام کشتیاں جلا کر آ رہے۔ اس کا باپ ساری زندگی چودھری سرفراز علی کی غلامی کرتا رہا اور غلاموں کی نسل کے حصے میں بھی غلامی آتی ہے۔ میں بھی ایک غلام کی اولاد تھا، جو آقا کی اولاد کا کارندہ بن گیا۔ آقا! تم نے یہ بات کیسے سوچ لی بھلا؟ نسل در نسل کے وفادار بھی غداری کر سکتے ہیں۔ ہمارے دلوں میں تو بچپن ہی سے آقاؤں سے وفاداری کا بیج بویا جاتا ہے اور جب ہم بڑے ہوتے ہیں تو وہ بیج ایک تناور درخت بن چکا ہوتا ہے جس پر پھل بھی وفاداری کا لگتا ہے۔ اور مالک! تم نے مجھے خدار سمجھا؟ کاش! تم بڑے لوگوں کے دل اپنی زمینوں کی طرح پتھر پلے نہ ہوتے۔ مگر زمینیں بھی تو بعض جگہوں پر بہت نرم ہوتی ہیں۔ ان پر پاؤں رکھنا اندر دھنکتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ایسی زمینیں تمہاری بھی ملکیت ہیں۔ لیکن تمہارے دل کی کوئی نرم گوشہ نہیں، ہر جگہ پتھر کے پہاڑ ہیں جہاں بھی تم کو کھرے کھوٹے کی تم پہچان نہیں کرتے۔ دینو خالی خالی نظروں سے چودھری شوکت علی کی طرف دیکھتے ہوئے یہ سب کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کا چہرہ زرد اور جذبات و احساسات سے بالکل ماری ہو چکا تھا۔ لیکن دل میں جذبات کا ٹھکانا نہیں مارتا سمندر موجزن تھا۔ چودھری شوکت علی اسے یوں اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

لے لے ٹک ٹک دیکھنا پا کر حیران رہ گئے۔  
”دینو! تو ہوش میں تو ہے؟“

”مالک! دینو تو ہمیشہ ہوش میں رہا ہے، آج ہی ہوش کھو بیٹھا ہے۔“ دینو کے لبوں سے نکلی گئی۔ سکیوں جیسی آواز نکلی۔

”میں نے تو تم سے ایسے ہی پوچھا تھا، دینو! تو تو پریشان ہو گیا ہے۔ جھلا نہ ہو تو۔“  
چودھری شوکت علی نے دینو کو شانوں سے تھام لیا۔ ”تجھے دکھ ہوا دینو؟“ انہوں نے نہایت مہذبیت سے پوچھا۔

”نہیں تو مالک!“ دینو ہنس دیا۔ مگر اس کے اندر کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ”دینو! سب کچھ کہہ دے، بول دے کہ چودھری! تمہاری بے اعتباری نے دینو کے دل کی گہرائیوں میں شر برپا کر دیا ہے، گوشت کا ننھا سا ٹوٹھڑا لہو لہو ہو گیا ہے..... اور اس کی تہہ میں ہونے والے شور نے دینو کی پوری ہستی کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ مگر وہ ہمیشہ کا غلام اپنے آقا کے سامنے کچھ نہ بول پایا۔ دل میں اٹھتی ہوئی درد کی ٹیسوں کو اندر نے اندر ہی اندر دبا لیا۔

”دیکھو دینو! یہ وقت ایسا ہے کہ میں خود پر بھی شک کر سکتا ہوں۔ تو ناراض نہ ہونا۔“  
چودھری شوکت علی نے دینو کو بالکل بچوں کی طرح پچکارا۔

”میں سمجھتا ہوں مالک!“ دینو نے لہجے کو خوشگوار بنانے کی بھرپور کوشش کی مگر بنا نہ سکا۔ بھلا اتنی بڑی بات سن کر وہ کیسے فوراً اپنے آپ میں آ سکتا تھا؟ اگر انسان برا ہو اور اسے برا کہا جائے تو اسے اتنا دکھ نہیں ہوتا، مگر اچھے انسان کو خواہ مخواہ برا کہہ دیا جائے تو وہ مرنے مارنے پر تل جاتا ہے۔ یہی حال دینو کا تھا۔ اگر چودھری شوکت علی کے علاوہ کوئی اور آدمی اس پر اس قسم کا شک کرتا تو وہ اس کی گردن توڑنے سے بھی دریغ نہ کرتا۔

”دینو! کچھ میں نہیں آتا، آخر وہ کہاں چلا گیا؟..... اگر وہ حسن پور پہنچ گیا نا، تو تو جانتا ہے، کیا ہو جائے گا۔ مجھ سے سب کچھ چھن جائے گا۔ سب کچھ چھن جائے گا۔ دینو! میں نے بہت مشکل سے یہ سب چیزیں پائی ہیں۔ یہ سکون و آرام، بیوی کا پیار، باپ کا رُحہ۔ کتنے سال میں تڑپتا رہا ہوں، تب یہ سب کچھ پایا ہے۔ زہرہ بیگم کے طلسم سے چند روز کے لئے تو آزاد رہتا ہوں۔ اگر میں اس کے پاس ہوتا ہوں تو آنے والے دنوں کے بارے میں سوچ کر خوش ہوتا رہتا ہوں کہ دنیا پور جاتے ہی میں اس جادو گرنی کے سحر سے آزاد ہو جاؤں گا۔ اور دینو! اب تو مجھے لگتا ہے۔ یہ سب کچھ مجھ سے چھن جائے گا۔ یہ آرام، یہ سکون..... نورال کی محبت..... مومو کی فلقاریاں..... میں ان سے محروم ہو جاؤں گا، میرا گھر اجڑ جائے گا۔“

”مالک! رب بھلائی کرے گا۔“ دینو نے کہا۔



”کیسے دینو؟..... کیسے؟ مجھے اس کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ اگر وہ لالہ طالب کے پاس گیا تو اس سرخ حویلی میں ایسی آندھیاں چلیں گی، جو سب کچھ اڑا کر لے جائیں گی۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ میں سرخ حویلی کے فٹے پر بیٹھ کر آنسو بہایا کروں گا۔ میں تصور میں وقت دیکھ رہا ہوں۔“ چودھری شوکت علی کے لہجے میں دُکھ ہی دُکھ تھا۔

”آپ ایسا تصور نہ کیا کریں۔ مالک! ایسا نہ سوچا کریں۔“

”اب سوائے ان سوچوں کے، اور میرے پاس ہے ہی کیا؟“ چودھری شوکت علی بے جان انداز میں ہنس دیئے۔

”یوں لگتا ہے، جیسے یہ گزرتے ہوئے لمحے میری خوشیوں کو سمیٹتے گزر رہے ہیں۔ گزرتے لمحے نہیں بلکہ پانی کا وہ ریلا ہے، جو میری خوشیوں کو خس و خاشاک کی مانند بہا کر لئے جا رہا ہے اور میں ایک ایک لمحے کو قید کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دینو! مجھے یہ نہیں پکڑے جا رہے یہ لمحے..... تو گزرتے وقت کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دے کہ یہ ٹھہر جائے۔“ نجیم نجیم چودھری شوکت علی، دینو کے کندھے پر سر رکھ کر بالکل بچوں کی مانند دیئے۔

دینو کا دل اپنے مالک کے دُکھ پر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گیا۔ آخر غریب کا دل جو تو اسی لئے تو چودھری شوکت علی جیسے پتھر دل انسان کے لئے لہو لہان ہوا جا رہا تھا۔ مگر آج تو پتھر بھی غریبوں کے دل کی طرح پھٹ پڑا تھا۔ سچ ہے، پتھروں میں سے ہی جتنے اُبلتے ہیں اور پتھر دی چودھری شوکت علی کی آنکھیں چشمہ بنی ہوئی تھیں..... نمکین اور کھارے پانی کا چشمہ۔

☆.....☆.....☆

”چودھری صاحب! اوہ بندہ ہوش میں آ گیا ہے جی۔“ شرفو نے انہیں اطلاع دی۔

”اچھا، اچھا..... تو نے اُس سے بات کی؟“

”جی نہیں مالک!“ شرفو بولا۔

”کیوں؟..... تو اس سے پوچھتا تو سہی کہ وہ کہاں رہتا ہے اور کہاں جانا چاہتا ہے؟ چلو اگر ہم ثواب کمانا چاہتے ہیں تو پورا کمائیں۔“ شرفو کا مالک ہنس کر بولا۔

”میں سمجھا نہیں۔“ شرفو نے حیرت سے کہا۔

”بھئی! اس کے ہاں باپ پریشان ہوں گے۔ گھر ہی چھوڑ آئیں۔“

”مجھے تو جی وہ دنیا پور ہی کا لگتا ہے۔“

”جو دنیا پور جانے والے راستے پر پڑا ہو، وہ وہیں کا ہو گا۔ تو بھی جھلا ہے شرفو!“

چودھری طالب علی ہنس دیئے۔

”جی آپ چل کر پوچھ لیں۔“

”ٹھیک ہے۔ ویسے وہ ٹھیک تو ہے؟“ چودھری نے پوچھا۔

”بالکل جی، ٹٹ فٹ ہے۔“ شرفو نے کہا۔

”تو نے اُسے بتایا تو نہیں کہ ہم کون ہیں؟“

”میری زیادہ بات نہیں ہوئی۔ بس میں نے اسے بتایا کہ ہم لوگ شکار سے آرہے تھے کہ تم سڑک پر پڑے ہوئے نظر آئے، میرا مالک تمہیں ہسپتال لے آیا۔ ڈاکٹروں نے فوراً توجہ دی اور مالک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ بس یہی بات بتائی ہے جی۔“ شرفو نے کہا۔

”اور ابھی تو کہہ رہا تھا، زیادہ بات نہیں ہوئی۔“ چودھری طالب علی نے ہنس کر کہا تو شرفو نے ہنسی نکال دی۔

☆.....☆.....☆

صبح چڑیوں کی چچھاہٹ سے نوراں کی آنکھ کھل گئی۔ پچھواڑے باغ میں درختوں پر چڑیاں خوب شور مچا کر صبح ہونے کا اعلان کر رہی تھیں۔

نوراں آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی اور چودھری شوکت علی کے پلنگ کی طرف دیکھا تو وہ خالی تھا۔

”کیا چودھری رات بھر نہیں آیا؟..... کہاں گیا؟..... کیا حساب کتاب اتنا تھا کہ پوری رات گزر گئی؟ یا پھر گھپلا بہت تھا؟“ نوراں کے ذہن نے ایک دم یہ سب کچھ سوچ ڈالا۔ پھر اس نے برابر بے سدھ پڑی ہوئی مومو کو دیکھا، جس کے سر پر زخم کی وجہ سے پٹی بندھی ہوئی تھی۔ زخم گہرا نہیں تھا، مگر خون بہت ضائع ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے اس کا شگفتہ چہرہ کلا کر رہ گیا تھا اور گالوں پر زردی سی چھائی ہوئی تھی۔ نوراں کے دل میں مامتا کی ایک لہر کی اٹھی۔ اس نے جھک کر مومو کے زرد زرد گال چوم لئے۔ مومو نے نیند میں کسمسا کر کدٹ بدل لی۔

نوراں ہاتھ منہ دھو کر باہر آ گئی۔

باورچی خانے میں کھٹ پٹ ہو رہی تھی، جس کا مطلب تھا کہ دینو ناشتہ تیار کر رہا ہے۔ نوراں بیٹھک کی طرف بڑھی۔ شگھائی کا پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئی تو کمرے کا نقشہ دیکھ کر وہ ٹھک گئی۔ یوں لگتا تھا، جیسے رات بھر کمرے میں کشتی ہوئی رہی ہو۔ زبردست تنگ ہوئی ہو۔

اور یہ سچ تھا۔ واقعی چودھری شوکت علی رات بھر لڑتے رہے تھے، خود سے..... اپنے جذبات سے۔ اور پھر بالآخر تھک ہار کر کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر سو گئے تھے۔

نوراں کمرے کے پتھروں پر کھڑی حیرت سے سب چیزوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔



وال کلاک کے شیشے کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ حقے کی چلم ایک کونے میں ٹھنڈی پڑی تھی، حقہ اوندھا پڑا تھا اور قالین پر اُپلوں کی راکھ بکھری ہوئی تھی۔ چودھری شوکت علی نے سدا سے پڑے تھے۔ ان کا لباس بے تحاشا مسلا ہوا، بال بکھرے ہوئے اور چہرے پر بیشانی کی لکیریں واضح طور پر نظر آ رہی تھیں۔ گریبان کھلا ہونے کے سبب وہ بالکل مجنوں لگ رہے تھے۔ نوران حیرت سے انہیں ٹک ٹک دیکھے گئی، پھر ایک دم گہرا کر انہیں جھنجھوڑ ڈالا۔

”چودھری!..... چودھری! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“

چودھری شوکت علی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے کسی خواب سے بیدار ہوئے ہوں۔ شب بیداری کی وجہ سے اُن کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں اور کچھ نیند کی وجہ سے وہ نوران کو دیکھنے لگے۔ نوران گہرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اُسے یوں لگ رہا تھا، چودھری کے چہرے پر آنکھیں نہ ہوں بلکہ دو دھکتے ہوئے انگارے رکھ دیئے گئے ہوں اور ان کی تپش سے نوران کو اپنا آپ جلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا جسم بید مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔

چودھری شوکت علی ہولے ہولے کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ نوران انہیں اُٹتے دیکھ کر پیچھے ہٹنے لگی۔ چودھری شوکت علی آگے بڑھ رہے تھے، اُن کی آنکھوں سے دشت ٹپک رہی تھی۔ ان کی جذبے لگائی آنکھیں آج ہر جذبے سے خالی نظر آ رہی تھیں۔ جن آنکھوں میں نوران کے لئے محبتوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہوتا تھا، آج نوران کو وہاں محبتوں کے طوفان کی بجائے خون کا سمندر نظر آ رہا تھا۔ مارے خوف کے نوران کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ چودھری شوکت علی زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر اس کی طرف بڑھ رہے تھے اور وہ پیچھے ہٹتی جا رہی تھی۔ آخر وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا لگی۔ چودھری شوکت علی اس کے قریب پہنچ گئے اور انہوں نے نہایت دیوانگی کے عالم میں اُسے شانوں سے تھام لیا۔ نوران کو یوں محسوس ہوا، جیسے ان کی انگلیاں اس کے گوشت میں دھنسی جا رہی ہیں۔ نوران کے منہ سے کھٹی کھٹی چیخ نکل گئی۔

”نورا! چودھری شوکت علی نے جذبات سے عاری لہجے میں اسے پکارا۔ نوران زخم خوردہ ہرئی کی مانند سہم کر انہیں دیکھنے لگی۔

”نورا!..... نورا! مجھے بتاؤ کہ تم مجھے چھوڑ کر چلی تو نہیں جاؤ گی نا؟..... بتاؤ۔“

چودھری شوکت علی نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ نوران کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ وہ کچھ بھی نہ بولی سکی۔ چودھری شوکت علی کی آنکھوں میں وحشت اور دیوانی نے اس کے دل کی تہوں میں شیر بچا دیا تھا۔

”تم جواب کیوں نہیں دیتیں؟..... کیا تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی، نورا؟“

”ناں!..... ناں!.....“ نوران کے لب کپکپائے۔

”چاہے کیا بھی وقت آجائے، تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گی نا؟“ چودھری شوکت علی نے بھیجی طرح پوچھا۔

نوران نے صرف سر کونٹھ کے انداز میں جنبش دینے پر اکتفا کیا۔ چودھری شوکت علی نے تباہی میزی سے خود سے لپٹا لیا۔

”نورا!..... نورا! اگر تُو چلی گئی تو خدا کی قسم! میں مر جاؤں گا۔ میں زندہ نہیں رہوں گا۔“

نوران نے بہت کچھ دیا ہے۔ خدا کی قسم! جس چیز کی بھی میں نے خواہش کی، وہ تُو نے مجھے دیا ہے۔ میری ازلی خواہش تُو نے پوری کی ہے۔ نورا! اب میری آخری خواہش بھی پوری کر دے۔ مجھے چھوڑ کر نہ جانا..... تُو میری ہے اور میری ہی رہنا۔ میں اگر اس حویلی میں اکیلا رہا تو گھٹ کر مر جاؤں گا، نورا!..... مجھے نہ چھوڑنا..... نہ چھوڑنا..... میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔“

چودھری شوکت علی بالکل محسوس بچے کی مانند اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ بالکل یوں، جیسے کسی بچے کو غلطی پر ماں سرزنش کرتی ہے تو وہ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگا ہے۔ اور چودھری شوکت علی بھی بالکل اُسی خطا دار بچے کی طرح کھڑے تھے۔

نوران کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ تجسس اور کچھ جاننے کی خواہش تھی۔ مگر کیا؟..... آخر چودھری کو پونے سات سال بعد کیسے خیال آیا کہ میں اسے چھوڑ کر چلی جاؤں گی؟ ایسا کیوں ہے؟ ایسے کون سے حالات پیدا ہو گئے تھے؟

”نورا! مجھے معاف کر دے نا۔“ چودھری شوکت علی کی آواز نوران کو خیالات کی یورش سے باہر گھسیٹ لائی۔

”کس بات کی معافی مانگ رہے ہو چودھری؟“ نوران نے ان کے بندھے ہوئے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔

”مجھے خود کچھ نہیں آ رہی کہ آخر میں ایسا کیوں کر رہا ہوں؟“ وہ دُکھ سے بولے۔

چودھری! نوران نے ان کے بندھے ہوئے ہاتھ تھام لئے۔ ”مجھے بتاؤ چودھری! کیا پریشانی ہے؟ دینو بتا رہا تھا کہ پٹواری آ رہا ہے۔ کیا بہت گڑبڑ ہے حساب میں؟“

”ناں!..... بہت گڑبڑ ہے حساب میں۔“ چودھری شوکت علی بڑبڑائے۔ ”میں کیسے ان سے بات کروں گا؟ کس طرح انہیں مطمئن کروں گا؟“

آپ پریشان مت ہوں، چودھری! خدا بھلا ہی کرے گا۔“ نوران نے انہیں دلاسا دیا۔



”وہ ٹھیک کہتا ہے۔“ نوراًں بولی۔

”مومو کی طبیعت کیسی ہے اب؟..... رات کو پریشان تو نہیں کیا؟“

”رات بھر آرام سے سوئی رہی، اب طبیعت ٹھیک ہے اس کی۔ مگر تم رات بالکل سوئے چودھری!“

”نیند نہیں آئی۔“

”آخر نیند کے اڑنے کی وجہ؟“ نوراًں نے اس سے پوچھا۔

چودھری شوکت علی نے رک کر نوراًں کے مسکراتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ کر نوراًں کی مسکراہٹ نے چودھری شوکت علی کے دل میں ڈھیروں شگوفے کھلا دیے، جن پر خوشبو سے ان کی روح معطر ہوئی جا رہی تھی اور وہ نوراًں کی اس حسین مسکراہٹ میں اپنا اپنے تمام دکھ اور پریشانیاں بھول گئے۔ ان کے بے قرار و مضطرب دل کو ایک دم ہی قرار گیا۔ وہ بڑی پر شوق نظروں سے نوراًں کے چہرے کو دیکھنے لگے۔ اپنی جانب نہیں دیکھا کر نوراًں نے گھبرا کر پلکوں کی چلمن گرا دی۔ وہ چودھری کے اس طرح دیکھنے پر ہنسنے لگا بڑا کر رہ جاتی تھی۔ اُسے یوں لگتا تھا، جیسے چودھری اُسے آنکھوں ہی آنکھوں میں پے کا ارادہ رکھتا ہو۔

”تم نے کچھ پوچھا تھا نور؟“ چودھری شوکت علی نے کہا۔

”تم نے جواب ہی نہیں دیا۔“ نوراًں بولی۔

”کیا پوچھا تھا؟“

”نیند کے اڑنے کی وجہ۔“

”میری نیندیں اڑانے والی صرف ایک شے ہے۔“ چودھری شوکت علی نوراًں کا ہنسا ہوا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اونچا کرتے اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے۔ ”جب سے جوانی کی حدود میں قدم رکھا، ایک ہی ہستی نے نیندیں لوٹی ہیں اور اب تو لوٹ رہی ہے وہ..... وہ تم ہو نور!“ چودھری شوکت علی نہایت گہمیں لہجے میں بولے ہوئے بول رہے تھے اور نوراًں سمجھتی جا رہی تھی۔ اور پھر نوراًں ایک دم ان کے قریب سے ہٹ گئی۔ چودھری قریب نے اس کے بدن میں شرارے سے بھر دیے تھے۔ کیونکہ نوراًں اس جگہ کھڑی تھی جہاں اس کے بابا نے دم توڑا تھا۔

”نور.....!“ چودھری شوکت علی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”ہوں۔“ نوراًں اپنے اندر اٹھتے ہوئے طوفانوں کو روکتے ہوئے بولی۔

”میں حسن پور جا رہا ہوں۔“

”کیوں؟“ نوراًں نے جذبات سے عاری لہجے میں پوچھا۔ آج اس نے پہلی بار...

”کہ چودھری شوکت علی! کیوں جا رہے ہو؟“

”نور! طالب سے کچھ کام ہے۔“

”تو پٹواری آج نہیں آ رہا؟“ نوراًں نے پوچھا۔

”نور! ہفتہ ہے اس کے آنے میں۔ بس آج شام تک واپس آ جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ نوراًں بولی۔

”تم ناراض تو نہیں؟“

”نہیں چودھری!“ نوراًں نے کہا اور تیزی سے باہر چلی گئی۔ اس کمرے میں اس کا دم گھٹا جا رہا تھا اور تصور میں اسے اپنے بابا کی لاش نظر آ رہی تھی۔ وہ بہت کم بیٹھک میں آئی تھی اور جب بھی آتی، چودھری کا تشدد اس کے دماغ میں گردش کرنے لگتا۔ اس کے زخموں کے ٹانگے اُدھڑ جاتے اور وہ لہو لہو دل لئے وہاں سے بھاگ نکلتی۔ مگر اب چودھری شوکت علی کی طرف سے اس کے دل میں ایک پھانس سی چھ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔

آخر اس کی حالت اتنی جنونی کیوں ہو گئی؟

چودھری کس بات کی مجھ سے معافی مانگ رہا تھا؟

کمرہ اتنا خراب کیوں تھا، جیسے کہ برسوں سے صفائی نہ ہوئی ہو؟

چودھری کی نیندیں کیوں اڑ گئیں؟

نوراًں سوچ سوچ کے پریشان ہوئی جا رہی تھی۔ خیالات کے دھاگے اس قدر اُلجھ گئے تھے کہ کوئی برا بھی ہاتھ نہ آ رہا تھا اور نوراًں بے چینی سے پورے کمرے میں گھول رہی تھی۔ اس کے ذہن سے یہ سوال چپک کر رہ گئے تھے کہ آخر چودھری نے مجھ سے معافی کیوں مانگی؟ اسے یہ خطرہ کیوں ہے کہ میں اسے چھوڑ جاؤں گی؟..... آخر ایسی کون سی افتاد آن پڑی ہے اُس پر؟..... تب ہی مومو کے رونے نے اُسے ان سوالات کی دلدل سے باہر نکال لیا۔ وہ تیزی سے پلنگ کی طرف بڑھی اور سوتی ہوئی مومو کو سینے سے لگا لیا۔





”آتا۔“ راجا خوشی سے چیخ پڑا۔  
 ”ہوں..... مگر کیوں میرے پاس آتا؟“  
 ”چودھری شوکت علی کی شکایت کرنے۔“ راجا نے کہا۔  
 ”کیسی شکایت؟..... یہی کہ وہ عورتوں کا رسیا ہے۔ اُس نے سرخ حویلی کو اپنی  
 عیاشیوں کا اڈا بنایا ہوا ہے؟“

راجا چپ رہا۔  
 ”یہی بتانا، تُو۔ مگر جھلے بادشاہ! مجھے یہ سب پتہ ہے۔ اُس نے مجھے بتایا ہوا ہے۔“  
 چودھری طالب علی نہایت فخر و غرور سے ہنس دیئے۔  
 ”یعنی سب کچھ؟“ راجا حیرت سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔  
 ”ہاں..... سب کچھ۔ بس یہ نہیں بتایا کہ اُس نے تجھے قید کر رکھا ہے۔ شاید تُو دنیا پور کا  
 بہت جگری جوان ہے۔ تُو اکڑ گیا ہو گا اور اُس نے تجھے سورج کی کرنوں کی گرمی اور چاندنی  
 کی کرنوں کی نرمی سے بچانے کے لئے بند کر دیا۔ ہے نا یہی بات؟“ انہوں نے کہا۔  
 ”ہاں جی۔“

”اُوئے نام کے راجے! یہ عمر ہوتی ہے ایسے دھندے کرنے کی۔ اگر رئیسوں کے  
 لڑکے ایسی حرکتیں نہ کریں تو کئی اور زمیندار کا فرق مٹ جاتا ہے۔ ذرا تُو کر کے دکھانا یہ  
 دھندے۔ بہت بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے، عیاشیاں کرنے کے لئے۔ سمجھا  
 تو؟“ چودھری طالب علی راجا کی طرف دیکھ کر تمسخر سے ہنستے ہوئے بولے۔  
 ایسے تو ہیں آمیز الفاظ سن کر راجا کا جوان خون غصے سے کھول اٹھا۔ اُس کے نتھنے  
 پڑنے لگے اور چہرہ اندرونی تپش سے سرخ ہو گیا۔ وہ دانتوں تلے ہونٹ چبا کر بولا۔  
 ”چودھری! تو پھر آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ اُس نے دنیا پور کے لوگوں پر کتنے ظلم  
 کئے ہیں؟“

”یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہر گاؤں کی ایک کہانی ہے اور دنیا پور کی کہانی بھی اس سے الگ  
 نہیں ہوگی۔“  
 ”مگر ایسی کہانی تم نے کبھی نہیں سنی ہوگی۔“ راجا بولا۔

”تُو جو اتنا دشمن بنا ہوا ہے، شوکی کا، بتا اُس نے کیا کیا ہے؟ جب تمہاری لڑکیاں شوکی  
 کی زمین پر رہتی ہیں، اسی کا دیا ہوا اناج کھاتی ہیں اور اگر وہ انہیں حویلی میں لے جاتا ہے  
 چودھری طالب علی کیوں کھینچتی ہے؟ اگر اتنے ہی غیرت مند ہو تو جنگلوں میں رہو۔“  
 ”ہاں بھی آپ کے شوکی جیسے بھیڑیے ہوتے ہیں..... ہم کہیں بھی محفوظ نہیں ہیں۔“

ہسپتال کے اسپیشل وارڈ میں وہ شخص بیڈ پر لیٹا تھا اور اس کے قریب  
 ہی شرفو اور اس کا مالک بیٹھا ہوا تھا۔ جب اس کی حالت مستحضر رہے بہتر ہوئی تو شرفو نے اُس  
 کے بارے میں چند سوالات کئے اور اس شخص نے شرفو اور اس کے مالک کو اپنے بارے میں  
 تھوڑی سی تفصیل بتادی تھی۔  
 ”ہوں..... تو تیرے کہنے کے مطابق، تُو دنیا پور کے چودھری شوکت علی کا مزارعہ  
 اور تیرا نام راجا ہے۔“

”جی چودھری صاحب! صرف نام کا راجا ہوں۔“  
 ”اور اُس نے تجھے ساڑھے چھ سال سے قید میں رکھا ہوا تھا۔ لیکن اب تُو کسی نہ کی  
 طرح وہاں سے بھاگ نکلا۔“  
 ”ہاں جی۔“ راجا نے جواب دیا۔

”تُو نے کون سا ایسا جرم کیا تھا، جو اُس نے تجھے قید کر دیا؟ آخر ایسی کون سی بات تھی  
 جس نے اُسے ایسا ظلم کرنے پر اکسایا؟“ چودھری نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔  
 ”عورت۔“ راجا نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

”کیا.....؟“ چودھری یوں اچھلے، جیسے کسی پچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ پھر وہ ایک  
 مطمئن ہو گئے کیونکہ شوکت علی نے انہیں اپنی عیاشیوں کے بارے میں مطلع کر دیا تھا۔  
 ”تجھے پتہ ہے، تُو کس کو یہ سب کچھ بتا رہا ہے؟“ وہ اٹھ کر راجا پر جھک گئے۔  
 راجا نے سر کو شقی جنبش دی مگر اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے صاف محسوس کئے  
 جاسکتے تھے۔

”میں آپ کو نہیں جانتا۔ پر اتنا ضرور جان گیا ہوں کہ آپ چودھری شوکت کو جانتے  
 ہیں۔“  
 ”میں شوکت کا بڑا بھائی ہوں۔ پھر کیوں نہ اُسے اچھی طرح جانوں گا۔“  
 ”یعنی آپ چودھری طالب ہیں؟ شکر ہے آپ مل گئے، میں تو آپ ہی کے پاس



”پھر جو ہوتا ہے، اسے مقرر کا لکھا سمجھ کر جھیلاؤ۔“ چودھری طالب علی بے پروائی بولے۔

”تو پھر آپ اسے مقرر کا لکھا سمجھ کر جھیلاؤ کہ چودھری شوکت علی، لڑکیوں کو حویلی پر لے جاتا، بلکہ اس نے ہمارے ہی گاؤں کے ایک فحشی اللہ دتہ کی دھڑی سے شادی کر لی ہے۔ راجا نے دھماکا کر دیا۔

”کیا.....؟“ چودھری طالب علی کرسی سے گویا اچھل پڑے۔

”اچھا، تو تیرے نشانے پر بیٹھا..... اس کا مطلب ہے، چودھری طالب علی کو شوکت علی کی شادی کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔“ راجا نے سوچا اور مسرت کی ایک لہری اس کے دھڑ میں سرایت کر گئی۔

”تو شوکت سے دشمنی کی وجہ سے جھوٹ تو نہیں بول رہا؟“ انہوں نے گھر کا۔

”جھوٹ میں نے نہیں بولا۔ اگر درمیان میں نورائیں نہ آتی تو شاید ہم دونوں میں کبھی دشمنی نہ ہوتی۔ وہ ہمیشہ ”چودھری“ ہی رہتا اور میں اُس کا کارندہ۔ دشمنی تو اس نے خود مول لی ہے۔“

”اس نے کب کی شادی؟“ چودھری طالب علی نے پوچھا۔

”جب دوڑے چودھری کے مرنے کے بعد پہلی مرتبہ وہ یہاں آیا تھا۔“

”نہیں..... یہ جھوٹ ہے..... میں نہیں مان سکتا۔ میں کئی بار سرخ حویلی جا چکا ہوں مجھے کوئی عورت نظر نہیں آئی۔“ چودھری طالب علی نے وثوق سے کہا۔

”چودھری! آپ کا بھائی بہت چالاک ہے۔ وہ نورائیں کو چھپا دیتا ہوگا۔ اب تو جی اس کی پٹی بچی ہے۔“ راجا نے گولی داغ دی۔

”دیکھ راجا! جھوٹ نہ بول۔“ چودھری طالب نے راجا کو تنبیہ کی۔

”مجھے جھوٹ بول کے نورائیں تو نہیں مل جائے گی، پھر سچ ہی کیوں نہ بولوں۔“ راجا بے پروائی سے بولا۔

”تجھے یقین ہے کہ اس نے نورائیں سے شادی کی ہے؟“ چودھری طالب علی نے پوچھا۔

”نورائیں دنیا پور کو پتہ ہے۔“

”تو مجھے ذرا تفصیل سے بتا۔“

”کیوں نہیں جی۔ ضرور۔“ راجا خوش ہو کر بولا۔ یہ تو اس کی دلی تمنا تھی۔

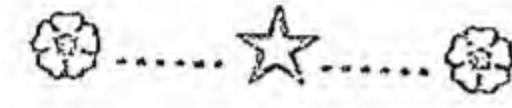
”تو پھر شروع ہو جا۔“

راجا کچھ دیر سوچتا رہا، جیسے ذہن میں واقعات ترتیب دے کر کڑیاں ملا رہا ہوتا کہ کوئی

نرئی رہ نہ جائے۔ ادھر چودھری طالب علی بے چینی سے اس کی آواز سننے کے منتظر تھے۔

”جلدی بول راجا!..... میں اس قدر انتظار کا عادی نہیں ہوں۔“

”جلدی جی! پہلے تو میں آپ کو نورائیں کے بارے میں بتاؤں گا۔ نورائیں میرے بچپن کی ساتھی ہے۔ ہم دونوں بچپن سے ہی ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے اور جوانی میں محبت دل کا روگ بن گئی۔ وہ بہت ہی سونہری ہے۔ آم کے پور کی مانند مہکتی، کچی کچنار کی طرح چمکتی ہوئی نورائیں میرے دل کی دھڑکن تھی۔ وہ میری منگ تھی جی۔ چودھری شوکت علی نے زبردستی اس سے شادی رچا لی۔ جب بڑے چودھری جی مرے تو میں ان دنوں تھے میں تھا کیونکہ انہی دنوں میری ماسی مر گئی تھی.....“ راجا دھیرے دھیرے بتاتا رہا اور چودھری طالب علی ایک ایک لفظ ذہن پر نقش کرتے رہے۔



کڑکتی دوپہر تھی اور نو کے تھپڑے جسم کو جھلسا رہے تھے، جب چودھری شوکت علی ”رنگ محل“ پہنچے۔ وہ بے دلی سے اپنی خواب گاہ کی جانب بڑھ گئے۔ پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئے تو زہرہ بیگم سامنے ہی موجود تھیں۔ شاید وہ ابھی نہائی تھیں اور سچکے تلے کھڑی بال سکھا رہی تھیں۔ زہرہ بیگم کو سامنے پا کر ان کا دل جھجھ سا گیا۔

”رک کیوں گئے شوکت؟“ زہرہ بیگم نے انہیں دروازے میں کھڑے دیکھ کر پوچھا۔

”آپ اجازت دیتیں تو آتا۔“ بے اختیار ان کے منہ سے یہ جملہ پھسل پڑا۔

مگر نہ جانے کیوں۔ زہرہ بیگم نے پلٹ کر کوئی جواب نہ دیا اور پلنگ پر پڑا ہوا دوپٹہ اٹھا کر اچھی طرح لپیٹ لیا۔

”آئیں..... اس بار بہت جلدی چکر لگایا۔“ زہرہ بیگم بولیں۔

”لالہ طالب سے کام تھا۔“ چودھری شوکت کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

”لالہ طالب سے؟..... مگر وہ تو دو روز سے شکار پر گئے ہیں اور یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ دہلی دنیا پور بھی جائیں گے۔“ زہرہ بیگم نے انکشاف کیا۔

”کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ شوکت علی ایک دم کھڑے ہو گئے۔ ان کا دل غمناک رسیدہ پتے کی مانند لرز رہا تھا۔

”تو کیا وہ آپ کے پاس نہیں گئے؟“

”اچھا تو میں چلوں۔“ چودھری شوکت علی کھڑے ہو گئے۔

”اتنی جلدی شوکت؟“

”ہاں، پٹواری کو آنا ہے نا۔ لالہ سے بہت اہم کام تھا۔ اگر لالہ وہیں پہنچ گئے تو وہیں



بات کر لوں گا۔“

”آپ تھکے ہوئے ہیں۔ کیوں فوری واپس جاتے ہیں؟ کچھ دیر آرام کر لیں۔ آپ وہاں نہ پا کر وہ سیدھے آئیں گے۔ دینو انہیں آپ کی یہاں آمد کے بارے میں بتائیں۔“

”نہیں..... میرا جانا بہت ضروری ہے زہرا!“ چودھری شوکت علی دروازے کی طرف بڑھے۔

”شوکت!“ زہرہ بیگم کی آواز میں قدرے رعب اور دھمکی تھی۔

چودھری شوکت علی کے بڑھے ہوئے قدم رک گئے اور دل اندر ہی اندر بیٹھنے لگا۔ انہوں نے مڑ کر نہایت خوف زدہ نظروں سے زہرہ بیگم کی طرف دیکھا۔

”آپ نہیں جانتیں گے شوکت؟“ زہرہ بیگم ہونٹ بجھجھک کر بولیں۔

”زہرہ! آپ سمجھیں نا۔ میرا جانا بے حد ضروری ہے۔ وہ پٹواری.....“

”جہنم میں گیا پٹواری۔ آخر میرے بھی کچھ حقوق ہیں، جنہیں آپ کبھی بھی پورا نہیں کرتے۔ بس ہر وقت آرام، کام..... آخر لالہ شجاعت اور لالہ طالب بھی تو ہیں جو گھر پر رہتے ہیں۔“ زہرہ چیخ پڑیں۔

”آپ سمجھیں نا۔“

”کیوں سمجھوں؟ کیا صرف آپ ہی کو جائیداد ملی ہے؟“

”زہرہ! میرے حسابات میں بہت گھپلا ہے۔“ انہوں نے سمجھانا چاہا۔

”تو کیوں کیا تھا؟“ زہرہ بیگم نے اُلٹا سوال کر دیا۔

”یہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ میرا جانا بے حد ضروری ہے۔“

”مگر شوکت!“

”زہرہ! میں نے کبھی آپ کا کہنا نہیں سنا ہے۔ چودھری شوکت علی نے آہستہ سے کہا۔

”ٹال بھی کیسے سکتے ہیں؟ آخر بڑی ہوں آپ سے۔“ زہرہ بیگم نہایت تسخیر سے بولیں۔

”چودھری شوکت علی ہمیشہ کی طرح ان کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔ انہیں زہرہ بیگم اس وقت ایسی ناگن نظر آرہی تھیں، جو ہر لمحے ان کی خوشیوں کو ڈس رہی ہو۔ چند منٹ تک

اپنی تکلیف دہ سناٹا چھایا رہا، پھر زہرہ بیگم آہستہ سے بولیں۔

”بہتر ہے شوکت! آپ جاسکتے ہیں۔ مگر ایک شرط پر۔“

”وہ کیا؟“ چودھری شوکت علی نے اظہار تشکر کے طور پر ان کے ہاتھ تھام لئے۔ یوں

لگ رہا تھا جیسے برف کی سل ایک دم دل پر سے ہٹ گئی ہو۔

”پٹواری کے جانے کے بعد آپ ہمیشہ کے لئے حسن پور آجائیں۔“

”مگر.....“ چودھری شوکت علی نے کہنا چاہا۔

”میں انکار سننے کی عادی نہیں ہوں۔ اب آپ چلے جائیں۔“ زہرہ بیگم فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

”بہتر زہرہ!..... بہت بہت شکریہ!“ چودھری شوکت علی نے زہرہ بیگم کے ہاتھ

ہونٹوں سے لگا لئے اور تیزی سے کمرے سے نکل گئے۔ اب ان کا واپسی کا سفر شروع ہو گیا تھا اور جیب دنیا پور کی طرف اڑی جا رہی تھی۔

☆.....☆

کمرے میں عجیب سا سکوت طاری تھا۔ چودھری طالب علی نہایت بے قراری سے ٹہل رہے تھے۔ راجا بستر پر دراز تھا اور شرفا اس کے قریب ہی اسٹول پر بیٹھا تھا۔

چودھری طالب علی بہت پریشان تھے۔ راجا کے انکشاف نے ان کے دل میں ایک

عجیب سی ہلچل مچا دی تھی، دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ یوں لگتا تھا، جیسے وہ بھک

سے اڑ جائے گا۔

”مجھے شوکی سے یہ اُمید نہیں تھی..... اس نے ہمیشہ مجھ سے جھوٹ بولا، مجھے بہلاتا رہا

اور میں ایسا بے وقوف کہ اُسے سمجھ نہ سکا۔ اتنے عرصے تک اس نے مجھ سے چھپایا۔“

چودھری طالب علی یہ سوچتے ہوئے ہاتھ مل رہے تھے۔ پھر ان کی آواز نے کمرے کا سکوت

توڑا۔

”جب تجھے شوکت نے کہا کہ دنیا پور چھوڑ کر چلے جاؤ تو تم کیوں نہیں گئے؟“ چودھری

طالب علی نے پوچھا۔

”میری بہن کی شادی تھی اور شادی کے بعد ماں نے مجھے جانے نہیں دیا۔“ راجا نے

جواب دیا۔

”تم نے ماں کو چودھری شوکت کے حکم کے بارے میں نہیں بتایا تھا؟“ شرفو نے پوچھا۔

”نہیں جی۔ مجھے ایک بار چودھری نے کہلوا دیا کہ میں چلا جاؤں مگر میں نہ گیا۔ پھر ایک

رات میں اپنے گھر کے کھلے صحن میں سویا ہوا تھا۔ جب آنکھ کھلی تو میں کال کوٹھری میں تھا اور

چودھری شوکت علی بھی قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے ہی مجھے بتایا کہ میں تاحیات اس تہہ

خانے میں بند رہوں گا۔ وہ مجھے کھلا رکھ کر کوئی مصیبت مول نہیں لینا چاہتا۔ لیکن اس نے مجھ

پر کوئی تشدد نہیں کیا۔ صبح و شام باقاعدگی سے دینو مجھے کھانا لاکر دیتا۔ میں نے کئی بار نکلنے کی

کوشش کی، مگر میری قسمت میں آزادی نہ تھی۔ اور پھر جب چودھری شوکت علی میرے پاس

آیا تو اتفاق سے اسی وقت دینو چیتا ہوا تہہ خانے میں آ گیا۔ اس نے غالباً اس کی لڑکی کے



رنجی ہونے کی اطلاع دی تھی اور چودھری اتنی بدحواسی میں گیا کہ ان دونوں کو میرا ہوش نہ رہا۔ مجھے یہ موقع غنیمت لگا اور میں وہاں سے بھاگ نکلا۔" راجا نے تمام تفصیل بتا کر چودھری طالب علی کی طرف دیکھا۔ "اور جی، اب آپ کے سامنے ہوں۔"

"تو اب بھی نوراں کو چاہتا ہے؟" چودھری طالب علی نے اس کی آنکھوں میں ہنسنے کی سوال کیا۔

"چودھری صاحب! ہم کئی لوگ اپنی محبتوں کو کبھی نہیں بھولتے۔ نوراں کا تصور ہر لمحے ہر ساعت میرے ساتھ رہا۔ میں اُسے بھی نہیں بھول پایا اور نہ کبھی بھول سکتا ہوں۔" راجا نے کہا۔

"اگر اب وہ تمہیں مل جائے تو کیا تم اسے قبول کر لو گے؟"

"یہ تو جی میری خوش قسمتی ہوگی، میری مصیبتوں کا انجام ہوگا کہ وہ مجھے مل جائے۔" راجا خوشی سے چیخ پڑا۔

"کیا تم اُسے اس کی بچی سمیت قبول کر لو گے؟" چودھری طالب علی نے راجا کے دھتے چہرے کی طرف دیکھا۔ راجا کے چہرے کی خوشی ایک دم ماند پڑ گئی۔ پیشانی پر سونوں کا جال بن گیا۔ اُس کا دل تو نوراں کے حصول کا سن کر مچلا جا رہا تھا اور آرزوئیں تڑپنے لگی تھیں، مگر بچی کے ذکر پر دل کی سیمائی کیفیت میں ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔

"تو نے کوئی جواب نہیں دیا، راجا؟"

"کیا چودھری بچی کو چھوڑ دے گا؟" راجا نے خدشہ ظاہر کیا۔

"ہاں..... اُسے بیوی اور بچی دونوں کو چھوڑنا ہوگا۔ اگر تم بچی سمیت نوراں کو قبول کر تو آج ہی نوراں تمہاری ہو جائے گی۔" چودھری طالب علی بولے۔

"مجھے منظور ہے۔" راجا بے دھڑک بولا۔

"مگر میری بھی ایک شرط ہے۔"

"وہ کیا؟" راجا نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"تم نوراں اور بچی کو لے کر دنیا پور سے چلے جاؤ گے۔"

"اوہ..... جی یہ تو میں کروں گا۔" راجا، چودھری طالب علی کی بات کاٹ کر بولا۔

"اگر شوکت بچی سے ملنے کی کوشش بھی کرے تو اُسے بالکل نہ ملے دینا۔ اول تو اُسے پتہ بھی نہ چلے کہ تو کہاں گیا ہے؟" چودھری طالب علی نے شرط کی وضاحت کی۔

"چودھری کی چودھری شوکت ازل سے مجھے چھوٹا پیارا سا ہے اور میں اس کی واحد اولاد ہوں۔ وہ اس کی تلاش میں تو زمین آسمان ایک کر دے گا۔ بھلا میں کہاں تک اس کی تلاش سے بچوں گا اور کہاں تک بھاگوں گا؟" راجا نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

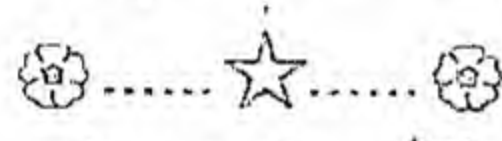
"بس، تجھے چھپنا پڑے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ کسیوں کا خون ہمارے لوگوں میں شامل ہو۔ آخر اب میں اس خاندان کا بڑا ہوں۔" چودھری طالب علی غرور سے بولے۔

"مگر آپ کے بھائی نے تو چاہا۔" راجا بولا۔

"وہ بے وقوف ہے اور اس کی سزا بھی اسے ملے گی۔" چودھری طالب علی نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ "خیر! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ اب فوراً دنیا پور چلنے کی تیاری کرو۔"

پھر وہ شرف کی طرف مڑ کر بولے۔

"شرف! میرا سامان ہوٹل سے اٹھا لا۔ ہم فوراً دنیا پور چائیں گے۔" چودھری طالب علی کچھ سوچتے ہوئے کرسی پر ڈھیر ہو گئے۔ انہیں ایسی امید نہ تھی کہ شوکت اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے اتنے اچھے کام اور اتنی ذلیل حرکتیں کرے گا۔ اُف! اگر زہرہ کو پتہ چل جائے تو وہ کیا سوچے گی؟ یہی سمجھے گی کہ مجھے سب علم تھا۔ حالانکہ خدا گواہ ہے، میں بھی اسی کی طرح ہر بات سے بے خبر ہوں۔ شوکی! تو نے یہ سب کچھ اچھا نہیں کیا۔ تو نے میرے اعتماد کے پرچے اڑا دیئے ہیں۔ تو نے میرا مان توڑا ہے۔ مجھے بہت دکھ ہوا ہے، شوکی! بہت دکھ۔" چودھری طالب علی خیالوں ہی خیالوں میں چودھری شوکت علی سے گلے شکوے کئے جا رہے تھے اور راجا ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ غور سے دیکھ رہا تھا۔



شام کا دھندلا پھیل چکا تھا۔ نیلے گگن پر کونجوں کی ڈار اپنی منزل کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ لالی دودھ دودھ رہی تھی کہ نوراں گھر میں داخل ہوئی۔

"کیا کر رہی ہے، لالی؟" نوراں نے پوچھا۔

"دیکھ لو۔" لالی بولی۔

"ہٹو، آج میں تمہاری بھینس کا دودھ دوھوں گی۔" نوراں نے کہا۔

"ہائے، نہیں نوری! چھوڑ۔"

تب ہی سکندر رونے لگا۔ وہ جب بھی نوراں کو دیکھتا، ہمکنے لگتا تھا اور جب وہ اس کی طرف توجہ نہ دیتی تو رونے لگتا۔ نوراں کے دل میں ممتا کا اُبال آیا اور ایک دم اُسے اپنی لپٹ میں لے لیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور نیچے بیٹھے، مٹی میں لت پت سکندر کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

"نوری! تیرے کپڑے خراب ہو جائیں گے۔ رہنے دے۔" لالی بولی۔

"آخر بیٹا تو میرا ہی ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے؟" نوراں ہنس دی۔

"نوری!" لالی خوف زدہ آواز میں ادھر ادھر دیکھ کر بولی کیونکہ نوراں نے کبھی سکندر کو ایسا نہیں کہا تھا۔



”یہاں تو کوئی بھی نہیں۔“ نوراں بولی۔

”نوری! دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“ لالی نے تنبیہ کی۔

”اچھا، ہوتے ہوں گے۔ چھوڑ۔“ نوراں بے پردائی سے بولی۔

”چودھری نہیں ہے گھر؟“ لالی گھڑوچی پر دودھ کا برتن رکھتے ہوئے بولی۔

”وہ آج حسن پور گیا ہے، لالہ کے پاس۔“ نوراں نے بتایا۔

”کیوں؟“ لالی نے پوچھا۔

”بھئی وہ لوگ گھیلے کرتے ہیں۔ سنا ہے، پٹواری آرہا ہے۔“

”کب تک آئے گا؟“ لالی نے پوچھا۔

”کہہ رہا تھا، شام کو واپس آ جاؤں گا۔“

”وہ بیوی چھوڑے گی اُسے؟“ لالی شوخی سے بولی۔

”کم بخت چھوڑ ہی دیتی ہے، تبھی تو آ جاتا ہے۔“ نوراں منہ بنا کر بولی۔

”نوری! سچ سچ بتا، جب چودھری حسن پور جاتا ہے تو کیا تجھے دکھ ہوتا ہے؟“

”مجھے خوشی ہوتی ہے کہ چلو، چند روز تو سکھ سے رہوں گی۔“

”واقعی تو اُداس نہیں ہوتی؟“

”لالی! اُداس تو اُس شخص کے لئے ہوا جاتا ہے، جس سے دل ملا ہوا ہو، جن کے دل

الگ الگ دھڑکتے ہوں، وہ بھلا خاک ایک دوسرے کے لئے اُداس ہوں گے؟“ نوراں

نے اطمینان سے جواب دیا۔

”نوری! اتنے برس ہو گئے، لیکن کیا اب بھی چودھری تیرے دل میں جگہ نہیں پاسکا؟“

لالی حیرت سے بولی

”نہیں۔“ نوراں نے صاف دلی سے اعتراف کیا۔ ”لالی! وہ میرے باپ کا، میری

جوانی کا قاتل ہے اور قاتلوں کے ساتھ رہتے ہوئے صدیاں بھی گزر جائیں تو بھی وہ دشمن

ہی رہتے ہیں، جن کبھی نہیں بن سکتے اور میں بھی اپنے دشمن سے انتقام لینے کے لئے وقت

کی منتظر ہوں۔ کیونکہ سو دن چور کے تو ایک دن سا ہو کار کا۔ یہ کہاوت تو نے بھی سنی ہو گی۔“

نوراں نے کہا۔

”ہاں..... یہ تو ہے، مگر مقدر سے لڑا بھی تو نہیں جاتا۔“ لالی نے اُسے سمجھایا۔

”میں لڑوں گی، مقدر سے۔“ نوراں ایک عزم سے بولی اور لالی اس کی طرف دیکھ کر

رہ گئی۔ پھر شیرا آ گیا تو انہوں نے باتوں کا موضوع بدل دیا۔ کچھ دیر بعد نوراں واپس چلی

آ گئی۔

رات نے دن کے اُجالے پر سیاہ چادر ڈال دی تھی اور راستے سنسان ہو چکے تھے، تب

سرخ حویلی کے آہنی گیٹ سے ایک جیب اندر داخل ہوئی۔ دینو آواز سن کر تیزی سے باہر آیا

وہ برآمدے ہی میں ٹھٹک گیا۔ اس کی اوپر کی سائس اوپر، نیچے کی نیچے رہ گئی۔ آنکھیں پٹی

کی پٹی رہ گئیں۔ وہ آگے بڑھ کر آنے والوں کی پذیرائی بھی نہ کر سکا۔

چودھری طالب علی آگے آگے تھے اور ان کے پیچھے پیچھے شرفو اور راجا تھے۔ وہی راجا،

جس کی خاطر انہوں نے دنیا پور کا چپہ چپہ چھان مارا تھا مگر وہ ہاتھ آنا تو کجا، نظر تک بھی نہ آیا

تھا اور اب وہی راجا، چودھری طالب علی کے ساتھ آ رہا تھا۔ دینو لمحے کے ہزارویں حصے میں

سب کچھ سمجھ گیا۔ راجا کا چودھری طالب علی کے ساتھ سرخ حویلی میں آنا اُسے ایک ایک

لمحے کی داستان بنا گیا۔

”دینو!“ چودھری طالب علی بالکل اس کے مقابل آ کھڑے ہوئے۔ اُن کا ایک پاؤں

یڑھی پر تھا اور دوسرا نیچے۔ وہ کڑے تیوروں سے دینو کو دیکھ رہے تھے۔

”دینو! ٹوشو کی کے ساتھ رہ کر سارے آداب بھول گیا ہے!“

”سلام مالک! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ.....“

”یہ کہہ کر راجا کو ساتھ لے کر آنے کا یقین نہیں آ رہا۔“ چودھری طالب علی نے اس کی

بات اُچک لی۔ ”تیرا چودھری کہاں ہے؟“

”وہ حسن پور گئے ہیں جی۔“

”کیوں؟“

”آپ کے پاس۔“

”راجا! تیرا خیال درست تھا۔ یعنی کہ اُسے بھی علم تھا کہ تُو سیدھا میرے پاس آئے گا۔“

چودھری طالب علی مُرد کر راجا سے مخاطب ہوئے۔

”بالکل ٹھیک۔“ راجا خوشی سے بولا۔

”اور تیری چودھرائی کہاں ہے؟“ انہوں نے دینو سے پوچھا۔

”وہ..... وہ جی.....“ دینو ہکا کر رہ گیا۔ اس اچانک سوال کی اُسے توقع نہ تھی۔

”دینو! غلط بیانی سے کام نہ لینا..... تجھے علم ہے کہ راجا میرے ساتھ ہے اور مجھے

ایک ایک بات کی خبر ہے۔“ چودھری طالب علی نے تنبیہ کی۔ ”یتا وہ کہاں ہے؟“ چودھری

طالب علی نے اُسے گھر کا۔

”جی..... اپنے کمرے میں ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں بیٹھک میں ہوں۔ تُو اُسے بھیج۔“ چودھری طالب علی آگے بڑھتے

پتے گئے۔ ان کے پیچھے دینو، شرفو اور راجا بھی چلے گئے۔



چودھری طالب علی بڑی سی رنگین کرسی پر بیٹھ گئے۔ دینو نے حقہ بھر کر رکھ دیا تھا۔ حقہ گر گزرتے ہوئے سوچ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں سوچوں کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ تب ہی کمرے میں پازیب کے ننھے ننھے ہنسنے والوں کی آواز ابھری اور پھر سکوت اور گیا۔

”مالک! نورائیں آگئی جی۔“ دینو نے اطلاع دی۔

”جہانچہروں کی آواز نے مجھے بیدار کیا ہے۔“ چودھری طالب علی دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولے، جہاں نورائیں کھڑی تھیں۔

سنہرے رنگ کے شلوار سوٹ میں قریب سے سر پر دوپٹہ جمائے وہ ایک ٹک راہا کی سمت دیکھ رہی تھی۔ راجا کو دیکھ کر اس کی آنکھوں کی چمک یوں بڑھ گئی تھی، جیسے اس کی آنکھوں میں قدریلیں جل اٹھیں ہوں۔ راجا کی حالت بھی اس سے مختلف نہ تھی، وہ بھی بہت کھڑا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں حال احوال پوچھتے جا رہے تھے۔ چودھری طالب علی نے نورائیں کی طرف دیکھا۔ واقعی، وہ بھی چاہے جانے کے قابل۔ مالک اور طرح داری، جس نے دوسروں کو اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا۔

”تمہیں شوکی نے چاہا تو اس کا کوئی قصور نہیں۔ قصور تو تمہاری جوانی اور تمہارے شرابی ٹیٹوں کا ہے۔ تم اتنے دُکھ درد سہنے، کلی سے پھول اور پھر ماں بننے کے باوجود اب بھی رن بھری ہو، لیکن جب تمہیں کسی مرد نے چھوا بھی نہیں تھا، تب تمہارا کیا حال ہوگا؟ شوکی انسان تھا، فرشتہ نہیں تھا کہ نہ بہکتا۔ تمہاری چھلکتی جوانی نے اس کے قدم لڑکھڑادیے۔“

چودھری طالب علی، نورائیں کی سمت دیکھتے ہوئے سوچے جا رہے تھے۔ ایک لمحے کے لئے انہیں خیال آیا کہ اگر شوکی کی جگہ میں خود ہوتا تو میرا بھی وہی حال ہوتا، جو اس کا ہوا اور جو چیز پسرا جائے، اسے پانے کے لئے جتنے بھی ظلم دشرد کئے جائیں، وہ سب جائز ہیں۔ شاید میں بھی یہی کرتا۔ پھر اس سوچ پر وہ ہنس دیے۔ بھلا یہ بھی کوئی وقت تھا، ایسی باتیں سوچنے کا؟ انہوں نے کھنکار کر نورائیں اور راجا کو بے خودی کے سمندر سے کھینچ نکالا۔ دونوں بھی چونک گئے۔

”نورائیں! یہ چودھری طالب علی ہیں۔“ دینو بولا۔

”سلام؟“ نورائیں نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر کہا۔

”وعلیکم السلام!..... تم اسے پہچانتی ہو؟“ چودھری طالب علی نے راجا کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں جی۔“ نورائیں بولی۔ وہ سوچنے لگی، بھلا اسے کبھی نہیں نہ جانوں گی، جس کی خوشی ہر دم میرے ارد گرد پھیلی رہتی ہے؟ میں جب بھی اکیلی ہوتی ہوں، یہ مجھ سے میرے خیالوں

بھلا میں اسے کیسے نہ پہچانوں گی؟

تب ہی چپ رکنے کی آواز سنائی دی اور دینو نے آنے والے لمحات سے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ شاید یہ منظر دیکھنے کی خود میں ہمت نہ رکھتا تھا، جو چند لمحے بعد اس کمرے میں رونما ہونے والا تھا اور اسے علم تھا کہ آنے والا سوائے چودھری شوکت علی کے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

چودھری شوکت علی، شگھائی کا پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئے تو پردہ تھامے تھامے ہی زلزل گئے۔ سامنے ہی وہ کافر ادا موجود تھی، جس کی خاطر انہیں آج یہ دن دیکھنا پڑا تھا۔ اُن کے پرسکون دلوں کے خزانے کی کنجی، جو لمحوں ہی میں اُن کے ہاتھ سے نکل گئی اور اُن کا سب کچھ غارت ہو گیا..... اور راجا..... اُن کے ہتھے بولتے دلوں کو ڈسنے والا ناگ..... وہ بھی تو سامنے ہی موجود تھا۔

چودھری طالب علی اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ چودھری شوکت علی کی سائیں اُلجھنے لگیں اور دماغ سائیں سائیں کرنے لگا!





آگاہ کر دیتی ہے۔ چودھری شوکت علی کے ذہن میں بھی تو سب سے پہلے یہی خیال آیا تھا کہ راجا کہیں حسن پور ہی نہ چلا جائے اور واقعی وہ ان سے پہلے چودھری طالب تک پہنچ گیا تھا۔ ان کی ساری دوڑ دھوپ رائیگاں گئی۔ یہی وجہ تھی کہ کئی روز سے دل کی دنیا میں آراستوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ کیونکہ اندر کا انسان آدمی کو پہلے ہی خوشی اور غم سے آشنا کر رہا ہے اور دل کی اداسیاں غموں کی نشاندہی کر جاتی ہیں۔

چودھری شوکت علی نے دروازے کے پٹ سے سر ہٹا کر کمرے میں ایک بار پھر چاروں طرف دیکھا۔ یہ خواب نہیں، حقیقت تھی۔ چودھری طالب علی، راجا، نوران اور دینو کمرے میں موجود تھے۔ ان کی نظریں سب سے پھسلتی ہوئی چودھری طالب علی پر ٹپک گئیں، جو سرخ سرخ آنکھوں سے انہی کی طرف دیکھ رہے تھے اور ان میں سوالوں کے شعلے لپک رہے تھے۔ مگر زبان خاموش تھی۔ انہوں نے نظریں چرا کر راجا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بازی جیت لینے کے غرور کی چمک تھی۔ جیسے کہہ رہا ہو۔

”دیکھا چودھری! خدا بڑا منصف ہے۔ آج وقت اور حالات کی ڈور میرے ہاتھ میں ہے۔ میں جو چاہوں گا، وہی ہو گا۔ میں بازی جیت چکا ہوں، تم ہار گئے ہو۔ تمہاری دولت بھی اس شکست کو جیت میں تبدیل نہیں کر سکتی۔ میں فاتح ہوں اور تم مفتوح۔ شکست کھانے والوں کے چہروں پر مردنی چھائی ہوتی ہے اور تمہاری آنکھیں ویران کھنڈروں کی طرح ہیں۔ چودھری شوکت علی کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر اس بات کا اعتراف کر لیں کہ راجا جیت چکا ہے اور وہ بازی ہار چکے ہیں۔ انہوں نے نوران کی طرف دیکھا، جو حیران و ششدران کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اُسے یہ تو پتہ چل گیا تھا کہ چودھری شوکت علی، چودھری طالب علی کو دیکھ کر گھبرا گئے ہیں۔ مگر ایسا بھی کیا ڈر۔ آخر میں اُن کی بیوی ہوں، ان کی بچی کی ماں ہوں۔ پھر انہیں کیا ہوا ہے؟ دروازے میں کیوں کھٹک کر رہ گئے ہیں؟..... آخر کیوں؟

کمرے میں ایک سکوت چھایا ہوا تھا۔ سب خاموش تھے، صرف آنکھیں بول رہی تھیں۔ حتیٰ کہ اپنے اپنے دلوں کے دھڑکنیں کی آوازیں بھی ان کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ پھر اس سکوت کو چودھری طالب علی کی بارعب اور گرج دار آواز نے توڑا۔

”آؤ، آؤ چودھری شوکت علی! رک کیوں گئے؟“ انہوں نے مسکراتے ہوئے نہایت طنز سے پوچھا۔

بھائی کے طنز نے چودھری شوکت علی کے زخمی دل کو مزید چھلنی کر دیا۔ انہیں یوں لگا، جیسے کسی نے گرم گرم انگارے ان کے کانوں میں بھر دیئے ہوں، جن کی تپش حلق سے ہوتی ہوئی پورے جسم میں پھیل گئی ہو۔

”لالہ.....!“ چودھری شوکت علی کے لب کپکپا کر رہ گئے۔

چودھری شوکت علی کے دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے۔ ذہن میں گولے اٹھ رہے تھے۔ دل میں ہلچل مچی ہوئی تھی اور وہ سوچ رہے تھے کہ آخر وہ لمحہ آن ہی پہنچا..... وہ قاتل و سفاک لمحہ، جس سے اب تک بچتا آیا تھا، جس کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی میری روح تک کانپ رہی تھی۔ میں تو اس لمحے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا..... کیونکہ مجھے یہ علم تھا، جب کبھی ایسا وقت آئے گا تو میرا سب کچھ چھن جائے گا۔ اور میں چاہتا تھا کہ یہ وقت کبھی نہ آئے۔ کتنے منصوبے تھے ذہن میں کہ اگر لالہ کو پتہ چل گیا تو کس طرح نمٹوں گا، کیا کچھ کہوں گا۔ مگر راجا کی اس وقت یہاں موجودگی نے تمام منصوبوں پر ایک دم پانی پھیر دیا ہے۔ کاش! یہ نہ ہوتا، تب میں لالہ کو سمجھا لیتا۔ لیکن اب تو اس نے لالہ کو میرے تمام کارناموں سے آگاہ کر دیا ہو گا۔ نوران کو بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں نے راجا کے ساتھ کیسا سلوک کیا ہے..... وہ کتنی مشکل سے میری طرف مانتت ہوئی تھی، کس قدر وقت سے میں نے اس کے دل میں جگہ بنائی تھی۔ اب راجا کی موجودگی سے اس کی نفرت پھر جاگ گئی ہو گی۔ کیونکہ محبت کرنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ مگر نفرت چند لمحوں میں برسوں کے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ اُف! میں کیا کروں؟ مجھ سے تو سب کچھ چھن جائے گا۔

انہوں نے تڑپ کر دروازے کے پٹ سے سر ٹیک دیا۔ اس سے اُن کا جی چاہ رہا تھا کہ سوالات کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں کیونکہ چودھری طالب علی کی نگاہوں میں انہوں نے ہزاروں سوالات چھلنے دیکھے تھے اور انہیں علم تھا کہ وہ تیروں کی طرح ان کی بو چھاڑ کر دیں گے، جیسی تو وہ زمین پھٹنے کی دعا میں مانگ رہے تھے۔ مگر وہ کوئی سستی تو تھے نہیں کہ اُن کی خاطر زمین پھٹ جاتی..... زمین جی سچے عاشقوں کے لئے پھٹتی ہے۔

”سچا عاشق تو میں بھی ہوں۔“ دل نے دہائی دی۔ ہر عاشق سچا ہوتا ہے اور راجا بھی تو سچا عاشق ہے، تبھی تو یہاں موجود ہے۔

ان کے دل و دماغ میں سرد جنگ جاری تھی۔ چٹھی جس انسان کو ہمیشہ ایسے خطرہ



”تم سب جاؤ، مجھے تمہارے چودھری سے بات کرنا ہے۔“ چودھری طالب علی نے چودھری شوکت علی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، ہاتھ کے اشارے سے سب کو باہر جانے کا حکم دیا اور وہ تو جسے کسی اشارے کے منتظر تھے۔ راجا اور دیو کمرے سے نکل گئے۔ نورال چند ثانیوں کے لئے کھلی، سوالیہ نظروں سے اُجڑے اُجڑے اور تھکے تھکے سے چودھری شوکت علی کی طرف دیکھا اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔

چودھری طالب علی ہولے ہولے چلتے ہوئے ان کے قریب آگئے۔

”اس طرح کب تک کھڑے رہو گے؟“ ایک دم ہی ان کے لہجے میں نرمی آگئی۔ ”آؤ!“ انہوں نے چودھری شوکت علی کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور سینے سے چمٹاتے ہوئے واپس پلٹے۔ وہ کسی روپوٹ کی طرح چودھری طالب علی سے چپے ہوئے آگے بڑھے۔ اس سے چودھری شوکت علی کا جی چاہ رہا تھا کہ بھائی کے سینے سے لگ کر ہٹوٹ ہٹوٹ کر روئیں، اپنی گستاخیوں اور نافرمانیوں کی معافی مانگیں اور کہیں، مجھے صرف نورال چاہئے..... لالہ! تم سب کچھ لے لو، مجھے میری بیوی اور بچی دے دو۔ مگر وہ کچھ نہ کہہ پائے۔ یوں لگتا تھا کہ زبان نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔

”یہاں بیٹھ۔“ چودھری طالب علی نے انہیں بڑی رنگین کرسی پر بٹھا دیا۔ چودھری شوکت علی، گم صم سے بھائی کو دیکھنے لگے۔ ان کی نظروں میں کئی حسرتیں سنگ رہی تھیں اور کتنی ہی آشاؤں کی چٹائیں روشن تھیں۔ ایک لمحے کو چودھری طالب کا دل دکھ سا گیا۔ ”سوچنے لگے۔“ یہ کھلنڈ راہا شوکی، جو مجھے بچوں کی طرح پیارا ہے، یہ کتنا سگوار اور اجڑا اجڑا سا ہے۔“ ان کی نظریں مسلسل شوکت علی پر ہی تھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ شوکی کی آنکھوں میں یاس کے دیے ٹٹھا رہے ہیں، چہرے پر اکتاس کے پھولوں کی سی زردی چھائی ہوئی ہے۔ خاموشی کے زہر میں ڈوبے ہوئے لمحے، ہولے ہولے سرک رہے تھے اور چودھری طالب علی کے دل میں جو نرم گوشہ چند لمحوں کے لئے پیدا ہوا تھا، وہ پھر پتھر کی مانند سخت ہو گیا۔ انہیں شوکت کی نافرمانیاں اور جھوٹ یاد آ گئے۔ حالانکہ انہوں نے کتنی بار شوکت علی کو تنبیہ کی تھی کہ وہ یہ کبھی برداشت نہ کر سکیں گے کہ ان کے اعلیٰ خون میں کئیوں کا خون شامل ہو اور وہ شوکت علی کے اس جرم کو کبھی معاف نہیں کر سکیں گے۔

”تمہیں یہ اُمید تو نہ ہوگی چودھری! کہ میں یہاں موجود ہوں گا۔“ انہوں نے ان کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ان کے لہجے میں تلوار کی کاٹ تھی۔ چودھری شوکت علی کو یوں لگا، جیسے بے بعد دیگرے کئی نثر ان کے وجود کے آہ پار ہو گئے ہوں۔ پھر بھی انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا کہ انہیں یہ اُمید نہیں تھی۔

”اوہ.....“ چودھری طالب علی کے ہونٹ سکڑ کر رہ گئے۔ چند لمحے وہ شوکت علی کو

تولنے والی نظروں سے تکتے رہے، پھر بولے۔

”دیکھ شوکت! میں لاگ لپیٹ کا عادی نہیں ہوں۔ مجھے راجا نے سب کچھ بتا دیا ہے اور اب میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ کیونکہ راجا کو دیکھ کر تیرا گھبرانا اور خوف زدہ ہو جانا اثبات کا ثبوت ہے کہ اس نے مجھے جو کچھ بتایا ہے، وہ رتی برابر غلط نہیں ہے۔“

”تو اب آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“ شوکت علی نے بڑی ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

”صرف یہ کہ تُو غلط بیانی سے کام کیوں لیتا رہا؟ تُو نے یہ سب کچھ کیوں چھپایا؟ اگر تُو مجھے شروع میں بتا دیتا تو میں تجھے سنبھال لیتا، اب تیری بچی بھی ہو گئی ہے، مگر.....“

”مگر کیا؟“ چودھری شوکت علی نے ان کی بات کاٹ دی۔

”مگر اسے وہ مقام نہیں مل سکتا، جو رنگ محل میں ہمارے بچوں کو حاصل ہے۔“

”مگر وہ میری بیٹی ہے۔“ چودھری شوکت علی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”تیرے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ تیری بیٹی ہے؟“ چودھری طالب علی نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“ چودھری شوکت علی کی شریانوں میں دوڑتا ہوا خون منجمد ہو گیا۔ ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ نورال، راجا سے ملتی رہی ہو۔“ انہوں نے آہستگی سے کہا۔

”لالہ.....!“ چودھری شوکت علی کو یوں لگا، جیسے طالب علی نے انہیں نامردی کا لفعہ دے دیا ہو۔

”جوش سے نہیں، ہوش سے کام لے شوکت!“ انہوں نے دلاسا دیا۔

”میں ہوش ہی میں ہوں، لالہ! شادی کے ابتدائی دنوں سے لے کر کل شام تک راجا میری قید میں تھا اور مومو میری ہی بیٹی ہے۔“ چودھری شوکت علی مضبوط لہجے میں بولے۔

”تجھے معلوم ہے کہ اب میں خاندان کا سربراہ ہوں اور خاندان کے فیصلے کرنے کا مختار ہوں۔ شوکت! میں نے تجھ پر اعتبار کیا اور تُو نے میرے اعتماد کو بخش پہنچائی۔ تُو مجرم ہے شوکت! اور تجھے اس کی سزا بھی ملے گی۔ تُو نے ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی رچا لی اور ہمارے خاندان میں بھی ایسا نہیں ہوا۔“ چودھری طالب علی کرسی سے اٹھ کر کمرے میں ٹھہرنے لگے۔

”یہ کوئی ایسا جرم تو نہیں ہے جو قابل سزا ہو۔“ چودھری شوکت علی نے کہا۔ انہوں نے سوچا لیا تھا کہ جو کچھ ہونا ہے، ہو جائے وہ بھی اپنے حق کی خاطر آخری وقت تک لڑیں گے، ان کے نہیں کیونکہ دینے والوں کو دنیا اور دہائی ہے۔ اسی لئے اب وہ ہر بات کا جواب سنا رہے تھے اور خود بھی سوال کر رہے تھے۔



”یہ جرم ہے شوکت! تو دنیا پور کا مالک کیا بنا کہ خود کو خاندان کا بڑا سمجھنے لگا۔“ انہوں نے گھبراہٹ سے کہا۔

”جب سینکڑوں عورتوں سے بیوی کی موجودگی میں دل بہلایا جاسکتا ہے تو من پر عورت سے شادی کرنا کون سا جرم ہے؟“ چودھری شوکت علی نے الفاظ چبا چبا کر ادا کیے۔ ”مجھے معلوم ہے ہمارے باپ کے پاس دن رات عورتیں موجود ہوتی ہیں، مگر ہماری ماں کے سوا انہوں نے کسی عورت کو بیوی کا درجہ نہیں دیا۔“ چودھری طالب علی انہیں یہ بات اس طرح فخر سے بتا رہے تھے، جیسے ان کے باپ نے جنگ عظیم جیتی ہو۔

”مگر مجھے بابا نے خود کہا تھا کہ میں اولاد کی خاطر دوسری شادی کر لوں۔“

”سننے میں کہا ہو گا۔“ چودھری طالب علی ہنس دیئے۔

”سننے میں نہیں، حقیقت میں کہا تھا۔ جب زمینوں کا بٹوارہ ہو رہا تھا۔“ وہ مٹھیاں ہچکچاتے ہوئے۔

”تب ہم کہاں تھے؟ ہم بھی تو وہیں تھے۔“ چودھری طالب علی نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”آپ لوگ پٹواری سے باتوں میں مصروف تھے۔ لالہ! خدا کی قسم! بابا نے کہا تھا۔“ وہ ہنسی لہجے میں بولے۔

”بہر حال، کچھ بھی ہو، ہم نورماں کو رنگ محل کی بہو تسلیم نہیں کر سکتے۔ وہاں کی بہو صرف زہرہ بیگم ہیں۔“ چودھری طالب علی نے غرور سے کہا۔ وہ بات کو واپس اسی جگہ لے آئے تھے، جہاں سے شروع کی تھی۔

”میں نے اُسے رنگ محل کی بہو نہیں بنایا، اس حویلی کی مالک بنایا ہے۔“ چودھری شوکت علی نے خود سری سے جواب دیا۔

”شوکت!.....!“ چودھری طالب علی اتنے زور سے چیخے کہ شوکت علی کو کمرے کے دروازے پر لرزرتے ہوئے محسوس ہوئے۔

”شوکت! میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ ہم آپس میں طے کر لیتے ہیں۔ زہرہ بیگم کو تمہارا بے وفائی کا شبہ بھی نہیں ہو گا۔“ چودھری طالب علی ایک دم نرم پڑ گئے۔ نہ جانے کیوں انہوں نے یکایک اپنے لہجے میں نرمی پیدا کر لی تھی۔

”میں سمجھا نہیں!“ وہ حیرانی سے بھائی کو تنکٹے لگے۔

”اگر زہرہ بیگم کو تمہارے ان کرتوتوں کا علم ہو گیا تو تم اس جائیداد سے محروم ہو جاؤ گے، جو اس کے باپ نے اسے دی ہے۔ پورے تین مرتبے ہیں شوکت!“

”مجھے معلوم ہے۔“ چودھری شوکت علی بے پروائی سے بولے۔

”اوجھلے! پھر بھی تو نے یہ حرکت کی؟“ چودھری طالب علی نے ہنس کر کہا۔

”مجھے نہیں ضرورت اُس کی زمینوں کی۔ میرے پاس اپنی ہی بہت ساری زمین ہے۔“

”بلکہ! دولت کی بھلا کس کو ضرورت نہیں ہوتی؟ اور زہرہ بیگم سے تو تجھے اچھی خاصی زمین مل رہی ہے، ورنہ میں تجھے مقدمے بازی میں پھنسا کر ان زمینوں اور پورے دنیا پور سے بھی محروم کر دوں گا۔“ وہ پھر گرم ہو گئے۔ اب وہ دھمکیاں دینے پر اتر آئے تھے۔

”مجھے نہیں ضرورت۔ آپ ابھی پٹواری کو بلوائیں، میں سب کچھ آپ کے نام کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے صرف نورماں اور مومو کی ضرورت ہے۔“ چودھری شوکت علی نے بے جگری سے کہا۔

”یہ تو نہیں، تیرا دل بول رہا ہے..... دل اور دماغ کے فیصلوں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ دل جو کچھ سوچتا ہے، جو فیصلے کرتا ہے وہ ناپائیدار ہوتے ہیں۔ تو دماغ سے سوچ، تجھے پتہ چل جائے گا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں..... کی اس قابل نہیں کہ انہیں ہم سینے سے لگائیں۔ پیروں کی جوتی، پیروں ہی میں اچھی لگتی ہے۔ تو دماغ سے سوچ، دل سے نہیں۔ دل کے فیصلے ذہن کو مفلوج کر دیتے ہیں۔“

”لالہ! نورماں میری بیوی ہے اور آپ نورماں کی نہیں، میری بے عزتی کر رہے ہیں۔“

چودھری شوکت علی کا چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ ہو گیا۔

”تم ایک معمولی لڑکی کے لئے اپنے بھائی سے اونچی آواز میں بول رہے ہو، شوکت!“ انہوں نے تنبیہ کی۔

”وہ آپ کی نظر میں معمولی ہو گی، لیکن وہ میری بیوی ہے، میری بچی کی ماں ہے۔ میں نے اسے بہت مشکل سے پایا ہے۔“ چودھری شوکت علی نے بتانا چاہا۔

”وہ مشکلات راجا مجھے بتا چکا ہے۔“ طالب علی ہاتھ اٹھا کر بے پروائی سے بولے۔

”پھر بھی آپ.....“

”ہاں..... میں اپنے خاندان میں نورماں اور مومو کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔“

”میں نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا۔“

”مجھے نہیں ضرورت آپ کے خاندان میں رہنے کی۔“ چودھری شوکت علی بھی ضدی بننے میں بولے۔

”واقعی؟“ چودھری طالب علی اُن کے قریب آگئے اور چودھری شوکت علی کے شانوں کو ہلکے سے پکڑ لیا۔

”ہاں..... مجھے نہیں ضرورت اس خاندان کی۔“ چودھری شوکت علی کے لہجے میں



”پھر بول!“

”مجھے نہیں ضرورت.....“

”شوکت!“ ابھی اُن کا جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ چودھری طالب علی کا ہاتھ اٹھا اور ان کے گال پر اپنا نشان چھوڑ گیا۔

”مجھے نہیں ضرورت آپ لوگوں کی۔“ چودھری شوکت علی کی زبان اسی جملے کا ورد کرتی تھی اور چودھری طالب علی کے تھپڑ پے در پے ان کے چہرے پر پڑ رہے تھے۔ مگر چودھری طالب علی کا پنے لگے۔ مگر شوکت علی نے ان کا ہاتھ نہ پکڑا۔ چودھری شوکت علی ہونٹ پھٹ گیا تھا اور اس سے خون رسنے لگا تھا۔

”شوکت! تُو نوراًں کو حاصل کرنے کے لئے ظلم کی آخری سیڑھی تک جا سکتا ہے۔ اخلاقی و انسانیّت کی ہر دیوار گرا سکتا ہے تو میں بھی تیرا بھائی ہوں۔ میں بھی اپنے بھائی نوراًں سے چھیننے کے لئے ہر جتن کروں گا۔ میں تجھے واپس اسی خاندان میں لے کر جاؤں گا، جس کی تجھے ضرورت نہیں ہے۔“ چودھری طالب علی ہونٹ بچھ کر بولے۔

”کیا کریں گے آپ؟“ وہ ہاتھ سے خون صاف کرتے ہوئے خود سری سے بولے۔

”تُو نے نوراًں کے حصول کے لئے اُس کے باپ کو ختم کیا اور میں تجھے پانے کے لئے نوراًں اور مومو کو ختم کر دوں گا۔“ وہ نہایت سفاکی سے بولے۔

”لالہ.....!“ چودھری شوکت علی کی گھٹی گھٹی سی آواز یوں لگی، جیسے ہزاروں سکياں حلق سے ایک ساتھ نکلی ہوں۔

چودھری طالب علی نے سوچا، یہ ٹرپ کا سب سے اچھا پتا پھینکا گیا ہے۔ وہ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے گویا ہوئے۔

”ہاں شوکت! تُو نہیں جانتا، میں بہت کمینہ آدمی ہوں۔ میری دو باتیں ہیں جن میں سے تُو ایک مان لے۔ نوراًں کی موت یا میرے خاندان میں واپسی، جہاں تیری بیوی ہے۔“

”مجھے کیا دیا ہے زہرہ نے لالہ؟..... آپ خاندان کے سربراہ بن کر نہیں، ایک باپ بن کر، ایک مرد بن کر سوچیں، لالہ! میری جگہ خود کو رکھ کر سوچیں، ان حالات میں آپ کرتے؟“ چودھری شوکت علی نے نہایت شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

”وہ کچھ نہیں کرتا، جو تم نے کیا ہے۔ اولاد کوئی قبر پر جھنڈے نہیں گاڑ دیتی۔“

”پھر اپنے بچوں کے گلے گھونٹ دیں۔“ چودھری شوکت علی نے مشورہ دیا۔

”اگر میرے ہاں بچے نہ ہوتے، تب بھی کسی لڑکی کو بیوی کبھی نہ بناتا۔“ چودھری طالب علی نے کہا۔

”اپنی ہم پلہ کو بنالیتے۔“ وہ بولے۔

”شاید کبھی نہیں۔ کیونکہ اولاد مرد کی قسمت سے ہوتی ہے۔ کیا پہلی بیوی سے مرد کی قسمت نہیں ملتی، جو دوسری سے شادی کے بعد بچے ہوں؟ اور میں سمجھتا ہوں کہ جو مرد صرف بچوں کی خاطر دوسری شادی کرتا ہے، دوسری بیوی سے ہونے والے بچے اس کے نہیں ہوتے۔“ چودھری طالب علی نے انہیں یہ بتایا کہ مومو اُن کی بیٹی نہیں ہے۔

”مگر مومو میری بیٹی ہے۔“ چودھری شوکت علی کو بار بار چودھری طالب علی کا یوں بچو کے لگانا بہت برا محسوس ہو رہا تھا۔

”میں نے راجا سے بات کی ہے۔ وہ نوراًں اور مومو کو قبول کرنے کو تیار ہے۔“ انہوں نے بات آگے بڑھائی۔

”آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر بات کیوں کی؟“ چودھری شوکت علی نے تیزی سے کہا۔

”میری مرضی۔ میں تجھے نوراًں کے چنگل سے چھڑانا چاہتا ہوں۔“ انہوں نے چودھری شوکت علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”لالہ.....!“

”دیکھ شوکت! تُو مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز ہے۔ تُو نے یہ جو حرکت کی ہے، اس سے ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔ ہمارے مزارع بھی ہم پہ نہیں گے۔ تُو خود سوچ۔“ پھر چودھری طالب علی نہایت محبت سے آہستہ آہستہ انہیں سمجھانے لگے۔



وہ دونوں کتنی ہی دیر سے ایک دوسرے کے سامنے گم صم سے بیٹھے تھے۔ لمحے سکوت میں ڈوبے ہوئے ہوئے گزر رہے تھے۔ دونوں کے دل اپنی اپنی جگہ جدا جدا احساسات و جذبات لئے دھڑک رہے تھے۔ یوں تو کبھی نہ ہوا تھا کہ دونوں قریب ہوں اور بت بنے خاموش بیٹھے رہیں۔ راجا نے سوچا۔

”نوراًں کتنی باتونی تھی، منٹوں میں پورے گاؤں کی رپورٹ سنا دیا کرتی تھی۔ اب کیوں اتنی خاموش ہے؟..... کیا چودھری نے اس کی زبان بھی جسم کی طرح چھین لی ہے؟“

راجا، نوراًں کی طرف دیکھ رہا تھا مگر وہ تو نیچے قالین پر بنے بیل بوئے ایک ایک دیکھے جارہی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ راجا کی طرف دیکھنے کی ہمت خود میں نہیں پا رہی تھی۔ اس میں تو کوئی تبدیلی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی، بلکہ چودھرائی بن کر تو وہ کچھ اور نکھر آئی تھی۔ منٹا کے نور سے اس کے خوب صورت چہرے کے گرد ایک ہالہ سا بن گیا تھا۔ بڑی بڑی کھٹی پلکیں تھرا رہی تھیں اور گلابی، رُس بھرے ہونٹ ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ راجا کا جی چاہا، بڑھ کر سہ باز وٹوں میں بھر لے، برسوں کی تشنگی مٹالے۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ اس کے ہونٹوں



پر یہ الفاظ آ گئے۔

”نوری! تو خوش ہے؟“

نوراں چونک پڑی، پھر راجا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”تجھے میں خوش نظر آتی ہوں؟“ نوراں نے سر جھکا لیا، جیسے راجا کی طرف دیکھنا بہت بڑا جرم ہو یا راجا سے نظریں چار کرنے کی وہ خود میں ہمت نہیں پا رہی تھی اور اپنی اس کیفیت کو وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ لاشعوری طور پر اسے چودھری شریک تلی کا خوف دلائے دے رہا تھا، اس کے باوجود اس نے پوچھ ہی لیا۔

”راجا! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تم ایک دم چودھری طالب علی کے ماٹو یہاں کیسے آ گئے؟“

”تمہیں لینے۔“ راجا نے بے ساختہ جواب دیا تو نوراں کھلکھلا کر ہنس دی۔ پھر راجا نے آہستہ آہستہ سب کچھ بتا دیا۔ دوران گفتگو نوراں کا ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا۔ بار بار اس کی مٹھیاں بھینچ جاتیں۔

”اس کے مظالم کا نشانہ ہم دونوں ہی کیوں بنتے ہیں؟“ نوراں نے سب کچھ سن کر راجا سے پوچھا۔ اس کا لہجہ نہایت شکستہ تھا۔ وہ یوں بکھری بکھری لگ رہی تھی، جیسے خود کو سمیٹنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”نوری! اگر تو مجھے مل جائے تو مجھے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا ذرا بھی دکھ نہیں ہوگا۔“ راجا نے نوراں کی طرف نہایت محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں اب چودھری کے ساتھ ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتی، راجا!“ نوراں کرسی سے اٹھ کر راجا کے قریب آئی اور اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ اس نے راجا کی ٹانگیں اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر اپنا سر اس کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔

”نوری!“ راجا کے لب کپکپائے۔ اس نے تو یہ سوچا بھی نہ تھا کہ یہ سب کچھ اس طرح ہو جائے گا۔ نوراں کے لمس نے اس کے دل میں ہلچل سی چا دی تھی۔ راجا کو اپنے جذبات پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔

”راجا! اگر چودھری مجھے چھوڑ دے تو تم مجھے سہارا دے دو گے؟..... میرا سائبان بنو گے؟ ایک استعمال شدہ عورت کو قبول کر لو گے، اس کی بچی سمیت؟“ وہ آہستہ آہستہ بولتی چلی گئی۔ نہ جانے کیوں آنسو لڑیوں کی مانند اس کی خوب صورت آنکھوں سے گر رہے تھے۔

”نوری! میں تجھے لینے ہی آیا ہوں۔ قسم خدا کی، تو اب بھی میرے لئے وہی نوری ہے۔ ان چھوٹی، مریم کی طرح کنواری نوراں۔ تیرے بدن کی ہر جگہ تو مجھے آج بھی دیوانہ بنا رہی ہے۔ تیرے بدن سے تو اب بھی وہی خوشبو آ رہی ہے، جس سے میرا انگ انگ لودے

”تھا۔“ راجا جذبات سے چور لہجے میں بول رہا تھا۔

”میں چودھری سے طلاق لے لوں گی۔ یہ سب میرے انتقام کا پہلا مرحلہ ہوگا۔“ نوراں اٹھ کھڑی ہوئی۔

”انتقام.....؟“ راجا کے لب کپکپائے۔ وہ حیرت سے نوراں کو دیکھ رہا تھا، جواب تک اس لفظ کو نہ بھولی تھی۔

”ہاں راجا! تیرا انتقام۔ اپنے بابا پر کئے گئے مظالم کا بدلہ، اپنی جوان اُمسگوں، خواہشوں، آرزوؤں اور آشاؤں کا انتقام، جو اس کمرے میں چودھری کی جینٹ چڑھ گئیں۔ میرا پور پور جھلس رہا ہے۔ انتقام کی آگ مجھے اندر ہی اندر جلانے لگتی ہے اب میں اسی آگ میں چودھری کو جلانا چاہتی ہوں تاکہ اس انتقام کی آگ پر کچھ تو تسکین کے چھینٹے پڑیں۔“ نوراں بے تکان بولے جا رہی تھی۔

”نوری! تجھے پتہ ہے، چودھری نے اماں اور بہنوں کو کہاں بھیجا ہے؟“

”تجھے نہیں خبر؟“ نوراں نے حیرت سے پوچھا۔

”میں پوچھتا تھا تو کہتا تھا، نوراں کا خیال چھوڑ دے، میں تجھے تیری ماں کے پاس بھیج دوں گا۔ اور مجھے اس کی یہ شرط منظور نہیں تھی۔ جتنا وہ مجھے تیرے خیال کو جھٹکنے کو کہتا، اتنا تیرا خیال میرے ذہن میں اور جڑ پکڑتا جاتا۔ تو میری روح میں اتر جاتی، خون میں گردش کرنے لگتی۔“

”میں دینو چاچا سے پوچھتی ہوں۔“ نوراں اس کا جواب سننے بغیر کمرے سے نکل گئی۔

راجا نے ایک طویل سانس لی اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ کھڑکیوں اور دروازے پر خوب صورت پھول دار پردے لہرا رہے تھے۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ دیواروں پر خوب صورت تصاویر آویزاں تھیں۔ کھڑکی کے قریب ہی بڑا سا رنگین پلنگ پڑا تھا، جس پر فاکس رنگ کی خوب صورت کڑھائی والی چادر پھیٹی تھی۔ پلنگ کے دائیں جانب چاندی کا پتھر کا اڑا ہوا تھا، جس میں مومو لیٹی تھی۔ مومو کو دیکھ کر نہ جانے کیوں، اس کے دل میں نفرت کا ایک لہر اٹھی اور اس کے پورے وجود پر چھا گئی۔ وہ سوچنے لگا۔

”یہ بھی تو چودھری کے مظالم کی نشانی ہے۔ چودھری طالب علی! تمہاری شرط بڑی کڑی ہے۔ میں کیسے اس بچی کو رکھوں گا؟ جب بھی اس پر نظر پڑے گی تو یہ احساس شدید ہو جائے گا کہ نوراں ایک مسلا ہوا پھول ہے۔ لیکن میں چودھری طالب علی اور نوراں سے وعدہ کر چکا ہوں کہ نوراں کو اپنا لوں گا۔ مگر صرف مومو کی خاطر تاحیات اپنی لگائی ہوئی آگ میں جلتا رہوں گا۔ محبوب کی گلی کے تو کتے بھی پیارے ہوتے ہیں، مومو کو تو پھر بھی نوراں نے جہنم دیا ہے۔ وہ تو نوراں کے جسم کا حصہ ہے۔ ٹھیک ہے، میں چودھری سے گئے دنوں کا انتقام لوں گا۔“



اسے بیوی کے ساتھ ساتھ بچی سے بھی محروم کر دوں گا، تاکہ وہ ہمیشہ تڑپا رہے، مطالعہ کرے۔ یہ اس کی ایسی شکست ہوگی، جسے اس کی دولت بھی جیت میں تبدیل نہ کرے۔ چودھری بھی کیا یاد کرے گا۔ سو دن چور کے تو ایک دن سا ہو گا۔ کاجی ہوتا ہے۔ اس نے راجا کو راہ دکھائی تو اس کے ذہن کی ہر گرہ کھلتی چلی گئی مگر پھر اس کی سوچوں کا دوسری طرف مڑ گیا۔

”نوراں جو تقریباً گزشتہ سات سال سے اس سے بچائے کمرے میں رہتی آئی ہے اتنی آرام وہ زندگی گزارنے کے بعد کیا وہ میرے ساتھ خوش رہ سکے گی؟ دکھوں میں تو مجھ بھی نفرتوں میں بدل جاتی ہے۔ ساری زندگی تو محبت کے سارے نہیں گزاری جاسکتی۔ محبت سے پیٹ تو نہیں بھرتا۔ ہم ایک دوسرے کی صورتیں دیکھ کر تو پوری زندگی نہیں جاسکتے؟ اگر اُسے یہ آسائشیں نہ ملیں تو کیا ہوگا؟ میں اُسے پا کر بھی نہ پاسکوں گا۔ اگر ایسا ہوا تو شاید میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔ میں نے صرف نوراں کی خاطر اتنی اذیتیں سہی ہیں۔ اگر وہی نہ رہی تو میں کیا کروں گا؟ وہ میرے کہنے سے پہلے چودھری سے طلاق لینے کی بات زبان سے نکالتی۔ اسے علم ہے کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں اسے محبت کے سوا اور کچھ دے سکوں گا اور وہ ہر طرح سے راضی ہے اور میرے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ وہ ازل سے میری ہے اور ابد تک میری ہی رہے گی۔ دُوریاں میری محبت کو ختم نہیں کر سکتیں۔

تب ہی خیالات کی مالا ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئی اور موتی بکھر گئے۔ نوراں، دینو کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ نوراں کچھ کہتی، مومو نے کسمسا کر کوٹ لی تو اس کے سر کی چوٹ کا درد جاگ اٹھا۔ وہ رونے لگی۔ نوراں تیزی سے آگے بڑھی اور اسے تھپکنے لگی۔ نوراں نے راجا سے کہا۔

”تم دینو چاچا سے پوچھ لو۔“

”میں نے بہت مرتبہ پوچھا ہے اس سے، یہی تو مجھے کھانا دینے آتا تھا مگر اس نے مجھ کو نہیں بتایا کہ میری ماں ہمیں کہاں ہیں۔“ راجا نے کہا۔

”دینو چاچا! اب بتا دو۔ اب چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں۔“ نوراں نے اس کے قریب آ کر اس سے پوچھا۔ کیونکہ مومو سو چکی تھی۔

”تمہاری ماں کو بٹے بھیج دیا گیا تھا اور اسے تمہاری طرف سے ایک چٹھی لکھ دی گئی تھی کہ تم شہر چلے گئے ہو۔ ہر ماہ چودھری چار سو روپے مٹی بکھڑ کر آتا تھا تاکہ تمہاری ماں اطمینان رہے کہ تم زندہ ہو اور کھا رہے ہو۔ تمہاری طرف سے خط بھی لکھوا کر بھیجے جاتے تھے۔“ دینو نے کہا۔

”تب جواب بھی آتا ہو گا خط کا؟“ راجا نے پوچھا۔

”ہاں۔ شہر میں چودھری صاحب کا ایک دوست ہے، اس کے بچے پر آتا تھا خط۔ پھر صاحب خود ہی جواب لکھ کر بھیج دیتے تھے۔“

چودھری صاحب بھی میرا پوچھنے نہ آیا؟“ راجا کے لہجے میں حسرت ہی حسرت تھی۔

”ایک بار تمہارا خالہ زاد بھائی نذیر اس بچے پر پہنچا تھا، مگر مالک کے دوست نے اسے شہر کر دیا کہ تم کبھی کبھار آ نکلتے ہو۔ کوئی خبر نہیں کہ کہاں ٹوکری کرتے ہو۔“ دینو نہایت آرام سے راجا کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔

”چودھری کا دوست بھی چودھری کی طرح بہت چالاک ہے۔“ راجا بڑبڑایا۔

پھر دینو چلا گیا۔ وہ بھی اپنے مالک کے دکھ پر ایک دم اُداس ہو گیا تھا۔

”راجا! میں بیٹھک میں جا رہی ہوں، چودھری سے دو ٹوک بات کرنے۔“ نوراں نے اطلاع دی۔

”کیا کہو گی؟“ راجا نے پوچھا۔

”بس یہی کہ مجھے ابھی اور اسی وقت طلاق دے دی جائے۔ میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ راجا! آج میں بہت خوش ہوں۔ اتنی کہ تجھے بتا نہیں سکتی۔“ خوشی نوراں کے چہرے سے بھونکی پڑ رہی تھی۔

”نوری!“ راجا آگے بڑھا، اس کے ہاتھ بڑھے تاکہ وہ نوراں کو کھینچ کر سینے سے لگا لے کر اس نے خود پر قابو پالیا۔ ”نوری! تو میرے ساتھ خوش رہ سکے گی؟“

”کیا مطلب؟“ نوراں حیران تھی۔

”مطلب یہ کہ میرے پاس دولت.....“

”راجا!..... راجا! تو مجھے گالی دے رہا ہے۔ دولت میرے لئے گالی ہے، سمجھا تو؟..... مجھے معلوم نہیں تھا کہ چودھری کی قید میں رہ کر تیری ذہنیت بھی بدل گئی ہوگی۔

راجا! کہیں ایسا تو نہیں کہ میں اب تمہارے قابل نہیں رہ گئی؟ میں اب الہڑ نوراں نہیں بلکہ ایک بچی کی ماں بھی ہوں۔“ نوراں نے کہا۔

”نوری! تو غلط سوچ رہی ہے۔“ راجا ٹپ کر رہ گیا۔

”راجا! میں گر کر تجھ سے اپنی محبت کی بھیک نہیں مانگنا چاہتی۔ چودھری کے ساتھ رہ کر ایک شہنشاہت میں نے سیکھی ہے اور وہ ہے خودداری۔ میں بہت خوددار ہوں، تجھے مجبور نہیں کر سکتی کہ تو مجھے اپنا لے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اب تیرے قابل نہیں رہی، مگر قسم اُس رات

ذہنیت کرتے ہوئے مجھے پیدا کیا ہے، میں آج بھی تجھے چاہتی ہوں۔ عورت زندگی میں صرف ایک

”نوری! میں بھی تو تجھے چاہتا ہوں، تبھی تو تیرے سامنے آیا ہوں اور یہاں بیٹھا ہوں۔“

”نوری! میں بھی تو تجھے چاہتا ہوں، تبھی تو تیرے سامنے آیا ہوں اور یہاں بیٹھا ہوں۔“



یہی چاہت کا راستہ تو مجھے یہاں تک لایا ہے۔ تیری محبت میرے پاؤں کی پیڑی ہے۔  
مجھے تجھ سے محبت نہ ہوتی تو میں بھلا چودھری کی قید قبول کرتا کبھی؟“ راجا بولتا گیا اور نور  
خالی خالی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔

”راجا! میں آج ہی تیرے ساتھ جاؤں گی..... میں ابھی آئی۔“ نور ایں یہ کہہ کر تیز  
سے کمرے سے نکل گئی۔



پیٹھک کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دونوں بھائیوں نے اُسے بند کرنے کی ضرورت ہی  
محسوس نہیں کی تھی۔ شاید انہیں علم تھا کہ جب تک وہ نہ چاہیں گے، کمرے میں کوئی بھی نہیں آ  
سکتا۔ مگر نور ایں کھلے دروازے سے اندر گھسٹی چلی گئی۔ وہ صرف چودھری طالب علی کا جملہ سن  
سکی تھی۔

”میں تجھے نور ایں کے چنگل سے چھڑانا چاہتا ہوں۔“

نور ایں کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس کا روم روم سگ اُٹھا، آنکھوں سے شعلے  
پلنے لگے۔ چودھری طالب علی اور چودھری شوکت علی اُسے یوں ایک دم کمرے میں پا کر  
تیراں رہ گئے۔

”چودھری! تم اپنے بھائی کو میرے چنگل سے چھڑانا چاہتے ہو۔ پہلے یہ پوچھو کہ قیدی  
کون ہے؟ چنگل میں پھنسا ہوا کون ہے؟ تم نے یک طرفہ فیصلہ کیا ہے۔“ نور ایں نے  
چودھری طالب علی سے کہا اور پھر چودھری شوکت علی کی طرف مڑی اور سپاٹ لہجے میں  
بولی۔

”چودھری! تم مجھے ابھی اور اسی وقت طلاق دے دو۔ میں ایک لمحہ بھی اب تمہاری قید  
میں نہیں رہ سکتی۔“

”اُف میرے خدا! آزمائش کی گھڑی آن پہنچی..... یوم حساب تو آج ہی ہے۔“  
چودھری شوکت علی زخمی نظروں سے نور ایں کو دیکھ کر رہ گئے۔ برسوں پہلے والی نور ایں آج اُن  
کے سامنے پھر آ گھڑی ہوئی تھی۔

”چودھری! میں نے تمہاری قربت میں کبھی چین نہیں پایا، مجھے تم سے شروع سے نفرت  
ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ میں صرف دنیا پور کے لوگوں کی سلامتی کی خاطر اور راجا کی زندگی کے  
لئے تم سے محبت کا ڈھونگ رچاتی رہی تھی۔ تم سمجھتے ہو کہ تم نے قیمتی لباس اور زیورات کا ڈھیر  
میرے سامنے لگا دیا اور میں ان چیزوں سے تمہاری ہو گئی..... یہ تمہاری غلط سوچ ہے۔ میں  
آزاد فضاؤں میں اُڑنے والا چھٹی تھی، تم نے مجھے سرخ حویلی میں قید کر دیا۔ میں تو پچھٹ



کی رانی تھی، تم نے مجھے ایک کمرے تک محدود کر دیا۔ تم نے مجھے بہت ذہنی اذیت دی ہے۔ چودھری! تم میرے باپ کے قاتل ہو۔ اور کوئی لڑکی اپنے باپ کے قاتل سے محبت نہیں کر سکتی۔ میں کم ظرف نہیں ہوں، میرے باپ کی بے گوردگن لاش ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتی ہے، زخموں سے چور چور بدن کا احساس کر کے میرا رونا رونا دیکھنے لگا ہے۔ میں واپس جانا چاہتی ہوں، آزاد فضاؤں میں۔ میں روز روز مرنے اور جینے کا کھیل اب مزید نہیں کھیل سکتی۔ مجھے اپنے ظلم سے آزاد کر دو۔ میں سونے کے پتھرے کے بجائے اپنے کچے گھر میں رہنا چاہتی ہوں۔ یہ سب کچھ مجھ سے واپس لے لو اور مجھے آزادی بخش دو۔“ نورائے کی آواز رندھ گئی۔ اس نے اپنا تمام زور اتارنا شروع کر دیا۔

چودھری شوکت علی حیرت زدہ نظروں سے اسے دیکھے جا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا، جیسے ان کا ذہن سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کھو بیٹھا ہو۔

”نور!..... نور! زندگی کے فیصلے یوں اچانک نہیں کئے جاتے۔ خوشیوں کو رندہ نہیں جاتا۔“ چودھری شوکت علی کے لب کپکپا کر رہ گئے۔

”چودھری! میں نے یہ فیصلہ اچانک نہیں کیا، یہ بہت پہلے کا فیصلہ ہے۔ اس وقت کا جب تم نے مجھ سے شادی کی تھی۔ اور کون سی خوشی ہے، جو تم نے مجھے دی ہے؟ خوشیوں کی طرف تو میں اب بڑھ رہی ہوں۔“ نورائے نہایت بے دردی سے مسکرائی اور چودھری طالب علی سے مخاطب ہوئی۔

”اپنے بھائی سے کہو، مجھے آزاد کر دے۔ تم اتنا تو کر سکتے ہو۔“

”ہاں شوکت! اب تم.....“ چودھری شوکت علی نے کہنا چاہا۔

”لالہ! یہ ہم دونوں میاں بیوی کا معاملہ ہے، آپ ہمارے معاملے میں دخل نہ دیں۔“

چودھری شوکت علی چمک کر بولے۔

”شرع کی رو سے جب بیوی خود ہی نہ رہنا چاہے تو مرد کو چاہئے کہ فوراً اسے آزاد کر دے۔“

”جب آپ لوگوں کو کوئی بات بنتی نظر نہیں آتی تو شرع کو درمیان میں لے آتے ہیں، اسلام کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ جب کوئی بچہ دنیا میں آتا ہے تو اس کی پیشانی پر نہیں لکھا ہوتا کہ یہ امیر ہے اور یہ غریب ہے۔ یہ مسلم ہے اور یہ غیر مسلم۔ فلاں بچہ کی ہے اور فلاں زمیندار۔“ چودھری شوکت علی نے لہو لہان دل کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ مارے غصے کے خون ان کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔

”چودھری! تم یہ اُمید دل سے نکال دو کہ میں اس قدر ظلم و جبر کے باوجود تمہارے ساتھ چکر بھرتہ کر لوں گی۔ اب حالات کی ڈور میرے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم نے کوئی سختی کی

میں سوہ کی بوٹی بوٹی کر دوں گی۔ میں ماں سے ناگن بن جاؤں گی چودھری!“ نورائے کے بچے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔

چودھری شوکت علی حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے اور چودھری طالب علی ہونٹوں پر ہنسی کا کٹھن مسکراہٹ سجائے ان دونوں کو۔ تمام مرحلے تو خود بخود ہی طے ہو رہے تھے۔

یہ سفاکانہ مسکراہٹ سب سے بڑھ کر دکھائی دیتی تھی۔ حالانکہ وہ شوکت علی کو سمجھاتے رہے تھے کہ وہ زیادہ سختی کی ضرورت ہی پیش نہ آئی تھی۔ حالانکہ وہ شوکت علی کو سمجھاتے رہے تھے کہ وہ نورائے کو چھوڑ دے۔ مگر وہ اس سے مس نہ ہوئے۔ ان کی ہنسی رٹ گئی کہ وہ سب کچھ چھوڑ

دیں گے، مگر نورائے کو نہیں چھوڑ سکتے۔ دھمکیوں اور مار کا بھی ان پر کوئی اثر نہ ہوا تھا اور اب جس کی خاطر وہ بھائی سے لڑ پڑے تھے، اسی نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے فیصلے

سے آگاہ کیا تھا۔ وہی ان کے سامنے شمشیر برہنہ بنی کھڑی تھی، جس کا صرف ایک ہی مطالبہ تھا۔

”چودھری! مجھے آزاد کر دو۔“ نورائے کی آواز کمرے میں گونجی۔

”نہیں۔“ چودھری شوکت علی بل کھا کر رہ گئے۔

”کیسے نہیں چودھری! اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو مومو کو کھود دو گے۔“

”نور! تمہیں واقعی مجھ سے نفرت ہے؟“ چودھری شوکت علی نے بچوں کی سی مصیبت سے پوچھا۔ ان کی آنکھوں میں شبنم تیرنے لگی۔

”ہاں!“ نورائے نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

چودھری شوکت علی چند لمحے تک کمرے میں ٹھہرتے رہے اور پھر رک کر نورائے کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

”پھر ایک شرط پر میں تمہیں آزاد کرتا ہوں۔“ ان کا لہجہ بے حد ٹوٹا ہوا تھا۔

”تو اپنی شرط۔ ویسے چودھری! تم ہر بات شرطوں سے طے کرنے کے عادی ہو۔“

نورائے نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا دل اندر ہی اندر بیٹھنے لگا۔ کچھ بھی ہو، نورائے کی بیٹی تھی، اس کی تحقیق کا درد اس نے سہا تھا۔ اب بھلا وہ کیسے اپنے دل کے بندھن کو چودھری کے پاس چھوڑ سکتی تھی؟ اسے یہ بھی علم تھا کہ مومو کو چودھری بے حد چاہتا تھا۔

”تم نے جواب نہیں دیا؟“ چودھری شوکت علی نے نورائے کو سوچوں میں غرق دیکھ کر

نورائے کے دل میں ہلچل مچ گئی، پھر بھی وہ خود پر قابو پا کر بولی۔



”کیا رنگ گل میں اُسے بیٹی کا مقام ملے گا؟“ اس کا رخ چودھری طالب علی کی طرف تھا۔

”شوکت! تم مومن کو بھی نوراًں کے حوائے کر دو۔ کیونکہ راجا، مومن و سمیت اُسے کرنے کو تیار ہے۔“ چودھری طالب علی نے کہا، جس کا مطلب تھا وہ مومن کو رنگ گل کی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

”لالہ! تمہاری خواہش کے مطابق میں اپنی بیوی کو تو چھوڑ رہا ہوں..... اب میری بھی.....“ اُس ظالم و جابر شخص کی آواز رندھ گئی۔

”ویسے بھی تم قانونی طور پر اس کے سرپرست نہیں بن سکتے، جب تک کہ وہ سات سال کی نہ ہو جائے۔“ چودھری طالب علی نے کہا۔

”آپ ہر بات میں اسلام اور قانون کی باتیں کرتے ہیں۔ آخر کوئی بات، کوئی قانون میرے حق میں بھی جاتا ہے یا میں ہی ہر جگہ تہی دامن، تہی دست نظر آتا ہوں؟“

”ظالم آدمی ہمیشہ ہارتا ہے چودھری! کبھی کی راتیں بڑی، کبھی کے دن۔“ نوراًں مسر سے ہنس دی۔

”نوراًں! تُو ٹھنڈے دل سے غور کر۔“ پہاڑ جیسے چودھری شوکت علی آج بھر بھری کی طرح بیٹھ گئے تھے۔

”چودھری! میں اپنے آپ سے کئے ہوئے عہد سے ٹکر نہیں سکتی۔ میں نے انتقام کی خاطر تم کو اپنا آپ سوچا تھا، تمہیں عورت کے انتقام کا اندازہ نہیں ہے۔ خدا نے مجھے حوصلہ دیا ہے، اتنی ہمت دی ہے کہ میں دنیا پور کے مالک سے انتقام لے رہی ہوں تاکہ ان کی نسلیں بھی یاد کریں۔“ نوراًں حقارت سے بولی۔

چودھری شوکت علی سوچنے لگے، جب تک اس نے چاہا، میرے ساتھ رہی۔ مجھے علم تھا کہ راجا جب بھی اس کے سامنے آئے گا، اس کے دل میں پرانی محبتیں انگڑائی لے کر بیدار ہو جائیں گی، پھر یہ کچھ نہیں دیکھے گی، راجا کو حاصل کرنے کے لئے تن من کی بازی لگا دے گی۔ اس کی ہو جانے کی خاطر وہ انتہاؤں کو چھونے سے بھی گریزاں نہ ہو گی۔ اور لالہ کہتے ہیں، اسے چھوڑ ہی دینا چاہئے۔ مومن میری بیٹی ہے، اس کا پورا گاؤں گواہ ہے۔ دانی! ابھی وہ قانونی طور پر میرے پاس نہیں رہ سکتی۔“

”ٹھیک ہے..... میں مقدمے نہیں لڑ سکتا یہ سب کچھ کامپنڈ پر نے لکھ دیا ہے۔ اب مقدر کا قائل ہو گیا ہوں، تقدیر کو تسلیم کر لیا ہے۔ جب تک تمہارا میرا ساتھ لکھا ہوتا رہیں اور اب تم جانا چاہتی ہو تو شوق سے جاؤ مگر.....“ چودھری شوکت علی بولنے لگے۔

”ضرور آگاہ کرنا، تاکہ میں اپنی بچی سے مل سکوں۔“

”کیا ملتا ہے حد ضروری ہے؟“ نوراًں نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”اور اگر میں نہ ملنے دوں، تو؟“ نوراًں نے کڑے تیوروں سے دیکھا۔

”تو پھر تیری بھی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہو سکتی کہ میں تجھے آزاد کر دوں۔ چاہے تُو

مومن کو ختم ہی کیوں نہ کر دے۔ اگر تُو اُسے اپنے ساتھ لے گئی اور مجھ سے ملنے نہیں دیا تو

میرے لئے تو وہ مر ہی جائے گی۔ میں تجھے بھی ساری زندگی ترساتا رہوں گا۔ تُو گناہ کرتی

رہے گی، میں تجھے طلاق نہیں دوں گا۔“ چودھری شوکت علی کے جڑے پہنچ گئے تھے۔ ان

کی آنکھوں میں غصے کے سائے لہرا رہے تھے۔

”ٹھیک ہے، تم مومن سے مل سکتے ہو، جب جی چاہے۔“ نوراًں کو ان کی بات ماننی ہی

پڑی اور چودھری کے ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اب تک ہار رہے تھے، یہ

ان کی پہلی جیت تھی۔

”دینو اور راجا کو بلا لو۔“ انہوں نے نہایت ٹوٹے اور شکستہ لہجے میں کہا، پھر چودھری

طالب علی کی طرف دیکھا، جو انہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ بھائی کو دیکھتے رہے، ہولے

ہولے چلتے ہوئے ان کے قریب پہنچ گئے۔ کتنی ہی دیر تک وہ ان کی آنکھوں میں تکتے

رہے۔ چودھری طالب علی نے گڑبڑا کر نظریں جھکا لیں۔

کیا تھا ان کے شوکت کی آنکھوں میں؟..... ناکام خواہشوں کا لہو، سرخ آنکھیاں سی

چل رہی تھیں۔ اپنی محبت کے بُت کو پاش پاش کرنے پر آنکھوں میں ویرانیاں ہی ویرانیاں

پھیل گئی تھیں۔ کتنے سوال تھے ان کی آنکھوں میں، جیسے کہہ رہی ہوں، لالہ! میری ایک بھی

خوشی آپ سے برداشت نہیں ہوئی۔ کیسے بھائی ہیں آپ؟ چند منٹوں میں میرے ہنستے ہستے

گھر کو اُجاڑ دیا۔ آپ نے شب خون مارا ہے اپنے ہی بھائی کے چن پر، اسی کے اشیانے

کے تنکے بکھیر دیئے ہیں۔ کوئی اور نہ ملا آپ کو؟..... آپ تو سہ کا وہ کاٹا ہیں، جو جس گھر

میں آجائے، وہ گھر اُجڑ جاتا ہے، فنا ہو جاتا ہے، کچھ بھی نہیں بچتا۔ آپ بھی میرے لئے سہ

کا کاٹا ہیں۔ میرے گھر کو فنا کرنے میں آپ کا ہاتھ ہے۔ میری بچی کو باپ کی محبت، شفقت

سے محروم کرنے کا سہرا آپ کے سر ہے۔ مگر میرا انصاف بھی رب کرے گا۔ وہ بہت بڑا

منصف ہے۔ نوراًں نے بھی اسی کے آسرے پر تقریباً سات سال گزار دیئے اور اس نے

نوراًں کی سن لی۔ میری بھی وہ ضرور سنے گا۔ میں بھی اس وقت کا انتظار کروں گا۔“

چودھری طالب علی نے بھائی کی نگاہوں کے سوالات سے بچنے کے لئے نظریں جھکا

لیں۔ ایک لمحے کو ان کا دل بھی دکھ سا گیا۔ آخر کو شوکت اُن کے بھائی تھے، اُن کا خون



تھے۔ اب اگر وہ دُکھی تھے تو چودھری طالب علی کے دل میں بھی پُرسین اٹھ رہی تھیں۔  
 ”لالہ! نظریں کیوں چرا لیں؟ جو آپ نے چاہا، وہ ہو گیا۔ بھائی کی آرزوؤں کے لئے  
 پر آپ رنگ گل جیسا ایک اور گل تعمیر کر لیں، خوشیاں منائیں، شادیانے بجا لیں، بزم  
 کرائیں، خوب دل کھول کر تہنہ لگائیں کہ آپ جیت گئے۔ رنگ گل کی روایات برقرار رہیں  
 اور نوراں، ایک کچی لڑکی، رنگ گل کی بہو بننے کا اعزاز نہ پاسکی۔“  
 ”شوکی! تو غم نہ کر۔ تُو جلد بہل جائے گا۔ عورتیں تو زندگی میں آتی جاتی رہتی ہیں؟“  
 چودھری طالب علی نے ان کے کندھے کو تپتپایا۔

”عورتیں..... ہا ہا۔“ چودھری شوکت علی ہنسے، پھر ہنستے ہی چلے گئے۔ ہنستے ہنستے ان کی  
 آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”لالہ! عورتیں تو واقعی زندگی میں آتی ہیں۔ کبھی زہرہ کے روپ  
 میں بیوی کم اور سرپرست بن کر زیادہ۔ کبھی نوراں کے روپ میں، جس کا روم روم انتقام کی  
 آگ میں جھلس رہا تھا۔ مگر کوئی عورت مجھے مومنو جیسی دُکھی نہیں دے سکتی۔ یہ تو آپ مائیں  
 کے نا؟“

اس سے پہلے کہ چودھری طالب علی کوئی جواب دیتے۔ نوراں دینو اور راجا کو لے آ  
 گئی۔ وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ چودھری شوکت علی نے راجا کی طرف دیکھا، پھر دیکھتے  
 رہے۔ راجا ان کی اتنی چمکی آنکھوں کی تاب نہ لا کر بار بار نظریں جھکا لیتا۔  
 ”ادھر آ، راجا!“ انہوں نے آواز کو بازو عب بنانے کی حد درجہ کوشش کی، مگر لڑش پر قابو  
 نہ پاسکے۔ راجا ان کی طرف یوں دیکھ کر رہ گیا، جیسے زمین نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا ہو۔  
 ”آ جا نا، راجا! چودھری اب تجھے کچھ نہیں کہے گا۔“ نوراں نے راجا کی ہمت  
 بندھاتے ہوئے نہایت مسخر سے کہا۔

”ہاں راجا! میں تجھے کچھ نہیں کہوں گا۔ تُو ڈر مت۔ میں نے تسلیم کر لیا ہے کہ تُو جیت  
 گیا ہے۔ میں نے محبتوں کے پیچھے بھاگنے کی بہت کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ جھوٹی محبتوں،  
 گزارا کرتا رہا۔ میں جو خود کو بہت سیانا سمجھتا تھا، محبتوں کے کھوٹ کی پہچان نہ کر سکا۔ بعض  
 لوگ پیاز کی پرتوں کی طرح ہوتے ہیں۔ جو بھی پرت اُتار دے، پھر ویسی ہی پرت نظر آتی ہے۔  
 تُو خوش قسمت ہے کہ اتنے عرصے بعد تُو نے نوراں کے دل کا دروازہ کھٹکھٹایا تو تجھے وہی  
 محبت ملی۔ بالکل ویسی ہی موتی کی طرح، میرا تو سایہ بھی نہ پڑا تھا اس پر۔ محبتوں کے  
 معاملے میں تُو واقعی عقبر کا سکندر ہے۔“ چودھری شوکت علی بولتے بولتے ایک دم رکا  
 گئے۔

راجا نے نہایت تفاخر سے ان کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر ایسی مسکراہٹ چمکی  
 ہوئی تھی، جس نے چودھری شوکت علی کا دل ادھیڑ کر رکھ دیا۔ وہ بڑی مشکل سے خود پر قابو

کر بولے۔  
 ”راجا! میں نوراں کو آزاد کر رہا ہوں..... اور مجھے یقین ہے کہ تُو اپنی محبت کو پا کر  
 بہت خوش ہو گا۔ لیکن ایک وعدہ کر، میری مومنو کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ اگر کبھی ایسا ہوا تو قسم خدا  
 کی، میں تیرے پورے خاندان کا خون پی جاؤں گا۔“  
 ”تو پھر تم مومنو کو اپنے پاس رکھو۔“ راجا بولا۔  
 ”راجا! نوراں کی گٹھی گٹھی سی چیخ نکلی۔  
 ”راجا! چودھری طالب علی چونک کر بولے۔

چودھری شوکت علی نے نوراں اور بھائی کو دیکھا۔  
 ”اپنی اولاد کسی کو بری نہیں لگتی، لیکن ان دونوں نے مجھے مجبور کر دیا ہے یا یوں سمجھ لے  
 کہ مجھے ایسے جال میں انہوں نے اُلجھا دیا ہے کہ میں مومنو کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔“  
 چودھری شوکت علی نے کہا۔  
 ”میں مومنو کو نہیں چھوڑ سکتی۔“ نوراں بولی۔

”راجا! تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم بچی سمیت نوراں کو قبول کر لو گے۔“ چودھری طالب علی  
 نے کہا۔

”ہاں! یہ تو میں اب بھی کہہ رہا ہوں۔“ راجا نے کہا۔  
 ”پھر تم نے چودھری شوکت سے یہ کیوں کہا کہ وہ مومنو کو اپنے پاس ہی رکھے؟“ نوراں  
 نے پوچھا۔

”وہ میرے خاندان کا خون پینے کی بات کر رہا تھا۔“ راجا نے غصے سے کہا۔  
 ”یہ تو اس کی عادت ہی ہے، جیسے اب خون کے گھونٹ پی رہا ہے۔“ نوراں ہنس دی۔  
 ”نوراں! یہ عادت نہیں ہے، میں ایسا کر کے دکھا بھی سکتا ہوں۔ مجھے اشتعال نہ دلا۔“  
 چودھری شوکت علی مٹھیاں بھینچ کر بولے۔

”چودھری! تم جلدی سے فیصلہ سناؤ، میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری بیٹی کو کوئی تکلیف نہ  
 ہوگی۔“ راجا بے پروائی سے بولا۔

”مومنو سے میں ملنے آیا کروں گا۔“  
 ”منظور ہے۔“ نوراں جلدی سے بولی کہ کہیں راجا کوئی اور بچی بات نہ کر دے۔  
 ”میں راجا سے پوچھ رہا ہوں۔“ چودھری شوکت علی نے راجا کی طرف دیکھتے ہوئے

”میں اور نوراں الگ نہیں ہیں۔“ راجا مسکرا کر بولا۔  
 ”جانتا ہوں۔“ چودھری شوکت علی طویل سانس لے کر بولے۔ سب خاموش تھے،



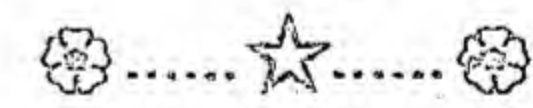
صرف سانسوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ چودھری شوکت علی فیصلہ سنانے کے لئے خود کو تیار کر رہے تھے۔ اس آخری سے بھی ان کا دل نور نور لاپ رہا تھا۔ بازو نوران کیسے لئے بے قرار ہوئے جارہے تھے اور دماغ میں جگہ بگہنے اٹھ رہے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کر ہیں؟ کیسے نوران سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناتا توڑیں؟ محبت اگر نہ ملے تو توڑ دیکھ نہیں ہوتا، جتنا محبتوں کی جدائی پر ہوتا ہے اور جدائی بھی ہمیشہ ہمیشہ کی، پھڑنا بھی تھا۔ حیاتی کا۔ اسی کیفیت سے چودھری شوکت علی دوچار تھے۔

”شوکی! تُو تین لفظ منہ سے نکال تا کہ قصہ پاک ہو۔“ چودھری طالب علی کو ان کا یوں چپ رہنا بہت کھل رہا تھا۔ یہی تین بول کبھی کبھی زندگی بھر کے لئے دو انجانے مسافروں کو ایک منزل پر لے آتے ہیں اور اس کے اُلٹ تین الفاظ سالوں ساتھ رہنے والوں کو انجان کر دیتے ہیں۔ تب ایک دم ہی نہ جانے چودھری شوکت علی کو کیا ہوا کہ وہ ہذیانی انداز میں بولنے لگے۔

”میں نے نوران کو طلاق دی..... طلاق دی..... طلاق دی۔“

پھر یہ کہتے کہتے وہ چودھری طالب علی کے بازوؤں میں جھول گئے۔ وہ، جو خود کو مضبوط اعصاب کا مالک سمجھتے تھے، نوران کو اپنے جسم کا حصہ سمجھتے تھے، خود ہی اس حصے کو کاٹ چکا اور جب جسم کے کسی حصے کو کاٹا جاتا ہے تو تکلیف تو لازمی ہوتی ہے۔ زخم ہوتا ہے تو درد بھی ہوتا ہے۔ پھر زخم بھی ایسا، جو کبھی نہیں بھرے گا، بلکہ بڑھتا ہی رہے گا اور ناسور کی شکل اختیار کر لے گا۔

دیو اور چودھری طالب علی نے چودھری شوکت علی کو پٹنگ پر لٹا دیا۔



نوران نے جب یہ تین الفاظ سنے تو اُسے یوں لگا، جیسے یہ الفاظ نہ ہوں، نہ ہر میں بھی ہوئی برچھیاں ہوں جو یکے بعد دیگرے دل کے تینوں خانوں میں پیوست ہو گئی ہوں۔ اب وہ مومو کے پنگھوڑے سے سر ٹپکے روئے جا رہی تھی۔

نوران کیوں رو رہی تھی.....؟

نوران، جو راجا کی محبوبہ تھی، چودھری شوکت علی کی بیوی تھی، مومو کی ماں تھی، یہ نوران اوپر سے تو خوش تھی، مگر اس کے اندر کی نوران جو بیوی اور ماں تھی، رو رہی تھی۔ عورت کا گھر چاہے کیسا بھی ہو، خواہ وہ گارے کا ہو یا کچی حویلی ہو، گھر پھر بھی گھر ہی ہوتا ہے اور جب اس کے شوہر کے لبوں سے طلاق کا لفظ تین بار نکلتا ہے تو عورت کا دھڑکنے لگتا ہے۔ آشیانے کے تنکے بکھر جاتے ہیں۔ اور نوران بھی تو ایک عورت تھی۔ چاہے وہ چودھری سے نفرت ہی کرتی تھی، انتقام لینا چاہتی تھی، مگر اس کے منہ سے تین الفاظ کے نکلنے ہی اسے

بل لگا، جیسے وہ اندر سے خالی ہو گئی ہو..... بھر بھری مٹی کی طرح بیٹھ گئی ہو۔  
”اب تُو رو کیوں رہی ہے نور؟“ راجا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نہایت محبت سے کہا۔

”نہیں تو..... ویسے ہی.....“ نوران نے آنکھیں رگڑیں۔

”حویلی چھوٹے کا دکھ ہے تجھے؟“ راجا نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔  
”ناں.....“ نوران نے سر کو متنی جنبش دی۔

”پھر.....؟“

”پتہ نہیں کیوں، راجا! انتقام کا پہلا مرحلہ پورا ہوا ہے اور میں رو رہی ہوں۔ شاید یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ ہم غم اور خوشی کا سوا گت آنسوؤں ہی سے کرتے ہیں نا؟“ نوران ہنس دی اور راجا کے دل کے شکوے نے مہک اُٹھے۔ اُسی وقت مومو جاگ گئی تو نوران اٹھی، بارہی خانے سے گلاس میں دودھ لے آئی اور مومو کو گود میں بٹھا کر بولی۔

”لے پی۔“ نوران نے اُس کی پیشانی چوم لی۔

”یہ بھی بتا دے کہ باپ کے گھر کا آخری بار دودھ پی لے۔“ راجا تسخر سے بولا۔

”راجا! اس غریب کو کیا خبر کہ دنیا ہی پلٹ گئی ہے۔ یہ تو معصوم ہے، اسے کیا پتہ کہ اس کی ماں نے خود ہی اسے باپ کی شفقت سے محروم کر دیا ہے..... مجھے علم ہے کہ اسے وہ شیش نہیں ملیں گے تیرے گھر میں جو یہاں ملتے ہیں۔ مگر تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ ہم مقدر کے تابع ہیں، مقدر ہمارا تابع نہیں۔“ نوران مومو کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سوچے جا رہی تھی۔

اسی وقت دینو آ گیا۔ اُس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔

”نوران! دیکھ! بڑے چودھری نے کہا ہے جو چیز لیتی ہو، لے جاؤ، اجازت ہے۔“

”میں دولت کی خاطر یہاں نہیں آئی تھی، دینو چاچا! مجھے اس گھر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اس گھر کی، بلکہ دنیا پور کی سب سے قیمتی شے مومو ہے، جسے میں لئے جا رہی ہوں۔“ نوران نے مستی بھرے غرور سے پہلے مومو کو، پھر دینو کو دیکھا اور دینو کو دیکھا کہ کمرے سے نکل گیا۔

”چلو اٹھو اب نوران! آج رات ہم لالی کے ہاں رہیں گے، کھلے روتے ہو جائیں گے۔“ راجا نے کہا۔

”اگلی نہیں جائیں گے تھے؟“ نوران نے پوچھا۔

”نہیں..... کیا ابھی چلیں؟“

”راجا! وہ بھی ایسی ہی تاریک ادا سیوں سے گھری رات تھی، چپ میں بے سے یہاں



پہنچی تھی۔ اور آج بھی ویسی ہی سیاہ رات ہے۔ اُس روز ظلم مجھ پر ہو رہا تھا اور ظالم چودھری تھا۔ آج چودھری مظلوم ہے اور میں.....“ نورماں زور سے نکل دی۔ ”واہ رکی نورماں“

پھر نورماں نے موصو کو اٹھایا، چادر اوڑھی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سرخ حویلی سے نکل گئی، جس طرح تاریکی میں آگ کی تھی اور کسی نے اُسے آگے نہیں دیکھا تھا۔ بس سب کو سنا کہ پتہ چلا تھا کہ نورماں حویلی میں ہے، بالکل اسی طرح اب وہ حویلی سے نکلتی تھی اور صبح سارا پتہ چلنا تھا۔

اس کے نکلنے ہی دینو نے آہنی گیٹ بند کر دیا۔ حویلی کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نورماں پر بند ہو گئے۔ وہ جس طرح تین کپڑوں میں آئی تھی، ویسے ہی چلی گئی۔ مرزا چودھری کی زندگی کا سرمایہ لے آئی تھی۔ وہ ہار کر بھی جیت گئی تھی۔ مارنے کے بعد کی جیت دلوں میں گل و گلزار کھلا دیتی ہے، اس وقت یہی کیفیت نورماں کی بھی تھی!

☆.....☆

دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز پر لالی نے ساتھ کی چار پائی پر سوتے ہوئے شیدے کو جگایا۔ ”شیدے!..... اوشیدے!“ لالی نے اسے جھنجھوڑا۔ ”کیا ہے؟“ شیدا کسمسا کر رہ گیا۔ ”اٹھ، دروازے پر کوئی ہے۔“ لالی بولی۔ دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ شیدا بڑی مشکل سے اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔

”کون ہو بھئی؟“

”میں ہوں شیدے بھائی!“ نورماں نے کہا۔

”اوہ..... نورماں!..... آؤ، آؤ“ شیدے نے ہٹ کر راستہ دیا۔ نورماں اور راجا اندر آ گئے۔ لالی حیرت زدہ نظروں سے انہیں دیکھے جا رہی تھی۔ ”نورماں اور راجا کے ساتھ؟“ یہ سوال اس کے ذہن پر کسی آسیب کی طرح چھا رہا تھا۔ ”ہیٹھو نورماں!..... ہیٹھو راجا!“ شیدے نے اپنے بستر پر دونوں کو بٹھا دیا۔ ”کیسے آنا ہوا؟ اور وہ بھی تم دونوں اکٹھے؟“ شیدے نے ہنسنے ہوئے پوچھا۔ ”چودھری کہیں گیا ہے کیا؟“

لالی چٹھی چٹھی آنکھوں سے دونوں کو جک رہی تھی اور اس طرح کڑی تھی، جیسے اُسے سنا ہو گیا ہو۔ اس کا دل انجانے خروشوں سے دھڑک رہا تھا۔ ”اب میں ہمیشہ کے لئے حویلی سے آگئی ہوں۔ چودھری نے مجھے طلاق دے دی ہے۔“ نورماں نے شیدے کو بتایا۔

پھر راجا نے پوری تفصیل لالی اور شیدے کو بتادی۔ ”اچھا کیا کہ اُس نے نورماں کو طلاق دے دی۔“ شیدا بولا۔ ”نورماں! اُس نے طلاق دی ہے یا تُو نے لی ہے؟“ لالی اُن کے بچہ بھائی بار بولی۔ اس کے لہجے میں ایسی کاٹ تھی کہ نورماں کا دل ٹڑپ اٹھا۔ ”کچھ بھی سمجھ لو۔“ راجا ہنس کر بولا۔ آج تو خوشی اُس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

”بھئی کچھ روٹی کا انتظام کر، لالی! دونوں بھوکے ہی ہیں۔“ ”نہیں، اب ایسی بھی بھوک نہیں ہے۔“ راجا، نورماں کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ پھر لالی اٹھ گئی اور اُن کے لئے کھانا تیار کرنے لگی۔ نورماں بھی اس کا ہاتھ بٹانے کے لئے اٹھ کر اُس کے پاس چلی آئی۔ ”نورماں! میں تجھ سے خوش نہیں۔“ لالی نے نورماں سے شکوہ کیا۔ ”وہ کیوں؟“ نورماں حیرت سے بولی۔

”تُو نے یہ اچھا نہیں کیا۔ جھیلے! محبوبوں کو ٹھکرانا نہیں چاہئے۔ بہت مشکل سے ملتی ہیں بھیتیں۔ چودھری تجھے کتنا چاہتا تھا۔ جب تُو سات سال تک یہ ڈھونگ رچا سکتی تھی، جھولی محبت کا، تو کچھ اور سال بھی اسی طرح بٹا دیتی۔“ لالی نے دُکھی لہجے میں کہا۔ ”شاید تجھے علم نہیں، جس شخص سے نفرت ہوتی ہے۔ اس سے محبت کا کیل کھیلنا مشکل کام ہوتا ہے۔ میری جیسی عورت جو چودھری کی سنگت میں ہر رات مرتی تھی، اب اس نے سکھ کی سانس لی ہے۔“ نورماں نے کہا۔

”نورماں! مجھے پتہ ہے کہ طلاق لے کر تیرے اندر کی محبت خوش نہیں ہے۔ راجا کی محبوبہ، منشی اللہ دتہ کی بیٹی تو خوش ہے مگر چودھری کی بیوی اور موصو کی ماں اپنا گھر اُجاڑ کر خوش نہیں۔ تُو چاہے خود کو کتنی ہی تاویلیں دے کر مطمئن کر لے۔“ لالی نے نورماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ لکڑیوں کی آگ کی روشنی میں وہ نورماں کے چہرے کو دیکھ رہی تھی، جس پر خوشیوں کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔ بھجا بھجا سا چہرہ تھا۔ آنکھوں میں خوشی کا تھوڑا سا تاثر بھی نہ تھا۔

”اب میں تجھے کیسے بتاؤں کہ میں بہت خوش ہوں اور ہاں، راجا کو بھی پتہ نہیں چلنا پاسبان کہ سکندر میرا بیٹا ہے، سچھی؟“ نورماں نے اپنا منہ اس کے کان کے پاس لے جا کر کہا۔ ”کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔“ لالی ہو لے سے بولی، پھر نورماں اٹھ کر اُس کے پاس سے نکل گئی اور لالی تو بے پروائی ڈالتے ہوئے صرف نورماں کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔

☆.....☆



چودھری شوکت علی کی بے ہوشی اب تک نہ ٹوٹی تھی۔ وہ بار بار ”مومو..... مومو.....“ مہری پچی!“ کہتے۔ بے ہوشی کی حالت میں بھی انہیں صرف مومو یاد آرہی تھی، باقی سب کچھ بھول گئے تھے۔ چودھری طالب علی کا دل بھی بھائی کی یہ حالت دیکھ کر افسردہ ہو جاتا اور کبھی اس پر خوشیوں کی پھوار برسنے لگتی۔ شرف، شہر سے ڈاکٹر کو لے آیا تھا اور اس نے انکس بھی لگایا تھا، مگر بے ہوشی نہیں ٹوٹی تھی۔ لمبے سکتے ہوئے گزر رہے تھے۔ ہوائیں درختوں کے پتوں میں سے بین کرتی ہوئی گزر رہی تھیں اور کمرے میں جگر کو چلانی کرنے والا منہ چھایا ہوا تھا۔

رات کے پچھلے پہر انہیں ہوش آیا تو دینو دودھ کا گلاس لئے تیزی سے آگے بڑھا۔ چودھری طالب علی بھائی پر جھک گئے۔ چودھری شوکت علی گردن موڑے پورے کمرے میں دیکھ رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں کمرے میں گردش کر رہی تھیں۔ وہ جنہیں دیکھنا چاہتے تھے، وہ تو انہیں نظر نہ آئے۔

”شوکت! تم جنہیں ڈھونڈ رہے ہو، وہ یہاں نہیں ہیں۔“

”کیا مطلب؟..... کہاں ہے میری مومو؟..... دینو! جا، میری مومو کو لے کر آ۔“ چودھری شوکت علی گرجے۔

”مالک! وہ سب.....“ دینو کے حلق میں آنسوؤں کا چندرا لک گیا۔

”وہ لوگ چلے گئے ہیں۔ شوکی! نوران کا اب اس گھر پر کوئی حق نہیں۔“ چودھری طالب علی بولے۔

”مگر مومو کا تو حق ہے؟“ وہ چمک کر بولے۔

”تم نے خود ہی تو مومو بھی ان کے حوالے کی ہے۔“

”ہاں، ہاں..... مگر وہ مجھ سے ملائے بغیر لے گئے۔ کیوں آخر؟“ چودھری شوکت علی نے پوچھا۔

”مالک! میرے خیال میں وہ ابھی یہاں سے نہیں گئے۔“ دینو نے کہا۔

”جادیکہ، لالی کے ہاں ہوں تو لے آ مومو کو۔“ انہوں نے کہا۔

”میرے ساتھ وہ نہیں بھیجے گی۔ اور وہ بھی اس وقت۔“

”سورے ہی چلے جانا، شیرے کے گھر۔ لے آنا میری مومو کو۔ میں اُسے دیکھ کر واپس بھیج دوں گا، رکھوں گا نہیں۔ نوران کو مطمئن کر دینا۔ جب حالت میرے حق میں ہوں گے، نقد میرا ساتھ دے گی، تب مومو مجھے مل جائے گی۔ میں نے سب اس پر چھوڑ دیا ہے، جو سب کا پالنہ ہار ہے۔“ چودھری شوکت علی نے اُنکا چہرہ کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔ اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے جھللائے لگیں تو انہوں نے تکیے میں منہ چھپا کر آنسوؤں

کسی کے سامنے اپنی کوئی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ فائدہ بھی کیا ہوتا؟ بچپان میں اُن کے دل کے آئینے میں گرتے ہوئے مزید زخموں کا اضافہ کر رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

چودھری شوکت علی، دیوانہ وار مومو کو چوم رہے تھے۔ اُن کا انگ انگ سرشار تھا اور مومو حیرت سے اپنی گول گول آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے باپ کو دیکھ رہی تھی۔ صبح سویرے ہی دینو اُسے لے آیا تھا۔ نہ جانے کیسے انہیں خبر بھی نہ ہوئی اور اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر گالوں کو بھگونے لگے۔

”بابا!.....!“ مومو کے ہونٹ ہلے اور وہ اپنی چھوٹی چھوٹی ہتھیلیوں سے اُن کے گال صاف کرنے لگی۔ پھر باپ کے سینے سے لگ کر بھٹوٹ بھٹوٹ کر رو دی۔ شاید اس مومو کے دل نے بھی باپ کا دکھ محسوس کر لیا تھا۔ اُس کے خون میں بھی باپ کا دکھ سرایت کر گیا اور وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔ چودھری شوکت علی کے سینے سے بے قراری سے سر رگڑنے لگی۔ اس کے جو احساسات تھے، وہ کوئی نہ سمجھ سکتا تھا، صرف چودھری شوکت علی سمجھ رہے تھے۔ آخر باپ تھے اور وہ اُن کی بیٹی۔ باپ بیٹی، جن کا دکھ درد سا بچھا ہوتا ہے، اُسے بھی باپ کے آنسوؤں نے بتا دیا تھا کہ وہ ان کی شفقت سے محروم کر دی گئی ہے۔ چودھری شوکت علی، مومو کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔ اُس کا چہرہ اُن کے دونوں ہاتھوں میں تھا۔ مومو کی سیاہ آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخ ہو گئی تھیں، اُس کی بھگی بھگی پلکیں، کھلایا ہوا چہرہ..... اس کے باوجود ان کے دل کے ایوانوں میں مومو کی محبت کے جلت رنگ بج رہے تھے۔ وہ ان کی نگاہوں کو سرد بخش رہی تھی۔

چودھری طالب علی ان شدتوں اور بے قراریوں کو دیکھ رہے تھے۔ نہ جانے کیوں اُن کا دل بھی اپنے شوکی کو دکھی دیکھ کر رنجیدہ ہو گیا تھا۔ پھر دینو، مومو کو واپس نوران کے پاس چھوڑ آیا۔ واپس جاتے وقت کیسا تڑپ تڑپ کر روئی تھی وہ۔ دینو کی گود میں چل چل گئی تھی۔ شاید اُسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ اس گھر سے وہ اب ہمیشہ کے لئے جا رہی ہے۔

”بابا! مومو نے اپنی ننھی ننھی ہاتھیں پھیلا دیں تو چودھری طالب علی شق ہو گیا۔

”بابا! مومو تڑپ رہی تھی، چل رہی تھی اور اُس کی آواز چودھری شوکت علی کے زخموں پر گونجنے لگی۔ بابا، بابا کی صدائیں ان کے کانوں میں گرم سیسے کی مانند اتر رہی تھیں۔ اُسے آنکھیں نم ہو کر چلا گیا تھا۔ وہ اپنے باپ کے لئے مچلتی رہی، تڑپتی رہی مگر مصیبتیں تھیں جس کے ایک طرف وہ تھے اور دوسری طرف ان کی بیٹی تھی۔ دینو اُسے لے کر چلا گیا۔ تب چودھری شوکت علی کے اندر والا آدمی چل چل کر کہہ رہا تھا۔ ”ایک بار..... صرف



”لالہ! میں دنیا پور میں نہیں رہنا چاہتا۔ آئندہ میں کبھی یہاں نہیں آؤں گا۔“

”کہیں؟“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود آپ یہ کہہ رہے ہیں۔ مجھے آپ کا سوال بہت عجیب لگا۔ چودھری شوکت علی مضحل سی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر بولے۔

”اب تم یہاں کس کو چھوڑو گے؟“

”ہم تینوں بھائیوں کی زمینیں برابر ہیں۔ کیوں نہ آپ یا لالہ شجاعت مجھ سے زمینوں کا تبادلہ کر لیں۔ اگر میں یہاں رہا تو وقت سے پہلے ہی قبر کی تاریکیوں میں جا سوؤں گا۔ یادیں مجھے ناگ کی طرح ڈستی رہیں گی۔“

چودھری طالب علی ان کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔ ”شوکی! تو اتنا بد دل ہو گیا ہے۔ تیرا دل اتنا کھٹا ہو گیا ہے، یہاں سے؟“ ان کے دل میں ہلچل سی مچ گئی۔

”زہرہ سے کیا کہو گے؟“

”بہی کہ میں اسی کی وجہ سے حسن پور رہنا چاہتا ہوں کیونکہ اسے ہمیشہ مجھ سے شکایت رہا ہے۔ اس کی دعائیں خدا کے حضور مستجاب ہو گئی ہیں۔“

چودھری طالب علی نے سوچا کہ خود وہی زمینوں کا تبادلہ کریں گے کیونکہ اگر شجاعت سے کہتے تو بات کھل سکتی تھی۔ جبکہ یہ بات وہ اپنے تک ہی محدود رکھنا چاہتے تھے۔

چند ہفتوں کے اندر ہی دونوں بھائیوں نے آپس میں زمینوں کا تبادلہ کر لیا اور چودھری شوکت علی دل میں ہزاروں زخموں کو چھپائے حسن پور آ گئے۔ مگر ہر ہفتے وہ نئے جاننا نہ بولتے۔ زہرہ بیگم بھی ان سے اب بہت خوش رہنے لگی تھیں۔

ایک بار پھر چودھری شوکت علی کے دل میں مزید زخموں کا اضافہ ہو گیا۔ لہو لہو دل کو سنبھالتے وہ بے حال ہو گئے تھے اور درخت سے ٹیک لگائے گہری گہری سانسیں لے رہے تھے۔ قریب ہی دینو سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے خبر ہی ایسی سنائی تھی، جس نے دل کے نیچے آہٹ ڈیے تھے اور زخموں کے منہ ایک بار پھر کھل گئے تھے۔



ایک بار مجھے اپنی بیٹی کو سینے سے لگا لینے دو۔ مجھے صرف ایک بار اپنی کک اور تڑپ مل جائے۔ دو۔“ پر کسی نے ان کے دل کی نہ سنی۔ سب گونگے، بہرے اور اندھے ہو گئے تھے۔

کہتے ہیں، وقت بہت بڑا حکیم ہے۔ گہرے سے گہرا زخم بھی مندرل کر دیتا ہے، مگر زخم ایسے ہوتے ہیں، جو کبھی مندرل نہیں ہوتے۔ ایسے زخموں کو روح کے زخم کہا جاتا ہے، جو گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ناسور کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ ظاہری طور پر یہ زخم کبھی نظر نہیں آتے لیکن یہ اندر ہی اندر انسان کو کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ آخر ایک روز ان زخموں کی ٹیسیں انسان کو بے حال کر دیتی ہیں اور وہ وقت سے پہلے ہی ذہنی طور پر بلوڑھا ہو جاتا ہے کہ اس عمر میں وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہی حال چودھری شوکت علی کا تھا۔

انہوں نے بھی اب حالات سے سمجھنا کر لیا تھا۔ وہ ہر ہفتے دینو کو لے کر نئے چلے جاتے۔ وہ گاؤں سے باہر کسی درخت تلے کھڑے ہو جاتے، دینو جا کر مومنو کو لے آتا اور جب مومنو ان کے پاس آ جاتی تو ان کے تڑپتے چلنے والے دل کو ایک دم قرار آ جاتا۔ ان کی آتما کی شانتی مل جاتی۔ وہ اسے سینے سے چمٹائے بے خود ہو جاتے۔ ان کا جی چاہتا، مومنو کو لے کر یہاں سے کہیں دُور، بہت دُور چلے جائیں جہاں لالہ نہ ہوں، زہرہ نہ ہو، راجا جیوانک حرام انسان نہ ہو، نوران جیسی بے وفا عورت نظر نہ آئے۔ مگر وہ کہاں جاتے؟ انہیں ہر جگہ لالہ جیسے ظالم انسان ملتے، راجا جیسے کینی فطرت کے انسان ملتے اور نوران جیسی جھوٹی عورتیں ملتیں۔ وہ بس وقت کے منتظر تھے۔

چودھری شوکت علی دنیا پور میں نہیں رہنا چاہتے تھے۔ آخر وہ رہنے بھی کیوں؟ یہی تو وہ جگہ تھی، جہاں آ کر وہ خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے رہے تھے۔ یہیں پر انہوں نے سب کچھ پایا اور یہیں پر کچھ خرچے بعد سب کچھ کھو دیا۔ دنیا پور ہی تو وہ جگہ تھی، جہاں کے پنگھٹ پر انہوں نے نوران کو پہلی بار دیکھا تو ان کے دل میں نرم و گداز جذبات کے انبار لگ گئے۔ یہیں تو ان کے دل نے دھڑکننا سیکھا اور کسی کو اپنانے کی خواہش تھی اور اسے با بھی لیا تھا۔ پھر یہیں ان کے ارمانوں کا جنازہ نکلا، خواہشیں پامال کی گئی اور انہیں پتہ چلا کہ وہ اب تک جھوٹی محبتوں پر قناعت کئے ہوئے تھے۔ وہ محبتوں کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتے رہے، بالکل اس پیاسے کی مانند جو سراب کو پانی سمجھ کر آگے بڑھتا ہے اور انہوں نے جو محبت پائی تھی، وہ بھی تو سراب تھی۔ محبت کی تلاش نے ان کے دل کے خلا وسیع تر کر دیے۔ اس حویلی کے چپے چپے میں نوران اور مومنو کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ بستر میں سے نوران کی خوشبو آتی تھی۔

بالآخر انہوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دنیا پور سے چلے جانے کا فیصلہ کر لیا اور ایک روز انہوں نے چودھری طالب علی سے کہا۔



بعض اوقات زندگی میں ایسے مقام بھی آتے ہیں کہ انسان کو اپنا وجود بوجھ لگنے لگتا ہے۔ بس ایک دم مر جانے کو جی چاہتا ہے۔ زندگی ٹھنڈ اور ٹھہری ہوئی معلوم ہوتی ہے اور اس کا وجود کوئی تحریک بھی نہیں توڑ سکتی۔ جب دل پر اُداسیاں ٹوٹ کر برس رہی ہوں تو پوری کائنات اُداس معلوم ہوتی ہے۔ بعض دکھ ایسے ہوتے ہیں، جو کسی سے بتائے بھی نہیں جا سکتے کہ دل پر دھری برف کی ریل جیسا بوجھ کم ہو جائے۔ ایسے دکھوں کو تنہا ہی جھیلنا پڑتا ہے۔ انسان کچھ دکھ، اُداسیوں اور تنخیوں کو خود اپنے ہی ہاتھوں حاصل کرتا ہے۔ یہی حال چودھری شوکت علی کا بھی تھا۔ اچھی خاصی زندگی گزر رہی تھی کہ انہوں نے اپنے لئے اُداسیاں حاصل کر لیں۔ نوراً کو حاصل کر کے وہ دکھوں کے بحر بے کراں میں کود گئے۔ ہر لمحے ذہن پر خوف سا طاری رہتا۔ ایک مسلسل عذاب تھا، جو اُن کی روح جھیلی تھی۔ وہ خوف زدہ تھے، آنے والے وقت سے، راجا سے اور سب سے بڑھ کر زہرہ بیگم اور طالب علی سے۔ نہ جانے کیوں اُن کی چھٹی جس کسی حادثے کی طرف اشارہ کرتی رہتی۔ ہر لمحے دل کو دھڑکا کا لگا رہتا تھا۔ اس دھڑکے نے جان عذاب میں ڈال رکھی تھی۔ جس روز انہوں نے نوراً کو دیکھا تھا، اُس روز سے لے کر اب تو وہ کسی پُر سکون منہ بنا رہے تھے۔ نوراً قریب ہوتی تو انہیں شب بھی یقین ہوتا کہ نوراً کا دل ان کے لئے نہیں دھڑکتا، مگر جب نوراً نے ان کے سامنے یہ اعتراف کیا کہ وہ انہیں چاہتی ہے، تب بھی دل کی تہوں میں عجیب سا شور تھا۔

زہن سے یہ خیالی بری طرح چٹ کر رہ گیا تھا کہ نوراً نے مصالحت کی خاطر ایسا کیا ہے۔ اس نے اپنی محبتوں کے قحطی بھائے ہیں۔ اس محبت نے نوراً سے خراج وصول کیا ہے جو اسے راجا سے تھی اور اس نے راجا کی خاطر یہ جھوٹ بولا ہے۔ مگر نوراً کے اعتراف نے وقتی طور پر ان کے من کے آنگن میں بے شمار پھول کھلا دیئے اور وہ ان پھولوں کی خوشبو سے برہوش ہو گئے، لیکن گزرتی ساعتوں نے انہیں بتا دیا کہ جو وہ سمجھے تھے، وہ درست ہے۔ نوراً کے لبوں کی مسکراہٹ کا ساتھ اس کی آنکھیں نہ دیتی تھیں۔ ان بھونرے جیسی آنکھوں

میں اُداسیوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ بعض مرتبہ ان کا جی چاہتا وہ اس اُداسی کا سبب بنیں مگر پھر وہ خود کو سرزنش کرتے، اپنے جی کو سمجھاتے، خود کو دلیلوں سے بہلاتے۔ کیونکہ بھلائی کے ہزاروں بہانے ہوتے ہیں۔

”تمہیں پتہ تو ہے شوکت! پھر پوچھ کر کیا کرو گے؟ اگر اس نے سچ سچ بتا دیا تو تم مزید دکھوں کی سولی پر لٹک جاؤ گے۔ جیسی گزرتی ہے، گزرنے دو۔ تمہیں جس سے خطرہ ہے وہ تو تمہاری قید میں ہے۔ پھر کا ہے کا خوف؟“ بس وہ اسے اُداس اُداس نظروں سے دیکھتے رہتے، سچے۔ ”نور! میں نے تو تمہیں پوچھا ہے۔ چاہا ہی نہیں، تمہاری عبادت بھی کی ہے لیکن اے میرے من مند کی دیوی! تُو پتھر ہے۔ ایسا پتھر جس میں کوئی جذبہ، کوئی احساس نرمی پیدا نہیں کر سکتا اور کوئی محبت اثر نہیں کرتی۔ مگر وہ ایک روز خود بخود چٹ جاتا ہے۔

تم میری زندگی ہو۔  
تم میری روح ہو۔  
میرا نور ہو۔  
میرا دل ہو۔  
بس میں تمہیں دل کی تمام تر گہرائیوں سے چاہتا ہوں۔  
مجھے تم یونہی اپنی بناؤ محبت کا آسرا دیئے رہو۔ مجھے بکھرنے نہ دینا، بس مجھے اپنی اس محبت سے محروم نہ کرنا۔“ وہ نظروں ہی نظروں میں اُسے دل کی تہوں میں اتارتے رہتے۔ دل کی سرزمین پر اس کے نقش ثبت کرتے رہتے، مگر دل کو جو دھڑکا لگا تھا، وہ پورا ہو کر رہا اور اس وقت جب وہ اپنا پورا پورا نوراً کی محبت میں فنا کر چکے تھے، ان کے بھائی نے ہی ان کی محبتوں پر شب خون مارا تھا اور ان کے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے۔ وہ اس قدر چھوٹے چھوٹے ذروں میں بٹ چکے تھے کہ خود کو سمیٹنا محال تھا اور انہیں علم تھا کہ اب پوری زندگی یونہی بکھرے بکھرے گزرے گی۔

نوراً کی شادی کی اطلاع نے انہیں مزید بکھیر دیا۔ حالانکہ یہ تو ہونا تھا۔ انہیں اس بات کا علم تھا مگر انسان حقیقتوں کا علم ہونے کے باوجود خیلی زندگی میں رہنا پسند کرتا ہے۔ خواب جو بہت سہانے ہوتے ہیں، خوابوں کے ان گنت پھول دل کی دیواروں سے لپٹے رہتے ہیں۔ ان کی خوشبو سے من کا آنگن مہکتا رہتا ہے مگر حقیقتیں بڑی ظالم ہوتی ہیں۔ زہر کی طرح قطرہ قطرہ حلق سے بڑی مشکل سے اُترتی ہیں اور وہ نوراً کی شادی کی حقیقت کو اپنے طور پر قبول کرتے کرتے پیار پڑ گئے تھے۔ کوئی ذہن پر مسلسل ہتھوڑے برسانا رہتا۔ اپنے لٹ جانے کا احساس بڑا جان لیوا ہوتا ہے اور سنبھلنے میں کافی عرصہ درکار ہوتا ہے۔

بہت مشکل ناگ کی طرح ڈستی رہتی ہیں۔



”لو چودھری! تمہاری محبت، تمہاری بیٹی کی ماں ایک غریب عرار کی انگوٹھی ہے..... کہاں گیا تمہارا ظلم؟..... کیا ہوئے تمہارے دلوں؟ اور کیا ہوئی تمہاری محبت؟ کیا ہوئے وہ جذبات و احساسات؟“ کوئی سلسل سرگوشیاں کرتا۔ جذبے تو راجا کے بچے تھے محبت تو اُس کی لازوال تھی جس نے اتنے انتظار کے بعد بھی نوراں کو پالیا تھا۔ چاہے وہ مسلا ہوا پھول تھی، اس کی خوشبو اڑ چکی تھی۔ مگر پھر بھی اس نے حاصل کر لیا۔ بڑے طرز کا مالک تھا کہ اس نے بچی کو بھی قبول کر لیا تھا۔ ”تو کیا میرے جذبے بچے نہ تھے؟“ چودھری شوکت علی کے دل میں عجیب سا درد ہلکوارے لیے لگتا لیکن انہیں اپنے اس سوال کا جواب کبھی نہ ملا۔ وہی خلفشار نے انہیں پیار کر دیا۔ دماغ جوار بھانا ہوا تھا دل میں ہرمت آگ لگی ہوئی تھی اور اس آگ میں اُن کا اپنا وجود جھلسا جا رہا تھا۔ وہ جی جی کر مر رہے تھے اور مر کر جی رہے تھے۔ اتنے دکھ..... اتنی اذیتیں کہ انسان سے نہ جیا جاتا ہے اور نہ ہی مرا جاتا ہے۔

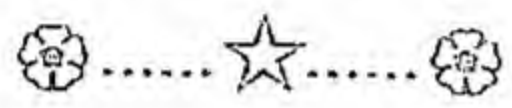
”خداوند!..... یہ کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے؟..... کیا محبت کرنا اتنا بڑا جرم ہے؟ خواہشوں کی تکمیل کے لئے اتنی بڑی سزا ہے، اس کا تو مجھے ظلم بھی نہ تھا۔ اگر پتہ ہوتا تو کبھی بھی بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ نہ ڈالتا۔“

چودھری شوکت علی کا پنڈا تاپ سے جھلستا رہتا اور ذہن کے پیٹ فارم پر واقعات صورتیں بدل بدل کر دہناتے پھرتے۔ وہ اپنے دل کے درد کو سنبھالتے سنبھالتے بے حال ہوئے جاتے۔ ان میں جینے کی کوئی اُمید باقی نہ رہی تھی۔ جی چاہتا، مر جائیں، اس دنیا سے منہ موڑ لیں۔ مگر موت بھی تو اپنی مرضی سے آتی ہے۔ ہر خواہش تھوڑی پوری ہوتی ہے جو ان کے مرنے کی خواہش پوری ہو جاتی۔

زہرہ بیگم نے ان کی خدمت گزاری میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ رات دن اُن کا ہٹی سے لگی بیٹھی رہتیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بھلے چنگے چودھری شوکت علی آخر ایک دم کیوں اتنے پیار ہو گئے ہیں؟ وہ جتنا سوچتیں، اتنی ہی الجھتی جاتیں۔ ہاں، اس بیماری کا چودھری طالب علی کو ضرور علم تھا۔ انہوں نے شہر سے دو مشہور ڈاکٹروں کو بلایا تھا، جو گزشتہ تیرہ روز سے حسن پور میں موجود تھے۔ چودھری طالب علی نہیں چاہتے تھے کہ بار بار ڈاکٹروں کو بلائے پھریں۔ ان دونوں نے بیماری کی وجہ ذہنی صدمہ بتایا تھا۔

”ذہنی صدمہ!“ زہرہ بیگم حیران تھیں۔ چودھری طالب علی ہی جانتے تھے کہ ان کا بھائی درد کے کون سے دریا کر گزر کر آیا تھا۔ بعض مرتبہ جب ان کا دل بھائی کی محبت سے بھر جاتا تو جی چاہتا، ابھی جا کر شوکی کی اصل معالج کو لے آئیں تاکہ شوکی وہی ہنسا سکرانا شوکی بن جائے۔ گئے دنوں کا شوکی لوٹ

نہ۔ مگر پھر وہ ایک دم بڑے بن جاتے۔ خاندان کے بڑے، جن کا فرض تھا کہ اپنے خاندان میں غیر خاندان کے خون کی آمیزش نہ ہونے دیں اور جو جرم شوکت نے کیا تھا اسے ان کی پوری پوری سزا ملنی چاہئے تھی۔ جب بھائی سے وہ خاندان کے سربراہ بنتے تو دوبارہ ان کی پوری طالب علی بن جاتے۔ وہ چاہتے تھے کہ بتاوت کا نوراً سر چل دینا چاہئے۔ پھر دل چودھری طالب علی بن جاتے۔ وہ چاہتے تھے کہ بتاوت کا نوراً سر چل دینا چاہئے۔ اُسی حرکت ان کے لخت جگر صفدر یا شعیب کرتے تو وہ ان کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتے اور اگر حقیقت میں ایسا ہو جاتا تو وہ یقیناً ظالم چودھری بن جاتے۔ اولاد بہت پیاری ہوتی ہے۔ یہ نول کے ٹکڑے ہوتے ہیں۔ کسی بھی ٹکڑے کو تکلیف ہو، درد پورے جسم پر مسلط ہو جاتا ہے۔ ہر شے کی اپنی اہمیت ہے۔ بیٹے اور بھائی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ باپ ہمیشہ پوری شفقت و محبت کے سامنے مجبور ہو جاتا ہے۔ بیٹے کی محبت پاؤں کی بیڑی بن جاتی ہے کیونکہ آگے انسان کو زندہ رکھنے کے لئے، اُس کی نسل چلانے کے لئے بیٹے ہی تو کام آتے ہیں۔ بیٹوں ہی سے تو نام زندہ رہتا ہے جبکہ بھائیوں سے باپ کا نام چلتا ہے۔



چودھری شوکت علی پورے ڈیڑھ ماہ بعد اپنے حواس میں آئے تھے۔ انہیں ہوش و حواس میں لانے والی ہستی مومو تھی۔ مومو کی ذات نے ان کے دل میں جینے کی اُمید پیدا کر دی تھی۔ مومو کے خیال نے ان کی زندگی کے ٹٹھٹھاتے چراغ کی لو بڑھائی تھی۔ مومو کا خیال ہی روشنی کا وہ واحد مینار تھا، جس نے انہیں راستہ دکھایا تھا۔

چودھری شوکت علی نے سوچا۔ یہ ضروری تھوڑی ہے کہ پوری زندگی حسب مرضی گزاری جائے۔ محرومیوں، ناکامیوں اور شکستوں کو بھی گلے لگا کر جینا پڑتا ہے۔ میں جیوں گا اور مجھے جینا بھی چاہئے، مومو کی خاطر..... اپنی سوہنی دلی کے لئے..... اپنے جگر گوشے کے لئے..... میں جیوں گا، مومو!..... میں تجھے حق دلاؤں گا۔ رنگ محل تو چودھری سرفراز علی کی پتی کی حیثیت سے ضرور آئے گی۔ میں تجھے رنگ محل میں دیکھنا چاہوں گا۔ اب میری یہ آخری خواہش ہے اور شدید تر۔ میں سب سے تسلیم کراؤں گا کہ تُو میری ہے، میری بیٹی ہے۔ تیری شریانوں میں میرا خون دوڑ رہا ہے۔ مجھے دنیا میں سب سے نفرت ہو گئی ہے، سوائے تیرے، مومو! سوائے تیرے۔ تو جو میری خواہشوں کی تکمیل ہے، میں تجھے کسی کا تھکا نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے علم ہے کہ لالہ طالب علی نے کیوں نوراں کو مجھ سے علیحدہ کیا ہے۔ میں ان کے اندر کے تمام موموں کو پہچانتا ہوں۔ انہوں نے صرف اور صرف میری بیماریاد کے لئے ہمارے درمیان دچھوڑے ڈالے ہیں۔ مجھے درد کے بحر بے کراں میں اسیلا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں بے اولاد ہی رہوں اور جب مروں تو اپنی تمام دولت انہیں اسی جاؤں۔ میں سب سمجھتا ہوں، بے وقوف نہیں ہوں۔ مومو! میں تیرا حق تجھے دوں گا۔



بس پُتر! کچھ غصہ تو باپ کی مجبوریاں سمجھ لے، میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا میری جاننا..... تیرا بابا بزدل نہیں ہے۔ تیری سنی سنی ہانپوں کا ہار ہے۔ میری روح! میں تجھے تیرا حق دلانے کے لئے آخری حد تک پہنچ جاؤں گا، چاہے سب کو ختم کر کے خود کو دار پر لٹکا دوں۔ میں صرف تیری خاطر جیوں گا، مومو! میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تو میری بیٹی ہو کر راجا جیسے مکی کے ٹکڑوں پر پلٹی رہے۔ میں زندہ رہوں گا۔" انہوں نے خود سے، مومو سے ہر ایک اس عہد نے چودھری شوکت علی کی شریانوں میں خون کی گردش تیز کر دی۔ ان کے جسم میں نئی روح، نیا دلولہ جاگ اٹھا۔ کچھ کرنے کا احساس شدت اختیار کر گیا۔

پورے ڈیڑھ ماہ بعد جب چودھری شوکت علی کی حالت سنبھلی تو ڈاکٹر اسے اپنی کامیابی تصور کرنے اور اپنی دواؤں کو صحت یابی کی ضمانت سمجھنے لگے، مگر وہ چاہے کچھ بھی سمجھے، یہ تو چودھری شوکت علی کو علم تھا کہ کس احساس اور کس عہد نے انہیں موت سے دُور اور زندگی سے قریب تر کر دیا ہے۔ مومو کا وجود ہی ان کی زندگی تھا۔ زہرہ بیگم بھی بہت خوش تھیں، انہوں نے تو شوہر کے لئے کتنی مٹھیں مرادیں مانیں اور شوہر کے ٹھیک ہونے پر انہوں نے غرباء میں اناج تقسیم کیا، کالے بکروں کا صدقہ اُتارا اور جتنے کے روز غسلِ صحت کے سلسلے میں جشن کا اہتمام کر ڈالا۔

"اوہ، زہرا! آپ اتنا کچھ کیوں کر رہی ہیں؟" چودھری شوکت علی اُن کی محبت دیکھ کر شرمندہ ہو گئے۔

"خدا نے آپ کو نئی زندگی سے نوازا ہے۔" زہرہ بیگم نے نہایت محبت سے کہا۔

"اچھا....." وہ نہ جانے کیوں ہنس دیئے۔

"شوکت! زہرہ بیگم نے ان کے عجیب طریقے سے ہنسنے پر انہیں دیکھا۔

"آپ کو کیا پتہ کہ قدرت نے کیوں نئی زندگی دی ہے؟" چودھری شوکت علی نے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"آپ کو پتہ ہے؟" زہرہ بیگم نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں۔" انہوں نے ایک سر دآہ بھری اور چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"قدرت نے بہت اہم کام کروانا ہے..... حق دار کو حق دلوانا ہے۔ اس لئے مجھے زندگی دی ہے۔ ورنہ آج آپ رنگ محل میں چراغاں کرنے کے بجائے میری قبر پر چراغاں....."

"خدا نہ کرے۔ کیوں بد فال منہ سے نکالتے ہیں؟" زہرہ بیگم نے تڑپ کر ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ان کا چہرہ مارے صدمے کے زرد ہو گیا تھا۔

"ارے..... آپ ڈر گئیں؟" چودھری شوکت علی زور سے ہنس دیئے۔ پھر وہ اپنے دل

کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے زور زور سے ہنسنے لگے۔ اندر کے دُکھوں کو انہوں نے قہقہوں میں چھپانا شروع کر دیا تھا۔

"آپ باتیں جو ایسی کر رہے ہیں۔" زہرہ بیگم نے ہولے سے کہا۔

"یہ باتیں، کیا مرنا نہیں؟" چودھری شوکت علی نے ان کا ہاتھ تھام کر نہایت لگاؤ سے پوچھا۔

"مرنا ہے اور یہ اٹل حقیقت ہے۔"

"جب آپ اس اٹل حقیقت کو تسلیم کرتی ہیں تو پھر خوف زدہ کیوں ہیں؟"

"ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے؟" زہرہ بیگم نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں..... آپ کو علم ہے کہ میری عمر کیا ہے۔ کیونکہ گودوں کھلایا ہے۔" چودھری شوکت بولے۔

"شوکت! زہرہ بیگم کے لہجے میں دبا دبا احتجاج تھا۔

"آپ خود ہی تو کہتی ہیں۔"

"اب تو نہیں کہا۔" زہرہ بیگم نے آہستہ سے جواب دیا۔

"ہاں..... کافی عرصے سے کان اس مخصوص جملے کے عادی ہو گئے ہیں نا! اب سننے کو نہیں ملتا تو عجیب سا لگ رہا ہے۔" چودھری شوکت علی نے آنکھیں موند لیں۔

"جب مجھے بہت غصہ آتا ہے، تب کہتی ہوں، ورنہ تو نہیں۔" زہرہ بیگم نے سر جھکا کر نہایت آہستگی سے کہا۔ وہ واقعی شرمندہ تھیں۔ شوکت نے کبھی بھی تو اُن سے اتنے نرم لہجے میں احتجاج نہیں کیا تھا اور شوکت علی کا یہ نرم لہجہ ان کو پانی پانی کر گیا۔

"میں آپ کے لئے سوپ لے آؤں۔" وہ شرمندگی مٹانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"زرا دینو کو بلوا دیں۔" چودھری شوکت علی نے ان کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"اچھا!" زہرہ بیگم نے کہا اور پھر اٹھ کر باہر جا رہی تھیں کہ چودھری طالب علی دروازے پر دستک دے کر اندر آ گئے۔ زہرہ بیگم باہر چلی گئیں۔

چودھری شوکت علی نے لیٹے لیٹے ہی دروازے کی سمت دیکھا اور چودھری طالب علی پر ٹکڑے ہنسنے لگیں۔ دل میں طغیانی سی آ گئی۔ دل کی تہوں میں شور مچ گیا۔

"چلے جاؤ، لالہ! مجھے تم سے نفرت ہے۔" ان کے اندر کوئی چیخ اُٹھا۔ دل میں حشر برپا ہو گیا۔ "تم میرے دشمن ہو، میرے دوست، میرے بھائی نہیں ہو۔ تم نے مجھے برباد کر دیا، میرے آشیانے کے تنکے بکھیر دیئے، میری اکلوتی بیٹی کو مجھ سے جدا کر کے کٹیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ تم چلے جاؤ! مجھے تم سے نفرت ہے..... نفرت ہے۔"



”شوکی!“ چودھری طالب علی نے محبت سے لبریز لہجے میں انہیں پکارتے ہوئے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا اور ان کی سرد پیشانی پر چودھری طالب علی کا گرم ہاتھ ایک آگ کی لہجہ لگا گیا۔ چودھری شوکت علی یونہی بے حس و حرکت پڑے رہے، کوئی جواب نہیں دیا۔

”مجھے علم ہے کہ تم سو نہیں رہے۔“ چودھری طالب علی نے سستے ہوئے مشفق لہجے میں کہا۔

”نیند بھی نصیبوں والے کو آتی ہے۔“ چودھری شوکت علی نے آنکھیں کھول کر خود چمکے چودھری طالب علی کو دیکھا اور چودھری طالب علی کا چہرہ ایک دم بجھ کر رہ گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹے۔ چودھری شوکت علی اب بھی ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ان گنت سوال تھے، شک تھے، شکایتیں تھیں اور چودھری طالب علی اپنے چھوٹے بھائی سے نظریں نہیں ملا رہے تھے۔ شوکت علی کی نظروں کی پیش سے وہ موم کی طرح پگھلے جا رہے تھے۔ ان کی نگاہوں کے حصار سے اپنا آپ بچانا انہیں مشکل ہو رہا تھا۔

”شوکی!..... یقین کر شوکی! اگر تیرے والی حرکت شعیبی بھی کرتا تو میں اس سے بھی پی سلوک کرتا۔“ چودھری طالب علی نے ان کا کمزور سا ہاتھ تھام لیا۔

”میں نے آپ سے شکوہ تو نہیں کیا۔“ چودھری شوکت علی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”تُو کچھ نہ کہہ، مگر میری جان! میں تیرے اندر کی حالت سے واقف ہوں۔ شوکی! میں خاندان کا بڑا ہوں اور یہ سب کچھ میرے فرائض میں شامل تھا، جو میں نے کیا۔ اگر آج بابا ہوتے تو یہی کرتے۔“ انہوں نے صفائی پیش کی۔

”میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ بابا نے مجھے شادی کی اجازت دی تھی۔“ چودھری شوکت علی بولے۔

”ہمارے سامنے انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔“ چودھری طالب علی نے کہا۔

”تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟“ وہ چیخ پڑے۔

”شوکی دیکھ! اگر تُو شادی ہی کرنا چاہتا تھا تو مجھ سے کہتا۔ میں کسی رئیس زادی سے تیری شادی کر دیتا، تاکہ کچھ زمینیں بھی آئیں۔ جائیداد.....“

”اور اسی جائیداد کی خاطر تو آپ نے مجھے تباہ کر دیا ہے۔“ چودھری شوکت علی نے ان کی بات کاٹ کر برہمی سے کہا۔

”ہولے بول، کوئی سن نہ لے۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔“ چودھری طالب علی نے کہا۔

چودھری شوکت علی انہیں زخمی نظروں سے دیکھ کر رہ گئے۔ پھر انہوں نے یوں آنکھیں

بدر لیں، جیسے لالہ کو دیکھنا ہی نہ چاہتے ہوں۔

”تجھے تیری بیٹی سے تو ملنے سے نہیں روکا ہم نے۔“ چودھری طالب علی نے احسان

بتایا۔

”روکنا، نہ روکنا برابر ہے۔“ چودھری شوکت علی نے ذرا سی آنکھیں کھول کر اپنے

انٹوں تلے ہونٹوں کو بھینچ کر آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔

”تُو ملنے جاتا رہا ہے اُس سے، مجھے علم ہے۔“ چودھری طالب علی نے بظاہر انکشاف

کیا۔ مگر اس انکشاف کی چودھری شوکت علی کے نزدیک کوئی اہمیت نہ تھی۔

”اور پھر یہ بھی علم ہو گا کہ راجا نے نورماں سے شادی کر لی ہے۔“ چودھری شوکت علی

ہونٹ چبا کر بولے اور یہ بتاتے ہوئے ان کے دل پر آ رہے چل گئے تھے۔

”نچ!“ چودھری طالب علی خوشی سے کھل گئے۔ یہ بات انہیں معلوم نہیں تھی۔

”ہاں..... آپ کے بھائی کے حرار پر اُس نے بیج سجائی ہے۔“ چودھری شوکت

بولے۔

”شوکی! تُو دل مند نہ کر۔ یہ کئی لڑکیاں اچھی نہیں ہوتیں۔ دیکھ، وہ تجھ سے شادی

کرنے کے باوجود اُسی راجا کو چاہتی رہی۔“ چودھری طالب علی نے بتایا۔

”لالہ! محبت صلہ نہیں مانگتی۔ محبت دیتی بہت کچھ ہے اور لیتی کچھ بھی نہیں۔ ہاں، اگر

محبت کرنے والوں کی دھڑکنیں ہم آہنگ ہو جائیں تو وہ دنیا کے خوش قسمت انسان ہوتے

ہیں۔ مگر میرے ساتھ معاملہ اُلٹ تھا۔ کچھ بھی ہے، وہ میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ اسی

سے میری خواہش کی تکمیل ہوئی ہے۔ مجھے میری مومو ملی ہے۔“ چودھری شوکت علی مارے

جوش کے اُونچا اُونچا بولے جا رہے تھے۔

”اوہو..... لے بول شوکی!“ چودھری طالب علی نے انہیں سرزنش کی۔

”میں آج مومو سے ملنے جاؤں گا۔ میں نے دینو کو بلایا ہے۔“ اُن کی سرکشی عود کر

آئی۔

”باگل ہوا ہے؟“ چودھری طالب علی بولے۔

”کچھ بھی سمجھیں، میں اس سے ملنے ضرور جاؤں گا۔ میں نے کب سے اُسے نہیں

دیکھا۔ آپ اتنے عرصے اپنے بچوں سے علیحدہ رہ سکتے ہیں؟“ چودھری شوکت علی نے سوالیہ

نظروں سے بھائی کو دیکھا۔

”ابھی صرف ڈیڑھ ماہ تو ہوا ہے۔“ چودھری طالب علی نے کہنا چاہا۔

”صرف ڈیڑھ ماہ.....“ چودھری شوکت علی ڈکھی انداز میں ہنس دیئے۔ ”آپ کے

لئے صرف ڈیڑھ ماہ ہے، مجھے دیکھیں، یوں لگتا ہے جیسے صدیاں گزر گئی ہوں، مومو کو دیکھ



ہوئے، اس کو پیار کئے ہوئے۔ وہ میری تمناؤں اور آرزوؤں کا مرکز ہے۔“  
”شوکی! چند روز اور.....“ چودھری طالب علی نے پیار سے سمجھایا۔

”نہ لالہ! میرے اندر جو لالہ ڈسک رہا ہے، وہ صرف مومن کو سینے سے لگا کر ہی ٹھہرا سکتا ہوں۔ اس آگ پر اُس کی مصوم اور ہر کھوٹ سے پاک محبت ہی چھینٹے ڈال سکتی ہے۔ اور میں آج ضرور جاؤں گا۔“ چودھری شوکت علی مضبوط اور حتمی لہجے میں اپنا فیصلہ سناتے ہوئے بولے۔

چودھری طالب علی چند لمحے انہیں دیکھتے رہے، ان کے چہرے کی کرسنگی یہ بتا رہی تھی کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں، اس پر عمل کریں گے۔ اُن کی ضد اور سرکشی حد سے بڑھ گئی تھی اور چودھری طالب علی کو علم تھا کہ ان کی ذرا سی بھی بات آگ پر تیل کا کام کرے گی اور شیطا بھڑک اٹھیں گے۔ اس لئے انہوں نے بجائے سمجھانے کے اُن سے پوچھا۔  
”کیسے جاؤ گے؟“

”جیپ پر۔“ چودھری شوکت علی نہایت بے پروائی سے بولے۔  
”خود چلاؤ گے؟“ چودھری طالب علی نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
”ظاہر ہے، پہلے بھی تو چلاتا رہا ہوں۔“  
”مگر پہلے اور اب میں بہت فرق ہے۔ تم اتنی طویل بیماری سے اُٹھے ہو اور ابھی کمزور ہو۔ یہ سفر تمہیں بیمار کر دے گا۔“

”اب میں بیمار نہیں ہوں، بالکل ٹھیک ہوں۔“ چودھری شوکت علی بولے۔  
”کیا لکھ کر بیٹھے ہو؟“ چودھری طالب علی کا لہجہ شگفتہ تھا۔  
”یہی سمجھ لیں۔“

”تو میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“  
”آپ؟“ چودھری شوکت علی نے حیرت سے انہیں دیکھا۔  
”ہاں..... میں اور دینو۔ میں تمہیں اکیلا بھیجنے کا خطرہ منزل نہیں لے سکتا۔“ چودھری طالب علی نے کہا۔

”مگر.....“ چودھری شوکت علی نے کہنا چاہا۔  
”اگر مگر کچھ نہیں شوکی! میں تیری ہر بات نہیں مان سکتا۔“ چودھری طالب علی سختی سے بولے۔

”کون سی بات مانی ہے آپ نے میری؟“ چودھری شوکت علی کا جی چاہا، کہہ دیں گے۔  
”نہ جانے کیوں ان الفاظ کا زبان نے ساتھ نہ دیا اور یہ صرف دل کی دیواروں میں گونج رہے گئے۔“

”میں ابھی جیپ نکلاتا ہوں۔ بھائی کو بتا دوں گا کہ تمہارا ایکسرے کروانے شہر چارہا کل پھر جشن ہے، ہم شام تک آ جائیں گے۔ تُو تیار ہو جا۔“ چودھری طالب علی نے بولے۔  
”نہایت محبت سے کہا اور ان کی پیشانی چوم کر باہر آ گئے۔“

”ہف! یہ محبتیں، یہ عنایتیں، یہ نوازشیں سب دکھاوا ہیں۔ یہاں کسی کو کسی سے محبت نہیں، یہ صرف دکھاوا ہے لالہ کا، اور کچھ نہیں۔“ انہوں نے یہ سوچتے ہوئے پلنگ کی پشت سے ٹپک لگا کر آنکھیں موند لیں اور نہ جانے کیوں آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ پھر بھی ان کا دل بلیوں اُچھل رہا تھا، مارے خوشی کے۔ مومن سے ملنے کی خوشی، اپنی بیٹی کو سینے سے لگانے کی خوشی میں اُن کے دل کے آنگن میں محبتوں کے سونے پھوٹ نکلے۔



رات کو وہ جب مومن سے مل کر آئے تو بہت خوش تھے۔ اتنے خوش، جیسے کوئی بچہ اپنا نیا کھلونا پا کر ہوتا ہے۔ ان کے لب کھلے جا رہے تھے۔ چہرے پر خوشیوں کے ان گنت رنگ بالورے لے رہے تھے۔ اور یہ بات زہرہ بیگم نے شدت سے محسوس کی تھی۔ وہ کتنی دیر سے پلنگ کے قریب ہی بڑی سی رنگین کرسی کی پشت سے ٹپک لگائے بظاہر آنکھیں بند کئے، آنکھوں کی جھری سے چودھری شوکت علی کو دیکھ ہی نہیں رہی تھیں بلکہ ان کے اندر تک جھانک رہی تھیں۔ چودھری شوکت علی مسکراتے ہوئے بہت ہی اچھے لگ رہے تھے اور زہرہ بیگم انہیں آنکھوں کے راستے دل میں اُتارے جا رہی تھیں۔ آخر شوکت اتنے خوش کیوں ہیں؟ یہ خیال اُن کے ذہن میں کندلی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکیں، ہولے سے اُٹھیں اور چودھری شوکت علی کے قریب آ گئیں، پھر لرزتے ہاتھوں سے ان کی پیشانی پر آئے ہوئے بالوں کو سنوارنا چاہا تو چودھری شوکت علی حسین خواب سے بیدار ہو گئے۔ ایک دم انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ زہرہ بیگم ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے، نہایت محبت پاش نظروں سے انہیں تک رہی تھیں اور اتنی محبت انہوں نے اپنے لئے شادی کے بعد آج پہلی بار زہرہ بیگم کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔

”بہت خوش ہیں آپ؟“ زہرہ بیگم نے ان کی پیشانی سے بال ہٹاتے ہوئے پوچھا۔  
”آپ بھی تو خوش ہیں۔“ انہوں نے الٹا سوال کر دیا۔  
”میں تو اس لئے خوش ہوں کہ خدا نے آپ کو صحت دی۔“

”اور میں اس لئے خوش ہوں کہ آپ خوش ہیں۔“ انہوں نے نہایت لگاؤ اور محبت سے زہرہ بیگم کا ہاتھ دبایا تو زہرہ بیگم لپکا کر رہ گئیں۔ تب چودھری شوکت علی کا جی چاہا، وہ زہرہ بیگم سے کہیں۔

”اُس عمر میں شرمانا، لجانا اچھا نہیں لگتا۔ آپ کیوں ناحق مجھے دل ہی دل میں خود پر



ہنسنے پر مجبور کرتی ہیں؟ اب آپ کی بھلا عمر ہے شرمانے کی؟“ مگر ان کو یہ علم نہیں تھا کہ خود کو ہر عمر میں جوان سمجھتی ہے۔ یوں چھوٹی موٹی بن جاتی ہے، جیسے اسی سال سولہواں ہو ہو، پانی عمر یا میں قدم رکھا ہو، کچھار کی چکی کلیوں کی مانند ہو۔ اور شوہر کے سامنے تو ہر روز دکھاتی ہے، جیسے اس نے پہلے پہل اسے جیتا ہوتا ہے۔

☆.....☆

جس طرح بادل ایک جگہ نہیں رکتے اور اڑے چلے جاتے ہیں، اسی طرح وقت کا ہار بھی اڑتا جا رہا تھا۔ نوراًں کو چودھری شوکت علی سے طلاق لینے پورا ایک برس ہو گیا تھا۔ چودھری شوکت علی اب بھی دینو کے ہمراہ اپنی بیٹی سے ملنے اور واپسی پر روتی بلکتی مومن چنیں، اُن کے دل کے زخموں میں مزید اضافے کا سبب بنتیں۔ مومن بھی اپنے بابا کو چھوڑنے پر کسی طور راضی نہ ہوتی مگر وہ، جو چودھری شوکت علی نے نوراًں اور اپنے ظالم لالہ سے جدا کیا تھا، وہ اُسے بھار ہے تھے۔ وہ وقت کے منتظر تھے۔ وقت، جو سب سے بڑا منصف ہے اور انہوں نے بھی اسی منصف کے ہاتھ میں اپنا مقدمہ دے رکھا تھا۔

حسب معمول اس بار بھی چودھری شوکت علی ایک ہفتے بعد مومن سے ملنے آئے تھے اور اس کے لئے ڈھیروں کپڑے اور کھلونے لائے تھے۔ وہ جب بھی آتے، کچھ نہ کچھ لے کر آتے۔ مگر مومن ان کی لائی ہوئی چیزوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتی، بس اپنے بابا سے لپٹ جاتی، بے تحاشا اُن کا منہ چومتی اور ساتھ چلنے کی ضد کرتی۔ تب وہ اُسے سمجھاتے اور دینو روتی ہوئی مومن کو واپس چھوڑ آتا۔

آج بھی وہ کیکر کے تنے سے ٹیک لگائے دینو کے منتظر تھے، جو مومن کو لینے گیا ہوا تھا۔ چند لمحے بعد جب وہ آیا تو ہمیشہ کی طرح مومن کو اُس نے نہیں اٹھایا ہوا تھا۔ بڑا لالہ اور بڑا اجڑا سا وہ آ رہا تھا۔ چودھری شوکت علی روڑوں سے ٹھوکریں کھاتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھے۔

”مومن کہاں ہے دینو؟“

”مالک.....!“ دینو روہانسا ہو گیا۔

”بتانا کیوں نہیں؟..... کہاں چھوڑ آیا اُسے؟ کیوں نہیں لایا؟“ انہوں نے چیخ کر پوچھا۔

”وہ..... مالک!..... وہ لوگ چلے گئے۔“ دینو نے بہ شکل بتایا۔

”کہاں.....؟“ چودھری شوکت علی کو یوں لگا، جیسے ان کے دل کے خلا بڑھتے جا رہے تھے۔

”راجا کے خالہ زاد نذر کو بھی نہیں پتہ کہ وہ کہاں گئے ہیں۔ وہ اپنے سارے کی شادناہ

بھترنڑہ گیا ہوا تھا، جب وہ میاں بیوی واپس آئے تو راجا صبح اپنی ماں، بہن، نوراًں اور مومن کو بٹا کر چکا تھا۔“ دینو نے رُک رُک کر بتایا۔

”مجھے وہاں لے چل، نذر کے پاس۔“ چودھری شوکت علی نے نہایت ٹوٹے ہوئے

ہجے میں کہا۔

دینو نے کچھ نہ کہا اور ٹوکری اٹھا کر آگے بڑھ گیا، جس میں مومن کے کپڑے، کھلونے

اور پہل تھے۔ چند لمحے بعد وہ نذر کا دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے۔ نذر نے دروازہ کھولا۔

”میری مومن کہاں ہے؟“ چودھری شوکت علی نے چھوٹے ہی سوال کیا۔

”جی..... جی آپ کو دینو نے نہیں بتایا؟“ نذر اس اچانک افتاد سے گھبرا گیا۔

”میں تم سے پوچھنے آیا ہوں۔“ چودھری شوکت علی نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

شور سن کر شادو دوڑی آئی اور اپنے شوہر کا گریبان ایک اونچے قد کاٹھ والے آدمی کے

ہاتھ میں دیکھ کر لرز اٹھی۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ ظالم چودھری شوکت علی ہے۔ کیونکہ تھوڑی دیر پہلے

ی تو دینو اُن کے ہاں سے سب کچھ سن کر گیا تھا۔

”بتا، کہاں ہے میری بیٹی؟“ چودھری شوکت علی نے نذر کو جھٹکا دے کر گریبان چھوڑ

دیا تو وہ لڑکھڑاتا ہوا نیچے جا گرا۔ اس سے پہلے کہ چودھری شوکت علی اس کی طرف بڑھ کر

اسے گریبان سے پکڑ کر پھراٹھا کر زمین پر پٹختی دیتے، شادو درمیان میں آ گئی۔

”چودھری جی! ہمیں خود پتہ نہیں کہ مومن کہاں ہے؟“

”کیوں پتہ نہیں؟ میں کتے کی موت ماروں گا نہیں..... جلد بتاؤ۔“ چودھری شوکت

علی کے منہ سے مارے غصے کے الفاظ بھی صحیح طرح ادا نہیں ہو رہے تھے۔

”ہر کوئی کتے کی موت کی دھمکی دیتا ہے۔“ شادو بڑبڑائی۔

”مجھے بتاؤ، تمہارے اور رشتے دار کہاں ہیں؟ میں مومن کو ڈھونڈ نکالوں گا۔“ چودھری

شوکت علی گر بے۔

”وہ جی..... ہم نے ہر جگہ پتہ کرایا ہے، وہ لوگ وہاں نہیں گئے، کسی رشتے دار کے گھر

نہیں ہیں۔“ نذر بولا۔

”کوئی ساٹھی؟“ چودھری شوکت علی نے گھر کا۔

”ہمیں کوئی پتہ نہیں، چودھری جی! قسم لے لیں جی۔“ شادو رو دی۔

”سچ کہہ رہے ہو؟“

”ہمیں جھوٹ بول کر کیا مل جائے گا؟ مومن تو ہمیں خود بھی بہت پیاری تھی۔ ہمارے

چھوٹے سے گھر کی بہار تھی۔ وہ تو مجھ سے بہت گھل مل گئی تھی۔ نوراًں کو تو بالکل نہ چاہتی

تھی۔ رات کو بھی میرے پاس سوتی تھی۔“ شادو بول رہی تھی۔







کر چودھری شوکت علی کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی اور پورے وجود پر درد کی لہر چھا گئی۔

”لالی کہاں ہے.....؟“ چودھری شوکت علی نے ایک دم دل کا درد چھپا کر حیرت کریمو سے پوچھا۔

”جی؟.....“ کریمو کے حلق سے دبی دبی آواز نکلی۔

”میں نے لالی بہن کے بارے میں پوچھا ہے۔“ چودھری شوکت علی بولے۔

”کریمو ان کے لالی کو بہن کہنے پر کھل اٹھا اور دل کی خوشی پر قابو پا کر بولا۔

”وہ اور شیردا تو کوئی چھ سات مہینے ہوئے، کراچی چلے گئے ہیں۔“

”کیوں؟“ چودھری شوکت علی کا دل مڑ جھا گیا۔

”وہ جی، یہاں گزارا نہیں ہوتا تھا۔ پھر چھوٹے سے بچے کا ساتھ تھا۔“

”ہوں..... تمہیں نوران کے بارے میں پتہ ہے؟“ چودھری شوکت علی مطلب کی بات پر آئے۔

”وہ جی بٹے میں ہے۔“ کریمو نے حمیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اگر وہ وہاں ہوتی تو میں یہاں کیوں آتا؟“ چودھری شوکت علی کا لہجہ سخت ہو گیا۔

”کیا مطلب؟“ کریمو کی ماں نے حیرت سے کہا۔

”ہاں۔ وہ اور راجا، مومو کو لے کر کہیں چلے گئے ہیں۔ میں نے سوچا وہ یہاں آئے

ہوں یا تمہیں پتہ ہو۔“ چودھری شوکت علی نے ٹوٹتی ہوئی نظروں سے کریمو کی طرف دیکھا،

مگر وہاں تو ہر طرف سچائیاں تھیں اور جھوٹ کی چھاپ تک نہ تھی۔

”نوران آئی تھی، مگر تب جب اس نے راجا سے شادی کی تھی۔ بہت خوش تھی وہ لیکن

لالی سے اس کا جھگڑا ہو گیا۔“ کریمو نے بتایا۔

”کیوں؟“ چودھری شوکت علی نے حیرت سے پوچھا۔

”کیونکہ لالی نے آپ سے طلاق لینے پر اسے لعنت ولامت کی تھی۔ مومو کو باپ کی

محبت اور شفقت سے محروم کرنے پر برا بھلا کہا تھا۔ دونوں میں خاصی ٹوٹ، میں میں ہوئی

تھی۔ پھر اس کے بعد نوران یہاں بھی نہیں آئی۔ اور ویسے بھی لالی اور شیردا اس واقعے کے

پندرہ روز بعد کراچی چلے گئے تھے۔ شاید اُسے پتہ چل گیا ہو، جی نہ آئی ہو۔ ورنہ تب تو

نہیں ہے نا؟“ کریمو نے پیشانی کو انگلیوں سے مسلتے ہوئے کہا۔

”اچھا!“ چودھری شوکت علی مجھ سے گئے، مگر اندر ہی اندر خوش بھی ہوئے کہ کوئی

ہے، جو ان کے لئے اپنے دل میں رحم کا جذبہ رکھتا ہے۔ کوئی تو ہے جو اس بے رحم اور

نوران سے ان کی خاطر لڑا۔ لالی انہیں اور بھی پیاری ہو گئی۔ نوران کے ناتے وہ انہیں بہت

پسند آتی تھی۔ وہ اسے بہنوں کی طرح چاہتے تھے۔ ویسے بھی انہوں نے کبھی کسی لڑکی کو پری

نہیں دیکھا تھا، سوائے نوران کے۔ اور پھر اُسے اپنا بھائی، مگر یہ اُس کی یا ان کی اپنی

نسبت کہ ان کی راہیں جلد ہی ایک دوسرے سے جدا ہو گئیں۔

”کریمو! کسی کو پتہ نہ چلے کہ میں آیا تھا۔ یہاں کی ہواؤں کو بھی نہ پتہ چلے۔“ چودھری

شوکت علی نے دھیمے اور شکستہ لہجے میں اس سے کہا۔ ان کے دل کا سارا غم، سارا کرب ان کی

آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔ وہ اس وقت شکست و ریخت کے جس دور سے گزر رہے تھے، ان

کا دل ہی جانتا تھا۔

”آپ کا حکم سر آنکھوں پر مالک!“ کریمو نے نہایت سعادت مندی سے کہا۔

”میں نے لالی کے بیٹے کے لئے وظیفہ مقرر کیا تھا۔ جب تک میں رہا، اسے باقاعدگی

سے ملتا رہا، پھر چلا گیا تو اپنے دکھروں میں کچھ یاد نہ رہا۔ تم یوں کرنا کہ میں رقم بھجوا دوں گا،

تم لالی کو بھیج دینا۔ پتہ تو ہو گا تمہارے پاس۔“ چودھری شوکت علی نے کریمو سے کہا۔

”ہاں ہے۔ پر جی اب تو شیردا وہاں کسی فیکٹری میں لگ گیا ہے۔“ کریمو نے کہا۔

”مگر میں نے لالی سے وعدہ کیا تھا اور جب تک میں زندہ رہوں، وہ رقم لالی کو ملتی

رہے گی۔ میں وعدہ خلاف نہیں ہوں، کریمو!“ چودھری شوکت علی کا لہجہ نہایت ٹوٹا ہوا تھا۔

”جو حکم جی۔“

”دینو ہر ماہ رقم دے جایا کرے گا۔ ابھی یہ تم اُسے فی الحال بھجوا دینا۔“ چودھری شوکت

علی نے گرتے کی جیب سے رقم نکال کر بغیر گئے ہی کریمو کو دے دی اور اس سے پہلے وہ

کچھ کہتا، وہ تیزی سے پلٹے اور کھلے دروازے سے ان تینوں کو خیرت کے بھنور میں ابھرتا

دیکھتا چھوڑ گئے۔





چودھری شوکت علی غصے سے نیم پاگل ہو گئے تھے۔ جہاں جہاں آدمی بھیجے، وہاں سے ناکام آئے تھے۔ پے در پے ناکامیوں نے ان کا دماغ کھولا دیا تھا۔ جی چاہتا تھا، زمین کا سینہ شتی کر دیں یا آسمان چیر ڈالیں۔ آخر وہ کیمن کہاں چلا گیا؟ آخر کہاں لے گیا وہ میری بیٹی کو؟..... میری روح کو؟

”تم سب لوگ ناکارہ ہو..... ایک آدمی کو نہیں ڈھونڈ سکتے۔“ وہ اپنے ڈیرے پر ان آدمیوں کو پھٹکار رہے تھے۔

”مالک! ارد گرد کے سارے گاؤں دیکھ ڈالے ہیں، وہ نظر نہیں آیا۔“ بخشور جھاکر بولا۔

”وہ کوئی جن ہے جو نظر نہیں آیا؟..... سلیمانی ٹوپی سر پہ رکھی ہوئی ہے اس نے؟“ پھر گئے۔

”اب تم لوگ اپنے آدمیوں کو شہروں میں بھیجو، کچھ بھی کرو، مجھے میری بیٹی چاہیے، سمجھے؟ ورنہ تم لوگ کہیں بھی دفنان ہو جانا، ادھر مت آنا۔ نہیں تو نہ جانے مجھ سے کیا ہو جائے؟ میں نے ہر ظلم سے توبہ کی ہوئی ہے، میری توبہ نہ ٹڑوانا۔“ چودھری شوکت علی پھر کی طرح گھوم کر کرسی پر گر سے گئے۔ ان کا سانس دھڑکنی کی مانند چل رہا تھا، جیسے ہزار ہائی کی مسافت طے کر کے آئے ہوں۔ پسینے کے ننھے ننھے قطرے، روشن پیشانی پر چمک رہے تھے اور وہ آنکھیں موندے موندے ہی منہ میں بڑبڑا رہے تھے۔

”میری مومو!..... میری دگی! میں تجھے کہاں ڈھونڈوں؟..... پترا ٹوٹی آواز دے۔“ روح میں اترے ہوئے صدے نے انہیں جکڑ رکھا تھا۔ اُن کا لہجہ اس قدر زوردار تھا کہ قریب کھڑے ہوئے دینو کے دل میں دراڑیں سی پڑنے لگیں اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

☆.....☆

اُس روز موسم نہایت خوشگوار تھا۔ موسم گرما کی پہلی بارش ہوئی تھی اور پوری فضا میں

کی سونڈی سونڈی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ چودھری شوکت علی عصر کی نماز پڑھنے کے بعد بیٹھ کر قرآن پاک الٹا الٹا کر رہے تھے کہ زہرہ بیگم، آنسوؤں کی پلیٹ لئے کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے چودھری شوکت علی کو قرآن پاک الٹا الٹا کر دیکھ کر کہا۔ ”وہ کئی روز سے دیکھ رہی تھیں کہ شوکت پانچ وقت کے پکے نمازی ہو گئے ہیں۔“

”یہ آم آپ کے لئے لائی ہوں۔“

”اچھا.....؟“ انہوں نے ٹوپی اتار کر میز پر رکھ دی۔

”کیوں..... آپ کے لئے میں نہیں لاسکتی؟“ زہرہ بیگم نے اک ادا سے کہا۔

”بھئی، آپ میرے لئے نہیں لائیں گی تو اور کون لائے گا؟“ چودھری شوکت علی ہنس رہے اور ہاتھ پکڑ کر زہرہ بیگم کو پلنگ پر اپنے پاس بٹھا لیا۔ یہ سن کر زہرہ بیگم شرما سی گئیں۔

”بھئی، اب شوکت علی ”حسن پور“ میں رہنے لگے تھے، زہرہ بیگم کا چوتھا چوتھا اپنا دور ہو گیا تھا۔ ہاں، کبھی کبھی دل میں پرانی خود مختاری کا جوش ضرور اُٹھتا، مگر وہ اسے دبا لیتیں۔

”شوکت! آپ سے ایک بات پوچھوں؟“ زہرہ بیگم آم کاٹ کر پلیٹ میں رکھتی ہوئی بولیں۔

”بھئی آپ بھی اجازت لینے لگیں؟“ چودھری شوکت علی بولے۔

”کیوں نہ لوں اجازت؟“

”آپ کو حق ہے۔ جو پوچھیں، جلدی پوچھیں۔“ شوکت علی نے بظاہر بے قراری سے کہا۔

”آج کل آپ نمازیں بہت پڑھنے لگے ہیں۔“

”نہ پڑھوں؟“ چودھری شوکت علی نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے یہ تو نہیں کہا۔“ زہرہ بیگم گڑبڑا گئیں۔

”بھئی، جب بھی عاقبت سنوارنے کا خیال آجائے، اچھا ہے، اپنی کوتاہیوں کی خدا سے معافی مانگ لی جائے تو بہت اچھا ہے اور کچھ مانگ لیا جائے۔“ وہ ایک جذب کے عالم میں تھیں۔

”آپ کیا مانگتے ہیں؟ سب کچھ تو ہے آپ کے پاس۔“ زہرہ بیگم ان کا جملہ مکمل کرنے سے پہلے بولیں۔



”آپ کو کیا معلوم، میں کیا مانگتا ہوں، زہرہ!“ چودھری شوکت علی کے لہجے میں اڑھل گھل گیا۔

”کیا مانگتے ہیں؟“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”اپنی بیٹی۔“ وہ بے خودی میں بول گئے۔

”بیٹی.....؟“ زہرہ بیگم کو جھٹکے لگنے لگے۔

”ہاں بھئی، بیٹی۔ مجھے بیٹی کا بہت شوق ہے۔ بیٹے کے روپ میں تو شخصیت ہی ہے۔ نہ پڑ بتائیں، آپ مجھے کب بیٹی دیں گی؟“ چودھری شوکت علی نے زہرہ بیگم کی طرف جھٹکے ہوئے محبت سے چور لہجے میں کہا اور زہرہ بیگم کے گالوں پر حیا کی سرخی پھیل گئی۔ پلکیں اس قدر بوجھل ہو گئیں کہ اٹھائی نہ گئیں۔ چودھری شوکت علی ان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگے۔ ”چلو شکر ہے، جھوٹ نہ گیا۔ میں پتہ نہیں بے خودی میں کیا ہو اس کر جاتا اور لینے کے دینے پڑ جاتے۔ خدا نے اتنی عقل تو دی ہے کہ میں جلد سنبھل جاتا ہوں۔“

آج کل وہ بہت پریشان رہتے تھے۔ رفیقہ اور بخشو بھئی نہیں آئے تھے۔ اور وہ جوں جوں ان کے بارے میں سوچتے، سوچیں کڑی کے چالے کی طرح انہیں جکڑ لیتیں۔ یوں ہی خالی ذہن شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ تب انہوں نے اُلٹے سیدھے خیالات سے بچنے کے لئے عبادت میں وقت گزارنا شروع کر دیا تھا۔ عبادت سے انہیں عجیب سے سکون کا احساس گہر لیتا۔ اللہ تعالیٰ کے حضور سر بسجود ہو کر ان کے دل میں گداز پیدا ہو جاتا۔ نماز کے بعد جب بھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے تو بس ایک ہی دعا ان کے لبوں پر چلتی۔

”خداوند! تو میری بیٹی کو مجھ سے ملا دے۔ میرے دل کا چین مجھے لوٹا دے۔ میں نے بہت ظلم کئے ہیں، میں بہت برا ہوں..... میری کوتاہیوں کو بخش دے اور اپنے محبوب ملاؤ۔ کے صدقے مجھے میری بیٹی سے ملا دے۔ اگر مجھ سے کوئی نیکی ہوئی ہے تو اس کے طفیل میری خوشی مجھے لوٹا دے۔“

بس یہی ایک دعا تھی، جو وہ مانگتے۔ اس کے علاوہ انہیں کچھ یاد نہ رہتا، صرف مومو یاد رہتی، اُسی کا خیال رہتا۔ رواں رواں سواہی بن جاتا اور سوال صرف مومو کا ہوتا، اُسے پانے کی آرزو ہوتی۔ اب وہ دعاؤں کے ذریعے مومو کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔

زہرہ بیگم سر جھٹکائے نہ جانے کیا سوچ رہی تھیں، پھر بولیں۔

”آپ بیٹے کی دعا بھی تو کر سکتے ہیں؟“

اُن کے اس سوال پر وہ ایک دم چونک گئے۔

”آں..... نہیں بھئی..... بیٹا تو ہمارا شعیبی ہے نا۔ میں مجھے بیٹی چاہئے۔“

اس سے پہلے کہ زہرہ بیگم کوئی جواب دیتیں، دروازے پر دستک ہوئی۔ چودھری شوکت

”کون؟“

”ہاں! میں ہوں۔“ باہر سے دینو کی آواز آئی۔

”آ جاؤ!“ چودھری شوکت علی بارعب آواز میں بولے۔

زہرہ بیگم کی پیشانی پر لاتعداد شکنیں نمودار ہو گئیں۔ کتنی اچھی باتیں ہو رہی تھیں، اس دینو کو بھی ابھی آنا تھا۔ انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے دینو کو گھورا مگر وہ ان کی طرف دیکھ ہی نہیں رہا تھا، جو اس کو پتہ چلا کہ زہرہ بیگم کس موڈ میں بیٹھی ہیں۔

”سلام مالک!..... سلام مالک!“ دینو نے جھک کر سلام کیا۔

”کیسے آنا ہوا؟“ چودھری شوکت علی نے دینو کی طرف غور سے دیکھا۔

”مالک! مجھے کچھ دنوں کی چھٹی چاہئے۔ کیونکہ میں نے.....“ دینو نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے مخصوص اشارہ کیا اور چودھری شوکت علی سمجھ گئے کہ کوئی بہت ہی اہم کام ہے، یہی دینو اشارہ کر رہا ہے۔ انہوں نے زہرہ بیگم کی طرف دیکھا مگر وہ آم کاٹ کاٹ کر رکھ رہی تھیں اور اُن کی طرف متوجہ نہیں تھیں۔

”تو چل، میں ابھی آیا۔“ انہوں نے زہرہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مالک! ذرا جلدی..... مومو.....“ دینو نے اتنی آہستگی سے کہا کہ اس کے لبوں کی ہلچل ہی سے وہ سمجھ گئے اور لفظ ”مومو“ نے ان کے دل کی دھڑکن تیز کر دی تھی۔ وہ ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”چلو میرے ساتھ۔“ چودھری شوکت علی نے دینو کو بازوؤں سے پکڑا اور تیزی سے کمرے سے نکلے چلے گئے۔ زہرہ بیگم صرف ہلے ہوئے پردے کو دیکھ کر رہ گئیں۔

”اب دینو! تم کو بھی یہاں آنے سے منع کرنا پڑے گا۔“ انہوں نے ہونٹ بھیج کر سوجا۔

بارے مزارعوں میں دینو ہی وہ واحد مزارع تھا، جو چودھری شوکت علی کا منہ چڑھا تھا اور ”رنگ محل“ میں بلا روک ٹوک آیا جایا کرتا تھا۔ رنگ محل کی خواتین اُس سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ دینو نے کبھی غور سے کسی کو دیکھا ہی نہ تھا۔ اسے تو یہ بھی علم تھا کہ چودھری طالب اور چودھری شجاعت کی بیویاں کون سی ہیں اور نہ اُسے یہ جاننے کی ضرورت تھی۔ زہرہ بیگم بلاوجہ ہی اُس سے خار کھاتی تھیں۔



زہرہ بیگم پر پہنچتے ہی چودھری شوکت علی تیزی سے کمرے میں داخل ہوئے اور دینو نے اندر آ کر دروازہ بند کر دیا۔



”ہاں بتا دیو! اپنے چلا مومو کا؟“ انہوں نے نہایت بے قراری سے پوچھا۔  
”ہاں جی!“

”کہاں ہے وہ؟..... کیسی ہے؟ کہاں دیکھا تم نے؟“ چودھری شوکت علی ایک سانس میں بولے گئے۔

”مالک! میں کل ملتان گیا تھا تو حسین آگاہی میں مجھے راجا نظر آ گیا۔“ دینو بولا۔  
”پھر.....؟“ چودھری شوکت علی نے بے چینی سے انگلیاں سر دڑتے ہوئے پوچھا۔  
”پھر جی میں نے ٹیکس بھی جمع نہیں کرایا۔ نشی کو واپس بھیج دیا اور راجا کا پیچھا کرنے لگا۔ وہ گھریلو سامان خریدنے شہر آیا تھا۔ پھر وہ سائیکل پر سوار ہوا تو میں نے ایک ٹانگہ لے لیا اور مسلسل اُس کا پیچھا کیا۔ ٹانگے والا بہت اچھا آدمی تھا۔ اس نے میری ایک ایک بات مانی اور راجا کو شک نہ ہونے دیا کہ اس کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔“ دینو سانس لینے کو تھوڑی دیر کے لئے رُکا۔

”تو یوں تو اُس کے ٹھکانے تک پہنچ گیا۔“ چودھری شوکت علی نے بات ختم کی۔

”ہاں جی۔ وہ احمد پور میں ہے۔ میں نے وہاں کے چودھری دلاور سے بھی ملاقات کی۔ راجا کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا، نیا آدمی ہے اور شریف نظر آتا ہے۔ ہوئی بچی ساتھ ہے۔ میں نے اسے مزارعوں میں شامل کر لیا ہے اور ایک مکان بھی رہنے کو دے دیا ہے۔“

”تو مومو سے بھی ملا؟“ چودھری شوکت علی کو مومو کی فکر دامن گیر تھی۔

”نہیں مالک! میں تو بس چودھری دلاور سے مل کر اسی تانگے پر شہر آ گیا۔“

”اوہ، دینو! مجھے تجھ پر ہمیشہ فخر رہا ہے۔“ چودھری شوکت علی نے فرط مسرت سے دینو کو چوم لیا اور دینو ہکا بکا رہ گیا۔ ایسی محبت تو چودھری نے کبھی بھی نہ دکھائی تھی۔ وہ جب بھی خوش ہوتے، معقول رقم دینو کو دے کر اپنی خوشی اور محبت کا اظہار کرتے۔ لیکن آج وہ واقعی ہمیشہ سے بہت زیادہ خوش تھے۔

”چلو، ابھی احمد پور چلیں۔“ چودھری شوکت علی نے فیصلہ سنا دیا۔

”مالک! کچھ روز اور صبر کر لیں۔“ دینو نے رسوا سے کہا۔

”کیوں؟“ چودھری شوکت علی کو دینو کے اس جواب کی امید نہ تھی۔

”ذرا راجا کو وہاں جم جانے دیں۔ یہ نہ ہو کہ ہمیں دیکھ کر وہ پھر کھسک جائے اور ہم ڈھونڈتے رہیں۔ ابھی کپاس کی بوائی کا زمانہ ہے۔ کیاں بولے گا تو کبھی بھی نہیں جائے گا۔ آئندہ فصل تک۔“ دینو نے سمجھایا۔

”تو کہتا تو ٹھیک ہے۔ مگر میں اپنے دل کا کیا کروں دینو! جو مومو کے لئے بے قرار ہے۔“

”اے۔“ چودھری شوکت علی نے مصیبت سے پوچھا۔

”جہاں آپ نے اس بے قرار دلی کو پانچ ماہ تک سنبھالا ہے، کچھ روز اور سنبھالیں۔“ دینو بولا۔

”جب تک مجھے پتہ نہیں تھا کہ مومو کہاں ہے۔ اب پتہ چل گیا ہے تو یہ دل سنبھالے نہیں سنبھلا دوست!“ وہ بڑے دُکھ سے بولے۔ ”اگر وہ چلا گیا تو.....؟“

”مالک! آپ بے فکر رہیں۔ فصل کی بوائی کے بعد وہ جکڑا جائے گا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ.....“ دینو ایک دم کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔

”اور دوسری بات کیا ہے؟“

”وہ جی.....“ دینو جھجک کر رہ گیا۔

”بول دینو! میں نے ہر اچھی بری خبر کے لئے خود کو تیار کر رکھا ہے۔ تو ڈر مت۔“

چودھری شوکت علی نے دینو کو پچکارا۔

”مالک! چودھری دلاور بتا رہا تھا کہ چند روز ہوئے، راجا کے بیٹا ہوا ہے۔“ دینو نے سر جھکا کر ایک سانس میں جملہ مکمل کر دیا۔

”اوہ!“ چودھری شوکت علی نے ایک طویل سانس لی اور کرسی پر ڈھیر ہو گئے۔ انہیں یوں لگا، جیسے کسی نے چاقو سے دل پر زخم لگا کر ان زخموں میں مرچیں بھر دی ہوں۔

”مالک! آپ دل برداشتہ کیوں ہو رہے ہیں؟ آپ دُکھی مت ہوں۔“ دینو اپنے آقا کے دُکھ پر دُکھی ہو گیا۔

”نہیں دینو!..... نہیں تو۔“ وہ ایسے انداز میں بنے، جس میں سینکڑوں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ ”بھلا میں کیوں دُکھی ہوں گا؟ وہ مجھ سے گئی۔ چاہے کچھ بھی کرے، کتنے ہی روپ بدلے، میں کیوں دُکھی ہوں؟“ وہ زور زور سے بول رہے تھے۔ بظاہر وہ دینو کو بتا رہے تھے کہ وہ دُکھی نہیں ہیں مگر وہ اصل میں خود کو سمجھا رہے تھے، اپنے اندر کے شور کو کم کر رہے تھے، اندر ہی اندر بہت دُور تک شور پیدا ہو گیا تھا اور وہ لفظوں سے اس شور کو دبانے کی کوشش کر رہے تھے۔

”دینو! شش آیا؟“ انہوں نے بات پلٹی۔

”آگیا ہو گا جی!“

پھر چودھری شوکت علی اُسے وہ کام سمجھانے لگے، جو اس کو شش کے ساتھ مل کر کرنا تھا۔

آئندہ اس شور کو کسی طرح تو کم کرنا تھا۔ ذہن کو کسی نہ کسی طور تو بیٹانا تھا۔

☆.....☆.....☆

چودھری شوکت علی بہت خوش تھے۔ آج وہ اپنی مومو سے ملے جا رہے تھے۔ دینو ان



کے ہمراہ تھا اور جیب احمد پور کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ وہ جلد از جلد احمد پور پہنچ جائے گا۔  
تجربہ بھری نظر سے جیب کی رفتار اس قدر تیز ہو جاتی کہ دینو کا دل اچھل کر حلق میں آ جاتا  
اور ڈرتے ڈرتے وہ چودھری شوکت علی کے اسٹیرنگ پر رکے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ دیتا۔  
”مالک! اس طرح تو ہم احمد پور کے بجائے اگلے جہاں پہنچ جائیں گے۔“

تب چودھری شوکت علی شرمندہ سے ہو جاتے اور جیب کی رفتار کم کر دیتے۔ دینو نے  
ایک سو سات میل کے سفر کے دوران کتنی بار ٹوکا تھا، یہ خود اس کو یاد نہیں تھا۔

پھر وہ احمد پور کی حدود میں داخل ہوئے تو ان کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ وہ یہاں پہلی  
بار آئے تھے مگر انہیں لگ رہا تھا، جیسے پہلے بھی یہاں آچکے ہوں لیکن یاد نہ آ رہا تھا کہ کب  
آئے تھے۔ ایک انجانی سی کشش تھی جو انہیں کھینچنے لگے جا رہی تھی۔ پھر انہوں نے پرائمری  
اسکول کے پاس برگد کے درخت تلے جیب روک دی۔

”مالک! آپ یہیں رکیں، میں راجا کو بلا لاتا ہوں۔“ دینو نے جیب سے اترتے  
ہوئے کہا۔

”نہیں، میں چلوں گا۔“ چودھری شوکت علی بچوں کی طرح بولے۔

”مالک! اب آپ اتنا بھی نہ گریں۔ آخر آپ کی اپنی ایک عزت ہے، وقار ہے۔ اس  
طرح تو وہ اکڑ جائے گا۔“ دینو نے نہایت رसान سے سمجھایا تو دینو کی یہ بات ان کے ذہن  
میں بیٹھ گئی، اپنی بڑائی کا احساس مزید بڑھ گیا۔ شملے پر انہوں نے ہاتھ رکھ کر دیکھا، طرے  
کی لمبائی کو محسوس کیا کیونکہ یہی طرہ ان کی بڑائی کا نشان تھا۔ ان کی گردن کی طرح اکڑا ہوا  
طرہ۔ اور اس کو ایک معمولی سی لڑکی اور مزارع نے جھکا دیا تھا۔ مگر آج پھر انہوں نے گردن  
تان لی تھی۔ وہی اکڑ، وہی غرور دوبارہ نمودار آیا تھا، جو گئے دنوں میں ان کا خاصہ تھا۔

تھوڑی دیر میں دینو مت راجا آتا ہوا دکھائی دیا۔ چودھری شوکت علی نے دیکھا کہ راجا کی  
صحت پہلے سے بہت اچھی تھی لیکن لباس نہایت خراب تھا۔ لگجھا سا گرناٹھنوں سے اوپر دھولی  
اور سیلا سا رد مال کندھے پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر چودھری شوکت علی کے لبوں پر  
بڑی طنز بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تم بھی لوگ کتنا ہی بڑا بننے کی کوشش کرو، کتنا بھی اونچا اڑنے کی کوشش کرو، تمہاری  
کوششیں رائیگاں جاتی ہیں۔ تم زمین سے اوپر نہیں اٹھ سکتے۔ ہاں، زمین میں مزید  
سکتے ہو۔ یہی تمہارا مقدر ہے۔ اور اب تم نے اپنے ساتھ ساتھ اس کی مٹی بھی پلید کی۔ مگر  
اس کو بھی پتہ چل گیا ہو گا کہ دولت سے کیا کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کی رات بھی تم  
سے مختلف نہیں ہو گی۔ اسے اب میرے ساتھ گزارا ہوا ایک ایک لمحہ ایسا آتا ہو گا۔  
بلوسات، وہ دن پھر آرام کرنا، وہ باتیں، جو اب صرف خیال ہو گئی ہوں گی۔ نورباں! اے

نت نطلی کی۔ انتقام کی آگ میں تم خود ہی جھلس گئی۔ اپنے پاؤں پر آپ ہی تم نے کلہاڑی  
برائی۔“ مالک! میں راجا کو لے آیا ہوں۔“ دینو کی آواز انہیں خیالات کے بھنور سے نکال  
لائی۔

”ہاں دیکھ رہا ہوں۔“ چودھری شوکت علی نے نہایت چھٹی نظروں سے راجا کو دیکھا، جو  
ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غم کے واضح نشانات اور دکھ کی پرچھائیاں  
موجود تھیں۔ وہ خود کو مضبوط ظاہر کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا، جسے چودھری شوکت علی  
اچھی طرح محسوس کر رہے تھے۔

”راجا! جو انسان قول پورا نہ کرے، اُسے کیا کہیں گے؟“

راجا خاموش رہا، کچھ بھی نہ بولا۔ بھلا بولنے کے لئے وہ ہی کیا کیا تھا؟

”تم کو پہلے بھی علم ہے کہ میرے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور میں بندے کو پانتال کی  
گہرائیوں سے بھی نکال لیتا ہوں۔ آخر میں نے تم کو سات ماہ بعد تلاش کر ہی لیا۔ مانتے ہو  
نا؟“ چودھری شوکت علی پھنکارے۔

”میں جانتا ہوں۔“ راجا نے سر جھکا کر کہا۔

”پھر تم نے یہ حرکت کیوں کی؟..... میں تم سے کچھ مانگ تو نہیں رہا تھا۔ اور تم مجھے  
دے بھی کیا سکتے ہو، جو میں کچھ لوں؟ میں صرف اپنی بیٹی سے ملنے آ جاتا تھا۔ بتاؤ، کبھی میں  
نے تم سے زیادتی کی؟“ چودھری شوکت علی کا دل چاہ رہا تھا کہ اُس کی گردن مردوڑ دیں۔  
”نہیں..... مگر میں مجبور تھا۔“

”کیا مجبوری تھی؟“ چودھری شوکت علی نے پوچھا۔

”آخر میں کس کس کی بات مانوں؟ آپ بتائیں۔“ راجا نے بے بسی سے کہا۔

”کیا مطلب؟“ دینو بول پڑا۔

”مطلب یہ کہ چودھری طالب علی بٹے آئے تھے اور انہوں نے.....“

”بس۔“ چودھری شوکت علی ہاتھ اٹھا کر بولے۔ ان کی آنکھوں میں خون سا اتر آیا  
تھا۔ آف لالہ! تم نے مجھے یہاں بھی نہیں چھوڑا۔ اُن کا دماغ گھوم سا گیا۔ تبھی میرے ساتھ  
آپ بٹے گئے تھے۔

”میرا کوئی بھی قصور نہیں، چودھری جی!“ راجا نے کہا۔

”میں سمجھ گیا، راجا!..... میں جان گیا کہ خیر تو غیر، اپنے ہی میرے دشمن ہیں۔ میرا تو  
نصیب ہی برا ہے۔ نصیب برا ہو تو پھر کیا کیا جائے؟“ ان کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

”اب آپ.....“ راجا نے بولنا چاہا۔



”بس، میں مومو سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسی طرح جیسے بے لئے جاتا تھا۔“ چودھری شوکت علی بولے۔

”اتنی دُور آئیں گے آپ؟“ راجا نے حیرت سے کہا۔

”یہ تو صرف ایک سوسائٹیل کا سفر ہے، اگر تم دنیا کے دوسرے کنارے پر بھی میری بیٹی کے ساتھ رہ رہے ہوئے، تب بھی میں وہاں پہنچ جاتا۔“ چودھری شوکت علی ہنس رہے۔

”میں مومو کو لے آتا ہوں۔“ راجا بولا۔

”دھوکا نہ کرنا۔“ چودھری شوکت علی نے اسے جتایا۔

”افسوس! آپ مجھے کبھی نہ سمجھ سکے۔“ راجا ہولے سے بولا اور پلٹ گیا۔ چودھری شوکت علی اُسے جاتا دیکھتے رہے۔

”مالک! راجا بہت غمزدار ہے۔“ دینو نے راجا کے جانے کے بعد کہا۔

”ہاں، اس کی حالت سے ظاہر ہے۔“ چودھری شوکت علی کی آنکھوں میں جگنو چمک اُٹھے۔

”آپ اس کی..... میرا مطلب ہے، آپ مومو کا خرچہ دے دیا کریں۔“ دینو نے اکتے ہوئے کہا۔

”مومو کو رکھنے پر یہ لوگ خود راضی ہوئے ہیں اور مجھے پتہ ہے کہ نورائیں کبھی مومو کے ناتے بھی میری مدد قبول نہیں کرے گی۔ پھر کیوں بات خالی جانے دوں۔ تم اسے نہیں جانتے، میں اسے جانتا ہوں، بہت اچھی طرح۔“ چودھری شوکت علی نے کہا۔

چودھری کی اس بات پر دینو دل ہی دل میں ہنس دیا۔ ”جانتے تھے، بھی پور پور اس کی محبت میں بھگو ڈالا۔ وہ بھی جھوٹی محبت پر اپنا سب کچھ بچھا کر دیا۔“ وہ کہنا چاہتا تھا مگر کہ نہ پایا کیونکہ کچھ بھی تھا، وہ مالک تھے اور دینو غلام۔

راجا، مومو کو لئے آ گیا۔ چودھری شوکت علی بڑی بے تابی سے آگے بڑھے۔ مومو کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں شبنم جمنے لگی، ہونٹ کپکپا کر رہ گئے مگر آواز نہ نکل سکی۔ مومو بھی انہیں پہچان گئی تھی۔ راجا کے بازوؤں میں مچلی تو چودھری شوکت علی نے بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اُف! وہ کتنی کمزور ہو گئی تھی۔ گانوں کے گلاب مرجھا گئے تھے اور ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ آنکھوں میں اُواسیوں کے سمندر موجزن تھے اور آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ کپڑے اتنے میلے تھے، جیسے کئی روز سے نہ بدلے گئے ہوں۔ اگر کوئی اور بچہ اتنا گھبراہٹا تو چودھری شوکت علی اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرتے۔ مگر یہ تو ان کی اپنی بیٹی تھی، اپنا لہو تھا۔ وہ بے تحاشا اُسے چوم رہے تھے۔ بس نہیں چلتا تھا کہ اسے اپنے میں چھپالیں۔

”بابا!..... تمہاں دئے تھے؟“ (بابا! کہاں گئے تھے) مومو نے ان کے سینے سے سر اُڑنے ہوئے پوچھا۔

”میں تجھے دھوڑ رہا تھا پُترا! تُو کہاں کھو گئی تھی، میری جان؟“ چودھری شوکت علی نے بے ہنجار کیا۔

”چودھری جی! بڑے چودھری کو پتہ نہ چلے۔“ راجا دل کا خدشہ زبان پر لے آیا۔

”کیا؟“ چودھری شوکت علی نے پوچھا۔

”انہوں نے کہا تھا کہ اگر مومو کو میں نے آپ سے ملنے دیا تو وہ ہم سب کی بوٹیاں کٹوں کو کھلا دیں گے۔“ راجا نے نہایت پتلی لہجے میں کہا۔

”ہر کوئی کتے جیسی موت کی دھمکی دیتا ہے۔“ شادو کا جملہ ان کی سماعت سے ٹکرایا۔ ”تو اس کا مطلب ہے لالہ نے یہ بات ان لوگوں کے سامنے کی ہو گی۔“ چودھری شوکت علی نے سوچا۔

”نہیں راجا! میں نہیں بتاؤں گا۔ جس طرح تُو نے اپنا فیصلہ وقت کے ہاتھ میں دے رکھا، ایسا ہی میں نے کیا ہے۔ آخر کب تک خدا میری نہ سنے گا؟..... بہت سکھ دیکھے ہیں، اب غموں سے بھی تو دو دو ہاتھ کر لئے جائیں نا۔ آخر مرد بچہ ہوں۔“ چودھری شوکت علی دیرے دیرے بول رہے تھے۔

”مومو!..... میری روح؟“ انہوں نے اُسے ہلایا تو وہ کسمسا کر رہ گئی۔ وہ اُن کے سینے سے لگتے ہی رو دھو کے سو گئی تھی، جیسے کئی مہینوں کی نیند پوری کر رہی ہو۔ باپ کی محبت نے اس کے غم مٹا دیئے تھے اور وہ سو گئی تھی، جیسے اُسے یقین ہو کہ اب اُسے اُس کے بابا سے کوئی دُور نہیں کر سکتا۔

”میں اگلے ہفتے آؤں گا، راجا! اپنی بیوی سے کہنا کہ دینو، مومو کو لینے جائے تو کوئی حیلہ و حجت نہ کرے۔“ انہوں نے راجا کی گود میں مومو کو ڈالتے ہوئے کہا۔

”اچھا جی!“ راجہ سعادت مندی سے بولا۔

”اوہ، ہاں بھی مبارک ہو۔ سنا ہے، پُترا ہوا ہے تیرا۔ مگر میری وحشی سے سونہنا نہیں ہو گا۔“ انہوں نے جھک کر مومو کی پیشانی چومی اور راجا کا جواب سننے بشیر اچک کر جیب میں بیٹھے گئے۔ دینو نے بھی ان کی تقلید کی۔ انہوں نے جیب اسٹارٹ کر دی اور مومو کی چٹخیں جیب کے شور میں دب کر رہ گئیں۔ مگر وہ جیب اُڑا لے گئے، پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اگر وہ لپٹ لیتے تو یقیناً پلٹ آتے۔ کیونکہ راجا نے پٹروں سے مومو کے گال سرخ کر دیئے تھے۔ اور جیب چمک کر رو رہی تھی۔



وقت زقندر لگا کر اڑتا رہا اور چودھری شوکت علی اپنی بیٹی سے ملنے آئے رہے۔ کبھی ساتھ ہوتا، کبھی وہ اکیلے ہوتے۔ مومو بڑی ہوتی جا رہی تھی۔ اب تو مخصوص دن نورائے تیار کر کے بھیج دیتی تھی۔ راجا کو اسے چھوڑنے بھی نہ آتا پڑتا۔ شام کا وقت ہوتا اور کوئی نہ دیکھ سکتا کہ مومو گاؤں سے باہر کہاں جاتی ہے۔ آجمل میں دیہاتی لوگوں کو اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ وہ ایک دوسرے کی ٹوہ میں لگے رہیں۔ یہ تو بس شہروں کی تھوڑا سا عورتیں ہی ایسے دھندے کرتی اور ہر آنے جانے والے پر نظر رکھتی ہیں۔ دیہاتی عورتیں صبح سے سہ پہر تک اپنے مردوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتی ہیں اور پھر گھر کے کھول میں ایسی اُلجھتی ہیں کہ شام تک تھک کر چور ہو جاتی ہیں۔ بس، پھر تو بستر پر جانے کی جلدی ہوتی ہے اور ایسے میں کوئی نہ تھا جو مومو پر نظر رکھتا۔

ادھر زہرہ بیگم جوں جوں عمر رسیدہ ہوتی جا رہی تھیں، ان کی پڑ چڑاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ چودھری شوکت علی کو اپنا مخصوص طعنہ دینا نہ بھولتیں اور چودھری شوکت علی اب بھی یہ طعنہ سن کر خاموش ہو جاتے، دل مسوس کر رہ جاتے۔ ان کی پیاری کے دوران چند دنوں کی چاندنی آتی تھی، اب پھر وہی مخصوص اندھیری راتیں تھیں۔ زہرہ بیگم کے نت نئے تازیانے ان کی روح تک کو گھائل کرتے تھے۔ ہر بات میں گھما پھرا کر وہ گیدوں کھلانے کا شہر ضرور چھو دیتیں۔ اصل میں بات کچھ یہ بھی تھی کہ وہ ان سے بے پروا بھی ہو گئے تھے۔ تنہائی میں وہ بہت کم زہرہ بیگم کے پاس بیٹھتے۔ انہیں وہ اس عنقریب کی مانند لگتیں، جو انہیں نکل لے گی۔ وہ شہیسی سے اپنا دل بہلاتے رہتے۔ اب تو وہ بھی خاصا بڑا ہو گیا تھا، مگر وہ اس سے بچوں جیسا برتاؤ کرتے تھے۔ رات کو وہ زہرہ بیگم سے پہلے ہی کالوں تلے ہاتھ رکھ کر کون بدل کر سو جاتے اور زہرہ بیگم غل کھا کر رہ جاتیں۔ جب وہ مومو سے مل کر آتے تو رات کو خاصی دیر ہو جاتی اور زہرہ بیگم پورے دن کا دل میں چھپا لاوا نکال پھینکتیں۔ چودھری شوکت علی اپنی خواب گاہ، اپنے منہل میں سر جھکائے سب کچھ سنتے رہتے اور پھر آرام سے پا کر سو رہتے۔ یہی ان کا معمول ہو گیا تھا۔ ایک خاموشی انہیں ہزار شکہ پہنچاتی تھی۔

☆.....☆

پھر ایک روز مومو نے اپنے بابا کو بتایا۔

”بابا! اماں کہتی ہے کہ میں اب آپ سے نہ ملوں۔“

”کیوں پھر؟“ وہ ٹپ کر رہ گئے۔

”مگر کام جو مجھے کرنا پڑتا ہے۔ اور.....“ مومو اصل بات چھپا گئی۔

”تو گھر کا کام کرتی ہے؟..... یہ ننھے ننھے ہاتھ کام کرنے کے لئے نہیں ہیں۔“

چودھری شوکت علی نے مومو کے ہاتھ تمام کر ہونٹوں سے لگا لئے۔ ان کا دل ٹپ اٹھا۔

”نہی سی جان اور گھر کا کام.....؟“

”میں کام نہ کروں تو اور کون کرے؟“ مومو نے اپنی سپاہ بیکیں جھپکائیں۔

”نوراں کیا کرتی ہے؟“

”وہ چودھری دلاور کے ہاں کام کرتی ہے۔ پھر راجا چاچا کے ساتھ کھیتوں میں جاتی ہے۔ تھک جاتی ہے نا۔ پھر گھر کا کام کیسے کرے؟“ مومو نے کہا۔

”تو میرے ساتھ چلے گی، پھر؟“ چودھری شوکت علی نے ایک دم پوچھا۔

”ناں..... نانا.....“ مومو کا رنگ لٹھے کی مانند سفید ہو گیا۔ آنکھوں میں وحشت چھا گئی۔

”کیا ہوا مریم؟“ چودھری شوکت علی گہرا سے گئے۔

”میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکتی بابا!“ مومو ان سے لپٹ گئی۔ ”ناں..... نہیں.....“

”میں نہیں جاؤں گی۔“

”نہ جانا۔ مگر تو رومت۔“ چودھری شوکت علی کا دل اس کے رونے پر ٹکڑے ٹکڑے ہوا

جا رہا تھا اور مومو اپنے بابا کو بتانے لگی کہ وہ کیوں نہیں جاسکتی۔ نورائے نے ایک بڑی سی چھری

اُڑا کر کہا تھا کہ اگر اس نے اپنے باپ کے ساتھ جانے کی کوشش کی تو وہ اُسے ذبح کر دے

گی۔ اُس نے یہ بھی بتایا تھا کہ جب وہ اپنے بابا سے ملنے جاتی ہے تو نورائے نگرانی کرتی رہتی ہے۔

اب خدا معلوم یہ سچ تھا یا جھوٹ، پتہ نہیں واقعی نورائے مومو کی نگرانی کرتی تھی یا صرف

اُسے خوف زدہ کیا تھا۔ بہر حال اُس کی چال کامیاب ہو گئی تھی اور مومو زخمی ہرنی کی طرح

سہم گئی تھی۔ ابھی تو اس نے اپنے بابا کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ جبکہ اس کا اندر چیخ

پُچ کر بابا کے ساتھ جانے کی ضد کر رہا تھا۔ مومو خود بھی چودھری دلاور کے ہاں نورائے کے

ساتھ جاتی تھی اور چھوٹا موٹا کام کرتی تھی، جتنا اس سے ہو سکتا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اب روز

تو وہ جی چاہنے کے باوجود چودھری شوکت علی سے نہیں مل سکتی تھی۔ تب چودھری شوکت علی

نے مومو سے کہا۔

”پھر میں ہر ہفتے آؤں گا تجھ سے ملنے۔ تو نورائے کو نہ بتانا۔“ حالانکہ ان کا اندر کہہ رہا

تھا، آخر مومو تمہاری بیٹی ہے، تم اتنے خوف زدہ کیوں ہو؟ بے دھڑک نہ آؤ اپنی بیٹی سے۔ مگر

بعض مرتبہ مصلحت کی خاطر بھی تو دل کی بات نہیں مانی جاتی۔

”کیوں بابا؟“ مومو نے کہا۔

”پھر وہ تجھے مارے گی نا، پھر! اب تو خود سیانی ہے۔ کوئی بھی بہانہ کر لیا کر۔“

”بابا! یہاں تو ماں دیکھتی ہے۔“ مومو نے انکشاف کیا۔



”اچھا؟“ چودھری شوکت علی نے حیرت سے کہا۔

”ہاں..... اُس کا خیال ہے، میں آپ کے ساتھ چلی نہ جاؤں۔“ مومو نے کہا۔  
 ”ہنہ..... بے وقوف عورت۔ اگر میں مومو کو لے جانا چاہوں تو تیرے غرضوں کی بجائے نہ چل سکے۔ میں تو جانے کیوں خاموش ہوں۔“ چودھری شوکت علی نے سوچا۔  
 ”بابا! چودھری دلاور کے گاؤں کے پچھواڑے باغ ہے، وہاں آ جانا۔“ مومو نے اپنی خیالوں میں غلطیاں دیکھ کر کہا۔  
 ”آں..... کیا کہا پھر؟“

”بابا! آپ چلیں، میں آپ کو باغ دکھاؤں۔ وہاں کوئی نہیں آتا۔ مانی بھی سارا دن اپنی جھونپڑی میں پڑا رہتا ہے۔“ مومو نے ان کی انگلی تھام کر کہا۔  
 ”کہاں ہے باغ؟“ چودھری شوکت علی نے پوچھا۔  
 ”پچھواڑے ہے۔“

”بس، میں آ جاؤں گا۔ آج منگل ہے نا۔ اگلے منگل کو آؤں گا۔“

”آپ آ جائیں گے نا؟“ مومو نے بے یقینی سے پوچھا۔

”ہاں، بھلا بتاؤ کس دن؟“ چودھری شوکت علی نے اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔  
 ”منگل کو۔“ مومو نے کہا۔

”یاد رکھنا!“ چودھری شوکت علی نے اس کی پیشانی چومی۔ جواب میں مومو نے بھی ان کے ہونٹ اور گالوں پر پیار کیا اور آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو ہلکی جھپک جھپک کر چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔ چودھری شوکت علی نے منہ پھیر لیا۔ بھلا وہ اپنی چیتنی بیٹی کی آنکھوں میں آنسو کیسے دیکھ سکتے تھے۔ اس کے آنسو تو ان کے دل میں چھالے ڈال دیتے تھے۔

یوں گزشتہ سات آٹھ ماہ سے وہ اپنی مومو سے چھپ کر باغ میں ملا کرتے اور کسی کو پتہ نہ چلتا، وہ کب آتے اور کب جاتے۔ انہیں کسی سے غرض نہیں تھی۔ وہ ہر جتنے آتے اور مومو کے لئے ڈھیروں پھل لاتے اور خود ہی پیٹھ کر اُسے گود میں لئے اپنے ہاتھوں سے کھلاتے۔ مومو کی صحت پہلے سے کافی بہتر ہو گئی تھی۔ گالوں پر سرخی نمایاں ہو گئی تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ستاروں کی مانند چمکتی تھیں۔ پیشانی چاند کی طرح روشن تھی۔ ہلکے ہلکے بھورے بال ڈوبتے سورج کی روشنی میں سونے کی مانند چمکتے۔ وہ جب بھی بس سے مل کر آتے، دل میں عجیب سا سکون محسوس کرتے۔ اپنے دل کے ٹکڑے کو سینے سے لگاتے تو ڈھیروں خون بڑھ جاتا۔

مگر آج..... آج ان کے دل کی ہر لہر میں طغیانی آئی ہوئی تھی۔ ہر تہہ سے خون اُبل کر آنکھوں میں آنسوؤں کی صورت جمع ہو گیا تھا۔ مومو نے کیسا انکشاف کیا تھا کہ وہ چودھری دلاور کے ہاں کام کرتی ہے تو رات کا کھانا چودھرائی دیتی ہے۔ اُف! یہ سب دیکھنے میں کیوں زندہ ہوں؟ میرے پاس کیا نہیں ہے، سب کچھ ہے۔ نوران! تم نے اپنے رشتہ جھجے اور میری بیٹی کو بھی تباہ و برباد کر دیا ہے۔ تم..... تم بہت کمینہ عورت ہو۔ تم نے دیکھو باپ کی شفقت و محبت سے تو محروم کیا ہی تھا، اب اسے ماں کی محبت سے بھی محروم کر دیا ہے۔ تم راجا کی ہو کر میری بیٹی پر مظالم کی انتہا کر رہی ہو۔ خدا نے صرف مجھے ہی ظلم کا بدلہ دینا تھا، تمہیں وہ نہیں دے سکتا۔ تم جو اتنی ظالم ہو گئی ہو۔ آخر تم سے وہ بدلہ کب لے گا؟ آخر کب لے گا؟“ ان کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔

اب ہی گاؤں کی مسجد سے آتی موزن کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ انہوں نے ہڑبڑا کر بچیں کھولیں۔ سامنے میز پر حساب کا رجسٹر کھلا پڑا تھا۔ قلم ان کے ہاتھ میں تھا اور زہرہ بیگم کرٹ لئے اب بھی سوئی ہوئی ہلکے ہلکے خراٹے لے رہی تھیں۔ پوری رات انہوں نے کڑی سے ٹیک لگائے اور ماضی کے مرغزاروں میں گھومتے گزار دی تھی۔ اُن کا جسم اکڑ کر رہ گیا تھا۔ اُف میرے خدا!..... زندگی کے چند سال گزرتے کتنی مشکل سے ہیں، جیسے عداں گزر گئی ہوں۔ اور جب انہیں دہرایا جائے تو الف لیلیٰ کی طرح صرف ایک رات ہی ان کے لئے کافی ہوتی ہے۔ زمینوں کے بٹوارے، باپ کی موت، دنیا پور کی ملکیت، نوران سے شادی اور باپ بننے تک کا ایک ایک لمحہ فلم کی مانند اُن کی نظروں کے سامنے سے گزر گیا، اور گئے ہوئے کل پر آ کر تمام منظر ظہر گئے۔ جہاں تک گزری تھی، ذہن نے وہ پوری کہانی دہرا دی۔ ہمارا لاشعور بھی عجیب چیز ہے، جو ایک ایک بات کو سینت سینت کر، تہہ در تہہ رکھتا ہے۔ یادوں کی ایک تہہ کھولی جائے تو ماضی کا ایک ایک لمحہ، ایک ایک یاد فلم کی ریل کی مانند لٹکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ اگر لاشعور ماضی کا آئینہ نہ دکھائے تو انسان گئے دن کو بھول کر نہ جانے کیا کچھ کرتا رہتا ہے۔

چودھری شوکت علی بہت مشکل سے کرسی سے اُٹھے، وضو کر کے انہوں نے نماز پڑھی، نماز کے حضور گڑ گڑا کر اپنے گناہوں سے توبہ کرتے رہے۔ اپنے ذہنی اور دلی سکون کی تلاش کرتے ہی آنسو ان کی آنکھوں سے نکل کر ان کے گالوں کو بھگوتے رہے۔





”بس، اب کوئی ضرورت نہیں خرید مقدسے لینے کی۔“ چودھری طالب علی نے کہا۔  
”کیوں لالہ؟“ چودھری شوکت علی نے حیرت سے پوچھا۔

”بھئی ضرورت ہی کیا ہے شوکی؟ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ میں نے تو اس کی ضد سے  
پُور ہو کر اسے شہر بھیجا تھا۔ پڑھنے کا اسے شوق تھا۔ بس، اب میں یہ برداشت نہیں کر سکتا  
کہ یہ جھوٹ سچ بول کر مجرموں کو رہائی اور مظلوموں کو سزا دلاتا پھرے۔“ انہوں نے سپاٹ  
بجے میں کہا۔

”مگر بابا! میں نے تو آج تک کوئی ایسا مقدمہ لیا ہی نہیں۔“ صفدر علی نے کہا۔  
”نہیں لیا تو اب لے لے گا۔ فضول میں گنہگار بننے سے فائدہ؟ اب میں یوڑھا ہو چکا  
ہوں۔ تم زمینوں کا کام سنبھالو۔“ چودھری طالب علی نے یہ فیصلہ سنا دیا۔  
”یعنی جاٹ بن جاؤں؟“ صفدر نے منہ ہٹا کر کہا۔

”ہاں، جن کی اپنی زمینیں ہوں، اتنی عزت ہو، انہیں یہ دھندے، یہ نوکریاں کرنی ہی  
نہیں چاہئیں۔ یہ سب کچھ غریبوں کے لئے ہے۔“ چودھری طالب کے لہجے میں امارت کا  
غور تھا۔

”مگر میں نے جو اتنا پڑھا ہے، رات دن ایک کیا ہے، انصاف کا بول بالا کرنے کا عہدہ  
کیا ہے، کیا میں اپنے عہد سے ہٹ جاؤں؟ نہیں بابا!..... نہیں۔“ صفدر نے مضبوط لہجے  
میں جواب دیا۔

”او بے وقوف! آخر تجھے اس سے کیا مل جائے گا؟ اور یہ جو تم لوگ انصاف کا بول بالا  
کرنے کا پرچار کرتے ہو، تم یہ کبھی نہیں کر سکتے جب تک رشوت اور سفارش ختم نہیں ہو  
جائیں۔ انصاف کبھی پھل پھول نہیں سکتا۔“ چودھری طالب علی بڑے جوش سے بول رہے  
تھے۔

”یہ آپ کی سوچ ہے۔ گواہ اور شہادتیں وغیرہ کس لئے ہوتی ہیں؟“ صفدر علی دھیرے  
سے بولا۔

”گواہ۔“ چودھری طالب علی ہنسے۔ ”میں آج ایک قتل کر دیتا ہوں اور عدالت میں ایسے  
گواہ پیش کر سکتا ہوں، جو جیسی شہادت ہونے کے باوجود بھی یہی کہیں گے کہ چودھری  
طالب علی جیسا نیک آدمی تو کمرہ ارض پر نہیں ہے۔ یہ سب کس طرح ہوگا، پتہ ہے تجھے؟“  
”یہ صرف اور صرف پیسے کے زور پر ہوگا۔ نوٹوں کی گڈیاں جیسی شہادوں کا منہ بند کر  
دیں گی، ان سے سوچنے سمجھنے کی قوت چھین لیں گی اور وہ جھوٹ کو سچ کہنے پر مجبور ہو جائیں  
گیں۔“

صبح ناشتے کی میز پر سب ہی موجود تھے۔ زہرہ بیگم کچھ شرمندہ شرمندہ کی چودھری  
شوکت علی کے برابر بیٹھی ہوئی تھیں۔ رات کی فرماں برداری انہیں شرمندہ کئے دے رہی  
تھی۔ گزشتہ سترہ برسوں میں انہوں نے پہلی بار چودھری شوکت علی کے پاؤں چھوئے تھے،  
ان کی جوتی اتارنے کے لئے۔ پہلی بار دونوں نے ایک سمجھوتا کیا تھا اور وہ بھی اتنے ہی  
گزرنے کے بعد۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ مجبور تھے، مجبوس کر دیئے گئے تھے۔

شعیب علی اپنی ماں سیکنہ کے برابر بیٹھا شرارت بھری نظروں سے سامنے بیٹھے اپنے  
چاچا شوکی کو دیکھ رہا تھا۔ اس شریر کی آنکھوں میں ان گنت سوال تھے۔ جیسے ہی چودھری  
شوکت علی کی نظریں اس سے ملیں، اس کی آنکھوں کی چمک مزید بڑھ گئی اور ہونٹوں کا  
مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔ چودھری شوکت علی نے جلدی سے نظریں چرا لیں۔ وہ شعیب کی  
آنکھوں کا سوال پڑھ چکے تھے۔

”چاچا! رات کہاں گئے تھے؟“

یہ سوال بڑے بڑے حروف میں اس کی آنکھوں میں لکھا نظر آ رہا تھا اور چودھری  
شوکت علی نہ جانے کیا سوچ کر گہبرانے جا رہے تھے۔ شعیب ان کی اس گہراہٹ سے خوب  
محظوظ ہو رہا تھا۔

”یعنی چاچا! آپ کا کوئی راز ہے، جسے آپ چھپانا چاہتے ہیں۔ مگر میں بھی وہ راز جاننا  
نہ لوں تو آپ کا بھتیجا نہیں۔“ شعیب نے چائے کی پیالی منہ سے لگاتے ہوئے سوچا۔ اس  
سوچ میں ایک عزم تھا۔ وہ پھر چودھری شوکت علی کی طرف دیکھنے لگا، جو قریب بیٹھے  
اس کی پرسکشن کے بارے میں مختلف سوالات کر رہے تھے۔ کیونکہ صفدر دیکھ لیا تھا کہ  
اور اس کی پرسکشن زور و شور سے جاری تھی اور وہ بھی بڑھ چکا تھا۔ انہیں بتا رہا تھا۔  
”چاچا! اب تک میں نے سات مقدسے لئے اور ساتوں ہی جیتے۔ ستر دیکھ لیں۔“

جلنے لگے ہیں اب تو۔“ صفدر نے نہایت فخر سے جواب دیا۔  
”اچھا.....“ چودھری شوکت علی نے بڑی پُر شوخی اور شفقت بھری نظروں سے صفدر



گئے۔“ چودھری شوکت علی، صفدر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بولے جا رہے تھے۔  
سریخ رہا تھا۔

”بابا! جب تک آپ جیسے دولت کے پجاری، دولت کے ذریعے انصاف نہیں  
والے اس دنیا میں موجود ہیں، انصاف نہیں پہنچ سکتا۔“ یہ اس نے سوچا مگر باپ کے رہنے  
وہ بول نہ سکا۔

”شوکی! تو اسے سمجھا کہ میری بات مان لے۔“ چودھری طالب علی کا رخ اب چھوٹے  
بھائی کی طرف تھا۔

”آپ لوگ خود ہی طے کر لیں، میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“ چودھری شوکت علی نے شانے  
اچکائے۔ وہ باپ بیٹوں کی لڑائی میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔ ان کا تو جی چاہتا تھا کہ لالہ کے  
بیٹوں میں سے کوئی بغاوت کر دے تاکہ پھر وہ ان سے پوچھ سکیں۔ ”لالہ! ان کی سزا کیا  
ہے؟“

”صفدر پتر! اب ہم چاہتے ہیں کہ تیری شادی کر دی جائے۔“ سیکھ پہلی بار بولیں۔  
”شادی؟..... میری؟“ صفدر علی نے گڑبڑا کر پوچھا۔  
”جی جناب!“ شعیب علی نے شرارت سے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر کہا تو صفدر  
جانے کیوں جھینپ گیا۔

چودھری شوکت علی نے شعیبی کی اس شرارت پر اسے دیکھا تو وہ صفدر کی طرف متوجہ  
تھا۔

”تم کتنے پیارے ہو مجھے شعیبی!..... بالکل موصوف کی طرح۔ اور جان! میں تم کو ضرور  
اپنا وہ راز بتاؤں گا۔ تم اپنے چاچا کی طرف سے دل میں کوئی اور خیال مت لاؤ۔ نہیں پتہ  
چلے گا کہ تمہارا چاچا کتنا مظلوم ہے اور تمہارا باپ کس قدر ظالم۔“ چودھری شوکت علی نے  
شعیبی کی طرف دیکھتے ہوئے سب کچھ سوچ ڈالا۔ انہوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ شعیبی کو سب  
کچھ بتا دیں گے۔

”عابدہ اور صفدر کا جوڑ ہے نا، شوکی؟“ چودھری طالب علی کی آواز پر وہ خیالات کے  
بھنور سے نکل آئے۔

”کیا لالہ؟“ انہوں نے چونک کر کہا۔  
”میں کہہ سکتی ہوں عابدہ کو ہم بہو بنانا چاہتے ہیں۔“ انہوں نے اپنا سوال زہرا  
”جب فیصلہ آپ نے کر لیا تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ معلوم نہیں کیوں  
چودھری شوکت علی کے لہجے میں کھلی گئی۔ بعض اوقات ان کا لہجہ اس قدر کھردرا ہوا  
کہ وہ خود بھی نہ سمجھ پاتے کہ ایسا کیوں ہوا؟ چودھری طالب علی ان کے اس جواب پر

”بھائی سے رائے معلوم کر لیجئے۔“ شعیب علی نے ماحول کی تلخی کو دور کرنے کے لئے  
کہا۔

”پہلے کبھی یہاں کسی کی رائے لی گئی ہے، جواب.....“ چودھری شوکت علی کہتے کہتے  
ہوش ہو گئے۔

”مگر اب وقت بہت بدل چکا ہے۔“ شعیب علی نے فوراً ان کا جملہ پکڑ لیا۔  
”وقت بدلا ہے، ہم تو نہیں بدلے۔ ہم پر تو بڑوں کے فیصلے مسلط کر دیئے جاتے ہیں۔  
بزرگ فیصلے کرتے وقت ہمارے بارے میں نہیں سوچتے، بلکہ یہ سوچا جاتا ہے کہ زمینیں کتنی  
لیں گی۔ زمینوں کے عوض ہماری آرزوؤں، تمناؤں اور اُمنگوں کو قفل کر دیا جاتا ہے۔“  
چودھری شوکت علی تیر پر تیر چلاتے جا رہے تھے، جو چودھری طالب علی کے دل میں پیوست  
ہو رہے تھے اور وہ سمجھ رہے تھے کہ کس طرح چودھری شوکت انہیں خود پر کئے جانے والے  
ظلم کا احساس دلا رہے ہیں۔

”یہ بات نہیں ہے شوکی!“ چودھری طالب علی جلدی سے بولے۔  
”پھر؟“ انہوں نے نہایت اُداس نظروں سے بھائی کو دیکھا۔  
”جب عابدہ پیدا ہوئی تھی، میں نے تب ہی افضل لالہ سے اسے مانگ لیا تھا، اپنے  
صفدر کے لئے۔“

سیکھ بیگم نے محبت سے صفدر کی طرف دیکھا، جو سب سے بے نیاز گاجر کا حلوہ کھانے  
میں مصروف تھا۔

”تو کیا وہ عابدہ کو زمینیں وغیرہ نہیں دیں گے؟“ چودھری شوکت علی نے پوچھا۔  
”زیں یا نہ دیں، ویسے غریب سے غریب آدمی بھی اپنی بیٹی کو جہیز دیتا ہے اور پھر لالہ  
تو.....“ سیکھ بیگم زکیں۔

”بہت بڑے جاگیردار ہیں۔“ شعیب علی نے ہنستے ہوئے جملہ مکمل کیا۔  
”یہ تو ہے۔“ وہ ایک تفاخر سے بولیں۔

”صفدر علی! آپ کی کیا رائے ہے؟“ شعیب علی، بھائی سے مخاطب ہوا۔  
”جو بڑے کریں گے، مجھے منظور ہے۔“ صفدر علی نے بات بڑوں پر رکھ دی۔  
”بھئی کوئی شرط درطریقہ نہیں۔“ شعیب نے کسی کے بولنے سے پہلے کہا۔  
”مثلاً؟“ صفدر علی نے حیرت سے شعیبی کو دیکھا۔

”مثلاً یہی کہ عابدہ یہاں جہیز نام کی کسی چیز کے بغیر آئے گی۔“ شعیب نے سیدھی سی  
شرط رکھی۔ اصل میں وہ بھی اپنے چچا کا ہم خیال ہی تھا۔ وہ بچپن ہی سے اپنے چاچا کی زہرہ



بیگم کے ہاتھوں درگت بنے دیکھ چکا تھا۔  
”کیا اٹلی پٹی پڑھا رہے ہو؟“

”اماں جی! سب کچھ ہے ہمارے پاس، تو پھر کیا ضرورت ہے جہیز وغیرہ کی؟ صفر بھائی! آپ پہل کر رہیں اور اس جہیز کی لنت کا قلع قمع کر دیں۔“ شعیب علی نے اکسایا۔  
”تمہاری شادی تو نہیں ہو رہی جو تم بڑھ چڑھ کر بول رہے ہو۔“ زہرہ بیگم نے فحش گھر کا۔

”کاش! میرا معاملہ ہوتا۔“ شعیب علی نے شادی سانس نے کر کہا تو سب کے ہاتھوں سے کمرہ گونج اٹھا۔

”اب تم شہرت جاؤ صفر!“ چودھری طالب علی نے صفر سے کہا۔ اس سے بچا کر صفر علی کوئی جواب دینا، شعیب علی بات کو پھر پہلے اسٹیج کی طرف لے آیا۔  
”پہلے مجھے ایک بات بتائیں، چاچی!“ شعیب علی نے زہرہ بیگم سے کہا۔  
”پوچھو؟“ زہرہ بیگم نے کہا۔

”یہ ہم لوگوں میں بیٹیوں کو زینت دینے کا رواج کیوں ہے؟“  
”سسرال میں ان کی عزت ہوتی ہے، رعب پڑتا ہے، شوہر دب کر رہتا ہے۔“ زہرہ بیگم بولے گئیں۔

”چاچا شوکی اسی لئے دب کر رہتے ہیں آپ سے۔“ شعیب علی نے دوستی لہجے میں کہا۔  
”تم تو بات کو الٹ لے جاتے ہو۔ جہیز دینا ایک روایت ہے۔“ زہرہ بیگم نے بات بدلی۔

”آخر ضرورت ہی کیا ہے جہیز دینے کی؟ آپ کی اس روایت نے غریب لوگوں کو بہت دکھ دیئے ہیں۔ آپ شہروں میں دیکھیں، ہر گھر میں پیریاں ہیں، مگر کوئی پھر ان پر آکر نہیں گرتا، اس لئے کہ وہاں سے جہیز ملنے کی امید نہیں ہوتی تو کوئی ادھر رخ ہی نہیں کرتا۔“ شعیب علی لہجے میں دُکھ کھل گیا۔

”تو تو شہر جا کر انہی جیسی باتیں کرنے لگا ہے۔ لالہ! اسے لگام دیں۔“ شجاعت علی ہنس کر بولے۔

”سچ بات کہو تو کہا جاتا ہے کہ شہر والوں جیسی باتیں کرتا ہوں۔“ بھی آخر اس لنت سے چھٹکارا کیوں نہیں حاصل کیا جاسکتا؟ صفر بھائی! آپ شرط رکھ دیں، یا تو اس گھر میں بھائی آئے گی یا جہیز۔“ شعیب علی نے صفر علی سے ضدی بچوں کی طرح کہا جیسے وہ اس کا دھمکے آگے یقیناً ہتھیار ڈال دے گا۔

”تو ناشتہ کر چکا، بس اٹھ جا یہاں سے۔“ بکواس کئے جاتا ہے۔“ سیکر بیگم نے فحش گھر کا۔

”اماں! آپ بھی..... اب میں نہیں آؤں گا۔“ شعیب علی کرسی کھسکا کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے بہت دکھ ہوا تھا کہ کوئی بھی اس کی بات نہیں مان رہا تھا۔

”اس کے ذہن میں یہ باتیں کیوں بٹھا رہا ہے؟ تجھے کیا دکھ ہے؟ عابدہ اگر جہیز میں نہیں لے کر آئے گی تو ہماری دولت میں ہی اضافہ ہو گا۔ نام اونچا ہو گا۔ اور کون سا اس سے ہم لیں گے، اگر لالہ دیں گے تو اپنی بیٹی کو دیں گے۔ اپنی شان اور نام اونچا کرنے کے لئے دیں گے۔“

”ہام اونچا صرف اس ذات کا ہے۔“ شعیب علی نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا اور باہر جانے کے لئے قدم بڑھائے۔

”دیے تمہاری دلہن ایسی تلاش کی ہے جو اکلوتی ہے۔“ چودھری طالب علی نے گویا دھاکا کر دیا۔ شعیب علی کے بڑھتے قدم ایک دم رک گئے۔ وہ پلٹا۔  
”کیا مطلب؟“

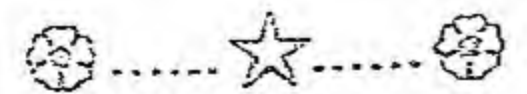
”بس، پریشان ہو گئے؟..... ساری جائیداد کی تنہا وارث ہے، وہ۔ تمہارے تو عیش ہو جائیں گے۔ بس ذرا عمر میں تم سے چند سال بڑی ہے، اور کوئی برائی نہیں ہے۔“ چودھری طالب علی کے بجائے زہرہ بیگم نے نہایت بے پروائی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

تب شعیب علی آہستہ آہستہ چلتا ہوا زہرہ بیگم کے سامنے آکھڑا ہوا اور سخت لہجے میں بولا۔

”مجھے اپنے بازوؤں پر بھروسہ ہے۔ کسی کی دولت کی ضرورت ہے مجھے۔ اور چاچی! میں کہانی دہرانا نہیں چاہتا۔“ شعیب علی نے ٹیبل پر دونوں ہتھیلیاں ٹکا دیں اور زہرہ بیگم کی طرف جھک کر بات جاری رکھی۔

”بس چودھری شوکت علی نہیں بننا چاہتا۔ سمجھیں آپ؟“

یہ کہہ کر وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ زہرہ بیگم کا رنگ المیاس کے پھولوں کی مانند زرد ہو گیا تھا اور پیشانی پر پسینے کی منہی منہی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھیں اور بائیں پرچی کی چادر میں تن کر رہ گئی تھی۔ پھر کوئی بھی کچھ نہ بولا۔ سب اس ماحول کی کشیدگی سے بچنے کے لئے ایک ایک کر کے باہر آ گئے۔



ان خاصا چڑھ آیا تھا، جب نورماں، راجا کو کھیتوں میں کھانا دے کر واپس آئی۔ راجا صبح تازہ تیرے ہی میل جوت کر بل چلانے چلا جاتا تھا۔ چاہے سردی ہوتی یا گرمی۔ یہ ہر دن کا اصول ہے کہ وہ سورج کی پہلی کرن کا استقبال اپنے کھیتوں میں کرتا ہے۔ جب راجا



جاتا تو نوریاں جاگ رہی ہوتی۔ اس کے جانے کے بعد وہ منہ ہاتھ دھو کر نماز پڑھتی، پھر ناشتہ تیار کرنے میں لگ جاتی۔ ساتھ ہی مومنو کو بھی جگا دیتی۔ مومنو، چودھری دلاور کے پاس سے جا کر کسی لے آتی۔ تب نوریاں ناشتہ لے کر کھیتوں پر چلی جاتی، جہاں راجا دوسرے ہاریوں کے ساتھ زمین کا سینہ چیر رہا ہوتا۔ نوریاں کے جانے کے بعد مومنو اور اشوئل کرنا شروع کرتے، پھر مومنو پورے گھر کی صفائی کرتی، برتن مانجھ کر ٹوکے میں اور گھرے بھر گھر وچنی پر رکھتی اور جب نوریاں کافی دیر بعد واپس آتی تو اسے پورا گھر صاف ملتا۔ مگر آج خلاف توقع جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو وہ جو کچھ، جیسا چھوڑ کر گئی تھی، ویسا ہی پڑا تھا۔ پیٹڈ پپ کے سامنے رکھے ہوئے برتن ویسے ہی بکھرے پڑے تھے اور پورے آنگن میں نیم اور شیشم کے پتے اڑتے پھر رہے تھے۔

یہ مومنو کہاں گئی؟..... نوریاں نے چنگیر اور جگ چولہے کے پاس رکھتے ہوئے سوچا۔ سویرے تو جا کر کسی لائی تھی۔ کیا پھر سو گئی؟.....

”مومنو!..... مومنو!“ نوریاں نے زور سے آوازیں دیں اور جب کوئی جواب نہ ملا تو کمرے کی طرف بڑھی۔ پھر اسے دروازے میں ہی ٹھک جانا پڑا۔ مومنو اور اشوئل ایک دوسرے کے گلے میں بائیں ڈالے سینے تک رضائی اوڑھے بے خود سوئے ہوئے تھے۔ کڑکی کے راستے آنے والی سورج کی کرنیں اُن کا منہ دھلا رہی تھیں۔ نوریاں کے دل میں مومنو کے لئے ڈھیروں پیار انگڑائی لینے لگا۔ آخر تھی تو اسی کی بیٹی، اس کے جگر کا ٹکڑا۔

نوریاں آہستہ آہستہ چار پائی کی طرف بڑھی اور مومنو پر جھک گئی۔ مومنو کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ یہ سرخی واضح طور پر انگلیوں کے نشانوں کی تھی۔ کیونکہ رات نوریاں نے سالن گرانے پر بڑے زور سے طمانچے مارے تھے اور انگلیوں کے نشان پھول سے گالوں پر جم کر رہ گئے تھے۔ آنسوؤں کی لکیریں بھی ان نشانوں کو چھپانے میں ناکام رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا، جیسے مومنو تمام رات روتی رہی ہو۔

نوریاں کی آنکھیں بیگ گئیں۔ اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔

”مومنو!..... میری جان!..... میں نے تجھے دُکھی کیا۔ تجھے کیا ملا میرے ساتھ رہ کر؟ غربت، دُکھ، سوتیلے بھر کی گھر کیاں، جو اپنی اُسنگوں کی راتوں اور جوانی کے دنوں کے بے رنگ گزر جانے کا ذمہ دار چودھری کو سمجھتے ہوئے بھی اس کا بدلہ تجھ سے لینا چاہتا ہے۔ جس نے کبھی تجھے بیٹی نہیں سمجھا، کبھی تجھے پیار نہیں کیا۔ اور اسی کے خوف سے کبھی میں نے بھی تجھے گلے نہیں لگایا کہ کہیں وہ کچھ اور نہ سمجھ لے۔ مرد ذات بڑی شکی ہوتی ہے نا!“

”مومنو!.....!“ نوریاں نے اپنے کپکپاتے ہونٹ مومنو کے گالوں پر ابھرنے ہوئے سرخ نشانوں پر رکھ دیئے۔ ”تُو اپنے بابا کے پاس کتنی خوش رہتی مگر وہ آتا کیوں نہیں؟ صرف تُو

کونے کے بعد اس نے تجھے چھوڑ دیا۔ کیا تیری یاد اُسے نہیں آتی؟ تُو جو اُس کی آرزوؤں کی پوری کی پوری کی پیکل ہے، تُو جو اس کے خوابوں کی جوت تھی، آنکھوں کا اُجالا تھی، اتنی جلدی تھی اس نے تجھے؟ تُو بھلا نے والی چیز تو نہیں۔ آخر وہ تیرا باپ ہے۔ میرے خیال میں اب کوئی اور نوریاں مل گئی ہوگی اور اس نے اسی کو اپنی خواہش کا مرکز بنا لیا ہوگا۔“

”سب کچھ سوچ کر نوریاں کے حلق میں کڑواہٹ کھل گئی۔

”مومنو!..... مومنو!..... میری دھی!..... میری جان!“ نوریاں نے مومنو کے چہرے پر ہاتھوں کی بارش کر دی۔

”بابا!..... بابا!“ مومنو نیند میں بڑبڑائی۔ اتنے پیار سے، اتنے جذبے اور محبت سے پُرجے میں اس کا بابا ہی اسے پکارتا تھا۔

مومنو کے منہ سے لفظ ”بابا!“ نکلنے کی دیر تھی کہ نوریاں ایک جھٹکے سے سیدھی ہو گئی۔ ابھی پُرجے پہلے جو کچھ اس نے سوچا تھا، وہ صرف جذباتی پن تھا، اور کچھ نہیں۔ مومنو کے منہ سے نکلنے والے لفظ ”بابا!“ نے اس کے تن بدن میں آگ سی نگادی۔ اس کا جسم جھلنے لگا۔

”بابا!..... بابا!“ مومنو نیند میں بائیں پھیلا رہی تھی، جیسے وہ خواب میں اپنے بابا کو دیکھ رہی ہو۔

”اٹھ جا مومنو!..... تُو اب تک اُس مردود کو نہیں بھولی۔“ نوریاں نے اس کا بازو کھینچا تو ایک دم آنکھیں کھول کر اٹھ بیٹھی۔ اتنی چیخ و پکار پر اشو بھی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

”میں جو کہہ گئی تھی، کام کر لینا۔“ نوریاں گرجی۔

”نیند آرہی تھی۔“ مومنو نے آنکھیں ملیں۔

”رات بھر بھٹے بھونتی رہی تھی، جواب نیند آرہی تھی؟“ نوریاں نے غصے سے پھٹکارتی آواز میں پوچھا۔

”بابا! رات کو روتی رہی تھی، اماں!“ اشو نے بتایا۔

”کیوں، کون مر گیا تھا، جسے رو رہی تھی؟ بابا کے مرنے کی خبر آئی تھی تیرے پاس؟“ نوریاں نے دو ہتھوڑ دیئے اور مومنو نے گھبرا کر سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔

”خدا نہ کرے ماں! وہ مریں۔ میں ہی مر جاؤں۔ اللہ میاں میری عمر بھی میرے بابا کو دے۔“ مومنو مار کھاتے ہوئے بھی بابا کے لئے دعائیں کر رہی تھی۔

”اماں! نہ مارو۔“ اشو نے ماں کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

”تُو زیادہ حمایتی نہ بنا کر اس کا۔“ نوریاں نے اشو کو لپٹا لیا۔ تب پتہ نہیں کیسے وہ نرم نرم ہونٹوں پر ہنس رہی تھی۔

”نوریاں! لال! تُو میرے جگر گوشے کو لے کر کہاں چلی گئی ہے۔“ نوریاں نے دُکھ سے



سوچا اور اشو کو سینے سے لگائے لگائے باہر آگئی۔

”بس میں نہیں رہوں گی، چلی جاؤں گی۔“ مومو نے اپنی آنکھوں کو بڑی بے دردی سے مسل ڈالا۔ حالانکہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ خوب ہٹوٹ ہٹوٹ کر روئے۔ مگر نے اپنے دل کی بات نہ مانی۔ بھلا کبھی رونے سے بھی قسمیں سنوری ہیں، جو اس قسمت بدل جاتی؟

”اب اٹھ بھی جا۔ کام کر لے۔ میں گندم صاف کرنے جا رہی ہوں، چودھری کے ہاں۔“ نوران نے باہر ہی سے ہانک لگائی۔ مومو جلدی سے بستر سے اترتی اور کمرے سے باہر آگئی۔ نوران نے روٹی اور لسی چار پائی پر رکھ دی تھی۔

”تو اور اشو روٹی کھا لو۔ کام کر کے ادھر ہی آ جانا۔“ نوران نے جوتی پہنتے ہوئے کہا اور کوئی جواب سنے بغیر گھر سے نکل گئی۔ مومو چوہے کے پاس بیٹھ گئی اور تنکے سے راکہ کریدنے لگی جیسے وہ چنگاری حاصل کرنا چاہتی ہو، جو راجا اور نوران کو بھسم کر دے۔ مگر ایسی کوئی چنگاری نہیں ملی۔

”بی بی! روٹی کھا لو۔“ اشو نے اسے سوچوں میں غرق دیکھ کر کہا۔

”میں نہیں کھاؤں گی۔ تم کھا لو۔“ مومو کے جڑے بچھ گئے۔

”بی بی! میں بھی نہیں کھاؤں گا۔“ اشو منہ پھٹلا کر بیٹھ گیا۔

”تم کھا لو نا۔“ مومو نے محبت سے کہا۔

”نہیں!“ اشو نے زور زور سے انکار میں گردن ہلائی۔ وہ بھی ضد کا ایک ہی تھا۔

”کھالے میرے ویر! مجھے بھوک نہیں۔“

”تو مجھے بھی بھوک نہیں ہے۔“ اشو نے منہ پھیر لیا۔

”بہت ضدی ہے تو۔“ مومو اس کی محبت کے سامنے بے بس ہو گئی۔ اس گھر میں صرف

اشو ہی تو تھا، جسے اس سے محبت تھی۔ مومو کو پڑتی، بیسیں اشو کے سینے سے اٹھتیں۔ مومو کے آنسو اس کے دل میں آگ سی لگا دیتے۔ ابھی اشو صرف پانچ سال کا تھا مگر بہن کا اسے

اس طرح خیال تھا، جیسے وہ اس سے بڑا ہو، اس کا سائبان ہو۔

کھانا کھانے کے بعد مومو کام میں لگ گئی، مگر اس کا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔ رات بھر

وہ اپنی زندگی کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ اب تو اس نے تہہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے بابا کے

ساتھ چلی جائے گی۔ یہاں تو دو دو جوتے کھائے بغیر روٹی بھی نہیں ملتی۔ بابا کے ہاں یہ بات

نہیں ہوگی۔ یوں لگتا ہے، سو تیلی ماں ہے میری۔ مگر ماں سو تیلی ہوتی ہے تو باپ سکا ہوا

ہے۔ میرا تو باپ بھی سو تیلہ ہے، پھر ماں کیوں بن گئی ہے؟

”اشو! تو میرے ساتھ چلے گا نا؟“ مریم نے اشو کی طرف دیکھا، جو برتنوں کو بے

بچے سے جھجکا کر ٹوکے میں رکھ رہا تھا۔

”کہاں بی بی!“ اشو نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”میرے بابا کے پاس..... میرا بابا بہت امیر آدمی ہے۔“ مومو نے کہا۔

”تو راجا تیرا بابا نہیں؟“ اشو نے نہایت حیرت سے پوچھا۔ ”یہ انکشاف اس کے لئے

پانچا۔

”یہ صرف تمہارا بابا ہے، جو نام کا راجا ہے۔ میرا بابا تو واقعی راجا ہے۔“ مومو نے نہایت

سنہرے کہا۔ باپ کی امارت کا بتاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک لہرائی تھی۔

اشو کو اس کی یہ منطق بالکل سمجھ نہ آئی تھی کہ آخر میری بی بی کا باپ اور آدمی کیوں ہے۔

یہ میری بہن ہے۔ جو ماں میری ہے، وہی اس کی ہے۔ پھر ہمارے باپ کیوں الگ ہیں؟ یہ

آج بی بی کیسی باتیں کر رہی ہے؟ کہیں مارنے اسے پاگل تو نہیں کر دیا؟..... اشو کا ننھا سا

ذہن سوچ کر رہ گیا۔ ابھی چند روز پہلے ہی تو ایسا ایک واقعہ گاؤں میں پیش آیا تھا۔ چودھری

دلادر کے مزارع رضو نے تجوری میں سے کچھ رقم چرائی تھی۔ چودھری دلادر نے ڈیرے پر

رضو کو اپنے کارندوں سے اس قدر پٹوایا کہ وہ پاگل ہو کر رہ گیا۔ اور اب وہ احمد پور کی گلیوں

میں ہوش و خرد سے بے گانہ پھرا کرتا ہے۔ اس کی ماں اور بہن تو ساتھ والے گاؤں چلی گئی

نہیں مگر رضو نہ جانے کیوں نہ گیا تھا۔ وہ نہیں جانا چاہتا تھا احمد پور سے۔ وہ اسی کی گلیوں

میں بچوں کے پتھر کھاتا رہتا۔ کبھی کوئی ترس کھا کر اسے کھانے کو کچھ دے دیتا۔ نوران نے

اشو کو بتایا تھا کہ رضو نے چوری کی تو چودھری دلادر نے بہت مار لگوائی اُسے اور آخر کار وہ

پاگل ہو گیا۔ اور اب اشو کے ننھے سے ذہن میں یہی بات آئی تھی کہ بی بی کو بھی روز روز کی

مارنے پاگل تو نہیں کر دیا۔ وہ مومو کی طرف دیکھ کر رہ گیا، جو راکھ سے دیکھی چمکانے میں لگی

ہوئی تھی۔



شام، رات کے کندھوں پر جھکتی چلی آرہی تھی۔ چہار سو شام کا ملکجا اندھیرا چھانے لگا

تھا۔ آج سب ساہیوال گئے تھے، صفدر علی کی منگنی کرنے۔ رنگ محل میں صرف چودھری

شوکت علی ہی تھے۔ حالانکہ سب نے کتنا چاہا تھا کہ وہ بھی چلیں، مگر انہوں نے جانے سے

سناں انکار کر دیا تھا۔ پرسوں منگل تھا اور انہوں نے اپنی مومو سے ملنے جانا تھا۔ ایک ہفتہ وہ

انگلیوں پر گن گن کر گزارتے تھے اور وہ..... اُن کی مومو، اُن کی بیٹی بھی کس قدر بے قرار

رہتی تھی۔

چودھری شوکت علی درتے میں کھڑے ڈوبتے سورج کو دیکھ رہے تھے۔ شفق پر لالی

میں ہونے لگی تھی اور کمرے میں ہلکے ہلکے سروں میں کیسٹ ریکارڈ چل رہا تھا۔ شوکت علی کی



پُرسوز آواز دل اُدھیر رہی تھی۔

کدلی آویں تے میں دُکڑے سداواں  
اڈیکاں وچ جند مُک گئی  
اگھاں تھک گئیاں تک تک کے راہواں  
اڈیکاں وچ جند مُک گئی

چودھری شوکت علی کو پتہ بھی نہ چلا، کوئی ہولے سے پردہ ہٹا کر کمرے میں آگیا۔  
ٹیپ بند کر دیا۔ چودھری شوکت علی خیالات کے بھنور سے ایک دم نکل آئے، فوراً اپنے  
سامنے شعیب کھڑا تھا۔

”چاچا.....!“ شعیب مسکرایا۔

”تم گئے نہیں مگنی میں؟“ چودھری شوکت علی نے حیرت سے پوچھا۔

”آپ کیوں نہیں گئے؟“ شعیب علی ان کے قریب آگیا۔

”بس، دل نہیں چاہا۔ مگر تمہیں تو زیادہ دن روکا ہی شخص اس لئے تھا بھر جائی نے کہ میں  
میں جاتے۔“ چودھری شوکت علی نے کہا۔

”ادھر بھی یہی حال ہے۔“ شعیب مسکرایا۔

”بیٹھو! کیسے آئے تم؟“ چودھری شوکت علی کرسی پر بیٹھ گئے اور اسے بھی بیٹھنے کو کہا۔

”آپ سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ کل میں چلا جاؤں گا۔ سوچا وہ بات آنا  
کر ہی لوں، جس نے کئی راتوں سے میری نیندیں لوٹ لی ہیں۔“ شعیب ان کے قریب  
پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”کون سی بات؟“ چودھری شوکت علی کا دل چوڑی چھاتی میں دھڑ دھڑ کرنے لگا۔

”آپ سمجھتے ہیں۔“ شعیب علی نے متنی خیر مسکراہٹ سے کہا۔

”کہیں اکھ ملکا تو نہیں چلا لیا تم نے؟“ چودھری شوکت علی بھی شوخ ہو گئے۔

”یہ خیال آپ کو کیوں آیا؟“ شعیب علی کے ہونٹوں پر بدستور مسکراہٹ تھی۔

”کیونکہ نیندیں عموماً اس عمر میں اسی وجہ سے اڑتی ہیں۔ آنکھ سے آنکھ لی، دل سے دل

نکلایا اور نیندیں پر کر فیوگ گیا۔“ وہ بالکل دوستوں کی طرح باتیں کر رہے تھے۔

”بہر حال، ادھر یہ معاملہ نہیں۔ آپ کے ساتھ تو یہ چکر نہیں؟“ شعیب علی نے جھک

کر پوچھا۔

”ناں..... ناں۔“ چودھری شوکت علی نے ہلنور اور زوردار ہتھک لگایا۔

”پھر اس روز کہاں سے آ رہے تھے، جب یہاں نہ کیا تھا کہ آپ مجھے اسٹیشن لے گئے

تھے؟“ شعیب علی ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے گہرے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

”وہ..... وہ شعیب!“ چودھری شوکت علی ایک دم گھبرا گئے۔

”چاچا! جھوٹ نہیں چلے گا۔ مجھے سچ بتادیں۔“ شعیب علی کرسی سے اٹھ کر ان کے  
قریب آیا اور ان کے گھٹنوں پر دونوں ہاتھوں کا بوجھ ڈالتے ہوئے بولا۔ ”چاچا! اتنا تو مجھے  
علم ہے کہ آپ چاچی زہرہ سے خوش نہیں ہیں، عمروں کا اتنا تفاوت کبھی بھی ذہنی ہم آہنگی  
پیدا نہیں ہونے دیتا۔ آپ مجھے بتادیں، آپ کا جو بھی جواز ہے۔“ وہ ہمیشہ اس دل میں  
رہے گا۔“

”شعیب! میری جان! آگئی کے دکھ بہت برے ہوتے ہیں۔ تُو کچھ نہ جان تو اچھا  
ہے۔“ ان کے لہجے میں دکھ تھا۔

”آپ کو میری قسم چاچا!“ وہ منمنایا۔

”جند میری! اگر تُو اپنی قسم نہ بھی دیتا تو بھی میں تجھے ضرور بتایا۔ میں نے تمہیں کیا ہوا  
ہے کہ اپنے راز میں تجھے شریک کر لوں گا۔ کیونکہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ سانس کے  
آنے جانے کا نام زندگی ہے۔ اور جب سانس رک جائے تو کچھ نہیں رہ جاتا، مٹی ہی رہ  
جاتی ہے۔ مجھے علم ہے کہ پوری دنیا میں تُو واحد بندہ ہے، جو میرا ہے۔ تجھے مجھ سے ہر رومی  
ہے۔ میں تو اپنوں کے لگائے ہوئے زخموں پر ابھی تک مرہم لگا رہا ہوں، مگر زخم ایسے ہیں کہ  
بہرتے ہی نہیں۔“ چودھری شوکت علی ہولے ہولے بولتے گئے۔ ان کا لہجہ نہایت ٹوٹا ہوا  
تھا۔ آنکھوں میں لاتعداد اذیتیں سرخی بن کر تیر رہی تھیں۔ اپنے چاچا کے دکھ پر شعیب کا دل  
بھی دکھ سے بھر گیا۔

”مجھے وہ راز بتادیں، چاچا! ان زخموں کے بارے میں بتائیں، جو اپنوں نے لگائے  
ہیں۔ کس نے لگائے ہیں چاچا؟ میں..... میں اس سے دُگنے زخم انہیں لگاؤں گا۔“ شعیب  
ایک عزم سے بول رہا تھا۔

”ابھی میں وقت کا منتظر ہوں..... وقت جو بہت بڑا منصف ہے۔ اگر وقت نے  
انصاف نہ کیا تو پھر میں تجھے بتاؤں گا۔“ چودھری شوکت علی چھت کی طرف دیکھتے ہوئے  
بڑبڑائے۔

”نہیں، مجھے آج ہی بتائیں چاچا!“ شعیب علی ضدی بچے کی طرح مچل گیا۔ اور دیے  
بھی اب وہ اس راز سے پردہ اٹھانا چاہتا تھا، جس نے اس کے چاچا کو بچھا کر رکھ دیا تھا، توڑ  
بھوڑ دیا تھا۔

”کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“ چودھری شوکت علی نے کرسی کی پشت سے سر لگا کر نہایت  
آہستہ سے کہا۔

”اُس روز اتنی سردی میں کہاں سے آ رہے تھے آپ؟“ شعیب علی نے پوچھا۔



”شعیبی! تو دل میں کوئی غلط بات نہ بٹھانا، میری طرف سے۔ میں اس روز اپنی اور سے ملنے گیا تھا۔“ انہوں نے آنکھیں موندے موندے کہا۔

”کیا.....؟“ شعیب علی ایک دم سیدھا ہو گیا۔ اسے اپنے چاچا کی دہائی حالت پر سہا ہونے لگا تھا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ شعیب علی نے انہیں کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

”میں نے غلط بات تو نہیں کہی، شعیبی! سچ بولا ہے۔“ چودھری شوکت علی نے انہیں کھول کر شعیب علی کے حیران و پریشان چہرے کی طرف دیکھا۔

”آپ کی بیٹی؟“ شعیب علی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ہاں، میری بیٹی۔ میری مومنو بہت پیاری ہے۔“ چودھری شوکت علی کے لہجے میں شیرینی سی گھل گئی۔ مومنو کے ذکر نے ان کے چہرے پر کئی رنگ پھیلا دیئے۔

”مجھ سے بھی زیادہ پیاری؟“ شعیب کے منہ سے شکوہ پھسل پڑا۔ تب انہوں نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔

”او جھلے! تو میرے دل کا ایک ٹکڑا ہے تو وہ دوسرا۔ ایک آنکھ کا نور وہ ہے تو دوسری کا تو۔ تم دونوں ہی میری آنکھوں کے تارے ہو۔“ چودھری شوکت علی اس کے سر پر ٹھوکی ٹکاتے ہوئے ہوئے ہوئے، محبت سے چوڑ لہجے میں بول رہے تھے۔

”تو آپ نے دوسری شادی کی ہوئی ہے۔“ شعیبی ان کے سینے سے سر رگڑنے ہوئے بولا۔

”ہے نہیں، کی ہوئی تھی۔“ وہ ہولے سے بولے۔

”چاچا! مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ آپ مجھے سب کچھ بتا دیں۔“ شعیب علی زچہ کر بولا۔

وہ جلد از جلد سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔ نو جوان نسل میں ایک برائی یہ بھی ہے کہ انتظار نہیں کر سکتی، چاہے وہ انتظار کسی قسم کا بھی ہو۔ نو جوان نسل ہوش سے نہیں، جوش سے کام لینے کی عادی ہے اور پھر بعد میں پچھتانا بھی پڑتا ہے اسے۔ شعیب نے چودھری شوکت علی کی طرف دیکھا۔ ان کی پلکیں موندی ہوئی تھیں اور منہ میں حقے کی تکی۔ چہرے پر غم کی پرچھائیاں لرزاں تھیں، جیسے وہ شعیبی کو اپنا راز بتاتے ہوئے تلوار کی تیز دھار پر سے گزر رہے ہوں۔ پچھلی باتوں کو دہرانا ان کے لئے کنھن کام ہو۔ وہ درد کے جس سمندر سے گزر رہے تھے، شعیب علی اس سے نابلد تھا۔ پھر ہوئے ہوئے انہوں نے بولنا شروع کیا۔

شعیب علی ہر تن گزشت ہو گیا۔

شعیب علی ہر تن گزشت ہو گیا۔

شعیب علی ہر تن گزشت ہو گیا۔

شعیب علی ہر تن گزشت ہو گیا۔

ہوا بہت تیز تھی، جس کی وجہ سے دھوپ کی تپش بھی زیادہ محسوس نہ ہو رہی تھی۔ اس تیز ہوا میں بھی نوریاں پوری کی پوری پسینے میں بھیک چکی تھیں۔ بار بار سر پر رکی چٹری سے وہ اپنے چہرے کو صاف کرتی، مگر تپ کی آستین چڑھاتی اور اور پھر گندم کی صفائی میں لگ جاتی۔ صبح سے وہ گندم صاف کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ مومنو بھی باقاعدہ ماں کا ساتھ دے رہی تھی اور صاف کئے ہوئے دانے الگ رکھتی جا رہی تھی۔ سامنے ہی شیشم کے درخت تلے چودھراؤں اپنی بیٹی زبیدہ کے ساتھ بیٹھی تھی اور دوسری چار پائی پر اس کا بیٹا زبیر تھا، جو چند روز پہلے شہر سے آیا تھا۔ شہر میں وہ کسی محل کا شیجر تھا۔

”مومنو! زبیدہ نے پکارا۔

”جی بی بی جی!“ مومنو نے اپنی نہایت اداس آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”بختو کو کہہ لالہ کے لئے چائے بنائے۔ اور جلدی سے لیتی بھی آؤ۔“ زبیدہ نے کہا۔

”اچھا جی!“ مومنو ہاتھ جھاڑ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

”کچھ دیر کے لئے جان تو چھوٹی۔“ مومنو نے باورچی خانے میں پڑی بیڑھی پر بیٹھتے ہوئے سوچا۔ بختو نے چائے کا پانی چولہے پر چڑھا دیا تھا۔

”ماں! آج کیا دن ہے؟“ مومنو نے یونہی پوچھا۔

”تیر ہے۔“ بختو بولی۔

”اور کل؟“ مومنو نے اشتیاق سے کہا۔

”منگل۔“

”کی.....“ مومنو کا دل ہلیوں اچھلنے لگا۔ اندرونی خوشی نے اس کے چہرے پر کئی رنگ بکھیر دیئے۔

”ہاں بھئی، مگر ایک بات تو بتا، یہ تو منگل کے دن کا سن کر خوش کیوں ہو جاتی ہے؟“ بختو نے مومنو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ نہیں..... ویسے ہی پوچھ لیا تھا۔“ مومنو گڑبڑا کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں کی



اویسیاں خرید گہری ہو گئیں۔

”تو اتنی گھبرا کیوں رہی ہے؟“ بخٹو نے پیالی میں دودھ ڈالتے ہوئے ہنس کر پوچھا۔  
”چائے بن گئی؟“ مومو نے جلدی سے بات پلٹی۔

”ہاں..... لے جا۔“ بخٹو نے کہا۔

اور جب مومو دونوں ہاتھوں میں ٹرے تھامے، آہستہ آہستہ آ رہی تھی تو نہ جانے کیسے ایک دم وہ لڑکھڑا گئی..... اس نے ٹرے اور خود کو بہت سنبھالنے کی کوشش کی، مگر خود سنبھالتے ٹرے گر کر رہ گئی۔

”کیا ہوا مومو؟“ وہ تینوں ایک ساتھ بولے۔ نورال تیزی سے اس کے قریب آئی۔  
”دھیان سے نہیں چلا جاتا، بد بخت!..... منہوس کہیں کی، اتنا نقصان کر دیا ہے۔“  
نورال نے دو ہتھوڑے جڑ دیئے۔

”ارے..... کیا کر رہی ہو؟“ زبیر نے نورال کا ہاتھ تھام لیا اور دوسرے ہاتھ سے مومو کو اپنے قریب کر لیا۔

”میں تو اس کی قبر کھٹ دوں گی۔ کم بخت، پتہ نہیں کن خیالوں میں رہتی ہے۔“ نورال شعلے برساتی نظروں سے اسے تک رہی تھی۔

”چھوٹے چودھری! میں نے جان بوجھ کر تھوڑی گرائی ہے؟“ مومو نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

”تم جاؤ، کام کرو نورال! چائے اور بن جائے گی۔“ زبیر نے نورال سے کہا تو وہ مومو پر ایک ناپسندیدہ نگاہ ڈال کر پلٹ گئی۔

”جلی تو نہیں تم؟“ زبیر نے محبت سے پوچھا۔

”پاؤں پر گری ہے۔“ مومو کے پاؤں پر جلن ہو رہی تھی۔

”آؤ، میں دوائی لگا دوں۔“ زبیر اسے سہارا دے کر اندر لے گیا۔ مومو کی سسکیاں اب تک نہ رک رہی تھیں۔

”بھئی اب رونا بس بھی کرو۔ مائیں تو بچوں کو مارتی ہی ہیں۔“ زبیر نے اسے مسکرایا بٹھاتے ہوئے کہا۔

”مگر میری ماں تو اٹھتے بیٹھتے جوتے مارتی ہے۔“ مومو نے ہتھیلی سے آنکھوں کو رگڑا۔  
”میں سمجھاؤں گا کہ نہ مارا کرے۔“ زبیر نے اس کے پاؤں پر برنائل لگاتے ہوئے کہا۔

تب ہی زبیرہ اور چودھرائی زینب بھی وہیں آ گئیں۔

”جاؤ مومو! بخٹو نے چائے بنالی ہوگی، لے آؤ۔“ زینب نے کہا۔

”ہاں! ابھی میں نے برنائل لگائی ہے، ذرا اسے آرام تو کرنے دیں۔“ زبیر نے کہا۔

”لازموں کو آرام کا موقع نہیں دینا چاہئے، ورنہ یہ آرام طلب بن جاتے ہیں۔“  
نورال نے نہایت سخت لہجے میں کہا۔

”مگر ماں!.....“ زبیر نے کہنا چاہا۔

”خیر آپ کو ملازموں سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟“ زبیرہ نے کہا۔

”ہونی بھی چاہئے۔ اپنے ملازمین کے دکھ درد کا احساس ہونا چاہئے۔ اور ابھی تو یہ منہ می تابی ہے، اسے محبت چاہئے۔“ زبیر کا لہجہ محبت سے بھر پور تھا۔

”اس کی ماں تو محبت کرتی نہیں۔“ زینب نے کہا۔

”آپ کو کیا پتہ۔ ماں کبھی اولاد سے نفرت نہیں کر سکتی۔ بس اس کی غلطیوں پر ٹوکتی ضرور ہے، مارتی بھی ہے، مگر دوسرے لئے پیار بھی کر لیتی ہے۔ اور مالک بھی تو ماں باپ کی جگہ ہوتے ہیں۔ مالکوں کو اپنے ملازموں سے محبت کرنی چاہئے۔“

”یہ باتیں آپ نے کہاں سے سیکھی ہیں؟“ زبیرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اپنے مالک سے۔ سچ زبیرہ! وہ ہم لوگوں میں اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ مالک، لازم کافرق مٹ جاتا ہے۔ ایسا سلوک کرتا ہے ملازموں سے جیسے کہ باپ بھائی ہوں۔ ذرا بھی اس میں خرد بڑائی نہیں ہے۔“ زبیر اپنے مالک کی تعریفیں کئے جا رہا تھا۔

”اچھا!.....“ چودھرائی زینب حیرت سے بولی۔

”ہاں۔ ایسے مخلص اور محبت کرنے والے لوگوں کی دنیا میں کمی نہیں ہے۔ انہی کے دم سے ہی تو اتنی بڑی دنیا کا کاروبار چل رہا ہے۔ اور انہی لوگوں میں چودھری شوکت علی بھی ہے۔ بہت ہی مخلص اور شفقت۔“ زبیر کا لہجہ اپنے مالک کی محبت سے چھوڑ چکا تھا۔

اور ادھر مومو کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ چودھری شوکت علی تو اس کا بابا ہے۔ یا یہ کی اور شوکت علی کا ذکر ہے؟ مومو کا جی چاہا، وہ زبیر کو اپنے بابا کا حلیہ پتا کر کے، کیا یہی اس کا مالک ہے؟ اور جب زبیر ”ہاں“ میں جواب دے تو اسے کہے۔ مجھے میرے بابا کے پاس فوراً لے چلو، اسے سب کچھ بتاؤ کہ یہاں میری ماں میرے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔

زبیر کیا کہہ رہا تھا، وہ بالکل نہیں سن رہی تھی۔ وہ تو اوپر والے کے کاموں پر حیران تھی کہ مقدر کی طرح بتاتا ہے۔ کیا قانون ہے مالک کا۔ زبیر میرے باپ کا ملازم ہے اور میں ان کی۔

اس نے تو اتنی جلدی حساب چکا دیا ہے۔ اور پھر زبیر کی آواز اسے سوچوں کے گرداب سے نکال رہی۔ وہ نہایت محبت سے کہہ رہا تھا۔

”مومو! اب ٹو مہینے آرام کر۔“

”نہیں!..... میں گھر جاؤں گی۔“ مومو فوراً بستر سے اتر گئی۔ ”میں جاؤں یا کس؟“



”ہاں، ہاں..... جاؤ تم۔“ چودھرائی زینب جلدی سے بولیں۔

”مومو ہولے ہولے پاؤں اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر آگئی۔ اب تک اس کے ہاتھ کی جلد پر سخت سوزش ہو رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا، کچا ڈالے۔“

”اماں! میں گھر جا رہی ہوں۔“

”آٹا گوندھ لینا، میں آ کر روٹی پکالوں گی۔ بس تھوڑے سے دانے رہ گئے ہیں۔“

نوراں نے دانے پٹختے ہوئے کہا اور مومو اپنی آنکھوں میں آنسو لئے حویلی کے آگے گئی۔

”ماں کو تو ذرا بھی میرا خیال نہیں ہے۔“ مومو نے زور سے آنکھوں کو مسلا۔

”ارے مومو! تو رو کیوں رہی ہے؟“ گلی کا موڑ مڑتے ہی شجاع سامنے آگیا۔

مومو کچھ نہ بولی، بس اُسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ بستہ لئے اُسے دیکھے جا رہا تھا۔

”آج بھی ماسی نوراں نے مارا ہے تجھے؟“ وہ ہنسا۔

”ہاں۔“ مومو نے نہایت سادگی سے اعتراف کیا۔

”کیوں؟“ شجاع نے حیرت سے پوچھا۔

جواب میں مومو نے سب کچھ بتا دیا۔

”تیرے سے چیزیں بہت گرتی ہیں۔ اُس روز تو نے سالن گرا دیا تھا اور مار کھائی تھی، اور آج چائے کا دھیان کرنا!“ شجاع نے سمجھایا۔

”میں نے جان کر تھوڑی گرائی تھی۔“ مومو کی پلکیں جھپک گئیں۔

”اچھا، اب تم روؤ مت۔“ شجاع نے اس کے آنسو پونچھ دیئے۔ ”بہادر بنا کرو۔ ذرا

ذرا سی بات پر رونا اچھا نہیں ہوتا، آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں۔“

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ مومو نے بھیگی بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”اسکول سے آ رہا ہوں۔ کھانا کھا کر چادریں اور تکیے بیچتے جاؤں گا۔“

”تم شہر جاؤ گے؟“ مومو نے نہایت اشتیاق سے پوچھا۔

”ہاں۔ کچھ منگوانا ہے؟“ شجاع نے کہا۔

”نہیں تو۔“ مومو بولی۔

”اگر کچھ منگوانا ہو تو کہہ دینا۔“ شیخو نے نہایت محبت سے کہا۔

”کہہ دوں گی۔“ مومو ہنس دی اور پھر آگے بڑھ گئی۔ شجاع اُسے جاتا دیکھتا رہا۔

چھوٹی سی لڑکی، جس سے اُسے ایک دم ہی ہر روی سی ہو گئی تھی۔ اُس کے دکھ کو وہ انجانے طور پر اپنے دل میں محسوس کرنے لگا تھا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو شیخو نہ جانے، سوچتا ہوا اپنے گھر آ گیا۔

☆.....☆.....☆

شعیب علی نہایت بے قراری سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ باہر گپ اندھیرا تھا اور اسے تنگ رہا تھا، جیسے یہ اندھیرا اس کے اندر ہی اندر بڑھتا چلا جا رہا ہو۔ چودھری شوکت علی نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا اور سب کچھ سن کر وہ خاموش تھا، کچھ بھی نہ بولا تھا اور اب مسلسل کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اس کے ذہن میں جوار بھانا آیا، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔

جی چاہ رہا تھا، اس کے بابا نے جس ”رنگ محل“ کی عزت بچانے کے لئے چاچا پر ظلم توڑا ہے، اس رنگ محل کو تھیں نہیں کر دے، آگ لگا دے اسے اس کے کینوں سمیت۔ اسے امید نہیں تھی کہ چاچا شوکی کا اس قدر بڑا راز ہوگا، جو وہ چھپائے پھر رہے تھے۔ یہ ان کا ہی دل کر رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر خالی ہو گئے تھے۔ ان کے دل میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ شعیب علی نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر چودھری شوکت علی کی طرف دیکھا، وہ کرسی پر بیٹھے نہایت حیرت سے شعیب کو دیکھ رہے تھے۔ شعیب کو یوں لگا، جیسے وہ کہہ رہے ہوں۔

”شعیبی! اب تو کیا کرنے کا چاند؟..... تجھ سے کیا ہوگا؟ کس طرح اپنے چاچا کا دکھ بٹائے گا؟“ ان کی آنکھوں میں اُن گنت سوال تھے۔ اربانوں اور اُمنگوں کی چٹائیں صاف جتنی نظر آ رہی تھیں شعیب کو۔ اور ان شعلوں کی لپک سے شعیبی بھی جھلسا جا رہا تھا۔

”انتقام لو میرا شعیبی!..... میری آرزوؤں کا انتقام لو تم اپنے بابا سے..... ہم باپ بیٹی کے درمیان وچھوڑے ڈالنے والے کو تم بھی وچھوڑ دوں سے ہم کنار کرو۔ تاکہ اُسے پتہ چلے، داد کا وچھوڑا کیسا ہوتا ہے۔ بلی سے بھی اگر اس کا بلو گٹرا جدا کر دیا جائے تو وہ بھی گر لاتی پھرتی ہے۔ میں تو انسان ہوں، جانور تو نہیں کہ چند روز بعد اپنی بچی کو بھول جاؤں۔ روز بروز شدت آتی جا رہی ہے اُس کی یاد میں..... میں کیا کروں؟“ شعیب علی کو یوں محسوس ہو رہا تھا، چاچا شوکی کی آنکھیں اس سے یہ سب کہہ رہی ہیں۔ اذیتوں نے ان کی آنکھوں میں دیریناں بھردی ہیں، اُداسیوں نے آنکھوں میں ڈیرے جمائے تھے۔

”چاچا!..... چاچا!“ شعیب علی تیزی سے آگے بڑھا اور چودھری شوکت علی کا حیران کن چہرہ اس چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ”چاچا! میں آپ کی آنکھوں میں چمک بھر دوں گا، شہنائیاں بھر دوں گا، آپ کی خوشیاں آپ کو لوٹا دوں گا۔ میں آپ پر کئے گئے مظالم کا بدلہ بابا سے لے لوں گا۔ میں وہی حرکت کروں گا، جو آپ نے کی تھی۔ میں بھی کسی نوراں جیسی لڑکی سے بوساں کروں گا۔“ شعیب علی ان کے چہرے کو دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لئے بولے۔

”نہیں!..... نہ۔ تو یہ حرکت نہ کرنا۔“ چودھری شوکت علی، گھٹی گھٹی آواز میں



”مجھے مت روکنا، چاچا!“ شعیب نے کہا۔

”تم جوش سے کام نہ لو، ہوش سے کام لو۔ یہ زخم اگر تجھے لگا تو تُو جی نہ سکے گا۔ یہ زخم مندرل کبھی نہیں ہوتا، بلکہ بڑھتے بڑھتے ناسور بن جاتا ہے، جس کا کوئی علاج نہیں۔“

”میں بابا کے دل پر ایسا زخم لگاؤں گا، جس کا کوئی علاج نہیں ہوگا۔“ شعیب علی لفظ چاچا کر بولا۔

”شعیبی! تُو برباد ہو جائے گا۔ جھلے! مجھے دیکھ..... مجھے دیکھ کر عقل پکڑ۔“ انہوں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

”یہ تو آنے والا وقت بتائے گا، چاچا! کہ میں برباد ہوتا ہوں یا رنگ محل کی بے تکی روایات کو برباد کرتا ہوں۔“ شعیب علی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”تُو نہیں مانے گا۔“ انہوں نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

”نہیں۔“ شعیب علی کے جڑے بھنچ گئے۔

”شعیبی!“ چودھری شوکت علی نے کچھ کہنا چاہا، مگر شعیبی بول اٹھا۔

”چاچا!..... آپ مجھے مت روکیے، بلکہ مجھے اُکسائیے، بابا سے انتقام لینے کا آپ اس سے اچھا موقع نہیں ملے گا۔ مجھے شہ دیتے کہ میں وہ سب کچھ کر گزروں جس سے بابا کو رنگ محل کی بنیادیں ہلٹی ہوئی نظر آئیں۔ ان کی اونچی گردن جھک جائے۔“

”شعیبی! میں نہیں چاہتا کہ تُو بھی تلوار کی دھار پر چلے اور اپنے پاؤں زخمی کرے۔“ چودھری شوکت علی نہایت سنجیدگی سے بول رہے تھے۔ ”میں..... میں تجھے اپنا بیٹا سمجھتا ہوں۔ اور کوئی باپ اپنی اولاد کو اپنے انتقام کی بھیٹ چڑھتے نہیں دیکھ سکتا۔ لالہ نے جو کچھ میرے ساتھ کیا، یہ میرے مقدر کا لکھا تھا۔“

”جو کچھ میں کروں گا، وہ ان کے مقدر کا لکھا ہے۔ اور تقدیر کے لکھے موت سے بچا نہیں۔“ شعیب علی نے درتے سے باہر اندھیرے میں نظریں گاڑ دیں۔

”میں کسی غریب لڑکی سے شادی کروں گا اور دیکھوں گا کہ وہ رنگ محل کی بھوکے نہیں بٹتی۔ آپ بزدل تھے، جو نوراں کو یہاں نہ لاسکے اور بابا کے غلط فیصلوں کی بھیٹ چڑھ گئے۔ مگر میں ان کی جھوٹی شان و شوکت پر خود کو قربان نہیں کروں گا، میں ان کے دل پر ہاتھ ڈالوں گا تا کہ وہ کراہ کر رہ جائیں۔“ شعیب علی چٹانوں کی سی سختی سے بولے گیا۔

”شعیبی! تم صرف انتقام کی خاطر شادی کرو گے؟ تم صرف میری خاطر اتنے لوگوں کا دل دکھاؤ گے۔ ایک رشتے کو خوش کرنے کی خاطر اتنے رشتوں کا تھوڑا سا مٹاؤ گے؟“ چودھری شوکت علی سمجھانے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔

”ہاں!“ شعیب علی نے کہا۔

”مگر چاند ایسی شادیاں چنیتی نہیں ہیں۔“ وہ بولے۔

”چاچا! پہلے عشق کروں گا، بالکل اسی طرح جیسے آپ نے کیا تھا۔ اور جب مجھے محسوس ہوگا کہ میں اس لڑکی کے بغیر نہیں رہ سکتا تو اس سے فوراً شادی کر لوں گا۔ ہم جیسے لوگوں کو جیت نہیں ہوتی تو ساتھ رہتے برسوں بیت جاتے ہیں، مگر گراں پیرا نہیں ہوتا۔ اور محبت کرنے کے لئے ایک لمحہ کافی ہوتا ہے۔ اب میں محبت کروں گا، چاچا! مجھے مت روکیں۔ جو آپ کو ملا ہے، اس کا سن کر میرے دل میں الاؤ سا روشن ہو گیا ہے اور اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے، جو میں نے بتایا ہے۔ اس طرح میں بابا کے ظلم کا تھوڑا سا کارہ ادا کروں گا۔“ شعیب نے کہا۔

”اگر لالہ انتہائی پہنچ گئے تو؟“ چودھری شوکت علی نے خدشہ ظاہر کیا۔

”میں شعیب ہوں..... چودھری شوکت علی نہیں۔“ شعیب علی نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت ذومستی لہجے میں کہا۔ اس کے اتنے مصمم ارادے نے چودھری شوکت علی کو گھبرا کر رکھ دیا۔ پھر بھی کتنی دیر اس کو انتہائی قدم اٹھنے سے روکتے رہے۔ مگر اس کے ذہن میں جو بات بیٹھ گئی تھی، اسے نکالنا مشکل تھا۔ اب چودھری شوکت علی پچھتا رہے تھے کہ انہوں نے شعیبی کو بتایا ہی کیوں۔ اگر نہ بتاتے تو شعیبی ان کے بارے میں نہ جانے کیا کچھ سوچتا اور آخر چودھری شوکت علی ہار گئے اور وہ جیت گیا۔

”ٹھیک ہے، جو تمہارا جی چاہے کرو۔ مگر ہر بات سے باخبر رکھنا۔“

”ضرور چاچا!“ شعیب علی خوشی سے بے قابو ہو گیا۔ ”چاچا! اب دیکھئے گا، میں کیا کروں گا۔ میں دیکھوں گا کہ چودھری طالب علی کیسے میرے بیوی بچوں کو جان سے ماریں گے۔ کیا کو جان سے ختم کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ پھر تم یوں کرو، میری ٹیکسٹائل میل کا بھی چارج سنبھال لو۔ میری کچھ اور بیٹوں کے سودے کی بات چل رہی ہے، وہ بھی ہو جائے۔“ چودھری شوکت علی نے کہا۔

”کیوں چاچا! آپ زمینیں کیوں بیچ رہے ہیں؟“

”مجھ میں سکت نہیں رہی کہ ان کی دیکھ بھال کر سکوں۔“ انہوں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

”سب بیچ دیں گے؟“ شعیب علی نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں..... تھوڑی بہت تو رکھوں گا۔“ وہ بولے۔

”مگر آپ نے تو مجھے بتایا بھی نہیں کہ آپ کی کراچی میں کوئی میل بھی ہے۔“ شعیب نے شگوہ کیا۔

”تمہیں اور کچھ بتایا تھا جو یہ بتاتا؟ بہر حال وہاں میرا گھر بھی ہے۔ لازم ہیں۔ تم



ہاسٹل سے وہاں شفٹ ہو جاؤ اور سب کچھ اب تمہارے اختیار میں ہو گا۔ مگر یہ یاد رکھو کہ ان چیزوں کے ایشن ہو۔ یہ سب کچھ میری مومن کا ہے۔“ چودھری شوکت علی بولے گئے۔  
”مجھے پتہ ہے۔ اور یہ سب کچھ اسی کو ملے گا۔ آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں؟“  
”تم پر تو خود سے بھی زیادہ اعتماد ہے۔“ وہ بولے۔  
”مگر آپ شاید یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں بھی اپنے باپ کی طرح خود غرض ہوں۔“  
شعیب نے کہا۔

”ناں، نائن شعیبی! یہ بات تُو نے کیوں سوچی جان؟“ چودھری شوکت علی زپ کر گئے۔

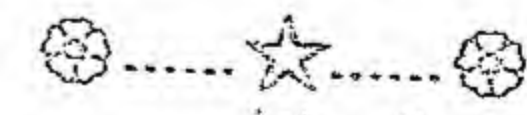
”سوری چاچا! میں تو ذرا ق کر رہا تھا۔“ وہ زور سے ہنس دیا۔ ”چاچا! ایک دم بھوک چک اٹھی ہے۔“

”ملازمہ سے کہو، لگا دے کھانا۔“ چودھری شوکت علی بولے۔  
”کیا خیال ہے، شہر چل کر نہ کھائیں؟“ شعیب علی نے دیکھ دے مٹکائے۔

”اتنی رات کو اور صرف کھانا کھانے چار پانچ کون کا سفر کریں؟“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”اتنی رات تو نہیں ہے، صرف دس بجے ہیں اور آپ نے سنا نہیں کہ دانے دانے پر ہوتی ہے۔ جہاں جس کے نصیب کا ہوتا ہے، وہیں ملتا ہے۔ اور چاچا! یہی روٹی تو بندے کو سات سمندر پار لے جاتی ہے۔ کبھی مشرق وسطیٰ کے ریگستانوں کا رخ کر داتی ہے، پتلی ریت پر دوڑاتی ہے۔ اگر ہم شہر چلے جائیں تو کون سا غضب ہو جائے گا۔ شاید قدرت نے آج کا کھانا وہیں کسی ہوٹل میں ہمارے لئے پہنچا دیا ہو۔“ شعیب علی ایک جذب کے عالم میں ہو لے ہو لے بولتا رہا اور چودھری شوکت علی متبسم ہونٹوں سے آنکھوں میں ڈھیر دل محبت لئے اُسے دیکھتے رہے۔

”گلاں تو تُو بہت اچھی کرتا ہے۔ چل پھر۔“ چودھری شوکت علی نے شعیب کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے شوخی سے کہا اور اس کا ہاتھ شام کر کرے سے باہر آگئے۔



وہ گھر کی صفائی سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔  
”کون آ گیا اس وقت؟“ اس کا منہ بن گیا۔ گھر میں کوئی بھی نہ تھا۔ شوہر نوکری پر گیا تھا اور بچہ سکول گیا تھا۔ مجبوراً وہ دروازے پر آئی۔

”کون؟“  
”جی ڈاکیہ ہوں۔“ آپ کا منہ آڑو آ رہا ہے۔ آپ دستخط کر کے لے لیں۔“ ڈاکیہ نے

”بھائی! یوں کرو، شام کو آ جانا۔ میرا میاں گھر پر نہیں ہے، میں کیسے دستخط کروں؟ مجھے تو لم پڑنا بھی نہیں آتا۔“ وہ بولی۔

”پھر بہن! یوں کرنا، کل گھر پر ٹھہرانا، کل دے جاؤں گا۔“ ڈاکیہ نے کہا۔  
”ٹھیک ہے۔ مگر یہ تو بتائیں، کہاں سے آیا ہے؟“ وہ بولی۔

”جہاں سے ہر سینے آتا ہے۔ کوئی کرم دین ہیں، وہ بھیجتے ہیں۔“ ڈاکیہ نے کہا اور چلا گیا۔

اور وہ تو سن ہو کر رہ گئی۔ دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ تو..... تو مجھے کیوں نہیں بتایا کیا؟ شیدے نے کبھی کوئی بات مجھ سے نہیں چھپائی تو یہ بات کیوں چھپاتا رہا؟ یہ رقم یقیناً چودھری شوکت علی، کریمو بھائی کو بھیجتا ہو گا اور وہ منی آرڈر کر دیتا ہے۔ اتنے سال ہو گئے اور شیدے نے مجھ سے یہ سب چھپایا۔ کیا وہ امانت میں خیانت کر رہا ہے؟..... نہیں، نہیں..... شیدا ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ تو بہت بھولا بھالا ہے۔ کیا شہر میں آ کر وہ بھی شہریوں جیسی سوچ رکھنے لگا ہے؟ دولت ہی کو مائی باپ سمجھنے لگا ہے؟..... مارے دکھ کے اس کے آنسو نکل آئے۔ تب ہی ایک ننھا سا بچہ گلے میں بستہ لٹکائے، صاف ستھری یونیفارم میں لباس گھر میں داخل ہوا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اُس نے ہانک لگائی۔

”امی!..... امی جی!“

یہ آواز سن کر وہ جلدی سے آنسو پونچھتے ہوئے آگے بڑھی۔

”امی جی! میں پاس ہو گیا ہوں..... اب میں فوراً کلاس میں پہنچ گیا ہوں۔ یہ دیکھئے کارڈ۔“ اس نے کارڈ ماں کے سامنے لہرایا۔

”علی!..... میرے لعل!..... ماں داری..... ماں صدقے..... ماں کو کہاں پڑھنا آتا ہے۔“ اس نے علی کو لپٹا لیا اور بے تحاشا اس کا منہ چومنے لگی۔ نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں سے آنسو ایک تواتر سے بہنے لگے۔

”امی جی! آپ خوش نہیں ہیں میرے پاس ہونے سے؟ پتہ ہے، میں کلاس میں نمبر نمبر پر آیا ہوں۔ ہیڈ ماسٹر نے بھی مجھے پیار کیا تھا، اور آپ خوش نہیں ہیں۔“ علی نے وہ بہت خوش تھا۔

”جان! میں خوش ہوں..... بہت خوش۔“ ماں نے اس کے گالوں پر ہونٹ رکھ دیے۔

”پھر وہ کیوں رہی ہیں؟“ علی نے پوچھا۔  
”یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔“ وہ مسکرائی۔

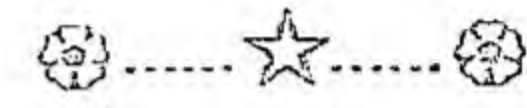


”خوشی کے بھی آنسو ہوتے ہیں امی جی؟“ علی نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... خوشی اور غم، یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ ہیں۔ یہ دونوں جذبے، یہ دونوں احساس ہمیشہ ایک ساتھ ملتے ہیں۔ اور آنسو تو کوئی موقع نہیں دیکھتے اور بہہ نکلتے ہیں۔“ اس نے علی کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے ہولے سے کہا۔

”امی جی! اب مٹھائی بانٹ دیجئے۔“

”ضرور..... چلو ابھی چلتے ہیں۔ مٹھائی لے آئیں اور بانٹ دیں۔ میرا بیٹا پاس ہوا ہے بھی۔“ اس نے بیٹے کو لپٹا کر بھینچ لیا۔



سہ پہر کا وقت تھا، علی سو گیا تھا مگر وہ جاگ رہی تھی۔ کیونکہ شیدے کے آنے کا وقت ہو گیا تھا اور اس نے جان بوجھ کر علی کو سلا دیا تھا۔ تاکہ وہ ان کی باتیں نہ سن سکے۔ آج اسے بہت غصہ تھا۔ بہت دکھ تھا اپنے شیدے پر۔ از دوامی زندگی میں یہ پہلا پتھر پڑا تھا، جس نے اسے زخمی کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ بہت حساس تھی۔ ذرا ذرا سی باتیں محسوس کرنے لگ جاتی تھی۔ صوفے کی پشت سے سر ٹیکے، آنکھیں موندے وہ دل میں اٹھتی درو کی لہروں کو دبائے جا رہی تھی۔

”علی کی ماں! کن سوچوں میں ہو؟“ شیدے نے اس کا کندھا تھپتھپایا تو وہ چونک گئی اور ایک ٹک شیدے کو دیکھنے لگی۔ اتنی غیریت تھی اس کی آنکھوں میں کہ شیدا حیرت سے اسے نکٹا رہ گیا۔

”کیا ہوا بھلی مانس! اس طرح کیوں رو رہی ہو؟..... کیا بہت اچھا لگ رہا ہوں؟“ وہ خوشی سے بولا۔

”زیادہ خوش فہمی میں مت رہو۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ مجھ سے کسی بات کا پردہ رکھو گے تو ہمیشہ اس بات پر پردہ پڑا رہے گا۔ کبھی تمہارا کوئی راز مجھ پر نہ کھل سکے گا۔“ اس کی آواز میں اس قدر سختی تھی کہ شیدا شش و پنج میں پڑ گیا۔ آج تک اس نے بیوی سے کوئی بات نہیں چھپائی تھی اور پھر چھپا کر کرنا بھی کیا تھا۔ تنخواہ ملتی تو پوری تنخواہ لالی کو لا کر دے دیتا اور روز کے دو روپے لے کر جاتا تھا۔ وہ بھی وہ خود دیا کرتی تھی۔ پھر کون سی ایسی بات ہو گئی۔

”تم نے مجھے بہت دکھی کیا ہے شیدے! میرا مان بھر بھری مٹی کی طرح ڈھے گیا ہے۔“

لالی دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پلک پڑی۔

”کس بات نے تجھے دکھی کیا ہے؟..... لالی! میں نے کبھی تجھ سے کوئی بات نہیں

چھپائی۔ پھر تیرا مان کیسے ٹوٹا؟“ شیدے نے نہایت محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ

دیا۔

”مجھے مت چھوؤ۔ تم دعا باز ہو، فریبی ہو۔“ لالی نے اس کا ہاتھ غصے سے جھٹک دیا۔

”جیسے بتاؤ تو سہی، کیا ہوا؟“ وہ پریشان تھا۔

”یہ پوچھو کہ ہوا کیا نہیں۔ کیا یہ جھوٹ ہے کہ چودھری شوکت علی اب تک تمہیں رقم بچا ہے؟“ لالی ناگن کی طرح پھنکار دی۔

”ارے بس.....؟“ شیدا ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا۔ ”اتنی سی بات پر تو نے مجھے فریبی

دعا باز بنا دیا ہے؟ یہ سچ ہے کہ ہم جب سے یہاں آئے ہیں، کریمو بھائی رقم بھیجتا ہے بلکہ چودھری اس کے پاس رقم بھجواتا ہے۔“ شیدا بولے گیا۔

”یعنی اتنے سال ہو گئے ہیں؟“ لالی حیران تھی کہ شیدے نے ایک دم ہی سب کچھ بے بنادیا۔ کوئی بہانہ کیوں نہ کیا۔

”ہاں۔ اور میں وہ رقم علی کے نام بینک میں جمع کرا دیتا ہوں۔ لالی! وہ رقم علی کی امانت ہے اور میں امانت میں خیانت کا تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ تجھ سے یہ بات میں نے اس لیے چھپائی کہ ایک بار تو نے ذکر کیا تھا، سونے کی چوڑیاں بنوانے کا اور میں نے سوچا، اگر تجھے بتا دوں گا تو شاید مجھے تیرا شوق پورا کرنا پڑ جائے، پھر ہم شرمندہ رہیں خدا کے سامنے۔“ لالی ہار ائی تو بیٹا ہے۔ ہمیں تو اس نے کبھی بے اولاد ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا اور نہ اپنے بیٹے کے اچھے مستقبل کے لئے رقم جمع کر رہا ہوں۔“

”شیدے! تو نے مجھے ایسا سمجھا ہے؟“ لالی آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

”نہیں، نہیں..... بندے کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔“ شیدے نے سمجھایا۔

”مجھے معاف کر دو۔ میں نے غصے میں تمہیں نہ جانے کیا کہہ دیا۔“ لالی واقعی شرمندہ تھی۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔

”یوں تو معافی نہیں ملے گی۔“ شیدا شوخ ہو گیا۔

”پھر.....“ لالی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ آنکھوں میں انجانے فتنے لئے ہونٹوں بشارت آمیز مسکراہٹ سجائے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر اسے آگے بڑھتے دیکھ کر لالی جلدی سے بولی۔

”شیدے! ہمارا علی پاس ہو گیا ہے۔“

”اچھا..... کہاں ہے میرا پتھر؟ میں اسے انعام دوں۔“ شیدا خوشی سے چیخ پڑا۔

”کیا حال تو وہ سویا ہوا ہے اور جو انعام اسے دینا چاہتے ہو، اس کی ماں کو دے دو۔“

”اچھا..... پھر قریب آؤ، انعام دوں۔“ شیدے نے شرارت سے کہا۔

”مردہ جو رکھا“ لالی اس کا مطلب سمجھ گئی۔ ”تم کپڑے بدل لو، میں کھانا لاتی ہوں۔“



لالی ہنستے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

رات کا سناٹا چار سو پھیلا ہوا تھا۔ باہر جھینگھنگروں اور میٹڑکوں کے ڈرنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ مومو اور اشو ایک ہی چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ اشو کو تو نیند آگئی تھی، مگر مومو اب تک جاگ رہی تھی۔ اداسیاں اُس کے من پر لڑ لڑاٹھ لٹکتی رہیں۔ چھوٹی سی عمر میں اس نے بہت سے نشیب و فراز دیکھے تھے، بہت کچھ سیکھ گئی تھی۔ محبتوں کی ترسی ہوئی مومو..... نہ باپ کی مکمل محبت ملتی تھی، نہ ماں کا شہر آگیاں لہجہ۔ جب دیکھو، نورماں کی تپریوں پر مل رہے اور زبان پر چودھری شوکت علی کے لئے گالیاں۔

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے راجا کی ہو کر بھی اُسے سکھ نہیں ہے۔ انسان کسی حال میں بھی خوش نہیں رہ سکتا۔ جب چودھری شوکت علی نے اسے مالکہ بنا کر رکھا ہوا تھا، بل کر پانی بھی نہیں پیتی تھی مگر پھر بھی اتنی آسائشوں کے بعد بھی راجا کو نہ بھولی تھی۔ اپنے بابا کی موت کا انتقام لینے کے منصوبے بناتی رہتی اور جب اس نے انتقام لیا تو اپنا ہی پور پور اس انتقام کے شعلوں کی نذر کر دیا۔ کچھ لینے کے لئے کچھ دینا بھی پڑتا ہے، بلکہ بہت کچھ گنوا کر بہت کم لیا جاتا ہے۔ نوراً نے بھی بہت کچھ گنویا تھا۔ چودھری کی محبت۔ وہ اُس کا ہر دم نوراً پر نثار ہوتا۔ اتنی محبتیں، اتنی آسائشیں سب کچھ اس نے راجا کی ایک جھلک دیکھتے ہی چھوڑ دیا۔ وہ خوش تھی کہ اس نے چودھری سے انتقام لے لیا ہے، مگر یہ اس کی بھول تھی۔ محبتوں سے پیٹ تو نہیں بھرا جاتا۔ اور راجا محبت کرتا تھا اس سے۔ مگر اب وہ محبتیں بھی خال خال ہی رہ گئی تھیں۔ دن بھر کے کام سے دونوں اس قدر تھک جاتے کہ گئے دنوں کے وہ محبتوں بھرے ڈائلاگ ہی بھول گئے۔ نوراً کبھی اس سے ہنسنے پر ماہیا سننے کی فرمائش نہ کرتی بلکہ جلد از جلد دونوں ہی سونے کی کوشش کرتے کیونکہ صبح پھر کام پر جانا ہوتا تھا۔ گیا وقت کبھی نہیں بھلایا جاسکتا، چاہے وہ اچھا ہو یا بُرا۔ جو گزرے وقت کو بھلا دیتے ہیں، وہ کم طرف ہوتے ہیں۔

ہوتے ہیں۔  
مگر بعض باتیں گزرے وقت کے ریلے میں ایسی بہہ جاتی ہیں کہ انہیں بھلا دینا ہی بہتر  
ہوتا ہے۔ مگر یہ بہت مشکل ہوتا ہے۔ اگر برسوں کی پڑی ہوئی کسی چیز پر گرد پڑ جائے تو اس  
کی افادیت کم تو نہیں ہو جاتی۔ جونہی گرد جھاڑ دی جائے، وہ چیز نئی نگر ہو جاتی ہے۔ یہ  
حال یادوں کا بھی ہوتا ہے۔ ذہن کے کسی خانے میں رُفت ہو کر رہ جاتی ہیں اور آج کل کی  
یادیں نوران کو پریشان کر رہی نہیں۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ چمک چمکی ہو گئی تھی۔ وہ اور رام  
آج کل بہت کچھ کچھنے سے رہنے لگے تھے، جیسے دونوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔

خود کو کاموں میں الجھائے رکھتی، تاکہ کچھ یاد نہ آئے، مگر یادیں تو ذہن کا  
 حصہ ہیں۔ یہ کوئی ماویٰ شے تو ہیں نہیں کہ انہیں مٹھی میں بند کر لیا  
 جاسکے۔ یادیں گہرا گہرا ہوتی ہیں۔ یادیں جو ٹھہریں۔

پہلے بھی اتنے کام کی عادی نہ تھی، چنانچہ اسے کرنا پڑتا تھا  
 اور اس تو شادی سے پہلے بھی اتنے کام کی عادی نہ تھی، چنانچہ اسے کرنا پڑتا تھا  
 اور اس تو شادی سے پہلے بھی اتنے کام کی عادی نہ تھی، چنانچہ اسے کرنا پڑتا تھا

میں سے اپنی چار پائی سے اُتری تاکہ اشو کی تیند میں خلل نہ پڑے۔ اُسے  
نہیں پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ گھڑو نیچے باہر رکھی تھی، اس لئے وہ باہر آ گئی اور پھر گھڑے  
میں سے پانی اُڑھ لیتے ہوئے ٹھٹھک کر رہ گئی۔ گلاس ہاتھ میں ہی رہ گیا اور گھڑا یوں ہی ٹیڑھا  
کئے پڑے رہی۔

”نوری! اب مومنو بھی بڑی ہوتی جا رہی ہے۔“ یہ راجا کی آواز تھی۔ یعنی وہ نور ا سے  
انرا رات گئے باٹیں کر رہا تھا۔

”ہاں راجا! میں دن بہ دن اس کے بڑھتے ہوئے قد سے خائف ہوں۔ کچھ بھی تو نہیں  
جز اس کے لئے۔“ نورماں ایک آہ بھر کر بولی۔

”اتنی جلدی بھی کیا ہے؟“ راجا نے دلا سدا دیا۔

”راجا! لڑکیاں تو توری کی پیل ہوتی ہیں، جو دنوں میں بڑھ جاتی ہیں اور ہمارے پاس نانا بچہ بھی نہیں، جو اس کے لئے کچھ بنا سکیں۔“ نوراس کے لہجے میں دکھ ہی دکھ تھا۔

”ہم کیوں نہ اے اس کے باپ کو دے دیں اور.....“ راجا نے خیال ظاہر کیا۔  
”نہیں راجا! میں اس کی چورائی نہیں سہار سکوں گی۔ بس ایک ہی۔“ نور ایں ٹرپ کر رہ

”اتنا توڑا اے بارتی ہے۔“ راجا اس کی بات گٹ کر بولا۔

”حالانکہ میرا جی نہیں چاہتا کہ اسے ماروں، کو سننے دوں۔ مگر میرے اندر کی عورت ہے۔“

”خیر! ایک بات ہے۔“ راجا جانے لگا۔

”اگرچہ کہ کورال نے اسے حیرت سے دیکھا۔“

کہ جہاں تک اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔" راجا بولا۔



”بہت کچھ کیا ہے راجا! میں نے۔“ نوراًں کی آواز دھیمی تھی۔  
 ”بیٹی کو اس سے جدا کر لینا..... یہ بہت کچھ نہیں ہے۔ اس نے تو سوچا کہ اچھا  
 جان چھوٹی۔ اب دیکھو، ملنے بھی نہیں آتا۔“ راجا نے تسخّر سے کہا۔  
 ”نہ آئے، مگر اسے ایک روز آنا پڑے گا۔ میں نے کام ہی ایسا کیا ہے۔“ نوراًں کا  
 یقین سے بھرا تھا۔

”کیا مطلب؟“ راجا نے پوچھا۔

”پھر بتاؤں گی۔“ نوراًں نے کہا۔

”نہیں..... آج اور ابھی بتاؤ۔“ راجا ضد سے بولا۔

”دیکھو راجا!.....!“ نوراًں نے کہنا چاہا۔

”اس کا مطلب ہے، کوئی ایسا راز ہے جو تم نے مجھ سے چھپایا ہوا ہے۔“ راجا کا لہجہ سخت  
 ہو گیا۔

”تم غلط سمجھے۔“

”میں غلط نہیں سمجھا، تو اُس مردود کے ساتھ رہ کر راز رکھنا بھی سیکھ گئی ہے۔ اس نے  
 میں کہتا ہوں، تو وہ معصوم نوری نہیں رہی، بلکہ اب بھی وہ چند دلوں کی چودھرائی تیرے اندر  
 چھپی ہوئی ہے۔“ راجا لفظ چبا چبا کر بولتا رہا۔

”راجا! یہ بات نہیں ہے۔ تو غلط کیوں سمجھ رہا ہے؟ وہ راز میں تجھے بتا دیتی ہوں، تو  
 دل میلانہ کر۔“ نوراًں نے نہایت محبت سے اسے سمجھایا تو وہ صرف اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”مومو، چودھری کی بیٹی ہے۔ اس کے علاوہ اس کا ایک بیٹا بھی ہے۔“ نوراًں نے کہا  
 اور باہر کھڑی مومو کو یوں لگا، جیسے کسی نے دھماکا کر دیا ہو۔ اُس کے کان سائیں سائیں  
 کرنے لگے۔

”بیٹا.....؟“ راجا کے لہجے میں حیرت تھی۔

”ہاں..... جس کا اُسے ظلم نہیں۔ یہ دونوں جڑواں تھے۔ بیٹا زندہ ہے اس کا،

اور.....“

مومو کے ہاتھ سے کھڑا چھوٹ گیا اور نوراًں کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ جاہلی سے باہر  
 آئی۔ راجا بھی اس کے پیچھے تھا۔ کھڑوچی کے قریب کھڑی مومو قہقہہ کانپ رہی تھی۔

”کھڑا توڑ دیا تو نے؟“ نوراًں کی پاٹ دار آواز آگن میں گونجی۔

”پانی پیئے آئی تھی۔ ماں!“ مومو نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

”وہ تو مجھے بھی پتہ چل گیا ہے۔“ نوراًں اُس کے قریب آئی۔

”اب میرا باوالا لائے گا کھڑا؟..... نیا خرچ کھڑا کر دیا ہے تو نے..... دفع ہو جاؤ۔“

راجا نے گرج کر کہا اور مومو تیزی سے اندر آ گئی۔ شکر ہے، جوئے نہیں پڑے۔ وہ خوش  
 تھی۔ اگر پڑ بھی جاتے تو دکھ نہ ہوتا۔ کتنا اہم انکشاف ہوا تھا۔ اس کا بھائی بھی ہے.....  
 بھائی..... اُس کی پیاس تک اڑ گئی تھی، یہ سب کچھ سن کر۔ اور وہ اپنی پیاس کی مشکور تھی،  
 جس کی وجہ سے اسے یہ خوشخبری ملی تھی۔

آج تو انکشافات کا دن ہے شاید..... چھوٹا چودھری، بابا کا ملازم ہے اور آج ماں بتا  
 رہی تھی کہ جڑواں بھائی بھی ہے میرا۔ اس گھڑے کو بھی کبخت ابھی گرنا تھا۔ یہ تو پتہ چل جاتا  
 کہ بھائی کہاں ہے، کس کے پاس ہے؟..... ماں تو کہہ رہی تھی، زندہ ہے۔ خدا اس کی عمر  
 راز کرے۔ اچھا ہے، وہ اماں کے پاس نہیں ہے۔ ورنہ پتہ نہیں کیا حال ہوتا اس کا بھی۔  
 جہاں بھی ہو، سنبھلی ہو۔

”اللہ میاں! مجھے میرے بھائی سے ضرور ملانا۔“ مومو نے صدقِ دل سے دعا کی اور  
 پھر آ کر چار پانی پر لیٹ گئی۔

”کل بابا کو بتاؤں گی..... بابا کتنے خوش ہوں گے نا؟ میرا بھائی..... میرا پیارا  
 بھائی۔“ مومو کے لب کپکپائے۔ وہ کتنی ہی دیر اپنے آن دیکھے بھائی کے بارے میں سوچتی  
 رہی اور پھر نیند کی دیوی اس پر مہربان ہو گئی۔ آنے والے کل کے سندر سپنے اس کی آنکھوں  
 میں اتر آئے۔





نے لڑے گا، کسی کو تو میرے دل کا درد محسوس ہوا ہے۔  
سلسل ایک گھنٹے سے گاؤں کے پچھواڑے آئے اسی باغ میں اپنی مومنو کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے ایک ایک لمحہ، صدیوں پر محیط ہو گیا ہو اور مومنو بھی نہ آئی نہیں چکتی تھی۔

”چاچا! آرام سے بیٹھ جائیں، ابھی آجائے گی وہ۔“ شعیب نے ایک خشک پتھا سلتے ہوئے کہا۔ چودھری شوکت علی ٹھلٹھلتے رک گئے اور پلٹ کر بولے۔  
”بھئی! میری مومنو ہمیشہ مجھ سے پہلے یہاں موجود ہوتی تھی، مجھ سے گلے شکوے کرتی تھی۔ اور آج..... آج نہ جانے وہ اب تک کیوں نہیں آئی۔ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔“

”چاچا! آج ہم لوگ جلدی آگئے ہیں نا۔“  
تب چودھری شوکت علی نے کلائی سے گرتے کی آستین ہٹا کر گھڑی دیکھی تو ایک طویل سانس لیتے ہوئے مسکرا پڑے۔ گھڑی ساڑھے چار بج رہی تھی اور مومنو کو پانچ بجے آنا تھا۔  
پندرہ ویں سو کھ پتوں پر بیٹھ گئے۔ شعیب علی بھی ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔  
”چاچا! مومنو آپ کو بہت پیاری ہے؟“ شعیب ان کا خیال بٹانا چاہتا تھا۔  
”ہاں، بہت..... بہت ہی پیاری۔“ چودھری شوکت علی کا لہجہ محبتوں سے پھور پھور تھا۔  
”پھر اے اپنے پاس کیوں نہیں رکھتے؟“ شعیب علی نے پوچھا۔  
”وقت کا منتظر ہوں۔“ چودھری شوکت علی نے اُنق پر نظریں گاڑ دیں، جہاں بے شمار چیلیں دائرے میں چکر کاٹ رہی تھیں۔

”وقت..... وقت..... میں پریشان ہو گیا ہوں۔ دو روز سے یہ تین حرفی لفظ ہزار بار یہ کہہ کر.....“ شعیب علی جھنجھلا گیا۔  
”دیکھو جان! ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے اور ہر کام اپنے وقت پر ہی اچھا لگتا ہے، چاہے ہم جتنی جلدی کرنا چاہیں، مگر وہ وقت پر ہوگا۔“ چودھری شوکت علی نے دھیرے سے اسے سمجھایا۔

”عجب منطقی ہے آپ کی۔ آپ وقت کے منتظر ہیں اور وقت کا ریلا اپنے دامن میں سب کچھ سمیٹتا ہوا، ہر چیز کو روندنا ہوا گزر جائے۔“ شعیب جھنجھلا کر بولا۔  
”پھر کیا کروں؟..... پھاڑ دوں تمہارے باپ کا سر؟..... گاڑ دوں راجا کو زمین میں؟ کوئی سے اڑا دوں نوریاں کو اور پھر پچاسی چڑھ جاؤں؟“ چودھری شوکت علی کو طیش آ گیا۔

”مومنو آپ کی بیٹی ہے، آپ کا خون ہے۔ آپ ہمت کریں اور ہزاروں میں کہیں کہ

وہ کتنی ہی دیر سے مسلسل ٹھل رہے تھے۔ کبھی کبھی ٹھلنے ہوئے ایک دم ٹرک جاتے اور بڑی آس سے گیٹ کی طرف دیکھتے مگر گہر مقصود نظر نہ آتا تو آنکھوں کی اُداسی مزید بڑھ جاتی۔ وہ بھی ٹھلنے لگتے۔ درختوں کے ٹوٹے ہوئے خشک پتے جوتوں تلے چرچرا کر مسلسل احتجاج کر رہے تھے، مگر انہیں اس کا احساس بھی نہ تھا۔ شعیب علی جاسن کے مونے سے تے کے ساتھ ٹیک لگائے ان کی بے قراری اور بے چینی بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کتنے بے قرار تھے وہ..... دل مضطرب کو کسی طور قرار نہ آ رہا تھا۔ ان کے اندر کا حال، ان کی ظاہری حالت ہی سے عیاں تھا۔ یہ انتظار، یہ تڑپ، یہ بے قراری، شعیب علی نے اس سے پہلے بھی نہیں دیکھی تھی۔ اب اُسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اولاد والہ رین کی کتنی بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ اولاد کے لئے ایک باپ کو اس نے پہلی بار تڑپتے، پھلتے دیکھا اور وہ بھی چودھری شوکت علی جیسے شخص کو۔ آج منگل تھا اور وہ اپنی مومنو سے ملنے آئے تھے۔ شعیب علی نے بھی ضرر کی اور ساتھ آ گیا تھا۔ اُسے بہت اشتیاق تھا، اپنے چاچا شوکی کی بیٹی سے ملنے کا۔ چودھری شوکت علی بھی اس کی ضد کے آگے مجبور ہو گئے تھے۔ انہوں نے سوچا، جب میں نے شعیب کو سب کچھ بتا دیا ہے تو کیوں نہ اسے مومنو سے بھی ملوا دوں، تاکہ میں نہ رہوں تو وہی ”رنگ محل“ میں مومنو کو اس کا اصل مقام دلا سکے۔ کیونکہ شعیب علی نے عہد کیا تھا کہ وہ ان فضول رسموں اور روایتوں کو توڑ ڈالے گا۔

”ان ریتوں کو توڑنے کا میں نے بھی عہد کیا تھا شعیب! مجھے بابا نے اجازت دی تھی کہ میں اولاد کی خاطر دوسری شادی کر سکتا ہوں، مگر افسوس! کہ انہوں نے ہونے سے کہا تھا، کوئی اور یہ بات نہ سن سکا مگر پھر بھی میں نے پرانی روایات کو توڑا۔“ چودھری شوکت کا لہجہ نہایت دھمکی تھا۔

”چاچا! آپ تو چھپ چھپ کر ان روایات سے لڑے، مگر میں ڈٹ کر مقابلہ کروں گا۔“ جب شعیب علی نے چٹانوں کی سی سختی سے یہ جملہ کہا تو چودھری شوکت علی سے دل کی کمی کھل گئی۔ انہیں خوشی تھی کہ ”رنگ محل“ میں کوئی تو میرا ہم خیال ہے، کوئی تو ہے جو میرے



وہ آپ کی بیٹی ہے۔ آپ کی اپنی بیٹی۔“ شعیب علی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”تمہارا باپ اس کے ساتھ مجھے بھی زندہ نہ چھوڑے گا۔ مجھے اپنی تو کوئی پروا نہیں، میں مومو کی خاطر جینا چاہتا ہوں۔ تم باپ کا دل نہیں جانتے، جو اپنے جگر گوشوں پر دکان پر چھاواں بھی نہیں پڑنے دینا چاہتا۔ میں اور باپوں سے مختلف نہیں ہوں۔“ چودھری شوکت علی بولے۔

”سب باتیں آپ کی درست ہیں مگر آپ نے کبھی مومو کے مستقبل کے بارے میں سوچا، یا صرف خود کو بٹی سمیت وقت کے دھارے پر بہنے کے لئے چھوڑ دیا؟ چاہے ڈب جائیں یا کنارے لگیں، کل کس نے دیکھی ہے؟“

”اُس کی اتنی دولت ہے، زمینیں ہیں، ٹیکسٹائل مل ہے۔“ چودھری شوکت علی کے لیے میں دولت کا غرور تھا۔

”اوہ!..... یہ مادی چیزیں ہیں۔ پیسہ ہاتھ کا میل ہے۔ آیا اور گیا۔“ شعیب چمک کر بولا۔

”تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“ چودھری شوکت علی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔  
”میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ مومو کے مستقبل کی فکر کریں۔ راجا اور نوران دونوں جاہل ہیں۔ دو چار سال بعد اگر وہ اپنے جیسے کسی جاہل سے مومو کو بیاہ دیں تو.....“  
”نہیں..... وہ ایسا نہیں کر سکتے۔“ چودھری شوکت علی چیخ پڑے۔ ”ایسا تو انہوں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ ان کا زہن اتنا آگے تو سوچ ہی نہ سکا تھا اور شعیب علی نے اتنا آگے تک سوچ لیا تھا۔“

”میں چاہتا ہوں کہ آپ مومو کو اپنے پاس رکھیں، اُسے زور تعلیم سے آراستہ کریں۔“ آپ کا اور آپ اُس کا مستقبل بنائیں۔“ شعیب علی جذب کے عالم میں کہتا چلا گیا۔  
”مگر.....“ چودھری شوکت علی نے کہنا چاہا۔

”اگر مگر کچھ نہیں، آپ نوران سے خود بات کریں۔ آخر وہ مومو کی ماں ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ مومو کے بہتر مستقبل کی خاطر سب کچھ مان جائے گی۔“ شعیب اُن کی بات کاٹ کر بولا۔

”وہ بہت کبھی عورت ہے شعیب؟“ چودھری شوکت علی کے جڑے بچے گئے۔  
”عورت کے ساتھ ساتھ وہ ماں بھی ہے۔“ وہ بولا۔

”ہونہ، ماں.....“ چودھری شوکت علی گلی سے ہنسے۔ ”شعیب پترا تو ابھی بچہ ہے، عورتوں کی چالیں نہیں سمجھتا۔ ان کے دل کسی اور کے لئے دھڑک رہے ہوتے ہیں، مگر زبان

شور کا نام الایے جاتی ہے۔ کبھی پہلی محبتیں دلوں سے نہیں نکلتیں۔ نوران عورت نہیں، چڑیل ہے۔ ایک ایسی پھل پیری ہے، جس نے میرا سب کچھ چھین لیا۔ میری بچی ہے، باپ کی بہت شفقت بھی تھیں لی۔ ہم دونوں باپ بیٹی کو بچی دست کر دیا ہے اور اب ہماری بچہ پر یقیناً قہقہے لگانی ہوگی، خبیث عورت!“

”چاچا!..... وہ۔“ شعیب علی نے ان کی بات کاٹ کر گیٹ کی طرف اشارہ کیا، جہاں سے ایک آٹھ نو سال کی بچی سہمی ہوئی ہرنی کی طرح داخل ہو رہی تھی۔ بچی نے انہیں نہیں دیکھا تھا کیونکہ وہ دونوں درخت کی اوٹ میں تھے۔ وہ بہت ہولے ہولے ادھر ادھر دیکھتی ہوئی آرہی تھی۔ چودھری شوکت علی ایک دم اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے، شعیب نے بھی تقلید کی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھے۔

”مومو.....!“ ان کے لب کپکپائے، آنکھوں میں قدیلیں روشن ہو گئیں۔ یوں لگا، جیسے سونے کے دھانوں میں پانی پڑ گیا ہو۔

مومو آئی اور چودھری شوکت علی کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں اس طرح سا گئی، جیسے یہ بازو بنے ہی اس کے لئے ہوں۔“

”اتنی دیر کر دی پترا!“ چودھری شوکت علی کے لبوں سے شکوہ پھسل پڑا۔  
”دیر تو نہیں ہوئی بابا! میں نے زبیدہ سے وقت پوچھا تھا۔“ وہ خوشی سے بھرپور آواز میں بولی۔

”میں کب سے آیا ہوا ہوں۔“ چودھری شوکت علی نے اپنی بے قراری کو الفاظ کا جامہ پہنایا۔

”آج آپ جلدی آ گئے ہیں نا؟“ مومو کے برجستہ جواب پر شعیب علی مسکرا دیا۔ وہ ان دونوں باپ بیٹی سے تھوڑے ہی فاصلے پر کھڑا انہیں دیکھے جا رہا تھا۔ کتنی شدتیں، کتنی تپشیں اس ملاپ میں کتنی تڑپ کے بعد یہ ملاپ نصیب ہوا تھا ان دونوں کو۔ ایک عجیب سا احساس شعیب علی کے اندر سرایت کر گیا۔ عجیب سی ٹھنڈک اس کے اندر اترتی جا رہی تھی۔

”مومو کی نظر شعیب علی پر پڑی تو وہ ایک جھٹکے سے اپنے بابا سے دور ہو گئی۔ اس کا چہرہ الماس کے پھولوں کی طرح زرد ہو گیا اور آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں تیرنے لگیں۔ چودھری شوکت علی اس کی اس بدلتی ہوئی کیفیت سے پریشان ہو گئے۔“

”بابا!..... وہ.....“ مومو کے لرزے ہوئے ہونٹوں سے یہ مشکل آواز نکلی۔ اُس کی نظریں مگراتے ہوئے شعیب پر جمی ہوئی تھیں۔

چودھری شوکت علی نے اس سمت دیکھا، جدھر مومو کی نظریں تھیں۔ مومو ایک ٹک



شعیب علی کو دیکھتے جا رہی تھی اور چودھری شوکت علی اس کی پریشانی محسوس کر کے زور سے ہنس دیئے۔ شعیب علی نے ایک غرے بعد انہیں اس طرح کھلی کر ہنسنے دیکھا تھا۔  
 ”چاچا! آپ ہنستے ہوئے کتنے اچھے لگتے ہیں۔ کاش! آپ ہمیشہ پونہی ہنستے رہیں۔ آپ کی خوشی، آپ کی مومو ہمیشہ آپ کے بازوؤں میں رہے اور آپ ہنسنے بکھیرتے رہیں، سرشار رہیں۔“ شعیب علی نے ان کے لئے دل میں پورے خلوص سے دعا کی۔  
 ”ارے مریم پٹر! تو پریشان نہ ہو، یہ تیرا بھائی ہے۔“ چودھری شوکت علی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میرا بھائی.....!“ مومو نے حیرت سے شعیبی کی طرف دیکھا، جو لمبوں پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ سجائے اُسے تک رہا تھا۔  
 ”ہاں، یہ شعیب ہے۔ تمہارا بھائی۔“ چودھری شوکت علی کا لہجہ خوشیوں سے لبریز تھا۔  
 ”اتنا بڑا.....؟“ مومو کے اس بے ساختہ جملے پر شعیب علی اور چودھری شوکت علی ہنس دیئے۔

شعیب علی آگے بڑھا اور اس نے حیران پریشان سی مومو کو لپٹا لیا اور ایک عجیب سی سونڈھی سونڈھی خوشبو نے شعیبی کو اپنے حصار میں لے لیا۔ یہ خوشبو ایک بہن کی تھی، دنیا کی ہر خوشبو سے پیاری۔

”میری بہن.....!“ شعیب علی نے اپنے کپکپاتے ہوئے لب مومو کی پیشانی پر رکھ دیئے اور نہ جانے کس احساس کے تحت اس کی پلگوں کے کونے بچپنے لگے۔  
 مریم سخت تذبذب کا شکار تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔

”اماں نے تو راجا کو بتایا تھا کہ میرا ایک جڑوا بھائی بھی پیدا ہوا تھا۔ پھر یہ اتنی جلدی بڑا کیسے ہو گیا؟ اور میں اتنی چھوٹی کیوں ہوں؟ اس کا قد تو بابا جانی جتنا ہے، پھر میرا قد بھی اماں کے برابر ہونا چاہئے تھا۔ جب یہ میرے ساتھ پیدا ہوا ہے تو یہ اتنا بڑا کیوں ہے؟“  
 مومو کا ذہن جوار بھانا بنا ہوا تھا۔ خیالات ریشم کے دھاگوں کی طرح اُلجھتے جا رہے تھے۔

”برا ہو اس گھرے کا جو گر گیا۔ اگر نہ گرتا تو شاید مجھے پتہ چل جاتا کہ میرا بھائی کہاں ہے؟ کون لے گیا اُسے؟“

”کیا سوچ رہی ہو مومو؟“ چودھری شوکت علی کی آواز نے اسے خیالات کے بہنور سے نکالا۔

”کچھ نہیں بابا جانی!“  
 ”مجھ سے مل کر خوشی نہیں ہوئی تمہیں؟“ شعیب علی نے گھٹے زمین پر ٹکا کر اسے دونوں

ازدوں سے تمام کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
 ”بہت خوشی ہوئی ہے لالہ!“ مومو اس سے لپٹ گئی۔ ”آپ تو زبیدہ کے بھائی سے بھی پیارے ہیں۔ بہت پیارے۔ کسی کا بھائی میرے بھائی جیسا نہیں ہو گا۔ کیوں بابا جانی؟“ مومو نے شعیب علی کے سینے سے سر رگڑتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا اور سوالیہ نگاہوں سے شوکت علی کی طرف دیکھا۔ وہ بس محبت پاش نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئے۔

”یہ زبیدہ کون ہے؟“ شعیب نے پونہی پوچھ لیا۔  
 ”چودھری دلاور کی دہلی ہے۔“ مومو نے مصحوبیت سے جواب دیا۔  
 ”لو مومو! یہ کھاؤ۔“ چودھری شوکت علی نے سیب کاٹتے ہوئے کہا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مومو، شعیب کو تمام حالات بتائے۔ بھی انہوں نے بات کا رخ بدل دیا تھا۔ حالانکہ شعیب علی کو علم تھا کہ مومو چودھری دلاور کے ہاں کام کرتی ہے۔ یہ بات خود چودھری شوکت علی نے ہی اسے بتائی تھی۔ پھر وہ کتنی دیر تک مومو سے باتیں کرتے رہے۔ مومو، شعیب علی سے یوں گل مل گئی تھی، جیسے وہ واقعی حقیقی بہن بھائی ہوں اور برسوں بعد ملے ہوں۔ مگر ایک سوال بار بار اس کے ذہن میں کچھ کے لگا رہا تھا کہ اگر یہ میرا بھائی ہے تو اتنا بڑا کیوں ہے؟  
 ”مومو! تم ہمارے ساتھ رہو گی؟“ شعیب علی نے اس سے پوچھا۔

”کہاں؟“ مومو چونکی۔  
 ”جہاں میں رہنا ہوں۔“

”بابا جانی بھی ہوں گے؟“ مومو نے چودھری شوکت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”بھئی بھی آیا کریں۔“ شعیب نے بتایا۔

”پھر کیا فائدہ؟ یہاں بھی تو آ جاتے ہیں کبھی کبھی۔“ وہ نہایت مصحوبیت سے بولی۔  
 ”میں تو ہوں گا نا۔“ شعیب علی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”اماں نہیں جانے دے گی۔“ مومو نے وجہ بیان کی۔  
 ”تم اسے راضی نہیں کر سکو گے شعیبی!“ چودھری شوکت علی ہنس کر بولے۔

”دونوں باپ بیٹی ایک سے ہی ہیں۔“ شعیب ہنس دیا۔ مومو بھی مسکرا دی۔  
 ”اور جب وہ چھڑے تو تینوں کے دلوں پر ایک ہی طرح کی اُداسی ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ تینوں کو ایک ہی دکھ تھا..... دچھوڑے کا دکھ..... چھڑ کر پھر ملنے کی آس۔ مگر انہیں اس دکھ کے سمندر سے گزرنا ہی تھا۔ انسان کو جب خوشیاں ملتی ہیں تو ساتھ ہی دکھ بھی منہ بجائے کھڑے ہوتے ہیں۔ خوشی اور غم کا آپس میں بہت گہرا ناتا ہے، جو اٹوٹ بندھن کی طرح ایک ہی گرہ میں بندھا ہوا ہوتا ہے۔“





صبح کو سبھی ناشتے کی بڑی سی میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ کل جب چودھری شوکت علی اور شعیب علی احمد پور سے واپس آئے تھے تو سب آچکے تھے۔ صفدر بہت خوش تھا۔ شاید اسے اپنی زندگی کا سبھی پسند آ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں ہیرے کی مانند چمک رہی تھیں اور اس چمک نے شعیب علی کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ اگر ہم سفر من پسند ل جائے تو دشوار گزار راستے بھی ہموار ہو جاتے ہیں۔ مگر من پسند ہم سفر بھی قسمت والوں کو ملتے ہیں۔ چاند کی تمنا تو چکر کرتا ہی ہے، مگر اسے چاند کی قربت تو نہیں ملتی۔ یہی ہر عاشق اور محبوب کے ساتھ ہوتا ہے۔ جو دل چاہتا ہے، اسے گناہ سمجھا جاتا ہے اور رسوم و روایات کی اتنی اونچی دیواریں چن دی جاتی ہیں، جنہیں ڈھانے کی کوشش بھی کی جائے تو ہاتھوں کے ساتھ ساتھ دل زخمی ہو جاتے ہیں مگر وہ دیواریں اپنی جھوٹی آن بان کے ساتھ کھڑی رہتی ہیں۔

سب خاموشی سے ناشتہ کر رہے تھے اور شعیب علی سے چپ بیٹھنا مشکل ہو جا رہا تھا۔ آخر وہ بول ہی پڑا۔

”صفدر بھائی! لگتا ہے بھابی بہت پسند آ گئی ہیں۔“

صفدر نوالہ منہ میں لیتے لیتے رک گیا۔ اس نے نظروں ہی نظروں میں شعیب کو تنبیہ کی اور پھر نظریں جھکا لیں۔

”آپ تو یوں شرمارہے ہیں جیسے لڑکی ہوں۔“ شعیب زور سے ہنس دیا۔

”تو بکواس بند نہیں کر سکتا؟“ صفدر کو غصہ آ گیا۔ ”اگر پوچھنا ہی تھا تو اکیلے میں پوچھتا۔ سب کے سامنے شرمندہ کر رہا ہے، شریر!“ صفدر علی اس کی شرارت پر زور ب مسکرا دیا۔

”دل میں تو لٹو پھوٹ رہے ہیں اور اوپر سے غصہ دکھایا جا رہا ہے۔ کیوں چاچا شوکی؟“ شعیب نے شرارت بھری نظروں سے شوکت علی کی طرف دیکھا۔

”تم بھی منگنی کروالو، پھر پتہ چل جائے گا کہ لٹو پھوٹے ہیں یا.....“ فاطمہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔

”جی نہیں..... مجھے تو معاف ہی رکھیں۔ ابھی تو امجد بھائی ہیں۔ میرا نمبر بہت ڈر ہے۔“ شعیب نے قریب بیٹھی اپنی بہن پروین کے بال بگاڑ دیئے تو وہ جھنجھلا گئی۔

”آپ بات ادھر کر رہے ہیں، ہاتھوں کو تو چین دیں۔ زبان کو تو تالو سے لگنا نصیب ہی نہیں ہے۔“

”اچھا بابا! لیکچر مت دیں، میں آج واپس جا رہا ہوں۔“ شعیب نے اطلاع دی۔

”آج..... وہ کیوں؟“ سیکینہ بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

”بہن صرف دو روز کے لئے آیا تھا اور پورا ہفتہ رہا ہوں۔ میری پڑھائی کا حرج ہو رہا“ شعیب نے کہا۔

”ابھی جانے کی ضرورت نہیں ہے، جتنے تک رک جاؤ۔“ سیکینہ بیگم نے کہا۔

”کیوں؟“ شعیب نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا کہ سیکینہ بیگم نے اسے روکا ہو۔ وہ ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ پہلے پڑھائی پر توجہ دو۔ جلدی جلدی حسن پور نہ آ کر۔ اور آج.....

”تمہاری خالہ آرہی ہیں، نسرین کی شادی کی تاریخ لینے۔“ انہوں نے بتایا۔

”ارے واقعی؟..... نسرین آپا کی شادی ہونے والی ہے؟..... واللہ! لطف آ گیا۔ آپا! جلدی سے مٹھائی کھلا دیں۔“ شعیب علی اٹھ کر نسرین کے قریب آ گیا۔ وہ بے چاری شرم سے ہر بہوٹی بن گئی۔

”تمہیں حیا تو چھو کر نہیں گزری۔“ صفدر نے گھر کا۔ مگر اس پر تو کوئی اثر ہی نہ ہوا تھا۔

”آپا! اب تو آپ نماز زور و شور سے پڑھیں گی۔ مجھے لگتا ہے، آپ کی دعاؤں نے ہی فیروز بھائی کو ڈنمارک سے بلایا ہے۔“ شعیب علی اس کے کان میں ہولے ہولے بولے جا رہا تھا۔ نسرین سے بیٹھنا دشوار ہو گیا تو وہ اس کے ہاتھوں کو جھٹک کر اٹھی اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ شعیب زور سے ہنس دیا۔

”نسرین آپا کو آخر تم نے اٹھا ہی دیا۔“ پروین نے کہا۔

”اٹھایا کہاں؟ وہ تو فیروز بھائی کا نام سنتے ہی کھسک گئیں۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔

”تمہیں بابا کی بھی شرم نہیں۔ وہ سامنے بیٹھے ہیں۔“ صفدر نے ڈانٹا۔

”بابا بھی اپنے زمانے میں اس دور سے گزرے ہوں گے۔ کیوں بابا جانی؟“ شعیب نالا ایسے موقعوں پر کب چوکنے والا تھا۔

”تم سے کوئی نہیں جیت سکتا۔“ چودھری طالب علی نے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم جمعہ تک رک جاؤ۔“ سیکینہ بیگم، جو اس کی نوک جھوک سے محفوظ ہو رہی تھیں، بات آنسو سے لپی پچھلے موضوع پر آ گئی۔

”نہیں امی جی!..... بالکل نہیں۔“ وہ کسی طرح بھی راضی نہیں ہو رہا تھا۔

”آخر وجہ؟“

”اب دیکھئے نا، سب آ جائیں گے اور یقیناً فیروز بھائی بھی ہوں گے۔ مجھے عادت ہے کہ فیروز بھائی کے ساتھ ہوں۔ اور سنا ہے وہ بہت غصہ ور ہیں۔ فضول میں اچھا بھلا رشتہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔“ شعیب نے انہیں بند کر کے شرارت سے بولا۔



”تیرے منہ میں خاک۔ کبھی تو ڈھنگ کی بات کیا کر۔ نسرین اس کی بچپن کی بات ہے اور اس نے خود کہا تھا کہ اب تاریخ مقرر کر دی جائے۔ کیونکہ وہ چھٹی پر آیا ہوا ہے اور چند دن پہلے چلا جائے گا۔“ سیکرٹری جگمگ کر بولیں۔

”یعنی آپ ابھی ڈنمارک جائیں گی؟“ شعیب نے حیرت سے پوچھا۔

”ظاہر ہے۔“ چودھری طالب علی نے بے پروائی سے کہا۔

”تاریخ کب کی رکھیں گے؟“ شعیب نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”بس تین چار روز بعد۔ رمضان شروع ہونے والا ہے۔ عید ہی کے ہفتے ٹھیک رہے گی۔“ چودھری طالب علی نے جواب دیا۔

”اور تمہیں بھی ٹانگ دیں گے کسی کے ساتھ۔“ سیکرٹری جگمگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے تو فی الحال بخشیں۔ عید پر آؤں گا تو بات کر لیجئے گا۔ بس آج میں شام کی ٹرین سے کراچی جا رہا ہوں۔ ٹکٹ بھی منگوا لیا ہے۔“ شعیب نے تیزی سے کہا۔

”ہم سے پوچھتے بغیر؟“ چودھری شجاعت علی نے کہا۔

”آپ ابھی تو پوچھتے بغیر ہی تھا۔“ شعیب علی نے پٹ سے جواب دیا تو وہ بے چارے اپنا

سامنے لے کر رہ گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ نسرین کے کمرے میں تھا۔ نسرین درجے میں کھڑی باہر کیارپوں میں

پھولوں کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ان گنت رنگین خواب چل رہے

تھے۔ فیروز کی وہ ٹھیکرے کی مانگ تھی۔ اس نے جیسے ہی شعور کی دنیا میں قدم رکھا، ایک ہی

نام تھا جس نے دھڑکنوں کو ایک نیا انداز عطا کیا۔ آنکھوں نے اسی کے خواب پلکوں پر جا

لئے اور کوئی خطرہ نہیں تھا کہ سنے پورے نہ ہوں۔ ہاں البتہ چند سال قبل فیروز اعلیٰ تعلیم کے

لئے ڈنمارک گئے تو نسرین کا ننھا سادل کانپ اٹھا تھا کہ وہاں کوئی رنگین کہانی جنم نہ لے۔

مگر ایسا نہیں ہوا۔ فیروز نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہیں سروس کر لی تھی اور اب پورے

سات سال بعد واپس آئے تھے، تین ماہ کی رخصت پر۔ مندر کی منگنی پر نسرین نے انہیں

دیکھا تھا۔ مینا نے ان کے لئے الگ ملاقات کا بھی بندوبست کر دیا تھا اور جب وہ ہائیں

باغ میں سرخ و سفید پھولوں کے درمیان نسرین سے ملے تھے تو وہ مدھوش ہو گئی تھی۔ ان کا

صرف ایک ہی جملہ ان کے بہتر مستقبل کی نوید بنا گیا تھا۔ فیروز اس کا ہاتھ تھامے دھیرے

دھیرے کہہ رہا تھا۔

”ریٹی جان! اب زیادہ انتظار نہیں ہوتا۔ اکیلے رہ رہ کر میں پریشان ہو گیا ہوں۔ اب

تمہیں ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ چلو گی نا؟“ فیروز نے جھک کر سرگوشی کی تھی۔ وہ کہنے

بولی۔ جب اصرار حد سے بڑھا تو نسرین نے بے اختیار گردن ہلا دی اور فیروز نے بے خور

ہر اس کا ہاتھ چوم لیا تھا اور نسرین ہاتھ چھڑا کر وہاں سے بھاگی تو اپنے کمرے میں آ کر دم

نہا۔ اب بھی نسرین کو اپنے ہاتھ کی پشت پر ایک دھکتا ہوا انگارہ محسوس ہوتا تھا۔ بے اختیار اس

نے اپنا دایاں ہاتھ ہونٹوں سے لگانا۔

”کیا سوچ رہی ہیں آپ؟“ شعیب علی کی آواز اسے خیالوں کی دنیا سے حقیقی دنیا میں

لے آئی۔

”تم بہت شریر ہو گئے ہو شعیبی!“ نسرین نے پیار سے سرزنش کی۔

”آپ تو ناشتہ کئے بغیر ہی اٹھ آئی ہیں؟“

”کر لیا تھا۔“ نسرین نے آہستہ سے کہا۔

”جی ہوں، آپ جیسی پیٹو لڑکی بغیر ناشتہ کئے تو اٹھ کر نہیں آ سکتی۔“ شعیب نے اسے

چھڑا۔

”تم باز آ جاؤ اپنی حرکتوں سے۔ بھلا ایسی باتیں بابا اور امی جی کے سامنے کی جاتی

ہیں؟“ نسرین نے نار ہونے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

”اُف! کیا کروں، خیال ہی نہیں رہتا۔ ویسے ایک بات سچ سچ بتائیں۔“ وہ جھک کر

بولی۔

”کیا.....؟“ نسرین نے پلکیں اٹھا کر شعیب کو دیکھا۔

”فیروز بھائی سے ملاقات ہوئی؟“

”دیکھو! میں مار بیٹھوں گی۔“ نسرین نے ہاتھ اٹھایا تو شعیب نے ان کے دونوں ہاتھ

مضبوطی سے تھام لئے مگر نسرین سوچ رہی تھی کہ یہ تمہیں الہام کب سے ہونے لگے تھے؟

”دھیرج آپا!..... یہ اپنے صاحب کو دکھائیے گا۔ اسی لئے میں جا رہا ہوں۔ بس

شاکی پر آؤں گا، جب آپ مایوس بیٹھی ہوں گی۔“ شعیب پھر بھی شرارت سے باز نہ آیا۔

”تم پورا رمضان کراچی میں گزارو گے؟“ نسرین ایک دم ڈکھی ہو گئی۔

”ظاہر ہے۔“ اس نے بے نیازی سے کندھے اُچکائے۔ ”کیا لاؤں آپ کے لئے؟“

”اپنے کھانے پینے کا خیال رکھنا..... لا پرواہی مت کرنا۔“ نسرین نے کہا۔

”مجھے اپنے آپ سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔“ شعیب نے مسکراتے ہوئے شوخی سے کہا تو

نسرین بھی مسکرا پڑی۔

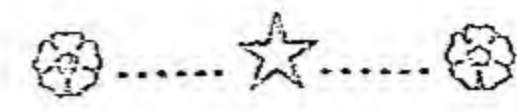
”آؤ، باتیں کریں۔ پھر تو تم شام کو بھی چلے ہی جاؤ گے۔“ نسرین نے شعیب کا ہاتھ

تھام اور پلنگ پر آ کر بیٹھ گئی۔

”آپ کے پاس تو ایک ہی موضوع ہو گا۔“ شعیب اس کے قریب بیٹھتا ہوا شوخی سے

نسرین کو گھور کر رہ گئی اور شعیب ہنستے ہوئے نسرین کے گلے میں جھول گیا۔





دو پہر ڈھل چکی تھی، گرمیوں کے دن تھے۔ دھوپ کی کات بھی ٹالمانہ تھی۔ چودھری دلاور کی حویلی سے نکلی ہی تھی کہ شجاع مل گیا۔ اس کے ہاتھ میں کتابیں تھیں جس کا مطلب تھا کہ وہ اسکول سے آرہا ہے۔

”کیا حال ہے مومو؟“

”ٹھیک ہوں۔“ مومو نے چتری کو سر پر جھاتے ہوئے کہا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ شجاع اس کے ساتھ چلتا ہوا بولا۔

”ڈیرے پر جا رہی ہوں۔ چھوٹے چودھری کا شہر سے دوست آیا ہے نا، ان سے پوچھنے جا رہی ہوں کہ کھانا گھر کھائیں گے یا ڈیرے پر۔“

”کوئی اور نہیں جو پوچھ کر آئے؟“ شجاع کو بہت برا لگا تھا کہ وہ اکیلی ڈیرے پر جا رہی تھی۔

”چودھرائی نے مجھے ہی بھیجا ہے۔“ مومو نے محسوسیت سے جواب دیا۔

”چلو، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ تم باہر کھڑی رہنا، میں پوچھ آؤں گا۔“ شجاع نے کہا۔

”تم گھر جاؤ، اسکول سے آرہے ہو شاید۔“

”نہیں، میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ شجاع اس کے ساتھ چل پڑا۔

”آئندہ اگر چودھرائی تجھے ڈیرے پر بھیجے تو مت جانا۔“ راستے میں شجاع نے اس سے کہا۔

”کیوں؟“ مومو نے حیرت سے پوچھا۔

”بس، میں نے کہہ دیا ہے۔“ شجاع جھنجھلا کر بولا۔

”پھر چودھرائی مارے گی۔“ مومو نے خدشہ ظاہر کیا۔

”تم کہہ دینا، وہاں کسی مرد کو بھیجا کرے۔“

”مگر کیوں؟“ مومو نے تکرار کی۔

”ہر بات نہیں بتائی جاتی۔“ شجاع نے ذرا سختی سے کہا تو وہ خاموش ہو گئی۔

اب وہ مومو کو کیا بتاتا کہ وہ اتنی چھوٹی سی عمر میں اس ڈیرے پر کیا کچھ دیکھ چکا ہے۔ جب وہ رات کو آخری بس سے احمد پور آتا تو ڈیرے کے قریب سے گزرتے ہوئے ہمیشہ ٹھٹک جاتا تھا۔ اس پاس سناٹا چھایا ہوا ہوتا تھا اور اس سناٹے کو گھنگھروں کی آواز اور بے ہنگم تہمتیں توڑ دیا کرتے تھے۔ سر شام ہی احمد پور کے غریب کیمپ اپنے گھروں میں گھستے تو پھر صبح کاؤب ہی نکلتے تھے۔ وہ سارے دن کے تھکے ہارے اس طرح سوتے تو صبح موزوں کی

بہت ہی جگاتی تھی۔ بھلا وہ کیسے جانتے کہ چودھری دلاور کے ڈیرے پر کیا کچھ ہوتا ہے؟ شجاع کو علم تھا تو اس نے کیا کر لیا تھا۔ منہ سے باپ تک نہ نکالی تھی، بس ایک روز جب حسب معمول وہ رات کو چادروں کے سیٹ پر لیٹ کر تھکا ہوا آخری بس سے واپس آیا تو ڈیرے کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک بانی آواز نے اس کے قدم روک لئے تھے۔

”خدا کے لئے، مجھ پر رحم کرو..... تمہیں خدا اور رسول ﷺ کا واسطہ۔“

”ارے، ارے.... دور کیوں ہو رہی ہو؟.... قریب آؤ۔“ ایک لڑکھاتی ہوئی آواز

بلائی۔

”دیکھو..... دیکھو! میرا ابا کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گا۔ میری چھوٹی بہنوں

کا زلیاں نہیں اٹھیں گی۔ خدا کے واسطے مجھے چھوڑ دو۔ میرے گھر پہنچا دو۔“

”بے فکر ہو۔ تمہاری بہنوں کو بھی لے آئیں گے۔“ ایک مکروہ تہمتہ گونجا۔

”نہیں..... نہیں۔“ وہ لرز گئی۔

شجاع کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کیسی آواز ہے اور یہ لڑکی کون ہے؟ بس پتہ نہیں، کیا جی نہ آئے کہ لڑکی پر چڑھا اور پھر روشن دان سے اندر جھانکنے لگا۔ اندر کا منظر دل دہلا دینے والے کافی تھا۔ سامنے ہی چودھری دلاور ایک بڑے سے تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک گلاس تھا، جس میں پیلے سے رنگ کی کوئی چیز تھی اور سامنے ایک چھوٹی سی میز پڑی تھی جس پر ایک بوتل اور گلاس رکھا تھا اور وہ لڑکی دیوار سے چکی لڑکی کی۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر ایک اونچا لمبا، گھنگھریالے بالوں والا آدمی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی گلاس تھا، جو پیلے پانی سے پُر تھا۔

”چھوڑو چودھری! اب تم ادھر آ کر بیٹھو۔ میں اسے رام کرتا ہوں۔“ چودھری دلاور تخت سے نیچے اترے۔ ان کے ہونٹوں پر بڑی مکروہ مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

وہ آدمی پلٹا، تب شجاع نے دیکھا کہ وہ نیا آدمی تھا اور احمد پور کا نہ تھا۔ کیونکہ احمد پور کے آدمی کو وہ جانتا تھا۔ وہ آدمی چودھری دلاور کی جگہ آ کر بیٹھ گیا اور چودھری دلاور اس کی طرف بڑھ گئے، جو دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے رو رہی تھی۔ پورے کمرے میں سکیموں کی آواز گونج رہی تھی۔

”دیکھو تمہاری بیٹی بھی ہوگی..... تم بھی باپ ہو۔“ وہ چودھری دلاور کو اپنی بات تو دنیا کا ہر مرد ہوتا ہے۔ چودھری دلاور زور سے ہنسے اور لڑکی کی طرف بڑھنے لگے، وہ نیچے اتر آیا اور پھر وہاں نہیں رکا بلکہ دوڑتا ہوا ماسٹر



مراد کے ہاں پہنچا تھا۔

”ماسٹر صاحب!..... ماسٹر صاحب!“ اس نے دروازہ پیٹ ڈالا۔ ماسٹر مراد سوئے ہوئے تھے، فوراً اٹھ بیٹھے۔ وہ شجاع کی آواز پہچان گئے تھے۔ انہوں نے فوراً دروازہ کھولا۔

”کیا ہوا شجاع! خیر تو ہے؟“ انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔

شجاع تیزی سے اندر آیا اور ان کے بستر پر گر گیا۔

”کیا ہوا شجاع بیٹے؟ بتاؤ نا۔“ ماسٹر مراد اس کے قریب ہی بستر پر بیٹھ گئے اور اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور تب ہولے ہولے شجاع نے انہیں سب کچھ بتا دیا جو وہ چودھری کے ڈیرے پر دیکھ کر آیا تھا۔ یہ سب کچھ سن کر ماسٹر مراد ہولے سے بولے۔

”شجاع بیٹے! یہ بات کسی کو نہ بتانا۔ بس یوں سمجھ لینا جیسے تُو نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ اس بات کو خواب سمجھ کر بھلا دینا۔“

”کیوں ماسٹر صاحب؟“ شجاع نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”بیٹا! ہر بات کا جواب نہیں دیا جاتا۔ کچھ باتیں دیکھی جاتی ہیں، کئی نہیں جاسکتی ہیں اور ان کا جواب کسی کے پاس بھی نہیں ہوتا۔“

”آپ کے پاس بھی نہیں ہے؟“ شجاع نے حیرت سے اپنے ماسٹر کی طرف دیکھا، جن کے پاس ہر قسم کا جواب ہوتا تھا اور آج وہ لا جواب ہو گئے تھے۔

”ہاں، میرے پاس بھی نہیں ہے۔ مگر اتنا بتا دوں کہ ڈیرا اچھی جگہ نہیں ہوتی۔ وہاں آرزوئیں، اُمّیں اور جوانیاں پامال ہوتی ہیں۔ تم شکر اس طرف بھی نہ جانے دینا۔“

”مگر ماسٹر صاحب! پتہ نہیں چودھری دلا اور ان کا ساتھی کیا پی رہے تھے کہ ان کی آواز بھی بدلی ہوئی تھی۔“ شجاع نے کہا۔

”بیٹا! وہ شراب تھی۔“

”شراب کیا ہوتی ہے؟“ شجاع نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ انسان کو شیطان بنا دیتی ہے۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو خود پر قابو رکھتے ہیں۔ جس طرح آواز بدلتی ہے، اسی طرح دل بھی بدل جاتے ہیں..... اچھے برے اور اپنے غیر کی پہچان مٹ جاتی ہے۔“

”جب یہ بری چیز ہے تو چودھری کیوں پیتا ہے؟“ شجاع کو بال کی کھال نکالنے کی عادت تھی۔

”انہیں برائیاں ہی جنم دیتی ہیں، برائیوں میں ہی زندہ رہتے ہیں اور برائیوں میں ہی مرتے ہیں۔ اگر یہ اچھے کام کرنے لگیں تو ان کی پہچان نہ مٹ جائے۔“ ماسٹر مراد بولے۔

”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا ماسٹر صاحب!“

”یہ سمجھ تو اچھا ہے۔ مگر کسی کو نہ بتانا کہ ڈیرے پر تُو نے کیا دیکھا ہے۔ اپنی ماں کو بھی کہیں۔“ جاب، وہ انتظار کر رہی ہو گی۔“ انہوں نے شجاع کو سمجھایا اور پھر اسے گھر تک چھوڑ گئے۔

ماسٹر مراد کے سمجھانے کا یہ اثر ہوا تھا کہ شجاع نے ڈیرے کی طرف سے آنے والا راستہ تبدیل کر لیا تھا اور اس نے یہ جان لیا کہ ڈیرا بری جگہ ہے۔ وہ بری جگہ کے قریب بھی نہیں پہنچنا چاہتا تھا اور آج اس نے مومو کو ادھر جاتے دیکھا تو اسے منع کر دیا۔ نہ جانے کیوں وہ مومو کے لئے اپنے دل میں بہت عزت و احترام پاتا تھا، اسے کام کرتے دیکھ کر اس کا دل جلتا تھا۔ یہ عمر تو مومو کی گڑیاں پٹو لے کھیلنے کی تھی اور وہ اتنا کام کرتی تھی۔

مومو کو شجاع نے ڈیرے سے کافی فاصلے پر چھوڑا اور خود اندر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد ہی واپس آ گیا۔

”کیا کہا چھوٹے چودھری نے؟“ مومو نے پوچھا۔

”کہہ رہا ہے کہ گھر آ کر کھانا کھائیں گے وہ لوگ۔“ شجاع نے جواب دیا۔

”اچھا۔“ مومو نے سر ہلا دیا۔

”آئندہ تُو نہ آنا اس طرف۔“ شجاع نے کہا۔

”بھئی ایک مرتبہ کہہ دیا ہے، نہیں آؤں گی۔“ مومو جھنجھلا گئی۔

”ٹھیک! شجاع مسکرایا۔

”شجاع! ایک بات تو بتاؤ۔“ مومو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”پوچھو۔“ شجاع اس کے ساتھ چلتا رہا۔

”میں کل سے بہت پریشان ہوں۔“ مومو نے بڑوں کی طرح اپنی پریشانی ظاہر کی۔

”وجہ؟“ شجاع نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”مگر وعدہ کرو، کسی کو بتاؤ گے نہیں۔“ مومو نے شجاع کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں مجھ پر اعتماد نہیں؟..... اور ویسے بھی میں کس سے ملتا ہوں؟ ابھی کھانا کھا کر چٹا جاؤں گا، پھر رات کو واپس ہو گی۔“ شجاع نے اپنا پردہ گرام بتایا۔

”شجاع! فرض کرو، میرا کوئی جڑواں بہن یا بھائی ہو تو وہ کتنا بڑا ہو گا اب؟“ مومو نے دو سے ذہن میں کھٹکتا ہوا سوال شجاع سے کر دیا۔

”نہیں، تمہارے برابر ہو گا۔“ شجاع جلدی سے بولا۔

”مگر وہ تو بہت بڑا ہے۔ چھوٹے چودھری کے برابر ہو گا وہ۔ مومو نہیں بھی ہیں اس کی۔“ شجاع نے بہت پیارا ہے۔“ مومو نے خودی کے عالم میں بولے چلی گئی۔



”کون بھئی؟“ شجاع نے حیرت سے پوچھا۔ تب وہ ایک دم ہوش میں آگئی۔ ہائے میں کیا بتائے جا رہی ہوں۔ اگر اماں کو پتہ چل گیا تو زندہ دفن کر دیں گی۔  
”کس کی بات کر رہی تھی مومو؟“ شجاع نے پوچھا۔

”وہ..... وہ زبیدہ کی ایک سہیلی آئی ہے، میرے جتنی ہے اور بھائی اس کا بہت بڑا ہے۔ جبکہ وہ کہتی ہے کہ جڑواں بھائی ہے۔“ مومو ذہین اور شاطر باپ کی بیٹی تھی، بھلا کر طرح بات نہ بناتی۔

”تو اُس کا قدر چھوٹا رہ گیا ہو گا۔“ شجاع نے خیال ظاہر کیا۔

”نہیں بھئی، آٹھ نو سال کی ہے۔“ مومو بولی۔

”پھر مذاق کر رہی ہو گی وہ..... تم ہو سیدھی سادی، لوگ تمہیں بے وقوف بنا لیتے ہیں۔“ شجاع نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا۔

”ہاں..... مجھے شاید بے وقوف بنایا ہے۔ کس نے؟ اماں نے یا بابا جانی نے؟“ مومو نے ایک طویل سانس لے کر سوچا۔ تب نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات برسنے لگی۔



رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ شعیب علی جب سے حسن پور سے واپس آیا تھا، ایک بھی کلاس اسٹینڈ نہیں کی تھی اس نے۔ بس اس کا ذہن شیطان کا گھر بنا ہوا تھا۔ بار بار منصوبے بناتا اور رد کرتا۔ وہ اپنے پیارے چاچا شوکی کا بدلہ لینا چاہتا تھا، اپنے ظالم و جابر بابا سے، جنہوں نے بھائی کو اولاد سے محروم کر کے اپنے خاندانی جاہ و جلال اور شان و شوکت کے بارے میں تو سوچا مگر اس شخص کے بارے میں نہ سوچا، جس نے اولاد کی خاطر کس قدر مظالم ڈھائے، باپ بننے کے لئے جنہوں نے اسے ظلم پر مجبور کر دیا۔ اور جب وہ اپنی خواہشوں اور آرزوؤں کی تکمیل کر چکا تو بھائی نے ہی شب خون مار کر سب کچھ اس سے چھین لیا اور اب وہ وقت کا منتظر بیٹھا ہے۔ مومو..... جس سے مل کر شعیب علی کا دل دوبارہ ملنے کو تڑپ رہا تھا، وہ معصوم سی کالی کالی آنکھوں والی، گھبرائی گھبرائی سی لڑکی، جس نے ذرا سی عمر میں بہت کچھ سیکھ لیا تھا، اپنے بابا کی دیوانی، شعیب کو بھائی سمجھ کر کھل اٹھی تھی۔

”آف، بابا! بہت ظلم کیا آپ نے۔“ شعیب علی مٹھیاں میچتے ہوئے بڑبڑایا۔ اس دافنے میں سارا جرم اسے اپنے بابا کا ہی نظر آیا تھا۔ شعیب علی اس خیال سے متفق تھا کہ اگر پندرہویہ چیز نہ ملے تو اسے چھین لیا جائے۔ اپنے دل کو ترسانا گناہ کبیرہ ہے۔ اب بھلا میں کس طرح چاچا شوکی کے دکھوں کا مداوا کروں؟ مجھے تو کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی۔ کبھی میں کسی کے ساتھ اس حد تک سنجیدہ نہیں ہوا۔ شعیب علی نے جھنجھلا کر سوچا۔

”اگر تم نے ذرا سی بھی بزدلی دکھائی شعیب علی! تو تم بھی چودھری شوکت علی بن جاؤ گے۔ رنگ محل میں تمہاری آنسوؤں اور خراہشوں کا خون بھی ہو گا۔ اپنے سے بڑی عمر کی عورت سے شادی کر کے نباہ کرنا بہت مشکل ہے۔ تم ہمت کرو۔“ شعیب کے دل نے راہ نکالی۔

”اب تو کسی کو دل میں بسانا ہی پڑے گا۔“ شعیب علی نے سوچا اور پھر پونچھوڑی جانے کی تیاری کرنے لگا۔ کنگھا کرتے ہوئے وہ خواجہ فرید کے کلام کا ایک خوب صورت بند گنگنا



رہا تھا۔

ہائے نی سب سے اسی نیناں دے آگے گئے  
کالے بٹناں چڑھے سفیدی کاگ نہ تھیندے گئے  
جہاں پاک لگایاں ہو یاں او میں تا جائزے ٹھگے

”اوئے..... تو آگیا ہے اور ہمیں اطلاع ہی نہیں دی۔“ انور صادق اور اشتر نے  
ایک ساتھ اس کمرے پر دھوا بول دیا۔

”پھر تمہیں پتہ کیسے چلا؟“ شعیب، انور سے گلے ملتے ہوئے شوخی سے بولا۔

”دوران نے بتایا تھا کہ تمہارا چودھری آگیا ہے۔“ صادق نے جواب دیا۔

”کیا چکر ہے پیارے؟ بڑے گیت گنگنا رہے ہو؟“ انور نے مٹی خیر لہجے میں پوچھا۔

”یہ تو میری عادت ہے۔“ شعیب علی بری طرح جھینپ گیا۔

”عادت؟“ صادق زور سے ہنسا۔ ”مجھے تو لگتا ہے کسی نے تمہیں ٹھگ لیا ہے۔“ انور

نے کہا۔

”ٹھگا تو نہیں ہے، کوشش کروں گا کہ ٹھگا جاؤں۔“ شعیب ہنس کر بولا۔

”یعنی چانس ہے۔ اب سیریس ہو گئے ہو۔“ انور مارے خوشی کے ناچ اٹھا۔

”ہاں۔“ شعیب علی نے کھلے دل سے اعتراف کیا۔

”ارے سنا ہے تم نے، سرور کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔“ صادق کو اچانک یاد آیا۔ سرور

اُن کا مشترکہ دوست تھا۔

”کب؟..... کیسے؟ ٹھیک تو ہے نا؟“ شعیب علی بے قرار ہو گیا۔

”جس روز تم گئے ہو نا، اُسی روز شام کو ہوا تھا۔ سنا ہے، پرسوں گھر آگیا ہے۔ ہم“

چار مرتبہ جا کر اسے دیکھ آئے تھے۔“ انور نے کہا۔

”میں بھی آج جا کر پوچھ آؤں گا۔“ شعیب نے کہا۔

”گھر کا پتہ ہے؟“ اشتر بولا۔

”ہاں..... ایک بار میں نے اسے ڈراپ کیا تھا۔ وہی گولی مار والا ہی گھر ہے نا؟“

شعیب نے کہا۔

”ہاں، ہاں..... وہی ہے۔“ انور اور صادق ایک دم بولے۔

”چلو پورا! کلاس شروع ہونے والی ہے۔“ اشتر نے کہا۔

”کچھ کھاؤ گے؟“ شعیب کو مہمان نوازی کا خیال آیا۔

”نہ بھئی، روزہ ہے۔“ انور نے کہا۔

”تم بھی روزے رکھتے ہو؟“ شعیب نے حیرت سے پوچھا۔

”اتنا بے دین سمجھ رکھا ہے؟ پورے روزے ہو رہے ہیں۔“ انور اکڑ کر بولا۔

”ہاں، آج تیرا روزہ ہے نا، بھئی تو بڑے فخر سے بتا رہے ہو۔“ شعیب بولا۔

”ان شاء اللہ! پورے رکھوں گا۔“ انور خم ٹھونک کر بولا۔

”پچھلے سال کی طرح۔“ اشتر نے کہا۔

”پارا وہ تو.....“ انور بری طرح جھینپ گیا اور وہ لوگ بری طرح ہنس دیئے۔ پچھلے

سال بھی انور نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ پورے روزے رکھے گا۔ مگر سات روزوں کے بعد ہی

پار گیا تھا، پھر اس نے روزے نہ رکھے تھے۔

”پتو پیار.....!“ شعیب نے کہا اور پھر وہ لوگ کمرے سے نکل کر نیچے آ گئے۔

☆.....☆.....☆

چودھری شوکت علی نے لباس تبدیل کیا، سنگھار میز کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے اونچے

نیلے کو بار بار درست کیا، پھر اسپرے کیا، آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ زہرہ بیگم بڑے غور سے

انہیں دیکھے جا رہی تھیں۔ بظاہر تو وہ دوپٹے میں کرن لگا رہی تھیں، مگر ان کا دھیان چودھری

شوکت علی کی طرف تھا۔ جب چودھری نے تیار ہو کر کمرے سے نکلنا چاہا تو زہرہ بیگم کی آواز

نے ان کے قدم روک لئے۔

”کہاں جا رہے ہیں آپ؟“ زہرہ بیگم نے نہایت دھیمے لہجے میں پوچھا۔ اب وہ بہت

زم گنتا ہو گئی تھیں۔ کئی روز سے کوئی طعنہ نہیں دیا تھا، جب سے دونوں کے درمیان معاہدہ

ہوا تھا۔ کیونکہ دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے اور اپنے بزرگوں کے فیصلوں کی بھینٹ چڑھ

گئے تھے۔

”کوئی کام ہے آپ کو؟“ چودھری شوکت علی پلٹ آئے۔ ان کا دل ایک دم سینے میں

ترہرانے لگا۔

”ایک بات کہنا تھی آپ سے..... وقت ہے؟“ زہرہ بیگم نے کہا تو چودھری شوکت علی

رستہ گرتے بچے۔ کبھی بھی تو انہوں نے یہ نہ پوچھا تھا کہ وقت ہے یا نہیں۔

زہرہ بیگم نے دوپٹہ رکھ دیا اور انگلیاں مردڑنے لگیں۔ وہ سخت شش و پنج کا شکار تھیں کہ

پتو پیار نہ پوچھیں۔

”کچھ کہہ رہی تھیں آپ؟“ چودھری شوکت علی نے زہرہ بیگم کو تذبذب کا شکار دیکھ کر

پوچھا۔

”نہیں..... میں یہ کہنا چاہ رہی ہوں کہ شعیب حد سے بڑھتا جا رہا ہے۔“ زہرہ بیگم نے

پتو پیار سے ہائے کہا۔

”میں سمجھا نہیں؟“ چودھری شوکت علی جان بوجھ کر انجان بن گئے۔



”دیکھئے نا، ہر ایک کے سامنے وہ کہہ دیتا ہے کہ وہ چاچا شکر بننا نہیں چاہتا۔ آپ چاہئے، اُسے سرزنش کریں۔“ زہرہ بیگم نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بھئی وہ بچہ ہے۔“ چودھری شوکت علی مکر کر بولے۔

”بچہ نہیں، سب کچھ جانتا ہے۔ ہم اُسے اپنی اولاد کی طرح سمجھیں اور وہ ہماری تصویر کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔“ زہرہ بیگم کا لہجہ سخت تھا۔

”دیکھیں زہرہ! ہر فرد کو اپنی رائے کے اظہار کا موقع ملنا چاہئے۔ اب اُس کی شادی لالہ اس سے بڑی لڑکی سے کرنا چاہتے ہیں تو اسے اختیار ہے کہ وہ چاہے تو انکار کر دے۔ کیا آپ چاہیں گی کہ ”رنگ محل“ ایک اور زہرہ بیگم کی آرزوؤں اور تمناؤں کو روند ڈالے؟“

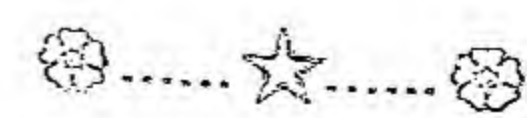
چودھری شوکت علی نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نہایت نرم لہجے میں پوچھا۔

”مگر شوکت! آپ ہیں اور شعیبی میں بہت فرق ہے۔ شعیبی نئے دور کا لڑکا ہے، وہ سب جانتا ہے۔ آپ کی طرح تیرہ برس کا کھلنڈر سا لڑکا نہیں ہے وہ۔“ زہرہ بیگم نے قائل کرنا چاہا۔

”آپ چاہتی ہیں کہ جس سے لالہ چاہتے ہیں وہ شادی کر لے؟“ وہ خوش لہجے میں بولے۔

”ایسا اسے کرنا پڑے گا، ورنہ جائیداد سے ہاتھ دھوئے پڑیں گے۔ آپ اسے سمجھائیں، لڑکی بہت اچھی ہے۔ بس عمر کی زیادہ ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ وہ بولیں۔

”بہت فرق پڑتا ہے زہرہ بیگم! عمروں کا تضاد زندگی میں زہرہ کو مل دیتا ہے۔“ چودھری شوکت علی نے نہایت ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا حالانکہ وہ کہنا چاہتے تھے کہ شعیبی کو بھی آگے چل کر بچوں کی خواہش ہوگی۔ باپ بننے کے لئے وہ تڑپے گا۔ پھر کہیں وہ بھی میرے راتے پر نہ چل نکلے۔ اس سے بہتر ہے کہ وہ ان جھوٹی روایات سے ٹکرا جائے اور اپنی مرضی سے شادی کرے۔ جو عورتیں دولت ساتھ لاتی ہیں، وہ بانجھ بن بھی ساتھ لاتی ہیں، بالکل تمہاری طرح زہرہ بیگم! وہ زہرہ بیگم کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے یہ سب سوچے جا رہے تھے۔ اب یہ بات تو وہ ذہن سے نہیں نکال سکتے تھے کہ زہرہ بیگم بانجھ ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہر وہ عورت، جو جہیز میں بے شمار دولت لے کر آئے، وہ بانجھ ہوتی ہے۔ یہ ان کی اپنی ذہنی اختراع تھی، جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ پھر وہ زہرہ بیگم سے کچھ نہ بولے اور کرے سے نکل گئے جیسے اگر چند لمحے اور رکتے تو زہرہ بیگم مزید سوال دلا دیں گی۔



شعیب علی، گولی مار کی چھوٹی چھوٹی گلیوں میں کب سے سرور کا مکان ڈھونڈ رہا تھا، مگر

کان تھا کہ ملنے ہی میں نہ آ رہا تھا۔ وہ سخت جھنجھلا گیا۔

”شعر وغیرہ کو لے آتا تو اچھا تھا۔“ اس نے سوچا، پھر ایک پرچون فروش کی دکان سے مکان کا نمبر پوچھا تو قسمت اچھی تھی کہ اس نے سپر ہا سادا پتہ بتا دیا۔ چند لمحے بعد شعیب علی، سرور کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا، جس پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا اور ایک طرف دیوار پر مکان نمبر اور نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔

”آخر! دیکھو، کون ہے دروازے پر؟“ اندر سے ایک نسوانی آواز آئی۔

”مجھ سے نہیں جایا جاتا۔“ دیکھتی نہیں کہ میں سکول کا کام کر رہا ہوں۔“ آخر نے نہایت بدتمیز لہجے میں بولے۔ منہ در منہ جواب دیتے ہیں۔“

”تھی قدموں کی چاپ ابھری اور دروازے کے قریب آ کر رُک گئی۔“

”میں شعیب علی ہوں۔ سرور سے ملنا چاہتا ہوں۔“ شعیب نے نہایت بے زاری سے کہا۔ یوں بتا رہا تھا، جیسے پوچھنے والی اسے اچھی طرح جانتی ہو۔

”آپ اندر آجائیے۔“ لڑکی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا اور دروازہ کھول دیا۔ شعیب علی اندر چلا آیا۔ لڑکی نے اشارے سے سرور کا کمرہ بتایا اور شعیب اس طرف بڑھ گیا۔ سرور سینے تک چادر اوڑھے مسہری بہ لپٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ آہٹ پر وہ چونک پڑا اور شعیب علی پر نظر پڑتے ہی خوشی سے کھل اٹھا۔

”کب آئے شعیبی؟“ سرور نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا مگر زخموں کی ٹیسوں کی وجہ سے کراہ کر رہ گیا۔

”لپٹے رہو بھئی۔“ شعیب علی تیزی سے اس کے قریب پہنچا اور اسے لٹا دیا۔

”بھٹو دوست!“ سرور خوشی سے بھرپور لہجے میں بولا۔

”تم اتنے لا پرواہ تو نہ تھے سرور!“

”بس یار! محلے کا ایک لڑکا ہے، اس کے ساتھ اسکوٹر پر جا رہا تھا کہ ایک کار نے ٹکرا مارا جس کی پاداش میں مجھ جیسا آدمی، جس کا پاؤں ایک جگہ نہیں ہٹتا تھا، اب ٹانگ پر پلستر لگا دیا ہے۔“ سرور نے ایک سیڈنٹ کی وجہ بتائی۔

”مگر کر، جان بچ گئی۔“ شعیب نے کہا۔

”سب یہی کہہ رہے ہیں۔“ سرور مسکرایا، پھر بولا۔ ”کیا کھاؤ پیو گے؟“

”انار سے ہوں۔“ شعیب نے کہا۔

”اچھا، پھر افطار کر کے جانا۔ رضیہ! بھئی ادھر آؤ۔“ سرور نے ہانک لگائی۔



”نہیں سرور! میں چلوں گا۔ تم کوئی اہتمام مت کرو۔“ شعیب نے اسے منع کرنا چاہا۔  
”واہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم آؤ اور پونہی لوٹ جاؤ.....“ سرور کا جملہ ابھی پورا نہیں  
ہوا تھا کہ ایک لڑکی دروازے پر آکھڑی ہوئی اور کہا۔  
”جی بھائی جان!“

”شعیب! یہ میری بہن رضیہ ہے۔“ سرور نے تعارف کرایا۔  
”آداب!“ شعیب کھڑا ہو گیا۔

”آداب!“ وہ ہولے سے یولی۔ شعیب نے دیکھا، وہ اچھی پُرکشش لڑکی تھی۔ پڑھ  
سوٹ میں وہ بہت بھلی لگ رہی تھی۔ سرور اُس سے کہہ رہا تھا۔

”رضیہ! آج میرا دوست یہیں روزہ کھولے گا، تھوڑا بہت انتظام کر لینا۔“

”بہتر!“ رضیہ نے ہولے سے کہا اور شعیب کی طرف دیکھا، جو اسی کی طرف دیکھتے  
ہوئے نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ رضیہ ایک دم گھبرا گئی اور جلدی سے کمرے سے نکل گئی۔

”کیا سوچ رہے ہو شعیب؟“ سرور نے اسے سوچ میں ڈوبادیکھ کر پوچھا۔

”سوچ رہا ہوں، تمہاری بہن کتنی اچھی ہے، جو تمہاری بات ایک دم مان گئیں۔ اور  
میری بہنیں، کیا مجال جو ایک بات بھی مان لیں۔“ شعیب نے ہولے سے کہا۔

”بھئی میں ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہوں، جن کی بہنیں بہت سعادت مند ہوتی  
ہیں۔ حالانکہ رضیہ سروس بھی کرتی ہے، مگر پورا گھر بھی سنبھالے ہوئے ہے۔ امی تو پیار رہتی  
ہیں۔“

”سروس.....؟“ شعیب نے اس لفظ کو دہرایا۔ کیونکہ وہ تو ابھی خود اسکول گرل لگتی  
تھی۔

”اسٹر کے بعد سی۔ ٹی کا کورس کر لیا تھا۔ گھر سے نزدیک ہی ہے اسکول، وہیں پڑھا  
رہی ہے چھ سات ماہ سے۔“ سرور نے بتایا۔

”اچھا ہے۔ لڑکیوں کو فارغ نہیں بیٹھنا چاہئے۔ تعلیم حاصل کی جائے تو اس کا کوئی  
مقصد بھی ہونا چاہئے۔ اب ہمارے ہاں دیکھو، لڑکیوں کو سوائے دینی تعلیم کے اسکول کی تعلیم  
بھی نہیں دکھائی جاتی۔ مگر لڑکوں کو اسی تعلیم دلائی جاتی ہے جبکہ پہلے تو لڑکوں کو بھی زیادہ نہیں  
پڑھایا جاتا تھا۔ مگر نئی نسل پڑھ رہی ہے۔“ شعیب نے بتایا۔

”تمہارے ہاں رشتے تو اپنوں میں ہوتے ہیں۔“ سرور نے کہا۔

”ظاہر ہے، قربانی کا بکرا بننا پڑتا ہے۔“ شعیب منہ ہٹا کر بولا۔

”تو لڑکے جاہل لڑکیوں کو قبول کر لیتے ہیں؟“ سرور نے پوچھا۔

”ارے یار! لڑکے جاہل لڑکیوں کو قبول نہیں کرتے، بلکہ اس بے شمار دولت کو اپنی

بارگاہی کا ساتھی بناتے ہیں جو وہ ساتھ لے کر آتی ہیں۔ اب میرے بھائی صفر کو دیکھو۔ میری  
جان بھائی تھی جب ان کے رشتے کے بارے میں سنا۔ اور وہ حضرت بالکل گنوار لڑکی  
نے نکلی کر کے یوں خوش ہیں، جیسے دنیا میں اس جیسی کوئی دوسری لڑکی ہے ہی نہیں۔“  
شعیب نے کہا۔

”تم بھی یونہی خوش ہو جاؤ گے۔“ سرور شوخی سے بولا۔

”کبھی نہیں..... میں کروں گا ہی نہیں اپنے خاندان میں شادی۔“ شعیب چٹانوں کی  
تختی سے بولا۔

”تم اپنی روایات تو نہیں توڑ سکتے۔“ سرور نے کہا۔

”وہی توڑنے کی تو کوشش کر رہا ہوں۔ یار! میرا بہنوئی فیروز ڈنمارک سے آیا ہے،  
انجینئر ہے۔ عید کے چاند میں شادی ہے اُس کی اور اُس نے بڑی خوشی کے ساتھ آپا سے  
شادی کی ہامی بھری ہے۔“ شعیب نے بتایا۔

”تو تمہارا خیال ہے، نہ ہامی بھرتا؟“ سرور نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”ہاں..... آپا خوب صورت ہیں، سلیقہ شعار ہیں، سب کچھ ہیں۔ مگر وہ بالکل جاہل  
ہیں۔ وہ بھلا کیسے ان کے ساتھ ایڈجسٹ ہو سکیں گی، میری سمجھ میں نہیں آتا۔“ شعیب علی  
کے لہجے میں پریشانی تھی۔

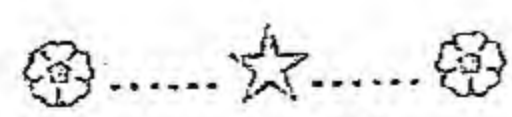
”تم بے فکر رہو۔ آخر وہ چاہتے ہیں، تبھی تو انہوں نے جلدی شادی کے لئے کہا ہے۔“  
سرور نے سمجھایا۔

”تم نہیں سمجھتے سرور! ہمارے ہاں کھنکھتے سکے اور لہلہاتی فصلوں والی زمینیں جہیز میں  
دینے کا جو رواج ہے نا، بالکل غلط ہے۔ پتہ نہیں چلتا کہ فیروز نے میری آپا کو قبول کیا ہے یا  
جہیز کو۔“ شعیب نے بتایا۔

”تم بے فکر رہو۔ آخر وہ تمہارے خالہ زاد ہیں۔“ سرور نے کہا۔

”آج کل جتنے دکھ اپنے دیتے ہیں سرور! بیگانے اتنے نہیں دیتے۔ اپنے ہی گھر  
نہری سے ذبح کرتے ہیں اور تڑپنے کی اجازت بھی نہیں دیتے۔“

”یار! اس قدر قنوطیت اچھی نہیں ہوتی۔ تم سب بھول جاؤ، بس یہ دعا کرو کہ خدا تمہاری  
شعیب بھی رکھے۔“ سرور نے شعیب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نہایت محبت سے کہا تو  
شعیب بھی اسے دیکھتا رہ گیا۔



رنگ محل میں غیر معمولی چہل پہل تھی۔ کیونکہ بہت عرصے بعد رنگ محل میں یہ پہلی  
نہایت تازہ روز شہر کے چکر لگتے۔ سیکڑ بیگم اور زہرہ بیگم لاہور جا کر تمام سامان خرید لائی



تھیں۔ تین درزی رنگ محل ہی میں بٹھا دیئے گئے تھے۔ گاؤں کی کئی عورتوں کو بلوالیا گیا تھا جو دوپٹوں پر کرن ٹانگنے کا کام کر رہی تھیں۔ سارا دن پورا برا آمد بھرا رہتا۔ شام کو سب نے اپنے افطار کا بھی انتظام کیا جاتا۔ پورے گاؤں میں عجیب سی پہاڑ آئی ہوئی تھی۔ سرین کویر کے ٹھیک پانچ روز بعد رخصت ہونا تھا اور وہ اُداس ہونے کے ساتھ ساتھ خوش بھی تھی۔ اپنوں سے چھڑنے کا غم، ہر غم پر بھاری ہوتا ہے، مگر آنکھوں کے رنگین سپنوں کو حسین تعبیر سے والی ہو تو یہ غم، غم نہیں رہتا۔ اپنے پرانے ہو جاتے ہیں اور پرانے اپنے ہو جاتے ہیں۔ یہ قانون قدرت ہے۔

چاند رات والے دن شعیب علی بھی حسن پور پہنچ گیا۔ شام کو افطار کے بعد وہ سب چھت پر چاند دیکھنے آ گئے۔ چودھری شوکت علی اور زہرہ بیگم بھی اوپر آئے تو شعیب انہیں دیکھ کر مسکرایا۔ تب زہرہ بیگم جھینپ کر فاطمہ بیگم کے قریب پہنچ گئیں اور شعیب، چودھری شوکت علی کے قریب آ گیا۔

”چاچا! کیا دعا مانگیں گے، چاند دیکھ کر؟“

”مجھے کوئی دعا یاد نہیں رہتی، شعیبی! سوائے مومنو کے۔ چاند دیکھ کر مجھے وہی یاد آتی ہے۔“ چودھری شوکت علی ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولے۔

”مگر اب یہ دعا ضرور مانگیے گا، جسے میں چاہتا ہوں، وہ مجھے مل جائے۔“ شعیب نے ان کے قریب جھک کر سرگوشی کی۔

”شعیبی!“ چودھری شوکت علی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”ہاں چاچا! وہ بہت اچھی ہے۔ بہت پیاری ہے۔ میرے دوست کی بہن ہے۔“ شعیب نے چند لفظوں میں انہیں ساری بات بتا دی۔

”شعیبی!“ چودھری شوکت علی کو یقین ہی نہ آ رہا تھا، اُس کی باتوں کا۔

”چاچا! یقین کریں کہ میں یہ صرف انتقام کی خاطر نہیں کر رہا بلکہ ان چند دنوں میں مجھے شدت سے احساس ہوا ہے کہ میں رضیہ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جیسے ایک ہی نظر میں نورال آپ کا سب کچھ لے گئی تھی، اسی طرح رضیہ نے بھی.....“ شعیب ہولے ہولے بولتا رہا۔

”بھئی کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں، چاچے بیٹے میں؟“ صفدر اوپر آتا ہوا بولا۔ شعیب علی

کب چوکتا۔

”آپ کو آجے دیکھ کر میں چاچا سے کہہ رہا تھا کہ صفدر بھائی کو چاند دیکھنے کی ضرورت ہے، ان کا چاند تو سا ہیوال میں ہے۔“

”تم باز نہیں آؤ گے؟“ صفدر ہستے ہوئے زمین کی طرف بڑھ گیا۔ پھر ”چاند نظر آ گیا“ کا شور ہوا تو سب ایک دوسرے کو اشارے سے آسمان پر باریک سا ہلال دکھانے لگے۔

شعیب علی نے واقعی رضیہ کے حصول کی دعا مانگی۔

”ان شاء اللہ! آئندہ سال ہم اکٹھے عید کا چاند دیکھیں گے۔“

شعیب علی نے تصور ہی تصور میں رضیہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ شعیب نے دعا مانگ کر ہزاروں دیکھا تو اس پر ایک نیا انکشاف ہوا۔ اس کا بھائی امجد علی بڑی پر شوق نظروں سے باہر اجتماع کی بیٹی پینا کو دیکھ رہا تھا، جیسے نظروں کے راستے دل میں اتار لینا چاہتا ہو اور وہ بھی ان آنکھوں سے کبھی کبھی اس کی طرف دیکھ کر سرخ ہوئی جا رہی تھی۔ مگر پھر بھی اس کے ماننے کڑی تھی، جیسے زیادہ سے زیادہ امجد پر اپنے حسن کے تیر برسانا چاہتی ہو، اسے اپنا دیوانہ بنانا چاہتی ہو۔

”امی جی تو امجد بھائی کا رشتہ ماموں جی کے ہاں طے کرنا چاہتی ہیں۔ کیا انہیں گھر میں نہ کہاں نظر نہیں آتیں؟ خدا کرے امجد بھائی آپ اپنی پسند پالیں۔“ شعیب علی نے سوچا۔ ہر ایک دم اسے شرارت سوچھی۔ سب آہستہ آہستہ نیچے جا رہے تھے، ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہوئے۔ شعیب ہولے ہولے چلتا امجد کے قریب آیا اور جھک کر بولا۔

”جذبوں کو یوں سرعام ظاہر نہ کیجئے، انہیں سینت سینت کر رکھیے، ورنہ بیٹا بدنام ہو جائے گی۔“ اس کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ امجد علی گھبرا گیا۔

”ارے، آپ بابا جان سے لڑیں گے کیسے، جبکہ ابھی سے گھبرائے جا رہے ہیں؟ ڈٹ جائیں ابھی سے۔ امی جی کو پٹائی جانے سے پہلے پہلے سب کچھ بتا دیں، ورنہ آپ کو کہیں اور بھسا دیا جائے گا۔ ساری زندگی تڑپتے رہیں گے، انجامی کہک اور جلن آپ کو چین نہ لینے دے گی۔“ شعیب علی نے کہا اور امجد علی کا جواب سننے بغیر تیزی سے نیچے آ گیا۔ پھر چودھری شوکت علی کو لئے رنگ محل سے باہر چلا آیا۔ وہ انہیں اس تکلیف دہ ماحول میں سے بچانے کے لئے لے جانا چاہتا تھا۔

”مومنو کے پاس نہیں جائیں گے آپ؟“ شعیب علی نے چودھری شوکت علی کے ساتھ ساتھ ایک پگڑی پر چلتے ہوئے پوچھا۔

”تین روز ہوئے، کیا تھا میں۔“ چودھری شوکت علی کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔

”چاچا! ان شاء اللہ، آئندہ عید پر وہ آپ کے پاس ہو گی۔“ شعیب علی نہایت جوش سے بولا۔

”کیسے؟“ چودھری شوکت علی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”میں جلد شادی کر لوں گا، پھر میں اُسے اپنے پاس رکھوں گا۔ کسی بھی طرح ہو، وہاں سے اسے نکالیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری بہن دوسری بہنوں کی طرح جاہل اور گنوار بنے۔“ شعیب نے کہا اور پھر وہ انہیں سمجھاتا رہا اور چودھری شوکت علی اس طرح سر ہلاتے



رہے، جیسے اس کی ہر بات مان لیں گے۔

☆.....☆

رات کے تقریباً دس بجے نسرن تاروں کی چھاؤں میں فیروز کے ساتھ رخصت ہوئی۔  
شعیب علی کو فیروز بہت پسند آیا تھا کیونکہ اس نے بات ہی ایسی کی تھی۔ شادی سے دو روز قبل  
اُس نے لکھوا بھجوا تھا کہ نسرن کو جھینر بالکل نہ دیا جائے، میرے پاس سب کچھ ہے، مجھے  
صرف نسرن کی ضرورت ہے تاکہ وہ میرے سونے گھر کو روٹی بخشنے۔ چودھری طالب علی کو  
بہت غصہ آیا تھا کیونکہ کبھی کسی نے اس طرح انکار نہیں کیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا اور انہوں نے  
تو کاغذات بھی تیار کر دئے تھے۔ اور وہ اتنے بڑے چودھری تھے، اگر بٹی کو جھینر میں دولت  
نہ دیتے تو آس پاس کے گاؤں والوں میں ان کی کیا عزت رہ جاتی۔ کنبیوں اور ان کی بٹی  
میں کیا فرق رہ جاتا؟ پورے گھر میں اگر کوئی خوش تھا تو وہ شعیب علی تھا۔  
”واہ فیروز بھائی! آپ پہل کر گئے۔“

چودھری طالب علی خود ساہیوال گئے اور فیروز سے جھینر لینے سے انکار کی وجہ دریافت  
کی۔ وہ زمانہ شناس لڑکا تھا، سمجھ گیا کہ دولت کے غرور نے انہیں اندھا کر رکھا ہے۔  
”خالو جی! دیکھئے نا، میں واپس چلا جاؤں گا اور نسرن بھی ساتھ ہی جائے گی۔ اب وہ  
جھینر آپ اپنی بٹی کو کیوں دینا چاہتے ہیں جو وہ برت نہ سکے۔ جب ہم واپس آجائیں گے  
پھر دے دیجئے گا۔“

آخر بڑے بحث و مباحثہ کے بعد بھی چودھری طالب علی نہ مانے تو فیروز نے آخری  
 حربہ استعمال کیا۔

”تو ٹھیک ہے خالو جی! یا تو جھینر دے دیجئے، یا نسرن۔ میں دو چیزیں قبول کرنے کی  
پوزیشن میں نہیں ہوں۔“

یہ سنتے ہی چودھری طالب علی بھر بھری مٹی کی طرح بیٹھ گئے۔ سارا جاہ و جلال پس  
پشت چلا گیا تھا۔

”تو تم نہیں مانو گے؟“ انہوں نے اپنے لہجے کو بارعب بنانے کی کوشش کی۔

”مان تو رہا ہوں۔ دونوں میں سے ایک چیز دے دیجئے۔“ فیروز بولا۔

”ٹھیک ہے..... پھر نسرن لے لو۔“ چودھری طالب علی مسکرائے۔

”اوہ..... خالو جی!“ فیروز ان سے لپٹ گیا۔

اور آج وہ اپنی نسرن کو بیاہ کر لے گیا تھا۔ شعیب علی بہت خوش تھا۔ اسے اپنی بہن کا  
مستقبل تابناک نظر آ رہا تھا۔ فیروز اُس کی اُمیدوں کے برخلاف بہت اچھا تھا۔ شاید اسے  
تعلیم نے بہت زیادہ شعور اور آگہی سے نوازا تھا۔

دوسرے روز شعیب علی نے رنج سفر باندھا اور چودھری شوکت علی سے ملنے ڈیرے پر  
گئے۔ وہ صبح ہی ڈیرے پر آ گئے تھے۔

”اتنی جلدی جا رہے ہو خبیثی!“ چودھری شوکت علی نے کچھ حیرت سے پوچھا۔  
”ہاں چاچا! پڑھائی کا بہت حرج ہو جاتا ہے۔ پہلے بھی کتنے دن ضائع ہوئے۔  
”میں پڑھائی بالکل نہیں ہوئی۔“ وہ ان کے قریب بیٹھ گیا۔  
”پڑھائی کا، یا.....“ چودھری شوکت علی شوخ ہو گئے۔

”ہاں..... وہ حرج بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ ابھی معاملہ وہاں بھی صرف دیکھنے کی حد تک  
ہے اور میں اس سے بات شادی کے بعد ہی کروں گا۔“ شعیب نے ہنستے ہوئے کہا۔  
”تم میل ضرور جانا۔ اور میرا خیال ہے کہ تم میری میل کا انتظام سنبھال لو۔ مجھ سے  
آئے روز کے بہانے کر کے نہیں جایا جاتا۔“ چودھری شوکت علی بولے۔

”میں چاچا؟“ شعیب علی نے حیرت سے کہا۔

”ہاں..... تم ہی۔ اور اب ہاسٹل سے میرے گھر میں شفٹ ہو جاؤ۔ پوری کوٹھی  
لازموں کے رحم و کرم پر پڑی ہے۔ میں ان پڑھ ہوں، مجھے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اب تم  
سنبھالو۔ تم تو میرا بازو ہو خبیثی!“ انہوں نے شعیب کو لپٹا لیا۔

”آپ آئیں گے تو پھر سوچوں گا۔ کب آئیں گے؟“ شعیب ان کے سینے سے سر رگڑتا  
ہوا بولا۔

”ایک آدھ ہفتے بعد آؤں گا۔ فیروز اور نسرن کو سی آف کرنے تو آنا ہی ہو گا۔“  
چودھری شوکت علی نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ شعیب بولا۔

”چلیں گھر چاچا!“ شعیب علی نے کہا تو چودھری شوکت علی بغیر کسی پس و پیش کے اٹھ  
کھڑے ہوئے۔

شعیب جیسے ہی گھر میں داخل ہوا، ہاجرہ نے بتایا کہ سیکینہ بیگم نے اُسے بلایا ہے۔ وہ  
بہن بھائی کے کمرے میں داخل ہوا تو سیکینہ بیگم پلنگ کی پشت سے ٹپک لگائے بیٹھی تھیں، شاید  
ان کی منتظر تھیں۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں مگر چہرہ بشارت تھا۔

ایک بلجھ اتر جانے سے ان کے چہرے پر نکھار آ گیا تھا کیونکہ بیٹیاں بوجھ ہی تو ہوتی  
ہیں۔

”آؤ خبیثی!..... بیٹھو۔“ انہوں نے اپنے قریب ہی اُسے بٹھالیا۔  
”کیوں یاد کیا تھا؟“

”کیوں..... میں تمہیں یاد نہیں کر سکتی؟“ سیکینہ بیگم محبت سے بھرپور لہجے میں بولیں۔



”آپ یاد نہیں کریں گی تو کون کرے گا؟“ شعیب نے ان کی گود میں سر رکھ دیا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہنے لگیں۔

”شعیبی! میں چاہتی ہوں کہ تیری بچی کہیں بات چیت پکی ہو جائے تو میں شیوں بہن کے ایک ساتھ لے آؤں۔“

شعیب علی تو یہ سنتے ہی ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔  
”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ میں نے بات تو کر ہی لی ہے، بس رسم ادا کرنی باقی ہے۔“ سیکینہ بیگم کے کہنے کی دیر تھی کہ شعیب علی ہتھے سے اٹھ گیا اور وہ بہت زیادہ جوشیلا تھا۔

”کس سے پوچھ کر آپ نے میری زندگی کا فیصلہ کیا ہے؟“

”کیا میرا اتنا بھی حق نہیں؟“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”حق..... میں کسی حق کو نہیں مانتا۔ میں اپنی پسند سے شادی کروں گا۔ میں کسی کو یہ اختیار نہیں دے سکتا کہ وہ میری زندگی کا فیصلہ کرتا پھرے۔“ شعیب علی بھڑک اٹھا۔

”کسی کون؟..... آخر میں تیری ماں ہوں۔ کیا والدین کو اتنا حق بھی نہیں؟ اتنا بھی تم اختیار نہیں دینا چاہتے کہ وہ اپنی مرضی سے بہولا لیں؟“

”یہ بتائیے کہ زندگی میں نے گزارنی ہے یا آپ نے؟“ شعیب نے دونوں ہتھیلیاں پلنگ کی پٹی پر ٹکا کر سیکینہ بیگم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”آخر وہ ہمارے ساتھ رہے گی۔“

”ضروری نہیں کہ میری بیوی آپ لوگوں کے ساتھ رہے۔ مجھے گاؤں بالکل پسند نہیں۔“ شعیب علی ترشی سے بولا۔

”کیا کہہ رہا ہے تُو؟..... آخر صفدر بھی تو ہے۔“ سیکینہ بیگم نے ہولے سے کہا۔

”صفدر بھائی اور مجھ میں بہت فرق ہے، سمجھیں آپ؟“ شعیب نے مٹھی بند کر کے انگوٹھا اپنے سینے پر رکھتے ہوئے چٹانوں کی سی سختی سے کہا۔

”میں کچھ نہیں جانتی..... تُو وہی کرے گا، جو میں چاہوں گی۔ وہی لڑکی رنگ محل کی بہو بنے گی، جو ہماری ہم پلہ ہوگی اور ہمارے خاندان کی ہوگی۔ یہ برسوں پرانی ریت چلی آ رہی ہے۔“ سیکینہ بیگم کو بھی اشتعال آ گیا۔ وہ پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مارے غصے کے

اُن کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور نتھنے پھڑک رہے تھے۔

”میں کسی روایت یا رسم کو نہیں جانتا۔ میں وہی کروں گا، جو میرا جی چاہے گا۔ میں آپ لوگوں کی بے ٹکی روایات کو بدلنا چاہتا ہوں۔ میں کسی صورت آپ کی پسند سے شادی نہیں کر سکتا۔“

”شعیب! میں تجھے دودھ نہیں بخشوں گی۔“ سیکینہ بیگم نے آخری حربہ آزمایا جس سے زیادہ ہمیشہ سے زیر کیا جاتا رہا ہے۔

”زیادہ روایتی قسم کی ماں نہ بنیں۔ جو میں نے کہہ دیا ہے، اس سے ایک انچ نہیں بڑھو گا۔“ شعیب پر کوئی اثر نہ ہوا، وہ اسی ہٹ دھرمی سے بولا۔

”تُو میری بات نہیں مانے گا؟..... تُو نے اگر اپنی پسند سے شادی کی نا تو تجھے میری بات کبھی پڑے گی شعیبی!“ وہ رُندگی ہوئی آواز میں بولیں۔

”بس، بس..... مجھے نہیں ضرورت ان فلمی مکالموں کی۔“ شعیب ہاتھ اٹھا کر بولا۔

”شعیب.....!“ اُس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی سیکینہ بیگم کا ہاتھ اٹھا اور شعیب علی کے گال پر جم گیا۔ آخر وہ ماں تھیں، کہاں تک بیٹے کے ہاتھوں اپنی تذلیل برداشت کرتیں۔

”بول..... میری بات مانے گا؟“ سیکینہ بیگم نے اسے جھجھوڑ ڈالا۔

”نہیں۔“ شعیب کے ہونٹ بھنج گئے اور آنکھوں میں شرارے لپکنے لگے۔

”کیوں؟..... ذلیل، کمینہ، پاجی! کیوں نہیں مانتا میری بات؟“ سیکینہ بیگم رو دیں۔

”اگر میں نے ذرا سی بھی بزدلی دکھائی تو آنے والا وقت مجھے چاچا شوکی بنا دے گا۔ اور میں تاریخ کو دہرانا نہیں چاہتا۔ میں چاچا شوکی نہیں بننا چاہتا۔“ شعیب علی نے یہ سب کچھ سوچتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا، جو روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”میں طالب سے کہوں گی۔ پھر دیکھوں گی، کیسے نہیں مانتا تُو۔“

”ان کے لئے بھی میرا یہی جواب ہے۔“ شعیب علی کا لہجہ اتنا سخت تھا کہ سیکینہ بیگم رونا دھونا بھول کر حیران و ششدر اسے دیکھ گئیں، جسے باپ کا بھی ڈر نہ تھا۔



سب بڑے کمرے میں جمع تھے۔ پورا کمرہ دودھیا روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ کھڑکیوں کے پرے کھنچے ہوئے تھے۔ چودھری شوکت علی کھڑکی میں کھڑے، کھڑکی کے ساتھ لگی چینی کی ٹیل کے پھول توڑ توڑ کر انگلیوں سے مسلتے جا رہے تھے۔ انہیں علم نہیں تھا کہ کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ تو پھولوں کو مسلتے جا رہے تھے۔ ان کا ذہن بالکل خالی تھا۔ سوچنے سمجھنے کی تمام تر صلاحیتیں جیسے مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں۔ کوئی بھی سوچ ذہن کے کسی بھی روزن سے باہر نہیں ہو رہی تھی۔ دماغ ایک زنگ آلود سلیٹ کی طرح تھا، جس پر کچھ بھی نہیں لکھا جا سکتا تھا۔

آج چودھری طالب علی نے رات کے کھانے کے بعد سارے بڑوں کو بڑے کمرے میں جمع کیا تھا۔ چودھری شجاعت اپنی بیوی فاطمہ کے ساتھ موجود تھے۔ زہرہ بیگم بھی سیکینہ بیگم کے ساتھ ہی صوفے پر براجمان تھیں۔ چودھری طالب علی بڑی سی کرسی پر شان و شوکت



سے بیٹھے تھے۔ ان کے قریب ہی صوفہ اور کمرے کے پچھوں بیچ شعیب علی بڑے سے فائزر کے نیچے کھڑا تھا، جس کی روشنی میں اس کے چہرے کے تاثرات کچھ عجیب لگ رہے تھے۔ سب کی نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں، مگر اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ مکمل طور پر باغی ہو گیا تھا۔ وہ کیسے پھرے عہد سے پھر جاتا۔ اس کے چچا شوکی ہی طنز کرتے۔ ”بس، اتنے دعوے کرنے تھے۔ اتنی ہی ہمت تھی؟“ اور شعیب یہ جملہ نہیں سننا چاہتا تھا۔ وہ ان کھوکھلی روایات کو توڑنا چاہتا تھا، جو انسان کو بھی کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ ان رسموں اور ریتوں میں کوئی جان نہیں، مگر پھر بھی لوگ انہیں نبھانے کے لئے اپنے پیاروں کا دل دکھاتے ہیں، اپنی پگڑی اوپھی رکھنے کی خاطر کتنی محبتوں اور کتنے ہی دلوں کا خون کرتے ہیں۔

اب تو شعیب علی کسی صورت بھی اپنے بابا جان کی بات نہیں مان سکتا تھا۔

وہ خوب صورت نیوٹن والی سادہ سی، معصوم صورت رضیہ اس کے من کے بند دروازے پر دستک دیتے ہوئے اتنی تیزی سے اندر داخل ہوئی تھی کہ شعیب کو خود بھی پتہ نہ چلا تھا اور اب دل اس کے حصول کے لئے چلا جا رہا تھا کیونکہ اس نے اس آفاقی جذبے کا مزہ چکھ لیا تھا، جسے محبت کہتے ہیں۔ تبھی تو بے قرار تھا۔ رضیہ کے دل کی دھڑکنوں سے اپنی دھڑکنیں ہم آہنگ کرنا چاہتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا، جب رضیہ اس کی ہو جاتی۔

چودھری طالب علی، شعیب علی کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہے تھے۔ سیکنہ بیگم نے انہیں ایک ایک لفظ بتا دیا تھا اور ان کا خون کھول اٹھا تھا۔ آج تک کسی میں بھی اتنی جرأت نہیں ہوئی تھی کہ چودھری طالب علی کے فیصلے سے انحراف کر سکے۔ جو وہ چاہتے، اسی پر عمل کیا جاتا۔ شوکت علی نے ان روایات کو توڑنے کی کوشش کی تھی، جو ان کے باپ دادا کی میراث تھیں، تب چودھری طالب علی نے انہیں ایسی سزا دی کہ وہ اب ساری زندگی بڑے اور سستے رہیں گے۔ چودھری طالب علی کا خیال تھا کہ چودھری شوکت علی بیٹی سے ملنے نہیں جاتے۔ مگر یہ ان کی بھول تھی۔ بھلا کوئی شخص اپنی اولاد سے بھی دور رہ سکتا ہے؟ کمرے میں سکوت طاری تھا اور سب فیصلہ سننے کے منتظر تھے۔ تب چودھری طالب علی کی گرج دار آواز گونجی۔

”شعیبی! تجھے پتہ ہو گا کہ تجھے کیوں بلایا گیا ہے؟“

”جی ہاں!“ وہ نہایت اطمینان سے بولا۔

”پھر کیا ارادہ ہے تیرا؟“ انہوں نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں اپنے ارادے سے امی جی کو باخبر کر چکا ہوں، تبھی تو آپ نے یہاں بلایا ہے۔“

آپ کو میرے ارادے کا علم ہو تو چکا ہے۔“ شعیب نے بغیر کسی گھبراہٹ کے جواب دیا۔

”شعیبی!.....!“ چودھری طالب علی نے سرخ سرخ آنکھوں سے اس گھورا۔ ”زیادہ

ندہ چھی نہیں ہوتی۔“

”میں ضد نہیں کر رہا۔“ شعیب علی نے نہایت رसान سے جواب دیا۔

”پھر جو کچھ تو کر رہا ہے، اسے کیا نام دیا جائے؟“ وہ گرجے۔

”میں نے حق بات کی ہے۔ ہر شخص کو اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق ہے۔ خدا بھی جب بچے کو پیدا کرتا ہے تو اسے رسموں رواجوں کی زنجیروں میں جکڑ کر دنیا میں نہیں بھیجتا۔“

”ہم تجھے جکڑ تو نہیں رہے۔“ چودھری طالب علی اس کی بات کاٹ کر تیزی سے بولے۔

”یہ جکڑنا نہیں ہے کیا؟ میں ایسی لڑکی کے ساتھ بندھ جاؤں، جو مجھ سے عمر میں بڑی

ہو۔ کیا مجھے اتنا اختیار نہیں کہ میں اپنی مرضی سے شادی کر لوں؟“ شعیب نے کہا۔

”تو کیا ہمیں اتنا اختیار نہیں کہ ہم اپنی مرضی سے بہو لائیں؟“ انہوں نے اُلٹا اس سے

سوال کر دیا۔

”میں آپ لوگوں کی مرضی کا پابند نہیں بننا چاہتا کہ ساری زندگی دار پر لٹکا رہوں۔ نہ

بدلے، نہ زندگی ملے۔“ شعیب کا لہجہ اونچا ہو گیا۔

”آخر کیوں؟..... کیوں نہیں ہماری مرضی پر تو چلنا چاہتا.....؟“ چودھری طالب علی

نے ترشی سے پوچھا۔

”ہر بات کا جواب نہیں دیا جاتا۔“ شعیب علی نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔

”شعیبی!..... جانتا ہے تو کس سے مخاطب ہے؟“ چودھری طالب علی مارے جوش کے

کسی سے کھڑے ہو گئے۔

”جی ہاں۔ چودھری طالب علی سے۔“ شعیب علی کو ان کے غصے کی پروا نہ تھی۔

”شہر جا کر تو ادب و لحاظ تک بھول بیٹھا ہے۔ میں تیرا باپ ہوں۔“ چودھری طالب علی

ٹرائے اور مٹھیاں بھینچتے ہوئے آگے بڑھے۔

”باپ۔“ شعیب علی تمسخر سے ہنسا۔ اس کی ہنسی نے چودھری طالب علی کو آپے سے باہر

کر دیا، مگر وہ ضبط کر گئے ورنہ شعیب علی کو مار بیٹھتے۔ وہ اور نزدیک آئے۔

”اؤئے، شہر میں باپ سے بات کرنے کا یہی ڈھنگ سکھایا جاتا ہے؟“ انہوں نے

شعیب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”آپ بھی تو باپ بن کر بات کریں۔ روایتی زمیندار کیوں بن رہے ہیں؟“ وہ نہایت

اطمینان سے بولا۔

تب چودھری شوکت علی کھڑکی میں کھڑے ایک دم گھوڑے۔ وہ سب باتیں سن

چکے تھے۔ ان کی سانسیں تیزی سے چل رہی تھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ شعیبی نے اپنے بابا کی



آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔ ان کی روح تک لرز اٹھی۔ ان کے لبوں پر ہنسی  
گیا۔ پھر وہ چوٹے۔ کیونکہ چودھری طالب علی، شعیب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نہایت  
رہے لہجے میں بول رہے تھے۔  
”شعیبی! ایک بات سچ سچ بتا۔“

”پوچھئے۔“ شعیب نے کہا۔ اُس کی سرکشی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔  
”دیکھ، جھوٹ مت بولنا۔“ چودھری طالب علی نے ان کے کندھے کو مضبوطی سے پکڑا۔  
ان کی نظریں شعیب علی کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔

”جھوٹ بولنے کی مجھے ضرورت نہیں ہے..... میں جھوٹ بولنے والوں کو بزدل سمجھتا  
ہوں اور میں بزدل نہیں ہوں کہ جھوٹ بول کر اپنی جان بخشی کراؤں۔“ شعیب علی نے  
نہایت رمان سے جواب دیا۔

”کیا تو شہر میں کسی لڑکی کو پسند کرتا ہے؟“ چودھری طالب علی نے بغیر کسی پس و پیش  
کے شعیب علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ نظروں ہی نظروں میں ٹٹولنے والا انداز آیا  
تھا، جیسے دل کی تہوں میں چھپے راز کا پتہ چلانا چاہتے ہوں۔

کمرے میں موجود ہر فرد خاموش اور متحیر تھا۔ اس اچانک اور غیر متوقع سوال کی کسی کو  
بھی امید نہ تھی۔ مگر شعیب علی جانتا تھا کہ اس سے یہ سوال ضرور پوچھا جائے گا۔ ابھی وہ  
ہونٹوں پر بڑی سندر سی مسکراہٹ سجائے چودھری طالب علی کو دیکھتے ہوئے ٹھنڈی سانس  
لے کر بولا۔

”کاش بابا جان! ایسی بات ہوتی۔“

”پھر انکار کی وجہ؟“ چودھری طالب علی جھنجھلا کر رہ گئے۔ بھائیوں اور بھابیوں کے  
سامنے ان کی کتنی سبکی ہو رہی تھی۔ مگر آج ان کا اپنا بیٹا بغاوت پر آمادہ ان  
کے سامنے کھڑا تھا۔ اگر کل کوئی اور اپنی بات منوانے کے لئے رنگ و گل کی عزت خاک میں  
لاتا تو وہ کیا کر لیتے؟ اس لئے وہ ایسا وقت ہی نہیں آنے دینا چاہتے تھے۔ سانپ کے سر  
اٹھانے سے پہلے ہی کچل دینا چاہتے تھے۔

”میں نے تم سے انکار کی وجہ پوچھی تھی۔“ چودھری طالب علی اسے خاموش دیکھ کر  
گرے۔

”صرف ایک وجہ ہے اور وہ یہ کہ میں چاچا شوکی نہیں بننا چاہتا، اپنے سے بڑی عمر کی  
لڑکی سے شادی کر کے اس کے اشاروں پر نہیں ناچنا چاہتا۔“ شعیب علی نے اتنے اطمینان  
سے کہا جیسے وہ بات اسے لوگوں کے بارے میں کہہ رہا ہو جن کا اس گھر میں وجود ہی نہ ہو۔  
زہرہ بیگم پہلو بدل کر رہ گئیں اور چودھری شوکت علی کے لبوں کا تبسم اور بھی گہرا ہو گیا۔

”شہینہ تم سے صرف چند سال بڑی ہے اور پھر یہ دیکھو، وہ اپنے ساتھ کتنی دولت اور  
تہادار رہی ہے۔ تہادارٹ ہے وہ۔“ سیکینہ بیگم پہلی بار بولیں۔

”آپ کی تان تو ہمیشہ دولت پر آ کر ٹوٹتی ہے۔ دولت، وراثت..... مجھے نہیں  
ضرورت ان چیزوں کی۔“ وہ چیخ پڑا۔ ”میں تو یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ میری بیوی مجھ  
سے چند دن بڑی ہو اور آپ سالوں کی بات کر رہی ہیں۔“

”تم بھی انہوں نے خواب مت دیکھو۔ کیونکہ یہ سراسر حماقت ہے۔“ چودھری طالب علی  
نے ہونٹ کھینچ کر سختی سے کہا۔ ”اگر وہ تم سے دس گیارہ سال بڑی ہے تو کیا مضائقہ ہے؟ تم  
حضور اکرم ﷺ کی مثال سامنے رکھو، جن سے بی بی خدیجہؓ پورے پندرہ سال بڑی تھیں۔“  
چودھری طالب علی بولے۔

”بڑی جلدی اس مثال کا خیال آیا، بابا جان!“ شعیب نے سپاٹ لہجے میں کہا۔  
”صرف میں حضور اکرم ﷺ کی مثال دے رہے ہیں۔ اور بھی تو مثالیں دیں۔ انہوں نے  
کبھی مسلمانوں میں امیر غریب کے فرق کو ترجیح دی؟ کبھی گورے کو کالے پر فوقیت دی؟“  
”تو تو بات کو کہیں سے کہیں لے جاتا ہے۔“ چودھری طالب علی اس کی بات کاٹ کر  
گرے۔

”بہتر ہے کہ آپ مذہبی مثالیں نہ دیں۔ آپ کے پاس ایک مثال ہے اور میں آپ کو  
ہزاروں مثالوں سے قائل کر سکتا ہوں۔“ شعیب علی نے ٹیکھے لہجے میں کہا۔

”شعیبی! وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ بہت سیدھی سادی، تجھ سے دب کر رہے گی۔“ سیکینہ  
بیگم نے سمجھانا چاہا۔

”یقیناً..... مثال سامنے ہے، دب کر رہنے والی۔“ شعیب علی نے زہرہ بیگم کی طرف  
اشارہ کیا۔

”امی! جو لڑکیاں جہیز میں زینیں لاتی ہیں نا، وہ رعب بھی بہت جھاڑتی ہیں۔“  
شعیب بولا۔

”جب تو کسی کو پسند نہیں کرتا تو پھر ہماری پسند کو قبول کر لے۔“ سیکینہ بیگم بولیں۔

”کیوں کر لوں؟ کیا میری اپنی کوئی رائے، کوئی پسند نہیں ہے؟“ شعیب چمک کر بولا۔  
”صفر بھی تو ہے۔“ چودھری طالب علی بولے۔ ”اس نے بھی ہماری بات مانی ہے۔“

”اُس نے جہاں اس کا رشتہ طے کیا، اس نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔ تم بھی یہی کرو۔“  
”میں نے امی جی سے بھی کہا تھا کہ صفر اور مجھ میں بہت فرق ہے۔“ شعیب نے  
ان سے کہا۔

”کیا تجھ میں لعل لگے ہیں؟..... شہر میں انوکھا ٹوٹی پڑھا ہے۔ آخر صفر نے بھی تو



پورے پانچ سال شہر میں گزارے ہیں، تجھ پر ہی شہر کا رنگ پڑھا ہے؟“ چودھری طالب علی نے  
کا غصہ بڑھ گیا۔

”آپ جہاں میری شادی کرنا چاہتے ہیں، وہاں صفر بھائی کی کیوں نہیں کر رہا؟  
میرے خیال میں عمروں کا بہت کم فرق رہ جاتا۔“ شعیب نے رائے دی۔

”بکواس نہ کر۔ تیری ماں نے شروع ہی سے فضل بھائی کو زبان دی ہوئی تھی۔  
چودھری طالب علی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”شوکی! تو اسے سمجھا۔“ چودھری طالب علی  
نے قریب کھڑے چودھری شوکت علی سے مدد طلب کی۔

”میں کیا سمجھاؤں؟ آپ کی اولاد ہے۔ آپ کی طرح خاندان کا اچھا برا سمجھتی ہے۔“  
چودھری شوکت علی جو بڑی دلچسپی سے سب کا ردوائی دیکھ رہے تھے، مسکرا کر بولے۔

”تو ہمیشہ انہونی بات کرتا ہے۔“ چودھری طالب علی پھر ہی تو گئے۔ ہر طرف سے  
انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ دونوں چاچا بھتیجا انہیں جھکانے پر تلے ہوئے تھے۔  
”پھر رائے کیوں لیتے ہیں؟“

”شعیبی کو بگاڑنے میں تیرا ہی ہاتھ ہے۔“ چودھری طالب علی گرم ہو گئے۔  
”ہاں..... سارے جرم میرے ہی ہیں۔“ چودھری شوکت علی، بھائی کے الزام پر ڈکی  
ہو گئے۔

”شوکی چاچا کو الزام مت دیجئے بابا جان! میں بچہ نہیں ہوں کہ اپنا اچھا برا نہ کچھ  
سکوں۔“ شعیب نے باپ سے کہا۔

”تم..... تم اپنا اچھا برا سمجھو گے؟“ چودھری طالب علی تسخّر سے ہنسے۔ ”ابھی تم نے دیکھا  
ہی کیا ہے؟ تم کو دنیا کی چالوں کا پتہ نہیں ہے۔ یہ دنیا بڑی کٹی شے ہے، پتھر! تجھے نہیں پتہ۔“  
”ہاں..... مجھے پتہ ہے۔“ شعیب نے انگلیاں چٹختے ہوئے جواب دیا۔

درست ہے کہ ہم برسوں کسی کے ساتھ رہتے ہیں مگر اسے سمجھ نہیں سکتے۔ آج کل لوگ کس  
طرح اپنوں کے گلے کند چھری سے کاٹتے ہیں اور پھر انہیں چیخنے چلانے کا موقع بھی نہیں  
دیتے۔ میں سب جانتا ہوں، تبھی تو میں اپنوں میں گھل مل کر رہنا نہیں چاہتا۔ اپنے اپنے زخم  
لگاتے ہیں، جو کسی بھی مرہم سے مندمل نہیں ہوتے۔“ شعیب علی اپنے بابا کی آنکھوں میں  
رکھتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا اور چودھری طالب علی بھی غصہ ضبط کرنے کی  
کوشش میں ٹھٹھیاں بھیجے جا رہے تھے۔

”ہمارے بزرگ کہتے آئے ہیں کہ اپنا مارے، چھاؤں میں ڈالے۔ غیر مارے، دھوپ  
میں ڈالے۔“ وہ غڑائے۔

”اب اس مقولے کو الٹ دیجئے۔“ شعیب علی نے نہایت اطمینان سے مشورہ دیا۔

”شعیبی! تو حد سے بڑھ رہا ہے۔“ چودھری طالب علی کا جی چاہا، پتھروں سے اس کا  
چہرہ بگاڑ دیں مگر وہ ضبط سے کام لے رہے تھے۔ پھرے ہوئے شیر کا نشانہ نہیں لینا چاہئے،  
یہ وہ جانتے تھے۔

”آپ کیوں میری حد سے مجھے نکالنا چاہ رہے ہیں؟“  
”تجھے ہمارا حکم ماننا ہوگا، ورنہ.....“ چودھری طالب علی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”ورنہ کیا؟..... یہی کریں گے نا آپ کہ مجھے جائیداد سے واقف کر دیں گے۔ اور کیا  
کریں گے؟ یہ بھی آپ بصد شوق کریں۔ مجھے آپ کی دولت کی ضرورت نہیں۔ مجھے اپنے  
بازوؤں پر بھروسہ ہے۔ اس دولت سے بھی زیادہ کما سکتا ہوں میں..... میں لہلہاتے کھیتوں  
والی زمینوں کا چودھری بننے کی خاطر اپنی جوانی داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ میں بیوی کا گھونگھٹ  
اٹ کر اسے بیوی ہی دیکھنا چاہتا ہوں، گورنس نہیں۔“

شعیب علی کا لہجہ اتنا سخت تھا کہ چودھری طالب علی کانپ کر رہ گئے۔ انہیں یوں لگا،  
جیسے یہ شعیبی نہیں، شوکی بول رہا ہو۔ شعیبی کے منہ میں شوکی کی زبان ہو۔ وہ جو کچھ سے کہنا  
چاہتا تھا، خود تو نہ کہہ سکا مگر مجھے نیچا دھانے کے لئے شعیبی کے ذریعے کہلوا دیا۔ اب شوکی،  
بٹے کو باپ کے مقابل لے آیا ہے۔ انہوں نے اپنا چکرانا ہوا سر دونوں ہاتھوں میں تھام  
لیا۔ وہ لڑکھڑا گئے۔ سیکنہ بیگم تیزی سے آگے بڑھیں۔ شجاعت علی نے بھائی کو تھاما اور کرسی پر  
بٹھا دیا۔ صفر پانی لینے دوڑا اور چودھری طالب علی گہری سانسیں لینے لگے۔ چودھری شوکت  
علی اپنی جگہ گم سم کھڑے تھے۔ انہیں شعیب علی سے اس قدر سخت رویے کی اُمید نہیں تھی۔  
ایسا تو انہوں نے سوچا بھی نہ تھا کہ شعیبی ان کی محبت میں والدین کی عزت و احترام بھی بھول  
جائے گا، خاندان کے سربراہ چودھری طالب علی کی سب کے سامنے بے عزتی کر دے گا۔

چودھری طالب علی کو بھی یہ اُمید نہیں تھی کہ شعیبی سے یوں منہ در منہ اتنی بحث ہوگی۔  
تبھی تو انہوں نے سب کے سامنے اس سے بات کی تھی تا کہ دوسرے بھی بغاوت کے متعلق  
نہ سوچیں، بس ان کے غلام رہیں۔ ان کا خیال تھا کہ بس ایک دو دھمکیوں سے وہ سیدھا ہو  
جائے گا۔ مگر وہ بھی انہی کا بیٹا تھا، انہی کی طرح ضدی اور ہٹ دھرم، جو اپنی بات سے ایک  
انچ بھی نہیں ہٹتا چاہتا تھا۔ وہ کسی بھی قسم کی بزدلی نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ ایک  
بار جھکا تو ہمیشہ چودھری طالب علی کا پاؤں اس کی گردن پر رہے گا۔ اور ویسے بھی رضیہ اُسے  
اتنی اچھی لگی تھی کہ وہ اس سے دستبردار ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اُسے تو حیرت تھی کہ  
بھلا اتنی جلدی بھی ایسی طوفانی محبت ہو سکتی ہے؟ اور چودھری طالب علی تھے کہ بھائی کے  
غلاف میں شکوک و شبہات میں پڑ گئے تھے۔ طرح طرح کے خیالات ان کے ذہن میں چکر  
لگا رہے تھے۔



”شوکی مجھ سے بدلہ لینا چاہتا ہے..... ہم باپ بیٹے میں بھڑٹ ڈال کر اپنے دل کے ٹکڑے جوڑنا چاہتا ہے۔ مگر شوکی! میں کبھی بھی تجھے تیرے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا..... تُو ہمارے گا اور جیت ہمیشہ کی طرح میری ہوگی۔ رنگ محل کی روایات کی جیت ہوگی۔ تُو پھر ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ اور شعبی تجھے سیٹھ نہ آئے گا۔“ وہ کرسی کی پشت سے سرٹیکے مسلسل سوچے جا رہے تھے۔

”لالہ! آپ ذہن پر زور نہ دیں، زیادہ۔ بچہ ہے، ٹھیک ہو جائے گا۔“ چودھری شجاعت علی نے بھائی کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ حیران تھے کہ شعبی ان کا بیٹا ہوتے ہوئے کیسے پٹر پٹر بول رہا ہے، جبکہ وہ خود آج تک بڑے بھائی سے آنکھ ملا کر بات نہ کر سکے تھے۔ اتنا رعب تھا چودھری طالب علی کا۔

”طالب! یہ ضدی اور ہٹ دھرم، آئی دولت کو ٹھوکر مار رہا ہے، مگر بعد میں پچھتائے گا۔ ایسے لڑکے بعد میں پچھتاتے ہیں، جنہیں بغیر محنت کے سب کچھ ملے۔ آپ فکر نہ کریں، میں وہاں انکار کر دوں گی۔ ہم امجد کا رشتہ طے کر دیں گے۔“ سیکینہ بیگم نے شوہر کو دلاسا دیا۔

”امجد کا۔“ شعبی علی زور سے ہنسا تو چودھری طالب علی ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور غور سے شعبی کو ٹکنے لگے۔

”اب تجھے کیا دکھ ہے؟“ انہوں نے جبرے سے بھیج کر پوچھا۔ ان کے ہنسنے پر ان کا خون کھول اٹھا

”ایک بات بتائیں امی جی! آپ آخر شہینہ ہی کو اس گھر میں کیوں لانا چاہتی ہیں؟“ شعبی نے ماں کے قریب آ کر پوچھا۔

”اس کے آنے سے تمہارا بھائی تم سے زیادہ دولت مند ہوگا۔ تم جل کر کوئلہ ہو جاؤ گے۔ اس کی دولت دیکھ کر تمہارے سینے پر سانپ لوٹیں گے۔“ سیکینہ بیگم بولتی چلی گئیں۔

”محبت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دولت نہیں۔ جس کے پاس محبت ہے، وہ دنیا کا امیر ترین آدمی ہے۔ دولت کے چمکتے سسکوں سے بھلا آج تک کسی نے محبت خریدی ہے؟“ شعبی نے نہایت بے پروائی سے کہا۔

”مسلل بکواس سے تنگ آگئی ہوں۔“ سیکینہ بیگم خجل ہو گئیں۔

”آپ کو باہر ہی کی لڑکیاں نظر آتی ہیں۔ گھر کی لڑکیاں نظر نہیں آتیں؟“ شعبی نے تیزی سے کہا۔

”کیا مطلب؟“ سیکینہ بیگم نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”مطلب یہ کہ امجد بھائی پینا کو پسند کرتے ہیں۔ آسان لفظوں میں بتا دوں، محبت کرتے ہیں۔“ شعبی علی نے گویا دھماکا کر دیا۔

سب سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے اور چودھری شجاعت علی کو یوں محسوس ہوا جیسے شیب علی نے انہیں سر راہ گالی دے دی ہو۔ سب اس انکشاف پر حیران تھے۔

”شعبی!..... تجھے میری بیٹی پر الزام لگانے کی ہمت کیسے ہو؟“ چودھری شجاعت علی انہیں بھینچتے ہوئے آگے بڑھے ہی تھے کہ صفدر اور سیکینہ بیگم نے انہیں پکڑ لیا۔

”میں نے پینا کا نام تو نہیں لیا۔ یہ تو نہیں کہا کہ پینا بھی اسے پسند کرتی ہے۔ میں نے امجد کی پسند کے بارے میں کہا ہے اور آپ لالہ پیلے ہو رہے ہیں۔“ شعبی کو بھی غصہ آ گیا، جی چاہا کہہ دے کہ آپ کی صاحبزادی بھی امجد کو پسند کرتی ہے۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے، جوان بیٹیوں کے ہوتے ہوئے بھی آنکھیں کھلی نہیں رکھتے، پھر کہتے ہیں کہ اولاد میرا کرتی ہے۔

”سوچ کہہ رہا ہے شعبی؟“ چودھری طالب علی کی گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

”آپ امجد بھائی کو بلا کر پوچھ لیں۔ اگر میری طرح حوصلہ مند ہوئے تو بتا دیں گے، ورنہ ساری زندگی تڑپتے رہیں گے اور میرے خیال میں تو یہ مناسب رشتہ ہے۔ پینا اور امجد بھائی کا جوڑ ہے۔ پھر پینا گھر کی لڑکی ہے۔ اس طرح بھائیوں میں رشتے اور مضبوط ہوں گے۔ آپ امجد بھائی کے پنڈی جانے سے پہلے ہی رسم ادا کر دیں تو اچھا ہے۔“ شعبی علی نے بڑوں کی طرح سمجھاتے ہوئے کہا۔

تب چودھری طالب علی نے عجیب سی نظروں سے چودھری شجاعت علی اور فاطمہ بیگم کی طرف دیکھا اور سوچنے لگے، اگر امجد بھی شعبی کی طرح میرے سامنے بول پڑا تو میں تو جیتے بجا مر جاؤں گا۔ میری کوئی عزت، کوئی رعب باقی نہیں رہے گا۔ میری کوئی حیثیت نہیں رہے گی۔ میں ایک عضو معطل کی طرح رنگ محل کے ایک کونے میں پڑ جاؤں گا۔ یہ نئی نسل بہت باغی ہے، یہ کسی کا احترام کرنا نہیں جانتی۔ اپنی من مانی کرنا چاہتی ہے۔ اسے اپنے بازوؤں پر بہت مان ہے۔ انہیں ضرورت نہیں ستونوں کی۔ پھر انہوں نے ایک لمحے کے ہزارویں لمحے میں فیصلہ کر لیا اور نہایت دھیمی آواز میں چودھری شجاعت علی سے کہا۔

”تمہاری کیا رائے ہے شجاعت؟“

”میں سمجھا نہیں۔“ چودھری شجاعت علی حیران تھے۔ انہیں تو اس سوال کی توقع نہ تھی

”شعبی ٹھیک کہتا ہے۔ اس طرح ہم بھائی اور مضبوط ہو جائیں گے۔ گھر کی لڑکی گھر کے لیے ہے تو کیا مضائقہ ہے؟“ چودھری طالب علی بولے۔

”آپ مختار ہیں لالہ! جو چاہیں کریں۔ پینا آپ کی بیٹی ہے۔“ چودھری شجاعت علی نے نہایت محبت سے چودھری طالب علی کا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگا لیا۔



”زندہ باد چاچا!“ شعیب علی مارے خوشی کے چودھری شجاعت سے لپٹ گیا۔ وہ تو اس طرح خوش ہو رہا تھا، جیسے امجد کی بات طے نہیں ہوئی بلکہ اس کی اپنی شادی کا اعلان ہو رہا ہو۔ اسے کہتے ہیں مقدر کی باتیں۔ یہاں جمع ہوئے تھے میرا رشتہ کرنے کو اور ہو گیا ہجر کا۔ جوڑ توڑ آسمان پر بنا دیئے جاتے ہیں، بندے یونہی لڑتے بھڑتے ہیں۔“

”تم بچ نہیں سکتے۔“ سیکرہ بیگم کے لب مسکرائے۔

”پلیز امی جی! اس ذکر کو چھوڑیے، پہلے ان دونوں سے نمٹئے۔“ شعیب کا اشارہ منظر اور امجد کی طرف تھا۔ ”اور ان لوگوں کو صاف کہہ دیجئے کہ وہ اپنی بیٹی کو بیاہ دیں۔ آج کل بھی دولت کے بہت لالچی مل جائیں گے، جو ان کی عمر رسیدہ بیٹی کو جہیز کے عوض قبول کر لیں گے۔“ شعیب علی نے نہایت سفاکی سے کہا اور کوئی جواب سنے بغیر کمرے سے جانے لگا تو طالب علی کی بارعب اور گرج دار آواز نے اس کے قدم روک دیئے۔

”تو سنو شعیب علی!..... اگر تم ہٹ دھری پر اتر آئے ہو تو میں بھی اپنی ضد کا پکا ہوں۔ تم میرے گھر سے ابھی اور اسی وقت نکل جاؤ۔ آج سے تم میرے لئے مرچکے ہو۔ تم میری دولت میں سے ایک پیسے کے بھی حق دار نہیں ہو۔ اور ہاں، تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور تم واپس آنا چاہو تو ایک سال کے اندر اندر واپس آ جانا۔ پھر جو ہم چاہیں گے، وہی ہو گا۔ یہ ذہن میں رکھ کر رنگ محل میں قدم رکھنا۔ نہیں تو میں سمجھوں گا کہ میرا تیسرا بیٹا تھا ہی نہیں۔“ چودھری طالب علی نہایت غصے سے بولے جا رہے تھے۔ آخر میں ان کی آواز لرز گئی تھی۔ شعیب علی ایک لمحے کے لئے تو دُکھی ہو گیا مگر پھر نارمل ہوتے ہوئے بولا۔

”بہت بہت شکریہ چودھری صاحب! اچھا ہے مجھے اس نفس سے رہائی مل گئی۔ آپ نے خود ہی پنجرے کا دروازہ کھول دیا ہے اور اب..... اب میں کبھی نہیں آؤں گا یہاں۔ آؤں گا تو اس وقت، جب آپ لینے آئیں گے۔“ شعیب علی نے مڑ کر نہایت شیکے تیکے تپوروں سے کہا اور تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

”شعیبی! سیکرہ بیگم نے تڑپ کر اس کے پیچھے جانا چاہا تو چودھری طالب علی نے لرزے ہاتھوں سے انہیں پکڑ لیا۔

”مت جاؤ سیکرہ! جب دھکے کھائے گا تو خود ہی واپس آ جائے گا۔ اسے دولت کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا۔ بڑا بازوؤں پر مان رکھتا ہے۔“ چودھری طالب علی بولے۔ انہیں یہ تو فتح نہ تھی کہ وہ یوں چلا جائے گا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ فوراً معافی مانگ لے گا۔

”طالب..... وہ میرا بیٹا.....“ سیکرہ بیگم رو دیں۔ پسوں نسرین آئے گی تو بھائی کو نہ پا کر کیا سوچے گی؟ اسے روک لو طالب۔“

”جانے دو، ناہنجار پاچی کو۔ تم یہ سمجھنا، وہ تھا ہی نہیں۔“ چودھری طالب علی نے انہیں

بھائی اور چودھری شوکت علی حیرت سے انہیں دیکھے گئے۔ تب چودھری طالب علی نے ان طرف دیکھا۔ دونوں بیانیوں کی نظریں ملیں اور چودھری طالب علی مسکرا دیئے، آنکھیں بند کر لیں۔ یہ مسکراہٹ، فتح کی مسکراہٹ تھی۔ یہ چمک جیت کی خوشی میں آنکھوں میں اتر گئی تھی۔ یہ چمک، یہ مسکراہٹ اس بات پر دلالت کر رہی تھی کہ وہ انہی سے مخاطب ہیں۔

”اب میں زبان کے بغیر بھی کہی جاتی ہیں۔“

تب چودھری شوکت علی کا جی چاہا، چیخ کر کہا۔ ”لالہ! یہی سزا آپ مجھے بھی دے دیے۔ مجھے بھی شعیبی کی طرح رنگ محل سے نکال دیتے۔ میری پوری جائیداد چھین لیتے، مگر میری مومن کو مجھ سے جدا نہ کرتے۔“ مگر ہمیشہ کے بزدل چودھری شوکت علی کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ فاطمہ اور زہرہ بیگم روتی ہوئی سیکرہ بیگم کو سہارا دے کر کمرے سے لے گئیں۔



شام آہستہ آہستہ رات کے شانوں پر چھکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پورے افق پر لالی چھائی ہوئی تھی اور یہ منظر مومن کو بہت ہی بھاتا تھا۔ وہ اور فوجی ندی کے پانی میں پاؤں ڈالے اور سورج کو تک رہے تھے۔ تبھی مومن نے شجاع سے پوچھا۔

”تو! یہ سورج کیکر کے درختوں کے پار چھپ رہا ہے نا؟“

”ارے نہیں مومنو!“ فوجی زور سے ہنسا۔ ”ہم چلتے جائیں تو بھی ہم وہاں تک نہیں پہنچ سکتے، جہاں سورج غروب ہو رہا ہے۔“

”آخر کیوں؟ وہ تو نزدیک ہی چھپ رہا ہے۔“ مومن نے حیرت سے کہا۔

”یہ یونہی نظر آتا ہے جبکہ کچھ پتہ نہیں کہ یہ کہاں چھپتا ہے؟“

”تو! آج تو شہر نہیں گیا؟“ مومن نے ایک دم بات پلٹ دی۔

”اماں کی طبیعت خراب تھی کل۔ وہ چادر پوری نہیں کر سکی۔ اس لئے آج میں نے چھٹی نہ کی۔“ شجاع نے ندی میں پاؤں مارتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔

”کیا شہر بہت اچھا ہے؟“ مومن نے معصومیت سے پوچھا۔

”نہیں..... مجھے پسند نہیں آیا شہر۔ ہمارا احمد پور ہر لحاظ سے اچھا ہے۔“ شجاع نے

”بالکل جھوٹ۔“ مومن نے سرکوشی میں جنبش دی۔

”کیوں؟“ شجاع نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”سب سے اچھا حسن پور ہے۔ میرا گاؤں۔“ وہ لہک کر بولی۔

”میرا گاؤں؟“ شجاع نے حیرت سے کہا۔

”ہاں، میرا گاؤں..... میرے بابا کا گاؤں..... جہاں بے شمار باغات ہیں۔ میرا بابا

میرا بابا



بہت امیر آدمی ہے۔ میں کسی روز اس کے ساتھ چلی جاؤں گی۔“ مومو نے انکشاف کیا۔  
”تو پاگل تو نہیں ہو گئی؟“ شجاع نے پریشانی سے کہا۔  
”میں ہمیشہ جانے کا سوچتی ہوں مگر اشو کی وجہ سے نہیں جاتی کیونکہ پھر وہ روئے  
نا؟“ مومو بولے گئی۔

”مومو! کیا ہوا ہے تجھے؟“ شجہ نے اسے جھنجھوڑ دیا۔

”کیا..... کیا ہوا؟“ مومو چہرے پر آئے بالوں کو ہٹاتے ہوئے بولی۔  
”ابھی تو کیا وہی جا ہی بک رہی تھی کہ میرا بابا بہت امیر آدمی ہے۔ جھلی تو نہیں ہو  
گئی؟“

”شجہ! تجھے یقین نہیں ہے۔ سچ کہہ رہی ہوں، میرا بابا بہت رئیس آدمی ہے۔ اتنا امیر  
ہے وہ کہ چودھری دلاور جیسے لوگ اس کی جیب میں پڑے رہتے ہیں۔“ مومو نے وہی جملہ  
دہرا دیا، جو چودھری شوکت علی نے کہا تھا۔

”کہاں رہتا ہے تیرا بابا؟“ شجاع ابھی تک حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔  
”حسن پور میں..... وہ حسن پور کا چودھری ہے۔ میں کسی دن اس کے ساتھ چلی جاؤں  
گی۔ اماں اور چاچا بہت مارتے ہیں نا۔“ مومو کی آنکھوں میں شبنم جننے لگی۔  
”نہیں، نہیں مومو!“ شجہ تڑپ کر رہ گیا۔ ”تو نہیں جائے گی..... تو نہ جانا۔“  
”وہ کیوں؟“ مومو نے حیرت سے کہا۔

”دیکھ، تو ہی تو میری ایک واحد دوست ہے۔ تو بھی چلی گئی تو میں باتیں کس سے کروں  
گا؟“ شجاع نہایت ہمتی لہجے میں بولا۔

”شجہ تو دیکھ نا، بھلا میں کیسے رہوں؟ اب عید پر بھی اماں نے مجھے وہی پچھلے سال  
والے کپڑے پہنائے تھے، جس کی شلوار چھوٹی تھی۔ میں نے کہا تو چاچا نے مجھے مارا۔“  
”آسو مومو کی پلکوں کا حصار توڑ کر گالوں پر بہہ نکلے۔“

”کیوں؟“ شجاع نے محبت سے اس کے بال سنوڑے۔  
”کہنے لگا، اب ہم کہاں سے تیرے لئے کپڑے لائیں؟ چلی جا، اپنے ذیل بابائے  
باس۔“ مومو نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”بس اب میں چلی جاؤں گی۔“ مومو آنسوؤں  
رگڑتے ہوئے بولی۔

”تو چلی جائے گی؟“ شجاع ایک دم سے دکھی ہو گیا۔ ”اڈاسیاں اس کے جی پر ہوں  
کے گالوں کی طرح برسنے لگیں۔ نہ جانے کیوں، مومو سے دوری کا اس کا جی بیٹھا  
رہا تھا۔“

”پر کیا کروں؟..... اشو کی وجہ سے میرا دل دکھتا ہے، اسے کیسے چھوڑ کر جاؤں؟“

مومو نے پریشانی سے کہا۔  
”کیا تم مجھے بھی چھوڑ جاؤ گی مومو؟“ شجاع نے بے ٹکا سوال کر دیا۔  
”اشو ہے، تم ہو۔ اچھے دوستوں کو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا شجہ! مگر بابا سے زیادہ پیاری  
ذکرنا چیز نہیں ہوتی نا۔ کوئی بندہ والدین سے زیادہ پیارا نہیں ہوتا۔ ٹھیک ہے نا؟“ مومو نے  
بے پھوٹے الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا۔

شجاع کچھ نہ بولا، بس زخمی نظروں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔  
”شجہ! تم اُداس مت ہو۔ میں جب بھی جاؤں گی، تمہیں بتا کر جاؤں گی۔ مگر تم کسی کو  
بات نہ مت، ورنہ اماں اور چاچا مجھے گھر سے نہیں نکلنے دیں گے۔“ مومو نے شجاع کے کندھے  
پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں مومو! میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ دنیا میں ملنا اور پھٹنا تو لگا ہی رہتا ہے۔ دنیا  
زیادہ وسیع نہیں ہے۔ ماسٹر صاحب کہتے ہیں، پھڑے ہوئے لوگ کبھی نہ کبھی ضرور مل جاتے  
ہیں۔“ شجاع نے مومو کا ہاتھ تھام کر نہایت خلوص سے کہا۔

”شجہ!..... تمہیں مایہ آتے ہیں؟“ مومو ہمیشہ بات سے نئی بات نکالتی تھی، جس کا  
پچھلی بات سے کوئی تعلق نہ ہوتا۔

”ادھورے ادھورے..... تمہیں آتے ہیں؟“ شجاع نے پوچھا۔  
”ہاں..... پتہ ہے، زبیدہ نے مجھے بہت سارے سکھائے ہیں۔“  
”پھر مجھے بھی سناؤ۔“ شجاع نے پکڑ پکڑی سے گھاس نونج نونج کر ندی میں پھینکتے  
ہوئے کہا۔

”نہو گے تو نہیں؟“ مومو مسکرائی۔  
”بھئی تم سناؤ تو۔“ شجاع کے کہنے پر مومو نے ندی کے بہتے صاف و شفاف پانی پر  
نظریں گاڑ دیں اور اس کے ہونٹ گنگنا اٹھے۔

کھواں تے کھاڈے ہن  
دشمن دے نہ ہوون شالا  
جیڑھے حال اساڈے ہن

”تم حسن پور جا کر مجھے یاد آؤ گی نا!“ شجاع کا ذہن تو مومو کی باتوں میں اٹکا ہوا تھا۔  
”اے..... تم تو پریشان ہو گئے۔ ابھی تھوڑی جا رہی ہوں؟“ مومو زور سے ہنس دی  
اور شجاع بھی مسکرا دیا۔









کراچی ایئر پورٹ پر جب نسرين نے شعیب علی کو دیکھا تو پھول کی طرح کھل اُٹھی۔ اُسے قطعاً اُمید نہ تھی کہ یوں یکا یک شعیب سے ملاقات ہو جائے گی۔ مارے خوشی کے نسرين کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ شعیب سے لپٹ گئی۔ شعیب نے دیکھا، نسرين شادی کے بعد پہلے سے زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی اور اس کی سیاہ آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا ہو گئی تھی۔

”تم بڑے خراب ہو شعیب!“ نسرين نے محبت سے گھر کا۔  
”نوازش۔“ شعیب یوں خوش ہوا جیسے نسرين نے اسے کوئی سہرا دی ہو۔  
”ویسے تمہیں پتہ کیسے چلا کہ ہم آ رہے ہیں؟“ فیروز نے شعیب سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”اپنے سی آئی اے کے ایجنٹ سے۔“ شعیب نے شوخی سے چودھری شوکت علی کی طرف دیکھا۔

”کیا مطلب؟“ فیروز نے حیرت سے پوچھا  
”بھئی چاچا شوکی نے فون کر کے بتایا تھا۔  
”یعنی رابطہ برابر قائم ہے۔“ فیروز بولے۔

”ان سے رابطہ تو کبھی ٹوٹ ہی نہیں سکتا۔“ شعیب ہنس کر بولا تو چودھری شوکت علی بھی مسکرا دیئے۔ پھر وہ آگے بڑھ گئے۔ نسرين بھائی کو دیکھ کر صدقے واری ہوئی جا رہی تھی۔  
کار میں بیٹھتے ہی نسرين بولی۔

”تم نے اچھا نہیں کیا شعیب! بابا کی بات مان لو نا۔“  
”کیا اچھا ہے؟ کیا برا؟ یہ میں خوب جانتا ہوں۔“ شعیب نے کار اشارت کرتے ہوئے کہا۔

”بابا جو بھی کرتے، تمہارے بھلے کے لئے کرتے۔“ نسرين بھر بولی۔  
”جی ہاں! جیسا بھلا دادا ابابا نے چاچا شوکی کے ساتھ کیا تھا، اپنے بھلے سے نہ ہونا ہی

بہتر ہے۔“ شعیب منہ بنا کر بولا۔  
”یہ یار! تم مان لیتے تو کیا حرج تھا؟ پھر اپنی مرضی سے بھی شادی کر لیتے۔ آسان طریقہ تھا۔“ فیروز نے شرارت سے کہا۔

”بی بی! ہوشیار رہنا۔ کہیں یہ اپنی مرضی نہ چلائیں۔“ شعیب نے نسرين کو متنبہ کیا تو پیچھے بیٹھے ہوئے فیروز نے ایک زوردار دھپ شعیب کے کندھے پر لگائی۔

”یہ فیروز بھائی! آپ کے ارادے خطرناک لگتے ہیں۔“ شعیب پھر بھی باز نہ آیا۔  
”مگر فیروز ٹھیک کہہ رہے ہیں شعیب! تم بعد میں اپنی مرضی سے شادی کر سکتے تھے۔“

نسرين نے شوہر کی طرف داری کی۔ پہلے تو شعیب کا جی چاہا، کہہ دے کہ چاچا کو اپنی مرضی کی شادی کرنے پر جو سزا ملی ہے کیا وہ میں بھی قبول کر لیتا؟ مگر وہ اس راز کو فاش نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لئے بولا۔

”یس، یک نہ شد دوشد۔ وہ اپنے ڈپٹی نذیر احمد کہہ گئے ہیں کہ ایک شخص کے پہلو میں دو دل نہیں ہوتے۔ تو جناب! میرے پہلو میں بھی ایک ہی دل ہے اور اس میں ایک ہی شیبہ ہے۔ باقی اللہ اللہ، خیر صلا۔“

”ریلی؟“ فیروز کی حیرت قابل دید تھی۔

”جی۔“

”تو کب کر رہے ہو شادی؟“ فیروز بولے۔

”اگر آپ مدد کریں تو اسی ہفتے۔“

”کیا مطلب؟“ نسرين چوکی۔

”بی بی! مطلب صاف ظاہر ہے کہ آپ اور فیروز بھائی میرا رشتہ لے کر وہاں جائیں۔“ شعیب نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

”بھلے مانس! ہم صرف دو روز رہیں گے، پرسوں رات کو ہمیں چلے جانا ہے۔“ فیروز نے یاد دلایا۔

”سیٹ کینسل بھی ہو سکتی ہے۔“ شعیب نے مشورہ دیا۔

”معلوم ہے، پہلے ہی میں زیادہ رہ لیا ہوں۔“ فیروز نے یاد دلایا۔

”کچھ زیادہ نہیں رہے۔ ایک ہفتے میں کوئی قیامت تو نہیں آجائے گی۔ بس صبح ہوتے ہی پہلا کام یہ کروں گا کہ آپ کی سیٹیں کینسل۔ ارے ہاں، ویزا ابھی ابھی ہے یا نہیں؟ ایسا نہ ہو کہ شادی کراتے کراتے آپ مہمان خانے کی سیر کرنے لگیں۔“ وہ شوخی سے بولا۔

”ابھی چودہ روز کا باقی ہے۔“ فیروز مسکرا کر بولے۔ ”اور ٹکٹ بھی اوکے نہیں



”وہ رفل۔“

”مگر پارا وہ لوگ مان جائیں گے؟ آخر لڑکی کا معاملہ ہے۔“ فیروز نے پوچھا۔  
”میں نے راہ کے سارے روڑے چن لئے ہیں۔“

”ابھی تمہاری تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی۔“ فیروز نے یاد دلایا۔

”ہو جائے گی۔ پہلے دلہا تو بن جاؤں۔“ شعیب نے شرارت سے کہا۔

”شادی کے بعد بیوی کو رکھو گے کہاں؟“ فیروز نے واضح طور پر نہیں کہا کہ تمہارے پاس گھر ہی نہیں ہے۔

”یہاں۔“ شعیب نے اسٹیئرنگ سے ہاتھ اٹھا کر سینے سر رکھتے ہوئے کہا۔

”پلیز، بی سیریس شعیب!“

”بھئی جہاں میں ابھی آپ کو لے جا رہا ہوں نا، وہیں رکھوں گا۔ وہ میرے دوست کی کڑھی ہے۔ اس کے والدین اسلام آباد میں رہتے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ جیسے ہی میری شادی ہوگی، وہ ہاسٹل میں شفٹ ہو جائے گا۔ جیسا کہ اب آپ لوگوں کے آنے کی اطلاع پا کر وہ ہاسٹل میں چلا گیا ہے۔“ شعیب نے انہیں اطمینان دلایا۔

چودھری شوکت علی نے حیرت سے شعیب کی طرف دیکھا، جس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ تب انہوں نے سوچا۔ شعیبی! تجھے جواب دینا آ گیا ہے اور اب مجھے شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ تُو واقعی جوان ہو گیا ہے۔ سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے کے قابل۔

”بس آپ لوگ کل میرے ساتھ رضیہ کے گھر چلیں گے۔ میں نے انہیں بتا دیا ہے۔“

شعیب نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”شعیبی! یہ کام ماں باپ کے ہاتھوں ہی اچھے لگتے ہیں اور.....“

”چھوڑیں بی بی!“ شعیب نسرین کی بات کاٹ کر بولا۔ ”ضروری تو نہیں کہ ہم والدین کے غلط فیصلے قبول کر لیں۔ شادیاں کوئی گڑبڑ کا کھیل نہیں ہوتیں۔ میں بھی انسان ہوں اور خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے عقل بخشی ہے اور میں اپنا اچھا برا سمجھتا ہوں۔“

”پھر بھی تمہیں بابا کی بات مان لینی چاہئے۔ اماں بہت پریشان ہیں، بہت روتی رہتی ہیں تمہارے لئے۔“ نسرین کی آواز بھرا گئی۔

”اگر میں اماں کے کہنے کے مطابق شادی کر لیتا تو وہی حشر ہوتا، جو چاچا شوکی کا ہوا ہے۔ چاچی زہرہ بیگم کیا کچھ نہیں کرتیں ان کے ساتھ؟ جب میں چھوٹا تھا تو سوچتا تھا کہ آخر چاچا اتنے بڑے ہو کر چاچی سے کیوں ڈرتے ہیں؟ اب پتہ چلا کہ عمر کا فرق خود بخود بچک اور خوف پیدا کر دیتا ہے۔ شادی کے لئے وہی ہم آہنگی ضروری ہے۔“

”تم غلط سمجھتے ہو شعیبی! چاچا شوکی کی جس عمر میں شادی ہوئی، یہ بہت چھوٹے تھے۔“

بیوی کے مفہوم سے نا آشنا تھے۔ اتنا شعور نہ تھا کہ زہرہ بیگم کے تقاضے پورے کر سکتے۔“ فیروز نے سمجھانا چاہا۔

”کچھ بھی ہو، میں بابا کی بات نہیں مان سکتا۔“ شعیب نے عقب نما آئینے میں فیروز کی طرف دیکھا۔ ”بس آپ دونوں کو کل میرے ساتھ جانا ہے۔“

”گر خالوجی کو پتہ چل گیا، تو؟“ فیروز نے خدشہ ظاہر کیا۔

”یہاں کوئی ایسا بندہ نہیں جو انہیں بتا دے اور اگر انہیں پتہ چل بھی گیا تو کیا کریں گے؟ ویسے بھی وہ مجھے جائیداد سے عاق کر چکے ہیں۔ اب میں جو بھی کروں، انہیں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔“

”تمہارے لہجے سے بغاوت کی بو آرہی ہے۔“

”مجھے بغاوت پر انہوں نے ہی اکسایا ہے۔ ان کے مظالم نے ان سے ان کا بیٹا چھینا ہے۔“ شعیب کے ہونٹ بھنج گئے۔

”شعیبی! یہ جوانی بڑی ظالم شے ہوتی ہے۔ بہت شدتیں ہوتی ہیں اس میں۔ انسان اس عمر میں جلد از جلد آگے بڑھنے کے جنون میں مبتلا ہو جاتا ہے، اسی لئے جوانی کو آفت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ تم بھی جوانی کے جنون میں فیصلے نہ کرو۔ کیونکہ اس عمر کے جذباتی فیصلے ناپائیدار ہوتے ہیں۔ آگے چل کر پچھتانا پڑتا ہے، مگر گزرا وقت نہیں لوٹتا۔ اس لئے جوانی کو سنجال کر خرچ کرو۔ یہ بہت بڑا خزانہ ہے۔“

”تو آپ لوگ میرے ساتھ جانا نہیں چاہتے؟“ شعیب کا لہجہ نرم تھا۔

”ہمارا یہ مطلب نہیں ہے۔ مگر میں یہ نہیں چاہتا کہ تم اپنی جوانی کے اُبال میں اپنی زندگی تباہ کر ڈالو۔ لڑکیوں کی عزت تو آئینوں کی مانند ہوتی ہے، جو ذرا سی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ جاتے ہیں۔“ فیروز اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

”میں اس سے محبت کا کھیل نہیں کھیل رہا، عام طریقے سے اسے بیوی بنانا چاہتا ہوں۔ آپ یقین کیجئے کہ ہم نے کبھی آپس میں گھل مل کر بات بھی نہیں کی۔“

”پھر معاملہ اتنا کیسے بڑھا کہ تم سیریس ہو گئے؟“ فیروز نے حیرانی سے پوچھا۔

”بس مجھے ایک دم وہ بہت اچھی لگی اور اچھی چیز کو اپنا لینا چاہئے۔“ شعیب نے کہا۔

”جیسی تمہاری مرضی۔“ فیروز نے ہار مان لی۔

”جینکس۔“

”تم نے چاچا سے تو پوچھا نہیں۔“ فیروز نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے چودھری شوکت علی کی طرف اشارہ کیا۔

”میرے چاچا بہت گریٹ ہیں، جو میری خوشی، وہ ان کی کیوں چاچا؟“ شعیب نے



ان کی طرف جھک کر پوچھا۔

”بالکل!“ چودھری شوکت علی نے سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے کہا۔  
فیروز اور نسرين حیرت سے انہیں دیکھنے لگے کہ چاچا شوکی نے تو شعیب کو کچھ بھی نہیں  
کہا، ذرا بھی تو سرزنش نہیں کی۔ آخر کیوں؟..... یہ ایک سوالیہ نشان تھا، جو دونوں کی نظروں  
کے سامنے بڑھتا جا رہا تھا۔

☆.....☆

”شیدے! اب اٹھ جا۔ میں نے علی کو تیار کر دیا ہے۔“ لالی نے سونے ہوئے شیدے  
کو جھنجھوڑ ڈالا۔ کتنی ہی بار وہ اسے آوازیں دے چکی تھی، مگر وہ تھا کہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لے  
رہا تھا۔ آج شیدے کی چھٹی تھی، اسی لئے وہ بھی لمبی تانے پڑا تھا۔

”بھئی سونے دو۔“ وہ کسمندی سے بولا۔

”علی کو سکول جانے میں دیر ہو جائے گی۔“

”امی جی! سکول نہیں، اسکول۔“ علی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

”ہاں، وہی۔“ لالی ہنس کر بولی۔

”بیٹا! تم اپنی ماں کو بھی پڑھایا کرو۔“

”امی جی تو بہت بڑی ہیں، یہ تھوڑی پڑھیں گی؟“

”کیوں نہیں پڑھیں گی؟“ شیدا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”گھر کے اتنے کام جو کرنے ہوتے ہیں۔ پڑھے تو وہ، جو پورا دماغ پڑھائی میں  
لگائے۔ ہماری بس کہتی ہیں کہ کتابوں سے دوستی کرو گے تو یہ تمہیں بلندی پر پہنچائیں گی۔“  
علی بولا۔

شیدا اسے دیکھے جا رہا تھا۔ سلیٹی ٹیکر، سفید شرٹ اور سرخ ٹائی میں وہ بہت پیارا لگ رہا  
تھا۔ سنہرے بال اس کی چوڑی پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے اور سیاہ آنکھیں ذہانت کے  
جگنوؤں سے چمک رہی تھیں۔

”تم تو حویلی کا چراغ ہو، جس نے اس غریب کے تین کمروں والے گھر کو روشن کر رکھا  
ہے۔“ شیدے نے یہ سوچتے ہوئے علی کو لپٹا کر اس کی پیشانی چوم لی۔  
”چلے ابو جی!“

”تم نے ناشتہ کر لیا؟“ رشید نے چہل پہنتے ہوئے کہا۔  
”جی۔“

”چلو!“ شیدے نے ایک ہاتھ میں علی کی کتابوں کا بیک آٹھاپو اور دوسرے ہاتھ سے  
علی کی انگلی پکڑی۔

”امی جی! خدا حافظ۔“ علی نے قریب ہی کھڑی لالی کی طرف دیکھا۔

”خدا حافظ میرے لعل!“ لالی نے حسب معمول اس کے گال چومے اور وہ شیدے کی  
انگلی تانے آگے بڑھ گیا۔

صبح کو شیرا فیکٹری جاتے ہوئے سائیکل پر علی کو اسکول چھوڑ آتا، پھر دوپہر کو علی اسکول  
کی بس سے واپس آتا تھا۔ بس اُسے دروازے پر ہی اتارتی تھی، جہاں لالی منتظر کھڑی ہوتی۔  
”بیگ سنبھالے دوڑ کر لالی سے لپٹ جاتا اور لالی کی روح سرشار ہو جاتی۔ کبھی کبھی لالی  
سرجی اگر میری اپنی اولاد ہوتی تو کیا وہ مجھے علی سے بڑھ کر پیاری ہوتی؟ ماں صرف ماں  
ہوتی ہے۔ چاہے وہ کسی لے پالک کی ماں ہو یا کسی بچے کی، جسے اس نے خود جنم دیا ہو۔  
لالی، شیدے کے لئے ناشتہ کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک سن کر چونک گئی۔ دوپٹے  
سے ہاتھ پونچھتے ہوئے وہ دروازے کی طرف لپکی۔  
”کون صاحب؟“

”میں ہوں لالی!“ باہر سے آواز آئی تو لالی کا دل مارے مسرت کے کھل اٹھا۔ یہ  
آواز..... یہ آواز تو اس کے پیارے ویر کریم کی تھی۔ لالی نے جلدی سے دروازہ کھول  
دیا۔ کریم پور آ گیا اور چند لمحے بعد ہی لالی اس سے لپٹی رو رہی تھی۔ کتنے سالوں بعد اس  
نے اپنے ویر کو دیکھا تھا۔ نورماں اور چودھری شوکت علی کے خوف کے مارے وہ جب سے  
آئی تھی، پھر دنیا پور نہ جاسکی۔ وہ اپنی چھوٹی سی جنت میں خوش تھی۔ وہ دنیا پور جا کر اپنی  
جنت کو دوزخ میں تبدیل نہیں کرنا چاہتی تھی، بس کریم دوبارہ آ کر اس سے مل گیا تھا۔ جبکہ  
لالی اماں کی موت پر بھی نہ جاسکی تھی۔

”بھئی ہم بھی ہیں۔“ ایک نسوانی مگر شوخ آواز لالی نے سنی تو چونک کر بھائی کے سینے  
سے سر ہٹایا۔ کریم کی بیوی اور بچے بھی ساتھ تھے۔

”آپ لوگ نہادھولیں اور میں کھانا تیار کر لوں۔“

”شیدا نظر نہیں آ رہا۔ کیا مل گیا ہے؟“ کریم بولا۔

”نہیں، آج اس کی چھٹی ہے۔ علی کو سکول چھوڑنے گیا ہے۔“

”کون سی کلاس میں ہے علی؟“ حمیدہ نے پوچھا۔

”چھٹی میں گیا ہے۔“ لالی نے فخر سے بتایا۔

”بہت خوب۔“ کریم ہنس کر بولا۔ ”اب میں انہیں بھی اسکول میں داخل کراؤں گا۔“  
کریم نے اپنے بیٹوں بیٹیوں اور بیٹوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ کیا آپ بھئی آگئے ہیں؟“ لالی نے پوچھا۔  
”ہاں!“ کریم بولا۔



”کیوں؟“ لالی کے لہجے میں حیرانی تھی۔

”اب وہاں میں کچھ نہیں رہا لالی! پیٹ بھرنا اور چار بچے پالنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ہم ان کو پورا نہیں کر سکتے۔ رات دن زمینوں پر بیلوں کی طرح جتے رہتے ہیں، پھر بھی تر نالہ نہ کھا سکیں تو دکھ ہوتا ہے نا؟“ کریمو کا لہجہ دُکھوں سے بھرا ہوا تھا۔

”آپ بھی شیدے کے ساتھ مل میں لگ جائیں۔“ لالی نے مشورہ دیا۔

ہاں میں بھی سوچ کر آیا ہوں۔“ کریمو نے جواب دیا۔

”اچھا، میں ذرا کھانا تیار کر لوں۔“ لالی یہ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی اور کریمو اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔

☆.....☆.....☆

شعیب علی حسب دورہ دوسرے روز سرور کے ہاں موجود تھا۔ اس کے ساتھ فیروز اور نسرین کے علاوہ چودھری شوکت علی بھی تھے۔ سرور کے والدین بچے جارہے تھے۔ انہیں تو یہ اُمید بھی نہ تھی کہ ان کی رضیہ کے لئے اتنا اچھا رشتہ آئے گا۔

نسرین نے ان کے گھر کی حالت دیکھ کر ہی اندازہ لگا لیا کہ یہ ہمارے ہم پلہ نہیں ہیں، صرف سفید پوشی کا بھرم قائم ہے۔ بیٹھک میں اگلونے صوفے پر لیٹے کے سفید براق غلاف منڈھے ہوئے تھے۔ سندھی کڑھائی کے شیشے لگے ہوئے کُشن اچھے لگ رہے تھے۔ فرش پر دری چھپی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں مسہری پڑی تھی یعنی برک وقت اس کمرے کو ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ صوفوں کے قریب ہی ایک میز پڑی تھی، جس پر سفید میز پوش تھا اور اس پر پلاسٹک کے پھولوں کا گلہان رکھا ہوا تھا۔

”بھائی جی! آپ کو سرور نے بتا دیا ہو گا کہ ہم کیوں آئے ہیں۔“ چودھری شوکت علی، سرور کے والد سے مخاطب تھے۔

”جی۔“ سلطان احمد چونک سے گئے۔

”منہ چھوٹا، بات بڑی ہے۔ اگر آپ شعیب کو اپنا بیٹا بنا لیں تو یہ ہماری خوش نصیبی ہو گی۔“ چودھری شوکت علی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کس طرح کھل کریں۔

”دیکھئے جی، جہاں بیٹیاں ہوتی ہیں، وہاں رشتے بھی آتے ہیں۔ یہ تو بھوک کی بات ہوتی ہے۔ جہاں جوڑ جوڑے ہوتے ہیں، رسائی ہو جاتی ہے مگر.....“ وہ خاموش ہو گئے۔

”مگر کیا جی؟“ چودھری شوکت علی نے بے قراری سے پوچھا۔

”میرا مطلب یہ ہے کہ اگر شعیب کے والدین یہ بات کرتے تو زیادہ مناسب تھا۔“

”آپ یہ سمجھیں کہ میں شعیب کا باپ ہی ہوں۔“

”پھر بھی آپ۔“

”آپ جو کچھ لکھوانا چاہیں، آپ کی جو بھی شرائط ہوں، ہمیں منظور ہیں۔ بس آپ ہاجی بھر لیں۔“ چودھری شوکت علی ہنس کر بولے۔ اب انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ کسی لڑکی کے باپ کو راضی کرنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ کیونکہ یہ تو دنیا کے سودے ہوتے ہیں اور زندگی کی سودے بازی بہت دیکھ بھال کر کی جاتی ہے۔

”ہم لوگ صرف شعیب کی وجہ سے ایک ہفتہ مزید رُکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جلد از جلد اس کی شادی ہو جائے۔“ فیروز نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

تب رقیہ خاتون نے چونک کر شوہر کی طرف دیکھا۔

”انتی جلدی تو ممکن نہیں ہے۔ ابھی تو ہماری تیاری.....“ سلطان احمد نے کہنا چاہا۔

”آپ بیٹی دے دیں، ہم سمجھیں گے کہ سب کچھ دے دیا ہے۔ اور ویسے بھی ہمارا

شعیبی چیز کا از حد مخالف ہے۔“ چودھری شوکت علی نے فخر کے ساتھ شعیب کی طرف دیکھا

جو سرور کے ساتھ بیٹھا ہوا بڑے غور سے یہ باتیں سن کر مسکرا رہا تھا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے جی۔ کاش ہماری نئی نسل کا ہر لڑکا شعیب جیسے خیالات کا

مالک ہو تو غریبوں کی بیٹیاں اچھے بڑوں کی آس میں بیٹھے بیٹھے بوڑھی نہ ہوں۔“ سلطان

احمد نے محبت سے شعیب کو دیکھا۔

نسرین کو ان کی اس بات پر غصہ آیا۔ جی تو چاہا، کہہ دے احمد صاحب! آپ کو کیا ظلم کہ

اس کے خیالات نے اس سے تحفظ کا وہ سائبان چھین لیا ہے، جسے باپ کہتے ہیں۔ یہ محبتوں

بھری اس گود سے محروم ہو گیا ہے، جو صرف ماں کی ہوتی ہے۔ نسرین یہ سوچ کر رہ گئی، مگر

بول نہ سکی۔

سرور کی چھوٹی بہن رملہ، نسرین کے قریب آ کر بیٹھ گئی تو نسرین اس کی طرف متوجہ ہو

گئی۔

”کون سی کلاس میں پڑھتی ہیں آپ؟“

”نور تھ میں۔“ رملہ بولی۔

”اور آپ کی باجی؟“

”وہ پڑھاتی ہیں، ایک اسکول میں۔“ رملہ نے کہا۔

”ہونہہ..... تو ماسٹر نی ہے۔“ نسرین کے لہجے میں تلخی کھل گئی۔ اس کی بوڑھا ہٹ کوئی

نہ نہ نہ نہ۔ حتیٰ کہ قریب بیٹھی رملہ بھی۔

”آپ کی باجی کہاں ہیں؟“

”کمرے میں ہیں اپنے۔“ رملہ نے معصومیت سے کہا۔

”میں ان سے ذرا ملنا چاہتی ہوں۔“ نسرین نے کہا، پھر فیروز کی طرف جھکتے ہوئے



بولی۔ ”میں ذرا رضیہ کو دیکھ آؤں۔“

”ہاں، جاؤ۔“ فیروز بولے۔

نسرین صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کہاں جا رہی ہو بیٹی؟“ رقیہ خاتون نے نہایت محبت سے پوچھا۔

”رضیہ کے پاس۔“ نسرین نے مسکرا کر جواب دیا اور پھر رملہ کے ہمراہ باہر آ گئی۔

رضیہ کوئی رسالہ پڑھنے میں منہمک تھی۔ نسرین پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر کلال

پھیل گیا۔ وہ ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور سر پر دوپٹہ جھاتے ہوئے بولی۔

”آداب!“

”بھئی آپ یہاں چھپ کر بیٹھی ہیں اور ہم دیکھنے کو تر سے جا رہے ہیں۔“ نسرین نے

ہنستے ہوئے کہا تو رضیہ نے سر جھکا لیا۔ سیاہ گھنیری پلکیں اس کے عارضوں پر ٹھکرنے لگیں۔

دل میں عجیب سی ہلچل پیدا ہو گئی اور نسرین کو وہ لجائی لجائی، کانسی سی لڑکی بہت پیاری لگی۔

نسرین کو شعیبی پر پیار آنے لگا۔ واقعی قدرت نے دونوں کا جوڑ بنایا تھا۔ بابا تو بے جوڑ

شادی کر کے شعیب کی شخصیت کو داغ دار بنانا چاہتے تھے۔ اچھا ہے شعیبی نے خود اپنی راہ

چُن لی۔ نسرین کے خیالات تبدیل ہو گئے۔ پھر رضیہ کی آواز نے اس کے خیالات کی مالا

توڑ دی۔

”آپ بیٹھے نا۔“ رضیہ اُسے بیٹھنے کا کہہ رہی تھی۔ نسرین اسی کرسی پر بیٹھ گئی، جہاں چند

لحے پہلے رضیہ بیٹھی ہوئی تھی۔

”تم بہت اچھی ہو۔ شعیبی کی پسند واقعی قابلِ تریف ہے۔“ نسرین نے رضیہ کا سراپا

تقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شعیبی بھی بہت اچھا ہے۔ تم اس کی ساتھی بن کر فخر

محسوس کرو گی۔ بس اس میں ایک عادت بری ہے کہ ضدی بہت ہے۔ جو کہتا ہے، کر گزرتا

ہے۔ اس کی کسی بات سے اختلاف نہ کرنا۔ افہام و تفہیم کی ضرورت ہر قدم پر ہوتی ہے۔

یوں بھی شرقی عورت، مرد کی ہر اچھی بری بات مانتی ہے چاہے اس کا کتنا ہی نقصان ہو۔“

نسرین بولتی رہی اور رضیہ سوچنے لگی کہ یہ سب کچھ مجھے کیوں سنایا جا رہا ہے؟ اور پتہ نہیں

کیسے، رضیہ کی سوچ نسرین تک پہنچ گئی۔

”میں یہ سب تمہیں اس لئے بتا رہی ہوں کہ ہر انسان میں اچرائیوں کے ساتھ کچھ

کمزوریاں بھی ہوتی ہیں۔ چاند میں بھی داغ ہے، مگر اس کے باوجود اچھا لگتا ہے۔ شعیبی میں

صرف ایک برائی ہے اور وہ ہے اس کی ضد۔ ویسے بہت سچا اور کسرا آدمی ہے۔ اور یہی سچائی

اور کسرا اپنی اُسے زخمی کرتا ہے۔ وہ بہت محسوم ہے۔“

”واقعی، وہ بہت سچا ہے۔“ رضیہ نے دل ہی دل میں سوچا۔ اس نے نظروں کی راہ میں

مجھے جو پیغام دیا تھا کہ میں تمہیں چاہتا ہوں اور اپنانے کا آرزو مند ہوں تو آج وہ سچائی

حقیقت کا روپ دھارے سامنے ہے۔ واقعی ہم دونوں کے خاموش مگر بظاہر آنکھوں کے

ذریعے بولتے جذبے بڑے سچے اور پُر اثر تھے۔

.....☆.....

”نہیں..... ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم غلط کہتی ہو۔“ نوران نے ماسی بخت کی طرف خوف

زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”لو بھلا، مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہر ایک کی زبان پر یہی چرچا ہے۔

بھلا بتاؤ تو وہ روز خادم کے گھر کیوں جاتا ہے؟ وہیں حلوے ماٹھے پکتے ہیں اور دھوئیں

اڑتی ہیں۔ تُو جوڑ جوڑ کر مری جا رہی ہے اور راجا اڑائے نہ ٹھکے۔“ بخت ماسی بولتی چلی گئی۔

”ماسی! بھلا وہ اس عمر میں..... نہیں.....“ نوران کپکپا کر رہ گئی۔

”مرد کی کوئی عمر نہیں ہوتی جھٹکی! کسی وقت بھی اس کے دل کی دنیا بدل جاتی ہے۔ مرد تو

ہمیشہ سدا بہار رہتا ہے بڑھاپا تو بے چاری عورت پر ناگہانی آفت کی طرح آگرتا ہے۔“

”ماسی! تمہیں علم نہیں، راجا نے مجھے بہت مشکل سے حاصل کیا ہے۔ بہت لمبی اماویں

کال ہے۔ ان ریاضتوں کے بدلے میں ملی ہوں اسے۔“ نوران ٹوٹے ہوئے لہجے میں

بولی۔

”ہر مردنی عورت کو حاصل کرنے کے لئے بن باس کاٹتا ہے۔ جو چیز اس کی دسترس

سے دور ہوتی ہے، وہ اسے حاصل کرنے کے لئے آگ کے دریا سے بھی گزر جاتا ہے۔ اور

جب وہ چیز حاصل ہو جائے تو وہ اپنی چمک دکھ کھو بیٹھتی ہے اور مردنی چمکتی شے تلاش کرتا

ہے۔ یہی تو اسے بھونرا کہا گیا ہے۔“ ماسی بخت نے کہا۔

”مگر راجا بھونرا نہیں ہے۔“ نوران چیخ پڑی۔

”لو، مجھ پر کیوں چلا رہی ہو؟..... اگر وہ بھونرا نہیں تو پھر کل خورشید کو کس رشتے سے

لڑے (سینما) لے گیا تھا؟“ ماسی بخت نے دل چیر دینے والا انکشاف کیا۔

”کیا؟..... تمہیں کیسے پتہ؟“ نوران کی دل کی دنیا میں حشر برپا ہو گیا۔

”ہاں۔ میں جھوٹ کیوں بولوں؟ رات میرا شمشو فلم دیکھنے گیا تھا، وہاں یہ دونوں بھی

تھے۔ اس نے تو رات آتے ہی مجھے بتا دیا تھا۔“

”تم نے کسی کو بتایا تو نہیں؟“ نوران نے پوچھا۔

”مجھے کیا ضرورت تھی۔ میری مان تو تُو خادم کے پاس جا اور اسے کہہ کہ اپنی بہن کو

اسکے گراہی ہی جوانی چٹھی پڑ رہی ہے تو کہیں اور شادی کر دے۔ آخر ایک شادی شدہ

انسان کا گھر کیوں اجاڑ رہی ہے؟“ ماسی بخت بولے گی، مگر نوران کب سن رہی تھی؟



کے کانوں میں تو سیٹیاں سی بچ رہی تھیں۔ اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ وہ بھرپوری سی طرح وہیں گھاس پر بیٹھ گئی۔ اسے یوں لگا، جیسے اس کی جان ٹکڑی جا رہی ہو۔

مجھے پتہ بھی نہیں چلا اور رات اتنی آگے بڑھ گئی۔ راجا! تو مجھ سے کون سا بدلہ لے رہا ہے؟ اگر تجھے یہی کچھ کرنا تھا تو تو نے مجھے کیوں اجازت میرے ہشتے بستے آشیانے کے تنے کیوں بکھیرے؟ میں ساری عمر چودھری سے انتقام لینے کے منصوبے بناتے ہوئے اس کی زمینوں کے وارثوں میں اضافہ کرتی رہتی اور پونہی محبت و نفرت کے کھیل میں زندگی بھارتی۔ مگر تو نے تو مجھے ہی راہ دکھائی کہ میں علیحدہ ہو جاؤں۔

”راجا! تو نے یہ کیا کیا؟“ نوراً دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رودی  
”روئے سے کیا حاصل ہو گا تجھے؟“ اسے روئے دیکھ کر ماسی بخت کا دل بھی بھر آیا۔  
”اب رونا ہی میرا مقدر ہے۔“ نوراً بولی۔

”تم خادم سے جا کر ملو تو۔“  
”کیا اسے نظر نہیں آتا کہ اس کی بہن راجا کے ساتھ ٹکڑے اڑاتی پھرتی ہے۔ مگر میں ذرا سی تبدیلی ہوتی ہے تو گھر کے مرد کو احساس ہو جاتا ہے۔“ نوراً آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

”پھر بھی تم اس سے ملو۔ کیا خبر اس کا دل پسچ جائے۔“ ماسی بخت نے کہا۔  
”پہلے میں راجا سے بات کیوں نہ کروں؟“ نوراً درختی سے گیلی مٹی کھودتے ہوئے بولی جیسے تصور میں راجا کی قبر کھود رہی ہو۔

”اگر راجا مگر جائے تو؟“ ماسی بخت نے خدشہ ظاہر کیا۔  
”نہیں۔ وہ مجھوں کے معاملے میں کبھی نہیں مگر۔ مجھے یقین ہے کہ وہ سچ سچ بتا دے گا۔“ نوراً نے نہایت یقین سے کہا۔

”پھر بھی نوراً! احتیاط کرنا۔“ ماسی بخت بولی تو نوراً پھر بے دلی سے گھاس کاٹنے میں مصروف ہو گئی

نوراً کا معمول تھا کہ عصر کے بعد جب کام سے فارغ ہوتی تو اپنی بکری کے لئے گھاس کاٹنے آ جاتی۔ آج بھی وہ حسب معمول آئی تو ماسی بخت پہلے سے ہی موجود تھی اور اس نے نوراً کو دیکھتے ہی راجا کے مصائب کے بارے میں بتایا۔ چند لمحوں کے لئے تو نوراً جو اس ہی کتبہ پر تھی، مگر پھر آہستہ آہستہ اس نے خود کو نارمل کر لیا کیونکہ اسے پہلے سے یہ توقع تھی کہ ایک نہ ایک روز ایسا ہونا ہی ہے۔ آخر روز روز کے جھگڑے کوئی رنگ تو دکھاتے نا؟

نوراً گھاس کی گٹھری لے کر آئی تو بکری اسے دیکھ کر سنسانے لگی۔ مگر نوراً نے اس

کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ مگر اسے دروازے میں ہی ٹھٹھک جانا پڑا۔ بات ہی ایسی تھی۔ وہ ایک ٹک راجا کو دیکھے گئی۔ کچھ تو اس کا رنگ ہی نہالا تھا۔ شاید کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ نئی بارڈر والی دھاری دار سبزنگی اندھے، خوب صورت کڑھا ہوا وائل کا کرتا پہنے اور کندھے پر پرچہ پٹکا ڈالا ہوا تھا۔ اس نے بالوں میں ڈھیر سارا تیل لگا کر بالوں کو نئے اسٹائل سے سنوارا تھا اور اب آنکھوں میں نرمہ لگا رہا تھا۔

نوراً کے دل میں ایک عجیب سے احساس نے انگڑائی لی۔ گئے دنوں میں راجا اسی طرح سچ دج میں رہا کرتا تھا۔ یہ وہ دن تھے، جب دونوں کے دل ایک دوسرے کے لئے ہڑکتے تھے۔ جب گھر کے کام کاج کے بعد نوراً، راجا سے ملنے آتی تو وہ آنکھوں میں اہانے فتنے بھر کر اسے اس طرح دیکھتا تھا کہ وہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو جاتی۔ ہر روز ایک نیا شگوفہ ان کے دلوں میں کھلتا تھا۔ پھر راجا تک ہی چودھری شوکت علی نے ان کے من کا زخم اجاڑ ڈالا اور انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ مگر قسمت نے عجیب انداز میں ان کا ملاپ کر لیا تھا۔ دونوں اس ملاپ سے خوش نہ تھے۔ غربت نے آسیب کی مانند ان کی محبت کو نگل لیا تھا۔ وہ مجھوں کو ترس گئے تھے۔ پھر راجا نے نئی دلچسپی تلاش کر لی تھی اور نوراً خود کو بھل میں مصروف رکھنے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

”کیا دیکھ رہی ہو نوراً؟“ راجا نے مونچھوں پر تیل والے ہاتھ پھیرتے ہوئے نہات تسخر سے پوچھا۔

”دیکھ رہی ہوں، آج تم اتنے عرصے بعد پرانے راجا کیسے بن گئے؟“ نوراً کے لہجے میں لڑکتا تھا۔

”میں نیا کب ہوں؟ وہی پرانا تو ہوں۔“ وہ بولا۔  
”یہ کپڑے کہاں سے آئے ہیں؟“ نوراً اس کی بات نظر انداز کر کے تیر نظروں سے راجا کے لباس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔  
”یہ بھی تمہیں بتانا پڑے گا۔“ راجا کے ابرو تن گئے۔

”یہ اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ ہمارے پاس یکمشت اتنی رقم کبھی نہیں آئی کہ جسم کے ٹکڑے ایک ساتھ بنا سکیں۔“ نوراً کا لہجہ سخت ہو گیا۔

”میں یہ پوچھنے کا کوئی حق نہیں سمجھتی؟“ راجا اس کے قریب آ کر سختی سے بولا۔  
”یہ حق تم نے مجھے خود دیا ہے، راجا! آخر میں تمہاری بیوی ہوں۔“ نوراً چیخ پڑی۔  
”بیوی۔ ہونہ، صرف مسلا ہوا پھول ہو تم۔ آج کان کھول کر سن لو کہ میں نے مجھ تم کو بدلہ لینے کے لئے شادی کی تھی۔“ راجا نے ایک نیا انکشاف کیا۔



”کیا.....؟“ نوراًں لڑکھرائی گئی۔

”ہاں..... ان مظالم کا بدلہ لینے کے لئے جو چودھری نے مجھ پر نہیں چاہنے کے جرم میں کئے تھے۔ میں جو سالوں روشنی سے محروم رہا، تہہ خانے میں پتھروں کی پلٹا میرے جسم میں سوئیاں چھبھو دیتی تھی۔ میں نے ان ساری تکالیف کا بدلہ تم سے لینے کا تہہ کر لیا تھا، اسی روز جب چودھری نے مجھے قید کیا تھا۔“ راجا نے کہا۔

”راجا.....!“ نوراًں کا مان بلبلے کی طرح بیٹھ گیا۔

”میرے دل سے تو تم اسی روز اتر گئی تھیں، جب میری اجازت کے بغیر تم کرپورے ساتھ جٹے سے دنیا پور آ گئی تھیں۔ اور پھر سرخ حویلی میں چودھرائی بن کر رہنے لگی تھیں۔ جب میں نے سکھ نہیں اٹھائے تو تمہیں کیسے رہنے دیتا؟“ راجا بولتے بولتے ٹھہر گیا۔

”نوری!.....“ تو بہت بد نصیب ہے۔ تو نے چودھری جیسے مرد کو کھو دیا۔ وہ تجھے جس قدر چاہتا تھا، دنیا کا کوئی مرد اپنی محبوبہ یا بیوی کو نہیں چاہ سکتا۔ تو تو وہ سنہری ناگن ہے، جو اچھے بھلے لوگوں کو ڈس لیتی ہے تو وہ پانی ہو جاتے ہیں۔ تجھے اس دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔“ اتنا کہنے کے بعد راجا رُک کا نہیں بلکہ اسے دھکیلنا ہوا کرے سے نکل گیا اور نوراًں تیزی سے اسے آنگن کا دروازہ عبور کرتے دیکھتی رہ گئی۔

یوں تو نوراًں کئی روز سے راجا کے بدلے بدلے تپور دیکھ رہی تھی۔ راجا میں بہت سی تبدیلیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ وہ اب بھی سمجھتی تھی کہ میں اس کی بات نہیں مان رہی، ابھی اُکھڑا اُکھڑا سا رہتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں، نوراًں کو بھی یہ ضرور ہو گئی تھی کہ وہ راجا کے دوسرے بچے کی ماں ضرور بنے گی اور اسی ضد نے اس کے گھر میں سرخ آندھیاں چلائی شروع کر دی تھیں۔ پہلے تو راجا زیادہ وقت زمینوں پر گزارتا تھا۔ رات کو آتا تو آنگن سے چور چور ہوتا۔ کھانا کھانے کے بعد نوراًں اس کے ہاتھ پیر دباتی اور وہ اتنا تھکا ہوا ہوتا کہ چارپائی پر لیٹے ہی نیند کی آغوش میں چلا جاتا۔ مگر اب چند دنوں سے وہ بہت زیادہ بدل گیا تھا۔ اب تو وہ زمینوں سے بھی سر شام لوٹ آتا۔ نہادھو کر صاف لباس تبدیل کرتا۔ یہ وہ اکلوتا جوڑا تھا جو کبھی کبھی شادی بیاہ کے موقع پر یا شہر جاتے وقت پہنتا تھا، اب ہر روز وہی پہننے لگا تھا۔ نوراًں کوئی توجہ نہ دیتی۔ رات کو وہ اس وقت آتا جب نوراًں اور بچے سو رہے ہوتے۔ وہ خود ہی کھانا نکال کر کھا لیتا۔

نوراًں نے کئی بار دیکھا تھا کہ بعض مرتبہ وہ تاروں بھرے آسمان کو دیکھتے ہوئے ہولے ہولے گنگنایا بھی کرتا۔ اس کے لب آپ ہی آپ مسکاتے رہتے۔ مگر جب نوراًں سے بات کرتا تو اس کا لہجہ کرخ ہو جاتا۔ اس کے مسکاتے لب بچنے جاتے۔ نوراًں جیسے ہی اس کے سامنے آتی، وہ طہر کے تیروں سے اس کی روح کو چھلنی کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتا۔

اب وہ نہیں چاہتا تھا کہ مزید بچے ہوں جبکہ نوراًں چاہتی تھی کہ اس کا آنگن اس غربت کے بارے میں بچوں کی گفتگو سے گونجتا رہے۔

اور آج تو راجا نے کھلم کھلا اپنی نفرت کا اظہار کر کے نوراًں کو بتا دیا تھا کہ وہ صرف اس سے چودھری سے شادی کا بدلہ لینا چاہتا تھا، ابھی اس نے شادی کی تھی۔ وہ اسے بیوی کا حق نہیں دینا چاہتا تھا۔ نوراًں کو اب کوئی حق نہ تھا کہ اس کے معاملات میں بولے۔ اب وہ ہم نہیں بلکہ تم اور میں ہو گئے تھے۔ نوراًں کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ چھری اپنے سینے میں اتار لے۔ روز روز کے مرنے سے تو ایک بار کا مرنا ہی بہتر تھا۔ ماسی کم بخت! تم کہتی ہو، مرد کا دل بدلنے کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔ نوراًں نے دروازے کے پٹ سے سرٹکا دیا اور زور زور سے رونے لگی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے آج ہی اس کا بابا منشی اللہ دتہ مرا ہو۔ راجا کی بے رخی نے نوراًں کو ہلاک کر دیا تھا۔

مومو اور اشرف آگے پیچھے دوڑتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تو مومو اسے دیکھ کر سہم گئی۔ اشو بھی ٹھک گیا۔ انہوں نے آج پہلی بار نوراًں کو یوں روتے دیکھا تھا۔ مومو کا دل رکھ سے بھر گیا۔

”یہ اماں آج کیوں رو رہی ہے؟ یہ تو ہمیشہ مجھے رلاتی تھی۔“ اس نے سوچا، پھر وہ رُپ کر آگے بڑھی اور دروازے کے پٹ سے لگی نوراًں سے لپٹ گئی۔

”اماں! کیا ہو گیا ہے؟..... کیوں رو رہی ہے تو؟..... کس نے مارا ہے؟“ مومو نے نہایت مصومیت سے ایک ساتھ کئی سوال کر دیئے۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”مومو.....!“ نوراًں کے لب کپکپائے۔ اس نے سر اٹھا کر آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے خود سے لپٹی ہوئی مومو کو دیکھا، جو اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کی رم جھم لئے ماں کا آنسوؤں سے تر چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”مومو!..... میری جان!..... میری روح!..... میری سوہنی دلی!“ جھکی اور مومو کو سینے سے لگا کر بچنے لیا۔ نوراًں نے کبھی اتنی محبت سے مومو کو نہیں پکارا تھا۔ اتنی محبتیں کبھی نوراًں کے لہجے میں مومو کے لئے یکجا نہ ہوئی تھیں۔ اب دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے سے لپٹی رو رہی تھیں۔ بس وہ تو ماں کے آنسو دیکھ کر برداشت نہ کر سکی۔ ویسے بھی ماں بیٹی کے دکھ سانچے ہوتے ہیں۔ ماں تو اپنے دودھ کے ساتھ ہی بیٹی کے دل میں اپنے دکھ منتقل کر دیتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جوں جوں لڑکیاں بڑی ہوتی ہیں، انہیں ماؤں کے دکھوں کا اہوتا ہے اور ماں کی ایک آہ بھی ان کے دل کو ادھیڑ کر رکھ دیتی ہے۔ یہی حالت اب مومو کی تھی۔ نوراًں کی سسکیوں نے مومو کو عجیب سی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔

”اماں! تھو نا، کیوں رو رہی ہو؟“ مومو نے نوراًں کے سینے سے سر اٹھا کر اپنی ہتھیلی



سے نور ایں کے آنسو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

”اپنے کمرے میں کود رہی ہوں۔“ نورانی نے بھڑائی ہوئی آواز میں کہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی آواز کنوئیں سے آرہی ہو۔ نورانی کو خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔

”اُہاں! یہ کرم کیا ہوتے ہیں؟“ نوراًں کے کہنے پر مہمانوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”کرم.....“ نوراًں نے ایک سر آہ بھر کر کہا۔ ”وہ، جو قدرت نکتا ہے۔ عموماً غریبوں کے کرم تو رب سائیں بلا دیکھے بھالے اور سوچے سمجھے لکھ دیتا ہے۔ یہ نہیں سوچتا کہ وہ دکھ جو ان کے نصیب میں لکھ رہا ہے انہیں وہ جمیل بھی سکین گے یا نہیں۔ دن رات کی مشقت کے باوجود بھی روٹی کا کال ہمارے کرموں میں لکھا جاتا ہے۔ ہزاروں من کپاس بوؤ مگر تن پر ایک چیترا نہیں ملے گا۔ یہ ہمارے لکھ میں لکھ دیا گیا ہے۔“ نوراًں بولے گئی اور مومنو ہونٹوں کی طرح ماں کو دیکھنے لگی جس کی باتیں اسے آسانی لگ رہی تھیں۔ چہرہ ایسا سخت ہو گیا تھا کہ پتھر کا گمان ہو رہا تھا اور نوراًں اپنے رب کے سامنے آج شکوؤں کی پٹاری کھولے بیٹھی تھی۔ دل کی ساری بھڑاس نکال لینا چاہتی تھی، جیسے آج کے بعد وہ کچھ نہ کہہ سکے گی۔

چودھری شوکت علی بہت خوش تھے۔ اتنے خوش تھے کہ اپنی خوشی کا احاطہ ہی نہ کر پارہے تھے۔ تین روز قبل ہی تو شعیب علی اور رضیہ انٹو بندھن میں بندھ گئے تھے۔ جلدی جلدی میں بھی ان کی شادی نہایت شاندار طریقے سے ہوئی تھی۔ چودھری شوکت علی نے روپیہ پانی کی طرح بہایا تھا۔ گزشتہ روز بہت بڑے ہوٹل میں شاندار ویلیمہ پارٹی کا انتظام کیا گیا تھا، جس میں شعیب علی کے دوستوں کے علاوہ پروفیسرز وغیرہ بھی شریک ہوئے تھے۔ اتنے زبردست انتظامات دیکھ کر فیروز پوچھ ہی بیٹھا۔

”چاچا! یوں لگتا ہے کہ آپ کو غم تھا، فطیحی شادی کر رہا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ انہوں نے چونک کر فیروز کو دیکھا۔

”مطلب یہ کہ اتنی جلدی اتنی ساری رقم کا انتظام بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”مطلب یہ کہ اتنی جلدی اتنی ساری رقم کا انتظام بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔“

”بھلے مانس! میں زمیندار ہوں، کوئی ٹٹ پونجیا نہیں۔ تم جب چاہو، جہاں چاہو مجھ

”پھر تو آپ بوتل کے جن ہوئے۔“ فیروز ہنس کر بولے۔

”پھر تو آپ یوتھل کے جن ہوئے۔“ فیروز ہنس کر بولے۔  
چودھری شوکت علی خوش کیوں ہوتے۔ ان کی تو دلی مراد بر آئی تھی۔ انہوں نے بھی تو  
غریب لڑکی سے شادی کی تھی اور چودھری طالب علی کے ظلم کا نشانہ بنے تھے۔ اب وہ دیکھا  
چاہتے تھے کہ چودھری طالب علی اپنے بیٹے کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ بہت صبر کیا تھا  
انہوں نے۔ انہیں یقین تھا کہ فیصلے کا وقت بہت نزدیک ہے۔

فیروز اور نسرین کو آج رات ہی روانہ ہونا تھا۔ نسرین، رضیہ کے پاس بیٹھی تھی۔  
 ”شعبی کا خیال رکھنا۔“ نسرین نے کہا۔  
 ”جی.....“ رضیہ نے سر جھکا لیا۔

”جی.....“ رفیقہ نے سر جھکا لیا۔

”ہاں! اس کی ہر حرکت پر نظر رکھنا، ورنہ مرد کو بدلتے کوئی دیر نہیں لگتی۔ تم ابھی نا سمجھ ہو اور اس سے کہہ دینا کہ کبھی تمہیں رنگ محل لے جانے کی کوشش نہ کرے۔“

”وہ کیوں؟“ رضیہ نے حیرت سے نسرین کی طرف دیکھا۔

”وہ کیوں؟“ روضیہ نے حیرت سے نسرین کی طرف دیکھا۔

”وہ اچھی طرح جانتا ہے مگر تم اس کی ضد کے آگے مجبور مت ہو جانا، ورنہ چوٹ کھا جاؤ گی۔“ پھر نسرین نے نہایت رसान سے رضیہ کو سب کچھ بتا دیا اور رضیہ کا رنگ املتاس کے پھولوں کی طرح زرد ہونے لگا۔ آنکھوں میں شبنم جننے لگی۔

”وہ تمام کشتیاں جلا کر تم تک پہنچا ہے۔ اب آگے نہ بڑھنے دینا اسے۔“ نسرین نے رضیہ کو لپٹا لیا۔ ”تمہیں میں یہ سب کچھ اس لئے بتا رہی ہوں کہ اچانک کسی بات کا تمہیں علم ہو تو خود کو ہر معاملے سے نمٹنے کے لئے تیار رکھو۔“

”یہ میری بیوی کو کیا پٹی پڑھائی جا رہی ہے؟“ شعیب کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ٹوٹی سے بولا اور ان کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”میں تمہاری بیوی کو نئی زندگی کے پارے میں تیار ہی ہوں۔“

”بس جی، تین ماہ تو آپ ہم سے سینئر ہیں۔ کون سے آپ کو تجربے ہیں، کیوں رضیہ؟“ شعیب نے رضیہ کا سراپا نظروں ہی نظروں میں جذب کرتے ہوئے کہا۔ فالسی غرارہ سٹ میں ہلکے ہلکے میک اپ اور زیورات نے اس کی خوب صورتی میں اضافہ کر دیا تھا۔ کلی سے پھول بن کر اس کا روپ اور نکھر آیا تھا۔ شعیب علی کی محبتوں نے اسے نیا رنگ روپ بخشا تھا۔ شعیب کی نظروں کی تپش یا کر رضیہ موم کی طرح پکھلی جا رہی تھی۔ دل پر شعیب علی کی محبتوں کی نرم نرم پھوار پڑ رہی تھی اور وہ پوری کی پوری بھگی جا رہی تھی۔ چند لمحے پہلے جو بات سرین نے اسے بتائی تھی، وہ اس کے ذہن و دل سے محو ہو چکی تھی۔ رضیہ نے سوچا تھا، باب شعیب میرا ہے تو مجھے کسی کی پروا نہیں۔ چاہے کوئی کچھ کرتا رہے۔

”شععی! یہاں کوئی اور بھی ہے۔“ نسرین نے شععی کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا،  
جراہیک ٹک رضیہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ وہ بری طرح جھینپ گیا۔ بھلائی بی کے سامنے بھی ایسی  
بے خودی کس کام کی۔ مگر کیا کرتا، اسے تو اب تک اپنی شادی کا یقین ہی نہ تھا۔ یوں لگتا  
جیسے سندر سپنا دیکھ رہا ہو، جب آنکھ کھلے گی تو کچھ نہ ہوگا۔ کیا دلی تمنا کہ اتنی جلدی پوری  
ہوتی ہیں؟

”نفسِ حق! تم صحت سے پڑھنا۔“ ”نفسِ حق! پڑھو۔“



”اب تو میں سروس کی سوچ رہا ہوں۔“ شعیب نے جواب دیا۔  
 ”کوئی ضرورت نہیں نوکری کرنے کی۔ اپنی تعلیم مکمل کرو۔“  
 ”پریکٹس لائف میں قدم رکھ دیا ہے تو نوکری بھی ضروری ہے۔“  
 ”کس میں قدم رکھا ہے؟“ سرین نے کہا۔  
 ”عملی زندگی میں۔“ شعیب ہنس کر بولا۔

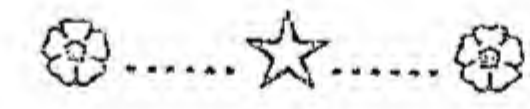
”چاچا شوکی تمہارا خرچ برداشت کریں گے۔ فی الحال تم صرف پڑھو۔ جب تم نے بڑے مان سے رنگ محل چھوڑا ہے تو پھر پیچھے کیوں ہٹ رہے ہو؟ وہاں سے تو تم پڑھنے آئے تھے۔“ سرین نے غیرت دلائی۔

”یہاں شادی رچالی، ہیں نا؟“ شعیب نے سرین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شوخی سے کہا۔

”یہ تمہاری قسمت کا لکھا ہے، جو تمہیں ملا۔“ سرین بولی۔  
 ”تو تعلیم بھی جتنی میری قسمت میں لکھی ہے، وہ مجھے ملے گی۔“ شعیب نے رمان سے جواب دیا۔

”پھر بھی، جو میں کہہ رہی ہوں، تم وہ کرنا۔“ سرین نے گھر کا تو شعیب ہنستا ہوا اٹھا اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کھڑا ہو گیا۔

”میں تو مذاق کر رہا تھا۔ میں پڑھوں گا، تاکہ چودھری طالب علی یہ نہ سمجھیں کہ انہوں نے خرچ بند کر دیا ہے تو میں پڑھ ہی نہ سکا۔“  
 ”بہت شریر ہو تم۔“ سرین نے اس کی پیشانی چوم لی۔ رضیہ قریب ہی بیٹھی دونوں بہن بھائی کو مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔



سہ پہر کو کام سے فارغ ہونے کے بعد نورائیں، خادم کے گھر چل دی۔ اس کے دل میں تو کل سے ایسی آگ لگی ہوئی تھی، جو کسی طرح بھی ٹھنڈی ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ کتنے ہی آنسو اس نے بہا لئے تھے، مگر دل میں ایسا الاؤ روشن تھا، جو نورائیں کی روح کو جھلسائے دے رہا تھا۔

دروازے پر پہنچ کر نورائیں کنڈی کھٹکھٹاتے ہوئے ٹھک گئی۔ اس کا اٹھا ہوا ہاتھ رک گیا۔ کبھی دشمن کو بتا کر اس پر حملہ نہیں کیا جاتا۔ اور خادم کی بہن نے بھی تو بتائے بغیر ہی اس کے گھر پر شب خون مارا تھا۔ نورائیں نے دروازہ دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ نورائیں اندر داخل ہو گئی۔

سامنے ہی خادم اور اس کی بیوی، کیکر کی چھاؤں میں چارپائی پر بیٹھے تھے۔ خادم حق

نورائیں رہا تھا اور اس کی بیوی فضلاں سبزی کاٹ رہی تھی۔ نورائیں کو دیکھ کر دونوں کے چہرے ایک لمحے کے لئے سایہ لہرا گیا۔ حقے کی نے خادم کے منہ میں رہ گئی۔ وہ حقہ گڑ گڑانا بھولی گیا اور فضلاں بھی ترکاری کاٹتے کاٹتے رک گئی۔ پھر فضلاں نے خود کو قابو میں کیا، چارپائی سے اٹھی اور مسکراتے ہوئے بولی۔  
 ”آؤ، آؤ نورائیں! کیسے آئیں؟“

نورائیں کچھ نہ بولی۔ اس کا چہرہ پتھر ہو رہا تھا۔ مسلسل رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں میوڑم ہو گئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کے قریب آ گئی۔  
 ”کیسے آئی ہو؟“ خادم نے پوچھا۔

”میں راجا کو لینے آئی ہوں۔“ نورائیں نے لفظ چبا چبا کر ادا کئے۔

”راجا تو یہاں نہیں ہے۔ آج آیا ہی نہیں۔“ فضلاں بولی۔

”آتا تو ہے نا؟“ نورائیں بولی۔

”ہاں۔ خادم کے ساتھ تاش وغیرہ کھیلنے آتا ہے۔“ فضلاں نے بتایا۔

”دوسرا کھیل بھی تو کھیلتا ہے۔“ نورائیں دانت پیس کر بولی۔

”کیا مطلب؟“ خادم نے بھوئیں سکڑ کر پوچھا۔

”سب کی زبان پر اس کھیل کی کہانیاں ہیں خادم!“ نورائیں کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

”ہوں۔“ خادم نے ہنکارا بھرا۔ ”اگر تمہیں پتہ چل گیا ہے کہ راجا یہاں کیوں آتا ہے تو یہ بھی جان لو کہ اس نے مجھ سے خورشید کو مانگا ہے۔“

”اور تم راضی ہو گئے ہو۔“ نورائیں ناگن کی طرح پھنکاری۔

”ہاں..... آخر وہ میرا یار ہے اور ہم یاری نبھانا جانتے ہیں۔“ خادم غرور سے بولا۔

”تو خادم! تم کو یہ بھی پتہ ہو گا کہ راجا نے مجھے کس طرح حاصل کیا تھا؟“

”ہاں..... اس نے بتایا ہے کہ گئے دنوں میں تم چودھرائی رہ چکی ہو۔“ خادم تمسخر سے ہنسا۔

”یہ نہیں بتایا کہ اس نے میری خاطر کئی سال چودھری کی قید برداشت کی؟“ نورائیں کے لہجے میں کاٹ تھی۔

”سب کچھ بتایا ہے۔ تم مجھے نہ بتاؤ۔“ خادم ہاتھ اٹھا کر بولا۔

”اس کے باوجود تم خورشید اُسے دے رہے ہو۔ جبکہ وہ ماضی میں مجھ سے محبت کر چکا ہے۔ یہ تمہیں علم ہے۔“

”مرد کا دل بہت بڑا ہوتا ہے۔ پرانی محبتیں بھی اس کے دل میں رہتی ہیں اور نئی کے



لئے بھی جگہ بنتی رہتی ہے۔“ خادم نہایت بے پروائی سے بولا۔

”اگر خورشید اتنا ہی بھاری پتھر ہے تو تم اسے کھوہ میں پھینک دو۔“ نوراًں نے خادم کو مشورہ دیا۔

”تمہارے مشورے کا شکریہ۔ میں اپنے یار کو زبان دے چکا ہوں۔“ خادم ہٹ دھرمی کے بولا۔

”یعنی تم نے میرا گھر اجاڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ نوراًں بولی۔

”لوگوں کی تو چار چار بیویاں ہوتی ہیں۔ اگر راجا دوسری شادی کر رہا ہے تو کیا مضائقہ ہے؟“ خادم نے بے پروائی سے کہا۔

”لوگوں کے ہاں کھانے کو بھی چاروں کے لئے ہوتا ہے۔ وہ تو ایک کا ہی پورا نہیں کر سکتا تو دوسری کا کہاں سے کرے گا؟“ نوراًں نے راجا کی حیثیت کھول دی۔

”تمہاری بیٹی بھی تو ہے۔ اس کا بھی تو وہ پورا کرتا ہے۔“ خادم نے طنز سے کہا۔

”میری بیٹی خود محنت کرتی ہے۔ صبح سے شام تک چودھری دلاور کے ہاں کام کرتی ہے۔ راجا اسے اپنی طرف سے ایک نوالہ بھی نہیں کھلاتا۔“ نوراًں نے ترشی سے جواب دیا۔

”بہر حال، کچھ بھی ہو، میں زبان دے چکا ہوں اور آدمی کی صرف زبان ہی اچھی ہونی چاہئے۔“ خادم نے بے پروائی سے کہا تو نوراًں کا دل لہو لہو ہو گیا۔ وہ خاموشی سے خادم کو دیکھنے لگی۔ پہلے تو جی چاہا، اس کے سامنے گڑ گڑائے، بچوں کا واسطہ دے کہ میرے سر کا

سائیں مجھے لوٹا دو۔ مگر پھر خیال آیا تب بھی وہ نہ مانا تو؟..... ویسے بھی وہ مانگے کی محبتوں کی قائل نہ تھی۔ چودھری شوکت علی کے پاس رہ کر اس نے ضبط کرنا سیکھا تھا۔ وہ مایوس ہو گئی۔

”ٹھیک ہے، خادم! اس گھر میں تمہاری بہن رہے گی یا میں۔“ نوراًں نے مضبوط لہجے میں کہا اور پھر تیزی سے پلٹ کر خادم کے گھر سے نکل گئی۔

”ہونہہ..... راجا واپس کر دوں۔“ خادم بڑبڑایا۔ ”آج کل ویسے ہی رشتوں کا کال ہے۔ اور پھر میں جہیز کہاں سے دوں گا؟ راجا تو بغیر جہیز کے خورشید کو اپنانے کو تیار ہے۔“

جب راجا گھر میں داخل ہوا تو شام کا لگجا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ آج اسے دیر ہو گئی تھی۔ غصے سے اس کا چہرہ تانبے کی طرح تپ رہا تھا، آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس دن

نوراًں آنگن میں چار پائیاں ڈال رہی تھی۔

”تو خادم کے گھر گئی تھی؟“ وہ اس کے قریب آ کر دھاڑا۔

”ہاں۔“ نوراًں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

”کیوں؟“

”تم میری جاسوسی کرنے گئی تھیں؟“

”نہیں۔ بلکہ یہ یقین کرنے کہ دنیا جو کچھ کہہ رہی ہے وہ درست ہے یا غلط۔“ نوراًں اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”پھر کیا پتہ چلا؟“ راجا نے کہا۔

”تمہارے نئے معاشقے کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا۔“

”اچھا ہے، مجھے خود نہیں بتانا پڑا۔“ راجا بے حیائی سے ہنسا۔

”مگر راجا! میں تمہیں خورشید سے شادی کی اجازت نہیں دوں گی۔“ نوراًں ترشی سے بولی۔

”تم سے اجازت مانگ ہی کون رہا ہے؟..... تم نے بھی تو شادی کی تھی۔ میں نے روکا تھا کیا؟“

”تم میرے جیتے جی شادی نہیں کر سکتے۔“ نوراًں گرجی۔

”میں کروں گا اور ضرور کروں گا، خورشید سے شادی۔ سمجھیں تم؟“ راجا پاؤں پٹخ کر بولا۔

”یہ ناممکن ہے، جب تک میں زندہ ہوں۔“

”اگر مجھے کسی اور کا ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتیں تو مر جاؤ۔ میں نے تو چودھری سے تمہاری شادی کو قبول کر لیا تھا اور زندہ بھی رہا۔ اگر تم برداشت نہیں کر سکتیں تو مر جاؤ۔ تم میرے راستے کی ایسی بودی دیوار ہو، جسے میں جب چاہوں، جس وقت چاہوں گرا سکتا ہوں سمجھیں؟“ راجا کے لہجے میں تلوار کی سی کاٹ تھی۔ پھر وہ رکا نہیں، جس طرح آیا تھا، اسی طرح ہی چلا گیا۔ بس اس کا ایک جملہ نوراًں کے ذہن پر بار بار ہتھوڑے برسا رہا تھا۔

”اگر مجھے کسی اور کا ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتیں تو مر جاؤ۔“

”مر جاؤ۔“

”مر جاؤ۔“

نوراًں نے ایک طویل سانس لے کر خود کو چار پائی پر گرا دیا۔ راجا! میں نے تمہیں چاہا ہے۔ اتنا کہ اس کرہ ارض پر کوئی تمہیں نہ چاہے گا۔ تمہارے ہر حکم کی میں نے تعمیل کی ہے۔ اب اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں مر جاؤں، تو میں تمہیں جان سے گزر کر بھی دکھا دوں گی۔ میں بزدل نہیں ہوں۔ میں ہنسنے مسکرانے موت کو گلے لگاؤں گی۔ مگر مجھے مر کر بھی یہی افسوس

رہے گا کہ میں نے تم جیسے کھٹیا، کینے اور کم ظرف آدمی کو کیوں چاہا؟ میری چاہت کوئی مسمولی تو نہ تھی۔ یہ چاہت جسے پانے کے لئے چودھری شوکت علی تڑپتا رہا اور جب میں نے اسے

پناہ بخشی محبت کا یقین دلایا تو وہ مارے خوشی کے دیوانہ ہو گیا۔ مگر راجا! میں نے تم سے

پناہ بخشی محبت کا یقین دلایا تو وہ مارے خوشی کے دیوانہ ہو گیا۔ مگر راجا! میں نے تم سے

پناہ بخشی محبت کا یقین دلایا تو وہ مارے خوشی کے دیوانہ ہو گیا۔ مگر راجا! میں نے تم سے



جی محبت کی تھی۔ میرا تو رواں رواں تمہارا نام پکارتا تھا۔ پھر جی محبت کا یہ انجام کیوں ہوا؟  
”اماں!“ مومو کی بیٹھی آواز نوران کو خیالات کے سمندر سے بھینچ لائی۔  
”جی۔“ نوران نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

”آج چودھری کے ہاں پروئے آئے تھے تو انہوں نے کھانا جلاری پکالیا اور مجھے بھی چھٹی دے دی۔“ مومو اس کے پاس چارپائی پر بیٹھ کر بتانے لگی۔

”اچھا.....“ نوران اٹھ کر بیٹھ گئی اور مومو کے چہرے کی طرف ہلکی ہلکی بانٹھ کر دیکھنے لگی۔ لائین کی ہلکی ہلکی روشنی میں مومو اسے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ مومو کی اٹھان بالکل ویسی تھی جیسے کسی زمانے میں نوران کی تھی۔ مومو، نوران کا بچپن تھی اور یقیناً جوانی میں بھی اس جیسی قیامت نکلتی۔

”یہ ہیرا تو یہاں رُل جائے گا۔ یہ بڑی ہو رہی ہے نوران! تو اس کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ تو سارا دن باہر رہتی ہے، یہ دلاور کے ہاں رہتی ہے اور پھر اس کا جوان لڑکا ہے۔ کیا بھروسہ کسی کی نیت کا۔ تو اسے اس آدمی کو دے دے، جو اس کا صحیح معنوں میں نگہبان ہو، جو اس کے چاروں طرف لوہے کی دیوار کا حصار گرا دے، تاکہ کوئی بھی اس نوخیز کلا کو نہ دیکھ سکے۔“

”مگر کہاں سے لاؤں ایسا شخص؟“ نوران نے دل میں خود سے سوال کیا اور پھر خود ہی جواب دیا۔

”اس کا باپ جو ہے۔ راجا اس کی حفاظت نہیں کر سکتا، اسے اس کے باپ کے حوالے کر کے پُر سکون ہو جا۔ رہا اشو تو وہ لڑکا ہے، کسی نہ کسی طرح پل جائے گا۔ مگر لڑکی رُل کھل کے نہیں پل سکتی۔ یہ دنیا والے لاوارث سمجھ کر ایسی لڑکیوں کو کھلونا بنا دیتے ہیں۔ تو اسے محفوظ ہاتھوں میں دے دے، پیکی بہتری ہے۔ ورنہ شاید آنے والے کل کو یہ بھی نوران بن کر انتقام کی آگ میں اپنا آپ جلا ڈالے اور اسے کچھ بھی حاصل نہ ہو۔“

مومو حیرت سے ماں کو دیکھ رہی تھی، جو اسے اس طرح دیکھ رہی تھی، جیسے پہلی بار دیکھا ہو۔ آخر مومو نے پوچھ ہی لیا۔

”کیا دیکھ رہی ہو اماں؟“

”مومو!..... مومو! تو اپنے بابا کے پاس جائے گی؟“ نوران نے اچانک پوچھا۔  
”نہیں..... میں اماں!“ مومو کانپ کر رہ گئی۔ باپ کو یاد کرنے پر ہی نوران نے اسے کٹا مارا تھا۔ اب اگر بابا کے پاس جانے کا نام لیتی تو وہ یقیناً اسے زندہ گاڑ دیتی۔  
”تو جائے گی..... تجھے جانا پڑے گا اس کے پاس۔ رونا تیرا بچہ ہے، تیرا سائبان ہے، اس کی چھایا تجھ پر ہوگی تو دنیا کی دھوپ تیرا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔ تجھے جانا ہوگا اس کے

پاس۔ میں تیری حفاظت نہیں کر سکتی۔ کیونکہ مجھے تو اپنی زندگی کا ہی پتہ نہیں کہ کتنے دن تو ہے۔ تو جائے گی چودھری شوکت علی کے پاس؟“ نوران نے مومو کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا اور مومو حیران و ششدر ماں کو دیکھے گئی، جو اسے جھنجھوڑتے ہوئے رو رہی تھی۔ آنسو ایک تواتر سے اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔  
پتہ نہیں، یہ آنسو شکست کے تھے یا چودھری کی جیت کے، جو نوران کی آنکھوں میں چلے آئے تھے۔





مؤذن کی روح پرور آواز پر حسب معمول وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ تیکے سے اپنے میلی اور بے شمار سلوٹوں والی چنری نکال کر اوڑھ لی اور نہایت انہماک سے اذان سننے لگی۔ جیسے ہی اذان ختم ہوئی وہ دوبارہ لیٹ گئی۔ یہ اس کی عادت تھی کہ مؤذن کی پہلی ہی آواز ”اللہ اکبر“ پر اس کی آنکھ کھل جاتی اور وہ اٹھ کر نہایت عقیدت سے پوری اذان سنتی اور پھر سو رہتی۔ اسے سوئے تھوڑی ہی دیر گزرتی کہ آنکھیں کھٹ پٹ شروع ہو جاتی۔ پھر نوران اسے دو ہتھڑ مار کر جگاتی تاکہ وہ چودھری دلاور کے ہاں سے لسی لے آئے۔ اور پھر وہ جھنجھلاتی، منہ بسورتی برتن اٹھا کر چلی جاتی۔

آج خلاف معمول آنکھیں بہت ہی پرسکون تھیں۔ نہ ہی ہتھڑ پپ کے چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور نہ ہی نوران نے اسے جگایا تھا۔ مومن نے کروٹ لی اور اپنے ساتھ والی چارپائی کی طرف مندی مندی آنکھوں سے دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں۔ وہ ہڑبڑا کر اس طرح اٹھی، جیسے چارپائی بان کی نہ ہو بلکہ اس میں اسپرنگ لگے ہوں۔

نوران کا بستر خالی پڑا تھا، حتیٰ کہ اس پر ایک بھی شکن نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے رات وہ بستر پر سوئی ہی نہ ہو۔

”کہاں گئی اماں؟“ مومن کے ذہن سے یہ سوال چپک کر رہ گیا۔ رات بھی جب ایک بار مومن کی آنکھ کھلی تو چارپائی خالی تھی اور اب بھی نوران کے برابر والی چارپائی پر راجا آرام سے پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ نوران ہی ہمیشہ اسے جگاتی تھی، تب وہ اٹھتا تھا۔

مومن چارپائی سے اُتری اور اندر کمرے میں چلی گئی۔ دروازوں کے نوران اسے نظر نہ آئی تو اس کے چھوٹے سے دل کو انجانے خدشات نے گھیر لیا۔ مومن محسوس کر رہی تھی کہ کئی روز سے نوران کا رویہ اس سے نہایت نرم ہو گیا ہے اور وہ اسے بہت پیار کرنے لگی ہے۔ وہ بار بار اس سے پوچھتی، تُو اپنے بابا کے پاس جائے گی مومن؟ تجھے تحفظ چاہئے ہے۔ سوائے اس کے، تجھے کوئی تحفظ نہیں دے گا۔ اس دنیا میں بیٹھے بیٹے ہیں۔ یہ سب کہہ

ہیں۔ نہ جانے وہ مومن کو سینے سے لگائے کیا کیا کہتی رہتی اور مومن خاموشی سے سنتی رہتی۔ مگر پھر بھی اس نے نوران کو یہ نہیں بتایا کہ وہ اپنے بابا سے ملتی رہتی ہے۔ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں نوران بھڑک نہ اُٹھے، بالکل اس شہڈی راکھ کی طرح جس میں صرف ایک چنگاری ہی ہوتی ہے مگر ہوائے پرشعلہ بن جاتی ہے۔ مگر اسے کیا علم تھا کہ نوران کو آج کل پچھتاوے کی آگ چیں نہیں لینے دے رہی ہے۔ وہ ہر وقت کب انسو ملتی رہتی ہے۔ راجا کو پانے کے لئے اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ اتنی محبت کرنے والے چودھری کو خوار کیا تھا۔ وہ، جو نوران کی ایک ایک ادا پر قربان ہوتا تھا، نوران کی آنکھوں کی نمی چودھری شوکت کے دل میں زخم ڈال رہی تھی۔ وہ جس کی محبت کسری اور صاف تھی، جس محبت کو ٹھکرا کر اس نے راجا جیسے کینہ پرور شخص کو اپنایا تھا اور اسی روز سے اس کے دل کا چین ختم ہو گیا تھا۔ اب آگے اسے کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا اور پیچھے پلٹ کر دیکھتی تو بھی ہر راہ مسدود نظر آتی۔ بعض مرتبہ نوران کا جی چاہتا کہ وہ چودھری شوکت علی کے پاس جائے، ان کے قدموں سے لپٹ کر اپنی زیادتیوں کی معافی مانگے اور ان سے کہے۔

”چودھری! مجھے صرف ایک بار پیار کرو۔ ویسے ہی، جیسے پہلے کیا کرتے تھے۔ تمہارے پیار کی پھوار سے میرا وجود بھیگ جاتا تھا، مگر من میں سلگتی انتقام کی آگ سرد نہ ہوتی تھی..... چودھری! اب تو میں اسی آگ کی لپیٹ میں خود آگئی ہوں۔ میرا پورا پورا راجا کی بے وفائی نے سلگا دیا ہے۔ میں زخمی ہو گئی ہوں، چودھری! میرے زخمی وجود کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لو، مجھے پیار کرو..... مجھے پیار کرو۔ تم جیسا پیار راجا نے مجھے کبھی نہیں دیا۔ کیونکہ اس کے دل میں بغض تھا۔ اس نے اپنی قید کا انتقام مجھ سے لیا تھا اور میں اس کے انتقامی پیار کی بو کو بھی نہ پہچان سکی۔ ویسے بھی آج کل کا انسان جھوٹی محبتوں کے لئے جی جان بھڑا کر کرنے کو تیار ہو جاتا ہے اور سچی محبتوں کی اسے پہچان نہیں رہی۔ اس لئے صاف گو اور پیارے لوگوں کو دکھی کرتا ہے۔“

مگر اب نوران نے سوچا تھا کہ وہ مومن کو چودھری کے حوالے کر دے گی۔ وہ اس کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ کیونکہ مومن بہت تیزی سے بڑھ رہی تھی حالانکہ اسے بڑی محنت سے دو وقت کا کھانا بمشکل نصیب ہوتا تھا، اس کے باوجود وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں سے بڑی لگتی تھی۔ اور جب سے راجا نے نگاہیں بدلی تھیں، نوران کو سب سے زیادہ پریشانی مومن کی تھی۔ وہ سوچتی کہ راجا کا دل تو بدلا ہے، مجھ سے۔ مگر کہیں وہ میری بیٹی کو انتقام کا نشانہ نہ بنائے۔ ہر دم اس کا ذہن شیطان کا گھر بنا رہا۔ طرح طرح کے خیالات، ناگ کی طرح اسے ڈبسنے لگتے۔ اب وہ مومن اور اشو کی چارپائی اپنے ساتھ بچھاتی تھی اور راتوں کو اٹھ کر مومن کو نواں کر اپنا اطمینان کر لیتی اور سو جاتی۔



”اب راجا اتنا کمینہ بھی نہیں ہے..... مگر انسان کو کمینہ بننے دیر نہیں لگتی۔“ اس کا ذہن فوراً اس کی مثبت سوچ کو متنی کر دیتا۔

مومو بہت پریشان تھی۔ اس نے گھر میں نورماں کو ہر ممکن جگہ تلاش کر لیا تھا، مگر وہ نہ ملی۔ تب مومو کچھ سوچتی ہوئی، تیر کی سی تیزی سے راجا کی چارپائی کی طرف بڑھی اور خرائے لیتے ہوئے راجا کو جھنجھوڑ ڈالا۔

”چاچا!..... چاچا!“ اس کی آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔

”کیا مصیبت ہے؟ آلو کی پٹھی، آرام نہیں کرنے دیتی۔“ راجا جھنجھوڑا کر اٹھ بیٹھا۔

”مصیبت تو آگئی ہے چاچا!“ مومو کے لب کپکپائے۔

”کیا مطلب؟“ راجا شیر کی طرح دھاڑا۔

”اماں نہیں ہے۔“ مومو کی آواز بھرا گئی۔

”تو میں کیا کروں؟“ وہ جھنجھوڑا کر بولا۔

”ڈھونڈو ماں کو۔ رات کو بھی میں اٹھی تھی تو ماں بستر پر نہیں تھی۔“ مومو نے کہا۔

”کئی ہوگی کسی شخص کے پاس.....“ راجا کے منہ سے گالیوں کا طوفان اُٹھ پڑا اور مومو

حیرت سے گنگ اُسے دیکھے گئی۔ وہ ایسے نازیبا الفاظ کہہ رہا تھا، جو مومو نے کبھی بھی نہ سنے

تھے۔ پھر ایک خیال مومو کے ذہن میں بجلی کی مانند کودا۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف

لپکی اور دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ اب وہ چھوٹی چھوٹی گلیوں میں تیزی سے بھاگی جا رہی

تھی۔ چند لمحوں بعد وہ گاؤں کے ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔

”کون ہے؟“ اندر سے آواز آئی۔

”ماسی! میں مومو ہوں..... دروازہ کھولو۔“

”مومو!“ شجاع، جو پڑھ رہا تھا، جلدی سے اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ باہر کھڑی مومو

اُس سے لپٹ گئی۔

”تجی!..... تجی!“ مومو کی زبان سے صرف یہی ایک لفظ ادا ہو رہا تھا اور وہ روئے جا

رہی تھی۔ ضبط کا ہر بند ٹوٹ گیا۔

”کیا ہوا مومو؟“ شجاع گھبرا گیا تھا۔ وہ اسے لپٹائے لپٹائے چارپائی تک لایا اور

بٹھا دیا۔

”بچہ! کیا ہوا؟“ مائی رحمت نے مومو کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت سے پوچھا۔

”ماسی! میری ماں.....؟“ مومو نے کہا۔

”کیا ہوا؟“ تجی نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ..... وہ رات سے گھر میں نہیں ہے۔ پتہ نہیں کہاں چلی گئی ہے؟“ مومو نے ایک

انک کر بتایا۔

”راجا اسے ڈھونڈنے نہیں گیا؟“ تجی نے حیرت سے کہا۔

”میں نے کہا تو چاچا گالیاں دینے لگا۔“

”تم اماں کے پاس بیٹھو، میں ماسٹر صاحب کے پاس جا رہا ہوں، انہیں بتاتا ہوں۔“

”تجی! میری اماں کو جلد ڈھونڈ لاؤ۔“ مومو نے نہایت سنجی لہجے میں کہا۔

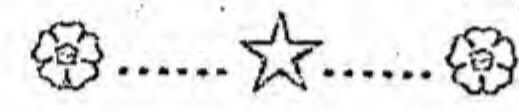
”یہیں کہیں ہوں گی۔ تم فکر نہ کرو، آرام سے اماں کے پاس بیٹھو۔ اور دیکھو، رونا

مت۔“ تجی نے مومو کے آنسو اپنے کرتے سے صاف کئے اور پھر ماں سے بولا۔ ”اماں!

مومو کو روٹی پکا دے۔ یہ کھالے تو کچھ ہوش میں آئے گی۔“

”ابھی آجائے گی تمہاری اماں..... تم فکر مت کرو۔“ شجاع نے اسے تسلی دی اور گھر

سے نکل گیا۔ مومو کو مائی رحمت نے اپنے سینے سے لگا کر بچھنچھنچ لیا۔



چودھری شوکت علی بے قرار تھے۔ انہوں نے پوری رات اپنے کمرے میں ٹہل ٹہل کر گزار

دی تھی۔ تھک جاتے تو چند لمحوں کے لئے صوفے پر بیٹھ جاتے اور پھر ٹہلنے لگتے۔ رات بھر

انہوں نے ایک لمحے کے لئے بھی سگریٹ نہیں بجھنے دیا تھا۔ پورے کمرے میں سگریٹ کی بو

پھیلی ہوئی تھی۔

”میں اس قدر بے قرار کیوں ہوں؟“ انہوں نے کئی بار یہ سوال خود سے کیا مگر جواب

نہ ملا۔ ذہن کی عجیب حالت تھی، دل پر اُداسیاں ٹوٹ کر برس رہی تھیں۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ

یہ برسات دل کے آنگن کو کیوں بھگور رہی ہے۔ اب بھی وہ صوفے کی پشت سے سر ٹکائے،

آنکھیں موندے بیٹھے تھے۔ سگریٹ اب بھی ان کی انگلیوں میں ان کے دل کی مانند سنگ

رہا تھا۔ رات بھر کی بیداری کے باعث ان کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اور حیرت کی بات یہ تھی کہ

نیند اب بھی نہیں آرہی تھی۔ وہ سونے کے ارادے سے بستر پر لیٹتے مگر فوراً اٹھ بیٹھتے جیسے وہ

نوم کا نرم بستر نہ ہو بلکہ اس پر کانٹے بچھا دیئے گئے ہوں۔

اتنی بے قراری انہیں کئی سال پہلے ہوئی تھی، جب راجا ان کی قید سے فرار ہوا تھا۔ پھر

آج وہ اتنے بے قرار تھے۔ دل تھا کہ لمحہ لمحہ ڈوبا جا رہا تھا۔

”یا میرے مالک! آخر کیا ہونے والا ہے؟“ انہوں نے پریشانی سے اپنے دونوں

ہاتھوں میں چکراتا ہوا سر تھام لیا اور پھر آہٹ پر وہ چومک گئے۔

”صبح بخیر چاچا!“ یہ شعیب علی تھا۔ وہ ان کے قریب آ گیا۔

”صبح بخیر۔“ انہوں نے آہستگی سے کہا۔ شعیب نے چومک کر انہیں دیکھا۔ آج انہوں

نے صوبہ معمول شعیب کی پیشانی چوم کر دعا نہیں دی تھی۔



”چاچا شوکی!“

”ہوں۔“ چودھری شوکت علی نے سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر اس کی طرف دیکھا اس کا دل دھل گیا۔ چودھری شوکت علی اپنی انگارہ جیسی سرخ آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”چاچا! کیا ہوا ہے آپ کو؟“ شعیب نے انہیں دونوں بازوؤں سے تھام کر جھنجھوڑ ڈالا۔

”تم بتاؤ شعیبی! مجھے کیا ہوا ہے؟ میں یہ سوال خود سے کر کے تھک گیا ہوں، پر کوئی جواب ہی نہیں ملتا۔“ انہوں نے شعیب کا ہاتھ تھام کر نہایت ہمتی لہجے میں کہا۔

”چاچا! خیر تو ہے؟“

”مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے، جیسے میرا دل بیٹھا جا رہا ہے، شعیبی!..... یوں لگتا ہے، جیسے کچھ ہونے والا ہے۔“

”کہیں چاچی تو یاد نہیں آرہیں؟“ شعیب نے شرارت سے پوچھا۔

”تمہیں مذاق سوچ رہا ہے اور میرے دل پر بنی ہے۔“

”اکیلے پن کی وجہ سے بھی دل پریشان ہو جاتا ہے۔ چلیں، آج سے میں آپ کے کمرے میں سویا کروں گا۔“ شعیب نے ان کے خیالات بٹانے چاہے۔ چودھری شوکت علی صرف اسے دیکھ کر رہ گئے۔ شعیب کی نظریں کمرے میں گردش کرنے لگیں اور پھر وہ چونک گیا۔ سامنے ہی سینٹر ٹیبل پر پڑا ایش ٹرے بھرا ہوا تھا، حتیٰ کہ ٹیبل پر بھی سگریٹ کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔

”چاچا!..... یہ..... یہ اتنے سگریٹ آپ نے پیئے ہیں؟“ مارے حیرت کے وہ آنکھیں پھاڑے، ایش ٹرے کو تک رہا تھا۔

”شاید۔“ چودھری شوکت علی نے ہولے سے کہا اور پھر صوفے کی پشت سے سرٹکا لیا۔

”آپ..... آپ تو کبھی اتنی سگریٹ نوشی نہیں کرتے تھے۔ پھر کیوں.....؟“ شعیب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح ان سے پوچھے۔

”مجھے خود علم نہیں۔“

”اچھا چھوڑیئے ان باتوں کو۔ اٹھئے، نہا کر فریش ہو جائیے۔ ساری قنوطیت ختم ہو جائے گی۔ میں رضیہ سے کہتا ہوں، وہ ناشتہ لگوائے۔“

”میرا جی نہیں چاہ رہا شعیبی!“ وہ ہمتی لہجے میں بولے۔

”آپ ناشتہ تو کر لیں۔ ورنہ میں بھی نہیں کروں گا۔“ شعیب بولا۔

”اب تو اپنی ضرورت کی عادت چھوڑ دو۔“ انہوں نے پیار سے کہا۔

”کیوں؟“ شعیب نے پوچھا۔

”اب تم شادی شدہ ہو۔“

”شادی شدہ ہونے کے بعد پرانی عادتیں چھوڑ دینی چاہئیں؟“ شعیبی نے ہنس کر کہا۔

”بالکل۔ انسان پر ذمے داریوں کا بوجھ بڑھ جاتا ہے۔“ انہوں نے سمجھایا۔

”ابھی تک تو کوئی ذمے داری نہیں پڑی مجھ پر۔“

”یعنی تم ذمے دار بن کر بھی کہہ رہے ہو کہ کوئی ذمے داری نہیں۔“ چودھری شوکت علی نے کہا۔

”چاچا جی! صرف شادی کا نام ہی تو ذمے داری نہیں۔“

”پھر کس کا نام ہے؟“

”ابھی تو میری ساری ذمے داریاں آپ نے اپنے مضبوط کاندھوں پر اٹھائی ہوئی ہیں۔ مجھے فکر کرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟“ شعیب نے ان کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے شوخی سے کہا۔

”بہت کمینہ ہے تو۔“ چودھری شوکت علی اتنی پریشانی کے باوجود مسکرا پڑے۔

”چلئے اٹھیے جلدی سے۔“ شعیب نے انہیں ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور پھر ہاتھ روم کا دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ جب چودھری شوکت علی اندر چلے گئے تو وہ پلٹ آیا اور صوفے پر بیٹھ کر سیٹی بجانے لگا۔ مگر اس کا ذہن کہیں اور الجھا ہوا تھا۔ آخر چاچا کیوں پریشان ہیں؟ کیا وہ اپنی پریشانی مجھے نہیں بتائیں گے؟ شاید میں ان کی پریشانی شیر کر سکوں۔ مگر کیسے پوچھوں؟

کیونکر پوچھوں؟..... پورے سترہ روز ہو گئے ہیں انہیں یہاں آئے۔ اب تک تو بہت خوش رہے۔ رات جب پکچر دیکھ کر ہم آئے، تب تک بھی خوش تھے۔ پھر ایسی کون سی بات ہو گئی کہ ایک دم ہی ان کی مندیں اڑ گئیں؟

شعیب علی جتنا اس کتھی کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا وہ اتنی ہی الجھتی جا رہی تھی۔ کوئی بھی سرابا تھ نہیں آ رہا تھا۔

چودھری شوکت علی نہا کر نکلے، کنگھا کیا اور پھر شعیب کے ساتھ باہر آ گئے۔ اس دوران کوئی بات نہیں ہوئی۔ شعیب اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا اور چودھری شوکت علی اپنے خیالوں میں۔ چند لمحے بعد وہ تینوں ناشتہ کر رہے تھے۔ یک دم ہی چودھری شوکت علی بولے۔

”شعیبی! میں سوچ رہا ہوں، آج گاؤں چلا جاؤں۔“

”وجہ؟“ شعیب نے حیرانی سے پوچھا۔

”مجھے بہت دل نہ لیا ہوں۔“



”آپ بہت پریشان ہیں چاچا! اور میں نہیں چاہتا کہ حسن پور جا کر آپ کی پریشانیوں میں اضافہ ہو۔ آپ کو اس قدر پریشان دیکھ کر چاچی ضرور کوئی کچھ کاروائی کریں گی۔“  
”اب وہ کچھ نہیں لگانی مجھے۔“ انہوں نے اطلاع دی۔  
”کیا مطلب؟“

”اب اس نے اتنے عرصے بعد اپنے مقدر سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔ اور جب تقدیر کے لکھے سے سمجھوتہ ہو جائے تو انسان بڑا پرسکون ہو جاتا ہے۔“ وہ جذب کے عالم میں بولے گئے۔

”میں سمجھا نہیں؟“ شعیب واقعی کچھ نہ سمجھا تھا۔  
”اوجھلے! اسے اب یہ احساس ہو گیا ہے کہ ہم دونوں کی شادی میں ہمارا کوئی تصور نہیں، یہ سب مقدر کا کھیل تھا۔ اور جب یہ بات اس کے ذہن میں بیٹھی تو وہ ٹھیک ہو گئی۔“  
”اوہ!“ شعیب علی کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔  
”پھر بھی چاچا جی! آپ آج نہیں جائیں گے۔“ رضیہ نے نہایت دُلاڑ سے کہا۔  
”وہ کیوں؟“

”اپنی بہو کی پکیاں بھی تو کھا کر دیکھیں۔“ شعیب علی نے شوخی سے رضیہ کی طرف دیکھا۔

”اب تو میں آتا جاتا رہوں گا۔ اور بھی میری لونہ (بہو) بہت چنگی ہے۔ مجھے تیری پسند یہ فخر ہے شعیبی! خدا تم دونوں کو سکھی رکھے۔“  
”آمین!“ شعیب زور سے بولا اور چودھری شوکت علی ہنس دیے۔ تب شعیب نے ان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ کاش چاچا! آپ ہر دم ہنستے مسکراتے رہیں۔ میرے حصے کی خوشیاں بھی اللہ آپ کو دے دے۔“

☆.....☆

دن خاصا چڑھ آیا تھا۔ مومو کی نظریں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ شجاع ابھی تک نہیں آیا تھا۔ مائی رحمت نے مومو کو زبردستی تھوڑی سی روٹی کھلا دی تھی۔ مومو تھوڑی تھوڑی دیر بعد رونے لگتی، پھر بڑی مصومیت سے مائی رحمت سے پوچھتی۔

”مائی! میری ماں مل جائے گی نا؟“

”ہاں پتر! تو فکر نہ کر۔“ وہ اُسے دلا سادیتی۔

”آج شجھو میری وجہ سے اسکول بھی نہیں گیا۔“

”کوئی فرق نہیں پڑتا ایک روز نہ جانے سے۔ صبح بائیک کے وقت پڑھنے بیٹھ جاتا۔“

”بہت محنت کرتا ہے۔ رب ضرور اس کی مراد پوری کرے گا۔“ مائی رحمت کا لہجہ بیٹے کی

”میں سے پُور پُور تھا۔“  
”مائی! کیا مراد ہے شجھو کی؟“

”نوج میں جانا چاہتا ہے۔ ملک کار کھولا جانا چاہتا ہے۔“ وہ مومو کو باتوں میں الجھائے رکھنا چاہتی تھی۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ مومو نے کہا۔

تب ہی کھٹکا ہوا۔ مومو نے جلدی سے دروازے کی سمت دیکھا، جہاں سے شجھو گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ اُس کے کندھے جھکے ہوئے تھے اور چہرے پر اُداسیوں کے سائے منڈلا رہے تھے۔ لگتا تھا جس کام کے لئے وہ گیا ہو، وہ پورا نہ ہوا ہو۔ اس کے پیچھے ہی ماسٹر مراد تھے۔ مومو جلدی سے چارپائی سے اُتری اور شجھو کے قریب پہنچ کر بولی۔

”میری ماں کا پتہ چلا؟..... کہاں ہے میری اماں؟“

شجاع خاموش تھا۔ کہتا تو بھلا کیا کہتا؟ بس خالی خالی نظروں سے مومو کے مر جھائے چہرے کو دیکھ کر رہ گیا، جہاں آنسوؤں کے اُن گنت نشان تھے۔ رونے کی وجہ سے آنکھیں نوج گئی تھیں اور سرخ ڈور لہرا رہے تھے۔

”تم بولتے کیوں نہیں؟..... کہاں ہے میری اماں؟“ مومو نے اسے خاموش دیکھ کر جھوڑ ڈالا اور پھر اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ ”بتاؤ، کہاں ہے اماں؟ تم ڈھونڈ کر کیوں نہیں لائے اسے؟“ وہ روتے ہوئے چھوٹے چھوٹے کئے شجھو کے سینے پر مار رہی تھی۔

”تم اپنے گھر جاؤ۔ تمہاری ماں گھر میں ہے۔“ ماسٹر مراد نے مومو کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے گلگیر آواز میں کہا۔

”کیا اماں گھر میں ہے؟“ مومو ایک جھٹکے سے شجھو سے علیحدہ ہو گئی۔

”ہاں..... مگر اس حالت میں نہیں ہے، جس میں تم اُسے دیکھنا چاہتی ہو۔“

”کیا.....؟“ مومو کے دروازے کی طرف بڑھتے قدم رک گئے۔

”وہ اس دنیا سے بہت دُور چلی گئی ہے، جہاں جلد یا بدیر سب کو پہنچنا ہے۔“ ماسٹر مراد کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ مومو کو نوراں کی موت کی خبر کس طرح دیں۔ مگر وہ ذہین لڑکی تھی، لمحے کے ہزارویں حصے میں سمجھ گئی کہ ماسٹر مراد کی اتنی لمبی تمہید کا مطلب کیا ہے۔

”ناں..... نہیں..... یہ جھوٹ ہے۔ میری اماں نہیں مری..... یہ جھوٹ ہے۔“ مومو کی آنکھیں پھر برس پڑیں۔ وہ رُک کی نہیں اور تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔

”ماسٹر جی! یہ ہوا کیسے؟“ مائی رحمت نے پوچھا۔

”ہم دونوں نے گاؤں کا ہر گھر دیکھا۔ نوراں کا کہیں پتہ نہیں چلا۔ تھوڑی دیر پہلے میں اور شجھو بیٹوں میں مومو کی ماں کو دیکھ کر واپس آ رہے تھے کہ کنویں کے پاس لوگوں کو جمع دیکھ



کردہاں پہنچ گئے اور وہیں پتہ چلا کہ نوریاں کی تلاش میں ہم نے جو احمد پور کا چہرہ چھو جھان بارہ تو کنوئیں کے پانی کی سطح پر تیر رہی تھی۔  
”اوہ!“ مائی رحمت نے کہا۔

”لوگوں نے اندر اتر کر اُس کی لاش نکالی۔ پتہ نہیں کیوں اس نے خرد کشی کی۔ کم از کم مومو اور اشو کا تو خیال کرتی۔“

”بے چاری بہت پریشان رہتی تھی۔ سنا ہے، راجا آج کل خادم کی بہن میں دلچسپی لے رہا تھا۔“ مائی رحمت نے ماسٹر مراد کو اطلاع دی۔

”بزدل تھی۔ ڈٹ کر مقابلہ کرتی۔ فضول میں جان گنوا دی۔ اب پتہ نہیں، دوسری عورت ان دونوں محسوسوں سے کیا سلوک کرے۔ سنا ہے، مومو تو نوریاں کے پہلے شوہر سے ہے۔ اب بھلا راجا کیا رکھے گا اُسے؟“ وہ بولے گئے۔

”ہم مومو کو رکھ لیں گے۔ کیا خیال ہے اماں؟“ شیخ نے ایک دم ہی فیصلہ کر لیا۔

”راجا کہاں مانے گا۔“ مائی رحمت بولی۔

”اگر مومو راضی ہو جائے تو وہ کیسے نہیں مانے گا۔“

”پھر بھی۔“ انہوں نے کہا۔

”بھئی تم ماں پیٹے بحث کرنے لگ گئے ہو۔ آپا! آپ جائیں مومو کے گھر۔“

”ہاں، میں جاتی ہوں۔“ مائی رحمت کو ایک دم ہی خیال آیا۔ اس نے چار پائی پر پڑی

چادر اوڑھی اور گھر سے نکل گئی۔

مومو جب گھر میں داخل ہوئی تو اس کا پورا آنگن گاؤں کی عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ جس

جس کو بھی نوریاں کی موت کی اطلاع ملی تھی، وہ سب کام چھوڑ کر اس کے گھر آ گئی تھیں۔

موت اور زندگی تو سب کے ساتھ ہے اور کام تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ویسے بھی نوریاں کا

یہاں کون رشتے دار تھا، جو آتا۔ گاؤں والوں نے آج تک ان کے ہاں کسی کو آتے جاتے

نہیں دیکھا تھا اور وہ لوگ خود بھلا کب کہاں گئے تھے؟ جب سے احمد پور میں آ کر بے تھے،

کبھی بھی کوئی ایسی رات نہ تھی، جو انہوں نے احمد پور سے باہر گزاری ہو۔

اب سب عورتیں اس کی چار پائی کے چاروں طرف بیٹھی تھیں، جہاں نوریاں سفید چادر

میں ابدی نیند سوئی ہوئی تھی۔ جب مومو دوڑی ہوئی آئی اور نوریاں کی لاش پر گر پڑی تو کتنی

ہی چیخیں نکل پڑیں۔ مومو نے نوریاں کے اوپر سے چادر کھینچ لی تھی اور نوریاں کا چہرہ دونوں

ہاتھوں میں تھامے سسکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔

”اماں! ٹو کہاں چلی گئی تھی؟..... میں نے ہر جگہ تلاش کروایا۔ اماں! ٹو بولتی کیوں

نہیں؟ مجھے مار اماں! میں تیرے پوچھے بغیر تجھے تلاش کرنے گھر سے چلی گئی۔ اماں! بول۔“

مومو اب پٹی سے اپنا سر ٹکرا رہی تھی۔ عورتیں اُسے سنبھال رہی تھیں، مگر نہ جانے اس میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی کہ وہ سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ پھر روتے روتے ایک دم اس کی نظر اشو پر پڑی، جو قریب ہی خالی خالی نظروں سے کبھی ماں کے مُردہ چہرے کو دیکھتا اور کبھی روتی بلکتی مومو کو۔ مومو نے اشو کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا اور چیخ کر بولی۔

”اشو! آج ہم یتیم ہو گئے ہیں۔ ہماری ماں مر گئی ہے۔“ اور اتنا کہنے کی دیر تھی، اشو

نے بھوں بھوں کر کے رونا شروع کر دیا۔ کتنی ہی آنکھیں ان ننھے مُنے بہن بھائی کو روتے

دیکھ کر اشک بار ہو گئیں۔ لیکن نوریاں کو اشو اور مومو کی چیخیں بھی ابدی نیند سے نہ جگا سکیں۔

ظہر کے بعد نوریاں کو احمد پور کے قبرستان میں دفن دیا گیا۔ حتیٰ کہ کفن کے لئے بھی راجا

کے گھر سے ایک دھیلا نہ نکلا۔ نوریاں کو کفن بھی چودھری دلاور نے دیا تھا۔ آخر وہ ان کے گھر

کی پرانی ملازمہ تھی۔ راجا ان کا حراز تھا اور یہ ان کا فرض تھا۔ حالانکہ کبھی کسی حراز کے

ہاں موت ہو جاتی تو وہ لوگ کفن دفن کا انتظام خود کرتے۔ راجا واحد شخص تھا جس کے گھر سے

یہی کے کفن کے لئے پیسے نہ نکل سکے۔ سب نے سوچا کہ چندہ کر کے کفن خریدا جائے، مگر

چودھری دلاور کے دل میں نہ جانے کیا نیکی آئی کہ اسی نے انتظام کر دیا۔





شام کا لنگجا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ بہت سے پنکھ پکھیر و نیلے آکاش پر قطار اندر قطار اپنے آشیانوں کی طرف اڑے چلے جا رہے تھے۔ اس وقت دینو، راجا کے سونے گھر میں داخل ہوا۔ سب سے پہلے لوبان کی خوشبو نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر آنگن میں دیکھا۔

مومو اور اشوزمین پر بیٹھے ہوئے تھے، جبکہ راجا چارپائی پر دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا ہوا تھا۔ دینو ہولے ہولے آگے بڑھا۔ راجا اپنے خیالات میں اتنا مستغرق تھا کہ اسے دینو کے آنے کی خبر ہی نہ ہوئی۔ دینو اس کے قریب پہنچ کر کھٹکارتا تو راجا نے سر اٹھایا۔

”اوہ!“ اس کے ہونٹ ہلے۔ وہ ایک دم اٹھا اور دینو سے لپٹ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اشو اور مومو بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

”کیا ہوا آخر؟“ دینو نے راجا کو دونوں بازوؤں سے تھام کر خود سے علیحدہ کیا۔

”کچھ مت پوچھو دینو!..... میں لٹ گیا۔ تباہ ہو گیا۔ میرا گھر اجڑ گیا۔ حالانکہ میں نے یہ نہیں چاہا تھا۔ وہ غلط سمجھی تھی۔ میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ اپنی جان گنوا دے۔“ راجا نے ہاتھ پر مکا مارتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“ دینو کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ جلدی سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔

پھر ہولے ہولے راجا نے نورائے مرنے کا قصہ سنا دیا، مگر اپنی زیادتی کے بارے میں کچھ نہ بتایا کہ میں نے اس سے کہا تھا مجھے کسی اور کا ہوتے نہیں دیکھ سکتی تو مر جا۔ اور اس نے جواب میں کہا تھا، میں مر کر دکھا دوں گی راجا! مگر میرے جیتے جی تم کسی کے نہیں ہو سکتے۔ یہ باتیں تو راجا کسی کو نہیں بتا سکتا تھا۔ پھلا بتا کر مصیبت مول لیتی تھی۔

”تم کیسے آئے ہو؟“

”مجھے نورائے نے بلایا تھا۔“ دینو نے کہا۔

”تمہیں؟“ راجا نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں۔ میں ایک ہفتہ پہلے آیا تھا۔“ دینو نے اطلاع دی۔

”کیوں؟“ راجا کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

”اس روز تم دونوں کی لڑائی سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ لڑائی کی جڑ مومو ہے۔ کیوں نہ میں اسے لے جاؤں اور چودھری کے حوالے کر دوں۔ تمہاری غیر موجودگی میں میں دو مرتبہ پھر آیا اور نورائے بڑی مشکل سے راضی ہوئی، مومو کو چودھری کو دینے کے لئے۔ اس نے مجھے آکر کہا تھا کہ میں آکر مومو کو لے جاؤں۔“

”اوہ..... تو نورائے نے کافی دن پہلے منصوبہ بنایا تھا اپنی موت کا۔“ راجا نے دل ہی دل میں سوچا۔

”اور میں آج مومو کو لینے آیا ہوں۔“

”تو لے جاؤ۔“ راجا نہایت سفاکی سے بولا۔ ”دینو! یہی لڑکی ہے جو کنڈا بن کر ہر وقت میرے سینے میں چبھتی رہتی ہے۔ اسی نے ہم دونوں کی محبتوں کے درمیان نفرتوں کی خلیج پیدا کی۔“

”یہ تو معصوم ہے راجا! تم نے اپنی غلطیوں سے خلیج پیدا کی۔ ورنہ نورائے نے تمہاری محبت کی خاطر کیا نہیں کیا۔ اپنا عیش و آرام اور چودھری کی طوفانی محبت کو ٹھکرا کر اس نے نہیں حاصل کیا اور تم نے اسے موت کی نیند سلا دیا۔“ دینو نے راجا کو گھورتے ہوئے کہا۔

”خودکشی اس نے کی ہے، میں نے تو مرنے کو نہیں کہا تھا۔“ راجا تنک کر بولا۔

”جب مرد کی نظریں بدلنے لگتی ہیں تو عورت سمجھ جاتی ہے کہ اس کا دل بھی بدل گیا ہے۔ نورائے بے وقوف نہیں تھی۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ جیت کر بھی ہار گئی ہے۔“

دینو نے بڑے پتے کی بات کہی۔

”اگر تم مومو کو لینے آئے ہو تو ابھی لے جاؤ۔ ویسے بھی نورائے نے خود ہی تمہیں بلایا تھا۔“ راجا نے بے زاری سے کہا۔

”ہاں۔“ دینو نے ایک طویل سانس لی اور پھر مومو کی طرف دیکھا، جو اپنی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو بھرے دینو اور راجا کو دیکھ رہی تھی۔ دینو نے سر کے اشارے سے اسے قریب بلایا۔ مومو دوڑ کر آئی اور دینو کے پھلے ہوئے بازوؤں میں سما گئی۔ دینو کو وہ پہچانتی تھی کیونکہ کبھی کبھی وہ اس کے بابا کے ساتھ آتا تھا۔

”تو میرے ساتھ چلے گی نا؟“ دینو نے روتی ہوئی مومو کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”میں نہیں روؤں گا۔ تجھے روکنے والی چلی گئی ہے۔ جو کچھ لینا ہے، لے اور چلی جا۔“



”بابا! میں بھی بی بی کے ساتھ جاؤں گا۔“ اشو زور سے بولا۔

”وہ اپنے باپ کے پاس جا رہی ہے۔ تو اپنے باپ کے پاس رہ۔“ راجا نے آگے بڑھ کر اشو سے کہا۔

”نہیں، میں بھی جاؤں گا۔“ وہ چل گیا۔

”بکو اس نہ کر۔“ راجا کا ہاتھ اٹھا اور اشو کے پھول جیسے گال پر جم کر رہ گیا۔ ”او بد بخت! یہ تیری مہر تھی بہن ہے، سگی نہیں ہے، سمجھا؟“ راجا لفظ چبا چبا کر بولا۔ مومو سہمی ہوئی ہرنی کی طرح اشو کو روتے دیکھ رہی تھی۔ اس کے آنسو مومو کے دل کو آرے کی طرح چیر رہے تھے۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور اشو کو لپٹا لیا۔ مگر اسی لمحے راجا نے اشو کو بالکل اس طرح نوچ کر پرے کیا، جیسے بلی کے بلوگڑے کو خود پر سے نوچ کر پھینکا جائے۔

”زیادہ محبت نہ جتا اور جا، اپنے چوہری باپ کے پاس۔ ہم غریب ہی بھلے۔ آج سے تو بھول جا کہ اشو کا تجھ سے کوئی رشتہ ہے۔“ راجہ نے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا۔ ”میں چلی جاؤں گی، مگر ایک بار مجھے اشو کو پیار تو کرنے دو چاچا!“ مومو نے ہلتی لہجے میں کہا۔

”کوئی ضرورت نہیں۔ لے جاؤ دینو! اس سے کنڈے کو۔“ راجا نے چیخ کر دینو سے کہا اور اشو کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لی۔ اشو مچلتا رہا۔ ”بی بی!..... بی بی!“ پکارتا رہا اور وہ ہونٹ کاٹتی ہوئی، آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے اپنے ویر کو دیکھتی ہوئی دینو کے ساتھ گھر کی دہلیز پار کر گئی۔ باہر گلی تک اشو کی دل خراش چیخیں مومو کا دل ادھیڑ رہی تھیں۔ مومو اپنے گھر کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی اور اس کے آنسو لڑیوں کی طرح آنکھوں سے بہنے لگے۔

اسی وقت نہ جانے کہاں سے ٹھو آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چنگیر اور ایک دیکھی تھی۔

”مومو!..... تو یہاں کیا کر رہی ہے؟“

”میں جا رہی ہوں۔“ مومو سسکی لے کر بولی۔

”کہاں جا رہی ہے؟ چل گھر، میں تمہارے لئے کھانا لایا ہوں۔ دوپہر کو بھی تم لوگوں نے نہیں کھایا۔“ شجاع نے کہا۔

”ہاں بیٹا! یہ جا رہی ہے۔“ دینو نے کہا تو شجاع چونک کر پلٹا۔ اس نے دینو کو دیکھا نہیں تھا۔

”کیا آپ کے ساتھ؟“ شجاع نے برتن نیچے رکھ دیئے۔

”ہاں۔“ دینو نے جواب دیا۔

”آپ اس کے کیا لگتے ہیں؟“ شجاع نے دیکھوں کی طرح جرح کی۔

”میں اس کے باپ کا ادنیٰ سا ملازم ہوں۔“ دینو بولا۔

”مومو کے باپ کا؟“ شجو کی آواز میں حیرت کا عنصر نمایاں تھا۔

”ہاں۔ مومو بہت بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ کئی مربے ہیں اس کے باپ کے۔ اور اب

یہ اپنے بابا کے پاس رہے گی۔“ دینو ہولے ہولے بولتا رہا اور شجو کو یوں لگ رہا تھا، جیسے کوئی اس کا دل مٹھی میں لے کر مسل رہا ہو۔ اندر ہی اندر دراڑیں سی پڑتی جا رہی تھیں۔

”مومو! اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا۔ تو سسکی رہے، میری تو یہ دعا ہے۔“ شجو کے لب کپکپا کر رہ گئے۔

”شجو! تم میری ماں کی قبر پر ہر جمعرات کو جایا کرنا۔ دیا جلانا، پانی چھڑکنا۔ وہ خوش ہو

گی۔“ مومو نے شجاع کے ہاتھ تھام کر درد بھرے لہجے میں کہا۔

”میں ضرور جاؤں گا۔ تم بے فکر رہو۔“ شجاع نے اس کا ہاتھ تھپکا۔ مومو اسے دیکھ کر رہ

گئی۔

”اور ہاں شجو! تم میرے ویر اشو کا بھی خیال رکھنا۔“ مومو نے کہا اور پھر دینو کی انگلی

تھام کر آگے بڑھ گئی۔ شجو وہیں کھڑا کھڑا سوچتا رہا، پھر اس نے نیچے پڑے برتن اٹھائے اور

راجا کے گھر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مگر اب ایک عجیب سے احساس نے اسے گھیر لیا

تھا۔ مومو سے اس کے بابا کا نام اور پتہ پوچھ لیتا تو شاید کبھی ملنے چلا جاتا۔

”او میاں شجو! تمہیں دینو نے بتایا تو ہے کہ وہ بہت رئیس آدمی ہے اور رئیس آدمی

غریبوں سے میل ملاقات نہیں رکھتے۔“ شجو کے دل نے راہ دکھائی۔ اس نے ہر خیال کو

جھٹک دیا اور دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ حالانکہ دروازہ چوہٹ کھلا ہوا تھا۔ سامنے ہی راجا اور اشو

بیٹھے تھے۔ اشو تو ابھی تک آنکھوں کو مسلتے ہوئے روئے جا رہا تھا۔

”آؤ شجو!“ راجا اس کے ہاتھ میں روٹی کی چنگیر دیکھ کر کھیل اٹھا۔ صبح سے ایک کھیل

بھی تو حلق میں اڑ کر نہیں گئی تھی اس کے۔ روٹی دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”میں آپ لوگوں کے لئے کھانا لایا ہوں۔“

”بالکل جی نہیں چاہ رہا۔“ راجا نے اوپری لہجے میں کہا۔

”دیکھیں چاچا! مرنے والوں کے ساتھ مرا تو نہیں جاتا نا؟ یہ روٹی تو زندگی کی اہم

ضرورت ہے۔ کھانے سے منہ موڑنے سے فائدہ؟ جب تک زندہ ہیں، کھانا ہی پڑے گا۔“

شجو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”تم کہتے ہو تو کھا لیتا ہوں۔ ورنہ جی تو نہیں چاہتا۔“ راجا نے گلوگیر آواز میں کہا اور

چار پائی پر آلتی پالتی مار کر روٹی کھانے لگا۔ مگر اشو نے روٹی کو ہاتھ نہیں لگایا۔

”بی بی بھی تو بھوکی ہے۔ شجو بھائی! اُسے بلاؤ، وہ بھوکی ہے۔“ اشو روئے جا رہا تھا۔



راجا نے اچھی طرح پیٹ پوجا کر لی۔ نئے سرے سے اس کے اندر طاقت بھر گئی تو اس نے بی بی، بی بی کی فکر کرنے والے اشو کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ ٹچو نے اشو کو بچانے کی بہت کوشش کی، مگر ایک بھر پور مرد کے سامنے ٹچو کیا کر سکتا تھا۔

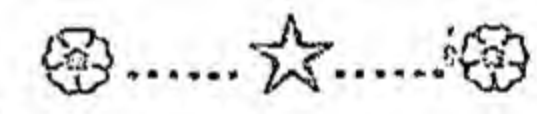
اس طرح اشو کے دل میں اپنے باپ کے خلاف نفرت کی پہلی اینٹ چھنی گئی۔ نفرت کی بنیاد راجا نے اشو کے دل میں رکھ دی تھی۔ اشو سوچنے لگا۔

”بابا بہت گندا آدمی ہے۔ بہت ہی خراب۔“ جتنا اس کا ذہن تھا، اتنی ہی اس کی سوچ بھی تھی۔

پھر ٹچو نے راجا سے کہا۔ ”چاچا! میں اشو کو لے جاتا ہوں۔ ہمارے گھر اس کا دل بہل جائے گا۔ آپ پریشان ہیں اور یہ مزید آپ کو پریشان کرے گا۔“

”لے جاؤ اس راں راں کے مرے کو۔“ راجا نے روتے ہوئے اشو کی طرف تھارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بڑا آیا بی بی کا چہیتا۔“

”چلو اشو! میرے گھر، پھر بعد میں آ جانا۔“ شجاع نے نہایت محبت سے اشو کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ اشو ایک دم ہی اٹھ کھڑا ہوا، جیسے وہ بھی یہاں نہ رہنا چاہتا ہو۔ اور پھر شجاع، اشرف کی انگلی تھامے راجا کے سونے آگن کو مزید سوتا کر کے نکل آیا۔



رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بس کبھی کبھی جھینگروں کی آوازیں اس سناٹے میں ارتعاش پیدا کر دیتی تھیں۔ دینو کئی بار ان سنسان راستوں سے راتوں کو گزرا تھا، مگر کبھی اسے خوف نہیں آیا تھا۔ پر نہ جانے آج کیا بات تھی کہ وہ خوف زدہ تھا۔ اس نے پیٹھ پر مومو کو لادا ہوا تھا۔ بھلا وہ معصوم جان کہاں تک پیدل چلتی۔ سارا راستہ تو وہ روٹی آئی تھی اور اب وہ دینو کے کندھے سے سر ٹپکے سوئی ہوئی تھی۔ دینو خوف زدہ اس لئے تھا کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ ورنہ یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پورے حسن پور میں پھیل جاتی کہ رات کو دینو ایک بچی کو لایا ہے۔ اور کیا خبر، چودھری طالب علی چوکتا ہو جاتے۔ وہ بہت ذہین تھے اور ہر بات فوراً ہی سمجھ جاتے تھے۔ دینو چاہتا تھا کہ اس وقت تک انہیں یہ معلوم نہ ہو، جب تک کہ چودھری شوکت علی کراچی سے واپس نہ آجائیں۔

دینو اپنے گھر میں داخل ہوا تو خلاف معمول اس کی بیوی کینر جاگ رہی تھی۔

”اتنی رات کو آئے ہو دینو؟“

”چودھری کے کام سے چلا گیا تھا۔“

”یہ لڑکی کون ہے؟“ کینر نے دینو کی پیٹھ پر لدی مومو کی طرف حیرت سے دیکھا۔

”یہ پوچھو کہ یہ کون نہیں ہے۔“ دینو نے پیچھے ہاتھ لے جا کر مومو کو بازوؤں میں بھرا

اور اسے خالی بستر پر لٹا دیا، جو کینر نے اپنے شوہر کے لئے بچھایا تھا۔ ”میں سمجھی نہیں۔“ کینر نے حیرت سے شوہر کی طرف دیکھا۔

”یہ مومو ہے۔“ دینو بولا۔

”کون مومو؟..... تم پہیلیاں کیوں بچھو رہے ہو؟“ کینر زچ ہو کر بولی۔ دینو نے اسے بازو سے پکڑا اور اندر کمرے میں لے جا کر بولا۔

”دیسے تو عورت ذات کو کوئی بات نہیں بتانی چاہئے۔ کیونکہ عورت پیٹ کی ہلکی ہوتی ہے۔“

”اب اتنی بھی ہلکی نہیں ہوتی۔ دینو! تمہارا ہر راز میرے سینے میں رہے گا۔“ کینر نے کہا۔

اور پھر دینو نے ہولے ہولے کینر کو چودھری شوکت علی کی شادی سے لے کر اب تک کے حالات سنا دیئے۔ وہ حیرت سے گنگ یہ باتیں سنے جا رہی تھی۔

”اب جب تک چودھری نہیں آ جاتا، یہ یہیں رہے گی۔ کسی کو پتہ نہ چلے کہ کوئی مومو نامی لڑکی ہمارے گھر میں ہے۔ زرینہ اور انوری کو بتا دینا کہ میرے کسی دوست کی لڑکی ہے۔“

”انہیں میں سمجھا دوں گی۔ تم فکر نہ کرو۔ مجھے تو یہ دکھ ہے کہ اپنا چودھری کتنا دکھی ہے۔ اب اس کے پتر کا کیسے پتہ چلے گا، دینو؟“

”یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔ نوران نے بتایا ہی نہیں۔“ دینو نے بالوں میں انگلیاں پھرتے ہوئے پریشانی سے کہا۔

اس سے پہلے کہ کینر کوئی سوال کرتی، گاؤں کی مسجد سے مؤذن کی آواز پر دونوں خاموش ہو گئے۔

”سویر تو ہو گئی زرینہ کی ماں! اب تو روٹی کا بندوبست کر۔ مومو بھوکا ہے۔ رات بھی میں نے بہت کوشش کی کہ روٹی کھالے، مگر باپ کی طرح ضدی ہے۔ خود بھی بھوکا رہی اور مجھے بھی بھوکا رکھا۔“ دینو بولا۔

”ہاں، بس ابھی لو۔“

”حلوہ بھی بنا لینا۔ پراٹھے اچھے ہونے چاہئیں۔ اور اسے نہلا کر زرینہ کا کوئی جوڑا پہننے کو دے دینا۔ اپنی زرینہ، مومو سے بڑی ہے، مگر مومو اس کے برابر لگتی ہے۔“ دینو نے کہا۔

”میں نے غور سے دیکھا بھی نہیں کہ پتہ چلے۔“ کینر بولی اور دونوں کمرے سے باہر آ گئے۔ دینو چومک گیا۔ مومو پیٹھی ہوئی تھی اور نہایت انہماک سے اذان سن رہی تھی۔

”تو سوئی نہیں پتر؟“



”اذان سن رہی ہوں۔“ مومو نے معصومیت سے جواب دیا۔ ”یہ میرے بابا کا گھر ہے؟“

”نہیں، یہ میرا گھر ہے۔ تو کسی کو نہ بتانا کہ تو اپنے بابا کے پاس جائے گی۔ ابھی چودھری جی کراچی گئے ہوئے ہیں نا۔“

”بھئی مجھ سے پچھلے ہفتے ملنے نہیں آئے۔“

”ہاں۔ ابھی تک تو انہیں آ جانا چاہئے تھا۔ نہ جانے کیوں نہیں آئے۔ جیسے ہی وہ لوٹے، میں تمہیں لے جاؤں گا ان کے پاس۔“ دینو نے محبت سے کہا۔

”یہاں تم خوش رہو گی، زرینہ! اور انوری سے کھیلنا۔ کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔“ کنیر نے مومو کو خود سے لپٹا لیا۔ مومو حیرت سے اُسے دیکھنے لگی۔

”یہ میری بیوی ہے۔“ دینو نے مومو کو حیران دیکھ کر کہا۔ ”جا بھلی مانس! کھانا تیار کر میری دہی بھوکی ہے۔“ دینو کا لہجہ مومو کی محبت سے چور چور تھا۔

کنیر چلی گئی تو دینو چار پائی پر لیٹ گیا۔ اس کے ذہن میں جوار بھاٹا آیا ہوا تھا۔ سوچوں نے اس کے دماغ کو آکٹوپس کی طرح جکڑ لیا تھا۔



”شوکت!“ زہرہ بیگم نے انہیں درپے میں کھڑے دیکھ کر پکارا۔

”ہوں۔“ چودھری شوکت علی پلٹے۔ زہرہ بیگم ان کے قریب ہی کھڑی تھیں۔

”جب سے آپ کراچی سے لوٹے ہیں، مجھے کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔ کوئی خاص وجہ ہے؟“ زہرہ بیگم نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے محبت سے پوچھا۔

”نہیں..... پریشان نہیں ہوں۔“ انہوں نے جلدی سے سر ہلایا۔

”پھر اتنے گم صم کیوں ہیں؟..... خاموشی کی وجہ؟“

”پہلے میں کون سا بولتا ہوں؟“ انہوں نے زہرہ بیگم کا ہاتھ تھام لیا۔

”مگر اندرونی پریشانی آپ کے بشرے سے عیاں ہے۔“ زہرہ بیگم نے محبت سے کہا۔

”ہاں..... دل کی وارداتوں اور ہر ٹوٹ پھوٹ کا اندازہ چہرے سے با آسانی لگایا جا سکتا ہے۔“ چودھری شوکت علی ایک طویل سانس لے کر بولے۔

”مجھے بھی نہیں بتائیں گے؟“ زہرہ بیگم نے اتنے لاڈ سے کہا جیسے وہ انہیں ہر بات بتاتے رہے ہوں۔

”زہرہ! کوئی بھی بات نہیں۔ آخر کیا بتاؤں آپ کو؟“ وہ زچ ہو کر بولے۔

”پھر اتنے پریشان کیوں ہیں؟“

”یہی وجہ تو میں خود سے پوچھ پوچھ کر ہار گیا ہوں۔ پتہ نہیں کیوں میرا دل اندر ہی اندر

بیٹھا جا رہا ہے۔ بعض مرتبہ تو یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے میرا دم گھٹ رہا ہو۔“ چودھری شوکت علی نے نہایت شکست خوردہ لہجے میں کہا اور ہولے ہولے چلتے ہوئے مسہری پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔

”شععی سے ملے تھے آپ؟“

”ہاں۔“ انہوں نے جھوٹ بولنا مناسب نہ سمجھا۔

”ٹھیک تو ہے؟“ زہرہ بیگم نے پوچھا۔

”ہوں!“

”آپ نے کہا نہیں کہ واپس آ جائے اور لالہ سے معافی مانگ لے؟“

”میں کیوں کہوں؟ باپ بیٹے کا معاملہ ہے، خود جانیں۔ جیسی کریں گے، ویسی بھریں گے۔ یہ تو قدرت کا اصول ہے، اس ہاتھ لے اس ہاتھ دے۔“ چودھری شوکت علی ٹکیے سے ٹپک لگاتے ہوئے بولے۔

”پھر بھی، شععی بچہ ہے۔“ انہوں نے شعیب کی طرف داری کی۔

”اس روز تو آپ کہہ رہی تھیں کہ وہ بچہ نہیں رہا۔ ہر دم ہماری تضحیک کرتا ہے۔“ وہ طنز سے بولے۔

”وہ تو میں نے غصے میں کہا تھا۔ آپ کو چاہئے کہ اُسے سمجھائیں۔ لالہ سے ناراضگی میں اسی کا نقصان ہے۔“

”ہر بندہ اپنا نفع نقصان خوب جانتا ہے۔ اور اب تو اس کا واپس آنا محال ہے۔“

چودھری شوکت علی کے لبوں پر دلاویز تبسم پھیل گیا اور کسی انجانے احساس کے تحت آنکھیں چمکنے لگیں۔

”خیر، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ لالہ کی زیادتی ہے۔“

”ہاں زہرہ! تمہیں علم نہیں کہ جوانی بڑی شوریدہ سر ہوتی ہے۔ یہ کوئی بند برداشت نہیں کرتی۔ یہ تو اس سیلاب کی مانند ہوتی ہے، جو کسی پشتے کو خاطر میں نہیں لاتا اور ہر شے روندنا ہوا کرتا چلا جاتا ہے۔ دنیا چاند پر پہنچ رہی ہے اور لالہ طالب ان فرسودہ ترین روایات کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔“

”یہ تو ہے۔“ زہرہ بیگم ان کی بات سے متفق ہوتے ہوئے بولیں۔

”اب دیکھیں نا، کوئی تو ہو جو اس جمود کو توڑے، ان روایات کی بوسیدہ دیواروں کو ڈھکا دے۔ شاید یہ کام شععی کے ہاتھوں سے ہو۔“ چودھری شوکت علی بولے گئے اور زہرہ بیگم کے ذہن میں یہ سوال لپکا۔

کہیں شوکت نے تو شععی کو بغاوت پر آمادہ نہیں کیا؟ تب انہوں نے چودھری کے



مسکراتے چہرے کی طرف نظر بھر کر دیکھا اور اپنے ذہن کا کھیلانا سوال ان سے کر دیا۔  
 ”شوکت! ان باپ بیٹے میں پھوٹ ڈلوانے میں آپ کا کتنا ہاتھ ہے؟“  
 چودھری شوکت علی اس غیر متوقع سوال پر ایک دم گھبرا گئے، مگر پھر فوراً ہی خود پر قابو پا کر مسکراتے ہوئے بولے۔

”آپ کو یہ شک کیوں ہوا کہ میں نے پھوٹ ڈلوائی ہے؟“  
 ”آپ کی باتوں سے۔“ زہرہ بولیں۔

”اوہ نہیں..... زہرہ! میں کیا بے وقوف ہوں؟“ انہوں نے زہرہ بیگم کی کمر میں ہاتھ ڈال کر خود سے قریب کر لیا اور نہایت گہمیر لہجے میں بولے۔ ”فضول خیالات کو ذہن میں جگہ نہ دیں۔ جیسی مجھے اپنے بچوں کی طرح پیارا ہے۔ اور کوئی باپ اپنے بیٹے کو غلط راستے پر نہیں ڈالتا۔“ وہ بولے گئے۔ مگر زہرہ بیگم کب سن رہی تھیں؟ وہ تو چودھری شوکت علی کی قربت سے مدھوش ہوئی جا رہی تھیں۔ اور پھر انہوں نے سرشار ہو کر چودھری شوکت علی کے سینے میں منہ چھپا لیا اور ان کے بازوؤں کا حلقہ زہرہ بیگم کے گرد مزید تنگ ہو گیا۔

☆.....☆

”مومو پُتر! آج تو تیار رہنا۔“ دینو نے زرینہ کے پاس بیٹھی مومو سے کہا جو زرینہ کی گڑیا سے کھیل رہی تھی۔

”کیوں چاچا؟“ مومو نے حیران حیران آنکھوں سے دینو کو دیکھا۔ دینو نے اسے اشارے سے اپنے قریب بلایا تو وہ گڑیا چھوڑ کر جلدی سے دینو کے پاس آ گئی۔ وہ ایک ہفتے سے یہاں تھی اور دینو کے اہل خانہ سے خاصی گھل مل گئی تھی۔ سارا دن وہ انوری اور زرینہ سے کھیل میں مگن رہتی، مگر جب رات کو سونے کے لئے بستر پر لیٹتی تو ایک دم نظروں کے سامنے روتا بلکتا اشوا آ جاتا۔ دل میں درد سو سو کروٹیں لے کر بیدار ہو جاتا اور پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔ پھر وہ اشو کی یاد میں کتنے ہی آنسو بہا کر تکیہ گیل کر لیتی۔ اس گھر میں اسے بہت محبت ملی تھی۔ دینو اور کنیر تو ہر دم اس پر صدقے واری ہوتے تھے۔ یہاں آ کر تو وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ یہ گھر اس کی منزل نہیں ہے۔ ابھی اسے آگے جانا ہے۔ پتہ نہیں منزل کتنی دور تھی اور کب تک اسے بھٹکتا تھا۔

مومو، دینو کے قریب پہنچ گئی۔ دینو نے اسے لپٹا لیا اور محبت سے پوچھنے لگا۔  
 ”اپنے بابا سے ملو گی؟“

”ہاں..... کہاں ہیں وہ؟“ مومو نے بے قراری سے پوچھا۔  
 ”وہ رات ہی کراچی سے آئے ہیں۔“ دینو نے ہولے سے بتایا۔  
 ”مجھے لے چلو۔“ مومو بے چین ہو گئی۔

”میں پہلے انہیں تمہارے بارے میں بتا دوں، پھر لے چلوں گا۔ بس تم تیار رہنا۔“  
 دینو نے مومو کو سمجھایا اور چار پائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔  
 ”آپ جلدی آئیں گے نا؟“ مومو نے دینو کا بازو تھام لیا۔  
 ”ہاں، ہاں..... تو بے فکر رہ۔“ دینو نے مومو کا گال چوم کر کہا اور پھر گھر سے نکل گیا۔ وہ سیدھا ڈیرے پر پہنچا تھا۔

”چودھری جی ہیں؟“ دینو نے گامے سے پوچھا۔  
 ”ہنوز آئے ہیں۔ کہہ رہے تھے، مجھے پریشان نہ کیا جائے۔ میں سو رہا ہوں۔“  
 گامے نے بتایا۔

”ٹھیک ہے۔“ دینو واپس پلٹا۔ چند لمحے بعد وہ مومو کو لئے ڈیرے پر پہنچا، دروازہ کھٹکٹائے بغیر ہی پردہ ہٹا کر مومو کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا۔  
 سامنے ہی چودھری شوکت علی ایڑی چیر پر بیٹھے ہوئے آگے پیچھے جھول رہے تھے۔ ان کی آنکھوں پر پلکوں کی چلسن گری ہوئی تھی۔ آہٹ پر انہوں نے آنکھیں کھولتے ہوئے سختی سے پوچھا۔

”گامے! میں نے تجھے منع کیا تھا کہ.....“ مگر باقی الفاظ ان کے حلق میں ہی اٹک کر رہ گئے۔ وہ ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے آنکھیں مل کر بار بار دینو کے ساتھ کھڑی لڑکی کی جانب دیکھا۔ انہیں اپنی بیٹائی پر یقین ہی نہ آ رہا تھا۔  
 ”مالک! آپ سنا نہیں دیکھ رہے، یہ حقیقت ہے۔“ دینو نے کمرے پر چھائے ہوئے جود کو توڑا۔

”یہ..... یہ کیسے آئی؟“ چودھری شوکت علی کی گھٹی گھٹی آواز نکلی۔ پھر وہ عقاب کے مانند جھپٹے اور مومو کو سینے سے لگا لیا۔

”مریم!..... میری دھی!..... تو یہاں کیسے آئی ہے؟ کون لایا ہے تجھے؟..... میں کل تجھ سے ملنے کے لئے آنے والا تھا۔“ وہ مومو کو سینے سے چمٹائے بے ربط سے جملے بولے جا رہے تھے۔

”بابا جانی!..... وہ..... وہ اماں.....“ مومو نے ان کے سینے سے سر رگڑتے ہوئے کہا۔

”کیا ہوا؟“ چودھری شوکت علی نے گھبرا کر پوچھا۔

”اماں مر گئی۔“ مومو کی چیخ نکل گئی۔

”کیا.....؟“ چودھری شوکت علی نے مومو کو ایک جھٹکے سے خود سے علیحدہ کیا اور اس کے ننھے ننھے بازوؤں کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ دیکھتے ہوئے



بولے۔ ”کیا کہہ رہی ہے مومو! تو؟“

”یہ سچ کہہ رہی ہے مالک!..... اب مومو ہمیشہ کے لئے آپ کے پاس آگئی ہے۔“  
دینو نے ان کی حیرانی ختم کرتے ہوئے کہا۔ ”نوراں نے خودکشی کر لی ہے اور مومو کو آپ کے حوالے کر دیا ہے۔“

”دینو.....“ شوکت علی مومو کو چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور دینو کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولے۔

”میں نے چاہا تھا کہ مومو میرے پاس آجائے۔ میں نے وقت سے انصاف مانگا تھا، مگر وقت نے کیسا انصاف کیا ہے کہ میری روح تک چھلنی ہو گئی ہے۔ میں نے کبھی یہ نہیں چاہا تھا کہ نوراں جان سے چلی جائے۔ میں نے یہ انصاف کبھی نہیں مانگا تھا..... کبھی نہیں۔“ چودھری شوکت علی، دینو کے کندھے سے سرٹکا کر پلک پڑے۔ دینو ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گم صم سا، آہنی عزم کے اس شخص کو یوں ہلکتے ہوئے دیکھ کر دکھی ہو گیا۔  
چودھری کو وقت نے کیا دیا ہے؟ جلن، خلش، تڑپ۔ اور کیا ملا ہے انہیں؟ ہرگز رتا ہوا لمحہ ان کے زخمی دل کو مزید زخمی کر دیتا ہے۔ یہ بڑا آدمی، جس کے پاس دنیا کی ہر آسائش ہے، یہ اس قدر دکھ اٹھاتا ہے۔ کیا اسے کبھی بھی سکون نہیں ملے گا؟  
”مالک! صبر کریں۔“ دینو نے گلوگیر آواز میں کہا۔ چودھری شوکت علی نے اس کے کندھے سے سر ہٹایا اور بولے۔

”کیسے صبر کروں دینو!..... کیسے صبر کروں؟ وہ میرے گھر سے جانے کے باوجود بھی آج تک میرے دل میں موجود ہے۔ میں جب بھی اپنے اندر دیکھتا ہوں، دل کے ہر خانے میں اسی کی شبیہ نظر آتی ہے۔“ انہوں نے اپنے پٹکے (پکڑی) سے آنسو صاف کئے۔

”تو مالک! آپ اُسے کبھی نہیں بھولے؟“ دینو نے حیرانی سے پوچھا۔  
”بھلا یا تو انہیں جاتا ہے جو دور ہوں۔ مجھے تو وہ ہر دم اپنے قریب نظر آتی۔ دل میں دھڑکن بن کر، جسم میں روح کی طرح اور شریانوں میں خون کی مانند۔ مجھے تو وہ شہ رگ سے بھی قریب لگتی ہے۔ پھر بھلا میں اُسے کیسے بھول جاؤں؟“ وہ کرسی پر ڈھیر ہو گئے۔  
”بابا جان!“ مومو ان کی طرف لپکی اور ان کی گود میں چہرہ چھپا کر رو دی۔ چودھری شوکت علی اس کے بالوں میں ہولے ہولے انگلیاں پھیرنے لگے۔

”دینو! تیرے سامنے نوراں فوت ہوئی؟“  
”نہیں مالک! آپ نے کہا تھا میں اس سے پوچھ کر آؤں کہ آپ کا بیٹا کہاں ہے؟“  
”پھر بتایا اس نے؟“ چودھری شوکت علی نے بے چینی سے پوچھا۔  
”نہیں مالک!“ دینو سر جھکا کر بولا۔

”اوہ!“

”مالک! میں دو مرتبہ اس کے پاس گیا، مگر وہ نہ مانی اور کہنے لگی کہ چودھری بہت خوش قسمت ہے۔ اپنے بیٹے کو بھی خود ہی تلاش کر لے گا اور مجھے یقین ہے کہ رب اسے ایسا وسیلہ بنائے گا کہ چودھری خود اپنے بیٹے تک پہنچ جائے گا۔ بس تم آنا اور مومو کو ہمیشہ کے لئے لے جانا۔ مومو کی اب میں حفاظت نہیں کر سکتی۔ اسے تحفظ کی ضرورت ہے، جو صرف چودھری دے سکتا ہے۔“ دینو نے سر جھکائے جھکائے کہا۔

”آخری وقت بھی وہ چوٹ دے گئی۔“ چودھری شوکت علی خالی خالی لہجے میں بولے۔  
”پھر جس روز کا نوراں نے کہا تھا کہ میں مومو کو آکر لے جاؤں، میں شام کو پہنچا تو گھر میں راجا، مومو اور اشو تھے۔ راجا نے کہا کہ لے جاؤ اسے اور میں لے کر آ گیا۔ آپ کراچی سے آئے نہیں تھے اس لئے یہ ایک ہفتہ میرے گھر رہی۔“ دینو نے کہا۔  
”دینو!“ انہوں نے پکارا۔

”جی مالک!“ دینو نے سعادت مندی سے کہا۔  
”کیا واقعی نوراں نے میرے پتر کے بارے میں کوئی اشارہ بھی نہیں کیا؟“ انہوں نے نہایت آس سے پوچھا۔

”نہیں..... بالکل نہیں مالک!“ دینو گڑبڑا کر بولا۔ مگر دل میں یہ خیال ضرور آیا کہ چودھری کو الہام کیسے ہونے لگے؟ یہ تو شکر تھا کہ چودھری شوکت علی اب مومو کی طرف متوجہ تھے اور دینو کا گڑبڑانا نہیں دیکھ سکے تھے۔ دینو کو یاد آیا، جب وہ آخری بار نوراں سے ملا تھا۔  
”نوراں! بتا دو کہ چودھری کا بیٹا کہاں ہے؟..... وہ بہت بے قرار ہے۔“  
”میں بھی اپنے بیٹے کے لئے بے قرار ہوں۔“ نوراں کی آواز بھرا گئی۔  
”کیا مطلب؟“ دینو نے حیرت سے پوچھا۔

”دینو چاچا! صرف راجا کو پانے کے لئے میں نے بہت کچھ گنویا ہے۔ تبھی تو مجھے سکون نہیں ملا۔ میرا بیٹا لالی کے پاس ہے اور لالی کا مجھے علم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ اور خدا کے واسطے، تم اپنے چودھری کو نہ بتانا، ورنہ وہ لالی اور شیدے کا برا حشر کر دے گا۔ مجھے یقین ہے کہ لالی اسے مجھ سے بھی زیادہ محبت دیتی ہوگی۔“  
”اوہ..... تو جو بچہ لے کر وہ حویلی آتی تھی، وہ چودھری کا جگر گوشہ تھا؟“ دینو نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں۔“ نوراں ایک آہ بھر کر بولی۔ ”وہ میرا بھی تو جگر گوشہ ہے۔“  
پھر دینو وہاں سے آیا اور سیدھا دنیا پور چلا گیا۔ مگر وہاں سے پتہ چلا کہ مومو نے اپنے بڑی بچوں کے شہر جا چکا ہے اور دینو نے سوچا، مالک! ابھی آپ کی قسمت آپ کا ساتھ نہیں



دے رہی۔

دینو کو یہ امید تھی کہ کریمو سے ملاقات ہو جائے گی تو وہ شیدے کا پتہ بتا دے گا۔ کیونکہ دینو ہر ماہ کریمو کو رقم دینے آتا تھا، جو کریمو، شیدے کو منی آرڈر کر دیتا تھا۔ یہ شیدے کے بیٹے کے لئے چودھری کا مخصوص وظیفہ تھا۔ تب دینو کا جی چاہا کہ وہ دل کھول کر قہقہے لگائے۔ باپ بیٹے کا خرچ برداشت کرتا ہے مگر اسے پتہ نہیں کہ یہی میرا بیٹا ہے۔ بعض مرتبہ تقدیر بھی کیسے کیسے وار کرتی ہے..... بڑے کا تو موقع ہی نہیں دیتی بندے کو۔ اور دینو نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ چودھری شوکت علی کو بالکل نہیں بتائے گا کہ نوران نے ان کے بیٹے کے بارے میں کوئی اشارہ کیا ہے۔ کیا فائدہ، مصیبت تو دینو ہی کو کاٹنی پڑتی۔ اب وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پاتا تھا کہ چودھری شوکت علی کے ایسے کام کرے۔ ان کے دوستوں اور دشمنوں کی تلاش میں مارا مارا پھرے۔ اگر وہ نہ ملیں تو جھاڑ سنے۔

”دینو! کیا سوچ رہا ہے تُو؟“ چودھری شوکت علی کی آواز اُسے خیالات کے بھنور سے نکال لائی۔ وہ اس کے قریب کھڑے پوچھ رہے تھے۔

”جی..... جی مالک! کچھ نہیں سوچ رہا۔“ دینو نے ہڑبڑا کر کہا۔

”نہیں، کچھ تو سوچ رہا ہے تُو۔“ وہ ہنس کر بولے۔

”سوچ رہا ہوں کہ اب مومو کہاں رہے گی؟“

”میرے پاس۔“ چودھری شوکت علی سینے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

”رنگ محل میں.....؟“ دینو نے اس طرح انہیں دیکھا، جیسے ان کی بات پر یقین نہ آ

رہا ہو۔

”یہ کراچی رہے گی۔ شعبی کے پاس۔“ چودھری شوکت علی نے دینو کے کندھے پر

ہاتھ رکھ کر کہا۔ پھر وہ سرگوشیوں میں دینو کو شعبی کے بارے میں بتانے لگے۔

”یعنی آپ نے شعبی کی شادی کرا کے چودھری طالب کو شکست دے دی۔“ دینو نے

اس کی بات کے اختتام پر پوچھا۔

”بھرپور شکست تو نہیں دی، سولہ آنے میں چار آنے دی ہے۔ کیونکہ ابھی لالے کو علم

نہیں ہے۔ جب پتہ چلے گا تو وہ میری خوشیوں کا پہلا دن ہو گا۔“ چودھری شوکت علی نے

غرور سے کہا اور دینو ان کے چمکتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر رہ گیا، جہاں آنے والی خوشیوں کی

چمک گلال بن کر پھیلی ہوئی تھی۔



مومو، دینو کے ساتھ جا چکی تھی اور جاتے وقت کتنا مچلی تھی، کتنا تڑپی تھی..... روتے ہوئے چودھری شوکت علی سے لپٹ کر بولی تھی۔

”باباجی! میں اب کہیں نہیں جاؤں گی..... صرف آپ کے ساتھ رہوں گی۔“

”بیٹا! ابھی تم جاؤ۔“ ان کی آواز بھرا گئی۔

”آخر آپ مجھے اپنے گھر میں کیوں نہیں رکھتے؟“ وہ چل کر بولی۔

”رکھوں گا..... ضرور رکھوں گا۔ بس وقت کا منتظر ہوں پُتر!“ چودھری شوکت علی نے

مومو کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور ہولے ہولے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے

کہنے لگے۔ ”مومو! تیرا بابا بہت مجبور ہے۔ خدا دنیا کے کسی باپ کو اتنا مجبور اور بے بس نہ

کرے۔“

”آپ اتنے بڑے ہو کر بھی مجبور ہیں؟“ مومو نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت

سے پوچھا۔

”میں بڑا کب ہوں؟“ وہ تمسخر سے ہنسے۔ ”میں تو مومو جان! بہت چھوٹا ہوں.....

مٹی کے معمولی ذرے جیسا۔“

مومو حیرت سے ان کا جذبات سے عاری چہرہ دیکھنے لگی۔

”دینو! اسے لے جاؤ، ایسے ہی کوئی آنہ جائے۔ میں جلد ہی مومو کو شعبی کے پاس بھیج

وں گا۔“ چودھری شوکت علی نے قریب کھڑے دینو سے کہا اور پھر مومو کی پیشانی چومتے

ہوئے بولے۔

”مومو پُتر! تم شعبی کے پاس جاؤ گی نا؟“

”آپ بھی چلیں گے؟“ مومو نے پوچھا۔

”ہاں..... ہاں، ضرور۔ اب تم دینو کے ساتھ جاؤ شاباش۔“ انہوں نے پکارا۔

پھر دینو کچھ کہے بغیر مومو کو لے کر کمرے سے نکل گیا۔

اب چودھری شوکت علی کتنی دیر سے کمرے میں ٹھہرتے جا رہے تھے۔ ان کے دماغ میں

ہزاروں خیالات چکرارہے تھے، مگر کوئی خیال مکمل نہ تھا۔ ایک بات ہمتی تو دوسری اس کی جگہ



انہوں نے اپنا چکرانا ہوا سر تھام لیا اور خود کو پلانگ پر گرا دیا۔ چند لمحے بعد ہی وہ منہ میں جپے میں چہرہ چھپائے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ بالکل ایسے، جیسے کسی بچے کا پسندیدہ کھلونا ٹوٹ جائے تو وہ چل چل کر رونا شروع کر دیتا ہے۔ یہی حال چودھری شوکت علی کا تھا۔

وہ نورائے کی موت پر رو رہے تھے جو کہ گئے دنوں میں ان کا حسین ترین کھلونا تھی۔ پھر اس کھلونے میں جان پڑ گئی اور اس نے چودھری شوکت علی کو اس قدر دکھ دیئے کہ ان کی روح تک میں چھالے پڑ گئے۔ چودھری شوکت علی نے نورائے کو پا کر ایک کامیابی حاصل کی تھی، مگر اس کے بعد ہر قدم پر اس نے انہیں شکست دی۔ قسمت کا زہرہ ہی ان کے پاس چلا گیا تھا اور وہ جب چاہتی، انہیں پیٹ دیتی۔ اس نے چودھری شوکت علی کی راہوں میں کانٹے بچھائے اور ایک ایسا جال پھینکا کہ وہ اس میں سے کبھی نہ نکل سکے۔ وہ بڑی مشاق شکاری تھی۔ انہیں سرتا پازنچی کیا تھا مگر پھرنے کی بھی اجازت نہ دینا چاہتی تھی۔ مومو کو ان کی محبت و شفقت سے محروم کیا اور ان کے بیٹے کا راز بھی اپنے سینے میں لئے دنیا سے چلی گئی۔ اور وہ اب رو رہے تھے۔ نورائے کی موت پر۔ اُس قاتلہ کی موت نے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔

وہ کیوں نہ روتے؟ آخر نورائے ان کی زندگی میں آنے والی وہ عورت تھی، جس نے ان کی کئی خواہشات پوری کی تھیں اور انہوں نے اسے دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا، پوجا تھا، ہمیشہ ہاتھ کا پھپھولا بنا کر رکھا تھا۔ جو بھی ظلم کرنا تھا، ایک بار ہی کیا تھا اور شادی کے بعد ہمیشہ اس کے زخموں پر محبت کے پھاہے رکھتے رہے۔ اسے کبھی پھول کی چھتری بھی نہ لگائی گئی۔ چودھری شوکت علی اسے ہر وقت خوش رکھنا چاہتے تھے۔ اب نورائے کا دل خوش نہ ہوتا تو بھلا وہ کیا کر سکتے تھے۔ دلوں کے راز تو خدا جانے۔ اور کتنا ظلم تھا اگر وہ اس کی موت پر دو آنسو بھی نہ بہاتے۔

ان کے علاوہ بھلا تھا ہی کون اس کی موت پر رونے والا۔

کیسا برا نصیب لائی تھی نورائے۔ چودھری شوکت علی کو مٹانا چاہا تھا، خود مٹ گئی اور ایسی لڑکی کہ خاک میں مل گئی۔ چودھری شوکت علی ٹپ ٹپ کر رو رہے تھے اور ان کے کپکپاتے لبوں سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ ادا ہو رہے تھے۔

”اللہ میاں جی! یہی بہت ہے۔ دیکھ لیا تیرا انصاف میں نے۔ بڑی کڑی ہے تیری بکری۔ کوئی نہیں جھٹ سکتا۔ اللہ میاں جی! تُو جو رحیم ہے، رحمن ہے مگر اس کے باوجود تیری انجانی آواز ہے۔ تیرا انصاف دنیا کے سارے قوانین سے جدا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں، تیری عزانت میں میرے مقدر کا جو فیصلہ ہوا ہے اس نے میری روح تک کو لرزا کر

لے لیتی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نورائے کی ناگہانی موت پر روئیں یا فلک شکاف قہقہے لگائیں۔ مگر یہ دل..... ہاں یہ دل ہی تھا، جس کی تہوں میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ یہ تڑپ تڑپ کر دہائی دے رہا تھا اور ہمیشہ کی طرح اس کی تڑپ میں ایک ہی آواز شامل تھی، ایک ہی نام وہ تڑپ تڑپ کر پکارے جا رہا تھا۔

”نوری..... نوری..... نورائے.....“

”واقعی میرے رب! تُو بہت بڑا مصنف ہے۔ جو لوگ اپنا فیصلہ تیری سرکار میں دے دیتے ہیں، انہیں تُو مایوس نہیں کرتا۔ تیرے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔ جو بھی تیرے بندوں پر زیادتی کرتا ہے، تُو اس کا بدل ضرور دیتا ہے۔ اور جو زیادتی سہتا ہے اُسے دلی سکون دیتا ہے۔ مگر میں نے یہ انصاف تو نہیں چاہا تھا کہ نورائے اس دنیا میں رہے۔ تُو گواہ ہے، میں نے ہمیشہ مومو کو پانے کی دعا کی ہے۔ کبھی یہ دعا نہیں مانگی کہ مومو، نورائے کی مٹی پھلانگ کر مجھ تک پہنچے۔ اللہ میاں! میں مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو مجرم سمجھ رہا ہوں۔ تیرا یہ انصاف میری سمجھ میں نہیں آیا۔“ واقعی، وہ انجانی آگ میں جل رہے تھے۔ ان کی روح بار بار سولی پر چڑھ رہی تھی۔ اُن کا ذہن کسی صورت بھی اس حادثے کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ مگر تصور میں نورائے کی پانی سے بھگی ہوئی لاش سامنے آ جاتی۔ ان کا اس بات پر یقین کرنے کو جی نہ چاہ رہا تھا، مگر یقین کئے بغیر بھی کوئی چارہ نہ تھا۔

”نور!“ اُن کے لب کپکپائے۔ ”میری روح! تم زندہ تھیں تو مجھے یہ سکون تو تھا کہ کبھی تمہیں دیکھ سکوں گا۔ میں انجانے طور پر ہمیشہ تمہارا منتظر رہا کہ شاید تم لوٹ آؤ۔“

”نور!“..... اگر تم راجا کے پاس دُکھی تھیں تو میرے پاس آ جاؤ..... میں دعویٰ نہیں کرتا کہ میں بہت وسیع دل کا مالک ہوں، مگر تم ایک بار مجھے آزماؤ لیتیں، یقین کرو میرے بازو اب بھی تمہیں سمیٹ لیتے۔ میں گزرا وقت اور تمہاری زیادتیاں ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھلا دیتا۔ میں تمہیں کبھی راجا کا طعنہ نہ دیتا، کیونکہ اس کی طرح کم ظرف نہیں ہوں نور! تمہارا یہ قدم بہت غلط اُٹھا۔ تم نے فضول میں حرام موت کو گلے لگا لیا۔ تم تو مجھ سے انتقام لینا چاہتی تھیں۔ یہ کیسا انتقام تھا، جس کی تم خود بھیٹ چڑھ گئی ہو۔ تمہارے دل میں بھڑکنے والا یہ کیسا لاؤ تھا، جس نے تمہیں کنویں میں چھلانگ لگا کر ٹھنڈا کیا؟ کیا تمہارے انتقام کی آگ سرد ہو گئی؟ تم سامنے ہو تھیں تو تم سے میں یہ سوال ضرور کرتا۔ تم نے تو اپنی چھری سے اپنا ہی گلا کاٹ لیا۔ شاید بعد میں تمہیں شدت سے یہ احساس ہوا ہو گا کہ لالی ٹھیک کہتی تھی۔

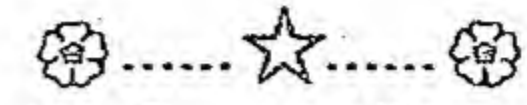
”محبتوں کو یوں نہیں ٹھکرانا چاہئے۔“

”نور! تم جی سے چلی گئی ہو اور مجھے لگتا ہے، میری روح بھی جیسے نکلی جا رہی ہو۔“

”نور!..... نور جان!“



رکھ دیا ہے۔ یہی بہت ہے۔“ چودھری شوکت علی ٹھنڈے سپینے میں نہا گئے تھے، اُن کا رواں رواں کانپ گیا۔



لالی پورے گھر میں چکراتی پھر رہی تھی۔ اُسے کسی بھی کل چین نہیں آ رہا تھا۔ بس اس کے ذہن میں ایک ہی سوال ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا۔

چند سال بعد جب علی یہی سوال اٹھائے گا تو پھر کیا ہوگا؟

آنے والا خطرہ وہ ابھی سے محسوس کر رہی تھی۔ مگر مستقبل کے خوف سے وہ ہراساں ہو گئی تھی۔ حالانکہ بات کچھ بھی نہ تھی۔ آج دوپہر کو جب علی اسکول سے لوٹا تو ہمیشہ کی طرح لالی اس کی منتظر تھی۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ شیدا ابھی آج جلد ہی فیکٹری سے آ گیا تھا۔ علی اب بڑا ہو گیا تھا، اس لئے محلے کے اور بچوں کے ساتھ ہی اسکول چلا جاتا اور انہی کے ساتھ آ بھی جاتا تھا۔ اب اس کے لانے لے جانے کا چکر باقی نہ رہا تھا۔ لالی حسب معمول اس کی منتظر رہتی۔ وہ آتے ہی اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیتا، لالی اس کے گال چومتی تو جواباً وہ بھی مال کا گال چومتا اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔ یہ گزشتہ پانچ برس سے اس کا معمول تھا۔

آج جب علی اسکول سے واپس آیا تو ہمیشہ کی طرح لالی کی پھیلی ہوئی بانہوں میں سما نہیں۔ اس کا منہ ہٹھولا ہوا تھا۔ لالی حیران تھی اور مارے حیرت کے گنگ ہو گئی تھی۔ اس کی بانہیں کٹی ڈالی کی طرح گر چکی تھیں۔ وہ اپنے آپ پر قابو پا کر تیزی سے آگے بڑھی اور علی کو لپٹاتے ہوئے، گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

”کیا بات ہے میرے چاند؟“

”کچھ نہیں امی جی!“ وہ بدستور ناراض تھا۔

”پھر آج تیرا رویہ بدلا ہوا کیوں ہے؟“ لالی نے بے قراری سے پوچھا۔

”میں سمجھا نہیں۔“ علی نے مصومیت سے کہا۔

”پھر کیا بات ہے؟“ لالی رو ہانسی ہو گئی۔

”کچھ بھی تو نہیں۔“ علی پریشان ہو کر بولا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس

طرح بتائے، اُس کا ننھا سا ذہن بہت پریشان ہے۔

”کسی لڑکے سے لڑائی تو نہیں ہوئی؟“ شیدا ابھی کمرے سے باہر نکل آیا۔

”نہیں۔“ علی نے سر کو متنی جنبش دی۔

”پھر کیا بات ہے؟ جلدی بتا، میرے دل میں ہول اٹھ رہے ہیں۔“ لالی نے بے

قراری سے کہا۔

”علی کی ماں! تم عورتوں کا دل عجیب ہے۔ کوئی بات ہو نہ ہو، ہول اٹھنا شروع ہو

جاتے ہیں۔“ شیدا نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر علی کو گود میں اٹھا کر اندر لے آیا اور چار پائی پر بٹاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں پُتر! کیا بات ہے؟“

”ابو جی! آپ مجھے سچی بات بتائیں گے؟“ علی نے اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں

گاڑ دیں۔

”بھلا اولاد سے بھی کوئی باپ جھوٹ بولتا ہے؟“ شیدا نے کہا۔

”ابو جی! آپ کا نام کیا ہے؟“ علی نے ایک دم ہی پوچھ لیا۔

”اے، آج پچھ رہا ہے۔ بھئی تجھے پتہ تو ہے کہ تیرے باپ کا نام شیدا ہے۔ سن علی کی ماں! تیرا پُتر آج پو سے ناں پچھ رہا ہے، کل دادا کا نام پچھے گا۔“ شیدا، لالی کی طرف دیکھ کر ہنسا۔

”تو پھر میرے رپورٹ کارڈ پر میری ولدیت کے خانے میں شوکت علی کیوں لکھا ہوا ہے؟“ علی نے پریشانی سے پوچھا۔ بچہ تو تھا ہی، فوراً مطلب کی بات بتا کر شیدا کے لئے آسانی پیدا کر دی۔ مگر لالی کو یوں لگا، جیسے اس کے ذہن میں کہیں دھماکا ہوا ہو اور یہ نام اس کے لئے دھماکے سے کم تو نہ تھا۔ لالی کا رنگ سرسوں کے پھول کی مانند ہو گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا، اس کے جسم میں سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا گیا ہو۔ شیدا ابھی علی کا سوال سن کر گڑبڑا گیا تھا۔ اس نے لالی کی طرف دیکھا، جو خالی خالی نظروں سے شیدا کو دیکھ رہی تھی۔ شیدا نے اس کے ذہن میں ایک خیال کوندا، اس کے لبوں پر مسکراہٹ کی لکیر کھینچ گئی۔ اس نے علی کو لپٹا لیا اور محبت سے ہنستے ہوئے بولا۔

”تجھے آج پتہ چلا ہے میرا صحیح نام؟“

”میں نے کبھی اپنے رپورٹ کارڈ پر بھی نہیں دیکھا۔“

”پھر آج تمہیں کیسے پتہ چلا؟“ شیدا بولا۔

”آج ہمارا رزلٹ نکلا ہے نا ابو جی!“ علی نے اس کی طرف دیکھا۔

”رزلٹ!“ لالی اور شیدا نے منہ سے بیک وقت نکلا۔

”وہ ششما ہی امتحان ہوئے تھے نا، ان کا نتیجہ نکلا ہے۔“

”اچھا، اچھا..... کیا رہا نتیجہ بھئی؟“ شیدا نے اشتیاق سے پوچھا۔

”فرسٹ آیا ہوں۔“ علی نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ اس کے لہجے میں خوشی کی رمت بھی نہ تھی۔

”ارے واہ۔“ شیدا نے مارے مسرت کے اُسے لپٹا لیا۔ مگر اس نے سنا، علی کہہ رہا تھا۔

”ابو جی! جب میرا نام پکارا گیا اور میں نے اس پر جا کر اپنا رپورٹ کارڈ لیا، ہیڈ ماسٹر

صاحب نے مجھے شاباش دی اور ہاتھ ملایا، پھر میرے دوستوں نے مجھ سے رپورٹ کارڈ لے



لیا اور نمبر دیکھنے لگے۔ تب ہی میرا کلاس فیلو وسیم بولا۔ ”کیا تمہارے ابو کا نام شوکت علی ہے؟“

”پھر تم نے کیا جواب دیا؟“ لالی کی آواز بمشکل نکل سکی۔

”میں تو خود حیران رہ گیا۔ پھر وسیم میرا جواب سنے بغیر دوسرے لڑکے کی طرف متوجہ ہو گیا تو میں جواب نہ دے سکا۔“ علی نے نہایت مصحوبیت سے کہا۔

”اوجھلے پُتر! میرا ناں شوکت علی ہی ہے۔ تیری دادی پیار سے شیدا کہتی تھی تو سب ہی کہنے لگے۔“ شیدے نے ہنستے ہوئے کہا۔

”سچ ابو جی؟“ علی کے چہرے پر سرخی پھیلنے لگی۔

”لے، اپنی ماں سے پوچھ لے۔ ہم لوگ شروع سے ہی اکٹھے رہتے ہیں۔ کیوں علی کی ماں؟“ شیدے نے لالی کی طرف دیکھتے ہوئے تصدیق چاہی۔

”ہاں بیٹا!“ لالی کی پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ جھوٹ بولنا بہت مشکل فن ہے نا۔

”اب تو ناراض نہیں ہو؟“ شیدے نے پوچھا۔

”تو ابو جی! میں ناراض کب تھا؟“ علی، شیدے سے لپٹ گیا اور پھر دونوں ہنس دیئے۔ مگر لالی کے لبوں پر مسکراہٹ تک نہ آسکی۔ چند سال بعد جب یہی سوال علی اٹھائے گا تو کیا ہوگا؟ یہ سوال اس کے ذہن میں چکرار رہا تھا۔

اس نے علی اور شیدے کو کھانا نکال کر دیا مگر خود ایک نوالہ بھی حلق سے نہ اتار سکی۔ علی نے لالی کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر اُسے منایا، اُس کے گال چومے مگر علی کی اتنی شدتیں اور محبتیں بھی اسے مسکرانے پر مجبور نہ کر سکیں۔ کھانے کے بعد وہ دونوں آرام کرنے لیٹ گئے تو لالی، کریمو کے ہاں چلی آئی۔ کریمو کا گھر بھی ان کے برابر ہی تھا۔ وہ کتنی دیر تک حمیدہ سے باتیں کرتی رہی مگر اس کے ذہن سے چپکا سوال نہ ہٹ سکا، بالکل اس چمکاؤ کی طرح جو دیوار سے چھٹ جائے تو مشکل ہی سے اُترتی ہے اور سوال بھی چمکاؤ سے کم نہ تھا۔ شام کو علی، کریمو کے بچوں کے ساتھ کھیلنے گراؤنڈ میں چلا گیا۔ تب لالی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں شیدے سے کہا۔

”شیدے! اگر پھر کبھی علی نے یہ سوال کر دیا، تو؟“

”پھر کی پھر دیکھی جائے گی۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔

”میں نے پہلے بھی تجھے کہا تھا کہ اسکول میں علی کی ولدیت میں اپنا نام لکھا۔ اگر ایسا کرتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔“ لالی کو غصہ آ گیا۔

”نہیں لالی! یہ سخت گناہ ہے کہ کسی کی اولاد کو خود سے منسوب کیا جائے۔“ شیدا بولا۔

”تو گناہ ثواب کے چکر میں رہا اور کل کو علی ہم سے نفرت کرنے لگے، پھر؟“ لالی نے

خندہ ظاہر کیا۔

”نہیں لالی! ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ پتہ ہے، اگر کتے کا پلہ بھی پالا جائے تو وہ بھی مرتے دم تک گھر نہیں چھوڑتا۔ پھر علی تو انسان کا بچہ ہے۔“ شیدا پُرسوج لہجے میں بولا۔ علی کے سوال پر چکر اتو وہ گیا تھا، مگر پریشانی ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا۔

”شیدے! میرا دل ہول رہا ہے۔“ لالی کی آنکھیں برس پڑیں۔

”تو سمجھا اپنے دل کو پگی! بس اب میرا سروں کا رڈ علی سے چھپا کر رکھنا کیونکہ اس پر

رشید مجر لکھا ہوا ہے۔“ شیدا اپنی پریشانی چھپانے کے لئے زور سے ہنس دیا۔

”تو بے وقوف! تو تبدیل کر دالے ناں اپنا ناں۔“ لالی نے رائے دی۔

”میں ٹائم کیپر سے بات کروں گا۔ اگر ایسا ہو جائے تو اچھا ہے۔“ شیدے نے کچھ

سوچتے ہوئے کہا تو لالی کے چہرے پر سکون نظر آنے لگا۔

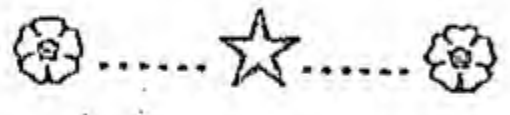
”اچھا جا، تو سبزی لے آ۔ نہیں تو رات کے کھانے کو دیر ہو جائے گی۔“ لالی کو ایک دم

ہی خیال آ گیا۔

”لا، پیسے تو دے۔“

چند لمحوں بعد شیدا سبزی لینے چلا گیا اور لالی کا ذہن پھر خیالات کی آماجگاہ بن گیا۔ وہ اب پورے گھر میں بولائی بولائی پھر رہی تھی اور یہ سوال اس کے ذہن پر ہتھوڑے کی مانند برس رہا تھا۔

چند سال بعد جب علی بھی یہی سوال اٹھائے گا تو پھر کیا ہوگا؟



راجا اُسے بری طرح پیٹ رہا تھا مگر وہ ایک بات ہی دہرائے جا رہا تھا۔

”بی بی کے پاس جاؤں گا۔“

”اوئے کمینے! وہ اپنے پیو کے پاس چلی گئی ہے۔“ راجا جھنجھلا کر بولا۔

”میں بھی اس کے پاس رہوں گا۔“ وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔

”وہ تجھے قتل کر دے گا۔ تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔“ راجا دانت کچکچا کر بولا۔

”بی بی مجھے بچالے گی۔“ وہ بولا۔

”اوبہد معاش! تیرے ذہن سے آخر وہ کیوں نہیں نکلتی؟“ راجا تھک کر بیٹھ گیا۔

”بابا! مجھے بی بی کے پاس چھوڑ آؤ نا۔“ اشو نے ہاتھ جوڑ کر نہایت لہجے میں کہا۔

اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

”وہ بہت دُور چلی گئی ہے اشو! میں تجھے کیسے سمجھاؤں؟“ راجا پریشان ہو گیا۔

”کہاں چلی گئی ہے؟ مجھے بتاؤ نا۔“



”وہ ریل گاڑی پر بیٹھ کر گئی ہے۔ مجھے نہیں پتہ کہاں گئی ہے۔“ راجا غصے سے پھنکارا۔  
”تم نے زبردستی اسے نکالا ہے۔ میں بی بی کے پاس جاؤں گا۔“ اشو نے پھر راگ الاپنا شروع کر دیا۔

”اوائے بد بخت! جامر۔ کسی کھوہ میں کود جا۔ وہ کمینہ مر گئی، تجھے ساتھ لے کر نہ مری۔“  
راجا کی زبان سے مغلظات کا طوفان اُٹھ پڑا۔ پھر وہ اٹھا اور اشو کو اٹھا کر چارپائی پر بیٹھ دیا۔  
اشو دو فٹ چارپائی پر اُچھلا اور گرتے ہوئے اُس کا سر پائے پر لگا۔ اب بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ اشو کی چیخوں نے پورا گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔

راجا حیرت سے اس کی چیخیں سن رہا تھا۔ سرخ سرخ خون دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ پھر ایک دم ہی خون کی محبت نے اس کے اندر جوش مارا۔ اس نے چیختے ہوئے اشو کی طرف دیکھا، جس کی چیخیں اب سسکیوں میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں۔ راجا نے لپک کر اسے بازوؤں میں اٹھایا اور چند لمحے بعد وہ زخمی اشو کو اٹھائے گاؤں کی گلیاں بھاگتے ہوئے طے کرتا ہوا ڈاکٹر کے پاس جا رہا تھا۔ گاؤں کا ڈاکٹر وہاں سے تین فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ ایک دم ہی اس نے بھاگتے بھاگتے اشو کی طرف دیکھا، جس کی سسکیاں بھی تھم گئی تھیں اور اس کے لب ہل رہے تھے۔ راجا نے غور سے سنا، وہ کہہ رہا تھا۔

”بی بی..... پاس..... بی بی..... پاس۔“

بس یہی دو لفظ اُس کی سمجھ میں آ سکے۔ وہ اور تیزی سے بھاگنے لگا۔

”ڈاکٹر صاب! پہلے میرے پتر کو دیکھو۔“ راجہ نے کلینک پہنچتے ہی ڈاکٹر سے کہا۔ اُس کی سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی۔

”اُدھر لٹا دو۔“ ڈاکٹر نے ایکز امینیشن ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔ راجا نے پھرتی سے اشو کو لٹا دیا۔ ڈاکٹر نے نہایت غور سے اشو کو دیکھا۔

”وہ..... چھت سے گر پڑا ہے۔“ راجا گڑبڑا کر بولا۔

”اوہ!“ ڈاکٹر کے ہونٹ سکڑ گئے۔ پھر وہ راجا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”مجھے افسوس ہے، تم نے بہت دیر کر دی۔“

”جی.....“ راجا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”آسان سا مطلب ہے کہ تم اُس کے کفن دفن کا انتظام کرو۔“ ڈاکٹر نے کہا تو راجا کو

زمین گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اُف! میری غلطی کی اتنی بڑی سزا مالک!

”نہیں، نہیں.....“ راجا چیخا اور اشو کے بے جان وجود سے لپٹ کر بچوں کی طرح رو

دیا۔ اس وقت کلینک میں گاؤں کے کچھ اور لوگ بھی تھے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے راجا کو سنبھالا، پھر وہ ننھے پھول کی لاش لئے گاؤں روانہ ہو گئے۔ راجا سر جھکائے ان کے پیچھے

پیچھے خاموشی سے چل دیا۔



چودھری شوکت علی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ زہرہ بیگم کو کس طرح بتائیں کہ وہ کراچی جانا چاہتے ہیں۔ شعبی سے ملنے کا بہانہ بھی کارگر نہ تھا۔ کیونکہ چند روز پہلے ہی وہ شعبی کی شادی سے لوٹے تھے۔ زہرہ بیگم کو تو یہی علم تھا کہ وہ مل کر آئے ہیں، اب اتنی جلدی جلدی جانا بھی زہرہ بیگم کو شکوک میں مبتلا کر سکتا تھا اور مومو کو بھی وہاں پہنچانا بہت ضروری تھا۔ یہاں گاؤں میں وہ دینو کے ہاں تھی تو ان کا جی اُسے ہر دم دیکھنے کو مچلتا تھا۔ کتنی مشکلوں سے تو وہ اُن کے قریب آئی تھی اور وہ اتنے مجبور تھے کہ اسے اپنے پاس نہ رکھ سکتے تھے۔ پورا ہفتہ ہو گیا تھا، مومو کو حسن پور آئے اور وہ صرف دو بار اس سے مل سکے تھے۔ گاؤں کے لوگوں کو تو ویسے بھی کھد بد سی تھی کہ یہ نئی لڑکی دینو کے گھر کون آئی ہے؟ اور دینو کی بیوی کینر ہر ایک کو مطمئن کر دیتی۔

دھنسنے کتنی دیر سے یہ سوچ رہے تھے کہ کراچی کیسے جائیں۔ سوچ سوچ کر ان کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا مگر کوئی بہانہ نہیں سوچ رہا تھا۔ تب ہی زہرہ بیگم کمرے میں آئیں تو چودھری شوکت علی کو آنکھیں موندے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے دیکھا۔ حقے کی نے ان کے منہ میں تھی مگر وہ حقہ گڑ گڑا نہیں رہے تھے۔

وہ ان کے برابر ہی بیٹھ گئیں تو چودھری شوکت علی چونکے اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

”کیا سوچ رہے ہیں شوکی؟“ زہرہ بیگم نے محبت سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ ہولے سے بولے۔

”نہیں، کوئی بات تو ہے۔“ زہرہ بیگم نے نئی نوپلی ڈلہن کی طرح اٹھلا کر پوچھا۔

”وہ..... وہ، شعبی یاد آ رہا ہے۔“ چودھری شوکت علی گڑبڑا کر بولے۔

”ابھی تو آپ مل کر آئے تھے اس سے۔“

”ہاں..... مل تو آیا تھا۔ بس اُس کی پیاری پیاری باتیں یاد آتی ہیں۔“ وہ بولے۔

”پہلے تو اتنا یاد نہیں آتا تھا۔“ زہرہ بیگم بال کی کھال نکالتی تھیں۔

”پہلے کی بات اور تھی۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ فون تو کھڑکا دیتا تھا۔ اس کی

آوازیں تو میں سن لیتا تھا، تسلی تو رہتی تھی۔“ چودھری شوکت علی بولے گئے۔ ”کیا آپ کو یاد نہیں آتا؟“

”بہت یاد آتا ہے، شوکت!“ زہرہ بیگم صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور ٹہلنے ہوئے بولیں۔ ”اس کی شرارتیں بھی پیاری تھیں۔ حالانکہ بعض مرتبہ وہ ہمارے ساتھ زیادتی کر جاتا تھا۔ مگر پھر بھی شوکت! مجھے وہ بہت اچھا لگتا تھا۔ کیونکہ.....“ وہ رکیں تو چودھری شوکت علی



بولے۔

”کیونکہ وہ ہمارے دل کی بات کہتا تھا۔ جو باتیں ہم اپنے دل کی دیواروں میں مقید رکھتے ہیں، وہ انہیں سب کے سامنے کہہ دیتا تھا۔ تب وہ باتیں وقتی طور پر ہمیں بُری ضرورت لگتی تھیں، مگر جب سوچا جاتا تو وہ سولہ آنے کی کھری ہوتیں۔“

”بالکل۔“ زہرہ بیگم ایک لمبی سانس لے کر بولیں۔ ”میرا بہت جی چاہتا ہے کہ اس سے ملوں، مگر لالہ طالب سے خوف آتا ہے۔“

”آنا بھی چاہئے۔ آخر وہ ہمارے بڑے ہیں۔“ چودھری شوکت علی فوراً بولے۔

”ہمیشہ ہمارے سروں پر بڑے تلواروں کی مانند تنے رہتے ہیں، ذرا بھی آزادی نہیں ہے کہ کوئی کام اپنی مرضی سے کر لیا جائے۔“ زہرہ بیگم کا لہجہ دکھوں سے بھر پور تھا۔

”آج تو آپ شعیبی کی زبان میں بات کر رہی ہیں۔“ چودھری شوکت علی نے ہنس کر کہا۔ ”شوکت! سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے، بھی ہمیں برا لگتا ہے۔“

”زہرہ! میں شعیبی سے ملنے جانا چاہتا ہوں۔“ چودھری شوکت علی اپنے مطلب پر آگئے۔ ”لالہ کو پتہ چل گیا تو؟“ زہرہ بیگم نے خدشہ ظاہر کیا۔

”آپ کچھ بھی کہہ دیجئے گا۔“ چودھری شوکت علی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”مثلاً؟“ زہرہ بیگم نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”بھئی مثلاً یہی کہ میں آپ کی زمینوں پر گیا ہوں۔“ چودھری شوکت علی نے جلدی سے کہا۔

”ٹھیک ہے، آپ شعیبی کو کچھ پیسے بھی دیتے آئیے گا اور اُسے کہئے گا کہ مجھ سے بھی مل لے۔“ زہرہ بیگم نے کہا۔

”رنگ محل میں تو اس کا آنا بند ہے۔ اور باہر کہیں آپ جا نہیں سکتیں۔“

”سچ بتاؤں تو بھابی سیکنہ بھی تڑپتی ہیں اس کے لئے۔“ زہرہ بیگم نے رازداری سے کہا۔ ”زہرہ! یوں لگتا ہے جیسے شعیبی کے دم سے اس گھر کی خوشیاں نکلیں۔ وہ ہوتا تھا تو یہ گھر

خوشیوں کا گہوارہ ہوتا تھا۔ اور جب وہ کراچی چلا جاتا، تب بھی ہم خوش ہی رہتے تھے۔ مگر اب تو یوں لگتا ہے جیسے لالہ نے اسے رنگ محل سے نکالا ہے تو اس کے ساتھ ہی ہماری خوشیاں بھی چلی گئیں۔“ چودھری شوکت علی ہولے ہولے بولے گئے۔

”ہاں شوکت! آپ اسے کہئے گا کہ لالہ طالب سے معافی مانگ لے، واپس آ جائے۔ رنگ محل کو اس کی خوشیاں لوٹا دے۔“

”اب وہ واپس نہیں آئے گا۔“ ایک دم ہی چودھری شوکت علی کے منہ سے نکلا۔

”کیوں؟“ زہرہ بیگم نے حیرانی سے پوچھا۔

”نہیں، نہیں..... میرا مطلب ہے کہ وہ ضدی بہت ہے۔ اگر وہ واپس آنا چاہتا تو جاتا ہی کیوں؟“ چودھری شوکت علی گڑبڑا کر بولے۔ وہ اپنی زبان کو کوس رہے تھے، جو راز اُگل دینا چاہتی تھی۔

زہرہ بیگم انہیں ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھیں، جیسے دل کی تہوں میں چھپا ہوا ہر راز پا لینا چاہتی ہوں۔ مگر ان کے چہرے پر تو کچھ بھی نہ تھا۔ وہ نہایت اطمینان سے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔

تب ہی چوہی گھبرائی ہوئی سی کمرے میں داخل ہوئی۔

”وہ..... وہ..... مالک! بڑے مالک کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔“

چودھری شوکت علی تیزی سے باہر لپکے۔

”کیا ہوا بھر جانی؟“ چودھری شوکت علی نے طالب علی کی خواب گاہ میں داخل ہوتے ہوئے بے قراری سے پوچھا۔

”پتہ نہیں..... باتیں کرتے کرتے ایک دم ہی لیٹ گئے۔“ سیکنہ بیگم نے روتے ہوئے کہا۔

”لالہ!..... لالہ!“

چودھری شوکت علی نے انہیں ہلایا جھلایا تو انہوں نے دھیرے سے آنکھیں کھول دیں، بولے کچھ نہیں، صرف مسکرا کر رہ گئے اور چودھری شوکت علی نے اطمینان کی سانس لی۔

پھر ڈاکٹر بھی آ گیا۔ چودھری طالب علی کا معائنہ کرنے کے بعد وہ شوکت علی کو ایک طرف لے گیا اور بولا۔

”انہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ معمولی سادل کا دورہ پڑا ہے۔“

”اچھا!“ چودھری شوکت علی نے حیرانی سے کہا۔ نہ جانے کیوں اُن کے اندر ہی اندر خوشیوں کے جگنو جھلکانے لگے تھے۔ مجھے دُکھی کرنے والا بھی سکھ میں نہیں ہے۔ شعیبی نے واقعی لالہ طالب کے کلیجے پر ہاتھ ڈالا ہے اور وہ تڑپ رہے ہیں۔ دل بھی اختیار میں نہیں رہا۔ لمحے کے ہزار دیں حصے میں ان کے ذہن میں یہ خیال آیا۔ بھائی تھے، مگر ان کا دل اس وقت خوشیاں منارہا تھا۔

ڈاکٹر، چودھری طالب علی کو انجکشن لگا کر اور دوائی دے کر جا چکا تھا۔ تب چودھری شوکت علی مسہری کے قریب آئے۔

”بھر جانی! لالہ کو آرام کی ضرورت ہے۔ ویسے جب شعیبی کو اپنی مرضی سے انہوں نے عاق کیا ہے تو پھر یہ دل کے دورے کیا معنی؟“ چودھری شوکت علی، بھائی کی طرف دیکھتے



ہوئے نہایت سفاکی سے بول رہے تھے۔ ”آپ تو بہت مضبوط دل کے مالک تھے لالہ! بن اولاد کے دور ہوتے ہی دل چھوڑ بیٹھے؟“ انہوں نے چودھری طالب علی کے اوپر جھک کر الفاظ چبا چبا کر ادا کئے۔ چودھری شجاعت علی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

”شوکی! تو کیسی باتیں کر رہا ہے؟..... لالہ کی حالت خراب ہے اور تو.....“ چودھری شجاعت علی نے سرزنش کرنا چاہی تو چودھری شوکت علی اُن کی طرف مڑے اور بولے۔

”اب انہیں پتہ چلا کہ یہ دکھ کیسا ہوتا ہے؟“

چودھری شوکت علی نے پھر جواب کا انتظار نہ کیا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئے اور چودھری طالب علی کراہ کر رہ گئے۔ شوکی کا یہ جملہ انہیں زہر میں سمجھی ہوئی برجھی لگا تھا، جو سیدھا سینے میں پیوست ہو کر رہ گیا تھا۔

”شوکی کیا کہہ رہا تھا، لالہ؟“ شجاعت علی نے پوچھا۔

”مجھے خود پتہ نہیں۔ دیوانہ ہو گیا ہے بد بخت۔“ چودھری طالب علی کے ہونٹ بھیج گئے مگر ان کا دُکھی دل یہ اعتراف کر رہا تھا کہ شوکی! تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ دکھ روح تک کدرا کر رکھ دیتا ہے۔ اولاد سے دُوری دنیا میں سب سے بڑا زخم ہے۔ اگر کسی سے دشمنی کرنی ہو تو اس سے اس کے ایک ہی جگر گوشے کو دُور کر دیا جائے تو وہ تڑپتا رہتا ہے۔ انسان، جانور تو نہیں ہے کہ اولاد کو بھول سکے۔ واقعی شوکی! میں نے تمہارے ساتھ ظلم کیا ہے۔ چودھری طالب علی کے دل سے صدا اُبھری مگر فوراً ہی ایک دوسری آواز نے اُس صدا کو دبایا۔

”طالب! تم نے جو کچھ کیا، اچھا کیا۔ آخر اپنی روایات ہر ایک کو پیاری ہوتی ہیں۔ اور شوکی نے ان روایات سے بغاوت کی تھی۔ یہی ریتیں تو ہماری پہچان ہیں، ہمارا ورثہ ہیں۔ جو غلطی شوکی نے کی تھی، اُسے اُس کی سزا ملی اور شعیب نے حکم عدولی کی، اُسے تم نے اس کی سزا دی ہے۔ تمہیں آخر رنگ محل کا سربراہ بنایا گیا ہے۔ تم یہاں کی روایتوں کے رکھوالے ہو۔“

اُن کا ذہن مسلسل اسی بات کی تکرار کئے جا رہا تھا کہ انہوں نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ صحیح ہے اور آنے والا وقت اسے صحیح تسلیم کرے گا۔ مگر دل تھا کہ دُہائی دیئے جا رہا تھا۔

”طالب! تم نے اچھا نہیں کیا۔“

مگر دل کی آواز پر ذہن کی آواز غالب آگئی اور انہوں نے تسلیم کر لیا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، بالکل درست کر رہے ہیں۔ تب انہوں نے نہایت اطمینان سے آنکھیں موند لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگے۔



شعیب علی یونیورسٹی سے لوٹا تھا اور مل جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ تب رضیہ نے اُسے کوٹ پہناتے ہوئے کہا۔

”تم تو کھن چکر بن کر رہ گئے ہو۔“

”یہ زندگی ہی ایسی ہے کہ بھاگتے رہو۔ اگر سستانے بیٹھ گئے تو پیچھے سے آنے والا ریلا تمہیں ملیا میٹ کر جائے گا۔“ شعیب علی نے فلسفہ بگھارا۔

”کون سا چاچا شوکی آکر کام چیک کرتے ہیں، جو تم اپنا آرام، چین برباد کئے ہوئے ہو۔“ رضیہ محبت سے بولی۔

”رضیہ! میں آئندہ تمہارے منہ سے یہ بات نہ سنوں۔“ شعیب کا لہجہ چٹانوں کی طرح سخت تھا۔

رضیہ حیرت سے اُسے ٹکنے لگی۔

”یہ چاچا شوکی کا احسان ہے کہ میں اپنی تعلیم جاری رکھے ہوئے ہوں، ورنہ بابا نے تو مجھے عاق کر دیا تھا اور کراچی جیسے شہر میں مجھے مزدوری بھی مشکل سے ہی ملتی۔ میں بے ایمانی کر کے اپنے چاچا کا اعتماد مجروح نہیں کرنا چاہتا۔“ شعیب لفظ چبا چبا کر بولا۔

”میں تو تمہارے آرام کے لئے کہہ رہی تھی۔“ رضیہ کی آواز بھرا گئی۔

”رات آرام کے لئے تھوڑی نہیں ہوتی۔ چھٹی کا پورا پورا دن میں تمہارے نام کر دیتا ہوں، اور کیا چاہئے تمہیں؟ یقین کرو رضیہ! بس تعلیم مکمل ہوتے ہی میں صرف سروں کروں گا اور شام صرف تمہارے ساتھ گزارا کروں گا۔ بس ایک ڈیڑھ سال کی بات ہے، تب تک تم میری نالائقوں کو برداشت کر لو۔“ شعیب محبت سے اُس کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

”میں نے کبھی آپ سے شکایت کی؟“ رضیہ نے کہا۔

”یہ تمہاری اپنی طرفی ہے کہ کبھی تم نے مجھے پریشان نہیں کیا۔ حالانکہ ابھی ہماری شادی کو صرف ایک مہینہ ہی ہوا ہے۔ یہ تو ہنی مون پیر یڈ تھا جو ہم دُور دور رہ کر گزار رہے ہیں۔“ شعیب نے شوخی سے کہا تو رضیہ مارے شرم کے لاجوئی کے پودے کی طرح سمٹ گئی۔ اور یہ



علی سے چپکی کھڑی مومو پر پڑ گئی۔ ”اوہ..... مومو جان!“ شعبی نے حیران حیران سی مومو کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا اور چٹ چٹ اُس کے گال چوم لئے۔ رضیہ بھی باہر آ گئی۔ اس نے چودھری شوکت علی کو جھک کر سلام کیا۔

”جیتی رہو۔“ انہوں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔  
 ”بھئی رضیہ! اپنی مومو آ گئی ہے۔ مومو جان! اپنی بھابی سے ملو۔“ شعبی نے کہا تو مومو مسکراتی ہوئی رضیہ کی بانہوں میں سما گئی۔ اسے یوں لگ رہا تھا، جیسے وہ انہی بانہوں کے لئے بنی ہو۔ اس کے دل میں خوشیوں کے گلاب مہک رہے تھے اور ان کی مہک سے وہ مدہوش ہوئی جا رہی تھی۔ اُسے امید نہیں تھی کہ اتنی نفرتوں کے بعد اس قدر محبتیں ملیں گی۔

پھر وہ لوگ ڈرائنگ روم میں آ گئے۔  
 ”تم کہیں جا رہے تھے، شعبی؟“ چودھری شوکت علی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔  
 ”بیل جا رہا تھا۔“ شعبی بولا۔  
 ”اچھا، اچھا..... پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟“ وہ بولے۔  
 ”ٹھیک ٹھاک۔“

”رضیہ پُتر! خوش تو ہو؟“ انہوں نے رضیہ سے پوچھا۔  
 ”جی ہاں۔“ رضیہ بولی۔  
 ”اور تم ابھی سے مل اور یونیورسٹی جانے لگے ہو۔“ وہ پھر شعبی سے مخاطب تھے۔  
 ”ابھی سے کیا، میں تو شادی کے چوتھے روز سے ہی کام اور پڑھائی میں لگ گیا تھا۔“ شعبی علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“ چودھری شوکت علی حیرت سے بولے۔  
 ”مطلب یہی کہ کام اور پڑھنا ہی تو فی الحال زندگی کا مقصد ہے۔“ شعبی بے پروائی سے بولا۔

”تم گھر میں کیوں نہیں رہتے؟“ انہوں نے شعبی کو گھورتے ہوئے کہا۔  
 ”کام بھی تو کرنا ہے چاچا! اور گھر بیٹھ کر بور ہو رہی تو ہوا جاتا ہے۔“ شعبی نے بات بنائی۔

”رضیہ کے ہوتے ہوئے بھی تم بور ہوتے ہو؟“ چودھری شوکت علی شوخی سے بولے۔  
 ”ارے نہیں چاچا! اس کے ہوتے ہوئے تو وقت کو پر لگ جاتے ہیں، پتہ بھی نہیں چلتا۔“ شعبی علی زور سے ہنس دیا۔ اب وہ بڑی دالہانہ نظروں سے رضیہ کو دیکھ رہا تھا، جو مومو سے باتیں کر رہی تھی۔

”بھلے بندے! ابھی تمہیں گھر ہی میں رہنا چاہئے۔“ چودھری شوکت علی نے سمجھایا۔

حقیقت بھی تھی کہ شعبی نے شادی کے صرف چار روز بعد ہی یونیورسٹی اور مل جانا شروع کر دیا تھا، حتیٰ کہ اب تک دونوں ایک پکچر بھی نہ دیکھ سکے تھے۔ رات کو وہ مل سے تھکا ماندہ لوٹتا تو آتے ہی پڑ کر سو رہتا۔ یوں لگتا تھا، جیسے رضیہ کو شعبی نے اپنے گھر میں شوپیس کے طور پر سجا دیا ہو اور وہ اللہ کی بندی ذرا سی بھی شکایت نہ کرتی۔ البتہ جمعے کا پورا دن وہ صبح سے شام تک اس کے ساتھ چپکا رہتا۔ مگر یہ سب کچھ گھر ہی تک محدود تھا۔ جبکہ رضیہ چاہتی تھی کہ وہ کہیں گھومیں، پھریں۔ مگر وہ صاف کہہ دیتا۔ ”بھئی میں نہیں چاہتا کہ تمہیں میرے علاوہ کوئی اور دیکھے۔“ اور شعبی کے اس جملے پر وہ مدہوش ہو جاتی کہ اس کا شوہر اسے کتنا چاہتا ہے۔ اتنا کہ کسی بھی شوہر نے بیوی کو نہ چاہا ہوگا۔

اُن کی شادی کے بعد ابھی تک تین چھٹیاں آئی تھیں اور یہ تینوں چھٹیاں شعبی کی عطر بیز باتوں اور مدہوش کن سرگوشیوں کی نذر ہو گئی تھیں۔ اتنی شدتیں اور محبتیں کہ بعض مرتبہ رضیہ ان سب باتوں کو خواب سمجھتی تھی۔ مگر یہ خواب نہیں، حقیقت تھی۔ زندگی میں ایسے بھی مقام آتے ہیں، جب حقیقت بھی خواب معلوم ہوتی ہے۔  
 ”اب میں جاؤں؟“ شعبی نے سگریٹ سلگاتے ہوئے سوچوں میں گم رضیہ سے پوچھا۔

”میں نے منع تو نہیں کیا۔“ رضیہ بولی۔  
 تب ہی ملازم نے آکر اطلاع دی۔ ”صاحب! آپ کے چاچا آئے ہیں۔“  
 ”اوہ..... چاچا شوکی؟“ شعبی علی خوشی سے چیخا۔  
 ”جی صاحب!“ رضیہ بولا۔  
 تب شعبی علی بچوں کی طرح خوش ہوتا ہوا باہر لپکا تو باہر نکلتے ہی چودھری شوکت علی پر نظر پڑ گئی۔

”ارے، آپ اچانک آ گئے۔“ شعبی علی ان سے لپٹ گیا۔  
 ”ہاں، بس ایک دم ہی پروگرام بن گیا۔“ چودھری شوکت علی نے شعبی کی پیشانی چومی۔ ”اب میں اکیلا نہیں آیا۔“  
 ”کیا مطلب؟“ شعبی نے شوخی سے کہا۔  
 ”کچھ اور مت سمجھنا۔ تم لڑکوں کی ذہنی سوچ صرف ایک ہی جگہ تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔“ چودھری شوکت علی مسکرائے۔

”پھر بتائیے نا؟“ شعبی کی شوخی بدستور تھی۔  
 ”بھئی تمہاری بہن آئی ہے..... مومو۔“  
 ”ریلی..... کہاں ہے؟“ شعبی ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر اُس کی نظر چودھری شوکت



”اوہ، چھوڑیے چاچا!“ شعیب علی ہنس کر بولا۔ ”ہاں، یہ بتائیے اب مومو یہیں رہے گی نا؟“

”بالکل۔ اب تو یہ اپنی منزل پر پہنچی ہے۔ اب یہ یہیں رہے گی۔“

”سچ چاچا؟“ رضیہ خوشی سے لبریز آواز میں بولی۔

”تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟“ چودھری شوکت علی نے پوچھا۔

”کمال کرتے ہیں چاچا! مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ یہ مومو کا گھر ہے اور ویسے بھی سارا دن اکیلی رہتی ہوں۔ مومو کی وجہ سے میرا وقت اچھا گزرے گا۔“ رضیہ نے مومو کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

”مگر ابھی تمہیں اس کی بولی سمجھنے میں دقت ہوگی۔ کیونکہ یہ سرائیکی بولتی ہے نا۔“

”نہیں چاچا!“ رضیہ نے کہا۔ ”مومو تو سرائیہ محبت ہے۔ اور محبت کی تو اپنی ہی زبان ہوتی ہے، جو ہر کس و ناکس کی سمجھ میں آ جاتی ہے۔ مومو کے ہاتھوں کی گرمی نے مجھے بتا دیا ہے کہ مومو کو مجھ سے ایسی محبت ہے، جو الفاظ کی محتاج نہیں بلکہ اس محبت کو الفاظ کا روپ دینے کا سلیقہ آج تک کسی کو بھی نہ آ سکا۔“ رضیہ نہایت دھیمے دھیمے لہجے میں بول رہی تھی۔

ایک دم ہی شعیب بولا۔ ”بھئی میری بیوی استانی رہ چکی ہے۔“ اس کا لہجہ بیوی کی محبتوں سے چور چور تھا۔

”پھر مومو کو بھی تو پڑھا دیا کرے گی نا؟“ چودھری شوکت علی نے بچوں کی طرح پوچھا۔

”کیوں نہیں چاچا جی!“ رضیہ نے خوشی سے کہا۔

”شکر یہ بھئی۔ مہربانی۔“ چودھری شوکت علی نے اخلافاً کہا۔

”چاچا! آپ نے صرف مومو کی پڑھائی کا کہا ہے، یہ تو آپ کے بھتیجے کو بھی پڑھا دے۔“ شعیب نے رضیہ کو شری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو رضیہ اسے گھور کر رہ گئی۔

چودھری شوکت علی ہنستے ہوئے بولے۔

”بھئی آخر بھو بھی تو میری ہے۔“

”سو فیصدی۔ بھئی اب تک آپ کو باتوں پر ٹر خا رہی ہے۔“ شعیب بولا۔

”اوہ..... مجھے بالکل ہی خیال نہیں رہا۔“ رضیہ شرمندہ ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اب بیٹھو۔ میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا۔“ شعیب نے بے پروائی سے کہا۔ اس سے پہلے کہ رضیہ باہر جاتی، ملازم ٹرائی دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔

”تم جاؤ، میں بنا لوں گی چائے۔“ رضیہ نے ٹرائی اپنی طرف کر لی۔

”کھانا.....“ شعیب نے کہنا چاہا۔

”نہیں، ہم نے ہوٹل میں کھا لیا تھا۔ مومو کو بھوک لگی تھی نا۔“ چودھری شوکت علی، شعیب کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑے۔

”واقعی مومو بیٹے! تمہیں بھوک نہیں؟“ شعیب نے پوچھا۔

”نہیں بھائی!“ مومو نے کہا۔

رضیہ نے سب کو چائے بنا کر دی۔

”بسکٹ لو، مومو!“ رضیہ نے مومو کی طرف پلیٹ بڑھا کر محبت سے کہا۔

”تم تھک گئی ہوگی۔ رضیہ! جاؤ، مریم کو سلا دو۔“ شعیب نے کہا اور مومو اٹھ کھڑی ہوئی۔

جس کا مطلب تھا کہ واقعی وہ بھی آرام کرنا چاہتی تھی۔ رضیہ اُس کا ہاتھ تھام کر چلی گئی۔

”ہاں چاچا! یہ ایک دم کا یا پلٹ کیسے ہو گئی؟“ شعیب نے ان دونوں کے جانے کے بعد وہ سوال کر دیا، جو لگتی دیر سے اُس کے ذہن میں کلبل رہا تھا۔

”کیا مطلب؟“ چودھری شوکت علی سمجھ نہ سکے۔

”میرا مطلب ہے، مومو اور آپ کے پاس کیسے؟“

”اوہ!“ چودھری شوکت علی کے ہونٹ گھٹی مونچھوں تلے مسکرا رہے تھے۔

”کیا آپ نے مومو کو اغوا کیا؟“ شعیب نے جلدی سے پوچھا۔

”نہیں..... نہیں شعیبی! قدرت نے خود ہی اسے میرے پاس بھیج دیا ہے۔ میں نے اپنا مقدمہ اپنے رب کریم کے سپرد کیا تھا۔ اس نے اتنے برسوں بعد فیصلہ سنا دیا۔ فیصلہ اس نے مظلوم ہی کے حق میں کیا ہے، مگر شعیبی! اس کے فیصلے سے بھی میرا دل خوش نہیں ہے..... پتہ نہیں، اندر ہی اندر دراڑیں پڑتی جاتی ہیں۔“ ان کا لہجہ نہایت ٹوٹا ہوا تھا۔

”میں سمجھا نہیں، چاچا!“ شعیب نے جلدی سے پوچھا۔

”شعیبی! پتہ نہیں کیا بات ہے، مجھے جو بھی خوشی ملتی ہے، وہ دکھوں کے غلاف میں لپیٹی ہوئی ملتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ملنے والی خوشی کا جشن مناؤں یا دکھ پر دھاڑیں مار مار کر روؤں۔“

چودھری شوکت علی کا لہجہ دکھوں سے بھرا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے اُن کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا ہو۔

”چاچا! آپ پہیلیاں کیوں بھجوا رہے ہیں؟ جلدی سے بتا دیجئے نا۔“ شعیبی نے بے قراری سے کہا۔

”شعیبی! میری نور مر گئی ہے..... نور ایں مر گئی ہے۔“ چودھری شوکت علی کی آواز بھرا

گئی۔



”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“ شعیب علی حیرانگی سے انہیں دیکھنے لگا۔  
”تمہیں یہاں مومو کا وجود اس بات کی گواہی نہیں دے رہا کہ وہ کسی بہت بڑے طوفان سے گزر کر پہنچی ہے۔“

”بہ خدا، میرے ذہن میں تو یہ آیا ہی نہیں کہ.....“ شعیب نے جملہ ادھورا چھوڑ کر چودھری شوکت علی کی طرف دیکھا۔ اس کی حیرت دوچند ہو گئی تھی۔ چودھری شوکت علی شملے کے کونے سے آنسو صاف کر رہے تھے۔ شعیب نے ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے پوچھا۔

”چاچا!..... آپ..... رو رہے ہیں؟“  
”کیا میں نہیں رو سکتا؟ میں پھر تو نہیں ہوں شعیبی!“ ان کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

”آپ تو نوراں کو گالیاں دیتے تھے، اُسے پھل پیری، ناگن اور نہ جانے کیا کیا کہتے تھے۔ پھر اُس کی موت پر یہ آنسو کیا معنی؟“ شعیب بولا۔

”جان! تم محبت کے روپ نہیں جانتے۔“ چودھری شوکت علی صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے اور شعیب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ ”یہ محبت بڑی کٹی شے ہے اور اس کے کئی روپ ہیں۔ میں جو سوچتا تھا کہ میں نوراں سے شدید محبت کرتا ہوں، یہ سچ تھا۔ میں نے اُس کی ایک ایک ادا کو پوجنے کی حد تک چاہا۔ پھر جب اس نے میرے ساتھ زیادتی کی تو میرے دل میں اس کے لئے شدید نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ میں اس کی زیادتیوں پر اسے کوئے دیتا، گالیاں دیتا، مگر جانتے ہو میرا دل کیا کہتا تھا؟“

”کیا؟“ شعیب نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔  
”یہ پھر بھی نوراں کا نام الاپے جاتا تھا۔ میں زبان سے یہ کہتے نہ تھکتا تھا کہ مجھے نوراں سے نفرت ہے مگر میرا یہ دل اُسے ہی پکارتا رہتا تھا۔ میں تو اس سے کبھی بھی نفرت نہیں کر سکا شعیبی! کبھی بھی نہیں..... میں نے اس کی یاد میں کتنے ہی آنسو بہائے ہیں، یہ تمہیں نہیں معلوم۔ کسی کو نہیں معلوم۔ اگر وہ کبھی میرے سامنے آ جاتی تو میرے بازو بے ساختہ اُسے سمیٹ لیتے۔“

”نفرت اور محبت کا یہ سنگم میری سمجھ میں نہیں آیا۔“ شعیب بولا۔  
”جسے ٹوٹ کر چاہا جائے، اس سے نفرت نہیں کی جا سکتی شعیبی!“ چودھری شوکت علی مضحک سی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر بولے۔

”آپ کی منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ شعیبی نے جھنجھلا کر کہا۔  
”اور آئے گی بھی نہیں۔ اچھا چھوڑو..... اب میں مومو کی طرف سے بے فکر ہو جاؤں

”؟“ چودھری شوکت علی نے بات پلٹ دی۔  
”بالکل چاچا! آپ کو کبھی بھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔“ شعیب بولا۔  
”مجھے تم سے یہی امید ہے۔“

”اور مجھ سے نہیں۔“ رضیہ نے اندر آتے ہوئے کہا۔ اُس نے اُن کا جملہ سن لیا تھا۔  
”بھئی تم پہ تو شعیبی سے بھی زیادہ مان ہے مجھے۔ آخر میری بیٹی ہو۔ جیسی مومو، ویسی تم۔“ چودھری شوکت علی نے ہستے ہوئے کہا اور پھر رضیہ کا ہاتھ تھام کر اپنے قریب ہی بٹھا لیا۔

”چاچا کیسی ہیں؟“ رضیہ نے پوچھا۔  
”بالکل ٹھیک۔“ چودھری شوکت علی بولے۔  
”کچھ کہہ رہی تھیں؟“ شعیب بولا۔  
”ہاں۔“ انہوں نے مسکرا کر شعیب کو دیکھا۔  
”کیا؟“ شعیب علی نے اشتیاق سے پوچھا۔  
”کوئی نئی بات نہیں۔ وہی پرانا رونا کہ مجھے یاد آتا ہے شعیبی۔ اُسے کہیں، لالہ سے معافی مانگ لے وغیرہ وغیرہ۔“ چودھری شوکت علی نے برا سامنے بنا کر کہا۔  
”اچھا!“ شعیب ہنس دیا۔

”لالہ کی طبیعت خراب ہو گئی تھی، پچھلے دنوں۔“ چودھری شوکت علی نے بتایا۔  
”کیا ہوا تھا؟“ رضیہ نے بے چینی سے پوچھا، مگر شعیب علی اطمینان سے بیٹھا رہا جیسے ذکر اس کے باپ کا نہیں، کسی اور کا ہو رہا ہو۔ چودھری شوکت علی حیران تھے کہ شعیب اتنا پھر دل بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے ذرا بھی بے قراری کا اظہار نہیں کیا۔ مگر انہیں کیا پتہ تھا کہ باپ کی بیماری کا سن کر اس کے دل کی دنیا میں ہلچل مچ گئی، لیکن وہ اس سمندر کی طرح پرسکون تھا، جس کی تہہ میں لاتعداد طوفان چھپے ہوتے ہیں، مگر اوپر سے پرسکون ہوتا ہے۔ بالکل یہی عالم شعیب علی کا تھا۔ وہ اپنی بے چینی کا اظہار کر کے چودھری شوکت علی کا مان نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ اس نے ان کے ذہن و دل میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ وہ اپنے بابا سے شدید ترین نفرت کرتا ہے اور صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے آپ پر ظلم کیا ہے۔

اور اب یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ چودھری طالب علی کی بیماری کے بارے میں کن کر کوئی ردِ عمل ظاہر کرتا اور یہ ردِ عمل سوائے پریشانی کے اور کوئی نہ ہوتا۔ اس طرح چودھری شوکت علی کا دل ٹوٹ جاتا اور شعیب علی ان کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے چاچا کے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنے کے لئے تو یہ سب کچھ کیا تھا اور اپنے بابا کی نظر دل سے گر گیا تھا۔ صرف اس لئے کہ اس کے چاچا خوش ہو جائیں۔ وہ بہ خوشی عاقبت بھی



ہو گیا تھا۔ مگر اب اُسے یہ سب اچھا لگتا تھا۔ روایات سے ٹکرا کر اسے خوشی ہوتی تھی۔ اگر وہ اپنی روایات سے نہ ٹکراتا تو اسے رضیہ جیسی شریک حیات کیسے ملتی جس کی قربت میں وہ اپنوں سے بچھڑنے کا ہر غم بھول گیا تھا۔

چودھری شوکت علی، شعیب کی طرف دیکھ رہے تھے، جو لائق بنا سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ وہ ایک دم چونکے، رضیہ پوچھ رہی تھی۔

”چاچا! آپ نے بتایا نہیں کہ لالہ جی کو کیا ہوا ہے؟“

”دل کا دورہ پڑا تھا۔“ وہ شعیب پر نظریں جمائے ہوئے بولے۔

”ہائے اللہ!“ رضیہ نے گھبرا کر دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

تب شعیب علی نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور دھول فضا میں چھوڑتے ہوئے بولا۔

”چاچا! آپ کے لالہ جی تو بہت چھوٹے دل کے نکلے۔“

”کیا مطلب؟“ چودھری شوکت علی نے پوچھا۔

”ذرا سی چوٹ لگی اور دل کے دورے پڑنے شروع ہو گئے۔“ شعیب نہایت سفاکی سے بول رہا تھا۔

”شعیبی! وہ تمہارے باپ ہیں۔“ وہ تلملا کر بولے۔

”ان کا مجھ سے کوئی رشتہ نہیں۔ انہوں نے مجھے عاق کر کے رنگ گل سے نکال کر ہر

رشتہ توڑ ڈالا ہے۔“ شعیب بے رخی سے بولا۔

”پگلے! اگر اس طرح رشتے ٹوٹنے لگتے تو میں کب سے ان سے رشتہ توڑ چکا ہوتا۔ تم

نے سنا نہیں، ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں، جس کا ہاتھی اس کا ناؤں۔ وہی حال تمہارا ہے۔ تم

کہیں بھی چلے جاؤ، رہو گے تو چودھری طالب علی کے ہی بیٹے۔“

”میرے بس میں ہو تو ان کا نام بھی اپنے نام کے ساتھ نہ آنے دوں۔“ شعیب علی کا لہجہ چٹانوں کی مانند سخت تھا۔

”تم عقل سے پیدل ہوتے جا رہے ہو شعیبی!“

”مجھے تو لگتا ہے اب عقل آئی ہے مجھے۔“ شعیب علی نے کہا۔

”رضیہ! تم ہی اسے سمجھاؤ۔“ چودھری شوکت علی رضیہ سے بولے۔

”میں کیا سمجھاؤں، چاچا؟“

”رضیہ! مومو سو گئی؟“ شعیب نے بات کا موضوع بدل دیا۔

”جی ہاں۔“

”کچھ کہہ تو نہیں رہی تھی؟“

”نہیں تو۔ بس یہی کہنے لگی، بھابی! آپ کا کمرہ بہت پیارا ہے۔“ رضیہ مسکرا کر بولی۔

”بس یا کچھ اور؟“ شعیب علی نہ جانے کیوں سوال پر سوال کئے جا رہے تھے۔

”ہاں..... اور بھی۔“ رضیہ خاموش ہو گئی۔

”کیا کسی چیز کی فرمائش کر دی؟“ چودھری شوکت علی نے پوچھا۔

”نہیں چاچا! یہ بات تو نہیں۔ مگر وہ نیند کے دوران اشو..... اشوپکار رہی تھی۔“ رضیہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”اشو..... یہ کون ہے چاچا؟“ چودھری شوکت علی کی طرف دیکھتے ہوئے شعیب نے پوچھ لیا۔

”مجھے خود پتہ نہیں۔ میرے خیال میں مومو کا ایک سوتیلا بھائی بھی ہے، شاید اسی کو یاد

کر رہی ہوگی۔“ چودھری شوکت علی بولے۔

”پھر یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ چاچا! آپ اسے بھی بلوالیں۔ مومو خوش رہے گی۔ آخر

وہ اس کا بھائی ہے۔“ رضیہ نے سوچنے کے انداز میں کہا۔

”راجا نہیں آنے دے گا۔“ چودھری شوکت علی بولے۔

”آپ کوشش تو کیجئے۔“ رضیہ نے کہا۔

”ارے رضیہ! چھوڑو، سوتیلا بھائی تو ہے۔“ شعیب علی بے پروائی سے بولا۔

”شعیب! بھائی سوتیلے ہوں یا سگے، بہت پیارے ہوتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ تم

ایسا سوچ رہے ہو۔“ رضیہ نے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

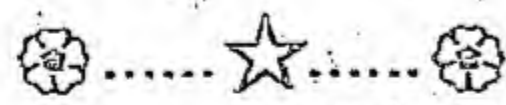
”چاچا! بچائیں، مجھے کچا چبا جائے گی آپ کی بہو۔“ شعیب، چودھری شوکت علی سے

لپٹ گیا اور رضیہ ہنس دی۔ غصہ تو آیا ہی نہیں تھا۔ بس ذرا افسوس ہوا تھا، شعیبی کے خیالات

جان کر۔ اصل میں اُسے بھی علم نہیں تھا کہ شعیب نے ایسا صرف چودھری شوکت علی کو خوش

کرنے کے لئے کہا ہے اور بیوی کو ناراض کر بیٹھا۔ اب تو اُسے ہر ایک کی خوشیوں کا خیال

رکھنا تھا۔ اور انسان کا ہر ایک کو خوش رکھنا بہت مشکل ہے۔



شام کو کرسیاں لان میں ڈال دی گئی تھیں اور وہ چاروں وہیں پر چائے پی رہے تھے۔

رضیہ نے مومو کو نہلا ڈھلا کر خوب صورت سا فراک پہنا دیا تھا اور بات بہت خوب صورت

انداز میں سیٹ کئے تھے۔ ہلکے ہلکے میک اپ میں چینی گڑیا لگ رہی تھی اور چودھری شوکت

علی بے حد خوش نظر آ رہے تھے۔ رضیہ کی اس قدر محبت پر انہیں اپنی بیٹی کے مستقبل کا اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔

چائے پیتے پیتے رضیہ نے کہا۔



”مومو ڈیر! یہ اشو کون ہے؟“

”جی.....“ مومو گھبرا گئی۔

”ڈرو نہیں، بتا دو۔“ شعیب نے محبت سے کہا۔

”بابا جانی ناراض ہوں گے۔“ مومو نے کہا تو چودھری شوکت علی ہنس دیے۔

”بھئی میری بیٹی کو میری ناراضگی کا کس قدر خیال ہے۔ نہیں پتر! تم بتا دو، میں ناراض نہیں ہوں گا۔“

”وہ..... وہ..... بابا جانی! اشو میرا بھائی ہے..... اور جب میں آرہی تھی تو بہت رویا تھا۔ راجا نے بہت مارا تھا اُسے۔ میرے ساتھ آنا چاہتا تھا وہ۔“ مومو کی آواز بھرا گئی۔ اُسے اشو بہت یاد آنے لگا تھا۔ کچھ بھی تھا، وہ اس کا بھائی تھا، اسے اپنی تمام تر مصومیت اور شدتوں سے چاہتا تھا۔ چوٹ مومو کو پڑتی، درد اُسے ہوتا۔ مومو کے آنسو بہتے تو اشو کی آنکھیں بھی خشک نہ رہتیں۔

”تو پتر! میں اشو کو یہاں بلا لوں؟“ چودھری شوکت علی نے کہا۔

”سچ بابا جانی؟“ مومو چپکلی۔

چودھری شوکت علی بولے۔

”نہیں بابا! وہ یہاں نہیں آئے گا۔“

”کیوں نہیں آئے گا؟“ رضیہ نے کہا۔

”راجا اُسے نہیں آنے دے گا۔ اگر وہ بھیجنا چاہتا تو میرے ساتھ ہی بھیج دیتا۔ مجھے پتہ ہے بابا!“ مومو کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

”تم بالکل نہ گھبراؤ میری جان!“ چودھری شوکت علی نے ہاتھ بڑھا کر مومو کو کرسی سے اٹھایا اور اپنی گود میں بٹھاتے ہوئے بولے۔

”اشو ضرور آئے گا..... کیونکہ تمہاری خوشیاں اسی کے دم سے ہیں۔ جب وہ دکھوں میں تمہارے ساتھ رہا ہے تو اب بھی رہے گا اور میں اپنی جان کی خوشیوں کو ہر قیمت پر خرید لوں گا۔“ چودھری شوکت علی نے مومو کا ننھا سا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

”بابا جانی! سچی مچی اشو یہاں آجائے گا؟“ مومو کے چہرے پر خوشیوں کا گلال پھیل گیا۔

”ہاں پتر! میں کل واپس حسن پور جا رہا ہوں۔“

”کیوں؟“ مومو بولی۔

”اشو کو لے آؤں نا؟“ چودھری شوکت علی نے کہا۔

”ہاں ٹھیک ہے..... آپ جلد آئیے گا۔ ورنہ میں اُداس ہو جاؤں گی۔“ مومو نے ان

کا چہرہ تمام لیا۔

”ہمارے ہوتے ہوئے بھی؟“ رضیہ نے شکوہ کیا تو مومو کو خیال آیا، وہ چودھری شوکت علی کی گود سے اُتری اور رضیہ سے لپٹ گئی اور اس کے گال سے گال رگڑتے ہوئے بولی۔

”نہیں بھرجانی! آپ کے اور شعیب بھائی کے ہوتے ہوئے میں کیسے اُداس ہو سکتی ہوں؟“

”پھر تم نے ابھی کیوں کہا تھا؟“ شعیب نے پوچھا۔

”مجھے خیال ہی نہیں رہا۔“ مومو نے مصومیت سے پلکیں جھپکائیں تو وہ تینوں ہنس

دیے اور رضیہ نے مومو کو بچھینچ لیا۔





جیسے ان پر آیا ہی نہ تھا۔ تب وہ کھیتوں کے راکھے بن جاتے ہیں۔ مگر ان کے پیچھے آنے والے ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور شاید یونہی ہوتا رہے گا۔

”بچپن بہت اچھا بھی ہوتا ہے اور بہت بُرا بھی۔“ دینو نے یہ سوچتے ہوئے نیچے بیٹھے پاگل کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا، جو کھٹنوں میں سر چھپائے بیٹھا تھا۔

”اٹھو دوست!“

”وہ..... وہ چلے گئے؟“ پاگل نے اپنی ڈبڈبائی آنکھوں سے دینو کی طرف دیکھا۔

”ہاں..... چلے گئے۔“

”وہ مجھے مارتے ہیں..... بہت مارتے ہیں۔ یہ دیکھو۔“ پاگل نے اپنی پھٹی ہوئی، جھولتی آستین کو کہنی سے ہٹایا۔ دینو نے دیکھا، کہنی پر ایک گوڑ سا تھا۔ اُس کی پیشانی پر بھی دیا ہی گوڑ تھا۔ دینو کا دل دُکھ سے بھر گیا۔

”بہت مارتے ہیں۔“ پاگل کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”تم اپنے گھر میں رہا کرو تو تمہیں کیوں ماریں؟“ دینو نے اس کے آنسو اپنے چمکے سے صاف کئے۔

”گھر..... کون سا گھر؟“ اس نے حیرت سے دینو کو دیکھا۔

”تمہارا گھر۔“ دینو نے لفظ ”گھر“ پر زور دے کر کہا۔

”میرا تو کوئی گھر نہیں۔ میں تو کبھی گھر میں نہیں رہا۔“ پاگل نے منہ سے گرتی رال کو ہاتھ کی پشت سے صاف کیا۔

”راجا! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ دینو نے اس کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں دیکھا، جہاں شناسائی کی ذرا سی بھی رمت نہیں تھی، جہاں صرف دیرانیوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ وہ تو ہوش و خرد سے بھی بیگانہ ہو گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ بھلا کب دینو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا۔

”راجا!“ دینو نے کہنا چاہا، مگر وہ زور سے ہنس دیا۔

”میرا ناں، راجا نہیں..... پاگل ہے۔ میں پاگل ہوں..... سب مجھے پاگل کہتے ہیں۔ اور میں ہوں ہی پاگل۔“ وہ لہک لہک کر بول رہا تھا۔

”نہیں..... تم راجا ہو۔“ دینو نے اسے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا، مگر نجانے اُس میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی کہ اُس نے ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو دینو سے چھڑایا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ دینو کو اس قدر شدید جھٹکا لگا تھا کہ وہ لڑکھڑا کر نیچے گر پڑا تھا۔ جب تک وہ اٹھ کر پاگل راجا کے پیچھے بھاگتا، وہ گاؤں کی گلیوں میں روپوش ہو چکا تھا۔

دینو بڑی دیر تک اُسے مختلف گلیوں میں تلاش کرتا رہا، مگر وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا

”بچاؤ..... بچاؤ..... مجھے بچاؤ۔“ وہ شخص بھاگتا ہوا آیا اور دینو سے لپٹ گیا۔ اس کے جسم پر پختہ بڑے جھول رہے تھے، سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے اور میل سے چکٹ ہو رہے تھے۔ بڑھی ہوئی داڑھی، منہ سے بہتی ہوئی رال سے بھری ہوئی تھی اور وہ دینو سے لپٹا۔ ”بچاؤ، بچاؤ“ کی گردان کر رہا تھا۔

”پاگل ہے..... پاگل ہے۔“ ننگ دھڑنگ اور میلے کچیلے بچے، جن کے پاؤں جوتوں سے نا آشنا تھے، پتھر اٹھائے ان کے قریب آگئے۔ پاگل، ننھے بچے کی طرح سہم کر اس کے سینے میں گھسنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ پھر وہ دینو کے پیچھے چھپ گیا۔

”مجھے ان سے بچاؤ..... یہ مارتے ہیں۔“ پاگل رو دیا۔

”پُتر! کیوں مارتے ہو اس غریب کو؟“ دینو نے ایک بچے سے کہا۔

”بس، مڑا آتا ہے۔“ ایک بچہ زور سے ہنس کر بولا اور پھر تاک کر پاگل کے سر کا نشانہ لگایا، جو دینو کے پیچھے چھپا اس کے کندھے سے سر نکالے بچوں کو وحشت زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس بچے نے جو پتھر مارا، وہ سیدھا پاگل کی پیشانی پر لگا۔ وہ کراہ کر دہرا ہو گیا۔

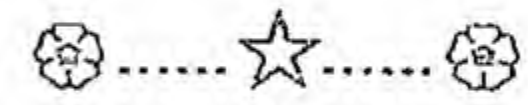
”چلو بھاگو!..... دُن ہو جاؤ یہاں سے۔“ دینو نے غصے سے بچوں کو ڈانٹا تو وہ ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پتھر دینو ہی پر برسا کر بھاگ کھڑے ہوئے اور دینو ہنس دیا۔

ویسے بھی گاؤں کے بچوں کے لئے کون سے کھیل کے سامان ہوتے ہیں۔ شہری بچوں کے لئے جس طرح پارک ہوتے ہیں، یہ بچے ان سے محروم ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں توجہ نظر تک پھیلے ہوئے سرسبز کھیت ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہ دل بہلانے اور کھیلنے کے نئے نئے طریقے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ کبھی کھیتوں میں چوری سے گھس کر بھٹے توڑنا، کبھی گندم کی سنہری بالیوں کو توڑ کر کھیت کا ستیاناس مارنا اور کبھی گھر سے پیسے نہ ملنے پر کپاس کے سفید سفید پھول پھٹی کی صورت نکال کر دکانوں پر بیچ کر گزک خریدنا۔ بس یہی گاؤں کے بچوں کی ایکٹیویٹیز ہوتی ہیں۔ وہ اسی طرح خوش خوش، ننگ دھڑنگ، ننگے پیر سارا دن آوارہ پھرتے بچپن گزار کر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہیں اور پھر اپنا بچپن اس طرح بھول جاتے ہیں،



تھا۔ دینو لاکھ کوشش کے باوجود بھی اس کی خاک کو نہ پاسکا۔  
اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک دم یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟..... راجا ہوش و حواس سے بیگانہ کس طرح ہوا؟ ابھی چند ہفتے پہلے جب وہ مومو کو لینے آیا تھا تو بھلا چنگا تھا، پھر یک دم یہ کون سی افتاد اس پر ٹوٹی؟ اشوکس حال میں ہے؟..... کہاں ہے؟ میں اُسے لینے آیا ہوں مگر راجا سے کس طرح پوچھوں کہ اشوک کہاں ہے؟  
”بس، چودھری جی! میرے پہنچنے سے پہلے ہی آپ کی بد نصیبی یہاں پہنچ چکی ہے۔ آپ کہتے تھے کہ ٹوٹوں کی گڈیاں لے جا اور راجا سے اشوک لے آئے۔ کیونکہ وہ آپ کی مومو کا بھائی، اُس کی خوشیوں اور دکھوں کا ساتھی ہے۔ پر مالک میں اُسے کہاں تلاش کروں؟..... کیسے ڈھونڈوں؟..... اُس کا باپ تو اس حالت میں نہیں کہ مجھے کچھ بتائے۔ اُف، کیا کروں؟“ دینو کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ پھر ایک خیال بجلی کے کوندے کی مانند اُس کے ذہن میں لپکا۔ کیوں نہ میں چودھری دلاور سے معلوم کروں۔ آخر وہ اس گاؤں کا چودھری ہے، اُسے پتہ ہوگا۔

یہ خیال آتے ہی دینو کے قدم چودھری دلاور کے ڈیرے کی طرف تیزی سے بڑھنے لگے۔



آج موسم اپنے جو بن پر تھا۔ سرمئی گھٹائیں اُڑ اُڑ کر آکاش پر بکھری جا رہی تھیں۔ وقفے وقفے سے پڑتی پھوار دھرتی کی پیاس بجھانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی اور مٹی کی سوندھی سوندھی مہک پورے ماحول کے ساتھ ہر ذہن کو معطر کر رہی تھی۔ گلاب کے بڑے بڑے پھولوں اور سرسبز پتوں پر ایک ایک بوند آب دار موتی بنا کر گر جاتی۔ دھیمی ہوا کی آہٹوں سے دم بخود دیتے چونک جاتے اور پھر اس کی گدگد اہٹ سے جھوم اُٹھتے۔  
چودھری شوکت علی کتنی ہی دیر سے لان میں بیٹھے قدرت کی صنائی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ان کے لب انجانے خیالات سے مُسکا اُٹھے۔ تبھی چودھری طالب علی کی آواز پر وہ چونکے اور اس سمت دیکھا، جہاں سے آواز آئی تھی۔ چودھری طالب علی سب مرم کے ستون سے ٹیک لگائے برآمدے میں کھڑے انہیں دیکھ رہے تھے۔  
”آجائے لالہ!“ چودھری شوکت علی مسکراتے ہوئے بولے۔

”تم بارش میں کیوں بیٹھے ہو؟“  
”بالکل بارش نہیں ہے۔ بس کبھی کبھی پھوار پڑ جاتی ہے۔ بڑا مزہ آ رہا ہے۔“ چودھری شوکت علی کرسی سے اُٹھے اور بھائی کے قریب جا کر بولے۔ ”آئیے، آپ بھی موسم کا لطف اٹھائیں نا۔“

”نہیں شوکی! میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ چودھری طالب نے دھیرے سے کہا۔  
”اب تو آپ کی طبیعت کبھی ٹھیک نہیں ہوگی۔“ چودھری شوکت علی نے دل ہی دل میں انہیں مخاطب کیا، پھر ان کی کمر کے گرد بازوؤں کا حصار کرتے ہوئے بولے۔  
”آئیں نا، خرد کو پیار سمجھیں گے تو پیار ہی رہیں گے۔“ پر چودھری طالب علی نے کوئی جت نہ کی اور شوکت علی کا سہارا لئے لان میں آ گئے۔  
”دیکھیں، کتنا اچھا موسم ہے۔“ چودھری شوکت علی ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

”شوکی! اب وہ عمر نہیں رہی کہ حسین موسم اچھا لگے۔ اب تو سارے موسم ایک سے لگتے ہیں۔ بس یہی لگتا ہے کہ پت جھڑکا موسم ہے، بہاریں بھی خزاں لگتی ہیں اور.....“ اُن کی آواز بھرا گئی۔

”لالہ! کیا ہو گیا آپ کو؟“ چودھری شوکت علی جانتے بوجھتے انجان بن گئے۔  
”کچھ نہیں، شوکی! بس بڑھاپا آ گیا ہے۔ یہ سب تو جوانی کے چو نچلے ہوتے ہیں۔“ چودھری طالب علی ایک دم خود پر قابو پا کر ہنسے۔ انہیں خیال آ گیا تھا کہ وہ شوکی کے سامنے کیوں ٹوٹ رہے ہیں؟ کیوں بھر بھری مٹی کی طرح بیٹھ رہے ہیں؟ اس طرح تو وہ اور خوش ہوگا۔ سمجھے گا اس نے مجھے شکست دے دی۔ بس یہ خیال آنا تھا کہ انہوں نے خود کو سنبھال لیا، مگر اپنی کھوکھلی ہنسی پر قابو نہ رکھ سکے۔ تب چودھری شوکت علی کا جی چاہا، انہیں جھنجھوڑ کر کہیں۔

”اس طرح مت ہنسو چودھری طالب علی!..... تمہاری ہنسی میں آنسوؤں کی آمیزش ہے۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ تمہارا دل ٹکڑے ٹکڑے ہے..... تم زبردستی کی ہنسی لبوں پر مت بجاؤ۔“

مگر ہمیشہ کی طرح وہ کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ ایک دم ہی پوچھ بیٹھے۔ ”لالہ! دنیا پور نہیں لگے آپ؟“

”طبیعت سنبھالے تو جاؤں گا۔“ وہ درختوں پر نظریں جما کر بولے۔  
”اچھا، اچھا۔“

”ویسے دنیا پور کی زمین اچھی نہیں ہے۔“ چودھری طالب علی نے ہولے سے کہا۔  
”نہیں لالہ! بہت زرخیز ہے۔ میرے خیال میں تو وہ زمین سونا ہے۔“  
”زرخیزی میں تو کوئی شک نہیں، شوکی! مگر.....“ چودھری طالب علی ایک آہ بھر کر بولے۔

”مگر کیا لالہ؟“ چودھری شوکت علی کے لہجے میں حیرت تھی۔



”وہ زمین بہت منحوس ہے۔ جس کے پاس ہوتی ہے، اس سے خوشیاں رُوٹھ جاتی ہیں۔“ چودھری طالب علی کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

”گستاخی معاف لالہ! جس کو بھی دکھوں کی دہلیز پار کرنی پڑی، آپ ہی کی وجہ سے کرنا پڑی۔ اب آپ بھی اسی دکھ کے پنجرے میں پھڑپھڑا رہے ہیں۔“ چودھری شوکت علی کا لہجہ سخت تھا۔ انہوں نے بھائی کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”مگر شوکی! یہ بھی تو دیکھو کہ میں اس خاندان کا بڑا ہوں اور تم سمجھتے ہو کہ تمہیں دکھی کر کے میں سکھ سے رہا؟ نہیں شوکی! تم نے جتنے آنسو بہائے، اس سے زیادہ میں نے بہائے ہوں گے۔ مگر میں کیا کرتا، یہ عزت و احترام بہت مشکل سے ملتا ہے۔“ چودھری طالب علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ سچ ہے، جب تک اپنے دل پر چوٹ نہ پڑے، دوسروں کی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔

”ہونہہ.....“ چودھری شوکت علی نے ہنکارا بھرا۔ ”یہ سب کہنے کی باتیں ہیں لالہ! ورنہ عزت و احترام اس کے لئے ہے، جس نے یہ دنیا بنائی۔ ہم بندے تو یونہی مصنوعی احترام کے پیچھے مرے جاتے ہیں۔ کیا ملتا ہے؟ صرف یہی کہ دل کے داغوں میں ایک اور کا اضافہ ہو جاتا ہے۔“

”شوکی! تو تو میرے دکھ پر خوش ہوتا ہے“ چودھری طالب علی ٹوٹ رہے تھے۔  
”نہیں لالہ! یہ کس نے کہا آپ سے؟“ چودھری شوکت علی گھبرا گئے کہ یہ دل کی باتیں ان تک کیسے پہنچ گئیں۔

”اگر یہ بات نہ ہوتی تو اُس روز تم یہ نہ کہتے۔ بس لالہ! اتنا ہی حوصلہ ہے کہ دل چھوڑ بیٹھے؟“ چودھری طالب علی کا لہجہ دکھوں سے بھرا ہوا تھا۔

”یونہی کہہ دیا ہوگا۔ ورنہ آپ کا دکھ تو مجھے اپنے دل میں محسوس ہوتا ہے لالہ!“ چودھری شوکت علی نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے بھائی کے ہاتھ تھام لئے۔

”شوکی! تمہیں یاد نہ ہو شاید، بابا نے ہماری تربیت کے لئے ایک خاتون رکھی تھی، جو ہمیں اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، بات کرنے کے آداب سکھایا کرتی تھی۔ ہماری تربیت اس نے اس انداز میں کی تھی کہ ہم لوگ اس کی آنکھ کا اشارہ سمجھنے لگے تھے کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ اس طرح ہمیں جس چیز کی ضرورت ہوتی تھی، وہ ہماری زبان سے ادا ہونے کا انتظار بھی نہ کرتیں اور منگوا دیتیں۔“

چودھری طالب علی بولتے بولتے ایک دم رُکے اور چودھری شوکت علی کی طرف دیکھا، جو حیران حیران نظروں سے یہ عجیب و غریب باتیں سن رہے تھے۔ ”پتہ ہے، میں بہت حیران ہوتا تھا کہ انہیں ہمارے دل کی باتیں کیسے معلوم ہو جاتی ہیں۔ میری یادداشت میں

ایسا کوئی دن محفوظ نہیں، جب اُن کا کوئی اندازہ غلط نکلا ہو۔“  
”مگر یہ سب مجھے بتانے کا کیا مطلب ہے؟“ چودھری شوکت علی نے بور ہو کر پوچھا تو وہ مسکرا کر بولے۔

”میں اسی طرف آ رہا ہوں، شوکی! میں تو سمجھتا تھا ان خاتون کو الہام ہوتا ہے یا وہ اللہ والی ہیں۔ ایسا نہیں تھا، بلکہ چہرے بولتے ہیں۔ دل کی ہر بات چہرے پر لکھی ہوئی ہوتی ہے۔ بس پڑھنے والے کی نظر ہونی چاہئے۔“ چودھری طالب علی نے ان کی طرف زخمی نظروں سے دیکھا۔

”اوہ!“ چودھری شوکت علی کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔

”اور سچ بتاؤں شوکی! تمہارے چہرے کا ایک ایک لفظ میں پڑھ رہا ہوں۔“

”جی۔“ چودھری شوکت علی گھبرا گئے۔

”ہاں..... مجھے دکھی دیکھ کر تم بہت خوش ہو شوکی! اس خوشی کا تم احاطہ نہیں کر سکتے۔“

”اوہ، لالہ! میں کس طرح آپ کی غلط فہمی دور کروں؟“ چودھری شوکت علی خود پر قابو پا کر بولے۔

”جس طرح تمہاری زبان جھوٹ بول رہی ہے نا، چہرے کو بھی جھوٹ بولنے کا عادی بناؤ۔ ورنہ خسارے میں رہو گے۔“ چودھری طالب علی کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”لالہ! آپ کچھ بھی سمجھیں، کچھ بھی کہیں، میری طرف سے آپ کے دل میں جو گرہ پڑ گئی ہے وہ تو کھلنے سے رہی۔ اصل میں آپ.....“ چودھری شوکت علی ایک دم رک گئے۔

”بولو..... کہو تم۔ میں سب سننے کو تیار ہوں۔“

”کچھ نہیں۔ یونہی کوئی بڑی بات نکل گئی تو آپ ناراض ہوں گے۔“ چودھری شوکت علی سر جھٹک کر بولے۔

”نہیں، تم مجھے بتاؤ کہ کیا کہنا چاہتے ہو؟“ چودھری طالب علی بچوں کی سی ضد سے بولے۔ تب چودھری شوکت علی کا جی چاہا کہ وہ کہہ دیں۔ ”لالہ! آپ کا دل مجرم ہے، آپ مجرم ہیں اور مجرم ہونے کا احساس آپ کو کچھ کے لگاتا رہتا ہے اور آپ یہ سوچنے میں حق بجانب ہیں کہ آپ کے دکھوں پر خوش ہوتا ہوں اور یہ حقیقت ہے، مجھ سے بڑھ کر آپ کا دشمن اور کون ہو سکتا ہے بھلا؟..... مگر وہ مارے مرثوت اور لحاظ کے کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ کچھ

بھی تھا، چودھری طالب علی اُن کے بڑے بھائی تھے، باپ کی جگہ تھے اور چودھری شوکت علی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کی غلطیوں کی فہرست نہیں سنا سکتے تھے۔

بارش کے موٹے موٹے قطرے گرنے لگے تو چودھری شوکت علی اُٹھ کھڑے ہوئے۔

”اُٹھے لالہ! مینہ تیز ہو گیا ہے۔“ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر چودھری طالب علی کا ہاتھ



تھاما تو وہ اٹھے اور اپنا ایک ہاتھ چودھری شوکت علی کے کندھے پر رکھتے ہوئے ہنس کر بولے۔

”تو بہت کمینہ ہے۔ میرے سوال کا جواب گول کر گیا۔ قدرت بھی تیرا ساتھ دے رہی ہے، جی تو اتنا مینہ برسنا شروع ہو گیا ہے۔“

چودھری شوکت علی نے مسکراتے پر اکتفا کی۔ واقعی اب قدرت ان کا بھرپور طریقے سے ساتھ دے رہی تھی۔

☆.....☆

دینو، چودھری دلاور کے ڈیرے پر پہنچا تو اسے چودھری دلاور تو نہ ملا لیکن اس کی گائے سے ملاقات ہو گئی۔

”چودھری جی! کب آئیں گے؟“

”خبر نہیں جی۔ اس وقت تو وہ حویلی میں آرام کرتے ہیں۔ بیٹھو۔“ گائے نے اپنے سامنے ہی پڑی چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ دینو بیٹھ گیا۔

”کہاں سے آئے ہو؟“

”شہر سے آیا ہوں۔“ دینو نے ایک ہی جملے میں بات ختم کرنا چاہی۔

”کوئی کام ہے چودھری جی سے؟“ گائے نے رازداری سے پوچھا۔

”ہاں..... کام تو ہے۔“ دینو داڑھی کھجاتا ہوا بولا۔

”او جی، کوئی لسی پانی؟ اتنے دور سے آئے ہو، پیاسے ہو گے۔ میں ابھی آیا۔ روٹی

بھی کھاؤ گے نا؟“ گائے دینو کی طرف جھکتا ہوا بولا۔

”مجھے بھوک نہیں، صرف پانی پلا دو۔“ دینو جلد از جلد اپنے مطلب کی بات پوچھنا چاہتا

تھا۔

”تھوڑی سی جی۔“ گائے نے اصرار کیا۔

”بالکل خواہش نہیں ہے دوست! یہاں آ کر تو بھوک ہی مٹ گئی ہے۔“ دینو آہ بھر کر

بولے۔

گائے حیرت سے دینو کو دیکھنے لگا، پھر وہاں سے چلا گیا۔ چند لمحے بعد وہ بڑے سے

پیتل کے گلاس میں پانی لے آیا۔

”لو جی، پیو۔ میں نے تو چاہا تھا کہ گھر جا کر تمہارے لئے روٹی لے آؤں۔“ گائے ہنستے

ہوئے بولا۔

”بس دوست! تمہاری محبت کا شکریہ۔ بس پانی ہی کافی ہے۔“ دینو نے گلاس اس

سے ہونے کہا اور پھر ایک سانس ہی میں پورا گلاس خالی کر دیا۔

”تمہارے گاؤں میں راجا رہتا ہے نا؟“

”اوہی نا، جس کی بیوی نے گھوہ میں چھال لگا دی تھی؟“

”ہاں، ہاں۔“ دینو جلدی سے بولا۔

”بڑا بد نصیب بندہ ہے جی..... پہلے بیوی کا دکھ سہا، پھر بیٹا بھی مر گیا۔“

”مشو مر گیا؟“ دینو کا دل زخمی کبوتر کی مانند پھڑکنے لگا۔

”ہاں جی..... چھت سے گر گیا تھا۔ سر پھٹ گیا تھا اس کا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا تو

وہیں راجا کا دماغ الٹ گیا۔ دو دن تو کچھ بولا ہی نہ اور نہ اشو کی لاش پر رویا۔ گاؤں والوں

نے اس کے کفن و دفن کا انتظام کیا۔ بہت کوشش کی کہ راجا رو دے۔ پر وہ رویا تو نہ، مگر دو

دن بعد ہی کپڑے پھاڑے، گاؤں میں تھپتھپے لگاتا نظر آیا۔ ہائے ہائے..... بس جی، دنیا سو

سو کہانیاں بنا رہی ہے۔“ گائے اٹھڑی سانس لے کر بولا۔

دینو حیرت سے یہ انکشافات سن رہا تھا۔ وہ پاگل راجا سے مل تو چکا تھا، مگر اس کے

پاگل ہونے کی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اب پتہ چلا کہ اتنے تھوڑے دن کا راجا تھا۔ یکے

بعد دیگرے دکھوں کو سہہ نہ سکا اور ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا۔ ایسی دنیا میں پہنچ گیا، جہاں

نہ دکھ کا احساس تھا، نہ سکھ کا۔ ہر دن ایک سا تھا۔ ہر پل ایک سا ہی گزرتا تھا۔

”ویسے لوگوں کا کیا خیال ہے؟ کیا کہانیاں بنا رہے ہیں؟“ دینو نے مزید کرید۔

”سنا ہے جی، دونوں میاں بیوی میں روز لڑائی ہوتی تھی۔ خدا نوراں کو جنت نصیب

کرے، وہ تو خدا کی بندی کسی عورت کو راز ہی نہ دیتی تھی۔ ویسے سنا ہے.....“ گائے ادھر

ادھر دیکھنے کے بعد دینو کی طرف جھک کر رازداری سے بولا۔ ”راجا کا، خادم کی بہن سے

چکر تھا۔“

”چکر..... کیسا چکر؟“

”اویار! عشق و معشوقی کا چکر۔ ہو کر کیا چکر چلیں گے یہاں؟“ گائے چو کر بولا۔

”او خدا!..... یہ کیسے انکشافات ہو رہے ہیں۔“ دینو نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں

تھام لیا۔ راجا نے کتنی مشکل سے نوراں کو حاصل کیا تھا، شدتوں سے اسے چاہتا تھا۔ جب وہ

چودھری شوکت علی کی قید میں تھا تو دینو نے کتنی بار اسے سمجھایا تھا۔ یارا کیوں اپنی آزادی

چھوڑ کر یہاں قید کاٹ رہے ہو؟ ضروری ہے نوراں تمہیں ملے؟ چودھری تمہیں اتنی دولت

دے گا کہ ساری زندگی عیش کرو گے، مگر شرط یہ ہے کہ نوراں کا خیال چھوڑ دو۔

جواباً وہ کہتا تھا۔ دینو! میری سب سے بڑی دولت نوراں ہے۔ مجھے یقین ہے وہ مجھے

ضرور ملے گی اور میں اسے حاصل کر کے رہوں گا۔ پھر واقعی اس نے نوراں کو حاصل کر لیا

تھا۔



گاما بتا رہا تھا۔

”بس جی، سنا ہے، دونوں نے خادم کی بہن کی وجہ سے ہی خود کو ختم کر لیا۔ اس نیک بخت کے مرتے ہی ان کا گھر اُڑ گیا۔ یوں لگتا ہے، جیسے نوراں ایک شہتیر تھی، جس پر گھر کی چھت کھڑی تھی۔ شہتیر کیا ٹوٹا، چھت نیچے آن رہی۔ خدا برے وقت سے بچائے جی۔“

”بس جی، بعض مرتبہ اللہ میاں سب بدلے نہیں چکا دیتا ہے۔“ گامایوں بولا، جیسے سب کچھ آج ہی بتا دینا چاہتا ہو۔

”کیا مطلب؟“ دینو نے چونک کر اسے دیکھا۔

”راجا بھی تو اپنی سوتیلی بیٹی سے بہت نفرت کرتا تھا۔ وہ بے چاری سارا دن کام میں لگی رہتی، مگر پھر بھی دو ہتھ مار کر اُسے روٹی دیتا تھا۔ کسی کی آہ نہیں لیتی چاہئے جی۔ سنا ہے اُس کا باپ آکر لے گیا ہے۔ مگر کسی کو یقین نہیں آتا۔“

”کیوں؟“

”تم خود سوچو، اتنے سال گزر گئے، وہ کبھی نہیں آیا۔ اب چپ چاپتے لڑکی کو لے گیا، ناممکن ہے۔ سب یہی سمجھتے ہیں کہ راجا نے مومو کو ختم کر کے کہیں گاڑ دیا ہے تاکہ وہ کوئی اہم راز نہ کھول دے۔ مگر.....“ گاما خاموش ہو گیا۔

”مگر کیا؟“

”وہ سچو ہے نا، وہ کہتا ہے اُس نے خود مومو کو جاتے دیکھا ہے۔ اس کے باپ کا ملازم لینے آیا تھا۔ اب کیا خبر، کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔“

”سچ ہی ہو گا۔ ورنہ وہ بچہ جھوٹ کیوں بولتا؟“ دینو نے کہا۔ ”راجا کا پتہ ہے، اب کہاں ہو گا؟“

”ہو گا یہیں کہیں گلیوں میں بچوں کے پتھر کھاتا پھر رہا ہو گا۔ رات کو شیشم کے درخت کے نیچے کھڑی بن کر سو رہتا ہے۔ کوئی کھانا دیتا ہے تو کھا لیتا ہے، ورنہ مانگتا نہیں بے چارہ۔“ گاما دکھ سے ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔

”اچھا دوست! اب میں چلتا ہوں۔“ دینو چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”او جی، تم چودھری سے نہیں ملو گے؟“

”جو کام تھا، وہ تم نے کر دیا۔“ دینو مسکرایا۔

”کیا مطلب؟“ گاما حیرت سے بولا۔

”راجا کے متعلق ہی پوچھنا تھا۔“

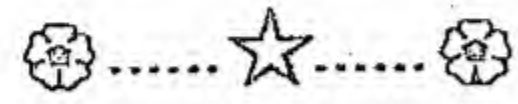
”راجا کیا لگتا ہے تمہارا؟“ گاما بولا۔

”بھائی ہے۔“

”او جی، بس اب تم اسے لے جاؤ۔ یہاں پر بھی ادھر ادھر پھرتا ہی تو رہتا ہے۔“ گاما بولا۔ ”اچھا ہے، اپنوں میں چلا جائے۔ کوئی دیکھ بھال تو کرے گا۔“

”یہی کروں گا..... اسے اپنوں تک پہنچا دوں گا۔ مجھے یقین ہے، شاداں اور نندیر اس کی خدمت کریں گے، اسے رکھ لیں گے۔“ پھر دینو نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ راجا کو بچے اُس کے خالہ زاد بھائی نذیر کے ہاں پہنچا دے گا۔

دینو ڈیرے سے نکل آیا۔ اب راجا کی تلاش ہی اس کا مقصد بن گیا۔



چودھری طالب علی نہایت بے قراری سے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ یوں لگتا تھا، جیسے کمرے میں دُکھ بول رہے ہوں۔ فریب ہی صفدر علی موجود تھا۔ آخر اُس کی آواز نے کمرے کا سکوت توڑا۔

”بابا جان! آخر حرج ہی کیا ہے مجھے اجازت دینے میں؟“

”نہیں..... نہیں پُتر! تم نہیں سمجھتے۔“ انہوں نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر جواب دیا۔

”سمجھنے کی ایک کہی آپ نے۔ دیکھئے نا بابا جان! صرف تین برس کی تو بات ہے۔“ صفدر علی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نہایت دُلا ر سے کہا۔

”میں ایک دم اتنی جدائیاں نہیں سہار سکتا صفدر! مجھے اتنے دکھ نہ دو کہ میرا دل پھٹ جائے۔“ چودھری طالب علی دکھ سے سوچ کر رہ گئے۔ مگر وہ یہ جملہ زبان سے ادا کر کے اپنی کمزوری کو ہوا دینا نہیں چاہتے تھے۔ بس وہ صفدر کو دیکھ کر رہ گئے۔

”بابا جان! میں نے کہا ہے نا کہ میں یہ چانس مس نہیں کر سکتا۔ اپنے بہتر مستقبل کی خاطر باہر جانا چاہتا ہوں۔“ صفدر نے سر جھکا کر کہا۔

”بہتر مستقبل؟“ چودھری طالب علی ہنسے۔

”ہاں بابا جان!“

”او بے وقوف! تم زمیندار ہو۔ جدی پشتی زمیندار۔ تمہارے پاس روپے پیسے کی کیا کمی ہے؟ کیوں اپنے مستقبل کی فکر کرتے ہو؟ اوئے پُتر! مستقبل کی فکر تو غریب غربا کرتے ہیں، جو کمائیں نہ تو کھائیں کہاں سے؟ ہمیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہمیں ایک سال میں اتنا مل جاتا ہے کہ دس سال کے لئے کافی ہوتا ہے۔ تو فکر نہ کر مستقبل کی۔“ چودھری طالب علی کے لہجے میں دولت کا غرور تھا۔ مگر صفدر علی بھی اپنی بات سے ایک انچ ہٹنے کو تیار نہ تھا۔

”اگر یہ بات تھی تو آپ نے مجھے پڑھایا ہی کیوں تھا؟“



”تمہارے شوق کے پیش نظر۔“ چودھری طالب علی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔  
”تو اب بھی میرا شوق پیش نظر رکھیں اور مجھے بار ایٹ لا کرنے کی اجازت دے دیں۔“ صفدر نے کہا۔

”تمہارے تب کے اور اب کے شوق میں بہت فرق ہے صفدر!“ چودھری طالب علی نے لہجے کو بارعب بناتے ہوئے کہا۔

”کوئی فرق نہیں بابا جان! آپ کے ذہن میں فرق آ گیا ہے، آپ کی سوچ میں فرق آیا ہے۔“ صفدر کا لہجہ خشک تھا۔ چودھری طالب علی نے پلٹ کر بیٹے کی طرف دیکھا، جس کے چہرے پر ناگواری صاف پڑھی جا رہی تھی۔ انہیں یوں لگا، جیسے لمحے ایک ایک کر کے ریشم کی کچھی کی طرح ان کے ہاتھ سے نکلتے جا رہے ہیں۔ انہیں صفدر اور شعیب ایسے بے پانی کی مانند لگے جو کسی کے رو کے نہیں رکتا، بڑھتا ہی جاتا ہے۔ کوئی پستہ بھی اس پھرے پانی کو نہیں روک سکتا اور یہ دونوں بھی سیلاب کے پھرے پانی کی مانند تھے۔ شعیب کو انہوں نے دوکنا چاہا، اپنی بڑائی اور دولت کا بند اس کے راستے میں باندھا مگر وہ ہر بات کو بہاتا ہوا چلا گیا۔ اور آج صفدر علی ان کے سامنے تھا، جو ان سے سات سمندر پار جانے کی اجازت چاہ رہا تھا، جہاں کے متعلق انہوں نے رنگین کہانیاں سن رکھی تھیں۔ اگر وہاں صفدر کے قدم لڑکھڑا گئے اور پھسل گیا تو وہ دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ شوکی میرے ظلم کی داستان سر عام سناتا پھرے گا۔ پھر اسے کوئی خوف نہیں ہو گا۔ میں اپنی اولادوں کو عاق ہی کرتا رہوں گا، محض شوکی کے خوف کی وجہ سے؟ واقعی، شوکی سچ کہتا ہے۔ اپنی ہی چھری سے اپنا گلا کاٹنا بہت ہی مشکل ہے۔ اس کے لئے بڑی ہمت چاہئے۔ اور اگر انسان ہمت کر بھی لے تو وہ اندر سے بالکل ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے، بالکل میری طرح۔ شعیب جو مجھے اپنے بیٹوں میں سب سے پیارا تھا، اس کی ضد اور ہٹ دھرمی نے تو میری کمر توڑ ہی دی، اب..... اب شعیب کی طرح صفدر بھی میری روایات، دولت اور شملے کو ٹھوکر مار کر چلا گیا تو میں کیا کر لوں گا؟ اس سے بہتر ہے کہ میں اس کی بات مان لوں۔

”بابا جان! آپ کن سوچوں میں پڑ گئے ہیں؟“ صفدر نے چودھری طالب علی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ سوچوں کے بھنور سے نکل آئے۔

”ہاں..... میں سوچ رہا تھا کہ.....“

”جو بھی سوچ رہے تھے، بابا جان! اس سوچ کا انجام میرے حق میں ہونا چاہئے۔ میں نے ہر صورت بار ایٹ لا کرنے جانا ہے۔“ صفدر کے لہجے میں محبت کے ساتھ ساتھ دھمکی کی ٹرشی بھی تھی۔

”میری سوچ نے وہی فیصلہ کیا ہے جو تم چاہتے ہو۔“ چودھری طالب علی کا لہجہ ٹوٹا ہوا

”سچ بابا جان؟“ صفدر مارے خوشی کے ان سے لپٹ گیا۔  
”ہاں!..... مگر میری ایک شرط ہے۔“ چودھری طالب علی اس کی پشت پر ہاتھ پھرتے ہوئے بولے۔

”شرط..... کیسی شرط؟“ صفدر نے چہرہ اونچا کر کے ان کی طرف دیکھا۔  
”میں چاہتا ہوں، تمہارے جانے سے پہلے تمہاری شادی کر دی جائے۔“  
”اتنی جلدی بابا جان؟..... آخر ایسی کیا جلدی ہے؟ میں آ کر کر لوں گا۔“  
”وہ تو مجھے بھی ظلم ہے کہ تم آ کر کر لو گے۔ مگر کیا پتہ کہ وہیں کر لو۔“ انہوں نے دل کی بات کو زبان دے دی۔

”یہ غلط خیال ہے آپ کا، بابا جان!“ صفدر تیزی سے بولا۔  
”میں جو کہہ رہا ہوں، سچ کہہ رہا ہوں۔ مرد کو بدلتے کوئی دیر نہیں لگتی صفدر! وہاں تمہیں کوئی اچھی لڑکی پسند آئے اور تم پھسل جاؤ، رنگ محل کی روایات سے بغاوت کر دو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو رنگ محل کے دروازے تم پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گے۔“ چودھری طالب علی کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔

”مجھے ظلم ہے بابا جان!..... میں آپ کو یہ موقع نہیں دوں گا کہ رنگ محل کے دروازے مجھ پر بند کر دیئے جائیں۔ مجھے آپ کی پسند جی جان سے پیاری ہے۔ اور رنگ محل کی روایات پر میں اپنی خوشیاں قربان کر سکتا ہوں، مجھ میں اتنا حوصلہ ہے۔“

”اچھا!“ چودھری طالب علی کا دل پھول کی مانند کھل اٹھا۔ حالانکہ ان کے ذہن کی آواز نے دل کے کھلے پھول کو خاکستر کر دیا۔ ذہن کہہ رہا تھا، حوصلہ مند تو شعیب علی بھی تھا، جو ان روایات سے ٹکرا گیا۔ صفدر میاں! تم بزدل ہو اور بزدل ہونے کے ساتھ ساتھ دولت کے لالچی بھی۔ تم چاہو بھی تو تم میں وہ حوصلہ نہیں آ سکتا۔ اور اچھا ہے کہ اس جیسا حوصلہ تم میں پیدا نہ ہو۔

”بابا جان! میں آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ جیسے کہ.....“ صفدر نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”جیسے کہ شعیب نے۔ ہے نا؟“ چودھری طالب علی نے صفدر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

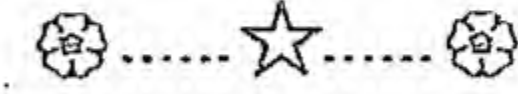
اور صفدر صرف گردن ہلا کر رہ گیا۔  
”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“  
”کون سی بات؟“ صفدر نے پوچھا۔



”یہی کہ تم شادی کر کے باہر جاؤ۔“ چودھری طالب علی نے صفدر کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

صفدر چند لمحے باپ کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے یہ احساس تھا کہ چودھری طالب علی اس کا جواب اثبات میں سننا چاہتے ہیں۔ تبھی تو اس نے کہا۔  
”جو آپ چاہیں گے بابا جان!“

”مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔“ چودھری طالب علی نے اسے لپٹا کر پیشانی چوم لی۔ یہ سب وہ اس لئے چاہتے تھے کہ وطن میں بھی صفدر کے لئے دولت کے علاوہ اور کُشش بھی رہے تاکہ وہ لوٹ آئے۔ ایسا نہ ہو، وہ اُس ترقی یافتہ ملک کی رنگین بھول بھلیوں میں ایسا گم ہو کہ واپسی کا راستہ بھی نہ دیکھ سکے اور انہیں ایک اور طویل صدمے سے دوچار ہونا پڑے۔



چودھری شوکت نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھالیا اور اپنی وحشت زدہ نظریں دینو پر گاڑ دیں۔ مارے غم کے ان کی آنکھیں آنسو روکنے کی کوشش میں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں اور دینو گم صم سیا اُن کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس نے چودھری شوکت علی کو پوری روداد سنا دی تھی۔

”دینو!“ چودھری شوکت علی کے لب زخمی پر ندے کے پروں کی مانند پھڑپھڑائے۔  
”جی مالک!“

”مجھے یہ بتاؤ کہ میں اپنی دہی کو کیا بتاؤں؟ کیسے بتاؤں کہ اُس کا بھائی اس دنیا میں نہیں ہے؟ وہ تو رورو کے ہلکان ہو جائے گی۔ اتنا بڑا صدمہ کیسے سہار سکے گی وہ؟“ وہ پلنگ سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُن کا لہجہ نہایت شکست خوردہ تھا۔ آنسو پینے کی کوشش میں اُن کا گلا رُندھ گیا تھا۔ آنکھوں میں شبنم جننے لگی تھی۔

”مالک! جو خدا کو منظور تھا، وہ ہو گیا۔ آپ بہتر سمجھیں تو مومو کو بتادیں، ورنہ چھپالیں اشو کی موت کی خبر۔“ دینو نے رائے دی۔

”پھر اُسے کیا جواب دوں؟ وہ میرے ساتھ اشو کو نہ پائے گی تو اس کا ننھا سادل ٹوٹ جائے گا۔“ چودھری شوکت علی دکھ سے بولے۔

”مالک! مومو کے ملتے ہی آپ کی سوچنے سمجھنے کی قوت ختم ہو گئی ہے کیا؟“ دینو نے مسکرا کر کہا۔

”کیا مطلب؟“ وہ بری طرح چونکے۔  
”بس، آپ مومو سے یہ کہہ دیں کہ راجا نے نہیں آنے دیا اشو کو۔ اور اشو خود بھی نہیں آنا چاہتا تھا۔“

”تم چاہتے ہو کہ میں مومو سے جھوٹ بولوں؟“ چودھری شوکت علی اُس کی بات کاٹ کر بولے۔

”کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ بعض مرتبہ مصلحت کی خاطر بھی جھوٹ بولا جاتا ہے اور آپ مصلحت کے مُہر دں سے کئی بار پٹ چکے ہیں۔ ایک بار پھر سہی۔“ دینو نے اطمینان سے جواب دیا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو دینو!“ چودھری شوکت علی ایک طویل سانس لے کر بولے۔ ”بعض مرتبہ مصلحت کی خاطر بھی جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ میں اس سے جھوٹ بول دوں گا۔ مگر میری دہی ساری زندگی انتظار ہی کرتی رہے گی اور اشو اُسے نہیں ملے گا۔ دینو! تم نہیں جانتے، یہ ملن کا انتظار بہت برا ہوتا ہے۔ مجھ سے پوچھو، جس نے اس زحمت کا مزا چکھا ہے۔ اتنا طویل انتظار ہوتا ہے یہ کہ دل میں دراڑیں ڈال دیتا ہے، عجیب سی ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے دینو! مگر میری بیٹی اس جلن کے احساس کو کبھی نہ پاسکے گی۔“ چودھری شوکت علی کی آواز بھرا گئی۔ ان کے گلے میں آنسوؤں کا پھندا لگ گیا تھا۔

انہیں دُکھی دیکھ کر دینو نے ایک دم ہی بات پلٹ دی اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”آج ملائی جی نظر نہیں آرہی ہیں۔“

”وہ بڑی اور چھوٹی بھرجائی کے ساتھ بہاؤ الدین زکریا کے مزار پر چادر چڑھانے گئی ہے۔“ چودھری شوکت علی نے کہا اور پھر دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولے۔ ”وہ نہیں تھی، تبھی تو تمہیں یہاں بلایا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے تو تمہارا سایہ بھی رنگ محل میں نہیں آ سکتا۔“

”یہ تو ہے۔ پر مالک! مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ ملائی جی مجھ سے کیوں جلتی ہیں؟“  
”جلنا، سڑنا، کڑھنا بانجھ عورتوں کا وطیرہ ہوتا ہے۔ اگر یہ سب کچھ نہ کریں تو مرد پر حکم نہیں چلا سکتیں۔ انہی چیزوں کے ریشم سے یہ جال بُنتی ہیں اور مرد کو جکڑ لیتی ہیں۔ زہرہ بیگم نے بھی ایسا جال بُنا ہوا ہے کہ میں چاہوں بھی تو اس سے نہیں نکل سکتا۔“

”مگر مالک! ایک بار تو نکل چکے ہیں اور انہیں خبر بھی نہیں ہوئی۔“ دینو نے شرارت سے کہا۔

”اب سوچتا ہوں تو بس یہی خیال آتا ہے، کاش میں دنیا پور نہ جاتا اور نہ یہ سب کچھ میرے ساتھ گزرتا۔ لیکن یہ بھی تو ہے کہ اگر انہونی باتوں کی خبر ہو جائے تو پھر انسان سے کوئی گناہ ہی نہ ہو۔ اگر میں دنیا پور نہ جاتا تو پھر مومو جیسی خوشی کیسے ملتی؟ کیوں دینو؟“ انہوں نے بچوں کی سی معصومیت سے پوچھا۔

”جی مالک!“ دینو نے ان کی بات سے اتفاق کیا۔



”ویسے کبھی کبھی مجھے زہرہ پر بہت ترس آتا ہے۔ کیا ہے بے چاری کے پاس۔ تہی راسن، شوہر کی محبت نہیں پاسکی، قدرت سے اپنے پاؤں تلے جنت کی تعمیر نہیں کروا سکتی۔ ہے نابد نصیب۔ مر جائے تو کوئی یاد بھی نہ کرے۔“ چودھری شوکت علی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

پھر جیب رکنے کی آواز پر وہ دونوں اسی طرف متوجہ ہو گئے۔ چودھری شوکت علی تیزی سے درخت کی طرف بڑھے اور پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے لگے۔ پھر وہ پلٹے، اُن کے لبوں پر مسکراہٹ کی لکیر کھینچ گئی تھی۔ وہ دینو کے قریب آئے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

”لو دینو! شیطان کو یاد کیا اور وہ حاضر۔“

”تو اب میں جاؤں مالک!“ دینو، زہرہ بیگم کے آنے سے پہلے ہی چلا جانا چاہتا تھا۔

”ہاں! میں آج رات ڈیرے پر سوؤں گا۔ تم اگر چاہو تو آ جانا۔“

”جو حکم۔“ دینو نے دھیمے لہجے میں کہا۔ حالانکہ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ انکار کر دے۔ نہ جانے چودھری شوکت علی تک اس کے دل کی آواز کیسے پہنچ گئی، تبھی تو وہ دینو کا کندھا تھکتے ہوئے محبت سے بولے۔

”آج تو آرام کر دینو! کل سہی۔ ویسے بھی تو تھکا ہوا ہے۔ میں تجھ سے بہت خوش ہوں۔ جا، پانچ روز کی تھکن اُتار۔ اور یہ رکھ لے۔ کام آئیں گے۔“ چودھری شوکت علی نے جیب سے نوٹ نکال کر دینو کی طرف بڑھائے۔

”نہیں مالک! مجھے بالکل ضرورت نہیں ہے۔ احمد پور جاتے ہوئے آپ نے دیئے تو تھے۔“ دینو نے روپے لینے سے انکار کر دیا۔

”اویار! تو رکھ لے۔ کام آئیں گے۔“ چودھری شوکت علی نے زبردستی اُس کے کرتے کی جیب میں نوٹ ٹھونس دیئے۔

”اچھا جی، رُب راکھا۔“ دینو گھبرا کر بولا۔

”جا، رُب راکھا۔“ وہ مسکرائے۔

دینو ابھی کمرے سے نکلا بھی نہیں تھا کہ زہرہ بیگم اندر داخل ہوئیں۔ دینو پر نظر پڑتے ہی ان کی پیشانی کی شکنوں میں حریفانہ اضافہ ہو گیا، آنکھوں سے ناگواری جھلکنے لگی۔

”سلام ملکائی جی!“ دینو نے جھک کر کہا۔ زہرہ بیگم نے کوئی جواب نہ دیا اور نہایت تمکنت اور غرور سے آگے بڑھیں۔ دینو جلدی سے کمرے سے نکل گیا۔

”سلام کا جواب دے دیتیں تو آپ کی شان میں کمی تو نہ آ جاتی؟“ چودھری شوکت علی طنز کرنے سے باز نہ آئے۔ انہیں واقعی زہرہ بیگم پر بہت غصہ آیا تھا۔

”شوکت! میں نے آپ سے ہزار بار کہا ہے کہ دینو میری خواب گاہ میں نہ آیا کرے۔“ زہرہ بیگم نے سلکی سیاہ شال جو سچے تلے سے کڑھی ہوئی تھی، اُتارتے ہوئے نہایت نخوت سے کہا۔

”یہ خیال رہے کہ یہ خواب گاہ میری بھی ہے اور وہ آپ کی موجودگی میں نہیں آیا اور نہ ہی ہماری خلوت میں دخل انداز ہوا ہے۔“ چودھری شوکت علی نے لفظ چبا چبا کر ادا کئے۔

”کچھ بھی ہو، میں یہ پسند نہیں کرتی کہ ملازم یہاں آئیں۔“ زہرہ بیگم منہ بنا کر بولیں۔

”اس طرح تو جیوی بھی یہاں آتی ہے۔ کیا وہ ملازمہ نہیں؟“ شوکت علی کا لہجہ ٹرش تھا۔

”اُس کی بات اور ہے۔“

”اس لئے کہ وہ آپ کے میکے سے ساتھ آئی تھی۔ تو زہرہ بیگم! اسی طرح دینو میرا

ملازم ہی نہیں، دوست بھی ہے۔ اور آج سے نہیں، بچپن سے۔“ چودھری شوکت علی ٹرش لہجے میں بولے۔

”آپ تو ہر بات کا اُلٹ مطلب لیتے ہیں۔“ زہرہ بیگم ادا سے مسکرائیں اور چودھری

کے قریب آ کر نہایت شیریں لہجے میں گویا ہوئیں۔ ”بس، مجھے اچھا نہیں لگتا کہ آپ کسی سے اتنے گھل مل کر بات کریں۔“

”اوہ..... تو یہ بات ہے۔ پہلے بتانا تھا نا۔“ وہ بن کر بولے اور زہرہ بیگم کا ہاتھ تھام

لیا۔

”ہاں تو آپ نے کیا دعا مانگی حضرت زکریا کے مزار پر؟“

”اب کیا دعا مانگوں شوکت؟“ زہرہ بیگم نے آہستگی سے کہا۔

”کیوں..... سب کچھ مل چکا ہے؟“ چودھری شوکت علی نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... خدا نے سب کچھ دے دیا ہے، سوائے اولاد کے۔ نہ جانے اولاد کیوں

نہیں دی۔ شاید یہ بھی اس کی مصلحت ہے۔ اپنے راز وہی جانے۔“ زہرہ بیگم دُکھی ہو گئیں۔

”ہاں..... وہ اپنے راز خود ہی جانے۔“ چودھری شوکت علی نے کہا۔ پھر زہرہ بیگم کا

سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے بولے۔ ”تم دُکھی مت ہو زہرہ! جو اُس نے دینا تھا، دے

دیا۔ مجھے کوئی غم نہیں ہے۔ ہمارا بیٹا تو ہے۔“

”کون سا؟“ زہرہ بیگم نے چونک کر پوچھا۔

”ارے شعیبی۔ وہی تو ہمارا بیٹا ہے۔“ چودھری شوکت علی زور سے ہنس دیئے۔

”ہاں۔ کچھ پتہ ہے آپ کو؟“ زہرہ بیگم پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

”کس بات کے بارے میں؟“ چودھری شوکت علی نے حیرت سے پوچھا۔

”لالہ طالب کل ساہیوال جا رہے ہیں۔“



”وہ تو جاتے ہی رہتے ہیں۔ بھر جائی کامیکہ ہے وہاں۔“ انہیں یہ بات نئی نہ لگی۔  
”مگر اس بار مقصد اور ہے۔“ زہرہ بیگم بولیں۔  
”یہ پہیلیاں کیوں جھوٹائی جا رہی ہیں؟“ وہ ہنسے۔

”بات یہ ہے کہ لالہ اب صفدر کی شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔“  
”اچھا!“ چودھری شوکت علی کے لہجے میں حیرت عود کر آئی۔

”آپ سے بھی بات نہیں کی؟ شوکت ہم سے تو کوئی مشورہ ہی نہیں کرتا۔ یوں لگتا ہے کہ عضو معطل کی طرح ہم کو رنگ محل میں ڈال رکھا ہے، جیسے کاٹھ کباڑ کو الگ تھک رکھ دیا جاتا ہے، بالکل اسی طرح۔“ زہرہ بیگم کی آواز بھرا گئی۔

”زہرہ! دکھی مت ہو۔ لالہ کو علم ہے کہ ہم تو جی حضور والے بندے ہیں۔ ان کی خوشی میں خوش ہوتے ہیں اور دکھوں پر آنسو بہاتے ہیں۔ سوائے اس کے کرتے بھی کیا ہیں ہم۔ نہیں پوچھا تو نہ سہی۔“ چودھری شوکت علی نے محبت سے ان کا ہاتھ تھپکتے ہوئے کہا۔

”یہ تو ہے۔“ اتنی محبت پا کر زہرہ بیگم کی آنکھوں سے دو آنسو رخساروں پر لڑھک آئے۔

”اوہ، جھٹکی نہ ہو تو۔“ چودھری شوکت علی نے ہنستے ہوئے انہیں لپٹا لیا اور زہرہ بیگم ان کے سینے سے لگ کر پلک پلک کر رو دیں۔ وہ اپنی قسمت پر آنسو بہا رہی تھیں۔ اس وقت شدت سے ایک ہی بات ذہن و دل کے آگن میں گونج رہی تھی۔

”یارب العزت! صرف ایک..... صرف ایک ہی بیٹا یا بیٹی دے دیتا۔ تیری دنیا میں کون سی کمی آجاتی؟ میں بھی یہ خوشی دیکھتی، اُن کے بیاہ کی خوشی کیسی ہوتی ہے؟ مجھے تو کوئی بھی خوشی نہ مل سکی۔ اللہ میاں جی! میرے ساتھ تو سخت نا انصافی ہوئی ہے۔ شوہر ایسا دیا، جسے گودوں کھلایا۔ بہت سالوں اس پر بھی صبر کر لیا۔ مگر اللہ میاں! میں نے کیا قصور کیا تھا کہ میرے قدموں تلے جنت کی تعمیر نہ ہوئی؟ روزِ محشر جب اولاد کو ماں کے نام سے پکارا جائے گا تو میرا نام تو کہیں بھی نہیں گونجے گا۔ میں تو اُس ٹنڈ منڈ درخت کی طرح ہوں، جو بہار میں بھی خزاں کا نمونہ رہتا ہے، جس پر کوئی کوئیل نہیں پھوٹتی، جس کے سائے تلے کوئی سانس لینے نہیں رکتا۔ جو جنگل میں تنہا ہوتا ہے..... اکیلا۔“



ساحل بحر پر وہ بڑے سے پتھر پر بیٹھی جھاگ اڑاتی، شور مچاتی لہریں دیکھ رہی تھی، جو بہت دور سے سانپ کی مانند شوکتی ہوئی آتیں اور پھر آگے والی لہروں سے مل جاتیں۔ ساحل تک آتے آتے ان کے شور میں کمی آ جاتی، وہ دھیرے سے پیچھے سے آنے والی لہر کے ساتھ غم ہو کر لوٹ جاتیں۔ وہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ لٹکائے اُن لہروں کو تک رہی تھی اور اس سے بے اختیار اسے وہ چھوٹی سی ندی یاد آ گئی، جہاں کبھی کبھی ٹچو کے ساتھ جاتی، گھنٹوں ندی کے صاف شفاف پانی میں پاؤں لٹکائے وہ بیٹھے رہتے۔ وہ ٹچو کی فرمائش پر اُسے مایہ سناتی۔ اُس کی پُرسوز آواز ہواؤں میں تحلیل ہو کر دور دور تک پھیل جاتی۔ کتنا مزا آتا تھا اُسے مایہ گانے میں۔ ٹچو محبت سے کہتا تھا۔  
”مومو! تیری آواز بہت پیاری ہے۔“

”سچ؟“ وہ مشرور ہو جاتی۔

”مومو!“ رضیہ نے اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر اسے گاؤں کی ندی سے کھینچ لیا۔ تب مومو کو ہوش آیا کہ وہ ندی پر نہیں، سمندر کے ساحل پر ہے۔  
”جی بھابی؟“

”کیا سوچ رہی ہو؟“ رضیہ ان کے قریب ہی پتھر پر بیٹھ گئی۔

”سوچ رہی ہوں، بابا جانی کو گئے پورے پندرہ دن ہو گئے ہیں اور وہ اب تک نہیں آئے۔“

”اوہ جان! تم مت سوچو۔ بس چاچا آ جائیں گے۔ وہ ہمیشہ اسی طرح آتے ہیں۔“

”مگر جب میں احمد پور میں تھی تو ہر ہفتے آتے تھے۔“ مومو نے بتایا۔

”احمد پور اور حسن پور کا فاصلہ کم ہے۔ صرف چند گھنٹوں کا۔“

”یہاں بھی تو ہم صرف چند گھنٹوں میں آئے تھے۔“ مومو نے رضیہ کو لاجواب کر دیا۔

”بھئی وہ زمینوں کے کام میں مصروف ہوں گے اور تمہاری طرف سے اب انہیں

اطمینان ہے کہ اب تم بالکل صحیح جگہ پر موجود ہو۔“



”میرے خیال میں اشو کی وجہ سے نہیں آئے۔ راجا نہیں آنے دیتا ہوگا۔“ مومو نے دھیرے سے کہا۔

”لگتا تو یہی ہے۔“ رضیہ بھی اس کی بات سے متفق تھی۔

”اور بابا جانی چاہتے ہوں گے کہ اشو کو لے کر ہی آئیں۔ ہے نا بھابی جی؟“ مومو نے اشتیاق سے کہا۔

”بالکل درست کہا تم نے۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔“

”شعیب بھائی نظر نہیں آ رہے؟“ مومو نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”سرور اور وہ ٹہلتے ہوئے آگے نکل گئے ہیں اور میں تمہاری طرف آگئی۔ لو، وہ بھی آگئے۔“ رضیہ چہکی۔ سرور اور شعیب اُن کے قریب آگئے۔ دونوں نے پتلونوں کے پانچے اوپر چڑھا رکھے تھے، اس کے باوجود بھی پتلونیں گیلی ہو گئی تھیں اور پاؤں پر ریت کے ذرے چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔

”مومو! تم بھی چلو پانی میں۔“ شعیب نے کہا۔

”نہیں بھائی! مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”میں ساتھ ہوں، پھر ڈر کا ہے کا؟ اٹھو۔“ شعیب نے اس کا ہاتھ تھام کر کھینچا۔

”نہیں، نہیں۔“ مومو کانپنے لگی۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا، آنکھوں سے وحشت جھلکنے لگی۔

”پریشان مت کرو مومو کو۔ دیکھو تو، کانپ رہی ہے۔“ رضیہ نے شعیب کو محبت سے ڈانٹا۔

”ارے تو اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟“ شعیب نے مومو کو لپٹا لیا۔

”اب گھر چلیں بھائی!“ مومو نے سہمی ہوئی ہرنی کی طرح کہا۔

”اوہو، بھی بہادر بنو۔ دیکھو، سرور کیا سوچے گا کہ شعیب کی بہن اتنی بزدل ہے؟“

شعیب نے مومو کو ہمت دلائی۔

”بس، اب گھر چلیں۔“ مومو ٹھنک کر بولی۔

”جو حکم۔“ شعیب کو رش بجالایا اور مومو ہنس دی۔ اس کے سرخ سرخ رخسار مزید سرخ ہو گئے۔

شعیب اور رضیہ، مومو کو ہر ممکن طریقے سے خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ شعیب آج کل شام کو میل سے جلدی آ جاتا تھا۔ کوئی نہ کوئی شوخ سا جملہ اس طرف اُچھال دیتا۔ صبح کو رضیہ، مومو کو پڑھاتی اور ویسے بھی شعیب نے کہہ دیا تھا کہ جیسے ہی مومو کو اچھی طرح کتابوں کے لفظوں کی پہچان ہو جائے گی تو وہ ٹیوٹر رکھ دے گا تاکہ وہ مومو کو پڑھا سکے۔ اور یوں بھی وہ چاہتا تھا کہ مومو کو سال دو سال گھر میں پڑھا کر ایک دم ہی سیونٹھ کلاس میں

داخل کروادے، اس کی عمر کے لحاظ سے۔ کیونکہ مومو کو کسی صورت بھی کے جی میں داخل کروانا ممکن نہ تھا۔

ادھر ایک بات اور بھی تھی اور وہ یہ کہ چودھری شوکت علی نے شعیب کو اشو کی موت کے

بارے میں بتا دیا تھا اور ساری بات شعیب پر ڈال دی تھی کہ وہ مومو کو بتائے یا نہ بتائے۔

اور شعیب نے یہی مناسب سمجھا تھا کہ مومو کو نہ بتایا جائے۔ کیا فائدہ اُس کے دل کے زخموں

میں ایک اور زخم کا اضافہ کرنے کا؟ یوں بھی وہ مومو کو بے تحاشا چاہتا تھا اور جس کو چاہا

جائے، انسان اُسے دُکھی نہیں کر سکتا۔ اس نے رضیہ کو بھی نہیں بتایا تھا۔ ویسے بھی اُن کے

ہاں عورت سے ہر بات چھپائی جاتی تھی۔ شعیب بعض مرتبہ سوچتا۔ قدرت بھی انسان کو کیسی

کیسی آزمائش میں ڈالتی ہے۔ مومو کو بچپن ہی سے آزمائشوں سے گزارتی آرہی ہے۔ پہلے

باپ سے علیحدہ ہوئی، سو تیلے باپ کے ساتھ ساتھ ماں کے بھی جوتے اور کڑوی کیلی باتیں

امرت سمجھ کر حلق سے اُتارنی رہی۔ باپ کی محبت قطرہ قطرہ پتی رہی۔ اور پھر جب ماں نے

محبت کے آبشار کا رخ اُس کی طرف موڑا تو اُسے ایک دم بھگو دیا۔ اور پھر وہ محبت کا آبشار

بھی خشک ہو گیا۔ تب وہ باپ کی پھیلی ہوئی بانہوں میں سا گئی۔ اُسے ہر خوشی کے ساتھ دُکھ

ملتا ہے۔ کبھی دو خوشیاں اُسے ایک ساتھ نہیں ملیں۔ جو بھی خوشی ملتی ہے، اپنا خراج ضرور

وصول کر لیتی ہے۔ کیسی قسمت ہے مومو کی؟ دل میں ایک زخم کا اضافہ ہوتا ہے، تب لبوں پر

مسکراہٹ آتی ہے۔ اور میں تو خوش نصیب ہوں، جو بچپن سے اب تک والدین کی محبتوں

سے سیراب ہوتا رہا ہوں۔ اب یہ محبتیں چھوٹی ہیں تو رضیہ جیسی بیوی کی محبت نے اس خلا کو

پُر کر دیا ہے۔

شام کا ملگجا اندھیرا پھیل چکا تھا، جب وہ گھر میں داخل ہوئے۔ فضا میں خنکی بڑھ گئی

تھی۔

”رضیہ! اب تم گرم گرم چائے پلوا دو تو مزہ آجائے۔“ شعیب نے برآمدے کی

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے پلٹ کر رضیہ سے کہا۔

”گھر میں گھستے ہی تمہیں چائے کی طلب لگ جاتی ہے۔“ رضیہ ہنس کر بولی۔

”دیکھ لو سرور! تمہاری بہن کیسے اپنے شوہر کے سامنے پٹر پٹر زبان چلاتی ہے۔“

شعیب نے شرارت سے کہا۔

”مجھ سے کیوں کہہ رہے ہو؟ یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا معاملہ ہے۔“ سرور بھی کہاں راہ

دینے والوں میں سے تھا۔

”ہونا آخر سالے۔“ شعیب نے اُس کی پشت پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا تو سرور ہنس

دیا۔ سرور ویسے بھی خوش تھا اور یہ احساس ہی اس کے خوش ہونے کے لئے کافی تھا کہ اس کی



بہن خوش ہے۔

رضیہ کے ہر دم مسکاتے لب، آنکھوں کی مخصوص جگہوں جیسی چمک اور اُس کا ٹھہرا کرنا  
روپ اس بات کی گواہی دیتا تھا کہ شعیب کی سنگت میں بہت خوش ہے۔ اور جب لڑکیاں  
اپنے گھروں میں سکھتی ہوں تو والدین نہایت سکھ کی سانس لیتے ہیں۔

”صاحب! دوبار آپ کے چاچا کا فون آیا تھا۔“ رضیہ نے اطلاع دی۔

”کچھ بتایا نہیں؟“ شعیب نے کہا۔

”کہنے لگے کہ پھر فون کر لیں گے۔“

”ٹھیک ہے، میں خود کر لیتا ہوں۔“ شعیب بولا اور پھر سرور کی طرف مڑ کر بولا۔ ”ذرا  
رنگ محل کے نمبر تو ڈائل کرو۔“

”وجہ؟“ سرور نے گھورا۔

”چاچا سے بات کروں گا۔“

”اگر کسی نے آواز پہچان لی، تو؟“ سرور نے خدشہ ظاہر کیا۔

”او بے وقوف! تم خود ہی بات کرنا۔ کوئی اور ہوا تو کہہ دینا کہ شوکت علی کو بلوادیں۔“

پھر بات میں کر لوں گا۔ عقل کے کورے ہی ہو۔“ شعیب جھنجھلا کر بولا۔

”مجھے کیا خبر، تمہارا شیطانی ذہن کیا سوچتا رہتا ہے، کیا پلاننگ کرتا ہے۔“ سرور نے  
اُسے چوایا۔ تبھی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

”ٹرن..... ٹرن..... ٹرن.....“

”لو، آگیا چاچا کا فون۔“ شعیب ہنس دیا اور ریسپورڈ اٹھا لیا۔ واقعی دوسری طرف

چودھری شوکت علی ہی تھے۔

”السلام علیکم چاچا!“

”وعلیکم السلام۔ دوبار فون کر چکا ہوں۔“

”بتایا تھا رضیہ نے۔ کوئی خاص کام؟“

”نہیں، ایک اطلاع دینی تھی۔ پہلے یہ بتاؤ، مومو کیسی ہے؟“

”بالکل ٹھیک ہے۔ اُسے لے کر ہی تو ہم کلفٹن گئے تھے۔ خوش ہے بہت۔“

”اچھا، اچھا..... جی لگ گیا ہے اُس کا۔ تم نے بتایا تو نہیں نا ابھی تک اشو کے بارے

میں؟“

”نہیں چاچا! میں نے سوچا ہے کہ نہ بتانا ہی مناسب ہو گا۔ جس راہ نہیں جانا، اس کا

نام کیا لینا۔ اب کون سا اُسے وہاں جانا ہے۔“

”جیسا تم مناسب سمجھو۔“ چودھری شوکت علی نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

”بس، اس بات کو گول کر دیں۔ اور ہاں، کون سی اطلاع دینی تھی آپ نے؟“ شعیب

نے یاد دلایا۔

”اس جمعے کو صفدر کی شادی ہے۔“

”آ..... اچھا۔“ شعیب کے دل کو ایک دم ہی کچھ ہونے لگا۔ پھر وہ خود کو سنبھالتے

ہوئے بولا۔ ”اتنی جلدی؟“

”ہاں..... یہ سب اس لئے ہو رہا ہے کہ صفدر بار ایٹ لا کرنے انگلیٹڈ جا رہا ہے نا۔

اور لالہ نے چاہا کہ اُسے رنگین بندھن میں باندھ دیا جائے۔“ چودھری شوکت علی ہنس کر

بولے۔

”نہیں چاچا! صفدر بھائی کو بابا جکڑ رہے ہیں۔ انہیں خطرہ ہے کہ وہ کوئی میم نہ لے

آئیں۔ اور پھر فضل ماما کی زمینیں نہ مل سکیں گی، ان کی دولت میں اضافہ نہیں ہو سکے گا۔ وہ

صفدر بھائی کو جکڑنے کے ساتھ ساتھ آزاد بگا چھوڑ رہے ہیں کیونکہ انہیں جس چیز کی

ضرورت تھی، وہ تو انہیں مل ہی جائے گی۔ ان کی زمینوں میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ پھر

صفدر بھائی کچھ بھی کرتے پھریں، ایک چھوڑ دس میمیں لے آئیں۔“ شعیب بولے گیا۔

”تم بہت باغی ہو گئے ہو جیسی!“ وہ بولے۔

”پتہ نہیں نئی نسل صحیح بات کرے تو پرانی نسل اُسے بغاوت کیوں کہتی ہے۔“ شعیب

ہنس دیا۔ ”خیر، آپ صفدر بھائی کو میری جانب سے مبارک باد دے دیجئے گا۔“

”میں کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ تم سے بات ہوئی ہے۔“

”جیسی آپ کی مرضی۔“ شعیب نے دھیرے سے کہا۔

”رضیہ تو ٹھیک ہے نا؟“

”دعا ہے آپ کی۔ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔“

”شعیب جان! تو دل مندانا کرنا۔“ چودھری شوکت علی بولے۔

”میں سمجھا نہیں؟“

”بہی کہ صفدر کی شادی میں شریک نہیں ہو سکتا تو۔“

”اوہو، چاچا! آپ نے یہ کیسے جانا؟ میں تو بہت خوش ہوں، رنگ محل کے طلسم سے

آزاد ہو کر۔ آپ یہ خیال بھی دل میں نہ لائیں کہ میں پچھتا رہا ہوں۔“

”تو سچ کہہ رہا ہے؟“ ان کے لہجے میں خدشہ ہلکورے لے رہے تھے۔

”سچائی کو نا۔ بچے کا کوئی آلہ ہے تو بتائیں آپ۔ اچھا آپ کب آرہے ہیں؟“

”بس جلد ہی آؤں گا۔ شاید صفدر کو چھوڑنے آنا پڑے۔ تمہیں دے اطلاع دے دوں

گا۔“ چودھری شوکت علی بولے۔ پھر ایک دم گھبرائے ہوئے لہجے میں کہنے لگے۔ ”شاید لالہ“



رہے ہیں۔ باقی باتیں پھر سہی۔ رت راکھا۔“ پھر انہوں نے شعیب کا جواب سنے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔

”ویسے یار! تمہارے اندازے کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔“ سرور نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“ شعیب بولا۔

”تم نے گھنٹی بجتے ہی کہا تھا کہ چاچا کا فون ہے۔“

”اوہ!“ شعیب بھی مسکرا دیا۔ اتنے میں رضیہ ٹرائی دھکیلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آگئی۔

”کیا کہا چاہا؟“

”بتا رہے تھے کہ صفدر بھائی کی شادی ہو رہی ہے۔“

”اچھا!“ رضیہ بچھری گئی۔

”تمہیں کیا ہو گیا بھی؟ ہنسو، بولو۔“ شعیب بھی زور سے ہنسا۔

”میں سوچ رہی ہوں کہ اگر ہم بھی شریک ہوتے تو کتنا اچھا تھا۔“ رضیہ نے چائے بناتے ہوئے کہا۔

”چھوڑو یار! تمہیں ذرا مزانہ آتا۔ ہمارے ہاں رسمیں بہت عجیب و غریب ہوتی ہیں۔

تم بور ہو تیں۔ اچھا ہے، ہماری ان بن ہے۔“ شعیب بظاہر بے پروائی سے بولا مگر اس کا دل

بھی یہی چاہ رہا تھا کہ وہ رنگ محل جائے، بھائی کا شہ بالا بنے، صفدر سے چھیڑ چھاڑ کرے۔

مارے خوشی کے لڑکیوں کے ساتھ لڑی اور بھنگڑا ڈالے۔ مگر اُس نے اپنے چاچا کو خوشیاں

دلانے کی خاطر خود خوشیوں سے منہ موڑ لیا تھا۔ کچھ پانے کے لئے بہت کچھ کھونا بھی پڑتا

ہے اور شعیب نے بھی بہت کچھ کھو دیا تھا۔

محببتوں کے آبشار ماں باپ کو چھوڑ دیا تھا۔

بہن بھائی سے دور ہو گیا تھا۔ ایک نسرین تھی، جس کا خط ہر ہفتے آ جاتا تھا۔

”رضیہ! مومو کو بھی بلانا۔“

”وہ تو آتے ہی کمرے میں گھس گئی۔ میں نے ایک گلاس دودھ پلا دیا ہے اسے۔“

”بلا لاؤ، لڈو کھیلیں گے۔ بہت خوش ہوتی ہے مجھے ہر اکر۔“ شعیب نے کہا۔

”ویسے بھی تو تم ہمیشہ ہار کر خوش ہوتے ہو۔“ سرور نے چوٹ کی۔

”سو فیصد درست کہا تم نے۔ مثال سامنے ہے۔“ شعیب نے شوخ نظروں سے رضیہ

کی طرف دیکھا تو رضیہ کے گالوں پر گلال پھیلا گیا۔

”بات کوئی ہو، تم الٹ مطلب لے جاتے ہو۔ ہر بات کا رخ میری طرف موڑ لیتے

ہو۔“

”رضیہ جی! میرے جتنے بھی راستے ہیں، وہ سب تم تک ہی جاتے ہیں۔ میں کہیں سے بھی چلوں، تم تک ہی پہنچوں گا۔ اس لئے ہر بات کا رخ تمہاری سمت ہو جاتا ہے۔“

”اچھا..... میں مومو کو بلا لاؤں۔“ رضیہ جان چھڑا کر جلدی سے باہر نکل گئی۔

”شعیب! ایک بات تو بتاؤ۔“ رضیہ کے جانے کے بعد سرور بولا۔

”پوچھو!“ اس نے کہا۔

”تم اس رنگ محل سے نکل کر پچھتا تو نہیں رہے؟“

”کیا کہہ رہے ہو تم؟“ شعیب نے حیرت سے پوچھا۔

”تمہارا ٹوٹا ہوا لہجہ اس بات کا گواہ ہے کہ تمہارے اندر ہی اندر دراڑیں سی پڑ گئی ہیں۔“ سرور اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”کیا بے تکی ہانک رہے ہو؟“ شعیب اندر کا درد چھپا کر زور سے ہنسا۔

”میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔“ سرور نے مطلع کیا۔

”دیکھو دوست! کوئی لمحہ ایسا تو ضرور آتا ہے، جب جی اپنوں سے ملنے کو کرتا ہے۔ اگر

انسان خود پر قابو پائے اور سفاک لمحے کو گزر جانے دے تو آسانی سے نارمل ہو سکتا ہے۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے جب چاچا نے مجھے بتایا کہ صفدر بھائی کی شادی ہے تو یہ حقیقت ہے کہ

میرے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔ مگر اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں نے بہت آن سے رنگ

محل چھوڑا تھا اور دھڑلے سے چودھری طالب علی سے یہ کہہ کر آیا تھا کہ میں واپس نہیں آؤں

گا۔ اور شعیب علی ایسی شاخ ہے، جو ٹوٹ جاتی ہے، مگر جھک نہیں سکتی۔ تم کوئی بھی خیال دل

میں نہ لاؤ۔“ شعیب نے سرور کے گلے میں بازو جمائل کرتے ہوئے کہا تو سرور زور سے ہنس

دیا۔



سیکنہ بیگم نے جیسے ہی دروازہ کھولا، اداسیوں کے ناگ چھن اٹھائے انہیں ڈسنے کے

لئے بڑھے۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے ستارے ناچنے لگے۔ اگر وہ دروازے کا پٹ نہ تھام

لیتیں تو یقیناً گر پڑتیں۔ وہ وحشت زدہ، خالی خالی نظروں سے کمرے کی ایک ایک چیز کو گھور

رہی تھیں۔ کمرے میں درتچے کے قریب ڈبل بیڈ پڑا تھا، جس پر خوب صورت کڑھت کی

گولڈن چادر چھپی ہوئی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر بے شمار کتابیں پڑی تھیں، درپچوں پر ہرے

پائے لہرا رہے تھے، فرش ایرانی قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔

”شعیبی!..... میری جان!“ سیکنہ بیگم کی آنکھیں قطار در قطار آنسو بہانے لگیں۔

انہوں نے ہونٹوں کو سختی سے دانتوں تلے دبا رکھا تھا، مبادا چیخ نکل جائے۔

یہ شعیب علی کا کمرہ تھا۔ جہاں اس نے بچپن اور جوانی کے کتنے ہی دن گزارے تھے۔



وہ جب بھی ہاسٹل سے آتا، اسی کمرے میں ٹھہرتا تھا۔ یہ اور بات کہ سارا دن وہ رنگ محل میں دھماچو کڑی عجائے رکھتا۔ بس رات کو یہاں سونے آتا تھا۔ سیکینہ بیگم کو اس کمرے کی ایک ایک چیز سے شعیبی کی خوشبو آ رہی تھی۔ ہر شے میں انہیں شعیبی کی شبیہ نظر آ رہی تھی۔ آج وہ انہیں ٹوٹ کر یاد آ رہا تھا۔ کل صفدر کی شادی تھی، انہیں بارات لے کر ساہیوال جانا تھا۔ آج صفدر کا دوست خالد اپنی بہنوں اور بیوی کے ساتھ آ رہا تھا۔ اس کی بہنوں کے لئے تو انتظام ہو گیا تھا۔ تب صفدر نے کہا۔

”امی جی! شعیب کا کمرہ خالی ہے اور یونہی بند پڑا ہے۔ وہی انہیں دے دیا جائے۔ آپ آج ہی صفائی کروادیں، سہ پہر تک وہ پہنچ جائیں گے۔“

بس اُس کے کہنے پر سیکینہ بیگم اوپر آئیں مگر شعیب کا کمرہ کھولتے ہی اداسیاں پھن پھیلانے لگیں۔ ”نہیں، نہیں..... میں اس کمرے میں کسی کو نہیں ٹھہرا سکتی۔ کیا خبر شعیبی آجائے۔“ دل نے موہوم سا دیا جلا لیا۔ اُس کا دیک، محبت کی شمع، ممتا کی آغ۔ مگر سیکینہ بیگم کو کیا پتہ تھا کہ ان کا شعیبی لوٹنے کا نہیں ہے۔ وہ آگے بڑھیں اور بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ چادر پر نہایت نرمی سے ہاتھ پھیرنے لگیں، اسی محبت اور شفقت سے جیسے کہ شعیبی کو پیار کرتے ہوئے اس کی پشت پر پھیرتی تھیں۔

لمحے آہستہ آہستہ گزرتے رہے۔ انہیں خبر بھی نہ ہوئی کہ کتنی دیر ہو چکی ہے۔ وہ تو چادر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بس آنسو بہا رہی تھیں۔ کبھی کبھی ان کے لب مسکا پڑتے۔ آنکھوں میں وحشت کی جگہ چمک لے لیتی۔ یہ لمحہ وہ ہوتا، جب انہیں شعیب کی کوئی بات یاد آ جاتی۔ تبھی کھٹکے سے وہ چونکیں سامنے ہی دروازے کے پیچوں چو دھری طالب علی کھڑے تھے۔ انہیں اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ حسب معمول زور سے ہنسے اور ان کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

”تم یہاں ہو اور میں تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔“

”کوئی کام تھا؟“ سیکینہ بیگم کے لب پھڑپھڑائے۔

”الماری کی کنجی کہاں رکھ دی تم نے؟ اور یہاں کیا کر رہی ہو؟“ چو دھری طالب علی نے لہجے کو باز عیب بناتے ہوئے پوچھا۔

”صفدر کا دوست آ رہا ہے۔ نا۔ تو وہ کہہ رہا تھا کہ یہ کمرہ اس کے لئے ٹھیک کروادوں۔“

سیکینہ بیگم کی آواز بھرا گئی۔

”پھر ٹھیک کروادونا۔“

”نہیں طالب!“ آنسو ان کی آنکھوں سے نکل کر گالوں پر لکیر بناتے ہوئے گردن تک

چلے گئے۔

”کیوں؟“ چو دھری طالب علی جان کر انجان بن گئے۔

”یہ میرے شعیبی کا کمرہ ہے۔ اور میں کسی کو نہیں دے سکتی۔“ وہ سسک پڑیں۔

”صرف دو تین دن کی تو بات ہے۔ اور کون سا وہ آ رہا ہے۔“ انہوں نے سیکینہ بیگم کے

کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”نہیں، نہیں..... میں دو تین گھنٹے کے لئے بھی یہ کسی کو نہیں دے سکتی۔ کیا..... کیا

خبر، شعیبی آجائے۔ پھر وہ ناراض ہو گا۔ نہیں..... نہیں طالب!“ سیکینہ بیگم نے ان کے سینے

سے سر ٹکا دیا اور پلک پلک کر رو دیں۔ روتے روتے وہ کہہ رہی تھیں۔ ”طالب! اپنی ہٹ

دھری چھوڑ دیں، اُسے منالائیں۔ مجھے میرا بیٹا لوٹا دیں..... یوں لگتا ہے، جیسے میری

خوشیاں اُسی کے دم سے آباد ہیں۔ طالب! خدا کا واسطہ، میری ممتا کا واسطہ اُسے لے

آئیں..... لے آئیں۔“

سیکینہ بیگم بکھری جا رہی تھیں۔ چو دھری طالب علی کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ دو ہی تو

موقعے ہوتے ہیں، جب پیارے بہت یاد آتے ہیں۔ خوشی یا غمی۔ یہ خوشی کا موقع تھا اور وہ

ضدی شعیبی انہیں بری طرح یاد آ رہا تھا۔ اس کی یاد بار بار دل میں چٹکیاں لے رہی تھی اور

چو دھری طالب علی جان بوجھ کر خود کو کام میں مصروف رکھ رہے تھے۔ حتیٰ کہ جو کام ان کے

کرنے کے بھی نہیں تھے، وہ بھی کر رہے تھے اور سیکینہ بیگم کے آنسو ان کے دل پر نشتر زنی کر

رہے تھے۔ مگر وہ ان آنسوؤں کے سامنے موم کی طرح پگھلنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ ایک دم

ہی باپ سے چو دھری بن گئے اور چٹانوں کی طرح سے سخت لہجے میں بولے۔

”سیکینہ! وہ ناخلاق ہے۔ اگر وہ مجھ سے معافی مانگتا تو میں اسے معاف کر دیتا۔ تمہیں علم

نہیں، وہ سب کے سامنے یہ کہہ کر گیا تھا کہ میں رنگ محل میں واپس نہیں آؤں گا۔ رہے وہ

باہر، دھکے کھائے تو پتہ چلے گا۔ ٹٹ پونچے کی طرح کہیں نوکری کر رہا ہو گا۔ اور دیکھنا، وہ خود

آئے گا ایک دن۔ دولت میں بہت کشش ہے۔ یہ کشش اُسے کھینچ لائے گی۔“

”کب لائے گی اُسے یہ کشش، طالب؟..... ماں کی ممتا سے زیادہ اور کسی چیز میں

کشش نہیں۔ یہ کشش بھی اُسے نہیں لاسکی۔ وہ جب بھی مجھے خواب میں دیکھتا تھا، بھاگا آتا

تھا۔ سال میں چار پانچ چکر لگاتا تھا۔ کیا اب اُسے میرے خواب نہیں آتے ہوں گے؟“

”نہیں..... اب تمہارے خواب نہیں آتے اُسے۔ یہ سب پیٹ بھرے کی باتیں ہیں۔

جب پیٹ خالی ہو تو نیند نہیں آتی۔ اور نیند نہ آئے تو خواب خاک آئیں گے؟“ چو دھری

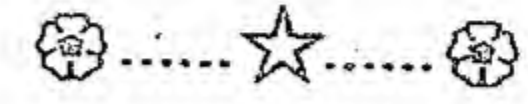
طالب علی زور سے ہنس دیئے اور سیکینہ بیگم انہیں صرف دیکھ کر رہ گئیں۔ اس چہرے پر کڑھکی

گئی، حتیٰ تھی، اور کوئی بھی جذبہ نہیں تھا وہاں۔

”بلا لومیراں کو اور ہاجرہ کو۔ صفائی کر دیں۔“



”نہیں..... یہ کمرہ میں نہیں دوں گی۔ میں اور انتظام کر دیتی ہوں۔“ سیکینہ بیگم نے سختی سے کہا اور چودھری طالب علی کے جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے سے نکل گئیں۔ طالب علی نے ایک طویل سانس لی اور ان کے منہ سے صرف ایک لفظ نکلا۔  
”شعیبی!“



اُسے یوں لگ رہا تھا، جیسے جسم دھتکتے انگاروں پر لوٹ رہا ہو، روح بار بار سولی پر چڑھ رہی ہو۔ دل بہت پریشان تھا۔ وہ کتنی دیر سے ہی کمرے میں بدل رہا تھا اور نیند لگتی تھی کہ آہی نہیں چکتی تھی۔ اُس کے پہلو میں لیٹی رضیہ خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی۔ اُس کا دل اور مضطرب ہو گیا تھا۔ کئی بار اُس نے پانی پی کر حلق تھا کہ بار بار خشک ہو رہا تھا۔

”حوصلہ کرو شعیب علی! تم تو بہت دعوے کرتے تھے۔ بس چند ماہ ہی میں ہار مان گئے؟“ اس کے ذہن نے سرگوشی کی۔ ”میں ہارا تو نہیں۔“ شعیب نے خود سے کہا۔ ”بس پتہ نہیں، دل کیوں پریشان ہے۔ نہ معلوم وہاں میں کسی کو یاد بھی آیا ہوں گا یا نہیں؟ سب اپنی خوشیوں میں گم ہوں گے۔ مگر نہیں، میری ماں..... ہاں میری ماں ضرور میرے لئے بے قرار ہو گی۔“ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے اس کی ذرا آنکھ لگی تھی تو اسے خواب میں سیکینہ بیگم بڑی ہنستی کھلکھلاتی نظر آئیں اور شعیب کو علم تھا کہ خواب کی تعبیر ہمیشہ اُلٹ ہوتی ہے۔ ”یقیناً امی جی میرے لئے بے قرار ہوں گی۔“ شعیبی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ ابھی کل ہی کی تو بات تھی، جب اشعر نے کلاس روم سے نکلنے ہوئے کہا تھا۔

”یار چودھری! اب تجھے تیری ماں خواب میں نہیں ملتی؟“

”ہاں، نہیں ملتی۔“ شعیب نے بلا سوچے سمجھے جواب دیا۔

”اب شادی کے بعد اسے ماں کے خواب کہاں آتے ہوں گے۔“ جاوید نے شوخی سے کہا تو شعیب نے اُسے گھور کر دیکھا۔ اس سے پہلے کہ جاوید کچھ اور کہتا، سرور آ گیا اور ظاہر ہے اب وہ شعیب سے کسی بھی قسم کا مذاق نہیں کر سکتے تھے۔ تب اشعر نے شعیب کے قریب جھک کر سرگوشی میں کہا۔

”یار! سالا کلاس فیلو نہیں ہونا چاہئے۔“

”میں ہاتھ چھوڑ دوں گا، کینے کہیں گے۔“ شعیب اُس کے مذاق سے محظوظ ہوتا ہوا بولا۔

اور اب وہ سوچ رہا تھا، ماں! مجھے تو تو ہر پل یاد آتی ہے۔ کوئی بھی دن تیری یاد کے بغیر نہیں گزرتا۔ مجھے آج بھی یاد ہے، جب میں رنگ محل کی روایات کو ٹھوکر مار کر وہاں سے نکلا تھا تو ایک آواز میں نے سنی تھی۔

”روک لو طالب! اسے۔“

اس آواز میں کتنی التجائیں تھیں، کتنے آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ اور کوئی ایسی آواز میں نے نہیں سنی تھی۔ اور پھر نہ مجھے کسی نے روکا، نہ ہی میں رُکنا چاہتا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میں واپس بھی نہیں جانا چاہتا۔ رنگ محل کی روایات نہ ہو گئیں، مصیبت ہو گئی۔

شعیب نے جھٹکے سے کمرے میں پھینکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے میں رضیہ پر جا پڑا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور نیبل لیمپ جلا دیا۔

”کیا ہوا شعیب؟“

”کچھ نہیں۔“

”کہاں جا رہے ہو؟“ رضیہ نے شعیب کو گاؤں پہنچنے دیکھ کر پوچھا۔

”ایک نظر مومو کو دیکھ آؤں۔“

”آیا ہے اُس کے کمرے میں۔“

”مجھے علم ہے۔ مگر ملازموں کا کیا بھروسہ، مومو پر کمرے ڈالا ہو یا نہیں۔ کہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے اُسے۔ سردی بہت ہے۔“ شعیب نے کہا تو رضیہ خاموش رہی۔ ”یوں کرو، تم ہی جا کر دیکھ آؤ۔ اچھا نہیں لگتا کہ میں جاؤں۔ نہ جانے، آیا کیا سمجھے؟“ شعیب مسہری پر بیٹھ گیا۔

”بہتر۔“ رضیہ نے بلا چون چرا اُس کی بات مان لی۔ حالانکہ ٹھنڈ میں اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ باہر نکلے۔

شعیب لیٹ گیا اور اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر سر کے نیچے بازو رکھ لئے اور چھت گھورتے ہوئے سوچوں میں گم ہو گیا۔



عابدہ! انسان کو بہتر مستقبل کی خاطر اپنوں سے دُور ہونا ہی پڑتا ہے۔ آج سے ایک ماہ پہلے جب میں نے بابا جان سے اجازت چاہی تو انہوں نے کہا، میں شادی کر کے جاؤں اور میں نے ان کی بات مان لی۔ مگر آج پتہ چلا ہے کہ اپنے پیاروں سے دُور ہونا کس قدر مشکل ہے۔ حالانکہ ہماری شادی کو صرف ایک ہفتہ ہوا ہے اور اس ایک ہفتے میں تم میرے اس قدر قریب آ گئی ہو کہ تمہیں چند سال کے لئے چھوڑ کر جانے کا تصور بھی سہاں روح ہے۔ ”صفر“ نے عابدہ کے گرد بازوؤں کا حصار کیا ہوا تھا اور اس کے بالوں پر ہونٹ رکھے وہ دھیرے دھیرے اپنے جذلوں سے اسے آگاہ کر رہا تھا۔ اور وہ نئی نویلی دلہن رونے پر قادر تھی۔

”تو مت جاؤ نا۔“ عابدہ نے یہ جملہ تقریباً ایک درجن بار دہرایا تھا۔

”جانا بھی ضروری ہے۔ تمام انتظامات مکمل ہیں۔“ صفر نے ایک آہ بھر کر کہا۔

”مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے سائیں؟“ عابدہ نے گلوگیر آواز میں پوچھا۔

”نہیں عابدہ!..... نہیں۔ تم تو میرے خون میں گردش کر رہی ہو، میرے دل میں



دھڑکن کی طرح ہو، جسم میں روح کی مانند ہو۔ میں بھلا تمہیں بھول سکتا ہوں؟“ صفدر تڑپ کر رہ گیا۔

”ابھی تو میرے ہاتھوں کی مہندی کا رنگ بھی پھینکا نہیں پڑا اور تم جا رہے ہو۔“  
”یہ رنگ سدا یونہی رہے گا۔“ صفدر نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ ”ان ہتھیلیوں سے حنا کا رنگ اُترنے نہ دینا عابدہ! یہ یونہی رنگین رہیں۔ حنا کی مہک رہے ان میں۔“  
صفدر نے اپنے پتے ہونٹ اس کی ہتھیلیوں پر رکھ دیئے۔

عابدہ ہونٹ چبانے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی، یہ کیسی شادی ہوئی تھی؟ ابھی تو اُس نے جی بھر کر اپنے ساجن کو دیکھا بھی نہ تھا۔ ابھی تو اس کی آنکھیں مجازی خدا کے حضور جھکی رہتی تھیں، سجدہ ریز تھیں۔ ابھی تو اس کی جھک بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ روشن مستقبل کی دیوار دونوں کے بیچ چُن دی گئی۔ ابھی تو موتیا اور گلاب کی کچی کلیوں کی مہک بھی اس کمرے سے ختم نہ ہوئی تھی اور ساجن نے دُور دیس جانے کا مژدہ سنا دیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتا دیا تھا کہ میں تم بن کیسے رہ سکوں گا۔ مگر دل کی دھڑکن بنا کر وہ جا رہا تھا اور عابدہ کون تھی، جو روک سکتی۔ وہ تو ماں باپ کی بات نہ مانا تھا، جنہوں نے اُسے پالا پوسا، پڑھایا لکھایا تھا اور عابدہ تو صرف اٹھ روز کی بیاہی دُلہن تھی، آٹھ دن کی ساتھی رہی تھی۔ بھلا اُس کی کیا مانتا وہ۔  
اور پھر صفدر اُسے ڈھیروں پیار کر کے، وعدوں کے بہت سے کھلونے تھا کر کمرے سے نکل گیا۔ سب اُس کے منتظر تھے۔ عابدہ اپنے بستر پر گری گئی اور ٹھٹھکیں تکیے میں منہ چھپا کر پلک پڑی۔



زہرہ بیگم پورے دو ماہ کی بیماری کے بعد اب صحت یاب ہوئی تھیں۔ ان کا گردے کا آپریشن ہوا تھا اور اس عمر میں اس بیماری نے انہیں بالکل نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان کے بچپنے کی تو بالکل اُمید نہ تھی۔ ہر گھڑی یوں لگتا، اب سانس کی ڈوری ٹوٹی۔ مگر قدرت نے انہیں موت کے منہ سے بچا لیا۔ بیماری کے دوران چودھری شوکت علی نے زہرہ بیگم کی تیمارداری میں رات دن ایک گُر دیا تھا۔ خدا کے حضور گُر گڑا کر ان کی صحت یابی کے لئے دعائیں کی تھیں۔ ہر لمحے زہرہ بیگم کے کمرے کے قریب رہتے کہ نہ جانے کس وقت اُن کی ضرورت پڑ جائے۔ وارڈ بوائے اور نرسین عجیب مسکراہٹ سے انہیں دیکھتیں، ان کی آنکھوں اور مسکراہٹوں میں چودھری شوکت علی کے لئے تمسخر ہوتا۔ مگر چودھری شوکت علی سب سے بے نیاز زہرہ بیگم کے لئے دعائیں کرتے رہتے۔ وہ خود نہیں سمجھ پارہے تھے کہ قدرت نے ایک دم ان کے دل میں زہرہ بیگم کی محبت کے چشمے کیوں جاری کر دیئے ہیں؟ دل کیوں چاہتا ہے کہ زہرہ زندہ رہیں؟ رب العزت کی مہربانی اور ڈاکٹروں کی محنت کے طفیل زہرہ بیگم صحت یاب ہو کر رنگ محل آگئیں اور آج اُن کا غسلِ صحت منایا گیا۔ کتنی خوش تھیں وہ، چودھری شوکت علی کے کرم و انکسار پر۔ خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھ رہی تھیں۔

تمام مہمان جا چکے تھے، تب چودھری شوکت علی، زہرہ بیگم کو سہارا دیئے کمرے میں آئے۔ زہرہ بیگم اس قدر تھک چکی تھیں کہ جلد ہی سو گئیں۔ مگر چودھری شوکت علی نہ سو سکے۔ حالانکہ ان کا جسم ٹھکن سے چور تھا، لیکن نیند آنکھوں سے دُور تھی۔ کتنی ہی دیر تک وہ بستر پر کروٹیں بدلتے رہے۔ بالآخر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اُن کی سماعت سے بار بار چودھری طالب علی کے قہقہے ٹکرا رہے تھے۔

”کس قدر خوش ہیں لالہ۔“ انہوں نے تڑپ کر سوچا۔ ان کا دل پارہ پارہ ہوا جا رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے درپے میں آکھڑے ہوئے اور پردے کھسکا کر پائیں باغ میں نظریں گاڑ دیں۔

ماحول پر رات کا فسوں طاری تھا۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ ہوائیں درختوں میں سرسرا



رہی تھیں اور فضا میں پھولوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ چودھری شوکت علی کا ذہن تیزی سے سوچنے لگا۔

اتنا عرصہ بیت کیا..... پورے سات برس..... مگر کچھ بھی تو نہ ہوا..... جو میں چاہتا تھا، رتی بھر بھی تو نہ ہوا۔ ہر کوئی اپنی جگہ مطمئن ہے، خوش ہے۔ اور میرے دل میں جو الاؤ میٹرک رہا ہے، وہ سرد ہونے کا نام نہیں لیتا..... میں سمجھتا تھا کہ شعیبی نے شادی کر کے جو قدم اٹھایا ہے، وہ لالہ کو توڑ کر رکھ دے گا، وہ ایسے بکھریں گے کہ کوئی انہیں سمیٹنے والا بھی نہ ہو گا۔ وہ تڑپیں گے اور ان کی ہر تڑپ میرے زخموں کے لئے پھاہا ثابت ہوگی۔ مگر ایسا تو نہیں ہوا۔ چودھری طالب علی تو آج بھی خوش ہیں، ان کی گردن آج بھی فخر و غرور سے تنی ہوئی ہے۔ ان کے رعب و دبدبے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آج بھی وہ رنگ محل کے کرتا دھرتا ہیں..... یہ درست ہے کہ شعیب کے جانے کے بعد انہوں نے چند ماہ اُسے بہت یاد کیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ شعیبی کو نکال کر وہ ٹوٹ پھوٹ سے گئے تھے۔ مگر پھر انہوں نے خود کو سنبھال لیا۔ آخر وہ خاندان کے سربراہ تھے، اسی لئے وہ بہت جلد اپنے خول میں سمٹ گئے۔ انہوں نے اپنے غموں کی تشہیر نہ کی۔ حالانکہ چودھری شوکت علی کو علم تھا کہ اولاد کی جدائی کا غم کیا ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے، جیسے کہ زندگی کا سفر تلوار کی دھار پر سے گزر کر طے کیا جا رہا ہو۔ مگر چودھری طالب علی نے بڑی ہمت سے شعیبی کے جانے کا صدمہ سہا تھا اور چودھری شوکت علی، جو یہ سمجھتے تھے کہ شعیب علی کی بغاوت کی وجہ سے رنگ محل کی خوشیاں ختم ہو جائیں گی، رنگ محل کی بنیادیں کھوکھلی ہو جائیں گی اور بہت جلد یہ عمارت اس میں رہنے والے یکنوں کا ملبہ ثابت ہوگی، اُن کی خام خیالی ثابت ہوئی تھی۔ اتنے برس گزر جانے کے باوجود یہ حویلی اپنی پوری روایتوں کے ساتھ سر اٹھائے کھڑی تھی۔

امیر کی بیٹا سے شادی نہایت دھوم دھام سے ہوئی۔

چودھری طالب علی اور سیکرٹری بیگم حج کر کے لوٹے تو کئی روز تک حسن پور میں خیرات ہوتی رہی۔ غربا میں اناج تقسیم کیا گیا، مسکینوں کو کھانا کھلایا گیا، پورے ہفتہ بھر توالی ہوتی رہی تھی۔ ایسے میں کسی نے بھی شعیب علی کی کمی محسوس نہ کی۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا اور جب صدر علی بار ایٹ لا کر گئے لوٹا تو خوشیوں کی انتہا نہ رہی۔ اسی دوران جب سب مہمان موجود تھے، چودھری شجاعت علی نے اپنے بیٹے امین علی کے لئے چودھری طالب علی سے پروین کو مانگ لیا، جس نے ایک سال قبل میٹرک کیا تھا۔ چودھری طالب علی لڑکیوں کی زیادہ تعلیم کے حامی نہ تھے۔ وہ تو لڑکوں کو بھی نہ پڑھنے دیتے تھے، پھر بھلا پروین کی کیا وقعت تھی۔ اس لئے میٹرک کرتے ہی بٹھالیا گیا تھا۔ امین علی لاہور میں ایف ایس سی کا طالب علم تھا۔ اعلیٰ پیمانے پر مگنی ہوئی اور شادی امین علی کی تعلیم کے مکمل

ہونے کے بعد رکھی گئی۔

صدر علی کراچی سینٹرل ہو گیا تھا اور جاتے جاتے اپنی بیوی عابدہ کی تنہائی کے باعث پروین کو بھی ساتھ لے گیا۔ حالانکہ چودھری طالب علی نے دبے نظروں میں صدر کے کراچی جانے پر اعتراض بھی کیا، مگر وہ نہ مانا اور طالب علی نے بھی زیادہ زور نہ دیا۔ اب وہ خود میں دوسرے بیٹے کی جدائی کی ہمت نہ پا رہے تھے۔ صدر نے کالج میں پروین کو ایڈمیشن دلوا دیا تھا اور چودھری طالب علی کچھ بھی نہ بول سکے تھے۔

چھوٹی چھوٹی چوٹیں تھیں، جو چودھری طالب علی کے دل پر لگتی تھیں اور وہ ان چوٹوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے، جلد ہی سہلا کر لوٹ پوٹ ہو کر ٹھیک ہو جاتے۔ مگر چودھری شوکت علی ابھی تک انہیں کسی بڑی چوٹ دینے کا انتظار کر رہے تھے۔

مومو کی طرف سے وہ بالکل مطمئن تھے۔ اس کی جیسی تربیت کرنا چاہتے تھے، وہ رضیہ اور شعیب کر رہے تھے۔ اور انہیں کچھ بھی نہ کرنا پڑا تھا۔ بس مہینے میں ایک دو چکر لگا لیتے تھے۔ شعیب نے مومو کو تین سال گھر میں پڑھانے کے بعد نویں کلاس میں داخل کروا دیا تھا۔ اس اسکول میں شعیب کے دوست کی والدہ ہیڈ مسٹر لیں تھیں، اس لئے زیادہ دقت نہیں ہوئی تھی۔ ویسے بھی مومو پڑھائی میں تیز تھی، پڑھنا اسے بے حد اچھا لگتا تھا۔ گزشتہ مہینے ہی وہ انٹر کے ایگزام سے فارغ ہوئی تھی اور ان دنوں شعیب، رضیہ اور ان کے تین سالہ بیٹے گیتو کے ساتھ پرفضا مقامات کی سیر کو گئی ہوئی تھی۔ حالانکہ شعیب نے کتنا چاہا کہ وہ بھی چلیں، مگر چودھری شوکت علی نہ مانے۔ پتہ نہیں وہ خود کو کیوں ٹوٹا پھوٹا محسوس کرنے لگے تھے۔ یوں لگتا تھا، جیسے بہت تھک گئے ہوں۔ صحرا میں اپنا راستہ بھول گئے ہوں۔ کوئی راہ بھی انہیں نظر نہ آئی کہ کس طرف جائیں؟ ”کیا میں یوں ہی بھٹکتا رہوں گا؟..... لالہ! تم نے مجھے کہیں کانہیں چھوڑا۔“ ان کا دل پارہ پارہ ہوا جا رہا تھا۔

”شوکت!“ زہرہ بیگم نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ان کی آنکھ کھلی تو انہوں نے شوہر کو درپے میں کھڑا دیکھا اور نہ جانے کیوں ان کا دل ڈکھ گیا۔ وہ اٹھیں اور اُن کے قریب چلی گئیں۔ ”کیا سوچ رہے ہیں؟“

”زہرہ بیگم! سوچیں تو پتنگ کی ڈور کی مانند ہوتی ہیں۔ ڈور جتنی لمبی کی جائے، اتنی ہی پتنگ کی اڑان اونچی ہوتی جاتی ہے۔ مجھے خود نہیں علم کہ میں کیا سوچتا ہوں، کیوں سوچتا ہوں۔“ انہوں نے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔

”آپ سوئے بھی نہیں۔ نیند لے لیں تو کوئی سوچ نہیں آئے گی۔“

”سوچوں کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ نیند میں بھی تو خوابوں کی صورت آ جاتی ہیں یہ سوچیں۔“ چودھری شوکت علی مسکرائے۔



تبھی سرد ہوا کا جھونکا درتے کی چوٹ سے ٹکرا کر ان دونوں کو ٹھہرا گیا۔ زہرہ بیگم کپکا کر رہ گئیں اور اپنے منہ ہاتھ گالوں پر رکھ لئے۔

”زہرہ! آپ ٹھنڈ میں کھڑی نہ ہوں۔ ابھی اتنی طویل بیماری سے اٹھی ہیں۔“ انہوں نے زہرہ بیگم کو کندھوں سے تھام لیا۔

”آپ کیوں ٹھنڈ میں کھڑے ہوئے تھے؟“ وہ بچوں کی طرح ضد سے بولیں۔

”اوہ..... تو میری ریس کرنے لگی ہیں؟“ چودھری شوکت علی نے ہنس کر کہا۔

”نہیں۔ مگر آپ کیا سوچتے رہے ہیں؟“ زہرہ بیگم نے درپچہ بند کر کے پردے برابر کر دیئے۔

”کیا سوچوں گا؟ بس، دل گھبراتا ہے تو ٹھہرنے لگ جاتا ہوں۔ اب بڑھاپے میں نیند بھی تو نہیں آتی۔ رات ہے کہ گزرنے کا نام ہی نہیں لیتی۔“ چودھری شوکت علی بولے۔

”شوکت! یہ آج کی بات نہیں ہے۔ آپ کی نیند تو برسوں سے آپ سے روٹھی ہوئی ہے۔ نہ جانے کیوں؟“ زہرہ بیگم نے یاد دلایا۔

”اوہ، نہیں میری بڑی بی! تم پریشان نہ ہوا کرو۔“ چودھری شوکت علی نے ان کے گلے میں بازو جھانک کر دیئے تو وہ دھیرے سے مسکرا دیں۔ ”تم کچھ مت سوچا کرو، ورنہ بیمار پڑ جاؤ گی۔“

”تیمارداری سے گھبرا گئے؟“ زہرہ بیگم شوخ ہو گئیں۔

”نہیں..... نہیں تو تمہاری تیمارداری سے اور میں گھبرا جاؤں؟ کبھی نہیں۔“

”سچ؟“ زہرہ بیگم خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرنے لگیں۔

”یقین نہ آنے کی وجہ؟“ چودھری شوکت علی نے ایک ہاتھ سے ان کی ٹھوڑی اوپر کی۔

”پھر دل چاہتا ہے بیمار ہونے کو، اور.....“

”اور ناز اٹھوانے کو۔“ چودھری شوکت علی نے ان کے لبوں پر انگلی رکھ کر نہایت جذباتی لہجے میں کہا تو زہرہ بیگم کے اندر گلاب مہک اٹھے۔ وہ تار ہوئی ہوئی نظروں سے شوہر کو دیکھ رہی تھیں اور چودھری شوکت علی سوچ رہے تھے۔

”خدارا زہرہ! اب بیمار نہ پڑنا۔ مجھ میں ہمت نہیں کہ تمہاری خاطر پریشان ہوتا پھر دوں۔ پہلے پریشانیوں کم ہیں کہ مجھے مزید پریشان کرنا چاہتی ہو۔“

☆.....☆.....☆

یونیورسٹی میں نئے سال کے ایڈمیشن شروع ہو چکے تھے۔ مختلف طلباء تنظیموں نے نئے آنے والوں کی آسانی کے لئے جگہ جگہ اسٹال لگائے ہوئے تھے۔ لڑکے لڑکیوں نے اپنی اپنی پارٹی کے خوب صورت بیجز لگا رکھے تھے اور نہایت تیزی سے ورک کر رہے تھے۔

مریم اور پروین بہت دلچسپی سے بس کے پہلے اسٹاپ سے لے کر لابی اور ایڈمنسٹریشن بلاک کے سائے میں لگے سٹالوں کو دیکھ رہی تھیں۔ تبھی یونیورسٹی کی کھٹارا سی بس، مست شرابی کی طرح جھومتی جھامتی آ کر رُکی۔ طلبہ اترنے لگے تو طلباء تنظیموں کے در کر عقاب کی طرح ان کی طرف جھپٹے۔ آخر کوئی نہ کوئی ان کے ساتھ اسٹال تک پہنچ جاتا۔ ان دونوں کے لئے تو یہ منظر ناقابل یقین تھا۔

”پروین! تم تو کہتی تھیں کہ ہمیں لوگ بے وقوف بنا کر تفریح حاصل کریں گے، یہاں تو معاملہ الٹا نظر آ رہا ہے۔“ مریم نے اسے ٹھوکا دیا۔

”یقین تو مجھے بھی نہیں آ رہا، مگر سنا تو یہی ہے کہ فرسٹ ڈے خوب فؤل بنایا جاتا ہے۔“ پروین نے ایک لڑکے کی طرف دیکھا، جو بس سے اترنے والے لڑکے سے تقریباً چپکا ہوا اپنے اسٹال کی طرف جا رہا تھا۔

”اب کیا کریں؟“ مریم نے بھیڑ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”گاڑی لاک کرو اور کسی بھی اسٹال پر چلتے ہیں۔ آخر ڈھیروں رہنما موجود ہیں۔“ پروین ہنسی۔

”یار! تمہیں مذاق سوچ رہا ہے۔“ مریم روہانسی ہو گئی۔

”دیکھو ڈیر! لڑکے کس طرح داخلے کے خواہش مند طلبہ کے آگے بچے جا رہے ہیں، جیسے کہ ان سے زیادہ مہمان نواز اور مخلص اور کوئی نہ ہو۔“

”میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں؟ میرا نام عاصم ہے۔“ وہ ان کے سامنے آ کر نہایت ادب سے بولا۔

مریم کی سیاہ بھونرا جیسی آنکھوں میں حیرت بھر گئی، اُس کے لب کپکپا کر رہ گئے۔

”جی..... وہ.....“

”داخلے کے لئے آئی ہیں نا؟“ عاصم نے ہنسی روکتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ پروین نے جلدی سے کہا۔

”آپ ہمارے اسٹال پر تشریف لے چلیں، ہم آپ کا مسئلہ حل کر دیں گے۔“

وہ دونوں عاصم کے ساتھ آگے بڑھ گئیں۔ مریم نے نہایت مضبوطی سے پروین کا ہاتھ تھام رکھا تھا، جیسے اتنی بھیڑ میں گھٹڑ جانے کا خوف دامن گیر ہو۔

”دو ضرورت مند لے آیا ہوں۔“ عاصم نے ٹیبل پر جھکے لڑکے سے کہا اور اُس کے اس طرح ضرورت مند کہنے پر مریم کو بہت غصہ آیا، مگر وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

”اچھا! میں یہ فارم پُر کر لوں۔“ اس نے جھکے جھکے جواب دیا۔

”اب باقی کام علی کر دے گا۔ یہ ہماری پارٹی کا جنرل سیکرٹری بھی ہے۔ میں ابھی آیا۔“



حاجم پلٹا۔

”مزید ضرورت مندوں کا انتظام کرنے جا رہے ہیں؟“ پروین نے شوخی سے کہا تو وہ زور سے ہنس دیا۔ پروین کی بات پر علی نے سر اٹھایا۔ نازک سی، سپید رنگت اور سیاہ آنکھوں والی پروین کی ستواں ناک میں پیرے کی منہی سی لونگ لشکارے مار رہی تھی۔ اس سے وہ ایک دم ہی علی کو بہت پیاری لگی۔ بھی پروین کی نظر علی پر پڑی، جو بڑے غور سے اُسے تک رہا تھا۔ پروین کی آنکھوں میں حیرت اُڑ آئی۔ سرخ و سپید رنگت، لمبا چوڑا، خوب صورت سا کھنڈ اپنی چمکتی آنکھوں سے اسے نہایت والہانہ پن سے دیکھ رہا تھا۔ پھر علی کو اپنی پوزیشن کا احساس ہوا تو بولا۔

”آررز میں داخلہ لیں گی یا پریولس میں؟“

”جی اے آررز۔“ مریم نے جواب دیا۔

”انٹرکس ڈویژن میں کیا ہے؟“ علی نے پیشانی پر سے بالوں کو پرے کرتے ہوئے کہا۔

”فرسٹ۔“ مریم نے کہا۔

”اور آپ نے؟“ وہ پروین سے مخاطب تھا۔

”جو انہوں نے بتایا ہے۔“ پروین نے شان بے نیازی سے جواب دیا۔

”تو کئی کچھ مفروضہ ہے۔“ علی نے سوچا۔ پھر وہ مریم کا فارم پُر کرنے لگا۔

”پلیز! آپ نام بتائیے۔“

”مریم شوکت۔“

”آپ کا نام بھی غالباً وہی ہے، جو ان کا ہے۔“ علی نے نہایت سنجیدگی سے چوٹ کی۔

”کیا مطلب؟“ پروین نے حیرت سے پوچھا۔

”ظاہر ہے، جو ڈویژن ان کی ہے، وہی آپ کی ہے۔ میں نے سوچا نام بھی ایک ہی ہوگا۔“ علی بے پروائی سے بولا۔

”پروین طالب۔“ اس نے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور جلدی سے نام بتا دیا۔

”مکمل ڈاکومنٹس لائی ہیں آپ؟“

”جی ہاں!“ مریم نے تمام ڈاکومنٹس علی کے سامنے کر دیئے۔

”ٹھیک ہیں۔“ علی نے سب دیکھ کر کہا۔

”میں سبجیکٹ کیا رکھیں گی؟“ علی نے مریم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”سوشیالوجی۔“ مریم بولی۔

”نہیں، انگلش۔“ پروین پٹ سے بولی۔

”میں تو نہیں لوں گی، تم لے لو۔“ مریم نے چمک کر کہا۔

”جو سبجیکٹ میں لوں گی، وہی تمہیں لینا ہوگا۔“ پروین نے ٹھکم آہیز لہجے میں کہا۔

”اس سے تو بہتر ہے کہ میں پڑھوں، یہی نہ اور گھر بیٹھے جاؤں۔“ مریم نے اپنے چہرے پر آئی ہوئی لٹ کان کے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھو مریم! ہم دونوں نے کالج میں دو سال اکٹھے گزارے ہیں، اب یونیورسٹی میں علیحدہ ہو جائیں، یہ تو اچھا نہیں ہے نا؟“ پروین نے اُسے سمجھایا۔

”تم لے لو نا، سوشیالوجی۔“ مریم نے کہا۔

”نہیں انگلش لینے میں کیا قباحت ہے؟“ پروین زچ ہو کر بولی۔

”بس، میری مرضی۔“ مریم نے بے نیازی سے کہا۔

علی نہایت دلچسپی سے ان کی ٹکرار سن رہا تھا، جنہیں یہ بھی احساس نہیں تھا کہ کوئی ان کے قریب کھڑا ہے۔ بلکہ دو اور لڑکے بھی انہیں بڑے غور سے لڑنا دیکھ رہے تھے، جو گھر سے یہ طے کر کے نہیں نکلی تھیں کہ کون سا سبجیکٹ لیں گی۔ آخر علی بول پڑا۔

”اگر آپ میری مانیں تو آپ لوگوں کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔“

”جی ٹر مائیے؟“ پروین نے علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”دیکھئے، نہ آپ سوشیالوجی لیں اور نہ مریم صاحبہ انگلش۔ بلکہ آپ دونوں جرنلزم رکھ لیں۔“

”تھکر.....“ مریم نے کہنا چاہا۔

”اگر تھکر نہیں کریں، سب سے اچھا شعبہ ہے یہ۔ اور اسکوپ بھی بہت ہے۔“ علی ہاتھ اٹھا کر بولا۔

”ہم نے سروس تھوڑی کرنی ہے؟“ پروین کٹ سے بولی۔

”تفریح کے لئے یونیورسٹی آئی ہیں؟“ علی نے چہتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔“ پروین گڑبڑا گئی۔

”آپ جرنلزم لکھ دیجئے۔“ مریم نے فیصلہ سنا دیا۔

”تو کیا تم نے سروس کرنی ہے؟“ پروین نے کہا۔

”ظاہر ہے، کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔“ مریم نے کہا۔ اب وہ اُسے کیا بتاتی کہ تعلیم مکمل ہوتے ہی وہ اپنے شعیب بھائی کا ہاتھ بٹائے گی۔ وہ ہمیشہ جی کہتے ہیں۔

”سمو جو جان! تم پڑھ لو تو میرے سر سے کچھ بوجھ نہ پڑے۔ پھر مل کر ہم دونوں بھائی بہن کام کریں گے۔ تم آٹس سنبھالنا اور میں باہر کی ڈیلنگ کروں گا۔“ تب وہ منہ سے شعیب کو



دیکھ کر رہ جاتی۔ کتنا مان تھا انہیں اس پر۔

یونیورسٹی انہوں نے محض اس لئے بھیجا تھا کہ وہ بولڈ بن جائے۔ لڑکوں کے ساتھ پڑھ کر، ان کے ساتھ رہ کر انہیں سمجھ سکے۔ کیونکہ آگے چل کر زیادہ واسطہ اُس کا مردوں ہی سے پڑنا تھا۔

”تو پھر مین سبجیکٹ جرنلزم لکھ دوں؟“ علی نے قلم کھولتے ہوئے کہا۔ مریم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور جلدی سے بولی۔

”جی ہاں!“

جبکہ پروین نے کچھ نہ کہا۔

”کتا بوں اور نوٹس کی ضرورت ہو تو لے لیجئے گا۔“ علی نے کہا۔

”تو کیا آپ بھی اسی ڈیپارٹمنٹ میں ہیں؟“ پروین نے حیرت سے پوچھا۔

”جی!“ علی شوخی سے بولا۔

”کس ایئر میں؟“ مریم نے پوچھا۔

”آنرز کا آخری سال ہے۔ ایک ہفتے بعد آپ ناموں کی لسٹ آ کر دیکھ لیجئے گا۔“ علی نے کہا۔

”جی بہت اچھا۔ اب مزید چکروں کی ضرورت تو نہیں ہے بھائی جان؟“ مریم نے علی سے کہا تو علی کے دل میں عجیب سا احساس سرایت کر گیا۔ کتنی محبت اور خلوص سے اُس نے اُسے بھائی جان کہا تھا۔ علی کا جی چاہا، کہے ”ایک مرتبہ پھر بولو۔“ مگر وہ اپنے دل کی بات دبا گیا اور بولا۔

”نہیں بھئی، اب زیادہ چکر نہیں لگیں گے۔ بس سمجھیں، آپ کا ایڈمیشن ہو گیا۔“

تبھی ایک سانولی سلونی سی ٹیج رنگت والی لڑکی ڈھیر سارے فارم لئے ان کے قریب آ گئی اور میز پر فارم رکھتے ہوئے بولی۔

”لو علی! اب تم یہ فارم جمع کرادو۔ سچ، بھر کس نکل گیا ہے۔“

”ابھی سے تھک گئیں باسہ؟“ وہ ہنسا تو پروین نے دیکھا، اُس کے اوپری ہونٹ کے کونے کا تیل بھی کھلکھلا دیا ہو۔

”نہیں تھکی تو نہیں ہوں۔“ باسہ شرمندہ ہو گئی۔

اُس کی شرمندگی محسوس کر کے علی جلدی سے ان کا تعارف کروانے لگا۔

”باسہ! ان سے ملو۔ یہ ہیں مریم شوکت اور یہ پروین طالب۔ انہوں نے ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں بی۔ اے آنرز میں داخلہ لیا ہے۔“ وہ بالکل بچوں کی طرح خوش ہو کر بتا رہا تھا۔

”اچھا، بہت خوشی کی بات ہے۔“ باسہ بولی۔ ”تم نے میرا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔“

خبر، میں خود ہی کرا دیتی ہوں۔ تم سے تو یہ توقع رکھنا ہی فضول ہے۔“ وہ شوخی سے بولی۔ پھر مریم اور پروین سے کہنے لگی۔ ”میں باسہ سلطان ہوں۔ علی کی کلاس فیلو۔“

”اچھا، اچھا۔“ پروین اور مریم بہ یک وقت بولیں۔

”باسہ! تم عاصم اور نوید کے اسٹالوں سے بھی فارم لے آؤ، تاکہ میں جمع کروا دوں۔“ علی نے کہا۔

”بہت اچھا۔“ باسہ جلدی سے راضی ہو گئی۔ ”اچھا دوستو! پھر ملاقات ہوگی۔ اب تو ساتھ ہو ہی گیا ہے۔“ اس نے ان دونوں کے ہاتھ تھام کر نہایت محبت سے کہا اور چلی گئی۔

”اچھا بھائی جان! اب ہم جائیں۔“ مریم نے نہایت محبت و احترام سے علی کی طرف دیکھ کر کہا تو اس کے چہرے پر شادابیاں کھلنے لگیں۔ پروین اسے بری طرح گھورے گئی۔

”ہاں، آپ ایک ہفتے بعد آئیے گا۔“ علی فارم سچ کر کے رکھنے لگا اور وہ دونوں وہاں سے پلٹ گئیں۔ علی کتنی دیر تک پروین کی پشت پر نظر جمائے اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کا دل اُس کے سیاہ، لاہے بالوں کے بھنور میں کہیں پھنس کر رہ گیا تھا۔

”تمہاری یہ عادت مجھے بہت بری لگتی ہے۔ جسے دیکھو، فٹ بھائی بنا لیتی ہو۔“ پروین نے مریم کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

”دیکھو پروین! تم مجھے بہت مرتبہ منع کر چکی ہو، مگر کیا کروں، میرا جی چاہتا ہے اس دنیا میں جتنے بھی لڑکے ہیں، سب کو بھائی بنا لوں۔ کتنا خوب صورت رشتہ ہے بھائی بہن کا۔“ مریم کے لہجے میں اُداسی کھل گئی۔

”کوئی تک بھی ہو۔ کسی کپڑے کی دکان پر جاتی ہو، بھائی جی! فلاں گلر دکھا دیں۔ کہیں ریسٹوران میں چائے پی تو بیرے کو کہا، بھائی جی! پیل لے آئیں۔ بھلا ہر ایرے غیرے کو بھائی بنانا ضروری ہے کیا؟ تمہاری یہ عادت مجھے بہت بری لگتی ہے۔“ پروین نے کھول کر کہا۔

”دیکھو جان من! تم نے سنا ہو گا، یار کی یاری سے مطلب، اس کے عیبوں سے کیا کام؟ تو تم چاہو تو میری دوستی سے مطلب رکھو، میرے عیب نہ گنا کرو۔“

”یہ تمہاری آئندہ زندگی کے لئے اچھا نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“ مریم نے حیرت سے کہا۔

”ہو سکتا ہے، تم اپنے شوہر کو بھی کہہ دو، بھائی جی!“ پروین نے بالکل سنجیدگی سے کہا تو مریم زور سے ہنس دی۔

”سچ کہتی ہو، سوچنا پڑے گا۔“ مریم اس کے جملے سے محظوظ ہوتے ہوئے بولی تو پروین اسے گھور کر رہ گئی۔



پروین سے اُس کی دوستی دو سال پرانی تھی، مگر یوں لگتا تھا، جیسے بچپن کی دوست ہوں۔ وہ دونوں کالج ہی میں دوست بنی تھیں۔ ایک دوسرے کا حد سے زیادہ خیال رکھتیں۔ مریم نے اُسے بتایا ہوا تھا کہ وہ اپنے بہنوئی اور بہن کے ساتھ رہتی ہے۔ کیونکہ شعیب نے اُسے یہی کہا تھا۔ نجانے کیا مصلحت تھی اور مریم نے وہی کہا تھا۔ جو کچھ وہ سمجھاتا اس سے ایک انچ بھی مریم ہٹتی۔ پروین ان کے ہاں آتی، رضیہ بہت محبت سے اُس سے ملتی۔ مگر شعیب سے بھی پروین کی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ اصل میں شعیب صبح کو نکلتا تھا تو رات ہی کو گھر میں گھستا تھا۔ پھر وہ پروین کا سامنا نہ کرنا چاہتا تھا۔ مریم اسے پروین کے بارے میں سب کچھ بتا دیتی تھی۔ کالج میں لے دے کے صرف وہی اس کی دوست تھی اور اب وہ دونوں یونیورسٹی میں بھی ساتھ ہی رہنا چاہتی تھیں۔ پروین کی ایک عادت مریم کو بری طرح کھینکتی تھی اور وہ تھی اس کی خود پسندی۔ وہ اپنے آگے تو کسی کو جانتی نہ تھی۔ جس بات پر اڑ جاتی، پوری کروا کر چھوڑتی۔ متوسط گھرانے کی لڑکیوں سے بات نہ کرنے کے برابر کرتی۔ جبکہ مریم ہر ایک سے محبت اور خلوص سے پیش آتی۔ وہ اپنا آپ نہیں بھولتی تھی۔ سب کچھ یاد تھا اُسے۔ صبح سویرے اٹھ کر چودھری کے ہاں سے لسی لانا، سارا دن کام کرنا اور رات کو دو جوتے کھا کر سونا۔ اس نے چھوٹی سی عمر میں ہی اپنے حصے کے دکھ سہہ لئے تھے۔ اب اُس کو سکھ ہی مل رہے تھے۔ مگر کبھی کبھی ایک بات پھانس کی طرح اُس کے کلیجے میں اٹکی رہتی۔ اسے شدت سے اشیاء یاد آتا۔ اپنا اُن دیکھا بھائی یاد آتا۔ اور..... اور پیارا سا ساتھی شجہ۔ ان تین بندوں کی یاد وہ دل سے نہ نکال سکتی تھی۔ وہ جس قدر اُنہیں بھلا نا چاہتی، ان کی یادوں کے نقوش اور گہرے ہوتے جاتے۔ وہ تو اس دن کی منتظر تھی، جب وقت ان تینوں کو اس کے سامنے لے آئے۔ اُس وقت کے تصور سے وہ سرور ہو جاتی۔ اچھے لوگوں سے ملنا، پچھڑنا اور پچھڑ کے ملنے کی آس ہی تو دل میں فانوس کی طرح روشن رہتی ہے۔ اور سنا ہے، آس پر تو دنیا قائم ہے۔



ڈرائنگ روم سے آتی آوازوں نے اس کے قدم اور تیز کر دیئے۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ سامنے ہی صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے کھلے کھلے چہرے والے چودھری شوکت علی بیٹھے تھے۔ مومو کے گلانی رخسار تھما اٹھے۔

”بابا جانی.....!“ وہ بلبل کی طرح چہکتی ہوئی چودھری شوکت علی کی کھلی بانہوں میں سما گئی۔

”میری پیاری دھی۔“ انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی۔ مومو اُن کے سینے سے لگی، اُن کی خوشبو اپنے اندر جذب کرتی رہی۔

”چاچا! یہ سخت بے ایمان ہے۔“ شعیب نے چودھری شوکت علی سے کہا۔

”کیا.....؟“ مومو سیدھی ہو گئی۔

”ہمیں سلام کیا نہیں اور باپ کے پاس گھس گئی ہو۔ ہاں، ہم تو ہوئے ہی غیر۔“ شعیب نے مصنوعی ناراضگی اور دکھ سے کہا۔

تب مومو ہنستی ہوئی اس کے قریب گئی اور ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ”شعیب بھائی! ذرا اچھے نہیں لگ رہے سنجیدہ ہو کر۔“

”تم سے مطلب؟“ شعیب نے اُسے چڑایا۔

”آپ صرف ہنسنے ہنسانے کے لئے ہیں۔“ مومو نے اس کے کندھے سے گال رگڑتے ہوئے کہا تو وہ نار ہو گیا۔ کتنی محبت کرتی ہے مومو مجھ سے۔ میں اپنی بہنوں کی محبت کی تشنگی اس سے مٹا لیتا ہوں۔ اس کی محبت ہر طمع اور لالچ کے بغیر ہے..... اُس کی آنکھوں میں محبتوں کی مشعلیں روشن ہو گئیں۔ تب اس نے مسکرا کر مومو کو دیکھا اور اس کے سر پر چپت مارتا ہوا بولا۔

”جاؤ اپنے بابا کے پاس، حال احوال وٹاؤ۔“

”اب تو آپ ناراض نہیں ہوں گے نا؟“ مومو کو اب بھی خدشہ تھا۔

”نہیں بابا! تم جاؤ۔“ شعیب زور سے ہنسا۔ تبھی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ فون کی طرف



بڑھا تو مومو، چودھری شوکت کے پاس آگئی۔

”اب اماں جی کیسی ہیں بابا؟“ مومو نے زہرہ بیگم کی طبیعت کے بارے میں پوچھا۔  
”ٹھیک ہیں اب تو..... تم بتاؤ، گھوم آئیں، کیسا لگا؟“ انہوں نے بات پلٹی۔ وہ اتنے اچھے ماحول میں زہرہ بیگم کا ذکر نہ کرنا چاہتے تھے۔ ہر وقت وہی ذہن پر مسلط رہتی تھیں، یہاں آکر اپنی مومو اور شعیب کے پاس آکر وہ انہیں بھول جانا چاہتے تھے۔

”بہت مزا آیا، بابا! آپ بھی ہوتے تو اچھا تھا۔“ مومو نے کہا۔

”پھر کبھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ یہ بتاؤ، داخلہ ہو گیا تمہارا؟“

”جی بابا! بس ایک ہفتے بعد ناموں کی لسٹ لگے گی اور میرا نام تو ضرور ہوگا۔“ وہ دثوق سے بولی۔

”اچھا..... اچھا..... اور بھئی، شعیبی نے مجھے بتایا تھا کہ تم فرسٹ آئی ہو، تمہارے لئے تحفہ لایا ہوں۔“ چودھری شوکت علی مسکراتے ہوئے بولے۔

”میرے لئے آپ کا آنا ہی تحفے سے کم نہیں ہے بابا!“ مومو نے جذب کے عالم میں کہا۔

”اوہ، میری بھولی دھی!“ چودھری شوکت علی بریف کیس کھولتے ہوئے ہنس کر بولے۔ پھر تھمیلیں ڈبہ نکالا، اس میں نہایت خوب صورت کنگنوں کی جوڑی تھی۔ چودھری شوکت علی بڑی پُر شوق نظروں سے ان کنگنوں کو دیکھ رہے تھے۔ اس وقت ان کی آنکھیں کسی خوب صورت تصور سے چمک رہی تھیں۔

”بابا! بہت خوب صورت ہیں یہ کنگن۔“ مومو نے ہولے سے کہا۔

”ہاں..... بہت خوب صورت ہیں یہ۔ یہ نورائیں کے ہیں۔ دیکھو، اب تک نئے پڑے ہیں۔“ چودھری شوکت علی بچوں کی سی معصومیت سے بولے۔ ”نورائیں کی گوری گوری کلائیوں میں یہ بہت سجتے تھے۔“ ان کا لہجہ بہت ادا تھا۔

”لایئے، مجھے دیجئے۔ اب میں پہن لوں۔“ مومو نے ان کی ادا سی محسوس کر کے جلدی سے ہنستے ہوئے کہا اور چند لمحے بعد وہ کنگن مومو کی کلائیوں میں نہایت اچھے لگ رہے تھے۔ پھر وہ ایک دم شعیب سے مخاطب ہوئی، جو فون سن کر ان کے قریب ہی آ بیٹھا تھا۔

”شعیب بھائی! کیسے لگ رہے ہیں؟“

”بہت اچھے..... بہت پیارے۔“ شعیب نے کہا۔

”بابا جانی نے گفت دیا ہے۔“

”ان کے گفت بہت خوب صورت ہوتے ہیں۔“ شعیب شوخی سے بولا۔

”شعیب بھائی! میں نے جرنلزم میں داخلہ لیا ہے۔“ مومو نے ایک دم ہی بات

پلٹ دی۔

”مگر تم تو.....“ شعیب نے کہنا چاہا۔

”ہاں، لیکن پروین نہیں مانی۔ وہ چاہتی تھی کہ انگلش لی جائے۔“ پھر مومو نے پوری تفصیل بتادی۔

”حب معمول تم نے بھائی بنالیا۔“ شعیب سب کچھ سن کر زور سے ہنسا۔

”جی، آپ دیکھیں تو۔ اتنا اچھا ہے وہ کہ میں بتا نہیں سکتی۔“ مومو نے کہا۔

”یہ پروین کون ہے؟“ چودھری شوکت علی کو یہ نام سن کر ایک جھٹکا سا لگا تھا۔

”میری سہیلی ہے بابا! پروین طالب ہے نام اس کا۔“ مومو نے جلدی سے بتایا تو

چودھری شوکت علی نے پہلو بدل کر شعیب کو دیکھا، جو مسکراتی نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا اور ان کا سوال سمجھ کر وہ بولا۔

”آپ جو سمجھ رہے ہیں، درست ہے۔ مگر ہم دونوں کبھی نہیں ملے۔“ شعیب نے کہا۔

”یہ کیا معنی میں باتیں ہو رہی ہیں؟“ مومو پریشان ہو اٹھی۔

”تم جاؤ۔“ چودھری شوکت علی نے کہا۔

”اب میں کچھ نہیں ہوں۔ مجھے بتائیں نا، کیا بات ہے؟“ مومو صدمہ سے بولی۔

”ہاں چاچا! مومو کو بتادینا چاہئے۔ اور مومو جان! تم جو سنو، اپنے تک ہی رکھنا، پروین

کو نہ بتانا۔ وہ میری چھوٹی بہن ہے۔“ شعیب نے انکشاف کیا۔

”جی.....؟“ مومو کو یوں لگا، جیسے پچھونے ڈنک مار دیا ہو۔

”یہ اتنی حیرت کی بات نہیں ہے۔ اس دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ تم کبھی اسے نہ بتانا

کہ آپس میں کزن ہو۔ وہی رشتہ بہتر ہے کہ تم رضیہ کی بہن ہو اور پڑھائی کی وجہ سے میرے

ساتھ رہتی ہو۔ سمجھیں؟“ شعیب نے کہا تو مومو صرف اسے دیکھ کر رہ گئی۔ پھر جلدی سے

اٹھی اور اپنے کمرے میں آکر دم لیا۔

نہ جانے کیوں، اس انکشاف پر اس کا دماغ جھنجھا گیا تھا۔ انہوں کو سامنے دیکھ کر تو وہ

دیوانی ہو جاتی تھی۔ پروین کے ساتھ بھی تو اس کی دوستی شاید اسی بنا پر ہوئی تھی کہ وہ اس کی

تایا زاد تھی۔ کتنا قریبی تعلق تھا! یہی تو وہ اسے بہت پیاری لگتی۔ کبھی میں کہوں، پروین رنگنی!

تم اتنی اچھی کیوں ہو۔ جبکہ تمہارے اور میرے خیالات میں اتنا تضاد ہے۔ مگر میں تمہیں نہیں

چھوڑ سکتی۔ یہی حال تمہارا بھی ہے۔ جب دو چیزیں ٹکراتی ہیں تو دھماکا ضرور پیدا ہوتا ہے اور

یہ ٹکراؤ نہ جانے کب ہوگا اور اس ٹکراؤ میں جیت کس کی ہوگی اور کس کے پرچے اڑیں گے؟

یہ تو خدا کو معلوم ہے۔“ مومو نے طویل سانس لے کر سوچا۔



”اوہ.....“ علی نے جھنجھلا کر قمیض بستر پر پٹخ دی۔ ”اچھی مشکل ہے، جو قمیض اٹھاؤ اسی کا بٹن ٹوٹا ہوا ہے۔“ وہ چیخ کر بولا تو لالی بولانی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

”کیا ہوا میرے لعل؟“

”اب مجھے جانے میں دیر ہو رہی ہے اور ادھر قمیض کا بٹن غائب ہے۔“ وہ منہ بسور کر بولا۔

”آمنہ نے کل ہی تو سب تیرے کپڑے صبح کر کے رکھے ہیں۔ کوئی اور جوڑا پہن لے۔“ لالی الماری کی طرف بڑھی۔

”میں یہی پہنوں گا۔“ وہ چیختا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔

”چلو، جیسی تمہاری مرضی۔ میں آمنہ سے کہتی ہوں، بٹن ٹانگ دے گی۔ تم کنگھی کر لو، کتابیں تو درست کرو جب تک۔“ لالی نے دھیرے سے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔ وہ ہمراہ کر اٹھا اور بین میں سیاہی بھرنے لگا۔ اتنے میں آمنہ آگئی۔ آمنہ کرمیو کی بڑی بیٹی تھی، جو زیادہ تر لالی کے پاس رہتی تھی، اس کا ہاتھ بٹا دیتی تھی۔ اب لالی سے زیادہ کام بھی نہ ہوتا تھا۔ بڑھاپا جو بچا گہانی آفت کی طرح وارد ہو رہا تھا۔

آمنہ نے قمیض اٹھائی اور بولی۔ ”یہ آج کل تم کچھ زیادہ ہی اپنے لباس پر توجہ دینے لگے ہو۔“

”تمہیں کیا تکلیف ہے؟“ وہ تنک کر بولا۔

”مجھے کیوں تکلیف ہونے لگی؟ یونیورسٹی تم کوئی نئے تو نہیں جارہے، گزشتہ ڈھائی سال سے جارہے ہو۔“ آمنہ نے کہا۔

”کیا صاف سحرانہ جاؤں؟“ وہ چلایا۔

”پہلے تو ہوش نہیں رہتا تھا لباس کا۔ کہہ کہہ کر تبدیل کروایا جاتا تھا۔ اب ہر دوسرے دن جوڑا تبدیل کرتے ہو۔“ آمنہ بھی ہار ماننے والوں میں سے نہ تھی۔

”ہاں..... پہلے اور اب میں بہت تبدیلی آگئی ہے۔“ علی کے غصے سے تنے چہرے پر نرمی اور شادمانی نمودار ہوئی۔

”مجھے نہیں بتاؤ گے اس تبدیلی کے متعلق؟“ آمنہ نے دھاگا دانت سے توڑتے ہوئے پوچھا۔

”تمہیں علم نہیں شاید کہ اب میں صدر کی پوسٹ کے لئے ایکشن لڑوں گا اور مجھے خوش پوش ہونا چاہئے۔“ علی کے چہرے سے نرمی ایک دم غائب ہو گئی۔

”تم تو ویسے بھی مشہور ہو، ذہین ہو، اچھے ڈیپٹر ہو، خوب صورت شاعری کرتے ہو۔ اور مجھے پتہ چلا ہے کہ بہت سی لڑکیاں بھی تم پر مرتی ہیں۔“ آمنہ نے شوخی سے کہا۔

”بکواس مت کیا کرو۔ ابھی سے تم ایسی باتیں کرتی ہو، میں مامی جی سے کہوں گا کہ اب اسے آگے نہ پڑھائیں۔ بس میٹرک کر لو اور گھر بیٹھو۔“ وہ رعب سے بولا۔

”جی ہاں..... آپ کی پولیس جو کھلتی ہیں۔ میں تو ضرور آگے پڑھوں گی۔ آپ کون ہوتے ہیں مجھے روکنے والے.....؟“ آمنہ جل کر بولی۔ جب اسے علی پر غصہ آتا تھا تو وہ آپ جناب سے بات کرتی تھی۔

”اب جاؤ یہاں سے۔“ علی نے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا تو وہ گھورتی ہوئی چلی گئی۔

علی کتابیں اٹھا کر جانے کے لئے بالکل تیار تھا کہ آمنہ پھر آگئی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی۔

”لو..... چائے پیو۔ پھوپھی جی کہہ رہی ہیں، دماغ تازہ ہو جائے گا۔“ آمنہ کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

”تم کیوں جلتی ہو؟..... آخر وہ میری ماں ہیں۔“

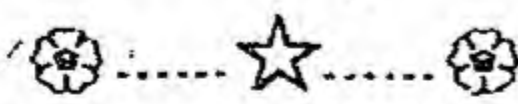
”میں کیوں جلوں؟ مجھے تو دکھ ہوتا ہے کہ ویسے بھی تمہارا دماغ بہت گرم ہے، مزید چائے پلا کر تو اور بیڑہ غرق کر دیں گی۔“

”آئی سے گیٹ آؤٹ۔“ وہ ایک دم طیش میں آ گیا۔

”زیادہ انگریزی کا رعب نہ جھاڑا کرو مجھ پر۔“ وہ بھی جواباً چیخی۔

”اب آنا تم میرے پاس انگریزی پڑھنے، پھر دیکھوں گا۔“ علی نے اسے گھورا تو وہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔

علی کو وہ بہت چاہتی تھی اور علی بھی اسے بہت پیار کرتا تھا۔ ایسا اس لئے تھا کہ علی کی کوئی بہن نہ تھی اور آمنہ کی اپنے بڑے بھائی سے بنتی نہ تھی۔ علی اور آمنہ دونوں لڑتے اور منٹوں میں مان بھی جاتے۔ اس قدر لڑائی ہوتی کہ لگتا اس کے بعد دونوں بات ہی نہ کریں گے۔ مگر رات کو علی جب پڑھ رہا ہوتا تو آمنہ کتاب اٹھائے اس کے پاس چلی آتی تو وہ مسکرا دیتا اور بڑی محبت اور لگن سے اسے پڑھا دیتا۔ وہ علی کے لئے تھرماس میں چائے رکھ دیتی۔ کیونکہ علی رات گئے تک پڑھتا تھا اور اسی چائے کی خاطر اسے آمنہ سے دوستی کرنا پڑتی تھی۔



فرسٹ سمسٹر کو شروع ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا، لیکن آج سے ریگولر کلاسز شروع ہوئی تھیں ورنہ پہلے پورا ایک ہفتہ ایک بھی کلاس نہ ہوئی تھی۔ کچھ طلبہ داخلہ فیس جمع کروانے اور بجیکٹ تبدیل کروانے کے چکر میں رہتے تھے۔ پروین نے کتنا چاہا تھا کہ وہ اور مریم بھی بجیکٹ تبدیل کروالیں، مگر مریم نہ مانی تھی۔ اسے بھی ایک ضد ہو گئی تھی۔



”ہمیشہ ہار میری ہو، پروین طالب! ایسا نہیں ہوگا۔ کیا صرف میں اور میرے بابا جانی ہی ہارتے رہیں؟ تمہارا باپ میرے بابا کو ہرا کر خوشیاں مناتا ہے اور تم چاہتی ہو کہ مجھے شکست دے کر سکون حاصل کرو..... یہ کبھی نہیں ہوگا۔“ مریم دل ہی دل میں کچپکا کر پروین کی ضد کے جواب میں کہتی اور پروین اُس کی اندر کی توڑ پھوڑ سے بے خبر اس کے سخت چہرے کو دیکھے جاتی۔ اسے لگتا، جیسے مریم بدلتی جا رہی ہو۔ چند لمحوں میں یہ خیال اس کے ذہن میں سانپ کی مانند کندلی مار کر بیٹھ جاتا، مگر پھر وہ سر جھٹک کر خیال کو ذہن سے نکال دیتی۔ ”نہیں، مریم بہت معصوم اور سادہ ہے۔ وہ نہیں بدل سکتی۔“

گلاس ختم ہونے کے بعد وہ دونوں ریفریشو کی طرف آئیں اور بنانا شیک لے کر شیڈ میں آ بیٹھیں۔

”پروین! تمہاری امی کراچی کبھی نہیں آئیں؟“ مریم نے ایک دم ہی پوچھ لیا۔

”یہ تمہیں ایک دم میری امی سے کیا دلچسپی پیدا ہوگئی؟“ پروین ہنسی۔

”یونہی پوچھا تھا۔ کبھی تم نے اپنے گھر والوں کے بارے میں نہیں بتایا۔“

”تم نے کب بتایا ہے؟“ پروین نے اسی کا سوال اسی پر دے مارا۔

”میں کیا بتاؤں؟..... سوچ رہی ہوں، کس خاندان میں خود کو ایڈجسٹ کروں۔“ مومو

ایک طویل سانس لے کر رہ گئی، پھر ہنستے ہوئے بولی۔

”یہ بتاؤ، تم گاؤں کب جاؤ گی؟“

”لو، ابھی تو واپس آئی ہوں چھٹیاں گزار کر۔ بھول گئیں؟ کیا بات ہے ڈیر! آج کل

تم بھولنے بہت لگی ہو۔“ پروین نے ہنستے ہوئے چوٹ کی تو مریم نے گڑبڑا کر گلاس منہ سے لگا لیا۔

”اُف خدا! یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے؟..... اس انکشاف نے کہ پروین میری کزن

ہے، میرے اندر دراڑیں کیوں ڈال دی ہیں؟..... یوں لگتا ہے میں خلا میں معلق ہو کر رہ گئی

ہوں۔ کیوں؟..... کیوں؟“ اُس کا اندر چیخ چیخ کر دہائی دینے لگا تھا اور اس نے ان چیخوں

کو دبانے کے لئے ایک سانس میں پورا گلاس خالی کر لیا۔

”ہیلو گرلز! کیا حال ہے؟“ علی ان کے قریب آ گیا۔

”اوہ، علی بھائی! کیسے ہیں آپ؟“ مریم کو کچھ دیر کے لئے تکلیف دہ احساسات سے

نجات مل گئی تھی۔

”تمہاری دعا ہے مریم رانی!“ علی نے کہا تو مریم کی آنکھوں میں غرور بھر گیا۔

مریم نے پروین کو دیکھا، جو بڑے غور سے علی کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی، اس

لڑکے میں کتنی کشش ہے۔ کیا بات ہے اس میں کہ دل اس کی طرف کھینچے لگتا ہے؟ اسے

قریب پا کر میرے ارد گرد گلاب کیوں مہک اٹھتے ہیں؟ آخر ایسا کیوں ہے؟ اُس کی آنکھیں عجیب سے سنے دیکھنے لگی تھیں۔ تنہائی میں بار بار علی کا سراپا اس کے تصور میں آ جاتا تھا۔ وہ خود کو سمجھاتی..... میں امین علی کی امانت ہوں۔ مجھے سوائے اُس کے کسی کے بارے میں نہیں سوچنا چاہئے..... مگر پھر بھی وہ لاشعوری طور پر علی کے بارے میں سوچتی۔ وہ علی کو دیکھے جا رہی تھی، جو مریم سے پوچھ رہا تھا۔

”کیسی پڑھائی ہو رہی ہے؟“

”آج تو پہلا دن تھا۔“ مریم ہنسی۔ علی کو یوں لگا، جیسے کانچ ٹوٹ گیا ہو۔

”تمہاری سہیلی کے منہ میں زبان نہیں ہے؟“ علی نے ہنستے ہوئے چوٹ کی۔

”ہے۔ بلکہ بہت لمبی ہے۔ پتہ نہیں، آپ کے سامنے کیوں خاموش ہو جاتی ہے۔“

مریم نے شوخی سے کہا تو پروین جو بڑے غور سے علی کو دیکھ رہی تھی، سٹپٹا گئی۔ علی ذہین تھا،

اس نے پروین کی آنکھوں میں خوابوں کی گلابیاں دیکھ لی تھیں۔ جو خواب علی کی آنکھیں بن

رہی تھیں، انہی خوابوں کی کھڑی پروین کی آنکھوں میں بھی اُسے نظر آئی۔ وہ سرشار ہو گیا۔ مگر

ایک لمحے کے لئے اُسے دکھ بھی ہوا۔ ”میں نے جو اپنا آپ اس قدر سنبھال کر رکھا ہوا تھا،

اس لڑکی کے سامنے میں ٹوٹ کیوں گیا؟..... اس کی ایک نظر نے ہی میری احساس کی

کھڑی کے تانے توڑ دیئے ہیں۔“ مگر اس ہار میں بھی اُسے حرا آ رہا تھا۔ اس ہار نے اس

کے دل میں عجیب سا گداز پیدا کر دیا تھا۔ یوں لگتا تھا، ہر طرف روشنیاں بکھر گئی ہوں۔

”علی بھائی! آپ کی کوئی بہن ہے؟“ مریم جانے کیوں پوچھ بیٹھی۔

”ہاں.....“ علی بولا۔

”کتنی بڑی؟“ مریم نے اشتیاق سے پوچھا۔

”تمہاری طرح۔ تم جتنی۔“

”سچی؟“ مریم خوشی سے چمک کر بولی۔ ”وہ پڑھتی ہے؟“

”ہاں۔“ علی نے سر کو مثبت انداز میں جنبش دی۔

”کہاں؟“ مریم نے تجسس سے پوچھا۔

”اسی یونیورسٹی میں۔“ علی نے کہا۔

”ہائے..... پھر ہمیں ملوایا کیوں نہیں؟ چلے ملوایے، کیا نام ہے اس کا؟“

”مریم..... مریم شوکت۔“ علی نے کہا۔

”کیا؟“ وہ چونک کر بولی۔

”ہاں بھئی۔ تم ہی میری بہن ہو۔“ علی کے لمبے میں سچائیوں کی گہیرا تھی۔

”تو آپ اکیلے ہیں؟“



”تمہارے ہوتے ہوئے تو نہیں اکیلا۔“ علی زور سے ہنسا۔ ”اور لگی! بھلا وہی رشتے تو مضبوط نہیں ہوتے جو خونی ہوں، بلکہ خونی رشتوں سے زیادہ پائیدار دوسرے سماجی رشتے ہوتے ہیں۔ یہی حقیقی اور مضبوط رشتے ہیں۔“ علی اس کا سر تھپکتے ہوئے بولا تو مریم کی آنکھیں عجیب سے احساس سے چمک اٹھیں اور آنکھوں میں آنسوؤں کی تہہ جم گئی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ ”اشو بھی اب بڑا سارا ہو گا۔ اور..... اور میرا بھائی جس نے میرے ساتھ ایک ہی دن جنم لیا، اب تو وہ بہت بڑا ہو گا۔ بالکل..... بالکل علی بھائی جیسا، اتنا ہی پیارا اور محبت کرنے والا۔“ مریم نے سر اٹھا کر علی کی طرف دیکھا، جو زیر لب مسکرا رہا تھا۔ جو اس کی زبان کہہ رہی تھی، وہی کچھ اس کی آنکھوں میں رقم تھا۔

”سچ..... آپ میرے بھائی ہیں نا؟..... بالکل اصلی والے۔“ مریم نے علی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

”ہاں..... بالکل اصلی بھائی۔ ایک رتی کھوٹ نہیں ہے اس سکندر علی میں۔“ علی نے ہنس کر کہا تو باسمہ نجانے کب ان کے قریب آکھڑی ہوئی تھی، ہنس کر بولی۔

”بس علی! تم پھنس گئے۔“

”کیا مطلب؟“ علی نے چونک کر پوچھا۔

”جناب! پتہ نہیں آپ کو، بھائیوں کے کندھوں پر بہت بھاری ذمے داریاں ہوتی ہیں۔“

”تو محترمہ! یہ کندھے فولاد کے ہیں۔“ علی نے اپنا کندھا تھپک کر کہا۔

”میں نے بھی دیکھ بھال کر بھائی بنایا ہے۔“ مومو اپنی گلابی ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے بولی۔

”ہر ایک کو تم بھائی بنا لیتی ہو۔“ پروین نے تڑخ کر کہا۔

”ہیں واقعی؟“ باسمہ نے حیرانگی سے پوچھا۔

”بھئی کوئی میرا ان کا بھائی ہے، کبھی سینما کا گیت کیپر بھائی جی بن جاتا ہے اور.....“

”بس کرو۔“ مریم ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”بھئی اب میری عادت ہے تو میں کیا کروں؟ اور کوئی بری بات تو ہے نہیں، اللہ میاں نے سب لوگوں کو برابر بنایا ہے۔ ہم نے علیحدہ علیحدہ درجے دے دیئے ہیں۔ کیوں علی بھائی؟“

”ہاں اور کیا تمہارے خیالات قابلِ قدر ہیں۔“ علی جلدی سے بولا۔ پروین کے لہجے میں نچلے طبقے کے لوگوں کے لئے جو مسخر تھا، علی نے محسوس کیا اور اس کے اندر اداسیاں خزاں رسیدہ چٹوں کی مانند ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں۔ وہ دل ہی دل میں پروین سے مخاطب تھا۔

”اگر..... اگر تمہیں یہ علم ہو جائے کہ میں بہت غریب ہوں، میرے ابو جی ایک مل مزدور ہیں تو..... تو کیا تم اپنے بڑھتے قدم روک لو گی؟ پھر یہ محبت تو نہ ہوئی، تمہیں اپنا اسٹیٹس عزیز ہوا۔ تم جو بیرسٹر صفدر علی کی بہن ہو، بہت بڑے زمیندار کی بیٹی ہو، جن کے نزدیک ایک دولت ہی پیار ہے، زندگی ہے۔ میری تو تمہارے سامنے کوئی وقعت نہ ہو گی۔ تم محبت کو اور دولت کو ترازو میں رکھ کر تو لو گی تو دولت کا پلڑا بھاری ہو گا۔ مگر..... مگر پروین! نہ جانے کیوں، میرا جی چاہ رہا ہے کہ میرے دل میں جو آگ لگی ہے، اس سے تم بھی محفوظ نہ رہو۔ میں نے تیر تمہاری طرف پھینک دیا ہے۔ پتہ نہیں نشانے پر بیٹھے گا یا نہیں۔ اوہو..... مجھے ابھی سے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“

جب حشر کا وقت آئے گا

اُس وقت دیکھا جائے گا

”یہ مراقبے میں کیوں چلے گئے علی؟“ باسمہ نے اس کے سامنے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

”کہیں نہیں گیا، میں یہیں ہوں۔“ علی نے مسکرا کر کہا تو اس کی آنکھوں میں گلابیاں مزید بڑھ گئیں۔

”بیل ہو گئی ہے..... کلاس شروع ہونے والی ہے۔“ باسمہ نے یاد دلایا۔

”اوہ، چلو۔ شاید سر زاہد کا پیرٹڈ ہے۔“ وہ ہاتھ جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا، پھر مریم کا سر تھپکتے ہوئے بولا۔ ”اچھا مریم! پھر ملیں گے۔“

”اچھا۔“ وہ مسکرائی۔ پھر باسمہ اور علی چلے گئے اور مریم کتنی ہی دیر تک علی کی پشت پر نظریں جمائے اسے جاتا دیکھتی رہی، جیسے دیوانی ہو گئی ہو۔

”تمہیں کیا ضرورت تھی، اسے بھائی بنانے کی؟“ پروین نے جھنجھلا کر پوچھا تو مریم نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

”پروین! تمہیں کیا معلوم، بھائی تو سائبان ہوتے ہیں، جن کی موجودگی میں کوئی ڈر خوف نہیں ہوتا۔ یہ تو ایسی ڈھال ہیں، ایسے قلعے ہیں، جن سے مخالف ہوائیں ٹکرا کر لوٹ جاتی ہیں۔ اور میں نے بھی ایک ایسے ہی قلعے میں خود کو محفوظ کر لیا ہے۔“

”اور وہ قلعہ علی ہے۔“ پروین نے اس کی بات مکمل کی۔

”بالکل درست۔“ مریم کا لہجہ چٹانوں کی سی سختی لئے ہوئے تھا۔

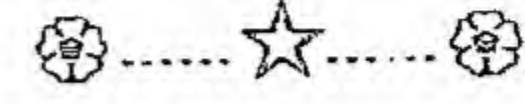
”تمہارا اپنا کوئی بھائی نہیں؟“ پروین نے کسی قدر طنز سے کہا تو مومو ٹپ کر بولی۔

”کیسی بد فال نکالتی ہو؟ اللہ رکھے، میرے دو بھائی ہیں۔“

”پھر ہر ایک کو کیوں بھائی بناتی پھرتی ہو؟“



”میرے بھائی میرے پاس ہوتے تو کیا ضرورت تھی کہ اپنی تشنگی اس طرح پوری کرتی؟“ مومنو نے دل ہی میں سوچا اور اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی تہہ جمنے لگی۔ پروین اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی، جو منٹوں میں خوش ہوتی تھی اور دوسرے لمحے اُداس ہو جاتی تھی۔ وہ اب تک اپنی سکھی کو سمجھ نہ پائی تھی۔



”بس، اُس گیارہ کے پاس موٹر روک دو۔“ باسمہ نے کہا تو مومنو نے گاڑی روک دی۔ ”اس کی پچھلی گلی میں علی کا گھر ہے۔ وہاں راستہ چوڑا نہیں ہے، پیدل چلے چلتے ہیں۔“ باسمہ نے بڑا سا پکٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

اصل میں مومنو آج علی کے ہاں اس لئے آئی تھی کہ آج اُس کا برتھ ڈے تھا۔ حالانکہ وہ سالگرہ نہیں مناتا تھا، مگر دوست یونیورسٹی میں اس کے جنم دن کے موقع پر جیب ضرور ہلکی کر دالیتے تھے۔ پتہ نہیں، عاصم نے کیسے اس کے سرٹیفکیٹ پر اُس کی تاریخ پیدائش دیکھ لی تھی اور یاد بھی کر لی تھی۔ ابھی تو ایک ہفتہ پہلے وہ علی سے کہنے لگا۔

”یار! اس بار تمہارا جنم دن چھٹی کے دن آ رہا ہے۔“

”خوشی کی بات ہے۔ شکر ہے، میرے پیسے بچے۔“ علی تشکر آمیز لہجے میں بولا۔

”یہ بڑے کنجوس۔“ نوید نے اس کی پیٹھ پر دھپ جمائی۔

”علی بھائی! کون سی ڈیٹ ہے؟“ مومنو نے پوچھ لیا۔

”15 ستمبر۔“ عاصم نے جلدی سے بتایا۔

”یار! ہزار مرتبہ تم لوگوں کو بتایا ہے کہ یہ درست نہیں۔ ہم دیہاتی لوگ ہیں۔ میرے

والدین کو میرا صحیح جنم دن یاد نہیں۔ یہ تو تئکے سے لکھوا دیا تھا۔“ علی بولا۔

”کچھ بھی ہو، اب تمہاری عمر تو سرٹیفکیٹ کے لحاظ سے جانی جائے گی۔“ عاصم نے کہا۔

مومنو نے یہ تاریخ اچھی طرح یاد کر لی تھی۔ پروین کے ساتھ جا کر اُسی روز اُس نے

پتھورانا سے اُون خریدی تھی اور تین چار روز مسلسل لگ کر علی کے لئے بہت شاندار سویٹر بنا

تھا۔ باسمہ سے منت کی تھی کہ علی کو بتائے بغیر اس کے گھر چلیں گے اور باسمہ مان گئی تھی۔

جبکہ پروین نے علی کے گھر جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اصل میں پروین آگے بڑھنا

نہیں چاہتی تھی۔ اس نے علی کی آنکھوں میں چھلکتے جذبے دیکھ لئے تھے۔ فی الحال وہ خود کو

سمجھا رہی تھی اور اپنے قدم مضبوطی سے جمار کھے تھے۔ اسے علم تھا کہ یہ قدم ایک بار اُکھڑ

گئے تو پُھر نہیں جیئیں گے۔ بس پھر بدنامیاں ہی مقدر ہوں گی۔ آج سہ پہر مومنو، باسمہ کے

ہاں چنچی اور اب وہ علی کے چھوٹے سے گھر کے دروازے پر کھڑی تھیں۔ باسمہ نے دستک

دی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھل گیا۔ یہ علی ہی تھا۔ شاید سو کر اُٹھا تھا۔ اپنی اُجلی اُجلی آنکھوں

میں گلابیاں سمیٹے وہ بڑی حیرانی سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

”اندر آنے کو نہ کہو گے؟“ باسمہ نے ہنس کر کہا۔

”ہاں، ہاں..... آؤ۔“ وہ ہٹ گیا۔ ”مگر یہ بتاؤ کہ کس خوشی میں آئی ہو؟“

”علی بھائی! آج آپ کا جنم دن ہے نا۔ مبارک باد دینے آئے ہیں۔“ مومنو بلبل کی

طرح چبکی۔

”اوہ.....“ وہ زور سے ہنسا۔ ”تبھی تم لدی پھندی آئی ہو۔“ علی نے اس کے پیچھے

دیکھا، شاید پروین بھی آئی ہو۔ اُس کا ننھا سا دیا روشن ہوا، مگر مایوسی کے جھونکے سے بھگ گیا۔

”جی۔“ مومنو اترائی۔

پھر وہ ان دونوں کو بیٹھک میں لے آیا۔

”خالہ جان کہاں ہیں؟“ باسمہ نے کہا۔

”وہ ماموں جی کے ہاں ہیں۔ ابھی بلاتا ہوں۔ تم بیٹھو۔“ وہ خوشی سے بولا۔ پھر باہر چلا

گیا۔ مومنو نے کیک اور پکٹ سامنے پڑی میز پر رکھ دیئے۔

”علی کی امی جی بہت اچھی ہیں۔ بہت محبت کرنے والی۔“

”وہ تو علی بھائی کی طرف دیکھ کر ہی پتہ چلتا ہے کہ محبت کرنے والوں کے بیچ رہ کر

پروان چڑھے ہیں اور سب سے محبت کرتے ہیں۔ سچ ان سات اٹھ ماہ میں مجھے یوں لگتا

ہے جیسے کہ ہم واقعی بہن بھائی ہیں۔“ مومنو کے لہجے میں محبتیں اور شدتیں کھلی ہوئی تھیں۔

پھر علی، لالی کے ساتھ اندر آ گیا۔ مومنو اور باسمہ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

”آداب!“

”جیستی رہو..... خدا عمر دراز کرے۔“ لالی نے مومنو کو لپٹا لیا۔

”امی جی! یہ میری بہن ہے، مریم۔“ علی نے ہنس کر تعارف کروایا۔

”بہت ذکر کرتا ہے تمہارا۔ میں نے کہا بھی کہ کبھی لے کر آؤ، مگر تمہیں لاتا ہی نہیں تھا۔“

لالی نے نہایت محبت سے مومنو کا ہاتھ تھام لیا۔

”اصل میں تین چار بج جاتے ہیں گھر جاتے جاتے۔ اور دیکھئے، آج ہم خود ہی آ

گئے۔“

”بہت اچھا کیا۔ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔“ لالی بولی۔

”امی جی! باتوں میں ٹر خاؤ گی۔ کچھ لائیں کھانے کے لئے۔“

”آمنہ کو بلا لے۔“ لالی نے کہا۔

علی باہر گیا تو لالی اب غور سے مومنو کو دیکھنے لگی۔ کھلتی ہوئی گئی کی طرح رنگت، سیاہ

ہرئی جیسی آنکھیں، ابھرے ابھرے گال، ٹھوکی پہ ننھا سا تیل، روشن پیشانی، سیاہ لائے بال۔



ان سب نقوش نے لالی کے ذہن میں فانوس کے مانند ایک سراپا روشن کر دیا۔ ”بالکل بالکل ایسی ہی تھی نور اں بھی اور..... اور اُس کی لڑکی کا نام بھی تو مریم تھا۔ کہیں.....؟ نہیں، نہیں..... وہ بھلا یہاں کیسے آسکتی ہے؟ ایک شکل جیسے کئی لوگ ہوتے ہیں۔ پھر وہ بھلا کہاں چودھری کو دیتی مومو کو۔ چودھری کا بھائی زندہ دفن کر دیتا، راجا اور نور اں کو۔ یہ اور کوئی ہے۔“ لالی نے اپنے ذہن میں ریگتے دوسوں کو جھٹکا۔ پھر بھی اپنی تسلی کے لئے کہنے لگے۔

”کبھی اپنی امی کو بھی لاؤ نا؟“

”میری امی نہیں ہیں..... فوت ہو گئیں۔“ مومو کی خوشی ایک دم دُکھ میں بدل گئی۔

”اوہ..... کیا ہو گیا تھا؟“ لالی اپنی گریڈ نے والی عادت سے مجبور تھی۔

جی بیمار تھیں۔“ مومو نے دھیرے سے کہا۔ حالانکہ اُس کا جی چاہا، کہہ دے، اُسے انتقام کی آگ چاٹ گئی تھی۔ میرے بابا کو اُس آگ میں جلاتے جلاتے خود ہی جل مری۔ ”بڑا افسوس ہوا۔ علی بتا رہا تھا، تم اپنی بہن بہنوں کے ساتھ رہتی ہو۔“

”ہاں جی۔“ مومو نے کہا۔

باسمہ کو بہت غصہ آ رہا تھا۔ جب سب پتہ ہے تو پھر پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر انہیں پتہ بھی نہ چلا، تھوڑی سی دیر ہی میں علی اور آمنہ نے خاصا اہتمام کر ڈالا تھا۔ ”علی بھائی! پہلے کیک کاٹیں۔“ مریم نے کہا۔

”بھئی یہ تو بڑے لوگوں کے چو نچلے ہیں۔ تم نے یونہی تکلف کیا۔“ وہ شرمندہ ہو گیا۔ ”میری خوشی کی خاطر۔“ مریم نے محبت سے اسے دیکھا۔

”چلو، تم بھی کیا یاد کرو گی کہ کس سخی سے پالا پڑا ہے۔“ علی، مریم کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”پہلے کپڑے تو بدل لو، کتنی سلوٹیں پڑی ہوئی ہیں۔“ آمنہ نے اُسے یاد دلایا۔

”رہنے دو..... ویسے ہی بہت اچھے لگ رہے ہیں۔“ مریم نے محبت سے علی کو دیکھا۔

”دیکھا۔“ وہ آمنہ کو چوانے لگا۔ ”ایسی ہوئی ہیں بہنیں۔ اور ہم تو ویسے بھی شہزادے

ہیں، جو پہنیں، سج جاتا ہے۔“ علی غرور سے بولا تو لالی اُس کی پیشانی چوم کر بولی۔

”تو واقعی شہزادہ ہے۔“

پھر علی نے مریم کا لایا ہوا کیک کاٹا۔ باسمہ، آمنہ اور مریم نے پی پی برتھ ڈے کا گیت گایا

اور لالی خاموشی سے انہیں خوش ہوتا دیکھتی رہی۔

کریمو کے بچے بھی آگئے تھے، وہ بھی خوش تھے۔ بس کریمو اور شیدا گھر میں نہ تھے۔

وہ میل میں کام کرنے والے ایک مزدور احمد کے بیٹے کے عقیقے میں گئے تھے۔ پھر لالی نے

انہیں گاجر کا حلوہ دیا، جس میں میوے کی بھرمار تھی۔

”یہ تو بہت اچھا ہے۔“ مومو نے کہا۔

”میں سردیوں میں علی کے لئے بنا کر رکھتی ہوں۔ علی کو بہت اچھا لگتا ہے۔“ لالی نے خوش ہو کر بتایا۔

”اب پتہ چلا ہو گا، ان کی صحت کا کیا راز ہے؟“ آمنہ نے ہنس کر کہا۔

”تم تو جل جل کر مر جاؤ گی۔ چلو اٹھو، برتن اٹھا کر رکھو۔“ علی رعب سے بولا۔ پھر

اس کے ساتھ خود بھی برتن اٹھا کر باہر آ گیا۔

”علی بھائی! یہ لڑکی مریم اچھی ہے۔“ آمنہ نے کہا۔

”ہاں، بہت اچھی ہے۔ بہت محبت والی۔“ علی کا لہجہ محبتوں سے چُور چُور تھا۔

”ہمیشہ کے لئے اس گھر میں لے آؤ نا۔“ آمنہ نے کہا۔

”کیا کہہ رہی ہو آمنہ؟“ علی حیرت سے گنگ ہو گیا۔

”میں نے کوئی غلط.....“ آمنہ نے کہنا چاہا۔

”بہت غلط سوچ ہے تمہاری۔“ وہ میری بہن ہے، میں نے صدقِ دل سے اُسے بہن

بنایا ہے۔“ علی اس کی بات کاٹ کر چیخا۔ ”آئندہ اپنے خیالات اپنے تک محدود رکھا کرو،

بعض خیال ایسے ہوتے ہیں، جنہیں زبان نہ دی جائے تو اچھا ہے۔ ورنہ کتنے ہی دل توڑ

دیئے ہیں، ایسے خیال۔“

”مجھے معاف کر دو، علی! مجھے کیا پتہ تھا؟“ آمنہ رودی۔ اُسے واقعی اپنے خیال پر بے

طرح شرم آ رہی تھی اور اپنی زبان پر غصہ جو کہ کچھ دیکھے بھالے بغیر چل جاتی تھی۔

”اچھا..... رومت۔ جلدی سے اچھی سی چائے ایک بار پھر پلا دو، شاباش۔“ علی نے

اُس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور پھر چلا گیا۔ آمنہ نے کیتلی چولہے پر رکھ دی۔





خلیل فوراً کمرے سے نکل گیا، پھر کینر، چودھری شوکت علی سے مخاطب ہوئی۔

”چودھری جی! اس میں رقم ہے۔“

”رقم..... کیسی رقم؟“ چودھری شوکت علی نے حیرت سے پوچھا۔

”جو آپ ہر ماہ لالی کے پٹر کے لئے بھیجتے تھے۔“

”تو وہ اُس تک نہیں پہنچی؟“

”دینو تو کریمو کو دے آتا تھا۔ وہی لالی کو بھیج دیتا تھا پیسے۔ پھر کریمو بھی شہر چلا گیا تو ہر ماہ جو رقم آپ دیتے تھے، وہ دینو کے پاس ہی رہتی۔“ کینر نے کہا۔

”دینو! تُو مجھے بتا دیتا کہ اب کریمو نہیں ہے دنیا پور میں تو میں نہ دیتا۔“ چودھری شوکت علی نے بغیر کسی تاثر کے کہا۔

”مالک! میں آپ کی ضدی طبیعت سے ڈرتا تھا۔“ دینو کی آواز بمشکل نکلی۔

”میں سمجھا نہیں؟“ چودھری شوکت نے دینو کی پیلی پیلی، ویران آنکھوں میں دیکھا۔

”مالک! آپ کے موڈ کا کیا پتہ، آپ دینو سے کہہ دیتے کہ شیدے کو تلاش کر کے یہ رقم اس تک ضرور پہنچا اور اب دینو میں یہ سکت نہیں رہی تھی۔ کینر نے بتایا۔

”اوہ، بھولے بادشاہ!“ چودھری شوکت علی نے دینو کا لاغر سا ہاتھ تھام لیا۔

”بھر جائی! یہ تم ہی رکھو۔ مجھے تو یہی پتہ ہے کہ یہ لالی کے پٹر کے لئے جا چکی ہے۔

میں بہت خوش ہوں، دینو کی ایمانداری پر۔ اس پر مجھے ہمیشہ فخر رہا ہے۔“

”مالک!..... مالک!“ دینو کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

”دینو! کیوں رو رہا ہے؟ رب اچھا ہی کرے گا۔ تُو ٹھیک ہو جائے گا۔ کملانہ ہو تو۔“

چودھری شوکت علی نے اپنے شملے سے اُس کے آنسو صاف کئے۔

”مالک! زندگی میں بہت بڑا جھوٹ آپ سے بولا ہے میں نے۔“

”کیا کہہ رہا ہے؟“

”مالک! مجھے معاف کر دینا۔ میں بوجھ سینے پر رکھ کر نہیں مرنے چاہتا۔“

”تُو بول دینو!..... تجھے پتہ ہے کہ میں نے ایک ہی بار بہت ظلم کیا تھا اور اب تک

اس کی سزا پا رہا ہوں۔ میرا وارث ہے اور مجھے خبر نہیں۔“ چودھری شوکت علی کی آواز بھرا گئی۔

”اسی کے متعلق..... بتانا چاہ رہا ہوں۔“ دینو نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”کیا کہہ رہا ہے دینو؟“ چودھری شوکت علی، دینو کی طرف جھکے۔ پھر انہوں نے سنا، دینو ایک ایک کر کے کہہ رہا تھا۔

چودھری شوکت علی، دینو کے بیٹے خلیل کے ساتھ اس کے گھر میں داخل ہوئے تو ہر طرف موت کا سا ساٹنا تھا۔ وہ خلیل کے ساتھ دینو کے کمرے میں پہنچے، جہاں ہڈیوں کے ڈھانچے کی صورت میں دینو پڑا تھا۔ اُس کی بیوی قریب ہی کھڑی بڑی حسرت زدہ نظروں سے اپنے جیون ساتھی کو دیکھ رہی تھی، جو زندگی اور موت کے پُل صراط سے گزر رہا تھا۔

چودھری شوکت علی کو دیکھ کر دینو نے اٹھنے کی ناکام کوشش کی تو چودھری شوکت علی نے جلدی سے اُسے کندھوں سے تھام کر لیٹا رہنے دیا۔

”نہ اٹھ..... لیٹا رہ..... یہ کیا حال ہو گیا ہے تیرا؟..... مجھے پہلے کیوں نہیں بلایا تُو نے؟“ چودھری شوکت علی کے لبوں سے شکوہ پھسل پڑا۔

”لب..... لب.....!“ دینو کے لب زخمی کبوتر کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گئے۔

”بھر جائی! مجھے افسوس ہے کہ تم نے مجھے نہیں بتایا۔ دینو کو پیلیا ہو گیا ہے۔ چل دینو!

میں تجھے کراچی لے جاؤں اچھے سے اچھے ڈاکٹر سے علاج کراؤں گا۔“ چودھری شوکت علی اپنے بچپن کے ساتھی کو اس حالت میں دیکھ کر رُپ ہی تو گئے۔

”مالک! بہت علاج کرایا ہے..... ساری جمع پونجی لگا دی ہے۔ رب شانہ دے تو بندہ

کیا کر سکتا ہے؟“ کینر نے گلوگیر آواز میں کہا۔

”میں تو خلیل سے پوچھتا رہتا تھا، یہ کہتا تھا، بس بابا کو بخار ہے۔ میں نے سوچا، ٹھیک

ہو جائے گا۔ تھوڑے بخار کا تو یہ اثر نہیں لیتا تھا۔“

پھر دینو نے بیوی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا تو اُس نے دینو کے تکیے کے نیچے سے ایک تھیلی نکالی اور دینو کے رگوں سے بھرے ہاتھ میں دے دی۔

”مالک! یہ..... یہ آپ کی امانت ہے۔“ دینو نے ایک ایک کر کے کہا۔

”یہ کیا ہے؟“ چودھری شوکت علی نے حیرانگی سے پوچھا۔

دینو میں بولنے کی سکت نہیں تھی۔ تب کینر نے قریب کھڑے خلیل سے کہا۔

”پٹر! تُو باہر جا۔“



کمرے سے نکل گئے اور کینز کی فلک شکاف چٹیں اُن کے دل و دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں۔



وہ کپری ہینسو ٹیسٹ دے کر بیٹھے ہی تھے کہ اسائنمنٹ مکمل کرنے میں کئی دن لگ گئے اور پھر صرف دو ہفتے کی چھٹیاں ملیں۔ پروین تو حسن پور چلی گئی تھی، جبکہ مریم نے چھٹیاں چودھری شوکت علی اور شعیب کے ساتھ گھر ہی پر گزار دیں۔ دو ہفتے اُس کی زندگی کے خوب صورت دن تھے۔ چھٹیاں ہوتے ہی چودھری شوکت علی آگئے تھے اور پورے دو ہفتے اس کے ساتھ رہے تھے۔

آج یونیورسٹی کھلی تھی، سب طلباء فریش نظر آ رہے تھے۔ چند روز کا آرام بھی انسان کو کس قدر تروتازہ کر دیتا ہے۔

کو ریڈور سے گزرتے ہوئے اُسے سکندر علی نظر آ گیا۔ وہ اُس کے قریب آیا اور بولا۔  
”کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں علی بھائی؟“ مریم نے چمک کر پوچھا۔  
”تمہارے سامنے ہوں۔ وہ تمہاری دوست نہیں آئی؟“ علی کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔  
”خیر تو ہے؟“ مریم نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔  
”ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔“ علی گڑبڑا کر بولا۔

”میں اس کے ہاں صبح آتے ہوئے حسب معمول گئی تھی۔ صفدر بھائی نے بتایا کہ آج شام آئے گی۔“ مریم نے تفصیل بتائی۔

”اچھا!“ نہ جانے کیوں علی مجھ سا گیا۔

”علی بھائی! ایسے راستوں پر چلنے کا کوئی فائدہ نہیں، جن کی منزل نہ ہو۔“

”تم مجھے سمجھا رہی ہو؟“ علی بھرپور طریقے سے مسکرایا۔

”میں نہیں چاہتی کہ آپ شوق گل بوسی میں کانٹوں پہ زباں رکھ دیں۔“ مریم نے کہا۔

”اب تو رکھ چکا۔“ وہ نہایت بے پروائی سے بولا۔

”نہیں علی بھائی! پلیز آپ پلٹ جائیں۔“ مریم سراپا التجا بن گئی۔

”مریم! ہم دونوں کے درمیان کبھی کوئی ایسی بات آج تک نہیں ہوئی۔ مگر انسان کی چٹھی جس ہوتی ہے، جو اُسے سچ بتاتی ہے۔ تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا، میرے اندر کا سکندر علی کہتا ہے، وہ مجھے پسند کرتی ہے۔“ علی نہایت جذب کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

”مجھے تو اُس نے نہیں بتایا۔“ مریم نے حیرت سے کہا۔

”تم بہت بھولی ہو۔ ابھی تک تو اُس نے خود کو بھی نہیں بتایا۔“ علی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”مالک!..... نو..... راں..... نے..... بتایا تھا..... آپ کا..... پٹر..... لال کے..... پاس.....“

چودھری شوکت علی بے یقینی کے عالم میں دینو کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کو دیکھ رہے تھے۔  
”دینو!..... ہوش میں تو ہے؟..... تو یہ کیا کہہ رہا ہے؟“ چودھری شوکت علی نے اُسے بازو سے پکڑ کر تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

مگر وہ تو اُس کے جواب دینے کی ذمہ داری سے بہت دور جا چکا تھا۔ دینو کی گردن ڈھلک گئی تھی اور آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ اُس کی ویران آنکھوں میں حسرتیں تھیں۔

چودھری شوکت علی گم صم کھڑے تھے۔ کافی دیر تک وہ دینو کی ویران آنکھوں میں نہ جانے کیا دیکھتے رہے۔ اُن کے لب کپکپا رہے تھے اور آنسو روکنے کی کوشش میں ان کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ پھر انہوں نے لرزتے ہاتھوں سے دینو کی حسرت و یاس کی ماری ویران آنکھیں بند کر دیں۔ تب ہی اُن کی پلکوں کا بند توڑ کر دو آب دار آنسو ٹپکے اور دینو کی پیشانی پر ٹپک گئے۔

قریب کھڑی دینو کی بیوی کینز کو اب صحیح صورت حال کا علم ہوا تھا۔ وہ چند لمحے وحشت زدہ نظروں سے دینو کا مُردہ وجود دیکھتی رہی اور پھر چیخ مار کر اُس کے ٹھنڈے سینے پر سر رکھ کر پلک پڑی۔ چارپائی کے پائے پر زور سے ہاتھ مار کر اس نے اپنی کلائی میں پڑی چوڑیاں چُور چُور کر دیں۔ کانچ کے ننھے ننھے ٹکڑے اُس کی کلائی میں چبھ گئے اور وہ بڑپتے مچلتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”سائیں! تم مجھے اکیلا چھوڑ گئے..... کس کے آسرے پر چھوڑا ہے تم نے؟..... ابھی تو انوری کو سسرال بھیجا تھا۔ خلیل کی دوہٹی کو بیاہ کر لانا تھا اور تم نے اتنی جلدی ایک نیا نگر بسا لیا ہے، جہاں سے کوئی واپس نہیں آ سکتا۔“

کینز کے بین چودھری شوکت علی کے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہے تھے۔ کینز کا ایک ایک لفظ ان کے سینے میں برچھگی کی مانند اتر رہا تھا۔ انہوں نے لرزتا ہاتھ، تڑپتی مچلتی کینز کے سر پر رکھا اور گلوگیر آواز میں بولے۔

”بھر جائی! صبر کرنے کو نہیں کہوں گا، کیونکہ تمہیں صبر آتے آتے ہی آئے گا۔ رب کے کاموں میں کسی کو اختیار نہیں ہے۔ میں تمہارے سر کا سائیں تو نہیں لاسکتا، پر یہ وعدہ ہے کہ انوری کو بیٹیوں کی طرح رخصت کروں گا اور خلیل کی دوہٹی بھی لاؤں گا۔ دینو میرا بھائی تھا، بھائی تھا، راز داں تھا، بہت رشتے تھے میرے اُس سے۔ اُسی کے ناتے سے اب تم سب میری ذمہ داری ہو..... قدرت مجھے ہمت دے کہ میں اپنی ذمہ داریاں نبھاسکوں۔“

چودھری شوکت علی کا لہجہ ٹوٹے کانچ کی طرح تھا۔ پھر وہ وہاں حریف نہ رُکے، بلکہ تیزی سے



”یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ چاہتا ہے، کوئی اُسے چاہے۔ چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش ہر دل میں ہوتی ہے۔“ علی نے مریم کو سمجھانا چاہا۔

”مگر آپ کو شاید علم نہیں کہ وہ.....“ اس سے پہلے کہ مریم اپنا جملہ مکمل کرتی، باسمہ ان کے قریب آگئی۔

”ہیلو..... کیا ہو رہا ہے؟..... چکر کیا ہے؟ خاص رازداری سے مینگ ہو رہی ہے؟“

”بہن بھائی بات کریں تو کیا کوئی چکر ہوتا ہے؟ باسمہ جی! اپنے خیالات درست کریں۔“ بظاہر نہایت معصومیت سے کہے گئے اس جملے میں چھپا طنز باسمہ نے محسوس کر لیا تھا، تبھی تو وہ شرمندہ ہو گئی تھی اور علی ہنس دیا اور بولا۔

”بھئی باسمہ! میری بہن سچ کہہ رہی ہے۔“

”اصل میں اس کی ذہنی اپروچ وہیں تک ہے۔ جبکہ میرا مطلب وہ نہیں تھا، جو مریم سمجھی۔“ باسمہ نے نارٹل ہوتے ہوئے کہا۔

”بخدا، میرا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔“ مریم ہنس کر بولی، پھر نیل ہونے پر وہ اپنے کلاس روم کی طرف بڑھ گئی۔ باسمہ اور علی ابھی تک وہیں کھڑے تھے۔

دوسرے سمسٹر ہوئے ہی تھے کہ یونین ایکشن کے ہنگامے شروع ہو گئے۔

سکندر علی کو صدر کی سیٹ کے لئے کھڑا کیا گیا، اس کے مقابلے میں مخالف پارٹی کا ایک کانگریسی ساٹھ کا کھڑا ہوا تھا۔ سب کو اُمید تھی کہ اُس کانگریسی کو تو ایک ووٹ بھی نہ مل سکے گا، تبھی تو ایک روز جب وہ سب سیمینار روم میں بیٹھے تھے تو باسمہ نے علی سے کہا۔

”لڑکیوں کے ووٹ پکے ہیں، تمہاری طرف علی!“

”کیسے؟“ علی کی آنکھوں میں چراغ جل اٹھے۔

”سمجھ جاؤ۔“ باسمہ کا لہجہ ذومعنی تھا۔

”بخدا، میں سمجھا نہیں۔“ علی سچ کچھ نہ سمجھا تھا۔

”بھئی باسمہ! بات پوری کیا کرو۔ صاف کہو کہ علی بھائی جیسا خوب صورت اور اسماٹ لڑکا جسے ہماری زبان میں دیس کا گبرو جوان کہتے ہیں، مخالف پارٹی کے پاس نہیں ہے۔

انہوں نے جو لڑکا کھڑا کیا ہے، لگتا ہے لڑکا نہ ہو، ایکسٹری ہو۔ تو اُسے خاک ووٹ ملیں گے؟ بندے کی شخصیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اتنی بڑی جامعہ کا صدر ایسا ہو کہ لوگ مرعوب ہو جائیں۔ اور علی بھائی میں یہ سب خصوصیات موجود ہیں۔“ مریم نے باسمہ کے دل کی بات بڑی تفصیل سے بیان کی تو باسمہ جربز ہو گئی اور علی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”تمہارے نزدیک میں گبرو جوان ہوں؟“

”بالکل!“ مریم نے اپنی بات میں وزن پیدا کرتے ہوئے کہا۔

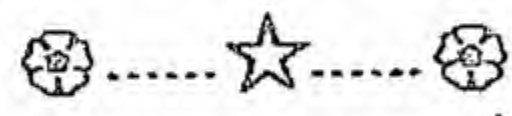
”کیا خبر، جشید نقوی کو بھی اُس کی بہن گبرو سمجھتی ہو، جسے تم کانگریسی کہہ رہی ہو۔“ علی نے اُسے چھیڑا۔

”چلے، اس پر بھی الیکشن کرا لیا جائے، وہ گبرو ہے یا آپ۔ سچ کہتی ہوں، ایک ووٹ بھی مل جائے اُسے تو نام بدل دیجئے گا۔“ مریم نہایت جوش میں بول رہی تھی۔ ”آپ کی

طرف تو لڑکیوں کا خود بخود دل کھینچتا ہے۔“ وہ کچھ سوچے سمجھے بغیر سچی بات کہہ دینے کی عادی تھی اور اب بھی بے تکلیف بات کر گئی تھی۔

”اچھا۔“ علی محفوظ ہوتا ہوا بولا۔ ”بھئی جسے میں چاہتا ہوں کہ وہ میری جانب کھینچ آئے، وہ تو آتا ہی نہیں۔“ علی نے کن آنکھوں سے پروین کی طرف دیکھا، جو ٹیبل کو اپنے لائے ناخنوں سے کھرچ رہی تھی۔

”یہ بات وہ دل والا یا دالی بہتر سمجھتی ہے۔ اسی میں آپ دونوں کی بھلائی ہے۔“ مریم، علی کا اشارہ سمجھ کر نہایت اطمینان سے بولی تو پروین پہلو بدل کر رہ گئی۔



یونیورسٹی کی کوئی دیوار ایسی نہ تھی، جہاں پوسٹر نہ لگے ہوں۔ رنگین کپڑوں کے بینرز ہواؤں سے جھولتے عجیب سماں پیدا کرتے۔ روز جلسے ہوتے، جلوس نکلتے۔

پڑھائی وغیرہ تو آج کل خاک نہیں ہو رہی تھی۔ سب لوگ یونیورسٹی آتے اور مخالفین کے خلاف نعرے بازی کر کے، لڑ جھگڑ کر مخصوص وقت پر پوائنٹ کی بسوں سے گھر لوٹ جاتے۔ سکندر علی کے جلسے میں بے تحاشہ طلبا ہوتے۔ مخالف پارٹی کو اپنے جیتنے کے چانسز کم نظر آتے تھے اور مریم نے جو بات کہی تھی، سچ کہی تھی۔ علی کے جلسے میں زیادہ تر لڑکیاں ہی

ہوتی تھیں۔ روز جلسے ہوتے اور وہ تالیاں پیٹ پیٹ کر بے حال ہو جاتیں۔

سکندر علی تقریر کرتا تو یوں محسوس ہوتا، جیسے اُس کی بات دلوں میں اترتی چلی جا رہی ہو۔ اُس کی آواز کا لوج مسخو کر دیتا اور لڑکیوں کے ساتھ پروین بھی اس کے انداز مخاطب پر

مسخو ہو جاتی۔ دھوپ کی تمازت اور جوش سے اُس کا سرخ و سپید رنگ سونے کی مانند تپنے لگتا۔ پیشانی پر پڑی گھنگھریالے بالوں کی لٹ اُسے مزید جاذب نظر بنا دیتی۔ مریم نے کئی بار دیکھا تھا، باسمہ ایک ٹک دیکھے جاتی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک مزید بڑھ جاتی اور

رخسار تھماتے لگتے۔ تب مومن نہایت دُکھ سے سوچتی۔

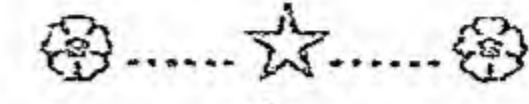
”اُف خدایا!..... یہ آج کل کی لڑکیوں کو کیا مرض ہے؟ جہاں اچھا لڑکا دیکھا، ان کے

دل کے سمندر میں ہلچل مچ گئی۔ اُس کے لئے دل و آنکھیں فرشِ راہ کر دیے۔ یہ کیسی دنیا ہے؟ بھلا لڑکیاں اسی لئے تعلیم حاصل کرنے آتی ہیں؟..... کتنی بدنامی ہے کہ تعلیمی اداروں

میں یہ دھندے ہوتے ہیں۔ اس عظیم تعلیمی ادارے کے تقدس کا خیال ہر طالب علم کو کرنا



چاہئے۔ اور آج کل تو یہ بات عام طور پر مشہور تھی کہ لوگ بیٹیوں کو مخلوط تعلیمی اداروں میں داخلہ اسی لئے دلاتے ہیں کہ اچھے رشتے مل سکیں۔ تو یہ قیامت نہیں تو اور کیا ہے؟“ مومو کال پیٹ لیتی۔



مریم کتنی ہی دیر سے شیشے کے کاؤنٹر پر جھکی نیچے پڑی خوب صورت گھڑیاں دیکھ رہی تھی۔ اب تک کتنی ہی گھڑیاں دیکھ چکی تھی، مگر اسے علی کے لئے کوئی گھڑی پسند نہ آرہی تھی۔ پروین سخت بور ہو رہی تھی۔ ایک تو وہ اس کے ساتھ آئی ہی مشکل سے تھی، جب مومو نے اس سے کہا تھا۔ ”پروین! میرے ساتھ زیب النساء اسٹریٹ تک تو چلو۔“

”کیوں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ کبھی کبھی مریم کو بازار گھومنے کا سودا سماتا تھا حالانکہ خریدتی کچھ نہیں تھی۔

”کل ایکشن ہیں، اور پھر علی بھائی کو کوئی گفٹ تو دینا ہی ہے۔“

”تمہیں یقین ہے کہ وہ جیت جائے گا؟“ پروین نے شوخی سے کہا۔

”ان شاء اللہ! اور دیکھنا، طلباء کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔“

”وہ تو خود مسائل پیدا کر رہا ہے۔“ پروین نے زیر لب کہا۔

”کیا مطلب؟“ مومو نے چونک کر پوچھا تھا۔

”کچھ نہیں!“ پروین مسکرا دی۔ اب وہ اُسے کیا بتاتی کہ میرے لئے تو اس کی ذہین

آنکھوں کے پیغام نے مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ دل کا مسئلہ۔ نہ جانے کیوں، میرا دل، سکندر علی

کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ کتنا میں نے خود کو سنبھالا، مگر دل تھا کہ پہلو سے نکلا جا رہا تھا۔

اور آخر نکل کر ہی دم لیا اس نے۔ میں بالکل خالی ہو گئی۔ مگر اس خالی پن میں بھی عجیب سی

لذت ہے۔ بیٹھی بیٹھی سکک بہت اچھی لگتی ہے۔ اور ویسے بھی محبت تو ایسا خود رو پودا ہے کہ

بغیر بیج کے اگتا ہے۔ مگر اس کی جڑوں نے بھی میرے دل و دماغ کو آکٹوپس کی طرح جکڑ

لیا ہے اور اس سے میں ہار گئی۔ اور محبت ویسے بھی کون سا اختیار جاذبہ ہے۔ مجھے بھی اختیار

نہ رہا۔ ایک لمحہ ایسا آیا کہ میں جذبات کے طوفان میں بہہ گئی اور ہار گئی۔ اس میں نہ علی کا

قصور ہے، نہ میرا۔ یہ تو دلوں کے معاملے ہیں، اور.....“

”پروین! یہ واضح کیسی رہے گی؟“ مریم نے اس کے جذبات سے بھرپور خیالات پر

آواز کا پتھر پھینک کر انہیں منتشر کر دیا۔

”آں..... ہاں..... ٹھیک ہے۔“ پروین نے سہٹا کر جواب دیا۔

”علی بھائی کی گوری کلائی پر یہ گولڈن چین کی گھڑی بہت اچھی لگے گی، ہے نا؟“ مریم

نے پوچھا۔

”ہاں..... بہت اچھی لگے گی۔“ پروین نے بظاہر بے پروائی سے کہا۔

”بھئی بیک کر دیجئے۔“ مومو نے کاؤنٹر کلرک سے کہا، پھر پروین سے بولی۔ ”تم کیا دو گی؟“

”وہی، جو وہ چاہتا ہے۔“ پروین نے دل ہی دل میں کہا۔

”تم نے بتایا نہیں۔“ مومو پوچھ کر ہی رہنا چاہتی تھی۔

”ضروری ہے کہ میں کوئی مادی شے خریدوں؟ ویسے بھی میرا اس سے ایسا کوئی رشتہ نہیں

کہ تحائف کا تبادلہ کروں۔“ پروین نے اپنی چھوٹی سی ناک سکڑ کر بے پروائی سے کہا۔

”تحائف دینے کے لئے رشتوں کا ہونا ضروری ہے؟“ مریم برا مان گئی۔ پروین نے

کوئی جواب نہ دیا۔ وہ شاپ سے نکلتی ہی رہی تھیں کہ مریم کو ایک آواز سنائی دی۔ کسی نے

شہد آگئیں لہجے میں پکارا۔

”مومو.....!“

وہ ایک دم ہلٹی۔ شاپ میں کئی مرد کھڑے تھے۔ کسی کی بھی توجہ اس کی طرف نہ تھی۔

کس نے پکارا تھا مجھے؟“ اس نے حیرت سے سوچا۔ پروین باہر جا چکی تھی۔

”تم رک کیوں گئیں؟“

”یوں لگے جیسے کسی نے مجھے پکارا ہو۔ تم نے سنی تھی آواز؟“ مریم اب تک حیران تھی۔

”میں نے تو نہیں سنا۔ تمہارے کان بج رہے ہیں۔“ پروین نے ہنس کر کہا۔

”نہیں پروین! لگتا ہے، وہ آواز میں پہلے بھی سن چکی ہوں۔ بہت محبت سے پکارا تھا

کسی نے۔ بڑا شہد آگئیں لہجہ تھا۔“

”یار چھوڑو۔ ہو گا کوئی تمہارا جاننے والا۔“ پروین اس ٹاپک سے بور ہو گئی تھی۔ ”چلو،

فالوہ کھائیں۔“

”اس قدر شہد نہیں؟“ مریم نے کپکپاتے ہوئے کہا۔

”کیا حرج ہے؟ تم چلو تو۔“ پروین بڑی مودت میں تھی آج۔ مریم نے بھی زیادہ بحث

مناسب نہ تھی اور آگے بڑھ گئی۔



دوسرے روز ایکشن ہوئے۔ طلباء نے زور و شور سے ایکشن میں حصہ لیا تھا۔ مومو اور

پروین نہ چاہتے ہوئے بھی تلی کے جمبورو کرنے پر پانچ بجے واپس آ گئی تھیں۔ حالانکہ مریم

نے کتنا کہا تھا۔

”علی بھائی! میں تو فیصلہ من کر جاؤں گی۔“

”مریم! تم سمجھا کر دنا۔ خدا نخواستہ کوئی ہنگامہ ہو گیا تو؟..... تم جاؤ، تمہیں اطلاع مل



جائے گی۔ ابھی تو ایس ٹی سی ہال میں کنتی ہوگی۔ نہ معلوم کتنا وقت لگ جائے۔“ علی نے سمجھانا چاہا۔

”ہاں۔ ابھی تم لوگ چلی جاؤ۔“ عاصم اور نوید نے بھی علی کی بات کی تائید کی۔

”جیسے ہی نتیجے کا اعلان ہوا، فوراً مجھے اطلاع دینا۔“ مریم نے عاصم سے کہا۔

”ہاں..... میں تمہیں فون کروں گا۔“ عاصم نے جلدی جلدی سے جواب دیا اور پھر وہ تینوں واپس آنے پر مجبور ہو گئیں۔

مریم نے پہلے باسمہ اور پروین کو ڈراپ کیا، پھر اپنے گھر آگئی۔ لمحہ لمحہ اُسے صدیوں پر محیط لگ رہا تھا۔ وہ کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں آگئی۔ کنتی دیر تک وہ رضیہ کے ساتھ کیرم کھیلتی رہی۔ آج تو کسی کھیل میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا اور نہ کوئی ٹی وی پروگرام مزا دے رہا تھا۔

دس بجے جب رضیہ اور شعیب خواب گاہ میں جانے لگے تو شعیب نے کہا۔

”مومو جان! اب تم بھی سو رہو۔“

”شعیب بھائی! آج مجھے نیند نہیں آئے گی۔“ مومو نے کہا۔

”وجہ؟“ شعیب پھر بیٹھ گیا۔

”آج الیکشن تھے نا۔ اور میں رزلٹ کی منتظر ہوں۔“

”آئی سی۔“ شعیب زور سے ہنس دیا۔ ”فرض کرو اگر تمہارا امیدوار نہ جیتا پھر؟“

”کیوں بری فال منہ سے نکالتے ہیں؟ اتنی تو ہم نے کنوینگ کی ہے اور پھر.....“

”جب انسان جیت کے لئے تیار رہتا ہے تو ہار کے لئے بھی خود کو تیار کرنا چاہئے۔“

رضیہ نے مومو کی بات کاٹ کر کہا۔

”علی بھائی ہار نہیں سکتے۔“ مومو نے وثوق سے کہا۔

”کوئی خاص وجہ؟“ شعیب نے شرارت سے پوچھا۔

”لڑکیاں اُس سے خاصی امپریس ہیں اور لڑکیوں نے انہیں بہت ووٹ دیئے ہیں۔“

ہمارے ٹینٹ میں بے تحاشا رش تھا۔“ وہ دلچسپی سے بتانے لگی۔

”ویسے مومو! مزا بہت آتا ہے الیکشن میں۔“ شعیب نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

”ہوں!“ مومو نے ہنکارا بھرا۔

”پتہ ہے رضیہ! کسی زمانے میں میرا بھی حال مومو جیسا ہوتا تھا۔ بالکل نیند نہیں آتی تھی۔“

الیکشن کے دنوں میں مجھے یاد ہے، رات میں بھی یونیورسٹی میں دن کی طرح چہل چہل رہتی اور جب ہمارا نماز سہرہ جیت جاتا تو ہم رات ہی کو شہر کا چکر لگا کر آتے۔ پچھلی رات کو

روڈ سنسان ہوتے ہیں، تب یونیورسٹی کے طلباء کی حکمرانی ہوتی تھی۔ کیا دن تھے وہ بھی۔“

شعیب کے لہجے میں پرانی یادوں کا خمار تھا۔

”کاش! میں بھی لڑکا ہوتی۔“ مومو کے لہجے میں حسرت نمایاں تھی۔

”اچھا۔“ شعیب اور رضیہ زور سے ہنس دیئے۔

تب ہی ٹیلی فون کی گھنٹی کی تیز آواز میں ان کی ہنسی کی آواز دب گئی۔ مومو تیر کی سی تیزی سے آگے بڑھی اور ریسیور اٹھا لیا۔

”عاصم بھائی! کیا رپورٹ ہے؟“ مریم کی پریشانی قابل دید تھی۔

”حسب توقع سکندر علی بھاری اکثریت سے جیت گیا ہے۔“ دوسری طرف سے عاصم نے کہا تھا۔

”یا خدا! تیرا شکر ہے۔“ مومو کی مارے تشکر کے آنکھیں بھیگ گئیں۔

”علی کو تو لڑکوں نے گھیر رکھا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ فوراً مریم کو اطلاع دے دو۔“

وہ شدت سے منتظر ہوگی اور میں فوراً ہاسٹل آگیا، تمہیں اطلاع دینے۔ اب باقی باتیں کل

ہوں گی۔“ عاصم نے اس کا جواب سنے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔ مریم نے ریسیور کرپٹل پر

رکھا اور مارے خوشی کے رضیہ سے لپٹ گئی۔

”دیکھا بھابی! میں نے کہا نہیں تھا، علی بھائی جیت جائیں گے؟ میں نے پورے سو نقل

مانے تھے، اُن کی کامیابی کے لئے۔“ وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر بتا رہی تھی۔

”تمہیں اُس سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟“ رضیہ کا لہجہ ذومعنی تھا۔

”بس، وہ بہت اچھا ہے بھابی جی! بہت ہی۔“ مومو کو علی کی صفات بیان کرنے کے

لئے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

”بچ کے رہنا۔ یہ لڑکے کچھ سے کچھ سمجھ لیتے ہیں۔“ رضیہ نے شوخی سے کہا۔

”نہیں بھابی جی! علی واقعی مجھے بالکل اس طرح چاہتا ہے، جیسے بہنوں کو چاہا جاتا ہے۔“

مجھے شعیب بھائی اور اس کی محبت میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ آپ بے تکے خیال دل سے

نکال دیں۔“ مومو نے نہایت رمان سے کہا۔

”میں جیلز ہونے لگا ہوں علی سے۔“ شعیب نے سگریٹ کاش لیتے ہوئے کہا۔

”میں بتاؤں گی انہیں۔“ مومو نے شعیب کے کندھے پر سر رکھ دیا اور پھر بولی۔

”شعیب بھائی! آپ میری ایک بات مانیں گے؟“

”ایک کیا، دس باتیں منوالو۔“ شعیب نے محبت سے کہا۔

”میں چاہتی ہوں کہ الیکشن میں جیتنے والے پورے پینل کو شان دار پارٹی دی جائے۔“

آپ کا کیا خیال ہے؟“

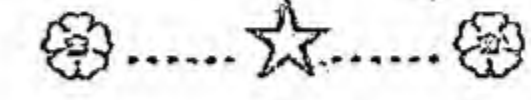
”جیسا تم مناسب سمجھو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ شعیب نے کہا۔



”آپ کتنے اچھے ہیں شعیب بھائی!“ مومو نے مسرت سے شعیب کے گلے میں بازو جھانک کر دیئے۔ تب اُس نے مومو کی پیشانی چوم لی اور بولا۔

”تم ان سے وقت لے لینا، گھر ہی میں ارنج کریں گے پارٹی۔“ بالکل ٹھیک ہے۔“ وہ بولی۔

”چلو، اب سو جاؤ۔ ایک رنج گیا ہے۔“ شعیب نے کہا تو مومو اور رضیہ کو بھی وقت کے زیاں کا احساس ہوا۔ پھر وہ تینوں ڈرائنگ روم سے نکل آئے۔



صبح ہوتے ہی اس نے اُلٹا سیدھا ناشتہ کیا اور پروین کے گھر پہنچ گئی۔ جاتے ہی وہ پروین سے لپٹ گئی اور کہا۔

”تمہیں پتہ چل گیا نا؟“

”ہاں، علی جیت گیا ہے۔“ پروین نے اُس کی بات کاٹ کر جلدی سے کہا۔ اُس کے گالوں پر گلال لہریں لے رہا تھا۔

”تمہیں کیسے پتہ چلا؟“ مریم کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ وہ تو سوچ رہی تھی کہ وہ خود یہ خبر سنائے گی اسے۔

”صبح کے اخبار میں اس کی بڑی ہی تصویر چھپی ہے۔“

”مجھے تو رات ہی عاصم نے بتا دیا تھا۔“ مریم نے اپنی بڑائی جتائی۔

”مجھے نہیں بتا سکتی تھیں تم؟“ پروین نے شکوہ کیا۔

”تم مجھ جیسی بے قرار تو نہیں تھیں۔“

پروین خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اب تمہیں کیا علم، مریم! کہ میں تم سے بھی زیادہ بے قرار تھی۔ ہر سانس کے ساتھ علی کی کامیابی کے لئے دعائیں کر رہی تھی۔ جب

دل کی دنیا بدلتی ہے تو خیالات اور دعائیں بھی بدل جاتی ہیں۔“

”میں نے پورا ٹوکرا پھولوں کا منگوایا ہے۔“

”اچھا!“ پروین نے حیرت اور خوشی کے بے پلے جملے جذبات کے ساتھ کہا۔

پھر جب وہ یونیورسٹی پہنچیں تو عجیب ہال تھا۔ چہرے خوشی سے کھلے ہوئے تھے۔ سب ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے۔ پوائنٹس کی بیس آ کر رکیں تو نعروں سے

یونیورسٹی گونج اٹھی۔ لاتعداد پرچم بسوں کی کھڑکیوں سے باہر لہرا رہے تھے، بسوں پر پارٹی کے پرچم لگائے گئے تھے۔ پارہ بچے جا کر کہیں مومو کی بڑی مشکل سے علی سے ملاقات ہوئی

اور وہ اپنے حالی لڑکوں میں گلاب کے ہاروں سے لہرا کھرا ہوا تھا۔ خوشی اُس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اتنی محبتیں پا کر اُس کا دل پگھلا جا رہا تھا۔

مریم نے اپنے پرس میں سے کاجل نکالا، اُسے انگلی پر گھسا اور لڑکوں کے جم غفیر کی طرف بڑھی۔

”جیسے راستہ دیں نا۔“ وہ منمنائی۔ علی نے اُسے دیکھ لیا تھا۔

”بھئی میری بہن کو راستہ دو۔“ وہ یہ کہتا ہوا خود بھی آگے بڑھا تو مریم نے اس کی ٹھوڑی کے کڑھے میں وہی سیاہی لگا دی۔

”علی بھائی! آپ بہت اچھے لگ رہے ہیں نا۔ میں نے سوچا، کہیں نظر نہ لگ جائے۔“ اُس کا رداں رداں علی کی محبتوں کی آبشار سے بھگکا ہوا تھا۔

”بہنوں کی نظر نہیں لگتی۔“ سکندر علی کی آنکھیں شدت جذبات سے بھیگ گئیں۔ کس قدر چاہتی ہے مجھے یہ لڑکی۔ اگر میری اپنی بہن ہوتی تو کیا وہ بھی مجھے اس قدر چاہتی؟“ وہ سوچ کر رہ گیا۔

”علی بھائی! لڑکیاں کب سے منتظر ہیں آپ کی آمد کی۔ تاکہ آپ کو مبارک باد دے سکیں۔ اس شاندار کامیابی میں لڑکیوں کا بہت ہاتھ ہے۔“ وہ شوخی سے بولی۔

”یعنی ہم نے کچھ نہیں کیا۔“ نوید چخ کر بولا۔

”کیا ہے۔ کیوں نہیں کیا۔ مگر زیادہ ووٹ لڑکیوں نے دیئے ہیں۔“ مریم نے نہایت مصحوبیت سے کہا۔

”چلو مریم!“ علی نے جلدی سے کہا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں مریم وہی باتیں نہ دہرائے، جو باسہ کی بات کے جواب میں کہی تھیں۔

باسہ، زینت نے آگے بڑھ کر علی کو ہار پہنائے، جبکہ پروین قریب ہی کھڑی دوپٹے انگلی پر لپیٹی رہی۔

”یہ کالک کس نے لگا دی؟“ تسنیم نے حیرت سے علی سے پوچھا تو پروین نے چونک کر علی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اُسی کو دیکھ رہا تھا اور ذہین علی نے پروین کی آنکھوں کی عبارت پڑھ لی۔ وہ سرشار ہو گیا، محمور و مسحور ہو گیا۔ پروین کے والہانہ پن نے علی کے دل میں گلاب مہکا دیئے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو نظروں کے راستے دل میں اتار

رہے تھے۔ اور مریم، تسنیم کو علی کی ٹھوڑی میں تلک لگانے کی وجہ بتا رہی تھی۔

”پتہ ہے، اس طرح نظر نہیں لگتی۔“

”یار! کیا دقیانوسی باتیں ہیں۔“ باسہ چخ کر بولی۔

”نظر لگتی ہے تو پھر پتھر کو بھی شق کر سکتی ہے۔ نظر سے دل پھٹ جاتے ہیں۔ تمہیں کیا معلوم؟“ مریم نے کہا۔

”تمہیں ہی معلوم ہے تو بہت ہے۔“ تسنیم نے غصے سے کہا۔ ”علی! تم یہ صاف کر



دو۔ اس نے علی سے کہا تو وہ ایک دم چونک گیا اور بولا۔

”کیا.....؟“

”بھئی یہ تلک ہٹا دیں۔“

”مریم کی خواہش ہے کہ یہ تلک لگا رہے۔“ علی نے مسکرا کر کہا۔

”بس؟“ مریم نے انہیں چوایا۔

”عجیب ہیں آپ بھی۔ ایسی باتوں پر اعتبار کرتے ہیں۔“ تسنیم نے غیرت دلائی۔

”ہاں تسنیم! میری ماں بھی جب میں اُسے بہت اچھا لگتا ہوں تو ایسا ہی تلک میری پیشانی پر لگا دیتی ہے۔“ علی نے اسے بتایا۔

”یہاں تو آدے کا آدہ ہی بگڑا ہوا ہے۔“ زینت نے کہا تو سب ہنس دیئے۔

”تمہاری کیا رائے ہے؟“ علی نے اچانک ہی پروین سے سوال کر دیا۔

”مریم نے جو کیا، اچھا کیا۔“ پروین نے دھیرے سے کہا۔ اس کے گالوں پر اندرونی محبتوں کا عکس پھیلا ہوا تھا اور اس سے علی کو وہ ہمیشہ کی طرح بہت ہی پیاری لگی۔ دل میں اُترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پل کے پل میں کتنا بڑا انقلاب آیا تھا۔ علی ایک ساتھ دو کامیابیوں سے ہم کنار ہوا تھا۔ ایک انکیشن میں کامیابی، دوسری پروین کی محبت۔ وہ سرشار سا عاصم اور نوید کے ساتھ آگے بڑھ گیا کیونکہ کامیابی کی خوشی میں انگلش ڈیپارٹمنٹ کے لان میں جلسہ تھا اور علی نے خطاب کرنا تھا۔ علی کا دل ہمک ہمک کر اپنی کامیابی پر مریم کو مبارک باد دے رہا تھا۔ اُس کا دل پروین کے نام کی مدھرتانوں پر رقص کر رہا تھا اور علی مدھوش ہوا جا رہا تھا۔

☆.....☆

شعیب علی کی کوشی بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ شعیب نے یونیورسٹی کے جیتنے والے پینل کی کامیابی کی خوشی میں مومو کی خواہش پر اعلیٰ پیمانے پر پارٹی کا انتظام کیا تھا۔ گلاب اور چنبیلی کی بیلوں میں سرچ لائیں اس طرح لگائی گئی تھیں کہ سارا سبزہ رنگ برنگی سرچ لائیں کا منج لگ رہا تھا۔ پھولوں کے تختے مست پروا کی اٹھیلیوں سے جھومتے ہوئے نہایت بھلے لگ رہے تھے۔

مومو اور شعیب مہمانوں کا استقبال کرنے کے لئے گیٹ پر کھڑے تھے، جبکہ رضیہ اپنی بھابی عروسہ کے ساتھ کھانوں کا آخری مرتبہ جائزہ لے رہی تھی۔ شعیب نے اپنے دوستوں کو بھی مدعو کیا تھا۔ سب سب کے مل بیٹھنے کا سامان تھا۔

مہمان آرہے تھے۔ پھر علی بھی آگیا۔ وہ اپنے دوستوں اور عہدے داروں کے ساتھ آیا تھا۔

”شعیب بھائی! آگئے علی بھائی۔“ مومو ہلبل کی طرح چبکی۔

تب ہی وہ لوگ قریب آگئے۔

”اتنی دیر؟“ مومو نے چھوٹے ہی کہا۔

”سچ، وقت پر آیا ہوں۔ تم نے سات بجے کہا تھا۔“ علی نے کلائی کی گھڑی اس کی طرف کر دی، جہاں پورے سات بجے تھے۔

”بھئی انتظار کیا جائے تو لگتا ہے صدیاں گزر گئی ہیں۔“ شعیب نے ہنس کر کہا۔

”مومو! بھئی تعارف کراؤ نا۔“

”اوہو!“ مریم کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ پھر اس نے ان کا تعارف کرایا۔ اس مرحلے سے فارغ ہو کر وہ انہیں لے کر آگے بڑھ گئی۔

”آپ خالہ جان اور آمنہ کو لے کر نہیں آئے؟“ مریم نے علی سے پوچھا۔

”میں یونیورسٹی سے آرہا ہوں۔“ علی نے جواز پیش کیا۔

”نہیں، آپ فوراً جا کر لے آئیں۔“ مریم ٹھٹھک کر بولی۔ ”یایوں کریں، عاصم بھائی چلے جائیں، ڈرائیور کے ساتھ۔“

”چھوڑ دو۔“ علی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”بالکل نہیں۔ آئیں عاصم بھائی!“ مومو نے کہا اور پھر اس نے عاصم کو ڈرائیور کے ساتھ آمنہ کو لالی کو لینے بھیج دیا اور خود شعیب کے پاس گیٹ پر آکھڑی ہوئی۔ تب ہی صفدر علی، عابدہ اور پروین آگئے۔ شعیب کو سامنے پا کر تینوں کو اچنچھا سا ہوا۔

”شعیبی لالہ!“ پروین نے حیرت اور خوشی سے چیخنے کے سے انداز میں کہا۔

”شعیب!“ صفدر علی کے لب کپکپائے۔

”واہ صفدر بھائی! اتنی حیرت سے کیا دیکھ رہے ہیں؟ بھول گئے کیا؟“ شعیب آگے بڑھا، صفدر سے لپٹ گیا۔ اتنے عرصے بعد بھائی سے مل کر اس کی آنکھیں جھپک گئیں۔

”تُو بہت خراب ہے شعیبی! اتنے عرصے سے جدا ہوا ہے۔ بابا سے اپنی زیادتی کی معافی کیوں نہیں مانگ لیتا؟“ صفدر نے شعیب کی پیٹھ سہلاتے ہوئے شکوہ کیا۔

”صفدر بھائی! یہ کسی صورت ممکن نہیں کہ میں اُن سے معافی مانگوں۔ قصور میرا نہیں، خطا دار وہ ہیں۔“ شعیب ان سے علیحدہ ہوتا ہوا بولا۔ پھر قریب کھڑی پروین کو لپٹا لیا۔ وہ اُس کے سینے سے لگ کر پلک پڑی۔

”میک آپ خراب ہو جائے گا پیو!“ شعیب نے شرارت سے کہا تو وہ ہنس دی۔

”آداب بھائی!“ شعیب نے عابدہ کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ”نور بھئی! ابھی تک تین نہیں بنے آپ لوگ، کیا بات ہے؟“

”بن گئے ہیں تین بھی۔ بیٹی ہے ایک۔ آیا کے پاس چھوڑ آئے ہیں۔“ صفدر اس کی



شرارت سے محفوظ ہوتے ہوئے بولا۔

”لے ہی آتے۔ میرا بیٹا خوش ہو جاتا۔“ شعیب کا لہجہ ذمہ داری تھا۔

”کیوں خوش ہوتا؟“ عابدہ نے حیرت سے پوچھا۔

”پھر بتاؤں گا۔“ شعیب نے صغیر کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”میری بیوی سے تو ملیں۔“ شعیب انہیں لے کر آگے بڑھ گیا اور مریم مہمانوں میں آگئی۔ ایک دم اس کے دل پر اداسیاں رُوئی کے گالوں کی مانند گرنے لگی تھیں۔ بار بار خیال آ رہا تھا۔

شعیب بھائی! اپنوں کے ملتے ہی مجھے بھول گئے؟ یہ جو اتنی محبت کرتے ہیں، فریب ہے، دھوکا ہے، بناوٹ ہے، ڈھونگ ہے۔

”کیا سوچ رہی ہو مریم؟“ علی اس کے قریب آ گیا۔

”کچھ نہیں، علی بھائی! بس تھکن سی محسوس ہو رہی تھی۔“ وہ خواہ مخواہ ہنس دی۔ اسے خود اپنی ہنسی کھوکھلی سی لگ رہی تھی، آنکھوں کی کوروں پہ آنسو رک گئے تھے۔

”مریم! مجھے بتاؤ، تم کیوں اُداس ہو؟“ نہ جانے کیوں، علی کو مریم کی اُداسی شاق گزر رہی تھی۔

”دیکھئے، لوگ کیا کہیں گے؟ آپ دوستوں کے پاس بیٹھیں۔“ اس نے علی سے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا۔ تب ہی باسمہ اُن کی طرف آگئی۔

”سنو مریم! وہ پروین نہیں آئی؟“

”آئی ہے۔“ مریم نے ہولے سے کہا۔

”کہاں ہے؟“ علی چاروں طرف دیکھتا ہوا بے چینی سے بولا۔

”اندر ہے۔ میرے بہنوئی اس کے چھتی بھائی ہیں۔ اتنے برسوں بعد ملے ہیں۔“ مریم نے مختصر اُبتایا۔

”اچھا تو کیا والدین کی مرضی کے خلاف تمہاری باجی سے شادی کی تھی؟“ باسمہ نے پوچھا۔

”ہاں ایسی ہی بات تھی۔ اب یہ لوگ برسوں سے شعیب بھائی سے نہیں ملتے۔“ مریم نے ہولے سے کہا۔

”مریم! تمہیں شعیب بلا رہا ہے۔“ سرور نے آکر کہا تو وہ علی اور باسمہ سے معذرت کرتی ہوئی اندر آگئی۔

”تم کہاں تائب ہو گئی تھیں؟“ شعیب نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

”میں نے سوچا، آپ اپنوں سے اچھی طرح مل لیں۔“ مومو نے بظاہر ہنستے ہوئے کہا مگر اپنے لہجے کی گچی چھپانہ سکی۔ مومو کا جملہ شعیب کے دل پر برچسبی بن کر لگا۔ وہ مومو کی

رگ رگ سے واقف تھا۔ بچپن سے مٹیوں کے نقشہ بچے صرف یہی چاہتے ہیں کہ جو انہیں چاہتا ہو، وہ کسی اور کو نہ چاہے۔ اور شعیب کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ مومو کو کہیں محرومی کا احساس نہ ہو۔ آج انجامنے میں ایسا ہو گیا تھا اور وہ اپنے آپ سے بھی شرمندہ تھا۔

”چلیں صغیر بھائی! مہمان کہیں گے کہ میزبان غائب ہو گئے۔“ شعیب نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ باہر جانے لگے۔ مومو نے بھی قدم بڑھایا۔ مگر شعیب نے سب کی نظر بچا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ عابدہ، صغیر اور پروین، رضیہ کے ساتھ باہر چلے گئے تو شعیب نے مومو کی طرف دیکھا، جو بری طرح ہونٹ چبا رہی تھی۔ اس کے دل کی بے قراری اُس کی ظاہری حالت سے عیاں تھی۔

”ناراض ہو مجھ سے؟“ شعیب نے مسکرا کر پوچھا۔

”جی نہیں!“ اس نے سر کو متنی جنبش دی۔

”پھر منہ کیوں پھولا ہوا ہے؟“ شعیب نے اس کی گردن میں بازو جھانک کر دیئے تو وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

”مومو جان! مجھے پتہ ہے، تم مجھ سے ناراض ہو۔ مگر جانی! بعض مرتبہ مصلحت کی خاطر خاموش ہونا پڑتا ہے۔ اگر میں صغیر بھائی اور پروین کے سامنے تم سے بہت محبت سے پیش آؤں گا تو وہ شک کریں گے۔ ہمارے ہاں سالیوں سے زیادہ قربت پسند نہیں کی جاتی۔“

”مگر میں آپ کی سالی نہیں ہوں۔“ وہ چیخ کر بولی۔

”یہ سچ ہے۔ مگر انہیں تو یہی بتایا ہے کہ تم رضیہ کی چھوٹی بہن ہو۔ میری بہنا! اگر مجھ سے کوئی کوتاہی ہو جایا کرے تو معاف کر دیا کرو۔ اور اب تو ایسا ہوتا ہی رہے گا۔“ شعیب نے ہولے سے کہا۔

”اچھا ہوتا، میں یہ دعوت نہ کرتی یا آپ منع کر دیتے۔“ مومو نے منہ پھلا کر کہا۔

”نہیں مومو! یہ بہتر ہے۔ میں حالات سازگار ہوتے ہی صغیر بھائی کو تمہارے بارے میں بتا دوں گا، تم فکر نہ کرو۔ پھر ہم کوئی حل نکال لیں گے کہ ”رنگ گل“ میں تم چاچا شوکی کی بیٹی کی حیثیت سے جاؤ۔ آخر کب تک یونہی اپنوں سے میں اور تم کٹ کر رہیں گے؟“

شعیب نے سمجھانا چاہا۔

”مجھے شوق نہیں ہے وہاں جانے کا۔“ مومو ترخ کر بولی۔

”تمہارے بابا جانی چاہتے ہیں کہ تم وہاں ضرور جاؤ۔“ شعیب نے اسے یاد دلایا۔

”بابا جانی تو انہوں نے بات کو ہلکا کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ بات کسی صورت ممکن نہیں۔“

”کیا ممکن ہے اور کیا ناممکن، یہ ہمیں سوچنا ہے، تمہیں نہیں۔ تم اپنے اس چھوٹے سے

دماغ پر زور نہ دیا کرو۔“ شعیب نے ہنستے ہوئے اس کا سر ہلایا۔



”پھر بھی.....“ مومو نے کہنا چاہا، مگر شعیب اس کی بات کاٹ کر رعب سے بولا۔  
 ”بس، میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ جاؤ، منہ دھو لو اور فوراً باہر آ جاؤ۔ اپنی اتنی پیاری صورت کا رو رو کر بیڑا غرق کر لیا ہے۔ جلدی آؤ۔“ شعیب باہر چلا گیا اور پھر چند لمحے بعد مومو مہمانوں میں بلبل کی طرح چمکتی پھر رہی تھی۔ شعیب کی محبت نے اس کے سینے پر رکھی ادا سیوں کی بھاری سِل اُتار دی تھی اور وہ اپنی پرانی جون میں آگئی تھی۔

عاصم، لالی اور آمنہ کو لے آیا تھا۔ لالی نے مومو کو لپٹا کر پیار کیا۔ تب ہی مومو کی نظر علی پر پڑی، جو آنکھوں میں قدیلیں روشن کئے ایک ہی جانب دیکھے جا رہا تھا۔ مومو نے اس کی نظروں کے زاویے کی سمت دیکھا تو حسب توقع علی، پروین کو دالہا نہ نظروں سے تک رہا تھا اور مومو نے محسوس کیا کہ دُور باسہ اور تسنیم کے درمیان پروین اس ادا سے بیٹھی تھی کہ پوری کی پوری علی کی نظروں کے حصار میں تھی۔ مومو مسکراتی ہوئی علی کے قریب گئی اور اس پر تقریباً جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

”اُنہوں، علی بھائی!“

”اوہ!“ علی سٹپٹا گیا۔

”میں نے آپ کو پہلے بھی منع کیا تھا، یہاں دال گئے والی نہیں ہے۔“

”اب تو دال گل چکی۔“ علی بھرپور طریقے سے مسکرایا۔

”واقعی؟“ مومو مزید جھکی تو اس کے سیاہ بالوں کی لمبی سی چوٹی، علی کی گود میں آ رہی۔

”میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔“ علی نے دیر سے کہا۔

”نہیں۔“ مریم کپکپا کر رہ گئی۔

”کیا یہ ممکن نہیں، بھئی اس نے تمہارے گہرو بھائی کو قبول کر لیا ہے۔“ علی نے

اکشاف کیا۔

”مگر..... اس کی تو ممکن ہو چکی ہے۔“ مریم نے کہا تو علی کا دل ایک لمحے کو کانپ

گیا، اس کی آنکھوں میں جلتی قدیلیں لرزنے لگیں۔ مگر علی نے خود پر قابو پالیا اور تھوک نگتے

ہوئے بولا۔

”ممکن ہوئی ہے، نکاح تو نہیں ہوا۔ مریم! اگر ہمارے جذبے سچے ہیں، ان میں رتی

بھر بھی صداقت ہے تو ہم ایک دوسرے کو پالیں گے۔ یہ میرا خود سے عہد ہے۔ اس محبت

سے وعدہ ہے، جو مجھے پروین سے ہے۔“ علی اپنے دل کی تمام تر شدتوں سے کہہ رہا تھا اور

اس کی نظریں بلیو سوٹ میں بیویوں پروین پر لگی ہوئی تھیں۔

”خیر، بعد میں بات ہوگی۔“ مومو ہنستے ہوئے سیدھی کھڑی ہو گئی۔ فی الحال اتنا بتا دوں

کہ اپنی نظروں کے زاویے درست کریں۔ اس کے دودھ بھائی یہاں موجود ہیں۔“

”اچھا ہے، انہیں بھی پتہ چل جائے کہ یہاں بھی امیدوار موجود ہے۔“ علی نے بھی ہنستے ہوئے کہا تو رضیہ اس کے نزدیک آئی۔

”مومو! ادھر آؤ۔“ رضیہ کے لہجے میں تحکم تھا۔ پھر وہ اسے پھولوں کے کنج کے قریب

لے گئی اور سمجھانے والے انداز میں بولی۔

”مومو! کچھ عقل کرو۔“

”کیا ہوا بھابی؟“ وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔

”علی سے اس قدر بے تکلفی اچھی نہیں ہے۔“

”اوہ بھابی! میں کیسے سمجھاؤں آپ کو، وہ مجھے بالکل بھائیوں کی طرح پیارا ہے، جیسے

اشو..... اور میرا اُن دیکھا جڑواں بھائی۔“ مومو کی آواز بھڑا گئی۔

”یہ درست ہے۔ تم تو اس انداز سے اسے چاہتی ہو۔ لیکن لوگ کیا سمجھیں گے؟“

”کچھ بھی سمجھیں، ہم کسی کی سوچ پر پھرے تو نہیں لگا سکتے؟“ مومو نے بے پروائی

سے کہا۔

”دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔“ رضیہ نے اُسے سمجھانا چاہا۔

”کیا چاہتی ہیں آپ؟“ مومو نے زنج ہو کر پوچھا۔

”بہی کہ اب تم علی کے اس قدر قریب نہیں جاؤ گی۔ صندر بھائی اور عابدہ بھابی کیا

سوچیں گے؟ اور دوسرے مہمان“ رضیہ کا لہجہ سخت تھا۔

”تو ٹھیک ہے، میں اپنے کمرے میں چلی جاتی ہوں۔“ آنسو مومو کی پلکوں پر ٹپک

گئے۔

”اوہو، مومو! تمہیں کس طرح سمجھاؤں؟“ رضیہ نے اُسے لپٹا لیا۔ ”جان! سمجھو نا۔“

”بہتر۔ جو آپ کہیں گی، میں مانوں گی۔“ مومو نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں صاف

کیں اور خود کو رضیہ کی بانہوں سے چھڑا لیا۔

پھر کھانے کے بعد رات گئے تک ہنگامہ رہا۔ لڑکوں نے خوب گانے گائے۔ لگتا تھا، فتح

کا جشن آج ہی منایا جا رہا ہے۔ پھر سب علی کے پیچھے پڑ گئے۔

”گانا سناؤ!“

”یاد نہیں آ رہا۔“ وہ بولا۔

”گنگنائے تو ہو۔“ عاصم بولا

”پاتھ روڈ منگر تو ہر کوئی ہوتا ہے۔“ علی نے کہا تو ایک زبردست تہتہ پڑا۔

”مریم! تم کہو، جیسی گائے گا علی۔“ عاصم نے کہا۔

تب مومو نے جلدی سے قریب بیٹھی رضیہ کی طرف دیکھا۔ رضیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔



”ہاں بھئی، علی سے کہو۔ سنا ہے بہت اچھا مقرر ہے۔ ہر خوبی ہے اس میں، شاید گانے کی خوبی بھی ہو۔“

”امتحان لے رہی ہیں آپ؟“ علی نے شرارت سے کہا۔  
”بھی سمجھ لو۔“

”اور اگر اس امتحان میں، میں پاس ہو گیا، پھر؟“

”ایک شاندار ٹریٹ۔“ شعیب نے جلدی سے کہا۔ تب علی کا جی چاہا کہہ دے۔

”میں ٹریٹ نہیں، تحفہ لوں گا اور وہ بھی پروین کی صورت میں۔ کیونکہ اس سے بہتر تحفہ میرے لئے کوئی نہیں ہو سکتا۔“ مگر وہ خاموش رہا۔ زبان سے دل کی بات کہہ کر جوتے تو نہیں کھانے تھے۔ پھر اس نے ایک بہت ہی خوب صورت پنجابی گیت سنایا۔

کیوں دور دور رہندے او حضور میرے کولوں

میںوں دس دیو ہویا کیہ قصور میرے کولوں

واقعی وہ ہر فن مولا تھا۔ اُس کی آواز بڑی سُریلی تھی، بہت لوج تھا۔ یوں لگ رہا تھا،

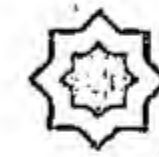
واقعی کوئی گلوکار ہی گا رہا ہو۔ اُس کی گائیکی سب کو مدہوش کر رہی تھی۔

جب اس نے گانا ختم کیا تو کتنی ہی دیر تک سب تالیاں پیٹتے رہے۔

اور رات گئے یہ خوب صورت تقریب اختتام کو پہنچی۔ مومو جب مہمانوں کو رخصت

کرنے کے بعد اپنے کمرے میں آئی تو مارے تھکن کے چور ہو چکی تھی۔ لباس تبدیل کئے

بغیر ہی وہ بستر پر گر گئی اور چند لمحوں بعد اُس کا تھکن سے چور وجود نیند کی آغوش میں چلا گیا۔



مومو کو پتہ بھی نہ چلا کہ پروین اور علی اتنے نزدیک آ گئے کہ ایک دوسرے سے دُوری کا تصور بھی سوہان روح بن گیا۔ مومو بعض مرتبہ حیران ہو کر سوچتی، یا خدا! یہ کس طرح ہو گیا؟ میں تو پروین کے ساتھ ہر لمحے سائے کی طرح رہتی ہوں۔ پھر کس طرح وہ علی کے اتنے قریب آ گئی؟ اُسے بہت دکھ تھا پروین کی اس حرکت پر۔ وہ اس کے خاندان کی عزت تھی اور نہ جانے کیوں، مومو کو اپنے خاندان کی عزت بہت پیاری تھی۔ حالانکہ چاہئے تو یہ تھا کہ پروین کے باپ چودھری طالب علی نے جو مظالم ان باپ بیٹی پر اب تک روا رکھے تھے، ان کی روشنی میں مومو، پروین کو خوب بھڑکائی، بلکہ خود اسے علی کے قریب کر دیتی۔ مگر وہ کم ظرف نہیں تھی، اپنے دشمن پر انجانے میں وار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح مقدر کی قائل تھی۔ آخر اس نے پروین کو سمجھانے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ دونوں کتابیں ایشو کروانے کے لئے لائبریری جا رہی تھیں کہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مومو نے کہا۔

”پروین! میں تمہارے اندر پگھلتے ہوئے جذباتوں کی تپش شدت سے محسوس کر رہی ہوں۔“

”اچھا! وہ ہنسی۔ آج کل ہنسی اُس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

”تم میری بہت اچھی دوست ہو، میں تمہیں بہنوں کی طرح چاہتی ہوں۔ اور پھر ہمارا

بہت قریبی رشتہ بھی ہے شعیب بھائی کے ناتے۔ اور میں نہیں چاہتی کہ تم غلط راستے پر چلو۔“

مریم نے آہستہ آہستہ گول مول الفاظ میں اُسے جتا دیا کہ وہ علی اور اس کی دلچسپی کے بارے

میں سب جانتی ہے۔ تب پروین پلنگ سے ٹک کر کھڑی ہو گئی اور پیشانی پر آئے بالوں کو

ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے بولی۔

”اگر تم سمجھ ہی گئی ہو تو کچھ مت کہنا۔“

”کیوں؟“ مریم کی آواز چیخ سے مشابہ تھی۔

”ہر سوال کا جواب دینا میں پسند نہیں کرتی۔ بعض باتیں صرف محسوس کی جاسکتی ہیں۔“



پروین کا لہجہ نہایت ترش تھا۔

”تم معین علی کی امانت ہو۔ اور مجھے علم ہے کہ تمہارا باپ تمہاری اس لغزش کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ شعیب بھائی لڑکے ہیں، انہوں نے شعیب بھائی کو برسوں گزر جانے کے باوجود معاف نہیں کیا۔ رضیہ کو قبول نہیں کیا تو علی کو کیسے قبول کریں گے؟“

”وہ علی کو قبول کریں یا نہ کریں، یہ ان کا معاملہ ہے۔ میں نے اور میرے دل نے علی کو اپنا لیا ہے اور مریم! میں کسی طور پر بھی پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔“ پروین کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔

”پیچھے ہٹنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ تم خود میں ہمت پیدا کرو۔“

”تمہیں علم نہیں مریم! کہ میں نے اس پیش قدمی کے لئے خود کو بڑی مشکل سے تیار کیا۔ میں علی کے جذباتوں کے سامنے جھک گئی، ہار گئی۔ اور اس ہار نے بھی مجھے ایک نئے احساس سے روشناس کرایا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ علی نے پہلے ہی روز میرے دل پر دستک دی تھی اور وہ مسلسل ایک برس تک دستک دیتا رہا۔ مگر میں نے اپنے دل کے پٹ مضبوطی سے بند کر لئے۔ حالانکہ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس کی دستک کا جواب دوں اور مریم! اگر پتھر پر بھی مسلسل پانی کی بوندیں گریں تو اس میں بھی گڑھا پڑ جاتا ہے، میرا تو پتھر گوشت پوست کا تھا اور میں نے علی کی مسلسل دستکوں کے جواب میں یہ پٹ کھول دیئے۔

”اب پھر وہ پٹ بند کر دو۔“ مریم نے مشورہ دیا۔

”میں ایسا نہیں کر سکتی۔ اور اگر بقول تمہارے، اپنے خاندان کی عزت کے لئے ایسا کر بھی لوں تو وہ میرے دل میں ایسی جگہ بیٹھا ہے، جہاں سے وہ باہر نہیں جاسکتا۔ میرے دل کے ہر خانے میں اس کی تصویر ہے۔ میرے دل کے آگن میں اس کی محبت کے پھول کھلے ہیں مریم! اور..... اور ہر گز رتا پل ان پھولوں کے رنگ گہرے کرتا جا رہا ہے۔“

”پھر معین علی کا کیا ہو گا؟“ مریم کی آنکھوں میں خلوص کی چمک تھی۔

”معین علی کی کسی بات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ مجھے چاہتا ہے۔ اس کے خواب بھی میری پلکوں کی منڈیوں پر دیوں کی مانند روشن نہیں ہوئے۔ اُس کی قربت میرے دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش پیدا نہیں کرتی اور نہ ہی اس کی باتیں میرے دل کے سمندر میں ہلچل مچاتی ہیں۔ مریم! لطف تو دھڑکنوں کے تبادلے میں آتا ہے۔“

”کیا خبر، علی بھائی تم سے کھیل رہے ہوں۔ جیسا عموماً نوجوان محبت کا کھیل کھیلتے ہیں، پھر بدنامیاں تمہارا مقدر بن جائیں گی۔“ مریم اس کی بات کاٹ کر بولی۔

”تم علی کو بھائی کہتی ہو اور مجھے اس کے خلاف بھڑکا بھی رہی ہو۔“ پروین نے ہنس کر

چوٹ کی تو مریم بغیر برا مانے بولی۔

”ہاں، وہ میرا بھائی ہے۔ مگر وہ ایک مرد بھی ہے۔ اندر سے ہر مرد ایک سا ہوتا ہے۔ آگ ہوتا ہے، جو پھول جیسی لڑکیوں کو جلا کر رکھ دیتا ہے۔ مرد کتنا بھی برا ہو، کچھ بھی کرتا پھرے، وہ پھر بھی پاک صاف، نواں نکور رہتا ہے۔ عورت کے ذرا قدم لڑکھڑا جائیں تو مرد اسے سنگسار کرنے سے نہیں چوکتا۔ حالانکہ جب عورت سے لغزش ہوتی ہے تو اس کی لغزش میں مرد بھی برابر کا شریک ہوتا ہے۔ پھر گھائے میں عورت کیوں رہتی ہے؟ سزا عورت کو ملتی ہے۔ یہ بھی سوچا تم نے؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی مریم کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

”میں کچھ سننا نہیں چاہتی مریم!“ پروین نے ہاتھ اٹھا کر ناگواری سے کہا۔ حالانکہ مریم کی باتیں پروین کا ذہن قبول کر رہا تھا اور دل تھا کہ وہ کوئی بھی بات علی کے خلاف سننا نہیں چاہتا تھا۔

سچ کہا گیا ہے، محبت کی آنکھیں ہوتی ہیں نہ زبان ہوتی ہے۔ نہ دیکھ سکتی ہے، نہ بول سکتی ہے۔ صرف دل کے آگن میں دھڑکنیں بولتی ہیں اور دھڑکن کی ہر بات ماننی پڑتی ہے۔ اور دل کی دھڑکنوں کی بات مان کر تم پچھتاؤ گی، پروین! یہ لکھ لو۔“ مریم نے دانت کچکا کر کہا اور پھر پروین کو وہیں چھوڑ کر نیچے آ گئی۔ اس کے ذہن میں ایک ہی بات گونج رہی تھی۔

”پروین! تم نے بہت غلط راہ کا انتخاب کیا ہے۔ تم، جو میرے خاندان کی عزت ہو، میں نہیں چاہتی کہ تم اپنے مقام سے گر جاؤ۔ تایا جی تو تمہیں زندہ گاڑ دیں گے۔ جب وہ پسند نہیں کرتے کہ رنگ گل کے مرد، کم حیثیت عورتوں سے شادی کریں تو وہ کیسے یہ پسند کریں گے کہ ان کی بیٹی کے دل میں ایک مل مزدور کا بیٹا دھڑکن بن کر سما جائے؟ وہ اپنے اصولوں کو نہیں توڑیں گے، کسی صورت بھی وہ علی کو فرزندگی میں قبول نہیں کریں گے۔ وہ علی کی ذہانت، شرافت اور محبت کا دولت کے ساتھ موازنہ نہ کریں گے۔ تب دولت کا پلڑا ہی بھاری رہے گا ہمیشہ کی طرح۔ اور ویسے بھی انہوں نے تو ساڑھے تین برس پہلے تمہاری قسمت کا فیصلہ کر دیا تھا، تمہیں معین علی کی زندگی کا ساتھی بنا دیا تھا، پھر..... پھر تم علی کی وجاہت کے سامنے کیوں پکھل گئیں؟ کاش..... کاش پروین! تم میری بات مان لیتیں۔ دل کے بجائے دماغ سے سوچو۔ دل تو اونگی بونگی باتیں کرتا رہتا ہے۔“

مومو کی آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات اُٹھ آئی۔ اور پھر اُس کے تپتے رخساروں پر گرم گرم آنسو لڑھک ہی آئے۔ اس نے نہایت بے درد سے آنکھیں گڑھیں۔

مریم کو پروین کی محبت کا خوف ناک انجام ابھی سے نظر آ رہا تھا اور وہ اس انجام پر قبل از وقت اشک بہا رہی تھی۔



چودھری طالب علی کو صندھ علاج کے لئے کراچی لے آیا تھا۔ نجانے انہیں کیا بیماری تھی، جو ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اب صندھ نے چاہا کہ کراچی میں ان کا علاج کرایا جائے اور چودھری شوکت علی نے ہنس کر سوچا تھا۔

”صندھ میاں! اب تمہارے بابا جان ٹھیک ہونے کے نہیں ہیں۔ فصیحی کی جدائی نے انہیں توڑ دیا ہے، ان کی بیماری وچھوڑے کی بیماری ہے، جس کا علاج صرف فصیحی کا ملن ہے، اس کے علاوہ کوئی دوا اور دوا انہیں ٹھیک نہیں کر سکتی۔ اپنی عزت اور غرور کے طنطنے میں یہ ٹوٹ گئے ہیں۔ بس ذرا سے جھکے کی دیر ہیں اور سب کچھ ختم ہوتے چند منٹ نہ لگیں گے۔“ اور حقیقت یہ تھی کہ شعیب کے رنگ گل سے جانے کے بعد چودھری طالب علی آئے دن بیمار رہنے لگے تھے۔ دواؤں سے ان کی ٹیبل بھری ہوئی تھی، مگر کوئی دوا کارگر نہ تھی۔ وہ اب آدھے بھی نہ رہے تھے۔ بس اکڑ اور غرور کا وہی حال تھا۔ طرہ ہمیشہ کی طرح اونچا رکھتے۔ چاہتے تھے کہ کندھے جھکا کر نہ چلیں۔ مگر بیماری اور کمزوری کے باعث کندھے جھکا کر اور شملہ مزید اونچا کر کے چلتے۔ سیکینہ بیگم کہہ کہہ کر ہار گئی تھیں کہ فصیحی کو منالائیں، خود چودھری طالب علی کا اندر بھی چیخ چیخ کر سیکینہ بیگم کی بات پر لبیک کہتا۔ مگر وہ اپنے اندر کے طالب علی کو جھڑک دیتے۔ ایک باپ پر چودھری کو مسلط کر دیتے۔ اپنے اندر کی چیخوں کو دبانے کے لئے سیکینہ بیگم کو برا بھلا کہتے۔ تب چند لمحے کے لئے ان کے من کی بے کلی کو چین آجاتا۔ مگر تھوڑی دیر بعد غم کی گھٹائیں اُٹھ اُٹھ کر آتیں اور دل کے آنگن پر چھا جاتیں۔

عابدہ اور پروین ہر طریقے سے ان کا خیال رکھتیں۔ پروین اور صندھ کی قربت سے چند لمحوں کے لئے وہ بہل جاتے۔ اُس روز پروین نے انہیں دوا پلانے کے بعد کہا۔

”بابا جان! ایک بات پوچھوں؟“

”ہاں، ضرور پوچھو۔“ وہ محبت سے بولے۔

”آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟“ پروین ان کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”نہ پتہ! تو مجھ، میں ناراض نہیں ہوں گا۔“ چودھری طالب علی نے اس کا سراپنہ

سننے پر ہلکا دیا۔

”آپ کو..... آپ کو فصیحی لالہ یاد نہیں آتا؟“ پروین نے ان کے سینے میں منہ

چھپائے چھپائے کہا تو وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئے۔

”بتائیں نا؟“ وہ محل کر بولی۔

”پتہ! میں انسان ہوں..... اور کوئی انسان، حیوان کی طرح اپنی اولاد کو نہیں بھول

سکتا۔“

”پھر آپ انہیں لے آئیں نا۔“ پروین نے ان کی طرف دیکھا، چودھری طالب علی کا

چہرہ ابلتاس کے پھولوں کی طرح زرد ہو رہا تھا۔

”نہیں..... نہیں پتہ پتہ! میں مر جاؤں گا، مگر جھکوں گا نہیں۔ اور..... اور اب تو وہ

کسی صورت بھی رنگ گل میں نہیں آ سکتا۔“

”کیوں؟ اگر وہ معافی مانگ لیں، پھر؟“

”اس لئے کہ جس طرح وہ تھا گیا تھا، معافی مانگنے کے بعد اسے تنہا ہی رنگ گل میں آنا

پڑے گا۔“

”اُن کی بیوی.....؟“ پروین نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”اُس کی کوئی گنجائش نہیں۔ جس طرح رنگ گل سے ناتا توڑ کر اس نے شادی کی، اسی

طرح وہ دوبارہ رنگ گل آئے گا تو اسے باہر کے تمام رشتے توڑنے پڑیں گے۔“ چودھری

طالب علی لفظ چبا چبا کر سختی سے کہہ رہے تھے اور پروین کا دل اندر ہی اندر دھلا جا رہا تھا۔

”بابا جان! آپ اپنے فیصلے میں تھوڑی سی لچک نہیں پیدا کر سکتے؟“

”بالکل نہیں۔ میری بات پتہ کی لکیر ہوتی ہے پروین! اور میں مرد کا بچہ ہوں، جو کہہ

دیا، اسی پر ڈٹ گیا۔ دنیا کی کوئی طاقت میرے فیصلے تبدیل نہیں کر داسکتی۔ ہاں، تمہیں آج

اچانک فصیحی کیوں یاد آیا؟“ وہ دکھ سے ہنسے۔

”آپ خفا ہوں گے۔“

”نہیں، بتاؤ۔ تم کیا اُس سے ملتی ہو؟“ چودھری طالب علی نے بخور اس کے چہرے کی

طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو پروین نے جھوٹ بولنا مناسب نہ سمجھا، اُسے پتہ تھا کہ چودھری

طالب علی چہرے سے دل کی بات کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔

”مجھے تو خود ان کے بارے میں علم نہیں تھا۔“

”پھر کیسے پتہ چلا؟“ چودھری طالب علی کو جاننے کی جلدی تھی۔

”وہ مریم ہے نا.....۔“ پروین جھجکی۔

”مریم؟“ ان کی حیرت قابل دید تھی۔ دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ کہیں مومنو تو نہیں شوکی

کی بیٹی؟ اوہ نہیں۔ ایک نام کی ہزاروں لڑکیاں ہوتی ہیں۔ انہوں نے خود ہی اپنے ذہن کی

بات جھٹلائی، پھر بولے۔ ”یہ مریم کون ہے؟“

”فصیحی لالہ کی سالی ہے۔“

”اوہ!“ انہوں نے سکھ کی سانس لی۔

”میں فرسٹ ایئر سے مریم کے ساتھ پڑھ رہی ہوں۔ کئی بار میں اس کے ساتھ اس

کے گھر بھی گئی، مگر کبھی شعیب بھائی سے ملاقات نہ ہو سکی۔“ وہ یہ بات صاف گول کر گئی کہ

صندھ علی اور عابدہ بھی شعیب سے مل چکے ہیں۔ پروین نے جانے کیا کہتی رہی، بس چودھری



طالب علی کا دل شدت سے خواہش کر رہا تھا۔

”طالب! اس سے پوچھو، شععی ٹھیک تو ہے نا؟..... خوش تو ہے؟..... کوئی مالی پریشانی تو نہیں ہے؟“ مگر یہ وقت سب باتیں پوچھنے کا نہیں تھا۔ وہ اپنی کمزوری اپنے بچوں کے سامنے عیاں نہ کرنا چاہتے تھے۔ دل میں تو شععی کی محبت کے چشمے پھوٹ رہے تھے، مگر ان کے چہرے پر چٹانوں کی سی سختی تھی اور پروین انہیں بتا رہی تھی۔

”بابا جان! آپ کی شرط بہت کڑی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں مجبور کروں تو شععی لالہ آپ سے معافی مانگ لیں گے، مگر.....“

”مگر کیا؟“ انہوں نے چونک کر پروین کو دیکھا۔

”وہ شاید رضیہ بھابی کو نہ چھوڑ سکیں۔ اور پھر گیتو کو چھوڑنے کا تصور ہی سوہان روح ہے۔“ پروین نے کہا۔

”گیتو.....؟“

”لالہ کا بیٹا ہے..... بہت پیارا، بڑا ذہین ہے۔“ پروین کی آنکھوں میں بھیتے کی محبت کے چراغ روشن تھے۔ ”آخر کیوں نہ ہو۔ ذہین دادا کا پوتا جو ہوا۔“

”پوتا.....“ طالب علی کے لب زخمی پرندے کی مانند پھڑپھڑائے۔ مجھے کتنی خواہش تھی کہ میرا پوتا ہو۔ امجد کے ہاں یکے بعد دیگرے دو بیٹیاں ہوئیں، صفر کے ہاں بھی پہلوٹھی کی بیٹی ہی ہوئی اور پوتا کھلانے کی خواہش میرے دل ہی میں رہ گئی۔ میری نسل میں ایک اور مرد کا اضافہ ہو گیا اور مجھے پتہ بھی نہیں۔ اور میں چاہنے کے باوجود اسے چھو نہیں سکتا، سینے سے نہیں لگا سکتا..... اُف خدا! زندگی میں ایسا وقت بھی آنا تھا۔“ چودھری طالب علی کی آنکھوں میں آنسو جمنے لگے۔ انہوں نے فوراً آنکھیں بند کر لیں، مبادا پروین ان کی آنکھوں میں مچلتے آنسو دیکھ لے۔

”یہ..... یہ سب شوکی! صرف تمہاری وجہ سے ہوا۔ نہ تم رنگ محل کی روایات سے ٹکراتے، نہ میں اپنے بڑے پن کی دیوار تمہاری راہ میں چھتا۔ اب میں صرف تمہارے ہی خوف سے اپنے بیٹے اور پوتے کو بانہوں میں نہیں بھر سکتا۔ اگر میں ایسا کروں گا تو تم چاہو گے کہ تمہاری بیٹی کو بھی رنگ محل میں وہی مقام دیا جائے جو شجاعت اور میری بیٹیوں کا ہے۔ اور یہ کسی صورت ممکن نہیں ہے شوکی!“ چودھری طالب علی خیالوں ہی میں چودھری شوکت علی سے شکوہ کر رہے تھے، اپنے بچھائے ہوئے جال میں خود پھنس گئے تھے اور نکلنے کی انہیں کوئی راہ بھی نظر نہ آرہی تھی۔ اب پتہ چلا کہ قید میں پیچی کیوں پھڑپھڑاتے ہیں۔

”کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے طالب!“ ان کے دل کے قرب میں سرگوشی ابھری۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ”اگر تم شععی کو اُس کی نالائقوں سمیت قبول کر لو گے تو رنگ

محل کی عظمت اور شان و شوکت کو تمہیں کھونا پڑے گا۔ کیا تم یہ گوارہ کر لو گے؟“

”نہیں، نہیں..... یہ کبھی نہیں ہو گا۔“ چودھری طالب علی ان آوازوں سے پریشان ہو کر چیخ پڑے۔

پروین جو یہ سمجھی تھی کہ شاید وہ سو گئے ہیں اور اب کمرے سے باہر جانے کا سوچ رہی تھیں کہ انہیں یوں چیختے دیکھ کر گھبرا گئی۔

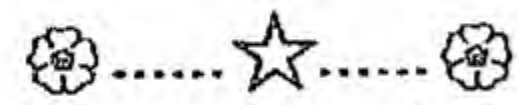
”کیا ہوا بابا جان؟“

چودھری طالب علی پسلیوں پر ہاتھ رکھے تڑپ رہے تھے اور ان کی زبان، نہیں..... نہیں کا ورد کر رہی تھی۔ ان پر عجیب سی جنونی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

پروین کی چیخ نکل گئی اور شور کی آواز سن کر عابدہ اور صفر گھبرائے ہوئے اندر آئے۔

”کیا ہوا پروین؟“

پھر ایک دم ہی اس کی نظر تڑپتے ہوئے چودھری طالب علی پر پڑی تو صفر بوکھلا گیا اور بیوی سے بولا۔ ”تم جلدی سے ڈاکٹر درانی کو فون کرو۔“ اور پھر خود مچلتے، تڑپتے چودھری طالب علی کو قابو میں کرنے کی کوشش کرنے لگا۔



مریم، پروین سے بے حد ناراض تھی۔ اُسے دکھ تو یہ تھا کہ پروین نے محبت پر اتنے برسوں کی دوستی کو قربان کر دیا تھا۔ اگر وہ دل رکھنے کو ہی مریم کی بات مان جاتی یا غور سے اس کی بات سن لیتی تو مریم کو اس قدر صدمہ نہ ہوتا۔ مریم کو اُمید تھی کہ پروین کو اپنی زیادتی کا احساس ہو گا اور وہ خود ہی اُسے منائے گی۔ مگر دوسرے روز پروین نہ آئی تو مریم پورے ڈیپارٹمنٹ میں بولائی بولائی پھری۔ گھر آ کر بھی وہ اس کے فون کی منتظر رہی، مگر لگتا تھا کہ وہ بھی مریم سے ناراض ہے۔ مریم اُسے پک کرنے بھی نہ گئی۔ دوسرے روز بھی وہ نہ آئی تو مریم کو احساس ہوا۔

”بیٹو! میں تمہاری کس قدر عادی ہو چکی ہوں۔ تم چاہے کچھ بھی کرو، میں تمہیں نہیں روکوں گی۔ اس راہ پر چلنے سے تمہارے پاؤں میں جو کانٹے چھیں گے، میں چُن لوں گی مگر اب تمہیں منع نہیں کروں گی۔ میرا باپ ہمیشہ تمہارے باپ کے سامنے جھکتا آیا ہے اور میں بھی تمہارے سامنے جھک جاؤں گی۔ سنا ہے، جھکنے میں عظمت ہے۔ میں بھی اس عظمت کو چھونا چاہتی ہوں۔“

یونیورسٹی سے واپسی پر وہ سیدھی پروین کے ہاں پہنچی، مگر یہاں بجائے پروین کے عابدہ سے ملاقات ہو گئی۔

”آؤ مریم! کیسی ہو؟“



”فائن..... یہ بتائیے، پروین کہاں ہے؟ دو روز سے یونیورسٹی نہیں آئی۔ میں نے سوچا پوچھ ہی آؤں، خیر تو ہے نا؟“  
”وہ ہسپتال میں ہے۔“  
”خدا خیر کرے۔“ مریم گھبرا گئی۔

”پھوپھا جی، پرسوں سے ہسپتال میں داخل ہیں۔“ عابدہ نے بتایا۔  
”کیوں.....؟“

”زبردست دل کا دورہ پڑا تھا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ زندگی تھی تو بچ گئے۔“  
”ہوا کیا تھا؟“ مریم نے پوچھا۔

”بس، پروین سے باتیں کرتے کرتے ایک دم ہی طبیعت بگڑ گئی۔“  
”اب تو ٹھیک ہیں نا؟“

”ہاں، اب بالکل ٹھیک ہیں۔ ویسے بھی کمزور سے تو ہیں، اس دورے سے تو نچ کر رہ گئے ہیں۔ پروین ان کے پاس ہی ہے۔“

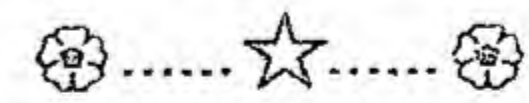
”پھر بھی، آج شام کو انہیں دیکھنے جاؤں گی۔“ مریم اٹھ کھڑی ہوئی۔  
”بیٹھو۔ کھانا کھا کے جانا۔“

”نہیں..... رضیہ بھابی انتظار کر رہی ہوں گی۔“  
”بھابی.....؟“

”ہاں.....“ مریم زور سے ہنس دی۔ ”اصل میں شعیب بھائی نے مجھے اپنے ہاں اسی شرط پر رکھا ہے کہ میں ان کی بہن بن کر رہوں گی اور رضیہ آپا کو بھابی کہوں۔ انہیں یہی اچھا لگتا ہے۔“ اس نے جلدی سے بات بنائی۔

”اچھا، اچھا..... بہت شریر ہے شعیبی۔“ عابدہ بھی ہنس دی۔  
”اچھا بھابی! خدا حافظ۔“

”خدا حافظ!“ عابدہ نے کہا اور پھر مریم کو باہر تک چھوڑنے بھی آ گئی۔



”آخر تمہیں اعتراض کیوں ہے شعیب؟ تم بابا جی کو دیکھنے کیوں نہیں جاتے؟“ رضیہ زنج ہو کر بولی۔ وہ کتنی دیر سے شعیب کو سمجھا رہی تھی کہ وہ چودھری طالب علی کو دیکھنے جائے۔ جب سے مومو نے رضیہ کو چودھری طالب علی کے بارے میں بتایا تھا، وہ بے چین سی تھی۔ یہ تو اتفاق تھا کہ شعیب آج آفس سے جلدی آ گیا تھا اور دوپہر کا کھانا ساتھ ہی کھایا تھا۔ کھانے کے بعد رضیہ نے نہایت رمان سے کہا تھا۔  
”شعیب! آپ کے بابا جی ہسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔“

”تو پھر میں کیا کروں؟“ اس نے نہایت بے پروائی سے کہا۔  
”تم انہیں دیکھنے جاؤ۔“ رضیہ نے کہا۔

”وائے؟“ شعیب چیخ کر بولا۔ شاید وہ اس چیخ سے اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کے شور کو دباننا چاہتا تھا۔

”آخر وہ تمہارے باپ ہیں۔“ رضیہ نے محبت سے سمجھایا۔

”باپ وہ میرے ہیں، فکر تمہیں کیوں ہے؟“ شعیب تنک کر بولا۔

”شعیب! تمہارے ناتے وہ میرے بھی بزرگ ہیں، میرے بھی باپ ہیں۔“

”تو تم چلی جاؤ انہیں دیکھنے۔“ شعیب نے اسے مشورہ دیا۔

”مجھ سے پہلے ان سے تمہارا رشتہ ہے۔“

”دیکھو رضیہ! مجھے پریشان مت کرو۔ اگر میں ان کی طرف چلا گیا تو پھر پلٹ کر تمہاری طرف نہیں آؤں گا۔“

”کیا مطلب؟“ رضیہ کا دل ہولنے لگا۔

”مطلب واضح ہے۔ اگر میں انہیں قبول کروں گا تو تمہیں اور گیتو کو چھوڑنا پڑے گا۔“

”کیا خبر وہ ہم دونوں سمیت تمہیں قبول کر لیں۔“ رضیہ نے آہستگی سے کہا۔

”یہ ممکن نہیں ہے۔ وہ میرا باپ ہے، جسے اپنی دولت اور رنگ محل کی عزت، بھائی اور بیٹے سے زیادہ عزیز ہے۔ اگر انہیں قبول کرنا ہوتا تو اب تک وہ مومو کو قبول کر چکے ہوتے۔“

”بس جس طرح گزر رہی ہے، گزرنے دو۔ زیادہ شور مت مچاؤ۔“ شعیب علی نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے کہا۔

”شعیب!“

”رضیہ! میں اس معاملے میں ایک لفظ سننا نہیں چاہتا۔ میں اپنا برا بھلا خود سوچ سکتا ہوں۔ ہم باپ بیٹے کے درمیان جو انا دیوار ہے، اسے یونہی رہنے دو۔ اس میں ذرا سی بھی دراڑ پڑی تو یہ گر جائے گی۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس دیوار کے طے تلے تم اور گیتو دب جاؤ گے اور میں لاکھ کوششوں کے باوجود تم دونوں کو نہیں نکال سکوں گا۔“

”نہیں، نہیں۔“ رضیہ خوف زدہ ہو کر بولی۔ ”تم کتنی خطرناک باتیں کر رہے ہو۔“

”یہی خطرناک باتیں حقیقت میں چاچا شوکی پر گزر چکی ہیں۔ تم ان کے حوصلے کی داد نہیں دیتیں۔“ شعیب نے ہنستے ہوئے اس کے دونوں لرزاتے ہوئے پنج بستہ ہاتھ تھام لئے اور بولا۔

”بس میرے یہی ہاتھ دنیا کی سب سے بڑی دولت ہیں۔ اور یہ ہاتھ ان شاء اللہ! میں کبھی نہ چھوڑوں گا۔ چودھری طالب علی کی کڑی سے کڑی شرائط بھی ان ہاتھوں کو مجھ سے



نہیں چڑا سکتیں۔

”سچ شعیب؟“

”سچ!“ شعیب نے اس کی آنسوؤں سے بھگی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وارنگی سے کہا اور پھر جھک کر ان پتی آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

☆.....☆.....☆

مومو، کی رنگ انگلی میں گھماتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ شام کا وقت تھا، بہت سے لوگ اپنے عزیزوں سے ملنے ہسپتال آئے تھے۔ اُف خدا! دنیا میں کس قدر بیماریاں ہیں..... جو ہسپتال دیکھو، وہی مریضوں سے بھرا ہوا ہے۔ کہیں بھی تو بیڈ خالی نظر نہیں آتا۔ ایک مریض شفا یاب ہو کر جاتا ہے تو دوسرا فوراً اُس کی جگہ لے لیتا ہے۔ بعض مرتبہ تو بستروں کی کمی کے باعث برآمدے ہی میں وارڈ بنا دیئے جاتے ہیں۔ وہ اپنی سوچوں میں غرق ہو لے ہو لے اوپر جا رہی تھی کہ ایک دم ہی ایک آواز نے اُسے پلٹنے پر مجبور کر دیا۔

”مومو.....!“ نہایت شہد آگیاں لہجے میں کسی نے اسے پکارا تھا۔ اس نے پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا، بے شمار لوگ آ جا رہے تھے اور وہ حیران، ششدر ایک ایک چہرہ دیکھ رہی تھی، جیسے اسے امید ہو کہ پکارنے والا پھر آواز دے گا۔ بالکل یہی آواز اس نے گھڑیوں کی دکان میں سنی تھی۔

”اے بیٹی! کس کو دیکھ رہی ہے؟ دیکھنا ہے تو نیچے جا کر دیکھ، رستہ تو چھوڑ۔“ ایک بڑی بی نے جو شٹل کاک برقعے میں تھیں اور ہانپتی ہوئی سیڑھیاں طے کر رہی تھیں، اسے یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آخر ٹوک ہی دیا۔

مریم پریشان سی پلٹی اور بے دلی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

”یا خدا! یہ کون ہے؟ جو میرے اپنے نام سے اتنی محبت سے مجھے پکارتا ہے؟ اس نام کا علم تو صرف شعیب بھائی، بھابی اور بابا جانی کو ہے۔ اپنی دوستوں اور کلاس فیلوز میں سب مجھے مریم کہتے ہیں۔ آخر کون ہے، جسے میرے باضی کا نام یاد ہے؟“ اسپیشل وارڈ میں کمرہ نمبر 23 کے قریب پہنچ کر وہ ٹھکی۔

عابدہ بھابی نے یہی نمبر بتایا تھا۔ اس نے یادداشت پر زور دیتے ہوئے سوچا۔ اب یہاں تک تو وہ آگئی تھی، مگر اندر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

کتنی خوش تھی کہ کم از کم ایک بار تو اپنے ظالم اور جابر تایا جی کو دیکھ لے، جنہیں انسانوں سے زیادہ پتھر کی بے جان حویلی پیاری ہے اور جس کی روایات کو وہ سینے سے لگائے اپنے دل کے زخموں میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔

نہ جائے رفتن، نہ پائے ماندن کے مصداق وہ اپنے ہونٹ کچل کچل کر سرخ کر رہی

تھی۔ تب ہی دروازہ کھولا تو وہ چونکی، یہ پروین تھی۔

”ارے مریم! تم؟“ پروین کے چہرے پر خوشی جھلکنے لگی۔

”ہاں..... میں۔“ مریم نے نارٹل ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے بابا کو دیکھنے آئی تھی کہ وہ شخص کیسا ہوگا، جس سے سب ڈرتے ہیں۔“

”نہ ہستہ بولو۔“ پروین نے مریم کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی تو مریم زور سے ہنس دی۔

”بھئی مجھے اندر تو جانے دیکھو۔“

”دیکھو، کوئی بے تکی بات نہ کرنا۔“ پروین نے اسے سمجھایا۔

”مثلاً؟“ مریم نے اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔

”وہ..... وہ.....“ پروین ہٹکا کر رہ گئی تو مریم سمجھ گئی اور ہنستے ہوئے بولی۔

”اوہ، نہیں۔ میں اتنی گئی گزری نہیں ہوں کہ تمہاری پرائیویٹ باتیں پہلی ہی ملاقات

میں تمہارے باپ کو بتا دوں اور یہ تمہارا معاملہ ہے، میں درد سہی کیوں مول لوں؟“

”تم سے کچھ بعید نہیں۔ ہر بات صاف کہہ دینے کی عادی ہو۔“

”ہر جگہ صاف گوئی بھی نہیں چلتی۔ بعض جگہ صاف گوئی مصیبت بن جاتی ہے۔

اور فی الحال میں تمہیں خود اور چودھری طالب علی کو اس صاف گوئی کی مصیبت سے دور رکھنا

چاہتی ہوں۔ جب وقت آئے گا تو ہر بات روز روشن کی طرح سامنے آ جائے گی۔“

”بہت ناراض ہو مجھ سے؟“ پروین نے ہنس کر کہا۔

”مجھے تم سے ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔“

”اچھا!“ پروین ہنسی۔ ”بہت دیر میں تم سمجھیں۔“

”ہاں، تم خود سمجھ دار ہو، اپنا برا بھلا سوچ سکتی ہو، میں کیوں فضول میں تم سے اور علی

سے دشمنی مول لوں؟ ہمیں یار کی یاری سے مطلب، اس کے نصیبوں سے کیا سروکار؟“ مریم

نے بے نیازی سے کندھے اچکائے تو پروین حیرت سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ پھر وہ مریم کو

اندر لے آئی۔ چودھری طالب علی، سر کے نیچے دونوں بازو رکھے چھت کو گھورتے ہوئے نہ

جانے کیا سوچ رہے تھے کہ پروین کی خوشی سے لبریز آواز نے انہیں چونکا دیا۔

”بابا جان! دیکھئے تو کون آیا ہے؟“

تب انہوں نے ہولے سے سر گھما کر ان کی طرف دیکھا۔ پروین کے ساتھ کھڑی مریم

پر ان کی نظریں ٹپک گئیں۔ نہ جانے وہ کیوں نہایت بے قراری سے ہونٹ کچل رہی تھی۔

پھر ایک دم اسے احساس ہوا تو جلدی سے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر بولی۔

”آداب!“ ہزار کوشش کے باوجود بھی اس کی آواز کانپ گئی۔ وہ جو خود کو بہت مضبوط

سمجھ رہی تھی، اس وقت بکھر رہی تھی۔ بیمار چودھری طالب علی کے چہرے پر اب بھی اتنا جاہ و



چلاں تھا کہ اچھے اچھوں کا پتہ پانی ہو جاتا۔ پھر وہ تو نازک سی جگہ کچھ جھپسی مظلوم ترین لڑکی تھی۔ چودھری طالب علی کے مظالم کی چکی میں پس کر جوان ہوئی تھی۔ اور انہیں تو یہ علم ہی نہیں تھا کہ جو کئی انہوں نے غریب راجا کو دی تھی، وہ تو شہر میں آ کر ہی چٹکی تھی۔

”بابا جان! یہ میری سہیلی مریم ہے۔“ پروین نے اس کا تعارف کر دیا تو مریم نے واضح طور پر غصوں کیا کہ چودھری طالب علی کے زرد گالوں پر سرخی کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی ہے۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگے تو پروین نے بڑھ کر انہیں سہارا دیا۔

”آؤ پٹر! میرے قریب آ جاؤ۔“ وہ تکیے سے ٹپک ٹپک کر بیٹھتے ہوئے بولے۔ مریم آگے بڑھی، بالکل شہزادیوں جیسی آن اس کی چال میں آگئی تھی۔ اور ویسے بھی چودھری شوکت علی کی تو شہزادی تھی وہ۔

”بیٹھو پٹر!“ چودھری طالب علی نے اسے اپنے قریب ہی بستر پر بیٹھنے کو کہا۔ لمحہ بھر کو تو وہ ٹپٹائی اور پھر جلدی سے بیٹھ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی۔

”سب کہتے ہیں، چودھری طالب علی بہت ظالم ہیں، ہر ایک کی خوشیوں کو روند دیتے ہیں، حتیٰ کہ بھائی اور بیٹے کا لحاظ بھی نہیں کیا۔ پھر یہ التفات، یہ سب کیا ہے؟“

”مومو! تم نری پاگل ہو۔ انہیں حقیقت کا کیا علم ہے؟ وہ تو تم سے پروین کی سہیلی ہونے کے ناتے محبت سے پیش آرہے ہیں۔ کچھ اور مت سمجھنا تم۔“

”تم شروع سے ہی شہر میں رہ رہی ہو؟“ چودھری طالب علی مریم کا سر تھپکتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”جی..... نہیں..... جی ہاں۔“ مریم گڑبڑا گئی۔

”تمہارا باپ کیا کرتا ہے؟“ چودھری طالب علی نے ایک دم ہی پوچھ لیا۔ اصل میں وہ شعیب کے سسرال والوں کی حیثیت معلوم کرنا چاہتے تھے۔

”جی..... وہ آج کل کچھ نہیں کر رہے۔ میرے بڑے بھائی ایک دواؤں کی انگلش فرم میں منیجر ہیں۔“ مریم نے کہا۔ اسے نہیں علم تھا کہ پروین نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔

”اچھا..... اچھا۔“

مریم کا جی چاہا، ایک بار پوچھ لے، آپ یہ سب مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟ کوئی خاص بات یا کوئی نیا چرکا لگانا چاہتے ہیں؟ مگر وہ اپنے دل کی آواز دبا گئی۔

”تم پروین کا خیال رکھا کرو۔“ وہ بولے۔

”پروین خود سیانی ہے۔“ مریم ہنس کر بولی۔

”نہ پٹر! شہر میں ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔ دو میں بہت طاقت ہوتی ہے۔“

”میں سچی نہیں۔“ مومو نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

”دیکھو پٹر! یہ ہاتھ کی پانچ انگلیاں ہیں نا؟“ انہوں نے اپنا خنیف سا جھریوں والا ہاتھ اس کے سامنے کر دیا، پھر بولے۔ ”اس کی انگلیاں علیحدہ علیحدہ ہیں، ان میں کوئی طاقت نہیں۔ مگر جب انگلیوں کو ہلا کر کٹھی بند کر کے مڑا دیا جائے تو دشمن کا منہ توڑنے کے لئے ایک ہی ٹکڑا کافی ہوتا ہے۔“

”مگر انگل! ہمارا یہاں کون دشمن ہے؟“ مریم زور سے ہنس دی۔

”ویسے ہی سمجھا رہا تھا۔“ چودھری طالب علی خود بھی ہنس دیے۔

پھر ادھر ادھر کی باتوں کے دوران انہیں وقت کا احساس نہ ہوا۔ وہ تو صغیر اور حابہ آئے تو مریم کو احساس ہوا کہ پورا ایک گھنٹہ ہو گیا ہے اسے یہاں آئے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اب مجھے اجازت دیجئے انگل!“

”بھئی ہم آئے اور تم جا رہی ہو؟“ صغیر ہنس کر بولا۔ ”کیا ہمیں نہیں آنا چاہئے تھا؟“

”نہیں صغیر بھائی! ایسی بات نہیں ہے۔ میں بتا کر نہیں آئی، رضیہ باجی پریشان ہو رہی ہوں گی۔“

”آئی رہا کرو پٹر!“ چودھری طالب علی بولے۔

”ضرور آؤں گی۔“ مریم نے کہا اور پھر پروین کے ساتھ باہر آگئی۔ ”تم جاؤ انگل کے پاس۔“

”بھابی اور صغیر بھائی ہیں تو..... تم سے ایک بات کرنی تھی۔“

”کرو۔“ مریم رک گئی۔

”وہ..... مریم! تم.....“ پروین جھجک کر خاموش ہو گئی۔

”علی بھائی کو پیغام دینا ہے؟“ مریم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر شوخی سے کہا تو پروین کے عارض سرخ ہو گئے اور پلکیں سرخ ہلالوں پر تھرک کر رہ گئیں۔ ”دیکھو بی بی! یہ پیغام رسائی مجھ سے نہ ہو سکے گی، سمجھیں؟“

”تم اسے یہ تو بتا سکتی ہو کہ میرے بابا پیار ہیں؟“ پروین نے کہا۔

”اگر انہوں نے پوچھا تو۔ ویسے تم لڑکیاں کتنی خوش فہم ہوتی ہو۔ تمہارا کیا خیال تھا کہ میں شاید علی کا ہی کوئی پیغام تمہارے لئے لائی ہوں گی؟ اس کی بے قراریوں کی روداد سناؤں گی؟..... مائی ڈیئر! دو روز سے وہ یونین آفس ہی میں مصروف رہا ہے، مجھ سے بھی ملاقات نہیں ہوئی۔ تم سمجھ رہی ہو گی کہ تمہارے لئے وہ بولایا بولایا پھر رہا ہو گا۔“ مریم چتر چتر بولے جا رہی تھی۔

”میں نے تم سے کچھ کہا تو نہیں۔“ پروین جزیب ہو کر بولی۔



”ہر بات کہی نہیں جاتی، کچھ باتیں محسوس بھی کر لی جاتی ہیں..... اب بھی سمجھ جاؤ، خود کو سنبھال لو۔“

”اچھا، تم اب بکواس نہ کرو۔ اب اتنی بھی بڑی نہیں ہو کہ مجھے نصیحتیں کرتی پھرو۔“

”میں نے تمہیں اس روز بھی منع کیا تھا کہ میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گی، پھر تم کیوں نصیحتوں کی پٹاری کھول کر بیٹھ جاتی ہو؟“ پھر وہ کچھ اور کہے بغیر ندر چلی گئی اور مریم مسکراتی ہوئی زینے کی طرف بڑھ گئی اور وہ یکایک سامنے سے تیزی سے آتے ہوئے آدمی سے ٹکرا گئی۔ یہ تو شکر تھا کہ اس نے اُسے تھام لیا اور بولا۔

”مومو!“

بالکل وہی لہجہ، جیسا اُس نے چند ماہ قبل سنا تھا، صرف ایک گھنٹہ پہلے اوپر آتے سنا تھا اور اب..... وہ حیران و ششدر نظروں سے اُسے دیکھے گئی۔

☆.....☆.....☆

وہ اب تک اُسے بازوؤں سے تھامے بڑی والہانہ نظروں سے تک رہا تھا۔ مریم کو یوں محسوس ہوا، جیسے لاتعداد جگنو اُس کی آنکھوں میں جگمگا رہے ہوں۔ پھر ایک دم ہی اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی، لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ اُسے پہچان چکی تھی، جو اسے آوازیں دیتا پھر رہا تھا۔ اس کے لب، کتاب کے اوراق کی طرح پھڑپھڑائے اور ایک ہی لفظ ان ہونٹوں سے ادا ہوا۔

”شش.....!“

”پہچان لیا؟“ اُس کی آواز خوشی سے کپکپا کر رہ گئی۔

”تم نے مجھے اتنے برسوں بعد دیکھا اور پہچان لیا تو میں نہیں پہچان سکتی تمہیں؟“ مارے خوشی کے مریم کی بھی آواز کپکپا گئی۔ ”مجھے آوازیں دیتے رہے، چھپتے رہے۔ ایک دم سامنے کیوں نہ آئے؟“

”میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا تو یوں لگا، جیسے میرا خیالی پیکر حقیقت بن کر سامنے آ گیا ہو۔ میرے خیالوں میں میرے بچپن کی ساٹھی مومو کی جو تصویر تھی، وہ آپ سے ملتی جلتی تھی، اس لئے بے اختیار میرے منہ سے ”مومو!“ نکلا۔ آپ نے پلٹ کر دیکھا تو میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ پھر آج دوبارہ آپ نظر آ گئیں تو میری زبان قابو میں نہ رہ سکی اور.....“

”پکار کر چھپ گئے۔“ مومو اس کی بات کاٹ کر بولی۔

”جی۔“ شجاع اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیوں شش!..... کیوں؟“ وہ بچوں کی طرح چل گئی۔ ”کیا تمہارا دل نہیں کرتا تھا مجھ

سے ملنے کو؟“

”اگر نہ کرتا تو آپ کو آوازیں کیوں دیتا؟“ شجاع کا لہجہ بچھا ہوا تھا۔

”اوہ، کیا آپ جناب لگا رہی ہے تم نے؟ ہم میں اتنا تکلف تو نہیں تھا شش!“ وہ چو کر بولی۔

”وقت بہت آگے بڑھ گیا ہے۔“ اس نے یاد دلایا۔

”کیا گزرتا وقت اچھے دوستوں کے درمیان تکلفات کی دیواریں چن دیتا ہے؟“

”پھر بھی آپ.....“ شجاع نے کہنا چاہا۔

”میں نہیں کرتی تم سے کوئی بات، سمجھے؟“ مومو نے آگے قدم بڑھایا۔

”اوہ، تم تو ناراض ہو گئیں۔“ شش ایک دم ہی تکلف کی باڑ پھلانگ گیا۔

”اب آئے ہو فارم میں۔“ مومو ہنس دی۔ ”آؤ نیچے چلیں۔“ مومو نے نہایت بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھام لیا تو شجاع نے آہستگی سے چھڑاتے ہوئے کہا۔

”یہ گاؤں نہیں ہے مومو!“

”اوہ!“ وہ جھل ہو گئی۔ پھر خجالت مٹاتے ہوئے پلٹ کر بولی۔ ”تم یہاں کیسے؟“

”میرے ماسٹر مراد ہیں یہاں داخل۔“ شجاع اس کے ساتھ چلتا ہوا بولا۔

”اوہو! کیا ہوا انہیں؟“

”بڑھاپا بذاتِ خود ایک بیماری ہے۔“ شجاع بولا۔ اب وہ نیچے لان میں پہنچ چکے تھے۔

”یہ تو ہے۔“ مومو سہزے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”تم کیا کر رہے ہو؟“

”بینک میں ملازم ہوں۔“ شجاع بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”تم تو فوج میں جانا چاہتے تھے۔“ مریم نے یاد دلایا۔

”ہر خواہش پوری تو نہیں ہوتی نا۔“ وہ دکھ سے بولا۔

”مگر میری خواہش پوری ہو گئی ہے۔“ مومو نے مسکراتے ہوئے شجاع کی طرف دیکھا۔

”سب تمہاری طرح خوش نصیب نہیں ہوتے۔“

”یہ نہیں پوچھو گے کہ میری کون سی خواہش پوری ہو گئی ہے؟“ مومو نے کہا۔

”تم خود ہی بتا دو۔ بچپن میں تم میرے پوچھے بغیر ہر بات بتا دیتی تھیں۔“ اس نے یاد دلایا۔

”ہاں شجاع! میں جب بھی تنہا ہوتی ہوں تو تین افراد سے ملنے کی شدید خواہش پیدا ہوتی ہے۔ ان تین میں سے ایک تم ہو۔“

”اچھا!“ شش کے دل میں شگوفے پھوٹنے لگے۔ ”باقی دو کون ہیں؟“

”ایک میرا جڑواں بھائی اور تیسرا شش۔“ مومو کی آواز بھرا گئی۔



”اشو!“ شجاع نے حیرت اور دکھ کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ مومو کی طرف دیکھا، جہاں بھائیوں کی محبت سرخی بن کر پھیلی ہوئی تھی۔

”شجہ! تم میری ماں کی قبر پر جاتے تھے؟“ وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

”میں تمہارے آنے کے دو سال بعد ہی پڑھائی کی غرض سے لاہور چلا گیا تھا۔ جب تک میں احمد پور میں رہا، ماسی نوراں کی قبر پر جاتا تھا۔ ہر جمعرات کو دیا جلاتا تھا۔ میرے آنے کے بعد.....“

”تمہارے آنے کے بعد میری ماں کی قبر پر دیا نہیں جلا؟“ مومو نے اس کی بات کاٹ دی۔

”نہیں..... مومو!“ وہ تڑپ کر بولا۔ ”میرے بعد شکرانے نے میری ڈیوٹی سنبھال لی تھی۔“

”سچ شجہ؟“

”جھوٹ کیوں بولوں گا؟ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔“

”تم نے میرے وعدے کا مان رکھا۔“ مومو نے شکر سے کہا۔

”کوشش کی تھی۔“

”میں تمہاری شکر گزار ہوں۔“ احساسِ شکر سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”روؤ مت، مومو!“ شجاع نے نہایت محبت سے کہا تو اس نے جلدی سے ہاتھ کی مٹھیاں بند کر کے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ تب شجاع زور سے ہنس دیا اور بولا۔ ”تمہاری عادتیں آج بھی وہی ہیں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے، جیسے برسوں پہلے کی مومو ندی کنارے میرے پاس بیٹھی ہے۔ بات بات پہ رونے والی۔ اب بھی تمہیں مایہ یاد ہیں؟“ شجاع کے پوچھنے پر وہ بری طرح جھینپ گئی۔ اسے یاد آیا، شجاع کے کہنے پر کتنے رومینک مایہ اُسے سنایا کرتی تھی۔ تب اُسے پتہ نہیں تھا کہ لڑکیوں کو ایسی آگ لگا دینے والی باتیں زبان پر نہیں لانا چاہئیں۔ وہ تو پگھٹ پر گاؤں کی لڑکیوں بالیوں سے مایہ سستی اور جوان لڑکیاں تو گاتی ہی ایسے مایہ تھیں، جن میں محبوب سے ملنے کی تڑپ ہوتی ہے۔ مومو شروع ہی سے ذہین تھی۔

ایک بار سننے کے بعد ہی اسے وہ مایہ یاد ہو جاتے اور جب شجاع اس سے فرمائش کرتا تو فوراً ہی سنا دیتی، نہایت سُرم میں۔ اور اب اُسے بے طرح سُرم آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر دھنک کے سارے رنگ اُتر آئے تھے، جنہیں لوگ محبت کے رنگوں سے تشبیہ دیتے ہیں۔

”تم نے کوئی جواب نہیں دیا؟“ شجاع نے شوخی سے کہا تو مومو نے اپنی بو جھل پلپٹیں اٹھا کر شجاع کو گھورنے کے سے انداز میں دیکھا اور بات پلٹ کر بولی۔

”یہ بتاؤ، میرا بھائی اشو کیسا ہے؟“

”اشو؟“ شجاع کی ساری شوخی لمحے بھر میں رنو چکر ہو گئی۔

”ہاں..... میرا ویر، اشو۔“ مومو جلدی سے بولی۔

”تمہیں کچھ علم نہیں؟“ شجہ کی آنکھوں میں دکھ لہریں لینے لگا۔

”میں سمجھی نہیں۔“ مومو نے حیرت سے کہا۔

”جب سے احمد پور سے آئی ہو، وہاں کے بارے میں تمہیں کوئی اطلاع نہیں ملی؟“

”میں نے اپنے بابا جانی سے کہا تھا کہ وہ اشو کو لے آئیں مگر..... مگر راجا نے اسے نہیں آنے دیا اور شجہ! مجھے ایک آس ہے کہ میرا ویر، میرا اشو مجھے ضرور ملے گا۔“ مومو کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا لگ گیا۔ شجاع اس کی بھگی بھگی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔

”شجہ! تم بتاتے کیوں نہیں اشو کے بارے میں؟“ مومو نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

”وہ..... وہ ٹھیک ہے مومو!“ شجاع نے سٹپٹا کر جواب دیا۔

”شجہ!..... میری طرف دیکھ کر جواب دو۔ مجھے علم ہے کہ تمہاری زبان جھوٹ بول رہی ہے۔ مگر تمہاری آنکھیں جھوٹ نہیں بولیں گی۔“

”ارے تم تو فضول میں وہمی ہو۔“ وہ ہنسنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

”پلیز شجہ! تمہیں میری قسم، سچ سچ بتا دو۔“ اس نے ہلچلی لہجے میں کہا۔

”مومو!..... تم نے اپنی قسم کیوں دے دی؟“ اس نے اپنی نظریں اٹھائیں اور آہستگی سے بولا۔

”دل چھوٹا نہ کرو مومو! زندگی میں دکھ سکھ تو ملتے ہی رہتے ہیں۔“ اور پھر دھیرے دھیرے اس نے مومو کو سب کچھ بتا دیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھے گئی اور جب وہ چپ ہوا تو وہ ہونٹ کھلتے ہوئے بولی۔

”اشو واقعی مر چکا ہے؟ میرے آنے کے صرف ایک ہفتے بعد؟“

”ہوں!“ شجاع نے ہنکارا بھرا۔

”نہیں۔“ وہ ایک دم ہی چیخی۔ اس تلخ حقیقت نے اس کی روح تک میں شکاف ڈال دیئے تھے۔ اس نے وحشت زدہ نظروں سے شجاع کو دیکھا اور اس کے کندھے پر سر ٹکا کر چل گئی۔

”شجہ! کہہ دو یہ جھوٹ ہے..... یہ سب جھوٹ ہے..... اشو زندہ ہے۔“

”کاش! میں تم سے جھوٹ بول سکتا۔“ شجاع اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سسک پڑا۔ بھی قریب سے گزرتے ہوئے دو لڑکوں نے انہیں اتنا نزدیک دیکھا تو ایک بولا۔

”یار! شوٹنگ ہو رہی ہے۔“

”بالکل نیچرل۔ کون سی فلم ہے؟“ دوسرے نے شوخی سے جملہ اچھالا۔

”شاید لو اسٹوری۔“ پہلا زور سے ہنس کر بولا تو شجاع کا خون کھول اٹھا۔ اس نے مومو



کا سر اپنے کندھے سے ہٹایا اور بولا۔

”مومو! خود پر قابو رکھو۔“

”شجوا! اس خبر سے میرے تصور کا محل دھڑام سے گر گیا ہے اور مجھے لگ رہا ہے میں اس کے بلے تلے دب کر رہ گئی ہوں۔ کراہ رہی ہوں، سسک رہی ہوں۔“

”چلو، میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔“ شجاع نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔

”ہاں شجوا! مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ خود جاسکوں۔ مجھے چھوڑ ہی آؤ تو بہتر ہے۔“ مومو نے گلوگیر آواز میں کہا اور شجاع کا سہارا لئے پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ گئی۔ اسے یوں لگ رہا تھا، اگر شجاع نے سہارا نہ دیا تو وہ گر جائے گی۔

شجاع لاکھ کہنے کے باوجود بھی اندر نہیں آیا تھا اور بولا تھا۔

”پھر کبھی آؤں گا مومو! ابھی ماسٹر صاحب انتظار کر رہے ہوں گے۔“ پھر وہ چلا گیا۔ مومو بڑی مشکل سے خود کو گھسیٹ کر اندر لائی تو ڈرائنگ روم سے آتی آوازوں نے اس کے قدم روک دیئے۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے آئی ہو۔ وہ خود کو بہت خالی خالی اور ٹوٹا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ سمٹ سمٹ کر بکھر رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا، اس قدر روئے کہ آنسوؤں میں اس کا وجود تحلیل ہو جائے۔ پھر وہ خود پر قابو پا کر اندر داخل ہو گئی۔ اسے پہلے رضیہ نے دیکھا۔ اس طرح تھکا تھکا اور اجڑا اجڑا دیکھ کر اس کا ذہن انجانے خدشوں کے حصار میں چلا گیا۔ وہ تڑپ کر آگے بڑھی اور اسے بازوؤں سے تھام لیا۔

”کیا ہوا مومو؟“

بس اتنا پوچھنے کی دیر تھی کہ مومو حوصلہ ہار بیٹھی۔ وہ رضیہ کے سینے سے لگ کر پلک پڑی۔ شعیب بھی ان کے قریب آ گیا۔

”کیا ہوا مومو؟“ وہ بھی سخت پریشان نظر آ رہا تھا اور چودھری شوکت علی جو ابھی چندرہ منٹ قبل ہی یہاں آئے تھے، سن بیٹھے مومو کو پلکتے دیکھ رہے تھے۔ مومو کی ایک ایک چیخ ان کے دل میں برجھی کی طرح اتر رہی تھی اور ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اٹھ کر مومو سے پوچھتے، وہ کیوں بکھر گئی ہے۔ کیا دکھ ملا ہے اسے۔ وہ تو جب بھی آتے تھے، مومو انہیں ہنستے ہوئے خوش آمدید کہتی تھی، ان کی کھلی بانہوں میں سمٹ جاتی تھی، حتیٰ کہ مسرت اور محبت سے ان کے گال پُوم لیتی اور وہ اس کی اتنی بہت سی محبت پر سرشار ہو جاتے۔

مومو کی چیخوں میں کمی آ گئی، مگر وہ اب بھی رضیہ کے سینے سے لگی ہوئی تھی اور اس کے وجود کے ہلکے ہلکے جھٹکے بتا رہے تھے کہ وہ اب بھی رو رہی ہے۔ رضیہ نے اسے پانی پلایا اور آنسوؤں سے تر چہرہ دوپٹے سے پونچھتے ہوئے اس کے خیالات بٹانے کے لئے بولی۔

”تم نے آتے ہی رونا شروع کر دیا۔ دیکھو، چاچا شوکی آئے ہیں۔“

تب مومو نے اپنی بیگی بیگی، متورم آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی زخمی نظروں سے مومو کو تنک رہے تھے۔ وہ بولے کچھ نہیں، بلکہ ہمیشہ کی طرح انہوں نے بانہیں پھیلا دیں۔ مگر نہ جانے کیوں آج ہمیشہ کی طرح وہ دوڑ کر ان کھلی بانہوں میں نہیں سمائی، بلکہ خالی خالی نظروں سے چودھری شوکت علی کے سٹے ہوئے چہرے کی طرف دیکھے گئی۔ چودھری شوکت علی کی بانہیں ٹوٹی ڈالی کی طرح ان کی گود میں آن گئیں۔ تب اُسے ہوش آیا۔ اُس نے رضیہ سے خود کو چھڑایا، بھاگ کر چودھری شوکت علی کے قدموں سے لپٹ گئی اور باقی ماندہ آنسو ان کی گود میں سر رکھ کر بہا دیئے۔

”پُتر! ہوا کیا؟“ وہ اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولے۔

”بابا جانی! آپ..... آپ کو اشوکی موت کا علم تھا نا؟“ مومو نے آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔

”اوہ!“ چودھری شوکت علی نے صوفے کی پشت سے سر اٹکا کر پلکیں موند لیں۔ مومو کا دکھ انہیں اپنے اندر اترتا محسوس ہوا اور ان کی خاموشی نے بتا دیا کہ شجوا نے جو کچھ اسے بتایا ہے، وہ سچ ہے۔ تب وہ ہولے ہولے اٹھی اور چودھری شوکت علی کے برابر بیٹھ کر ان کے کندھے سے سر اٹکا کر بولی۔

”بابا جان! اگر ایسا تھا تو مجھے پہلے بتا دیتے۔ میں اپنے تصورات میں رنگ تو نہ بھرتی۔ تصور ہی تصور میں اپنے ماں جائے کو جوانی میں ڈھلا ہوا تو نہ دیکھتی۔ بابا جانی! خواب ٹوٹ جائیں تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ ہم خوب صورت خواب دیکھتے ہیں تو تعبیر بھی خوب صورت چاہتے ہیں۔ اور اب خلاف توقع تعبیر ملی ہے تو ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں میرے دل میں پیوست ہوئی جا رہی ہیں..... میں لہو لہان ہو رہی ہوں بابا جان!“

”مومو!“ چودھری شوکت علی کا چہرہ ضبط کی کوشش میں سرخ ہو رہا تھا۔ تب مومو نے ان کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیا اور ان کی جلتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”بابا جان! آپ مجھے بتا ہی دیتے، میں اماں کی موت پر آنسو بہانے کے ساتھ چار آنسو اشوکی موت پر بھی بہا لیتی۔ جب میرے زخموں پر کھرند آ جاتے ہیں، تب ہی ایک نیا زخم ملتا ہے۔ کیوں؟ میری قسمت میں ایسا کیوں ہے؟..... مجھے ہر خوشی غم کے جزدان میں لپٹ کر کیوں ملتی ہے؟“ مومو نے ان کے سینے میں منہ چھپا لیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا، جیسے اُس کا ویرا شو آج ہی مرا ہو۔

رضیہ نے شعیب علی کی طرف دیکھا، جیسے پوچھ رہی ہو۔ شعیب! تمہیں علم تھا اس



سانے کا؟

شعیب نے اس کی آنکھوں کا سوال پڑھ لیا تھا اور شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔ ان کے ہاں عورتوں کو ہر بات نہیں بتائی جاتی تھی اور کبھی کبھی رگ محل کی روایات وہ نبھا لیتا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھا اور مومو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”مومو!..... ہم نے یہ بات صرف اس لئے تم سے چھپائی کہ تمہیں اس خبر سے صدمہ ہوتا۔ ہم تمہارے زخموں میں مزید اضافہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔“

”زخم.....“ وہ سرخ انگارہ آنکھوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ”شعیب بھائی! زخم تو بہت چھوٹی عمر میں لگنے لگے تھے اور پتہ نہیں، کب تک لگتے رہیں۔“

”مومو! جند میری! مجھ سے ناراض مت ہونا۔“ چودھری شوکت علی نے کہا۔

”میں..... میں اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔ صرف..... صرف تجھے خوش دیکھنے کی خاطر میں نے ایسا کیا تھا۔ مجھے معاف کر دو۔ میں ہاتھ جوڑتا ہوں مومو!“ اور واقعی چودھری شوکت علی بیٹی کے سامنے ہار گئے تھے۔ اپنے جرم کا اعتراف کر لیا تھا، حالانکہ مجرم نہ تھے۔

”بابا!“ مومو نے تڑپ کر ان کے ہاتھ تھام لئے اور آنکھوں سے لگا کر بولی۔ ”مجھے گناہ گار مت کریں بابا! میری قسمت میں یہی لکھا تھا۔ میں آپ سے بالکل ناراض نہیں۔“

”سچ!“ چودھری شوکت علی نے اپنے پٹکے سے اس کے آنسو صاف کئے۔

”بالکل۔ اچھا یہ بتائیں، آپ کب آئے؟ کیسے آئے؟“ وہ ایک دم ہی پرانی جون میں آگئی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ چند لمحے پہلے وہ پلک پلک کر رہی تھی۔

”تمہارے تایا جی بیمار ہیں نا۔ مجھے پتہ چلا تو میں آ گیا۔“ انہوں نے کہا۔

”کس نے بتایا؟“

”شعیب کے علاوہ کون بتا سکتا ہے؟“ وہ اسے ہنستا دیکھ کر خود بھی مسکرا دیئے۔

”آپ نہیں جائیں گے شعیب بھائی؟“ مومو نے شعیب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں اپنی بات سے ہٹنے والا نہیں ہوں، مومو جان!“ شعیب کے ہونٹ بھیج گئے۔

”اب تم اٹھو، جاؤ منہ دھو کے کپڑے بدل دو اور آ کر چائے پیو، شاباش!“ رضیہ نے محبت سے کہا تو وہ ہنستی ہوئی اٹھی اور یہ کہتی ہوئی باہر چلی گئی۔

”بس، ابھی آئی۔ آپ چائے میں دودھ زیادہ ڈال لے گا۔“

اس کے جانے کے بعد شعیب نے کہا۔ ”چاچا! مومو کو اشو کی موت کا کیسے پتہ چلا؟“

”خدا معلوم۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ ”ہم تو چاہتے تھے کہ اسے معلوم نہ ہو۔ کون ملا ہوگا اسے؟“

”رضیہ! تم معلوم کرو۔“ شعیب نے بیوی سے کہا۔

”میں کیوں معلوم کروں؟..... تم نے تو مجھے اس قابل ہی نہ سمجھا کہ مجھے بتا دیتے۔“ رضیہ نے شکوہ کیا۔

”بھئی تم عورتیں پیٹ کی بہت ہلکی ہوتی ہو۔ کسی روز محبت میں آ کر تم بتا دیتیں۔“ شعیب نے ہنس کر کہا۔

”تم یہ بات چھپا سکتے ہو تو اور بھی چھپا سکتے ہو۔“ رضیہ ابھی تک ناراض تھی۔

”مثلاً؟“ شعیب دلچسپی لیتا ہوا بولا۔

”کسی بھی قسم کی بات۔“ رضیہ شانے اچکا کر بولی۔

”تمہارا بھائی میرے ساتھ اس طرح رہتا ہے جیسے تیر، کمان میں۔ سمجھیں؟“ شعیب نے کہا تو اس کی تیر کمان والی تشبیہ پر وہ ہنس دی۔

”رضیہ پتر! ابھی مومو سے مت پوچھنا کہ اسے کس طرح پتہ چلا ہے۔ بہت دکھی ہے وہ۔ بہت محبت تھی اسے اشو سے۔“ چودھری شوکت علی سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولے۔

”بہتر چاچا!“ رضیہ نے کہا۔ تبھی مومو آگئی اور بات ختم ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

خالی پیرید تھا۔ پروین، تسنیم کے ساتھ کینٹین گئی ہوئی تھی اور مریم سیمنٹ کی بیچ پر بیٹھی نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ کبھی اس کے معصوم سے چہرے پر سرخی پھیل جاتی اور پگھڑی جیسے نازک لبوں پر مسکراہٹ کی لکیر کھینچ جاتی۔ اسے پتہ بھی نہ چلا، پروین اور تسنیم اس کے قریب آ گئیں۔

”اے..... کن سوچوں میں گم ہو؟“ پروین نے اس کے سر پر چپت مار کر پوچھا۔

”ایسی سنہری سوچیں نہیں ہیں، جیسی تمہاری کھوپڑی میں بسی ہیں۔“ مریم تنگ کر بولی۔

”کیا بات ہے، آج کل تم قمشیر برہنہ بنی رہتی ہو۔“ تسنیم ہنس کر بولی۔

”ایک ہفتہ قبل ان کے بابا سے ملی ہوں۔ کچھ تو اثر آنا تھا۔“ مریم نے پروین کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”کیا مطلب؟“ تسنیم نے حیرانی سے پوچھا۔

”بھئی سنا ہے، پروین کے والد بہت سخت ہیں، بہت غصیلے ہیں اور.....“

”اور تمہارا سر۔“ تسنیم کو اس کی بے تکی باتوں پر غصہ آ گیا۔ ”یہ بتاؤ، علی کہاں ہے؟“

”کیوں..... مجھے اس کی سیکرٹری سمجھ رکھا ہے؟“ مریم گیلی لکڑی کی طرح چیخ کر بولی۔

”سیکرٹری نہیں، بہن تو ہونا۔“ پروین نے ہنس کر کہا۔



جواب میں مریم نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ پروین گڑبڑا گئی۔ مریم کا جی تو چاہا کہہ دے۔ ”مجھ سے زیادہ تمہیں پتہ ہوگا اپنی محبت کا۔ بھلا بھائی بہنوں کو اپنے ٹھکانے کب بتاتے ہیں؟“ مگر وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اس طرح بدنامی پروین کی ہوتی۔ علی اور پروین کی محبت ٹوٹنے لگی کی طرح یونیورسٹی میں پھیل جاتی۔ علی کوئی گم نام سالڑ کا تو تھا نہیں جو کسی کو پتہ نہ چلتا۔ پروین کی بدنامی ہوتی تو دکھ مریم کو ہوتا۔ کیونکہ وہ ایک ہی مالا کے موتی تھے اور وہ کسی صورت اپنے خاندان کی بدنامی نہیں چاہتی تھی۔

”بھئی مریم! تمہیں علی نے یاد کیا ہے۔“ علی کی کلاس فیلو عذرا نے اسے اطلاع دی۔

”وجہ؟“ اس نے اپنی سیاہ بھونرا جیسی آنکھیں اٹھا کر عذرا سے پوچھا۔

”مجھے کیا علم؟ بس یہی کہا کہ مریم کو یونین آفس میں بھیج دو۔“ عذرا یہ کہتی ہوئی حامد کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ مریم کو علم تھا کہ دراصل اس نے پروین کو بلوایا ہے۔ اسے علم تھا کہ پروین بھی اس کے ساتھ ہی آئے گی۔ اب تو اس کے کلاس فیلوز ان دونوں کو دیکھ کر یا جوج ماجوج کہنے لگے تھے۔

”لو جی، آگیا بلاوا۔“ مریم نے ہنستے ہوئے ذومعنی لہجے میں کہا۔

”تمہیں بلایا ہے۔“ تسنیم بولی۔

”ڈھونڈتی تو تم پھر رہی تھیں۔ چلو۔“ مریم نے گاؤں اور کتابیں اٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر وہ تینوں یونین آفس کی طرف بڑھ گئیں۔ راستے ہی میں تسنیم کو اپنی اسکول فیلو مل گئی، جس نے اسی سال انگلش ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ لیا تھا۔

”ہائے تسنیم! مجھے علم ہوتا کہ تم جرنلزم میں ہو تو میں بھی اسی شعبے میں آجاتی۔“ وہ تسنیم کا ہاتھ دباتے ہوئے خوشی سے چیختی آواز میں بولی۔ مریم کو اس کی آواز بڑی ناگوار لگی، وہ بولی۔

”ہم جارہے ہیں۔ تم آجانا۔“ پھر تسنیم کا جواب سنے بغیر وہ پلٹ گئی۔

”اے، تم اسے سمجھا دو کہ میری آڑ میں شکار نہ کھیلے۔“ پروین کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے مریم نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ پروین کچھ نہ سمجھی۔

”مطلب یہ کہ میرا کندھا بہت نازک ہے، اس پر رکھ کر بندوق نہ چلائے۔“ مریم نے

پھر بات ڈھکے چھپے لفظوں میں کہی۔ مگر بات اس قدر کلیئر تھی کہ پروین سمجھ گئی۔

”تم خود کہہ دو۔“ پروین نے شریکیں مسکراہٹ سے کہا۔

”میں نہیں چاہتی کہ علی بھائی کو علم ہو کہ میں نے ان کے دل کی سلیٹ پر تمہارا نام لکھا

دیکھ لیا ہے۔“

”کیوں؟“ پروین نے پوچھا۔

”فضول میں شرمندہ ہوں گے اور ایک دوسرا مسئلہ بھی کھڑا ہو جائے گا۔“ مریم نے کہا۔

”کیسا مسئلہ؟ تمہیں ہر بات میں سسپنس پیدا کرنے کی عادت ہے۔ صاف صاف کہو نا۔“ پروین چوکر بولی۔

”جی جناب! پھر تو تم دونوں مجھے رولر کے طور پر استعمال کرو گے۔ جہاں محبتیں ہوتی ہیں، وہاں جھگڑے بھی ہوتے ہیں۔ اور پھر مجھے ثالث کا کام کرنا پڑے گا۔ یہ میرے بس کی بات نہیں۔“ مریم نے ناخن کترتے ہوئے کہا۔

”ہمارا جھگڑا نہیں ہونے کا۔“ پروین نے وثوق سے کہا۔

”ہو سکتا ہے۔ ابھی معاملہ نیا نیا ہے۔ چند ماہ تو ہوئے ہیں۔“ مریم نے بے پروائی سے کہا۔

”اچھا، کیسے ہوگا جھگڑا؟“ پروین دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔

”کسی طرح بھی۔ فرض کرو، علی بھائی تم سے کہیں کہ فلاں جگہ ملنا۔ تم نہ ملو تو ناراضگی شروع۔ ہے نا؟“

”مگر میں کیوں نہ ملوں؟ اور تمہیں کیا علم کہ ہم ملتے ہیں یا نہیں؟“ پروین نے شوخی سے کہا۔

”اچھا! بہت آگے بڑھ گئی ہو۔“

”ابھی تک ایسا موقع آیا تو نہیں، مگر مجھے علم ہے کہ علی کہیں باہر ملنے کے لئے کہے گا تو میں انکار نہیں کر سکوں گی۔“ پروین کی آنکھوں میں علی کی محبت کی قدیلیں جل اٹھیں۔

”کیوں؟“ مریم نے ابرو چڑھا کر سوال کیا۔

”کیونکہ مجھے اس سے محبت ہے۔ محبت، جو زندگی ہے، نور ہے۔ عبادت کا درجہ دیتی ہوں میں محبت کو۔ محبت مطلوب ہے، طالب نہیں۔“ پروین جذب کے عالم میں بولی۔

”یہ سارے محبت کرنے والے تم جیسے پاگل ہی ہوتے ہیں۔ دنیا جہاں کے مسئلے نکال کر بیٹھ جاتے ہیں۔ حالانکہ محبت زندگی ہے نہ نور ہے۔ فراڈ ہے، بربادی ہے۔“

”تمہیں کیا پتہ؟ کبھی محبت کی ہو تو پتہ چلے۔ محبت دنیا کا خوب صورت ترین جذبہ ہے۔“ پروین بولی۔

”پروین ڈیر! یہ تب تک خوب صورت ترین جذبہ ہے، جب تک پیٹ میں روٹی ہو۔ پیٹ خالی ہوگا تو یہی زندگی تمہیں جہنم لگے گی۔ اس محبت کے نور سے تم اندھیرا کمرہ روشن کر کے دکھا دو تو مان جاؤں۔ سب چوٹیلے ہیں۔“ مریم نے تڑخ کر کہا۔

”تم بہت خوف ناک باتیں کرتی ہو۔“ پروین کپکپا کر بولی تو مومو مسکرا دی۔ وہ سوچ



”بھئی مریم! تم ہو بہت خوش قسمت۔“

”واقعی۔“ مریم کے لبوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”ہاں..... جسے تم چاہتی ہو، اسے اپنا لو گی۔“ باسمہ اُس کے ہاتھ کی لکیروں پر پنسل پھیرتی ہوئی بولی۔

”لا حول ولا۔ میں نے تو ابھی تک کسی کو نہیں چاہا۔“ مریم نے ہاتھ کھینچ لیا۔

”یار! دیکھنے تو دو۔ دیکھو، شہادت کی انگلی کے نیچے یہ جو کراس ہے نا، یہ اسی بات کو ظاہر کرتا ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ جو چھوٹی سی لکیر ہے، یہ کامیابی کی ہے۔“ باسمہ اسے سمجھانے لگی۔

”ابھی مزید اسٹڈی کرو۔ کبھی اپنا ہاتھ بھی دیکھا ہے تم نے؟“

”ہاں دیکھا ہے۔ بلکہ پامسٹری کی اسٹڈی اپنے ہاتھ پر کی ہے۔“ باسمہ نے بتایا۔

”ایسی لکیر تمہارے ہاتھ میں بھی ہو گی۔“ مریم نے دثوق سے کہا۔

”ہے تو سہی، مگر اس کے ساتھ کامیابی کی لکیر نہیں ہے۔“ باسمہ کے لہجے میں ٹوٹے کانچ جیسی کھنک تھی۔

”بڑا افسوس ہوا۔“ مریم نے دکھ سے کہا۔

”تمہیں افسوس کیوں ہو رہا ہے؟ تم تو خوش قسمت ہو۔“ باسمہ خواخوہ ہی زور سے ہنس دی۔

”علی بھائی! منع کریں باسمہ کو۔“ مریم نے پلٹ کر علی سے مدد لی۔ علی گھبرا سا گیا اور اس کے ہاتھ سے پنسل چھوٹ گئی۔ پروین نے بھی قلم چھپا لیا اور مریم نے بڑی مشکل سے ہنسی کے فوارے کو روکا۔ اصل میں وہ دونوں ان کی موجودگی میں کاغذ پر لکھ لکھ کر باتیں کر رہے تھے اور حقیقت میں ان دیوانوں کو خیال ہی نہیں رہا تھا کہ ان کے علاوہ بھی کوئی اور موجود ہے اور انہیں مخاطب کر سکتا ہے۔ واقعی محبت بالکل اندھی، گونگی، بہری ہوتی ہے۔

”پروین! تم دکھاؤ ہاتھ باسمہ کو۔ سچ، بہت اچھا دیکھتی ہے۔“ علی خود پر قابو پاتا ہوا بولا۔

”آپ نے دکھایا علی بھائی؟“ مریم نے پوچھا۔

”ہاں..... بالکل سچ سچ بتایا ہے اس نے۔“ علی کی آواز میں شوخی تھی۔

”مجھے تو صحیح بتایا نہیں۔“ مریم منہ بسور کر بولی۔

”بھئی تم دکھاؤ نا۔“ علی نے پروین کو مجبور کیا۔

”میں نہیں دکھاتی۔“ پروین نے آہستگی سے کہا۔

”کیوں؟“ علی نے حیرانی سے پروین کی طرف دیکھا۔

”مجھے اس وقت ایک آزاد نظم یاد آ رہی ہے۔“ پروین گال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے

رہی تھی۔ میں نے محبت کو بہت قریب سے نفرت میں بدلتے دیکھا ہے۔ اپنی ماں اور سوتیلے باپ کی محبت کے جنون کی کہانی سنی ہے۔ پھر اپنی ماں کے آخری ایام بھی دیکھے۔ اسی محبت نے اسے ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔ میرے دماغ میں آج بھی راجا کے وہ الفاظ گونجتے ہیں۔ ”مجھے کسی اور کا نہیں ہوتے دیکھ سکتیں تو مر جاؤ۔“ میری ماں نے اپنی محبت کی لاج رکھ لی اور مر گئی۔ کتنا بھیاںک انجام تھا اس محبت کا۔ اُسے پتہ بھی نہ چلا اور وہ پروین کے ساتھ سوچوں میں گم یونین آفس پہنچ گئی۔ چونکی تو تب، جب علی کہہ رہا تھا۔ ”میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا، مریم!“

تب مومو کا جی چاہا کہہ دے۔ ”علی بھائی! آپ کیسے کڑیل شخص کے منہ سے یہ جملہ اچھا نہیں لگ رہا۔ اتنا جھوٹ بھی نہ بولیں کہ سچ پر سے اعتبار ہی اٹھ جائے۔“ مگر وہ ہمیشہ کی طرح خاموش رہی اور مسکراتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی یہ مسکراہٹ اس کے چہرے کا لازمی جز تھی۔ اپنے تمام دکھ درد وہ اسی مسکراہٹ کے پیچھے چھپا لیتی تھی۔

”ارے..... تو باسمہ بی بی بھی موجود ہیں۔“ اس نے حیرت سے کہا۔

”ہاں..... کچھ نوٹس تیار کرنے تھے۔“ باسمہ نے بغیر سر اٹھائے جواب دیا۔

”اور تمہیں یونین آفس سے بہتر اور جگہ مل ہی نہیں سکتی تھی۔“ مریم نے کہا تو باسمہ بری طرح جھینپ گئی اور علی، نوید اور عاصم ہنس دیے۔

”ارے باسمہ! تمہاری ہاتھ کی لکیروں کی اسٹڈی کہاں تک پہنچی؟“ مریم نے پوچھا۔ اسے پتہ چلا تھا کہ باسمہ آج کل پامسٹری کی کتابیں پڑھ رہی ہے۔ پتہ نہیں، ایک دم اسے قسمت سے کیا دلچسپی ہو گئی تھی۔

”ابھی پڑھ رہی ہوں۔“ باسمہ تیزی سے قلم چلانے لگی۔

”میرا ہاتھ دیکھو نا۔“ مریم اس کے قریب جا بیٹھی۔

”یار! کام کرنے دو۔“ باسمہ نے کہا۔

”پھر کر لیتا۔“ مریم بچوں کی طرح مچل کر بولی اور اپنی گلابی ہتھیلیاں باسمہ کے سامنے پھیلا دیں۔

”بھئی یہ تو دکھا کر ہی دم لے گی۔“ عاصم ہنس دیا۔

”علی! مجھے اجازت دو، تاکہ میں ایک بجے کے پوائنٹ سے چلا جاؤں گھر۔“ نوید اٹھتا ہوا بولا۔ علی نے بھی اسے روکنا مناسب نہ سمجھا۔

”یار عاصم! تم ذرا چائے کا تو کہہ آؤ۔“ علی نے کہا۔

”بہتر سائیں!“ عاصم ہنس کر بولا اور پھر نوید کے ساتھ یونین آفس سے باہر نکل گیا۔

باسمہ، مریم کے مجبور کرنے پر اس کا ہاتھ دیکھنے لگی اور پھر بولی۔



بولی۔

”جس کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا۔ اچھی آزادی ہے، جدھر منہ اٹھا چل دیئے۔“ مریم پٹ سے بولی تو وہ تینوں ہنس دیئے۔

”اچھا، وہ نظم سناؤ۔“ علی نے اسے والہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے فرمائش کی۔ باسمہ پہلو بدل کر رہ گئی اور مریم نے سنا، پروین کہہ رہی تھی۔

”اس نظم کا عنوان ہے ”ڈر“۔“

”اچھا۔“ مریم صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ پروین نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ بولی۔ ”بھئی پاؤں اس لئے اوپر کر لئے ہیں کہ تمہاری آزاد نظم کے جہاں سینک سائیں، چلی جائے۔ میرے پیروں سے نہ لپٹتی پھرے۔“

”بھئی تم اس کی باتوں پر مت جاؤ، نظم سناؤ۔“ علی کو نظم سننے کی پڑی تھی۔ اسے علم تھا، یقیناً کوئی چٹ پٹ سی نظم ہوگی۔ یقیناً کوئی پیغام ہوگا۔

”ہاں..... تو شاعرہ کہتی ہے۔“ پروین بولی اور نظم سنانے لگی۔

”میں کسی کو اپنا ہاتھ نہیں دکھاتی

ڈرتی ہوں

کہ وہ میرے ہاتھ کی لکیروں میں

تیرا نام نہ پڑھ لے

اور پھر یہ نہ کہہ دے

کہ میں تجھے نہ پاسکوں گی“

پروین نے بڑے خوب صورت انداز میں نظم پڑھی اور علی زور سے ہنس دیا۔



رضیہ، مومو کے سر میں مساج کر رہی تھی۔ مومو کبھی بھی ملازمہ سے سر میں تیل نہیں لگواتی تھی۔ وزیراں اتنی زور سے چوٹی ہتھیلی سے رگڑتی کہ مومو کے سر میں کئی دن تک درد رہتا۔ اس لئے اب یہ ڈیوٹی رضیہ نے سنبھال لی تھی۔ وہ چھٹی کے دن مومو کے سر میں تیل لگاتی۔ اس کی مومی انگلیاں دھیرے دھیرے مومو کے بالوں میں پھرتی رہتیں اور اسے نہایت سکون ملتا۔ رضیہ اسے بالکل بچیوں کی طرح چاہتی تھی۔

”بھابی! ایک بات کہوں۔“

”کہو!“ رضیہ نے اس کے بال لپیٹتے ہوئے کہا۔

”اب گیتو بڑا ہو گیا ہے نا۔“ مومو نے چمکتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہوں۔ پھر؟“ رضیہ نے اس کی طرف دیکھا۔

”پھر اب ایک اور ننھی سی چیخ ابھرنی چاہئے۔“ مومو کے لہجے میں شرارت تھی اور رضیہ بیر بہوٹی بن گئی۔ چھوٹی موٹی کے پودے کی طرح اپنے آپ میں سمت گئی اور مصنوعی غصے سے بولی۔

”لڑکیاں ایسی باتیں نہیں کرتیں۔“

”کیسی باتیں؟“ مومو نے ستانا چاہا۔ رضیہ نے اسے گھورا تو وہ ہنستی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

”بھابی جی! غلط بات تو نہیں کہی میں نے۔ بھرا پرا گھر اچھا لگتا ہے۔ ہلا گلا، شور شرابا۔ اور ویسے بھی بہن بھائیوں میں اتنا زیادہ فرق نہیں ہونا چاہئے کہ ایک دوسرے سے بے تکلف ہی نہ ہو سکیں۔“ مومو نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ اس سے پہلے کہ رضیہ کچھ کہتی، رضانی آ گیا۔

”مومو بی بی! کوئی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔“

”مجھ سے؟“ مومو نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں جی۔ میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔“ رضانی آنکھیں جھپکتا

ہوا بولا۔



”نام نہیں بتایا؟“

”کہنے لگے، کہہ دو، شیخو آیا ہے۔“ رضانی نے کہا تو مومو ہنستی ہوئی بیڈ سے اتری اور چپل پہنتے ہوئے بولی۔ ”رضانی بابا! شیخو نہیں، شیخو کہا ہوگا۔“

”ہاں..... ہاں جی۔“ رضانی بولا۔

”کون ہے؟“ رضیہ نے حیرت سے پوچھا۔

”بس آپ آئیں، میں ملو ادوں گی۔ ذرا چائے کا بھی کہہ دیں۔“

”تم اس حالت میں جاؤ گی؟“ رضیہ نے کہا۔

”کیا ہوا بھابی جی؟ میں تو اب لاکھ درجے بہتر ہوں۔ پہلے سے بھی بری حالت میں اس کے سامنے جانی رہی ہوں، جب میرے کپڑوں پر کئی پیوند لگے ہوتے تھے۔ بال، تیل اور کنگھے سے نا آشارہتے تھے۔“ مومو کی آواز لرز گئی اور پھر وہ سر پر دوپٹہ جماتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اس نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو دوپٹے سے صاف کئے اور ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ شیخو اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔

”تمہیں بہت جلد خیال آ گیا مجھ سے ملنے کا۔“ مومو نے شکوہ کیا۔

”وہ..... وہ مومو! بس آنہیں سکا۔“ ذہنی طور پر اس شکوے کے لئے تیار نہیں تھا۔

”پتہ ہے، پورے ستائیس روز بعد آئے ہو۔“ مومو نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”دنوں کا حساب رکھنے لگی ہو؟“ شیخو نے شرارت سے کہا تو وہ جھینپ گئی۔

”بھئی تم نے کوئی نام پتہ ہی نہ چھوڑا۔ اور شیخو! اس وقت میں اس قدر اپ سیٹ تھی کہ تم سے کچھ پوچھ ہی نہ سکی۔“ وہ اُداس ہو گئی اور شیخو اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ تم آج بھی گئے دنوں کی مومو ہو۔ ذرا بھی تو تم میں تبدیلی نہیں آئی۔ وہی سادگی، وہی حسن، بالکل پہلے کی طرح ہر بات کھٹ سے کہہ دینا۔ شہر والوں کی مصنوعی دنیا کا رنگ تو تم پر بالکل نہیں چڑھا۔ آخر تم بچ کس طرح گئیں؟ تمہارے چہرے پر کوئی خول مجھے نظر نہیں آ رہا۔ تمہارے دل کی ہر بات چہرے پر لکھی نظر آتی ہے۔ ورنہ یہاں تو چہرے کچھ بولتے ہیں اور دلوں میں کچھ ہوتا ہے۔

”اوہو، شیخو! کیا سوچ رہے ہو؟..... اور بیٹھو نا، کھڑے کیوں ہو اب تک؟“ مومو کی آواز اسے سوچوں کے خود رو جنگل سے گھسیٹ لائی۔ وہ جھینپا جھینپا سا بیٹھ گیا۔

”تم نے بتایا نہیں، اتنے دن کہاں غائب رہے؟“

”بس، بہت پریشان تھا۔“ وہ بولا۔

”ایسی کیا پریشانی ہے جو مجھے نہیں بتائی جاسکتی؟“ مومو نے کہا۔

”ارے نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ وہ تمہیں بتایا تھا نا کہ ماسٹر مراد ہسپتال میں ایڈمٹ تھے۔“ شجاع نے کہا۔

”ہاں، ہاں..... اب کیسی طبیعت ہے؟“

”تمام تکلیفوں سے چھٹکارا پا گئے۔“ شجاع آہ بھر کر بولا۔

”ویری سیڈ۔“ مومو کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

”ان کی میت لے کر گاؤں گیا تھا۔ کل ہی واپس آیا ہوں۔ میرا مستقبل بنانے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ اگر وہ نہ ہوتے تو.....“

”بس شیخو! خدا ویلے تو بنا ہی دیتا ہے۔ اب مجھے دیکھو، نہ میری ماں مرنے اور نہ میں اپنے بابا کے پاس آئی۔ اور آج پتہ ہے میں یہاں نہ ہوتی، بلکہ.....“ وہ رُک گئی۔

”بلکہ؟“ شجاع نے اس کی طرف دیکھا۔

”بلکہ احمد پور کے یا کسی اور گاؤں کے کسی ہاری کی بیوی بن جاتی اور اس وقت گوبر کے اُپلے تھاپ رہی ہوتی۔“ وہ زور سے ہنس دی۔

”اب تم وہ سب کچھ بھول جاؤ۔“ شجاع نے مشورہ دیا۔

”شیخو! جو لوگ اپنا ماضی بھول جاتے ہیں، وہ کم ظرف ہوتے ہیں۔ اور میں کم ظرف نہیں بننا چاہتی۔ کبھی کبھی اپنے ماضی کی مومو سے حال کی مومو کا موازنہ ضرور کرتی ہوں۔

اس سے ایک فائدہ ہے۔“

”کیسا فائدہ؟“ شجاع نے حیرت سے پوچھا۔

”میں بھٹک نہیں سکتی۔ کسی کو خود سے کم تر نہیں سمجھتی۔ انسان کبھی کبھی اپنے ماضی میں جھانک لے تو میرے خیال میں وہ گناہ نہیں کر سکتا، کسی کا دل دکھانا بھی تو گناہ ہے نا۔“

”ہاں..... یہ تو ہے۔“ شجاع نے اس کی بات کی تائید کی۔

”شیخو! کیا تم اپنا ماضی بھول گئے؟“ مومو نے یکایک اس سے سوال کر دیا۔

”اگر بھول جاتا تو تمہیں بھی بھول جاتا۔ تم بھی میرے ماضی کا ایک حصہ ہو۔“ شجاع کی آنکھوں میں محبت کا نور لشکارے مار رہا تھا۔

”سچ؟“ مومو بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔

رضیہ چائے لے آئی تو شجاع اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”بھابی جی! مجھے کہا ہوتا۔ وزیراں کہاں ہے؟“ مومو شرمندہ سی ہو گئی۔

”وہ گیتو کو نہلا رہی تھی۔ میں خود ہی لے آئی۔ کیا فرق پڑتا ہے؟“

”شیخو! یہ میری بھابی ہیں..... اور بھابی! یہ شجاع ہے، میرے بچپن کا ساتھی۔“ مومو کلی کی طرح چمک کر بولی۔



”آداب!“ شجاع نے نہایت ادب سے کہا۔

”جیتے رہو۔ بیٹھو!“ رضیہ نے بزرگوں کے سے انداز میں کہا۔ مومو چائے بنانے لگی اور رضیہ فوج سے باتوں میں لگ گئی۔

”کب ملاقات ہوئی تمہاری شجاع سے؟“

”جس روز بابا جانی آئے تھے۔“ مومو نے شجاع کو چائے کی پیالی پکڑاتے ہوئے کہا۔

”اچھا!“ رضیہ کو سب یاد آ گیا۔ اس روز مومو تڑپ تڑپ کر روئی تھی اور چودھری شوکت علی اور شعیب نے جو ایک کام رضیہ کے ذمے لگایا تھا کہ مومو سے وہ پوچھے کہ کس نے اشوکی موت کے بارے میں اسے بتایا ہے۔ رضیہ ہزار کوشش کے باوجود بھی مومو سے نہ پوچھ سکی۔ وہ مومو کو کوئی دکھ نہیں پہنچا سکتی تھی۔ ایسا دل چیرنے والا ذکر نہیں چھیڑنا چاہتی تھی۔ وہ مومو کے ہنستے کھلکھلاتے چہرے کو کملایا ہوا دیکھنے کی خود میں سکت نہ پاتی تھی اور مومو جب بھی رضیہ کے قریب ہوتی، اپنی باتوں سے اسے بھی ہنساتی اور خود بھی ہنستی۔ یونیورسٹی کے قصبے سناتی اور رضیہ ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرے سنتی رہتی۔

”کب سے ہو کر اچی میں؟“ رضیہ نے شجاع سے پوچھا۔

”ڈیڑھ سال ہو گیا ہے۔“ شجاع نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

”اکیلے ہو یا.....؟“ رضیہ نے شوخی سے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ جملوں کا حسن ادھورے

پن میں ہوتا ہے اور سننے والا انجوائے کرتا ہے۔

”فی الحال تو اکیلا ہی ہوں۔“ شجاع کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ مومو کو اس کے تلخ چہرے پر سرخی بھلی لگ رہی تھی۔ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”بھابی! فوج تو لڑکیوں کی طرح شرمارہا ہے۔“ پھر شجاع کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے

بولی۔

”آخر کب تک اکیلے رہو گے؟ شادی وادی کر ہی ڈالو۔“ مومو نے مشورہ تو دے دیا

مگر اسے یوں لگا جیسے اندر ہی اندر ادا سیاں تہہ در تہہ اترتی جا رہی ہوں اور پھر یہ ادا سی امرتیل کی طرح دل کی دیواروں سے چٹ گئی۔

”بھئی مومو نے تمہیں مشورہ تو دیا ہے فوج!“ رضیہ، شجاع کو خاموش دیکھ کر بولی تو نہ جانے کیوں چائے کی پیالی اس کے ہاتھ میں کپکپا کر رہ گئی تھی۔ تب مومو کا اندر چیخ چیخ کر

کہنے لگا۔ ”فوج! تم کہہ دو، یہ تو بے تکی باتیں کرنی ہے۔ اُلٹے سیدھے مشورے دیتی ہے۔ حالانکہ اس کا دل راضی نہیں ہے۔“ مگر مومو نے سنا، وہ کہہ رہا تھا۔

”اس کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔“

مومو نے نہایت زخمی نظروں سے اسے دیکھا اور پھر وہی نرالی مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجا

لی جو اس کی ذات کا خاصہ تھی۔

”اچھا بھابی! اب اجازت دیجئے۔“ وہ پیالی رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”ارے..... اتنی جلدی؟ کھانا کھا کر جائیں۔“

”نہیں..... آج نہیں۔ ایک دوست کے ہاں پہنچنا ہے۔“ وہ بڑے شائستہ انداز میں

معذرت کر رہا تھا۔

”اب اور کتنے دن غائب رہو گے؟“ مومو نے اپنا مچلتا دل قابو میں کرتے ہوئے

پوچھا۔

”آہی جاؤں گا۔“ شجاع کا لہجہ بجھا بجھا ہوا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا، میاں! جو تم سوچ

رہے ہو وہ مومو کے خواب و خیال میں بھی نہیں۔ کیوں سراب کے پیچھے دوڑ رہے ہو؟

”کوئی پتہ شتہ تو دے جاؤ۔“ مومو نے کہا تو اس نے جیب میں سے ایک کارڈ نکال کر

مومو کی طرف بڑھا دیا۔

”شکریہ!“ مومو نے ہولے سے کہا۔ ”پھر کب آؤ گے؟“ اس نے دوبارہ پوچھا۔

”جلد آ جاؤں گا۔“ شجاع بولا۔

”انتظار رہے گا۔“

”واقعی؟“ اس کی آنکھوں میں الوہی سی چمک ابھری۔ اس چمک نے مومو کے دل میں

ہلچل مچا دی۔

”ظاہر ہے، دوستوں سے ملنے کا انتظار ہی رہتا ہے۔“ وہ نہایت بے پروائی سے بولی۔

”اب کے آؤ گے تو شعیب سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔“ رضیہ نے کہا۔ ”اس وقت

وہ گھر پر نہیں۔ آج ان کا دوست اشعر پی ایچ ڈی کر کے آیا ہے، اس سے ملنے سویرے ہی

چلے گئے۔ اگر پتہ ہوتا تو میں انہیں روک لیتی۔“

”پھر کبھی سہی۔“ شجاع نے ہنس کر کہا۔

”ہاں!“ رضیہ بھی ہنس دی، پھر وہ خدا حافظ کہہ کر چلا گیا اور مومو ہلتا ہوا پردہ دیکھتی رہ

گئی۔

”اب جا چکا وہ۔“ رضیہ نے اس کے چہرے کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

”لگتا ہے وہ مجھ سے ناراض ہو گیا ہے بھابی!“ مومو نے ہولے سے کہا۔

”کیسے اندازہ لگایا تم نے؟“ رضیہ نے حیرانی سے پوچھا۔

”میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے، اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ اسے

میری کوئی بات بری ضرور لگی ہے۔“ مومو نے کہا۔

”اب آئے تو پوچھ لینا۔“ رضیہ نے کہا۔



”علیکم السلام! کیسی ہو؟“ صفدر اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔  
”ٹھیک ہوں۔ کیسے یاد آگئی آج؟ انکل جی کے آنے سے تو آپ ادھر کا راستہ ہی بھول گئے۔“ مومو نے ہنس کر چوٹ کی۔

”شعیب اور رضیہ کہاں ہیں؟“ وہ اس کی چوٹ نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔  
”گیتو کے کلاس فیلو پوپ کی برتھ ڈے پارٹی ہے، وہیں گئے ہیں۔“  
”اتنی جلدی؟..... میرے خیال میں برتھ ڈے پارٹی تو مغرب کے بعد ہوتی ہے۔“  
”پہلے سرور بھائی کے ہاں جانا تھا۔“ مومو نے کہا۔  
”اچھا ہے، تم اکیلی ہو۔“  
”جی.....“ مومو گھبرا گئی۔

”میں نے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“  
”کیا؟“ اس نے جلدی سے پوچھا۔

”مریم! کل پروین کو تم نے ڈراپ کیا تھا گھر؟“ صفدر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں الجھا دیں اور مومو کا دل اچھل کر حلق میں آگیا، اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔  
”چائے پیس گے آپ؟“ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔  
”میں چائے پی کر آیا ہوں۔ بس تم میرے سوال کا جواب دو۔ دیکھو جھوٹ نہ بولنا۔“  
صفدر کا لہجہ نرم ہونے کے ساتھ ساتھ سخت بھی تھا۔

”وہ..... وہ صفدر بھائی.....!“ مریم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے بتائے کہ پروین کبھی بھی واپسی پر اس کے ساتھ نہیں آئی تھی۔ جس روز ان کی کلاسز ایک بجے آف ہوتی تھیں تو پروین پوائنٹ سے جاتی تھی اور مومو جان بوجھ کر لائبریری میں نوٹس بنانے کے لئے رک جاتی۔ وہ صرف یہ چاہتی تھی کہ علی شرمندہ نہ ہو کہ اس کے ویک پوائنٹ کا پتہ مومو کو چل گیا ہے۔ پھر پروین اور علی نہ جانے کہاں کہاں گھومتے پھرتے رہتے اور مومو نے کبھی پروین سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ گھر کیسے پہنچی؟ کب پہنچی؟ وہ اس بات کو پروین کا ذاتی معاملہ سمجھتی تھی اور اب پروین محبت میں اتنی آگے جا چکی تھی کہ پلٹنا مشکل نظر آتا تھا۔ اس نے تو اپنی واپسی کے سارے راستے مسدود کر دیئے تھے۔

”تمہاری خاموشی کو کیا سمجھوں میں؟“ صفدر نے لفظ چبا چبا کر ادا کئے۔

”پروین نے کچھ بتایا؟“ مومو نے دانتوں سے ناخن کاٹتے ہوئے کہا۔

”ہم لڑکیوں سے کبھی کچھ نہیں پوچھتے مریم!“ صفدر اٹھ کھڑا ہوا اور ٹہلے ہوئے بولا۔  
”ہمارے بزرگ جو فیصلہ کر لیتے ہیں، وہ پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی جوانی کے طوفان میں بھٹک گئی ہے، تبھی تو کل وہ اس لڑکے کے ساتھ اسکوٹر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور

”کیا پوچھوں؟ جبکہ مجھے علم ہے کہ وہ کس بات پر ناراض ہے۔“ مومو نے ہاتھ میں پکڑے کارڈ پر نظریں جمادیں۔

”مجھے نہیں بتائے گی؟“ رضیہ نے محبت سے کہا۔

”اوہ، کیوں نہیں بتاؤں گی؟“ وہ ضرورت سے زیادہ تیز آواز میں بولی۔ ”اصل میں اسے میرا مشورہ برا لگ گیا ہے۔“

”مشورہ؟“ رضیہ نے حیرت سے یہ لفظ دہرایا۔

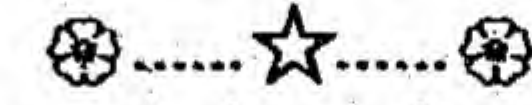
”وہی شادی والا مشورہ۔ اور پتہ نہیں بھابی! میں خود بھی اُداس ہو گئی تھی اس سے۔“  
مومو نے نہایت کھلے دل سے اعتراف کیا۔

”ہوں..... تو یہ بات ہے۔“ رضیہ نے شرارت سے کہا۔ ”اچھی طرح سوچ لو۔“

”سوچنا کیا بھابی جی! یادوں پر پڑی ہوئی گرد کھرچی ہے تو ساری یادیں شیشے کی طرح چمک گئی ہیں، اور..... اور.....“ وہ خاموش ہو گئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

”اور تم بچپن کے ساتھی کو زندگی کا ساتھی بنانا چاہتی ہو۔ ہے نا؟“ رضیہ نے کہا تو مومو نے سر جھکا لیا حتیٰ کہ اس کی ٹھوڑی سینے سے جا لگی۔ اس خوب صورت اعتراف پر رضیہ نثار ہو گئی۔ اسے خوشی تھی کہ مومو نے جھوٹ نہیں بولا۔

”خدا تمہارے دل کی مراد پوری کرے۔“ رضیہ نے اسے لپٹا کر محبت سے چور لہجے میں کہا تو مومو نے اس کے سینے میں منہ چھپاتے ہوئے صدقِ دل سے آمین کہہ دیا۔



آسمان پر شفق کی لالی پھیلی ہوئی تھی اور پنکھ پکھیر اپنے آشیانوں کو واپس جا رہے تھے۔ مریم لان میں بیٹھی اڑتے پرندوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ ”ہر کوئی اپنے مرکز کی طرف لوٹ جاتا ہے اور..... اور ایک میں ہوں، مجھے اب تک علم نہیں کہ میرا مرکز کون سا ہے، کہاں جانا ہے، حسن پور یا احمد پور؟..... احمد پور کا نام ذہن میں آتے ہی اس کے دل میں پھلجھڑیاں سی پھوٹنے لگیں۔ احمد پور اسے بہت عزیز تھا۔ مگر تجو اس روز کے بعد کیوں نہیں آیا؟ کیا واقعی ناراض ہے مجھ سے؟ کل بابا جانی آ رہے ہیں، اسے چاہئے کہ وہ بابا سے مل لے۔ بابا جانی اسے دیکھ تو لیں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی، جو قسمت میں ہوگا، مل جائے گا۔ تم بھی پاگل ہو، مومو! کیا خبر اس کے دل میں کیا ہو؟..... دل کی آواز نے اس کی سوچوں پر شب خون مارا۔ میں ابھی اسے فون کرتی ہوں۔“ مومو کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر گاڑی کی آواز پر وہ چونکی۔ یہ صفدر علی تھا۔

صفدر علی نے بھی اسے دیکھ لیا تھا، تبھی تو گاڑی لاک کر کے اسی کی طرف آگیا۔

”السلام علیکم صفدر بھائی!“



مریم! اگر اس سے بابا جان کے پاس بندوق ہوتی تو ان دونوں کی لاشیں اسی سڑک پر خون میں نہائی ہوتیں۔ مگر بابا جان خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔“ صفدر کا لہجہ سخت تھا۔  
 ”یعنی..... یعنی چودھری طالب علی نے انہیں دیکھا تھا؟“ مومو کپکپا کر رہ گئی۔  
 ”ہاں..... وہ ڈاکٹر سے چیک اپ کروا کر آرہے تھے، ایک سنگٹل پر جب ٹریفک رُکا تو بالکل ان کے قریب ہی..... آف، میں کیسے بتاؤں؟“ صفدر علی نے شدت کرب سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ ”مجھے بتاؤ وہ کون ہے؟“

”میں نہیں بتا سکتی۔“ مومو نے نہایت اطمینان سے کہا۔  
 ”کیوں؟“ صفدر نے چیخ کر کہا۔

”آپ کا خاندان مظالم میں مشہور ہے صفدر بھائی! اور میں نہیں چاہتی کہ اس کو کوئی زک پہنچے۔“ مومو نے ہمت کر کے کہا۔ حالانکہ اس کا رنگ فق ہو چکا تھا۔  
 ”اُسے کچھ نہیں کہا جائے گا مریم!“ صفدر علی اس کے قریب آئے اور محبت سے بولے۔ ”اگر..... اگر وہ ہمارے معیار کا ہوا تو میں بابا جان کو منالوں گا۔“

”سچ؟“ مومو خوش ہو گئی۔ صفدر علی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”وہ سکندر علی، یونیورسٹی یونین کا صدر ہے اور.....“ پھر مومو نے صفدر علی کو علی کی ذہانت، شرافت، وجاہت کے متعلق سب کچھ بتا دیا، حتیٰ کہ یہ بھی بتا دیا کہ اس کا باپ ایک معمولی بل مزدور ہے۔

صفدر علی تمام معلومات حاصل کر کے بہت خوش تھا دل ہی دل میں۔ اس نے مکاری سے مریم سے سب کچھ پوچھ لیا تھا۔ اور سادہ لوح مریم کو علم ہی نہ تھا کہ وہ کس کی شہ پر ایسا کر رہا ہے۔ وہ چودھری طالب علی کا بیٹا تھا اور پھر مشہور و معروف بیرسٹر تھا۔ چالاکی اسے ورثے میں ملی تھی۔ دل میں چھپے ہوئے راز وہ منٹوں میں اُگلوا لیتا تھا۔

”اچھا مریم! اب میں چلتا ہوں۔“ صفدر نے ٹیبل پر سے چابیاں اٹھاتے ہوئے کہا۔  
 ”بیٹھے، شعیب بھائی تو آجائیں۔“ مریم نے اسے اتنی جلدی جاتے دیکھ کر کہا۔  
 ”نہیں ڈیر! بابا جان صبح حسن پور جا رہے ہیں۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔  
 ”کیوں؟“ مومو نے حیرت سے پوچھا۔

”بھئی پورے تین ماہ رہ لئے ہیں۔ اور ویسے بھی امی جی کی طبیعت کی خرابی کی اطلاع ملی ہے، پروین بھی بابا کے ساتھ جائے گی۔“ صفدر نے بتایا۔  
 ”مگر مجھے تو آج تک اس نے نہیں بتایا تھا۔“ مریم کی چھٹی جس خطرے کا الارم بجانے لگی۔

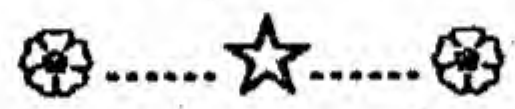
”اسے یاد نہیں رہا ہوگا۔ میں نے تو کہا رک جائے، لیکن اسے امی کو دیکھے بنا چین

تھوڑی آئے گا؟“ صفدر ہنسا۔

”جی..... ماں بہت ہی پیاری شے ہوتی ہے۔ جن کی ماں ہوتی ہے، انہیں قدر کرنی چاہئے۔“ مریم نے آہستگی سے کہا۔

صفدر ہنستا ہوا پورچ کی طرف بڑھ گیا اور چند لمحوں بعد اس کی گاڑی آہنی گیٹ سے باہر جا رہی تھی۔ مگر مومو اپنی جگہ گم صم سی بیٹھی تھی۔ اس کی روح کی گہرائیوں سے کوئی پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔

”مومو! تم نے صفدر علی کے بارے میں بتا کر اچھا نہیں کیا۔“ کوئی اس کا دل مٹھی میں لے کر بھینچ رہا تھا۔ مومو کو یوں لگا، جیسے اس کی جان نکلتی جا رہی ہو۔ ”تم چوٹ کھا گئیں مومو!“..... ”نہیں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اپنے رونے کی وجہ خود اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اب پتہ چلا تھا کہ اپنے ایسی کند چھری سے ذبح کرتے ہیں کہ کراہنے کی اجازت بھی نہیں دیتے۔



”صفدر! یہ سب تیری کمزوری کی وجہ سے ہوا۔ ہمارے ہاں اس عمر میں لڑکیوں کو اتنا آزاد نہیں چھوڑتے۔“ چودھری طالب علی مٹھیاں بھینچتے ہوئے آپے سے باہر ہو رہے تھے۔  
 ”بابا! وہ تو مریم کے ساتھ.....“ صفدر نے کہنا چاہا۔

”جو دوسروں پر بھروسہ کرتے ہیں، خطا کھاتے ہیں۔ اور تم قانون کی کتنی ہی کتابیں پڑھ جاؤ، مگر جو کچھ میں سمجھتا ہوں وہ تم نہیں سمجھ سکتے۔“ چودھری طالب علی اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولے۔ ”تجربہ بھی کوئی چیز ہوتا ہے صفدر میاں! یہ جوانی بڑی منہ زور ہوتی ہے۔ جوانی کو آگ سے اسی لئے تشبیہ دی گئی ہے۔ اگر اس پر نصیحت کے پانی کے چھینٹنے نہ ڈالے جائیں تو یہ بھڑکتی جاتی ہے۔“

”بابا! میں کیا کروں؟“ صفدر کا جی چاہا کہ وہ اپنا پھر پیٹ لے۔  
 ”ڈوب مرو۔“ وہ چیخے۔ ”بہن غیر مرد کے ساتھ چھڑے اڑاتی پھر رہی ہے اور تمہیں خبر نہیں۔ کیسے مرد ہو کہ گھر میں اتنی بڑی تبدیلی آجائے اور گھر کے مرد کو پتہ نہ چلے۔ تم اسے لے کر آئے تھے تو کیا حفاظت نہیں کر سکتے تھے اس کی؟ اس وقت تو کہہ رہے تھے کہ آپ فکر نہ کریں۔ خدا معلوم یہ کھیل کب سے کھیلا جا رہا ہے۔ میری عزت کو روند جا رہا ہے۔“

”بابا! مریم بتا رہی تھی، ابھی صرف چند ماہ سے..... آپ نے مجھے آج بتایا ہے تو میں نے مریم سے تصدیق کرنا چاہی۔“ وہ خود شرمندہ سی تھی۔

”چند ماہ..... میرے لئے صدیاں ہیں صفدر!“ ان کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا۔



”بس بابا! آپ اسے لے جا رہے ہیں۔ معین کو بلوا کر رخصتی کر دیں۔“ صفدر نے آسان حل بتا دیا۔

”یہی کروں گا..... یہی کروں گا۔“ وہ ہاتھ پر مٹکا مارتے ہوئے بولے۔ ”میں نے شجاعت سے بات کی ہے، وہ بھی راضی ہے۔ اس نے معین کو فون کیا تھا، اس نے کہا تھا کہ اس کے ٹیسٹ ہونے والے ہیں، ایک ماہ سے پہلے وہ نہیں آ سکتا۔“

”پھر.....“ صفدر نے پریشانی سے باپ کو دیکھا۔

”پھر کیا، وہ لڑکا، کیا ناں ہے اُس کا.....؟“ چودھری طالب علی ذہن پر زور دیتے ہوئے بولے۔

”علی۔“ صفدر کے لبوں سے یہ نام اس طرح پھسلا جیسے چکنے گھڑے سے پانی پھسلتا ہے۔

”ہاں..... وہ بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔“

”کیسے؟ بابا..... آپ لے جائیں گے؟“ صفدر نے پوچھا۔

”آج شرفو اور رحو جو آ گئے ہیں۔“ چودھری طالب علی کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

”تو..... تو آپ نے انہیں بلوایا ہے؟“ صفدر علی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

”ہاں۔ میں نے کل ہی سیکنہ کو فون کر کے کہہ دیا تھا کہ میرے ان کام کے بندوں کو بھیج دے۔“ چودھری طالب علی غرور سے بولے۔ ”یہ دونوں بہت اچھے بہروپے ہیں صفدر!“

”اوہ!“ صفدر کے ہونٹ دائرے کی صورت میں سکڑ گئے۔

”تم آج ہی انہیں سکندر علی کی صورت دکھا دو۔ پھر آگے ان کا کام۔“

”اب تو رات ہو چکی بابا! اور اس کی ضرورت ہی کیا ہے، جب آپ پروین کو لے جا رہے ہیں۔“

”دیکھا..... میں نے کہا نہیں تھا کہ قانون کی کتابیں پڑھ لینے سے پورا قانون سمجھ میں نہیں آ جاتا۔“ چودھری طالب علی کرسی پر بیٹھ گئے۔ صفدر ہونٹوں کی طرح ان کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ کہہ رہے تھے۔ ”معین سے پروین کی شادی ایک ماہ بعد ہوگی۔ اگر اس عرصے میں پروین کوئی قدم اٹھائے، کوئی خط پتر بھیج کر اسے بلوا لے اور وہ دونوں کورٹ میں نکاح کر لیں تو؟ پھر مجھے دونوں کے خون سے ہاتھ رنگنے پڑیں گے صفدر! اور پھر تیرا قانون کیا مجھے بخش دے گا؟ نہیں..... پھانسی کا پھندا تیار ہوگا میرے لئے اور بالفرض میں بچ بھی جاؤں گا تو تمہاری ماں مجھے چمین نہ لینے دے گی۔“

”تو..... تو بابا! آپ علی کو.....“ صفدر کانپ گیا۔

”نہیں..... اسے میں نے قتل و قتل نہیں کرنا، بس اس وقت تک وہ میرے پاس رہے گا

جب تک کہ پروین اپنی سسرال نہیں چلی جاتی۔“ چودھری طالب علی ہاتھ اٹھا کر بولے۔

”اوہ بابا!“ صفدر نے ٹھنڈی سانس لی۔ واقعی وہ بڑی دیر میں اپنے باپ کا منصوبہ سمجھا تھا اور اب سوچ رہا تھا۔

”بابا دنیا کے سب سے بڑے وکیل ہیں۔ ہر اچھے ہوئے مسئلے کا حل ان کے پاس ہے۔ ہر قدم نہایت سوجھ بوجھ کر اٹھاتے ہیں، کبھی تو کہیں ہارتے نہیں۔ ہر جگہ جیت ہوتی ہے ان کی۔“ اس نے دیکھا چودھری طالب علی کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے گہری سوچ میں گم تھے۔

☆.....☆.....☆

مومو بولائی بولائی سی علی کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں ہر جگہ اسے دیکھ لیا تھا، حتیٰ کہ اس کی تلاش میں اس نے اپنا پیریڈ بھی مس کر لیا تھا مگر وہ اسے مل ہی نہیں رہا تھا۔ کتنے ہی لوگوں سے وہ پوچھ چکی تھی، پھر اسے عاصم پوائنٹ سے اترتا ہوا نظر آیا تو وہ تیر کی طرح اس کے قریب پہنچی۔

”علی بھائی آج کتنے بجے آئیں گے؟“

”آ جانا چاہئے اسے تو..... وہ نو بجے آ جاتا ہے۔“ عاصم نے کلائی گھڑی کی طرف دیکھا۔

”اور اب ساڑھے دس بج رہے ہیں۔“ مریم جلدی سے بولی۔

”شاید کہیں چلا گیا ہو۔“

”یقینی بات کرو عاصم بھائی!“ مومو ٹپ کر بولی۔

”ارے تم اتنی پریشان کیوں ہو؟ آج صرف دو پیریڈ تھے۔ شاید نہ آیا ہو۔“

”کبھی ایسا ہوا تو نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”تم فکر نہ کرو، وہ ہے ہی ایسا لا اُبابی۔“ عاصم ہنس کر بولا۔

”تو..... تو میرا دل اندر ہی اندر کیوں بیٹھا جا رہا ہے؟ یہ..... یہ دل میں دراڑیں سی کیوں پڑ رہی ہیں؟“ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

”مریم! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ عاصم گھبرا گیا۔

”میں..... میں گھر جا رہی ہوں۔“ وہ رو دینے کو تھی۔

”علی سے تمہیں کوئی کام تھا؟“ عاصم نے پوچھا۔

”میں صرف اسے ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”اچھا!“ عاصم زور سے ہنسا۔ ”تم لابی میں بیٹھو، میں تلاش کرتا ہوں اسے۔ شاید فزکس ڈیپارٹمنٹ کی طرف چکر لگانے گیا ہو۔ کل ان کا پورا وفد آیا تھا اس سے ملنے۔“ عاصم نے کہا



پھر اسے دلا سا دیتا ہوا چلا گیا۔

مومو کا ذہن گھن چکر بنا ہوا تھا۔ رات بھر وہ ایک لمحہ بھی نہیں سو سکی تھی۔ یوں لگتا تھا، جیسے لمحے لمحے کی موت مر رہی ہو۔ پچھتاوے کے آگے اُسے ڈس رہے تھے۔ بار بار ایک ہی خیال دماغ کے در پر دستک دیتا۔ ”مومو! تم نے صفدر کو سب کچھ بتا کر اچھا نہیں کیا۔“ ضمیر کے کچوکے اسے مارے ڈال رہے تھے۔ رات کو بھی وہ کئی بار رو چکی تھی اور اب بھی اس کی آنکھیں آنسوؤں کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھیں۔ ان گرم گرم آنسوؤں نے اس کی آنکھوں میں آگ سی لگا دی تھی۔

پورے ایک گھنٹے بعد عاصم آ گیا۔

”پتہ چلا؟“ وہ بے قراری سے بولی۔

”ہاں۔ صبح آیا تھا وہ۔“ عاصم اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”اچھا!“ مومو کے چہرے پر سرخی پھیل گئی اور آنکھیں احساسِ تشکر سے چھلک پڑیں۔

”اب کہاں ہیں علی بھائی؟“ اس نے ٹشو پیپر سے گالوں پر آئے آنسو صاف کئے۔

”مجھے بھی باسہ نے بتایا، وہ اس سے ملا تھا۔ کہہ رہی تھی، پونے دس بجے ایک آدمی

آیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ چلا گیا ہے۔“ عاصم نے کہا۔

”مگر میں تو اس وقت یہیں تھی، مجھ سے کیوں نہیں ملے؟ میں پورے نو بجے آ گئی تھی

اور تب سے انہیں تلاش کرتی پھر رہی ہوں۔“ مومو نے بے یقینی سے عاصم کو دیکھا جیسے اس

کا دل رکھنے کو عاصم نے جھوٹ بولا ہو۔

”ایسا ہو جاتا ہے۔ تم بوکھلائی ہوئی بھی تو اتنی تھیں کہ وہ قریب سے گزر بھی گیا ہو گا اور

تمہیں خبر نہ ہوئی ہوگی۔“ عاصم ہنس کر بولا۔

”اگر مجھے خبر نہیں ہوئی تو انہوں نے تو دیکھا ہو گا۔ وہ خود مجھے پکار لیتے۔“ مریم بحث

کرنے پر تکی ہوئی تھی۔

”اب یہ تو تم بہن بھائی جانو۔ ویسے مجھے علی پر رشک آتا ہے۔“ عاصم شوخی سے بولا۔

”کیوں؟“ وہ حیرانی سے پوچھنے لگی۔

”کاش! کوئی مارے لئے بھی اتنا ہی بے قرار رہے۔“ عاصم نے آہ بھر کر کہا تو مومو

ہنستے ہوئے بولی۔

”آپ غائب ہو جائیں تو تب بھی میں یونہی پریشان رہوں گی۔ آخر بھائی جو ہوئے۔“

”سچی؟“ عاصم کی آنکھوں میں غرور آ گیا۔

”آزمائش شرط ہے۔“ مومو نے کہا تو وہ ہنستا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”اب کلاس لے ہی لوں۔“

”اجازت ہے۔ جائیں۔“ مومو نے شوخی سے کہا۔ عاصم کے جانے کے بعد وہ پبلک

ٹیلی فون بوتھ کی طرف آئی اور صفدر علی کے نمبر ڈائل کر دیئے۔ فون عابدہ نے ریسیو کیا۔

”پروین چلی گئی؟“

”ہاں..... وہ آٹھ بجے کی فلائٹ سے چلی گئی ہے۔“ عابدہ نے بتایا۔

”کب تک آئے گی؟“ مومو نے پوچھا۔

”ایک ہفتے تک..... اگر پھپھو جی کی طبیعت ٹھیک ہوئی تو جلد بھی آ سکتی ہے۔“ عابدہ

نے کہا تو مومو نے کچھ اور کہے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔ پھر وہ سیمینار روم میں آ گئی۔ وہ اپنا

کچھ وقت یہاں گزار کر خود کو نارمل رکھنا چاہتی تھی کیونکہ اسے علم تھا کہ جب وہ گھر جائے گی تو

اس کے بابا آئے ہوئے ہوں گے اور وہ ان کے سامنے پریشان صورت لے کر نہیں جانا

چاہتی تھی۔ اسے پریشان دیکھ کر وہ خود جو پریشان ہو جاتے تھے۔





لالی کی رو رو کر بری حالت تھی۔ آمنہ اور اس کی ماں حمیدہ اسے دلا سے دے رہی تھیں، مگر بھلا ممتا کوئی دلا سے، کوئی دلیل کب قبول کرتی ہے؟ وہ چھلی کی طرح تڑپ تڑپ کر کہہ رہی تھی۔

”وہ کبھی بھی مغرب کے بعد گھر سے باہر نہیں رہا۔ میں اس سے کہتی تھی کہ چراغ جلے تو گھر کے مردوں کو گھر آ جانا چاہئے۔ وہ ہمیشہ میری اس نصیحت پر عمل کرتا تھا اور کبھی اسے دیر سے آنا ہوتا تو کہہ کر جاتا تھا۔“ لالی سینے پر دو ہتھ مار کر بولی۔

”پھپھو! علی بھائی کوئی بچے تو نہیں ہیں، آ جائیں گے۔“ آمنہ نے کہا مگر دل اس کا بھی اندر ہی اندر کانپ رہا تھا۔ وہ بھی تو پوری رات لالی کے ساتھ جاگی تھی، ہر آہٹ پر وہ چونک پڑتی تھی۔ پوری رات ان دونوں پھوپھی بھینچی کی آنکھ نہیں جھپکی تھی۔ شیدے کی نائٹ ڈیوٹی تھی اور جب وہ گھر آیا تو کہرام مچا تھا۔ لالی کو غش پر غش آ رہے تھے، اس کا لعل پوری رات گھرنے آیا تھا۔ شیدے سے لپٹ کر وہ بچوں کی طرح روئی تھی۔ شیدے کی بھی ساری ٹھکن روفو چکر ہو گئی تھی اور وہ لالہ کو دلا سے دیتا ہوا یونیورسٹی چلا گیا تھا۔

محلے کی عورتیں آ رہی تھیں، لالی کو تسلی دیتیں۔ اس کو روتے مچلتے دیکھ کر کوئی بھی اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پاسکتی۔

دو پہر کو شیدا آ گیا۔ مگر وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ عاصم اور نوید بھی تھے۔ عاصم اور نوید، علی کے ساتھ آتے رہتے تھے۔ ان کو بھی لالی بالکل علی کی طرح چاہتی تھی۔

”ملا میرا علی؟“ لالی تڑپ کر ان کے قریب پہنچی۔ اُس کی اس تڑپ میں کتنی ہی حسرتوں کے دیپ روشن تھے۔ مگر ان تینوں کے جھکے سروں نے لالی کی آس کے ٹٹماتے دیپ بجھا دیئے۔

”کل بھی وہ مجھے نہیں ملا۔“ عاصم نے کہا۔

”کل تو ہمیشہ کی طرح تیار ہو کر گیا تھا وہ۔“ آمنہ نے جلدی سے کہا۔

”مگر میں دیر سے پہنچا۔ مریم بھی اسے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔“

”کیوں؟“ لالی نے چونک کر پوچھا۔

”مجھے بتایا نہیں۔ ویسے بہت پریشان تھی وہ۔“ عاصم نے انکشاف کیا۔

”پریشان تھی؟“ لالی کے لب کپکپائے۔

”عاصم! آپ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں سب کو بتا دیں۔ شاید کسی کو علم ہو۔“ آمنہ نے رائے دی۔

”کیا؟“ عاصم نے تلخ چہرے والی آمنہ کی طرف دیکھا۔

”علی بھائی کی گمشدگی کے بارے میں۔“ آمنہ نے بھڑائی ہوئی آواز میں کہا۔

”نہیں..... تم ایسا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ لڑکے مشتعل ہو جائیں گے اور سب مخالف پارٹی پر الزام عائد کریں گے کہ شاید اس نے اغوا کر لیا ہو۔“ عاصم بولا۔

”ایکشن ہوئے بھی پورے چھ سات ماہ ہو گئے ہیں، اب اغوا کیوں کرائیں گے؟“

آمنہ نے کہا۔

”لالی بہن! پولیس میں رپٹ کرادو۔“ ایک ہمسائی نے مشورہ دیا۔

”نہیں خاتون! یہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔“ نوید نے جلدی سے کہا۔

”کیوں؟“ لالی نے پوچھا۔

”اس لئے کہ پولیس یونیورسٹی ہی میں تفتیش کرے گی اور لڑکوں میں یہ بات پھیل جائے گی۔“ نوید نے سمجھایا۔

”آپ دو تین روز صبر کریں، ہم کوشش کریں گے۔“ عاصم نے لالی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”دو تین دن..... نہیں عاصم پتر! میرا تو ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری ہے۔ یا خدا!..... یا خدا! مجھے موت دے دے..... مجھے موت دے دے۔“ لالی کی آواز پھٹ سی گئی اور پھر وہ شیدے کے بازوؤں میں جھول گئی اس کی زبان علی کا ورد کر رہی تھی۔ ماں تڑپ رہی تھی اور اس کے سارے خواب اور اُمنگیں آنسوؤں کے سیلاب میں بہی جا رہی تھیں اور وہ شیدے سے لپٹی کہہ رہی تھی۔

”شیدے! میرے علی کو لے آ..... میرے علی کو لے آ۔ نہیں تو میرا گلا گھونٹ دے۔“

سارا گھر اس کا ہم زبان بن گیا تھا۔

”صبر کرو علی کی ماں!“ شیدا لالی کو صبر کی تلقین کرتا ہوا خود بکھرا جا رہا تھا۔

”شاید مریم کو پتہ ہو علی کے بارے میں۔ کل وہ اس کو پوچھتی پھر رہی تھی۔ ابھی عاصم ہی تو کہہ رہا تھا کہ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ میں..... میں خود اس سے پوچھنے جاؤں گی۔“

لالی نے دل میں مصمم ارادہ کر لیا۔ آخر وہ کیوں علی کا پوچھتی پھر رہی تھی؟ یہ ’کیوں‘ اُس کے



ذہن میں سوالیہ نشان کی طرح بڑھتا جا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

علی کو جب ہوش آیا تو وہ ایک نہایت ہی خوب صورت اور بے سجاے کمرے میں تھا۔ اس نے آنکھیں مسلیں اور پھر کمرے کی سجاوٹ غور سے نکتے لگا۔

”یا خدا! میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے اپنی کلائی میں زور سے چٹکی لی تو بلبلا کر رہ گیا۔

”یہ تو حقیقت ہے۔“ وہ ہتھیلی سے کلائی سہلانے لگا۔ مگر میں یہاں کیسے؟..... میں نے تو کبھی خواب میں بھی ایسا کمرہ نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی خواہش کی ہے۔

وہ بڑے سے رنگین پلنگ سے اُترا، دبیز قالین پر اس کے پاؤں پڑے تو یوں لگا، جیسے پھولوں پر چل رہا ہو۔ میں یہاں کیسے؟..... وہ آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور خیالات کی کڑیاں ملانے لگا۔ اس روز جب وہ یونیورسٹی پہنچا تو دو تین ڈیپارٹمنٹس کے چکر لگانے کے بعد یونین آفس آگیا تھا کیونکہ کلاس ساڑھے گیارہ بجے شروع ہونی تھی۔ اسے یونین آفس میں بیٹھے پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ ایک آدمی آیا اور بولا۔

”میرا نام شریف احمد ہے اور مجھے سکندر علی سے ملنا ہے۔“

”میں ہی ہوں۔ حکم کیجئے، کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ علی نے کہا۔

”آپ کو پروین بی بی نے بلایا ہے۔“ وہ رازداری سے بولا۔

”مجھے؟“ علی نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں جی۔ وہ آج حسن پور جا رہی ہیں اور بس وہ چند منٹ کے لئے آپ سے ملنا

چاہتی ہیں“ شریف نے اپنے لہجے میں بے قراری پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”کہاں ہے وہ؟“ علی کی آواز میں بے چینی تھی۔

”وہ دس بجے ایر پورٹ پہنچ چکی ہوں گی۔“

”اکیلی جا رہی ہے؟“ علی نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ صفر کو فرصت نہیں تھی۔ ڈرائیور چھوڑنے جائے گا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ کو

کیوں بلاتیں؟“ وہ مسکرایا۔

”چلو پھر، دس بجنے میں پندرہ منٹ تو ہیں۔“ علی نے کہا اور اس کے ساتھ باہر آگیا۔

”خان لالہ! آفس بند کر دینا۔ میں ذرا کام سے جا رہا ہوں۔“ اس نے چپراسی سے

کہا۔

”اچھا صاب!“ وہ بولا۔

باسمہ نے اسے تیزی سے جاتے دیکھ کر پکارا۔

”یہ آندھی اور طوفان کی طرح کہاں بھاگے جا رہے ہو؟“

”ذرا کام سے جا رہا ہوں ان کے ساتھ۔“ علی نے اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑا اور وہ پارکنگ کی طرف آگئے، جہاں گرین مزد میں ڈرائیونگ سیٹ پر پہلے سے کوئی بیٹھا تھا۔ علی اس کی شکل نہ دیکھ سکا کیونکہ اس کے ساتھی نے جلدی سے موٹر کا پچھلا دروازہ کھول دیا تھا۔ ان کے بیٹھتے ہی موٹر تیزی سے تارکول کی سیاہ سڑک پر دوڑنے لگی۔

یونیورسٹی کی حدود سے نکلتے ہی اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے شریف احمد نے کہا۔ ”سگریٹ پیو گے سائیں؟“ اس نے سگریٹ کا پیکٹ اس کے سامنے کر دیا جس میں دو ہی سگریٹ تھے۔

”پی لوں گا۔“ علی نے کہا اور سگریٹ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔ شریف احمد نے سگریٹ کو لائٹر کا شعلہ دکھا دیا۔ دوکش لینے کے بعد ہی علی کو یوں لگا، جیسے اس کا دماغ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ وہ کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے دماغ کے ساتھ ساتھ پاؤں بھی سن ہو گئے ہوں۔ پھر اُسے کچھ ہوش نہ رہا تھا۔

پھر نہ جانے کب اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو گاڑی کے ڈبے میں پایا تھا۔ اسے اتنا یاد ہے کہ اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے پانی مانگا تھا اور اسے پانی دے دیا گیا تھا۔ پانی پینے کے بعد اسے اب اس کمرے میں ہوش آیا تھا۔

”اغوا۔“ علی کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ وہ تیزی سے کرسی سے اٹھا اور دروازہ پیٹنے لگا۔

”دروازہ کھولو..... مجھے کیوں اغوا کیا گیا ہے؟ کیا جرم ہے میرا؟“ وہ دروازہ پیٹتے

ہوئے چیخ رہا تھا اور پھر اسے اپنے پیٹ میں درد محسوس ہونے لگا۔ پیٹ خالی تھا جو اتنی تیز

چیخیں نہیں سہار سکتا تھا۔ وہ پسلیوں پر ہاتھ رکھے پلنگ پر آگیا، پھر اس نے تالے میں کنجی

گھومنے کی آواز سنی اور ہلکی سی جڑ جڑاہٹ کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ اس نے دیکھا، وہی

شریف احمد کھانے کی ٹرے اٹھائے اندر آیا اور اس کے داخل ہوتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔

”ہوں..... تو بہت حفاظت کی جا رہی ہے میری۔“ علی دل ہی دل میں مسکرایا۔

”اٹھو سکندر علی! کھانا کھا لو۔“ شریف نے تسخیر سے ہنستے ہوئے ٹیبل پر ٹرے رکھ دی۔

”یار! تم صورت کے تو شریف نظر آتے ہو مگر سیرت کے.....“

”زیادہ زبان مت چلاؤ۔“ وہ چیخ کر بولا۔

”تم تو مجھے پروین سے ملانے لائے تھے۔“ علی نے پوچھا۔

”میں تو تمہیں بہت عقل مند سمجھتا تھا۔“ شریف نے طنز کیا۔

”محبت سب کی عقلوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔“ علی نے کھلے دل سے اپنی بے وقوفی کا



اعتراف کیا اور واقعی اس سے زبردستی بے وقوفی ہوئی تھی کہ پروین کا نام سنتے ہی وہ اس کے ساتھ چل پڑا تھا اور اب اس عالی شان کمرے میں قید ہو گیا تھا۔

”آخر یہ آج کل کے منڈے عشق کیوں کرتے ہیں؟“ شریف منہ بنا کے بولا۔

”تم نے کبھی عشق نہیں کیا؟“ علی نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

”کیا ہے۔ مگر وہ عشق نہیں جو تم نے کیا ہے۔ میں نے اپنے خدا سے عشق کیا ہے، اس کے بعد اپنے چودھری سے۔“ شریف مونچھوں کو مروڑتے ہوئے بولا۔

”چودھری؟“ علی نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں..... وہی چودھری، جس کی بیٹی سے تم عشق لڑا رہے تھے۔ اب سڑتے رہو یہاں۔“ وہ ہنسا۔

”اوہ، سمجھا۔“ علی پیشانی پر آئے بالوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے بولا۔ ”تو اس کا مطلب ہے اب میں تمہارے چودھری کی مرضی کے بغیر یہاں سے نہیں جاسکوں گا؟“

”ہاں۔“ شرفو بولا۔ ”اونو جوان! روئی تو کھالے۔ بھوکا ہے دو دن سے۔“ اسے یاد آیا۔

”ہاں بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔ وقت کیا ہوگا؟“ علی نے پوچھا۔

”گھڑی تو تم نے لگائی ہوئی ہے۔“ وہ بولا۔

”یار! غریب بندہ ہوں۔ آٹو میٹک تو ہے نہیں۔ چابی نہیں دی تو بند ہو گئی سُسری۔“ علی نے شوخی سے کہا۔

”بندے غریب ہو اور عشق امیروں کی لڑکیوں سے کرتے ہو۔“ شریف طنز سے باز نہ آیا۔

”اب امیروں کی لڑکیاں خود جھولی میں آن گریں تو سینے سے نہ لگایا جائے تو یہ کفرانِ نعمت ہے نا۔“ علی نے نہ جانتے ہوئے بھی یہ جملہ کہہ دیا۔

”بکواس نہ کر۔“ شرفو کو غصہ آ گیا۔

”بڑے بھائی! ہولے۔ وقت بتاؤ۔“ علی نے ٹرے اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔

”شام ے پانچ بجے ہیں۔“ شرفو نے گرتے کی آستین ہٹا کر کلائی گھڑی کی طرف دیکھا۔

”یہ جگہ کون سی ہے؟“ علی نے ٹرے پر سے رومال ہٹاتے ہوئے کہا تو کھانا دیکھتے ہی بھوک مزید چمک اُٹھی۔ مرغ کا سالن اور حلوے کے ساتھ توری روٹیاں تھیں۔

”یہ دنیا پور ہے۔“ شریف نے کہا۔

”واقعی؟“ علی کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک پیدا ہو گئی۔

”تم اتنے خوش کیوں ہو؟“ شرفو نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

”پچھی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔“ علی نے نوالہ توڑا اور پھر کھانا کھانے لگا۔ چند لمحے بعد وہ موٹی موٹی تین روٹیاں کھا چکا تھا۔ اسے خود پر حیرت تھی کہ اتنی ساری روٹی وہ اکیلا کھا گیا ہے۔ بھوک واقعی بڑی ظالم شے ہے۔ اسے یوں لگا، جیسے کھانا کھاتے ہی اس میں بارود بھر دیا گیا ہو۔ اس میں نئے سرے سے طاقت پیدا ہو گئی تھی۔ حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔

”شہر میں تم لوگوں کو یہ نہیں سکھایا جاتا کہ کھانا کھاتے ہوئے دوسرے کو بھی صلح مار لو۔“ شریف نے اس کے سامنے سے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔

”شہر میں قیدیوں کو صلح مارنے کا سلیقہ نہیں سکھایا جاتا۔“ علی بھی ترکی سے ترکی بولا تو شریف اسے گھور کر رہ گیا۔ علی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں نے اس لئے تمہیں صلح نہیں ماری کہ کیا خبر اب بھی اس میں بے ہوشی کی دواملا دی گئی ہو؟“

”اب تمہیں بے ہوش ہونے کی ضرورت نہیں۔“ شریف بولا۔

”کیوں؟ کیا میں یہاں سے نہیں جاسکتا؟“ علی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”اس حویلی سے میری مرضی کے بغیر کوئی نہیں جاسکتا۔“ شرفو بولا۔

”پھر تو تم بڑے کام کے بندے ہو شریف بھائی!“ علی نے طنز یہ لہجے میں کہا۔ ”میرا ایک کام کرو گے؟“

”دیکھو تم یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچنا بھی مت۔“ شریف نے متنبہ کیا۔

”یار! میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ بس میں ایک خط لکھنا چاہتا ہوں، اپنے گھر۔ میری ماں بہت پریشان ہو گی۔ یہ دو دن اس نے رو کر گزارے ہوں گے۔ بس تم میرا وہ خط پوسٹ کر دینا۔“ علی نے جلدی سے کہا۔

”یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔“ شریف بولا۔

”شریف بھائی! تم بھی آلِ اولاد والے ہو گے، سچ میری ماں مر جائے گی۔ میں اس کا ایک ہی بیٹا ہوں۔“ علی نے ہاتھی لہجے میں کہا۔ اسے حقیقت میں اپنی ماں کی فکر کھائے جا رہی تھی۔

”پھر ایسے دھندے کیوں کرتے ہو؟..... ایک انڈہ، وہ بھی گندا۔“ شریف بولا۔

”عشق کرنے کے لئے باقاعدہ کوئی پلاننگ نہیں کرنی پڑتی۔ کوئی بھی گزرتا لمحہ دل میں گل و گلزار کھلا دیتا ہے۔ اب تم کیا سمجھو گے؟ تم نے عشق کیا ہو تو پتہ ہو۔“ علی نے آہ بھر کر کہا۔

”ویسے دوست! تمہارا چودھری کچھ بھی کرے، میں پروین کو حاصل کر لوں گا۔ میں ہمیشہ جیتا ہوں اور یہ زندگی کی بازی میں نہیں ہاروں گا۔“ علی کا لہجہ ایک دم سخت ہو گیا۔

”خام خیالی ہے میاں! ایک مہینے بعد جب تم رہا ہو گے تو پروین، معین علی کی ہو چکی ہو۔“



گی۔“ شرفو ہنس دیا اور اس کے اس جملے پر علی کا دماغ جھنجھٹا اٹھا۔ چٹ سے کوئی چیز دل کے اندر ٹوٹ گئی۔

”نہیں، نہیں..... چودھری طالب علی ایسا نہیں کر سکتے۔“

”تو جا کر ان سے مانگ لو، پروین بی بی کو۔“ شریف طنز سے بولا۔

”میں ان سے کیوں مانگوں؟ اپنے خدا سے مانگوں گا۔“ علی نے جذب کے عالم میں

کہا۔ شرفو اس لا اُبابی نو جوان کو دیکھتا رہ گیا۔

”مجھے کاغذ قلم لا کر دو تا کہ میں اپنی ماں کو خط لکھ دوں۔“

”تا کہ تم یہاں کے بارے میں سب کچھ بتا دو۔“ اس نے کہا۔

”تم پڑھ لینا خط میرا۔ حالانکہ کسی کا خط پڑھنا اخلاقی جرم ہے۔“

”مجھے پڑھنا نہیں آتا۔“ شرفو اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”حیرت ہے، باتیں تو تم پڑھے لکھوں جیسی کرتے ہو؟“ علی نے حیرت سے کہا اور

واقعی اسے اچنبھا ہوا تھا۔ شریف جب اسے پہلی بار ملا تھا تو اس کی چال ڈھال، بات چیت

سے اسے ایسا کوئی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ بالکل اُجڑ ہے۔ یہ تو یہاں آ کر اسے پتہ چلا کہ یہ

تو چودھری طالب علی کا معمولی کارندہ ہے۔ اس کے اشاروں پر ناپچنے والی کٹہ پتلی۔

”میں منشی نواز کو بھیجتا ہوں۔ وہ تمہیں کاغذ پینل دے گا، تم خط لکھ دینا۔ زیادہ ہوشیاری

نہیں چلے گی۔“ نرمی کے بجائے شرفو کے لہجے میں سختی آ گئی تھی۔

”تم فکر نہ کرو۔“ علی نے کہا تو شرفو کھانے کی ٹرے اٹھا کر باہر چلا گیا۔ چند لمحے بعد

ہی ایک ادھیڑ عمر آدمی اندر آیا۔

”میرا نام نواز ہے۔“ وہ نہایت میٹھے لہجے میں بولا۔

”مجھے سکندر علی کہتے ہیں۔“ علی نے بھی اپنا تعارف کرایا۔

”یہ لو۔“ نواز نے کاپی اور پین علی کی طرف بڑھایا۔

”بہت شکریہ نواز صاحب! میری ماں تو رو رو کر پاگل ہو جائے گی۔“

”ماں جو ہوئی جی۔“ نواز بھی دُکھی ہو گیا۔

”شاید آپ میری ماں کو جانتے ہوں۔“ علی نے کہا۔

”کیسے؟“ نواز نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ ذکر تو کرتی ہیں دنیا پور کا۔ میرا ماموں تھا کریمو، اس کی بہن لالی تھی، وہی میری

ماں ہے۔“ علی نے بتایا۔

”او تم شیدے کے پُتر ہو؟“ نواز کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک پیدا ہو گئی۔

”جی..... جی ہاں!“ علی نے اثبات میں سر ہلایا تو نواز اٹھا اور اسے لپٹا لیا۔ ”شیدا تو

میرا جگری یار تھا۔ اب کیسا ہے؟“ نواز، علی کی پیشانی چومتا ہوا بولا۔

”ٹھیک ہیں جی۔“ علی اس کی محبت پر پکھل گیا۔

”پُتر! تم نے کیوں بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ دے دیا ہے؟ کیا لوڑ تھی، چودھری کی

دھی سے.....“ نواز نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ مگر علی سمجھ گیا تھا کہ نواز کا مقصد کیا ہے۔ علی

کچھ بھی نہ بولا، سر جھکائے کچھ سوچتا رہا۔

”پُتر علی! ان چودھریوں سے متھا کیوں لگتا ہے ہو؟ اور چودھری طالب علی نے تو اپنے

بھائی کا گھر اُجاڑ دیا، اس کے آگے تم کیا ہو؟“ نواز نے کہا۔

”میں سمجھا نہیں؟“ علی نے نواز کے سپاٹ چہرے کی طرف دیکھا۔

”تم اپنی ماں سے پوچھنا۔ اسی کی سہیلی تھی نور ایں۔ چودھری طالب کے چھوٹے بھائی کو

وہ پسند آ گئی۔ مظالم کی انتہا کر کے اس نے نور ایں کو حاصل کر لیا اور پھر.....“ نواز نے

ہولے ہولے اسے سب کچھ بتا دیا۔ سب کچھ سننے کے بعد علی مسکرایا۔

”چاچا نواز! مجھے اپنی ماں کا خیال ہے، ورنہ پروین کو یوں اڑا لیتا۔“ علی نے چٹکی

بجاتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے چودھری کے اچھے بھی تلاش نہ کر سکتے۔ خیر میں مقدر کا بڑا

قائل ہوں، اگر وہ میرے مقدر میں ہے تو دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے، وہ مجھے ملے گی ضرور۔

پھر سوچوں گا کہ اسے حاصل کرنے کی کیا ترکیب ہونی چاہئے۔ پہلے امی جی کو خط لکھ لوں۔“

علی نے کہا اور پھر گھٹنے پر کاپی رکھ کر ماں کو خط لکھنے لگا۔



سیاہ آہنی گیٹ کے سامنے رکشہ رک گیا۔ آمنہ نے ڈرائیور کو پیسے دے دیے اور پھر

لالی کو سہارا دے کر اُتارا۔ وہ لالی کو تھامے ہوئے اندر آ گئی۔ پہلے بھی وہ علی کے ساتھ یہاں

تین بار آ چکی تھی، اس لئے یہ گھر اس کے لئے اجنبی نہ تھا۔ لالی اب بھی سسکیاں لے رہی

تھی۔

”پھپھو جی! میں نے آپ کو منع کیا تھا کہ مت روئیں۔ راستے بھر روتی آئی ہیں۔ آخر

وہ بھلا آدمی کیا سوچتا ہوگا؟“ آمنہ نے ناگواری سے کہا۔

”کیسے نہ روؤں؟ پتہ نہیں میرے علی کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہوں گے۔ خدا معلوم

وہ کہاں ہے؟“

”رونے سے آپ کو علم تو ہونے سے رہا۔“ اب وہ روش طے کر کے برآمدے کی

سیڑھیوں پر پہلا قدم رکھنا چاہ رہی تھی کہ ایک رعب دار آواز جس میں نرمی بھی تھی، سن کر

ٹھٹک گئیں۔

”کس سے ملنا ہے؟“



”جھوٹ مت بولو۔ میں نے تمہیں برسوں بعد دیکھا ہے اور چند لمحوں کی کوشش سے پہچان بھی لیا۔ تمہارا نام تو ہمیشہ میرے ذہن کی سلیٹ پر لکھا رہا۔ سہیلی تم نورائیں کی تھیں، مگر طرف داری میری کرتی تھیں۔ کیا یہ جھوٹ ہے کہ تم نورائیں سے کہتی تھیں کہ نوری محبتوں کو نہیں ٹھکرانا چاہئے۔“

”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ میں کسی نورائیں کو نہیں جانتی۔“ لالی نے سخت لہجے میں کہا لیکن اس کی آواز بھرا گئی۔

”لالی! میں بوڑھا ہو گیا ہوں، مگر میری آنکھوں میں اتنی خوشی ہے کہ اپنے مخاطب کے چہرے سے اندازہ لگا لوں کہ وہ سچ کہہ رہا ہے یا جھوٹ۔ آخر تم کیوں جھوٹ بول رہی ہو؟ میں قسم کھاتا ہوں کہ تم لالی ہو، نورائیں کی سہیلی۔“ چودھری شوکت علی نے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ لالی کے گھٹنوں پر رکھ دیئے۔ اس نے اپنی آنسوؤں سے بوجھل پلکیں اٹھائیں اور دھندلائی ہوئی نظروں سے چودھری شوکت علی کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر لکھی دکھ کی تحریر پڑھ کر وہ تڑپ گئی۔ اس نے جلدی سے کہا۔

”ہاں، میں لالی ہوں۔ میں نورائیں کی سہیلی ہوں۔ اور کچھ؟“

”اور..... اور لالی! مجھے یہ بھی بتا دو کہ جب تم حویلی آتی تھیں تو ایک بچے کو لے کر آتی تھیں۔ کہاں ہے تمہارا بیٹا؟“

”تو..... تو آپ کو پتہ چل گیا؟“ لالی کی آواز میں دل کا پورا درد سمٹا ہوا تھا۔

”ہاں!“ چودھری شوکت علی ٹھنڈا سانس لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر ٹہلتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولے۔

”ڈیڑھ برس قبل میرا وفادار ساتھی دینو جب بستر مرگ پر پڑا تھا تو اس نے اپنے دل کا بوجھ میرے دل پر ڈالا اور خود قبر کی تاریکیوں میں جا سویا۔ مجھے یہ تو علم تھا کہ میرا بیٹا بھی ہے۔ مگر کہاں؟ کس کے پاس؟ یہ مجھے علم نہ تھا، نورائیں نے مرنے سے قبل دینو کو بتا دیا تھا مگر وہ یہاں غدار کر گیا، مجھے نہ بتایا۔“

”نوری مر گئی۔“ لالی کی آواز چیخ سے مشابہ تھی۔ چودھری شوکت علی ٹہلتے ہوئے اس کے قریب رُکے اور بولے۔ ”اس نے خودکشی کی تھی، مجھ سے انتقام لیتے لیتے خود اپنی شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی۔“

”اوہ!“ لالی کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔

”لالی بہن!“ چودھری شوکت علی پھر لالی کے قدموں میں گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئے اور بولے۔ ”مجھے میرے پتر کے بارے میں بتا دو۔ واقعی وہ تمہارے پاس ہے نا؟ میری تلاش ختم ہو گئی ہے نا؟“ انہوں نے لالی کے کپکپاتے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔

لالی نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور پھر وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں چودھری شوکت علی کو پہچان گئی۔ بھلا انہیں کیسے نہ پہچانتی، ان کا دوسرا روپ جو برسوں سے اس کے پاس تھا۔ چودھری شوکت علی سفید کرتے شلوار میں ملبوس تھے۔ سر پر بڑا سا اونچا کلف لگا اکڑا ہوا طرہ تھا۔ پاؤں میں سچے تلے والی جوتی اور ہاتھ میں چھڑی تھی۔ وہ خود بھی بڑی حیرت سے لالی کو دیکھ رہے تھے۔ متورم سرخ آنکھیں، لرزتے ہونٹ، گالوں پر آنسوؤں کے نشان، ملگجا لباس۔ اس نے ٹاسے کی بڑی سی چادر میں خود کو چھپا رکھا تھا۔ چودھری شوکت علی ایک ٹک اسے دیکھے جا رہے تھے اور وہ بولائی جا رہی تھی۔ آمنہ بھی انہیں دیکھ کر زرد سی ہو گئی تھی۔ آخر چودھری شوکت علی نے اس سے پوچھا۔

”پتر! تم نے بتایا نہیں، کس سے ملنا ہے؟“

”مریم باجی سے۔“ آمنہ نے جلدی سے کہا۔

”اچھا، اچھا..... اندر آؤ۔“ پھر گردن موڑ کر زور سے بولے۔ ”مریم پتر! باہر آؤ.....“

تمہارے پردہ اٹے ہیں۔“

لالی کے دل میں اٹھل پھل ہونے لگی۔

بالکل وہی آواز..... وہی رعب و دبدبہ..... اور..... اور مومو..... لالی کے دماغ میں لہریں اٹھنے لگیں، جیسے سمندر کی لہریں آگے پیچھے اٹھتی ہیں۔ پھر وہ انہیں لے کر اندر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

”ناں کیا ہے پتر؟“ چودھری شوکت علی ان سے باتوں میں لگ گئے۔

”میرا نام آمنہ ہے۔ اور یہ میری پھوپھی ہیں۔ نام تو ان کا لالی ہے، مگر ابھی برسوں کا پھول بنی ہوئی ہیں۔“ آمنہ نے شوخی سے کہا۔ وہ لالی کو ہنسانا چاہتی تھی، مگر چودھری شوکت علی جیسے صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب وہ لالی کو اس طرح دیکھ رہے تھے، جیسے اس کے دل کے اندر کی ہر بات جان لینا چاہتے ہوں۔“

”لالی۔“ اس نام نے ان کے دماغ میں ایک ساتھ کئی بلب روشن کر دیئے تھے۔ لالی نے چادر کی بکل ماری، اس طرح کہ اس کی اب صرف آنکھیں ہی نظر آرہی تھیں۔ پر اب دیر ہو چکی تھی، اُس کی اس حرکت نے چودھری شوکت علی کی تمام الجھنیں حل کر دیں۔ وہ تیزی سے آگے بڑھے اور پھر نیچے بیٹھ گئے۔

”لالی بہن! کیوں چھپا رہی ہو چہرہ اپنا؟“

”جی.....“ لالی کے پورے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔

”تم..... تم نورائیں کی سہیلی ہونا؟“ وہ بے چینی سے پوچھ بیٹھے۔

”نہیں۔“ لالی نے تھوک نگل کر بڑی مشکل سے کہا۔



”جی..... نہیں۔“ لالی کے لب بھنج گئے۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”لالی بہن! خدا کے واسطے جھوٹ مت بولو۔ میں اب تک جھوٹ سے ہی بہلتا آیا ہوں، مگر شاید اب نہ بہل سکوں گا۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ خدا کے لئے مجھے میرا پتر ایک نظر دکھا دو۔ اس سے ملوا دو۔“ چودھری شوکت علی نے سچ مچ اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ مارے دکھ کے ان کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ لالی کا دل ایک لمحے کو دکھا بھی۔ کچھ بھی تھا، گئے دنوں میں وہ اور اس کا پورا خاندان چودھری شوکت علی کا دست نگر تھا اور آج قدرت نے کیا وقت دکھایا تھا کہ اپنے وقت کا ظالم شخص، جس کے ہونٹوں کی معمولی سی جنبش سے قتل ہو جاتے تھے، آج لالی کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھا رو رہا تھا۔

”نہیں، نہیں..... میں چودھری کو علی نہیں دوں گی۔ اب تک اسے میں نے پالا ہے، بالکل اپنی اولاد کی طرح، اپنی ضروریات روک کر اس کی خوشی پوری کی ہے۔ چھٹپن میں رات رات بھر اس کے لئے جاگی ہوں۔ خود گیلی پر سوئی اور اسے سوکھے پر سلا یا۔ میں نے اپنی خالی گود اس سے بھری اور اب میں اپنی گود خالی کر دوں..... نہیں، نہیں یہ کبھی نہیں ہوگا۔

چودھری شوکت علی نے شاید اس کے دل کی آوازیں سن لی تھیں، گلوگیر آواز میں بولے۔

”لالی بہن! میں اسے تم سے نہیں لوں گا۔ وہ تمہارا ہے اور تمہارا ہی رہے گا۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر میں نے کبھی تمہارے یا تمہارے خاندان کے ساتھ کوئی نیکی کی ہے تو اس نیکی کا آج میں معاوضہ طلب کرتا ہوں حالانکہ نیکی کرنے والے طالب نہیں ہوتے، مگر میں کم ظرف ہوں، میری کی ہوئی نیکی کا بدلہ دو اور وہ اس طرح کہ مجھے میرے بیٹے سے ملوا دو۔ مجھے نہ ترساؤ، میں تمہارے پاؤں پکڑتا ہوں۔“

اور چودھری شوکت علی نے سچ مچ اس کے ٹھنڈے پیروں پر ہاتھ رکھ دیئے اور دو آنسو لالی کے پاؤں پر بھی گر گئے تو وہ ہوش میں آ گئی۔ نیچے جھکے ہوئے چودھری شوکت علی کے کندھے پر سر رکھ دیا اور ہلک پڑی۔

”آپ مجھے کیوں گناہ گار کرتے ہیں؟ مجھ دکھیاری کی اجڑی ہوئی حالت نہیں دیکھ رہے چودھری جی! مجھے خود علم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ میں تو خود مریم سے اس کا پوچھنے آئی ہوں۔ اگر وہ اس وقت ہوتا تو مجھے یہاں اس حالت میں آنے دیتا؟ میں تو کل سے تڑپ رہی ہوں اس کے لئے۔ مجھے بتائیں، میں کہاں ڈھونڈوں اپنے لعل کو؟ اپنے دل کے سکون کو؟“ لالی تڑپ رہی تھی۔

”کیا کہہ رہی ہو لالی؟“ چودھری شوکت علی اس کے اُلجھے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بول رہے تھے۔ میں اس تک پہنچا بھی نہیں اور مقدر اپنی چال چل گیا۔“ ان کا جی چاہ رہا تھا، اپنے بال نوچ ڈالیں، گریبان پھاڑ ڈالیں اور چیختے ہوئے سڑک پر نکل جائیں۔ چیخ چیخ کر کہیں۔“ مجھے بتاؤ، مجھ جیسا نصیب کس کا ہے؟“ پھر وہ لالی سے بولے۔

”پتہ نہیں اس بار میری خوشیوں کی راہ میں کانٹے کس نے اُگائے ہیں۔“

”اس بار بھی آپ کے بھائی صاحب ہی ولن بنے ہیں۔“ مومو کی آواز پر لالی نے چودھری شوکت علی کے کندھے سے سر ہٹایا۔ مومو ان کے قریب ہی آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات لئے بے چینی سے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ رضیہ بھی اس کے پیچھے ہی کھڑی تھی اور دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ ”اس کا مطلب ہے ان دونوں نے سب کچھ سن لیا ہے؟“ چودھری شوکت علی نے سوچا، پھر وہ مومو سے بولے۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

مومو کچھ نہ بولی۔ لالی کے قریب بیٹھ کر اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کے گال چومے اور پھر اس کے سینے سے لگ کر رو پڑی۔

”مومو پتر! مجھے بتا، تجھے اگر علی کے بارے میں علم ہے تو۔“ لالی نے اس روتی بلکتی مومو کو بازوؤں سے پکڑ کر سیدھا کیا۔

”ہاں..... مجھے علم ہے۔ میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ چودھری طالب علی نے اسے اغوا کیا ہے۔“ مومو نے تھیلی سے آنسو صاف کئے۔

”کیوں؟..... وہ ایسا کیوں کرنے لگے؟“ چودھری شوکت علی نے چیخ کر کہا۔

”اس لئے کہ ان کی چیتا پروین، علی بھائی کی وجاہت پر مر مٹی تھی اور.....“ پھر مومو نے آہستہ آہستہ انہیں سب کچھ بتا دیا۔ حتیٰ کہ یہ بھی کہ صفدر اس کے پاس تصدیق کے بہانے بھید لینے آیا تھا۔ ”اور..... اور بابا جانی! اب میں خاموش نہیں رہوں گی۔ آپ کے بھائی نے ہمارے کلیجے پر ہاتھ ڈالا ہے۔ میں..... میں رنگ محل جاؤں گی۔“ مومو نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”پتر! جذباتی نہ بنو۔“ چودھری شوکت علی نے اسے سمجھانا چاہا۔

”میں جذباتی نہیں ہوں۔ جذبات کو تو میں دنیا کی گھٹیا ترین چیز سمجھتی ہوں۔ جس طرح بھی ہو سکا، میں علی بھائی کو لے کر آؤں گی۔ چاہے مجھے ان کی خاطر جان سے جانا پڑے۔“ وہ چوٹ کھائی ناگن کی طرح پھنکاری۔

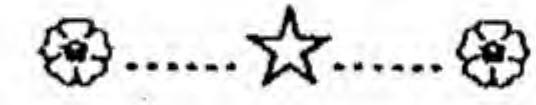
”مجھے تو آج تک علی نے کچھ بھی نہ بتایا۔ مریم بیٹا! تم ہی بتا دیتیں۔ میں اسے بتاتی کہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر نہیں جانا چاہئے۔“ لالی تھوک نکل کر بولی۔



”میں آج ہی حسن پور جانا چاہتی ہوں، بابا جانی!“ مومو نے کہا۔  
”ضرور جانا۔ ذرا شعیبی کو تو آنے دو۔ وہ کوئی حل نکالے گا۔ مجھے تو کوئی ڈھنگ کی بات سوچھ ہی نہیں رہی ہے۔ رضیہ دھی! ذرا شعیبی کو فون کر کے بلا لو۔“  
”میں خود بات کرتی ہوں۔“ مومو اٹھی۔

”ناں پُتر! وہ گھر آجائے تو اسے سب کچھ بتا دیں گے۔ وہ گھبرا نہ جائے۔“ چودھری شوکت علی نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے قریب بٹھالیا۔ رضیہ، شعیب کو فون کرنے لگی۔ تب آمنہ نے چودھری شوکت علی سے کہا۔  
”آپ..... آپ علی بھائی کو ہم سے لے لیں گے؟“  
”نہیں..... نہیں پُتر!“ چودھری شوکت علی نے محبت سے کہا۔ ”وہ تمہارا ویر ہے، تمہارا ہی رہے گا۔“

”وہ میرا بھی بھائی ہے۔“ مومو ان کی بات کاٹ کر بولی تو چودھری شوکت علی پریشانی کے باوجود مسکرا دیئے۔



سورج اپنی آخری کرنیں دھرتی پر ٹکا رہا تھا جب جیپ حسن پور کی حدود میں داخل ہوئی۔

”دیکھئے مس مریم! وہ رہی رنگ محل کی عمارت۔“ امجد نے اسٹیئرنگ سے ہاتھ اٹھا کر انگلی سے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ مومو نے اس کے اشارے کی سمت دیکھا، سرسبز درختوں میں گھری عمارت دور سے نظر آرہی تھی۔ اس کے اونچے چوپارے جن پر پیتل کے بڑے بڑے گنبد تھے، سورج کی کرنیں انہیں الوداعی بوسے دے رہی تھیں۔ وہ گنبد سونے کی طرح چمک رہے تھے۔

”رنگ محل باہر سے تو یونہی ہے، مس مریم! مگر اندر سے واقعی یہ رنگ محل ہے۔“ امجد نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے نہایت فخر سے بتایا۔  
”رنگ محل کے مکینوں کے دل بھی اسی کی طرح اُجلے اُجلے ہیں۔“ مریم نے امجد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ زور سے ہنس دیا اور بولا۔

”آپ ہمارے گھر میں بالکل اجنبیت محسوس نہیں کریں گی، بلکہ آپ کا تو جی ہی نہیں چاہے گا ہمارے گھر سے جانے کو۔ مہمان تو ہمارے لئے رحمت ہوتے ہیں۔“  
”اچھا!“ وہ ہنس کر خاموش ہو گئی اور گردن موڑ کر سڑک کے کنارے کنارے حد نظر تک پھیلے ہوئے سرسبز کھیتوں کو دیکھنے لگی۔ جوار کے کھیت دھرتی کے سینے پر بڑی شان سے لہرا رہے تھے۔ وہ سبزے پر نظریں جمائے خود کو چودھری طالب علی سے بات کرنے کے

لئے تیار کرنے لگی۔

اصل میں شعیب علی نے بھی پوری بات سننے کے بعد کہا تھا کہ مومو کو رنگ محل ضرور جانا چاہئے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ یہ اپنا حق حاصل کرے بلکہ چھین لے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے کچھ نہ ہوگا۔ اب اسے خود ہمت کرنی ہوگی، پھر اس نے مومو کے لئے پلین میں سیٹ ریزرو کروادی۔ چودھری شوکت علی نے زہرہ بیگم کو فون کر کے اطلاع دے دی تھی اور کہا تھا، میرے ایک دوست کی بیٹی کو گاؤں دیکھنے کا بہت شوق ہے، آج کل اس کی چھٹیاں ہیں، مجھ سے میرے دوست نے ذکر کیا تو میں نے کہا کہ بچی کو میرے گاؤں بھیج دو۔ وہ آرہی ہے، تم اس کے لئے رہائش کا بندوبست کر دینا، اور امجد اور امین سے کہنا کہ ملتان ایئر پورٹ پر اسے ریسیو کر لیں۔ پھر انہوں نے زہرہ بیگم سے کہا کہ بچی کو کوئی تکلیف نہ ہونی چاہئے۔

آج سہ پہر جب مومو، ملتان ایئر پورٹ پر اُتری تو امجد علی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ وہ انہیں فوراً پہچان گئی۔ کیونکہ امجد، شعیب علی سے مشابہ تھا۔ تعارف کے دوران مومو نے اسے اپنا حقیقی نام بتا دیا، جبکہ شعیب نے کہا بھی تھا کہ وہ کسی اور نام سے رنگ محل جائے مگر مومو نے سوچا تھا کہ کسی کام میں جھوٹ سے پہل نہیں کرنی چاہئے۔ نیت صاف ہو تو منزل آسان ہوتی ہے۔ میرا مقصد نیک ہے، میں سچی ہوں، پھر جھوٹ کیوں بولوں؟ اس لئے اس نے اپنا صحیح نام بتا دیا۔

ایئر پورٹ سے حسن پور کا سفر پورے ڈھائی گھنٹے کا تھا اور اس سفر سے وہ بور ہو کر رہ گئی تھی۔ راہ میں کوئی بھی تو ڈھنگ کی چیز نظر نہ آئی تھی، سوائے ہریالی کے۔ ایک ہی چیز انسان کب تک دیکھے؟ اور ویسے بھی یہ سبزہ اور کھیت اس کے لئے نئے نہ تھے۔ اس کا بچپن انہی جیسے کھیتوں میں تتلیاں پکڑتے اور کام کرتے گزرا تھا۔ تبھی ایک جھٹکے سے جیپ رُکی تو وہ خیالات کی عمیق گہرائیوں سے نکل آئی۔

”اُترئے مادام!“ امجد علی نے شوخی سے کہا تو وہ مسکرا کر اُتر آئی۔ جیپ کی آواز سن کر سب برآمدے میں آگئے تھے۔  
”یہ چاچا شوکت علی کی بیگم ہیں۔“

تب مومو کا جی چاہا، وہ ہمک کر کہہ دے کہ ”میری امی جی!“ مگر اس نے دل کی آواز کو دبا لیا۔

”میں تو سمجھی تھی، کوئی چھوٹی سی بچی ہوگی۔ تم تو ماشاء اللہ!“ زہرہ بیگم نے مسکراتے ہوئے مومو کی پیشانی چوم لی اور مومو کی آنکھیں نم ہو گئیں۔  
وہ سب سے مل ہی رہی تھی کہ پروین آگئی۔ مریم کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ اس سے کچھ



بولا ہی نہ گیا۔ یوں لگتا تھا، جیسے اُسے سکتہ ہو گیا ہو۔

”اے، کہاں ہو؟“ مریم نے دل پر جبر کر کے اس کے گلے میں بازو حائل کر دیئے۔  
”کیا مجھے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا؟“ مومو نے اتنی آہستگی سے کہا کہ صرف پروین ہی سن سکی۔

”ہائے..... بہت خوشی ہو رہی ہے تم سے مل کر۔“ پروین نے کلی کی طرح چنگ کر کہا۔  
پھر وہ ان کے ساتھ اندر کی طرف بڑھی۔ زہرہ بیگم نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا ہوا تھا۔  
”تمہارے انتظار میں شام کی چائے بھی کسی نے نہیں پی۔“ زہرہ بیگم خوش ہو کر بتا رہی تھیں۔

”اوہ..... مجھے کیا پتہ تھا؟“ وہ شرمندہ ہو گئی۔

وہ لوگ ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ ملازم نے چائے لا کر رکھ دی، دیگر لوازمات بھی تھے اور زہرہ بیگم کہہ رہی تھیں۔

”میں نے اپنی دہی کے لئے گاجر کا حلوہ خود بنایا ہے۔“

”پھر تو بہت شاندار ہوگا۔“ مومو نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا، تبھی چودھری طالب علی اندر آ گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے چودھری شجاعت علی، امین اور امجد تھے۔

”آگئی شوکی کے دوست کی دہی؟ بھی بہت انتظار تھا۔“ وہ ہنستے ہوئے صوفے کی طرف بڑھے۔ ”آج تو چائے کو بھی دیر.....“ اور پھر مریم پر نظر پڑی تو وہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ مومو بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”آداب انکل جی!“ مومو کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

”اچھا، تو تم اپنی سہیلی سے ملنے آئی ہو۔“ چودھری طالب علی زور سے ہنس دیئے۔

”جی نہیں۔“ مومو کے ہونٹ بھنج گئے۔ پروین کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ پہلے بھی کم حیران نہ تھی کہ مریم اچانک کیسے آگئی۔ وہ سب تو چاچا شوکی کے دوست کی بیٹی کے منتظر تھے۔  
پھر..... پروین اب تک اس گتھی کو سلجھا نہیں سکی تھی کہ مومو کیوں آئی ہے!

”پھر کیا لینے آئی ہو؟..... کیوں آئی ہو؟“ چودھری طالب علی نے ناگواری سے کہا تو وہ مریم کو شعیب کی سالی کی حیثیت سے جانتے تھے۔ اندر سے وہ خوش ہو رہے تھے کہ شاید شعیب نے اسے ثالث بنا کر بھیجا ہو۔ پورے کمرے میں سنائے کی دبیز چادر چھا گئی تھی۔

”میں علی کو لینے آئی ہوں۔“ ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نہایت مضبوط لہجے میں کہا۔

”کیا بکواس ہے؟..... کون علی؟“ وہ یوں اچھلے جیسے پچھونے ڈنک مار دیا ہو۔

”اب آپ اتنے بھولے بھی نہیں ہیں چودھری طالب علی!“ مومو نے لفظ چبا چبا کر ادا

کئے۔ ”غلط بیانی سے کام مت لیجئے، وہ آپ کے پاس ہے۔“

”تم ابھی اور اسی وقت رنگ محل سے نکل جاؤ۔“ چودھری طالب علی گرجے۔

”نہیں۔“ زہرہ بیگم کی زبان سے نکلا۔ وہ کانپ گئیں۔ نہ جانے کیوں بے اختیار یہ لفظ ان کی زبان سے نکلا تھا۔

”میں علی کو لئے بغیر نہیں جاؤں گی۔ آپ شرافت سے علی کو ابھی میرے ساتھ کیجئے، ورنہ.....“ مومو نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”ورنہ تم کیا کر لو گی؟“ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس نازک سی لڑکی کی گردن ہی مروڑ دیں۔

”مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ میں آپ کی اس بودی سی حویلی کی، جسے آپ رنگ محل کہتے ہیں، اینٹ سے اینٹ بجا دوں۔ جو مظالم آپ نے اس حویلی کی چمک دمک کو دو آتشہ کرنے کے لئے کئے ہیں، ان کا آپ سے حساب لوں۔“

”لڑکی!..... جانتی ہو تم کس سے بات کر رہی ہو؟“ چودھری طالب علی اس کی بات کاٹ کر گرجے۔

”آپ کو علم ہے کہ آپ کس سے بات کر رہے ہیں؟“ مریم نے بھی چیخ کر کہا۔

”پتہ ہے..... ٹو شعیب کی سالی ہے۔“ وہ تمسخر سے ہنسے۔

”غلط ہے یہ۔“ مریم نے انہیں جھٹلاتے ہوئے کہا۔

”پھر تم کون ہو؟“ چودھری طالب علی کا دل نہ جانے کیوں بیٹھنے لگا۔

”میں اپنی ہڈیوں کی شناخت کروانے نہیں آئی۔ آپ علی کو رہا کر دیجئے۔“ مریم نے تنگ کر کہا۔

”علی نہیں ہے میرے.....“

”چودھری جی! کیوں بڑھاپے میں جھوٹ بول کر اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں۔ یہ دن تو آپ کے اللہ اللہ کرنے کے ہیں۔“ اور پھر وہ پروین کی طرف پلٹی، جو صوفے کے ہتھے سے ٹکلی، خالی خالی نظروں سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ مومو نے اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔

”پروین! اپنے باپ سے کہو، علی کو چھوڑ دے۔ اس کا اپنا پیسہ کھوٹا تھا۔ اگر تم علی کی طرف نہ بڑھتیں تو اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ تمہیں اسکوٹر پر سیریں کرواتا۔ بولتی

کیوں.....“ مومو کا جملہ اس کے منہ ہی میں رہ گیا۔ چودھری طالب علی نے اسے بالوں سے پکڑ کر پروین کے قریب سے ہٹایا۔ مومو کے جملوں نے آگ پر تیل کا کام کیا تھا۔ وہ

راز، جو چودھری طالب علی نے اپنی بیوی سے بھی چھپایا تھا، وہ مومو نے پورے رنگ محل کے کینوں کے سامنے عیاں کر دیا تھا۔ وہاں چودھری شجاعت علی اور فاطمہ بیگم بھی موجود تھے، جو



پروین کے ہونے والے ساس سر تھے۔

”میں کہتا ہوں، نکل جاؤ یہاں سے۔“ انہوں نے مومو کو دھکا دیا، جو سامنے کھڑے چودھری شجاعت علی کے بازوؤں میں جا رہی۔ اگر وہ اسے تھام نہ لیتے تو وہ یقیناً دروازے کی چوکھٹ پر جا گرتی۔ مومو نے تیزی سے خود کو چودھری شجاعت علی کے بازوؤں سے نکالا، عقاب کی طرح جھپٹ کر چودھری طالب علی کے قریب پہنچی اور گرج کر بولی۔

”چودھری طالب علی!..... اپنی ذات کے پجاری! دولت کے ناگ!..... تم مجھے نہیں جانتے، میں کون ہوں۔“ اس نے اپنے چہرے پر آئے بالوں کو جھٹکے سے پیچھے کیا اور بولی۔ ”غور سے دیکھو اس چہرے کو۔ تم تو چہرے کی تحریریں پڑھنے کے ماہر ہو۔ یہاں ایک ایک ظلم لکھا ہوا ہے، جو تم نے میرے باپ پر کیا۔ مجھے باپ سے دور کرنے والے بھی تہی تھے۔ تمہیں رنگ محل کی عزت پیاری تھی نا، اسی رنگ محل کی خاطر تم نے مجھے میرے ماں باپ کے سائے سے محروم کیا..... اور پھر جب میں اپنے باپ کے پاس واپس آئی تو ماں سے ہاتھ دھو چکی تھی۔ مجھے پہچانو چودھری طالب علی! میں مومو ہوں..... چودھری شوکت علی کی بیٹی۔“ مومو نے دھماکا کر دیا۔ چودھری طالب علی ایک قدم پیچھے ہٹے، ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

”نہیں.....“ ان کے لبوں سے صرف یہی نکل سکا۔

”نہیں کیسے؟..... یہ حقیقت ہے چودھری! صرف تمہاری وجہ سے میں برسوں اپنے سوتیلے باپ کے مظالم سہتی رہی۔ تم قاتل ہو میری ماں کے..... میرے سوتیلے ویراشو کے۔ نہ تم میرے باپ کو طلاق دینے پر مجبور کرتے نہ یہ قتل ہوتے۔ اگر تم بچ میں نہ پڑتے تو میری ماں، چودھری شوکت علی سے انتقام لینے کے لئے خود موت کو گلے سے نہ لگاتی۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا اور اب یہ بھی سن لو کہ علی میرا بھائی ہے..... میرا ماں جابا، میرا جڑواں بھائی۔ وہ اپنی بات سے نہیں پھرے گا، اُسے ضد ورثے میں ملی ہے..... وہ پروین کو اپنائے گا۔ اور تم.....“

”ہائے، زہرہ کو کیا ہو گیا؟“ فاطمہ بیگم نے چیخ کر مومو کو بلانے پر مجبور کر دیا۔ زہرہ بیگم کا سرفاطمہ کی گود میں تھا۔ وہ تڑپ کر آگے بڑھی اور ان کے گال تھپکتے ہوئے بولی۔

”امی جی!..... امی جی!..... ہوش میں آئیں، امی جی!“

زہرہ بیگم ان الفاظ، ان القاب امی جی کی پھوار میں بھیگتی چلی گئیں۔ انہیں یوں لگا، جیسے مومو کے لبوں سے میٹھا اور ٹھنڈا آبشار پھوٹ پڑا ہو۔

”پھر کہو.....“ زہرہ بیگم تو ازل سے اس لفظ کے لئے سسکتی آئی تھیں۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ کوئی تو ہو، جو انہیں ماں کہے اور ان کا رداں رداں جی جی کی گردان کرتا رہے۔

”امی جی!..... کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“ مومو نے ان کے سینے پر اپنا سر ٹکا دیا۔ ”میں آپ کی بیٹی ہوں، مومو۔“

”پتر! بعض اوقات تو خوشی بھی برداشت نہیں کرتا، یہ دل ایسا ہو گیا ہے۔“ زہرہ بیگم نے مسکرا کر مومو کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔

”زہرہ! اسے جانے دو۔“ چودھری طالب علی کی آواز پر مومو نے زہرہ بیگم کے سینے سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور بولی۔

”مجھے خود بھی شوق نہیں ہے یہاں رہنے کا۔ مگر چودھری طالب علی! آپ نے مجبور کیا ہے تو میں آئی ہوں۔ آپ میرے بھائی کو بلوادیں، میں ابھی چلی جاؤں گی۔“ مومو نے چیخ کر کہا۔ ”آپ بہت گری ہوئی حرکتیں کرتے ہیں، مجھے آپ سے اچھائی کی امید نہیں ہے۔ آپ اپنے بھائی کی خوشیوں کے قاتل ہیں۔ آپ لیجئے یہ ساری دولت اور انہیں ان کا بیٹا لوٹا دیجئے۔ وہ ماں تڑپ رہی ہے، جس نے اس کی پرورش کی ہے..... وہ رو رو کر ہلکان ہو گئی ہے۔ آپ کو کسی پر ترس نہیں آتا۔ اور اب تو میں خود علی کو سمجھاؤں گی۔ میرے خیال میں اسے بھی ضرورت نہیں ہوگی کہ وہ آپ جیسے ظالم شخص کا داماد بنے۔ سنبھالیے آپ اپنی بیٹی اور کر دیجئے معین علی سے اس کی شادی۔“ مومو کی آواز پورے ڈرائنگ روم میں گونج رہی تھی۔

”مگر میں، معین علی سے شادی نہیں کروں گی۔“ پروین نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

”کیوں؟“ چودھری طالب علی کی آنکھوں میں شعلے لپکنے لگے۔

”یہ ٹھیک کہہ رہی ہے، لالہ!“ چودھری شوکت علی نے کہا۔

چودھری طالب علی نے پلٹ کر بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ بھائی جو آج تک ان کے سامنے سر جھکاتا آیا تھا..... جو ان کی ہر بات پر سر تسلیم خم کرتا آیا تھا، آج وہی بھائی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہا تھا۔

”لالہ! میں نے ہمیشہ آپ کی ہر بات مانی ہے۔ چاہے وہ غلط ہو یا صحیح، دل و دماغ نے آپ کے فیصلے قبول کرنے سے انکار کر دیا، مگر پھر بھی میں نے آپ کے ہر حکم پر ہمیشہ سر جھکایا، صرف اس لئے کہ آپ ہمارے بڑے تھے، باپ کی جگہ تھے۔ مگر مجھے علم نہیں تھا کہ آپ صرف اس بے جان حویلی کی عظمت کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں، اس کے لئے دلوں کو توڑتے ہیں، دل جو خدا کا گھر ہے، آپ اپنے اُلٹے سیدھے فیصلے کی برچھی مار کر چکنا چور کر دیتے ہیں۔“ چودھری طالب علی یوں کھڑے تھے، جیسے انہیں سکتہ ہو گیا ہو۔ ان کے دل میں شور برپا ہو گیا۔ دماغ سے آوازیں آنے لگیں۔

”ہاں طالب علی! شجاعت ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تم واقعی شیشہ گر ہو۔“



آج یہ پہلا موقع تھا کہ ان کا دل اور دماغ ایک ہی بات بول رہے تھے۔ ورنہ تو پہلے یہ ہوتا تھا کہ ان کا دل کچھ کہتا تھا، مگر دماغ میں بیٹھا ہوا رنگ محل کا سربراہ اس کی بات جھٹلا دیتا تھا۔ آج وہ سوچ رہے تھے۔

”طالب علی! تمہاری بیٹی نے اپنی زندگی کا ساتھی چن لیا ہے۔ شرع کے لحاظ سے یہ جائز بھی ہے اور..... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ شوکی کا بیٹا ہے۔ یہ بہت اچھا موقع ہے طالب علی! اپنی ساری زیادتیوں کا ازالہ کرنے کا..... مگر اس کی ماں کی بھی۔“ اُن کے دماغ میں پھر کھل بل ہوئی۔ ”کوئی فرق نہیں پڑتا..... باپ تو اس کا شوکی ہے۔“ ان کا دل بولا۔ ”اور طالب علی! کئی ہونا اتنا بڑا جرم نہیں، تمہاری دادی تو کنجری تھی، جو تمہارے باپ کو چند ماہ کا چھوڑ کر کسی اور کی دنیا بسانے چلی گئی۔ نوران اس سے تو اچھی تھی۔“

اور جب انہوں نے دل کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو وہ انہیں بے حد مکروہ نظر آیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان کا ذہن کچھ نہ بولا، ان کے دل کی بات پر کوئی برجھی نہ ماری۔ انہوں نے سر اٹھا کر چودھری شجاعت علی کی طرف دیکھا، وہ کہہ رہے تھے۔

”لالہ! میں سخت شرمندہ ہوں کہ معین بھی اس رشتے پر راضی نہیں۔“

”کیوں؟“ چودھری طالب علی کو اپنی آواز کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔

”وہ کہتا ہے کہ اگر اس نے پروین سے شادی کر لی تو یہ ادلے بدلے کی شادی ہو جائے گی، جیسے وہ بیٹا کے بدلے میں آئی ہو۔ وہ خوش نہیں تھا، بس ہماری طرح حسب روایت آپ کا فیصلہ ماننے پر مجبور تھا وہ۔ اور اب اگر پروین، علی کو پسند کرتی ہے تو آپ.....“

”تمہیں پتہ ہے، اس کی ماں کون تھی؟“ چودھری طالب علی نے نہ چاہتے ہوئے بھی سوال کر دیا۔

”کوئی عورت ہی ہوگی۔“ چودھری شجاعت علی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہیں۔

”منشی اللہ دتہ کی دھی تھی۔“ چودھری طالب علی نے کہا۔ حالانکہ ابھی ان کے دل و دماغ میں جنگ ہوئی تھی اور ان کا دل جیت بھی گیا تھا، مگر وہ اتنی جلدی ہارنا نہیں چاہتے تھے۔ آخر انا بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ابھی تک چند لمحے پہلے سب ان کا حکم مانتے آئے تھے، انہیں اپنا وقار بہت عزیز تھا۔ اب بھی وہ گرتے وقار کو سہارا دے رہے تھے۔

”لالہ!“ زہرہ بیگم کی آواز نے کمرے پر چھائے سناٹے کی چادر کو چیر کر رکھ دیا۔ ”غربت کوئی جرم نہیں ہے۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے کہ شوکی کی دوسری بیوی کون تھی؟ کس خاندان سے تھی؟..... بس یہی بہت ہے کہ وہ شوکی کی پسند تھی، اس کے نکاح میں آئی تھی اور مجھے شوکی سے کوئی شکوہ نہیں ہے تو آپ کو بھی نہیں ہونا چاہئے۔ مجھے

خوشی ہے کہ شوکی نے شادی کر لی، اس کا نام لینے والا تو کوئی ہے۔ اور لالہ علی کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔ وہ..... وہ شوکی کا بیٹا ہے تو میرا بھی پتر ہے۔“ زہرہ بیگم کے لہجے میں التجا کے ساتھ ساتھ دھمکی بھی تھی۔

چودھری طالب نے زہرہ بیگم کے سرخ چہرے کی طرف دیکھا، پھر مومو کو دیکھا، جو ان سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ وہ آگے بڑھے اور پھر کسی کو یقین ہی نہ آیا کہ یک دم یوں بھی کایا پلٹ سکتی ہے۔ انہوں نے مومو کو لپٹا لیا تھا اور اس کے سر پر ہونٹ رکھے بڑبڑا رہے تھے۔

”میں ہار گیا پتر!..... میرا ضمیر مجھے کچھ کے لگاتا رہتا ہے۔ تو میری ہے، میری مومو ہے، میری دھی ہے۔“

اور اُن کی آنکھوں سے کتنے ہی آنسو نکلے، جو مومو کے خشک بالوں میں جذب ہونے لگے۔ کمرے میں موجود سبھی اشک بار تھے۔ تب امجد علی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”چاچی! وہ حلوہ کہاں ہے، جو صبح سے آپ تیار کر رہی تھیں؟ اور دیکھو تو، چائے بھی ٹھنڈی ہو گئی ہے۔“

چودھری طالب نے مومو کو بازو سے پکڑ کر علیحدہ کیا اور بولے۔

”تو شوکی کی بیٹی ہے، رنگ محل میں تیری وہی اہمیت ہے جو اور لڑکیوں کی ہے۔“

اور مومو انہیں ڈبڈبائی نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔ اُن کا سر پُر غرور جھکا ہوا تھا اور وہ نہایت شرمندہ تھے!





رات بھر چھا جوں مینہ برسا تھا اور اب بھی ہلکی ہلکی بوند باندی ہو رہی تھی۔ بارش سے نہائے ہوئے درخت نہایت خوب صورت لگ رہے تھے۔

مومو نہایت بے قراری سے برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ بالکل اس طرح جیسے سمندر کی لہریں ادھر ادھر بے قراری سے مچلتی ہیں۔

اُسے شدت سے علی کا انتظار تھا۔ یوں بھی وہ علی کو دل کی عمیق گہرائیوں سے چاہتی تھی اور جب سے اسے پتہ چلا تھا کہ علی اس کا وہی حقیقی بھائی ہے، جس کے بارے میں ایک اندھیری رات کو اسے پتہ چلا تھا۔ جب سے اس نے نوراں اور راجا کی باتیں سنی تھیں، تبھی سے وہ اپنے بھائی سے ملنے کے لئے بے چین تھی۔ برسوں گزار لئے تھے، مگر اب چند گھنٹے نہیں گزر رہے تھے۔ چودھری طالب علی نے رات ہی اپنے آدمی دنیا پور روانہ کر دیئے تھے۔

رات کو وہ زہرہ بیگم کے سینے سے لگ کر سوئی تھی، بالکل کسی ننھی بچی کی طرح۔ وہ ان کی قطرہ قطرہ محبت اپنے اندر سموئی رہی تھی۔ اس نے ہوش سنبھالا تھا تو کبھی اپنی سگی ماں کے سینے سے لگ کر اس طرح نہ سوئی تھی۔ اور زہرہ بیگم کے ساتھ لیٹے ہوئے وہ چپکے چپکے روتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ ”یہ تو سوتیلی ماں ہے، مگر لگتا ہے اس کے سینے میں جو دل دھڑک رہا ہے، اس میں صرف میری محبت کا سمندر ہی لہریں لے رہا ہے۔ پھر سگی ماں کی محبت کیا ہوتی ہوگی؟

زہرہ بیگم اب تک سوئی ہوئی تھیں۔ مومو ناشتے کے بعد برآمدے میں آگئی تھی اور علی کے انتظار میں وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔

”بہت بے قرار ہو؟“ سیکنہ بیگم کی آواز پر وہ چونک گئی۔ اس نے ان کی طرف دیکھا، وہ مسکرا رہی تھیں۔

”علی بھائی کا انتظار ہے۔“

”آجائے گا۔ اب گھر ہی تو آنا ہے اس نے۔“ سیکنہ بیگم نے محبت سے کہا۔

”تائی جی! بس، اب تو جی چاہتا ہے کہ پنکھ لگ جائیں اور میں اس کے پاس پہنچ

جاؤں۔ مجھے پہلے علم نہیں تھا کہ وہ میرا سگا بھائی ہے۔ یہ خون کی کشش بھی عجیب ہوتی ہے، تائی جی! میں نے پہلی مرتبہ ملتے ہی اسے بھائی بنا لیا تھا۔ ہے نا حیرت کی بات؟“ مومو زور سے ہنسی۔

”قدرت ہی میل کراتی ہے۔ کاش! قدرت میرے شعبی سے بھی اسی طرح اچانک کسی روز میل کرادے۔“ سیکنہ بیگم کی آواز بھرا گئی۔ مومو کے دل میں انی سی چھگئی اور وہ ان کے گلے میں بازو جھانک کرتے ہوئے بولی۔

”تائی جی! آپ غم نہ کریں، شعیب بھائی آپ سے ضرور ملیں گے، بمعہ رضیہ اور گیتو کے۔“

”گیتو؟“ سیکنہ بیگم نے حیرانی سے مومو کو دیکھا۔

”جی..... آپ کا پوتا۔ مومو مسکرائی۔ ”پروین نے آپ کو نہیں بتایا؟“

اتنے میں فاطمہ بیگم آگئیں اور بولیں۔ ”بھرجائی! آپ کو لالہ طالب ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”فاطمہ!..... فاطمہ! سنا تم نے، میرا پوتا بھی ہے..... میرے شعبی کا پتر۔“ سیکنہ بیگم نے فاطمہ بیگم کے ہاتھ تھام کر نہایت جذب سے کہا اور پھر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ مومو انہیں دلا سہ دیتی ہوئی اند لے آئی۔

دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد زہرہ بیگم اسے اپنے کمرے میں لے آئیں اور بیڈ پر بٹھاتے ہوئے بولیں۔ ”مومو! اب تم سو جاؤ۔“

وہ مومو سے اس طرح پیش آرہی تھیں، جیسے وہ ننھی بچی ہو۔

”علی بھائی جب تک نہیں آئیں گے، میں نہیں سو سکتی۔“ مومو پاؤں اوپر کر کے بیٹھ گئی۔ ”پتر! ضد نہ کرو۔ آج موسم خراب ہے نا، اس لئے دیر ہوگئی ہوگی۔ پتہ نہیں، دنیا پور

میں بارش ہو رہی ہو اور وہ وہاں سے چلے بھی نہ ہوں۔“

”امی جی! ایک بات میرے ذہن پر بار بار دستک دے رہی ہے۔“ مومو نے انگلیاں چٹختے ہوئے کہا۔

”میں سمجھی نہیں..... کیا بات ہے؟“ زہرہ بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

”کہیں تائی جی کی کوئی چال نہ ہو!“

تب زہرہ بیگم نے اس کا سراپے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

”تم یہ سب سوچنے میں حق بجانب ہو۔ کیونکہ وقت نے تمہارے ساتھ چالیں چلی ہیں۔ لالہ طالب نے بھی تمہارے ساتھ چال چلی، ہر جگہ تمہیں شکست دی۔ مگر کل شام تم نے سب کے سامنے انہیں شکست دی ہے۔ وہ کبھی نہیں ہارے، وہ ٹوٹ گئے ہیں مومو جند



میری! مگر اس ہار کی بھی انہیں خوشی ہے۔ ان کے چہرے پر جو سکون میں نے دیکھا ہے، وہ بتاتا ہے کہ اس ہار پر ان کا ضمیر مطمئن ہے۔ اور جب وہ جیتے تھے تو ان کا ضمیر انہیں کچوکے دیتا تھا۔ پتر! ضمیر کی مار بہت بُری ہوتی ہے اور اسی مار نے انہیں کبھی پُرسکون نہ رہنے دیا تھا۔ ہمارا منصف ہمارے اندر ہی موجود ہے۔ وہ ہر فیصلہ صحیح کرتا ہے اور اس جج کو ضمیر کہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اب انہوں نے کوئی چال نہیں چلی۔“ زہرہ بیگم نہایت نرمی سے، ہولے ہولے اُسے سمجھا رہی تھیں۔ ”بس، اب تم سو جاؤ۔“

”ایک مرتبہ پھر دیکھ آؤں باہر تک پھر۔“ مومو نے مچلتے ہوئے ضدی لہجے میں کہا۔ ”اچھا جاؤ۔“ وہ مسکرائیں۔

”اوہ..... میری اچھی امی جی۔“ مومو نے اُن کا گال چوم لیا۔

”اور ہاں، اپنے بابا کو بھی فون کر کے یہاں کی صورت حال بتا دو۔“ زہرہ بیگم نے کہا۔ ”کھانا کھانے کے بعد ہی میں نے فون کیا تھا انہیں۔ لالہ شعیب نے بتایا، انہیں چین ہی نہ تھا اور وہ حسن پور کے لئے روانہ ہو چکے ہیں۔ رات کو تو بارش کی وجہ سے سلسلہ مل ہی نہیں رہا تھا۔“

”تو جلد ہی آجائیں گے۔“ زہرہ بیگم نے کہا۔

”یقیناً..... اچھا ہے، علی بھائی آئیں تو بابا جانی موجود ہوں۔ کیا خیال ہے؟“ مومو نے کہا۔

”ہاں مومو!..... پتہ ہے، مجھے ہمیشہ یہ دکھ ہوتا تھا کہ میں نے شوکت کو اولاد جیسی خوشی نہیں دی اور پتہ ہے، میں ان پر بہت کڑی نگرانی رکھتی تھی۔“

”پھر بھی بابا جانی رستہ ٹھاگئے۔“ مومو نے شوخی سے کہا۔

”ہاں..... اگر وہ ایسا نہ کرتے تو تم اور علی مجھے کیسے ملتے؟“ زہرہ بیگم کا لہجہ محبتوں سے چُور تھا۔ انہیں اپنے اندر ذرا بھی کھوکھلے پن کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ انہیں یہی لگ رہا تھا، جیسے مومو کو انہوں نے خود جنم دی ہو، اس کی تخلیق کا درد سہا ہو، اس کے چین اور آرام کے لئے راتیں جاگ کر کائی ہوں۔

مومو پھر برآمدے میں آگئی اور شاید یہ اس کی دعائیں مستجاب ہونے کی گھڑی تھی کہ گیٹ پر جیپ رکنے کی آواز آئی تو وہ ہلکی ہلکی پھوار میں بھی تقریباً بھاگتی ہوئی گیٹ پر پہنچی اور گیٹ کھول دیا۔ علی نے مومو کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہ جلدی سے جیپ سے اتر آیا۔

”علی بھائی!“

”مریم!“ دونوں کے لب کپکپائے اور پھر مومو اس سے لپٹ کر رو دی۔ علی بوکھلایا جا رہا تھا۔ اسے یہ تو علم تھا کہ مریم اسے بے تحاشا چاہتی ہے، مگر اتنی شدتیں اُس کی محبت میں

کبھی نہ آئی تھیں۔ بھائی، بھائی کہتے اُس کی زبان سُکھتی تھی، مگر کبھی ہاتھ تک نہیں تھاما تھا اُس نے۔

”مریم! ہوش میں تو ہو؟“

”ویر! جس لڑکی کا بھائی مدتوں بعد ملے وہ بھلا ہوش میں کیسے رہ سکتی ہے؟“ مومو کی بھگی بھگی آنکھیں فرط مسرت سے چمک رہی تھیں۔

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ علی پریشان تھا۔

”ہولے ہولے سب سمجھ جاؤ گے۔“ چودھری طالب علی نے ہنستے ہوئے کہا۔ مومو، علی کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اصل میں شرفو نے اندر جا کر چودھری طالب علی کو اطلاع دی تھی کہ وہ علی کو لے آیا ہے اور وہ خود علی کے استقبال کے لئے آئے تھے۔ گھر کے کسی اور فرد کو پتہ نہ چلا تھا، اس لئے کوئی باہر نہ آیا تھا۔

”آؤ پتر!“ چودھری طالب علی نے بازو پھیلا دیئے۔ علی حیران و ششدر تھا۔ مومو نے ہولے سے کہا۔

”علی بھائی! ملیں نا۔ یہ پروین کے والد ہیں۔“

مومو کے ٹھوکا دینے پر وہ آگے بڑھا اور چودھری طالب علی سے لپٹ گیا۔ اس کی سوچیں جیسے مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں۔ تین روز تک وہ چودھری طالب علی کی حویلی میں قید رہا تھا۔ آج رات کے پچھلے پہر شرفو نے آکر کہا تھا کہ وہ تیار ہو جائے، اسے فوراً حسن پور جانا ہے۔

”کیوں؟“ علی نے ابرو چڑھا کر پوچھا تھا۔

”یہ چودھری طالب علی کا حکم ہے۔ اور وہ جو حکم دیتے ہیں، کوئی بندہ ان سے وجہ نہیں پوچھتا۔ وہ مالک ہیں۔“ شریف نے بے پروائی سے کہا۔

”تمہارے مالک ہوں گے۔ میں ان کا بیل نہیں ہوں۔ رات کو تو کسی صورت بھی نہیں جاؤں گا۔“ علی اکڑ گیا اور پھر شرفو، رحمو نے زبردستی اُسے جیپ میں ڈالا تھا اور اب یہاں وہ چودھری طالب علی کے سینے سے لگا ہوا تھا۔

”یا خدا! یہ سب کیا ہے؟“

پھر وہ اندر آئے۔ زہرہ بیگم نے علی کو دیکھا تو دیکھتی رہ گئیں۔

علی میں انہیں گئے دنوں کے شوکت کی جھلک نظر آرہی تھی۔ وہی قد کاٹھ، سرخ و سپید رنگت، گھنگھریالے بال، سیاہ بھونرا جیسی آنکھیں، جن میں سرخ ڈورے لہرا رہے تھے۔ شیو بڑھا ہوا تھا، لباس ملگجھا تھا، مگر پھر بھی وہ اچھا لگ رہا تھا۔ بالکل دل میں اترتا ہوا۔ اور کیسے نہ دل میں اترتا؟ یہ خوشی کیا کم تھی کہ وہ ایک بیٹے کی ماں ہیں۔ جوان بیٹے کی ماں۔ اور جن



ماؤں کے جوان پُتر ہوتے ہیں، وہ کبھی اُداس نہیں ہوتیں۔

پھر چودھری طالب علی نے مختصر اعلیٰ کو تمام صورت حال بتادی۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا؟“ علی کو یہ سب باتیں خواب معلوم ہو رہی تھیں۔

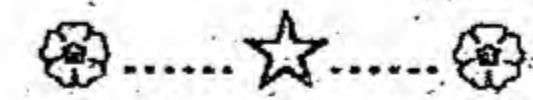
”لالی بتائے گی تو تمہیں یقین آ جائے گا۔“

اس آواز پر سب نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ چودھری شوکت علی دروازے کے پیچوں پہ کھڑے تھے اور ان کے مسکراتے لب اور مسکراتی آنکھیں، علی کی بلالیں لے رہی تھیں۔

علی، زہرہ بیگم کے پہلو میں ڈبکا بیٹھا تھا۔ دوسری طرف مومو تھی۔ چودھری شوکت علی خوش تھے۔ بہت خوش کہ زہرہ بیگم نے بچوں کو قبول کر لیا ہے۔ پھر علی اٹھا اور ہونے ہوئے چلتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا، جہاں چودھری شوکت علی کھڑے تھے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ چند لمحے پہلے جو کہانی سنائی گئی تھی، اس کا ہیر و شوکت علی ہے اور یہ وہی شوکت علی ہے، میرا باپ، جس کا لہو میری شریانوں میں زندگی بن کر دوڑ رہا ہے۔ اُس کا دل چودھری شوکت علی کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ علی کی آنکھیں بھگنے لگیں اور دوسرے لمحے وہ ان سے لپٹ گیا۔ وہ آنسو بہاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”ابو جی! اب لالی امی جی کے بتانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے، اعتبار ہے کہ جو کچھ مجھے بتایا گیا ہے، سچ ہے۔ آپ کو دیکھتے ہی میرے دل میں کچھ ہونے لگا ہے اور..... اور اب آپ کے سینے سے لگ کر مجھے جو سکون اور آشتی مل رہی ہے، ایسی کبھی نہیں ملی۔ بعض مرتبہ میں کبھی بہت تشنگی محسوس کرتا تھا۔ میری روح کبھی سیراب نہیں ہوتی تھی اور..... اور آج تو میری روح بھی خوشی محسوس کر رہی ہے۔ مریم مجھے اپنی اپنی سی لگتی تھی۔“ وہ چودھری شوکت علی کے سینے سے سر رگڑتے ہوئے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”لگتی تھی کا کیا مطلب ہے؟ میں تو ہوں ہی آپ کی بہن اور آپ میرے بھائی۔“ مومو، جو ان کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی، ہنس کر بولی تو چودھری شوکت علی نے ہاتھ بڑھا کر اُسے بھی لپٹا لیا۔



دوسرے روز علی اور مومو واپس جا رہے تھے اور ان کے ساتھ ہی پروین کو بھی جانا تھا۔

تب چودھری طالب علی نے سب کو بڑے کمرے میں جمع کیا اور بولے۔

”میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ رنگ محل میں بسنے والوں کے لئے یہ میرا آخری فیصلہ ہے اور میں آئندہ فیصلوں کے لئے کسی کو اختیار سونپنا چاہتا ہوں۔“

سب نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ پھر انہوں نے اشارے سے علی اور مومو کو

اپنے پاس بلایا اور پھر میز پر رکھی ہوئی چابیاں اٹھاتے ہوئے بولے۔

”مومو پُتر! اس دن تم نے کہا تھا کہ تم میری مرضی کے خلاف رنگ محل میں آئی ہو؟ اس جملے نے میرا دل چیر دیا ہے۔ میں اپنی کوتاہی یا ظلم کا جو بھی کہہ لو، ازالہ اس طرح کر رہا ہوں کہ رنگ محل تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔ اس کی کل مختار تم ہو میری دھی!..... اب رنگ محل میں تمہارا فیصلہ مانا جائے گا۔“ چودھری طالب علی نے چابیوں کا گچھا مومو کی طرف بڑھایا تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

”تایا جی!“ مومو لڑکھڑا کر گرنے کو تھی کہ علی نے اُسے تھام لیا۔

”ہاں مریم! یہ رنگ محل تمہارا ہے۔ ہم سب تمہارے فیصلوں پر سر جھکائیں گے۔“ چودھری طالب علی کا سرا بھی سے جھکا ہوا تھا۔

”آپ..... آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں؟“ مومو نے کہا۔

”تم ذمے داریوں سے گھبرا رہی ہو پُتر؟“ انہوں نے اسے چیلنج کیا۔

”آپ کسی اور کو.....“ مومو نے ان کا چیلنج نظر انداز کر دیا۔

”اور مجھے کوئی اتنا عقل مند نظر نہیں آتا۔ ان کے فیصلے منٹوں میں بدلتے ہیں۔ یہ سب کوئی بھی بات یقین سے نہیں کرتے۔ میری ذرا سی دھمکی ان کے فیصلے تبدیل کر دیتی ہے۔ جبکہ پُتر! تم میں یہ بات نہیں ہے۔ تم جو بات کہتی ہو، اس پر قائم رہتی ہو۔“

”آپ کی طرح۔“ مومو نے کہا تو سب ہنس دیے۔ چودھری طالب علی کے لب بھی مسکرا اٹھے۔

”جو بھی سمجھ لو، مگر مجھ میں ایک بات بری ہے کہ میں غلط بات کو بھی صحیح منوانے کی کوشش کرتا ہوں اور تم نے جب نہایت وثوق اور اعتماد سے کہا تھا۔“ چودھری طالب علی! آپ ہی کے پاس ہے علی، جھوٹ مت بولیں۔“ تو مومو! میں سچ مچ چونک گیا۔ اس قدر دھڑکنے سے کبھی کسی نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میری کہی ہوئی بات کو غلط ثابت نہ کیا تھا۔ تم واحد لڑکی ہو۔“

”شکر یہ تایا جی!“ مومو نے ان کے ہاتھ تھام لئے۔ ”اب علی بھائی اور پروین.....“

”ابھی سے فیصلے کرنے لگیں۔“ چودھری شجاعت علی ہنسے، پھر علی سے بولے۔

”علی پُتر! اب مومو کی بات مجھے مانتی ہی ہے۔ مجھے اس پر اپنی اولاد سے بھی زیادہ

اعتماد ہے۔ تم ایم اے کر لو، پھر تمہاری شادی کر دی جائے گی۔“

”سچ تایا جی؟“ علی کی بے چینی قابل دید تھی۔

”ہاں، اب میں نے سوچا ہے کہ یہ فرض بھی نمٹا لوں۔“

”دیکھا تم کہتی تھیں کہ میں پروین سے عشق نہ کروں۔“ علی نے قریب کھڑی مومو سے



سرگوشی کی۔

”میں نے اُسے قسمت کی لکیروں سے پُچرایا ہے۔ تمہارے منع کرنے کے باوجود میں نے اسے چاہا اور پالیا۔ اسے کہتے ہیں مقدر۔“ علی ہولے ہولے بول رہا تھا۔ اس کی سرگوشیاں چودھری طالب علی نے بھی سن لیں اور ہنستے ہوئے بولے۔

”علی پُتر! تم نے رات بھی مجھے یہ بات بتائی تھی اور میرے دل میں مومو کی عزت دوچند ہو گئی۔ حالانکہ میرا جو رویہ اس کے ساتھ رہا تھا، اسے مد نظر رکھتے ہوئے تو یہ تمہیں اور پروین کو بھڑکاتی، تمہیں قریب لاتی، مگر اس کی رگوں میں اچھا خون دوڑ رہا ہے، جس نے اسے گری ہوئی حرکتیں کرنے سے باز رکھا۔“

تب چودھری شوکت علی پہلو بدل کر رہ گئے۔ ان کا جی چاہا، وہ پوچھیں۔ ”لالہ! خود تو آپ کی رگوں میں بھی اچھا ہی دوڑ رہا ہے، مگر اس کے ساتھ رنگ محل کی شان کے ذرے بھی گردش کرتے رہتے ہیں۔“ پھر انہوں نے سنا، مومو، علی سے کہہ رہی تھی۔

”علی بھائی! یہ چاہیاں آپ رکھیں۔“

”کیوں پُتر! تم میرے فیصلے سے خوش نہیں ہو؟“ چودھری طالب علی نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ بات نہیں ہے تایا جی! بس میں یہاں نہیں رہوں گی۔“

”کیوں؟“ سب کے ذہنوں اور زبان پر یہ سوال ایک ساتھ مچلا۔

”بیٹیاں ہمیشہ والدین کے گھر میں تھوڑی رہتی ہیں؟ اصل مالک تو بیٹے ہوتے ہیں۔“

مومو نے جھینپتے ہوئے کہا۔ اس کے جسم کا سارا خون چہرے پر سمٹ آیا تھا۔

”اوہ!“ چودھری طالب علی زور سے ہنسے۔ مومو کی گالوں کی سرخی نے انہیں بتا دیا تھا

اور مومو کی بات اس قدر واضح تھی کہ سب جان گئے تھے، مومو کسی کو پسند کرتی ہے۔

”کون ہے وہ؟“ علی اور چودھری طالب کے منہ سے ایک دم نکلا۔

”شجاع احمد!“ چودھری شوکت علی نے مومو کے بجائے کھڑے ہو کر جواب دیا۔ مومو

نے حیرت سے باپ کو دیکھا۔ وہ اس کی نظروں کا سوال سن کر مسکرائے اور آہستہ آہستہ چلتے

ہوئے مومو کے قریب آ کر محبت سے بولے۔

”جس روز تم حسن پور کے لئے روانہ ہوئیں، اسی روز شجاع آیا تھا۔ رضیہ نے مجھے سب

بتا دیا ہے اور میری بھی خواہش ہے کہ وہ تمہاری زندگی کا ساھی بن جائے۔ کیونکہ تم دونوں

ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہو۔“

”ہاں..... اس سے چنگی اور کیا بات ہوگی؟“ چودھری طالب علی اور شجاع علی ایک

ساتھ بولے تو مومو، لاجوتی کے پودے کی مانند سمٹ گئی، پھر شرمائے شرمائے بولی۔

”ابھی تو مجھے ایم اے کرنا ہے۔“

”اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“ علی تڑسے بولا۔

”کیوں؟“ مومو نے اس کی طرف دیکھا۔

”اب اپنے گھر جاؤ اور چولہا ہانڈی کرو۔ کیونکہ ہر عورت کی قسمت میں یہی ہوتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی کیوں نہ پڑھ لکھ جائے۔“ علی نے ڈپٹ کر کہا تو کمرہ قہقہوں سے گونج گیا۔ وہ جلدی سے کمرے سے بھاگ گئی۔

”لالہ طالب! آپ پروین کو بلا لیں، میں اپنی نوں (بہو) کو انگٹھی تو پہنا دوں۔“ زہرہ بیگم نے قہقہے تھمتے ہی کہا۔ مومو نے جاتے جاتے یہ بات سن لی تھی۔ چند لمحے بعد ہی وہ پروین کو لے آئی۔ زہرہ بیگم نے اپنے ہاتھ کی انگلی سے ایک انگٹھی اتاری اور پروین کی انگلی میں پہنا دی، پھر اُس کی پیشانی چوم لی۔

ادھر چودھری طالب علی نے بھی ایسا ہی کیا۔ اپنی نہایت قیمتی انگٹھی، جس میں تین ننھے ننھے ہیرے جڑے ہوئے تھے اور جوان کی شادی پر ان کے بابا چودھری سرفراز علی نے انہیں دی تھی، انہوں نے علی کو پہنا دی، پھر اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ کن انکھیوں سے زہرہ بیگم اور سیکنہ بیگم کے درمیان بیٹھی پروین کو دیکھنے لگا۔

”تم لوگ دو چار دن رک جاؤ تو باقاعدہ اعلان کر دیا جائے۔“ چودھری شجاعت علی بولے۔

”نہیں چاچا جی! وہاں جو میری ماں ہے نا، وہ رو رو کر ادھ موئی ہو جائے گی۔ جب تک میں اس سے نہیں ملوں گا، تب تک اسے چین نہیں آئے گا۔“ علی کا لہجہ لالی کی محبتوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔“ چودھری طالب علی بولے، پھر سیکنہ بیگم سے مخاطب ہوئے۔ ”شععی کی ماں!“ انہوں نے کئی برسوں بعد سیکنہ بیگم کو اس طرح مخاطب کیا تھا۔ وہ حیرت سے شوہر کو تنکے لگیں۔ ”بھئی دیکھ کیا رہی ہو؟ شععی کا کمرہ ٹھیک کرا دو، میں علی اور مومو کے ساتھ کراچی جا رہا ہوں، تاکہ شععی کو لے آؤں۔ وہ بھی تو میرا پُتر ہے، وہ ان خوشیوں سے کیوں محروم رہے؟ میری نوں (بہو) بھی آجائے گی اور پوتا بھی۔“ چودھری طالب علی نے کہا۔

”سچ طالب!.... پھر کہو۔“ سیکنہ بیگم اپنی جگہ سے اٹھیں اور بے یقینی سے شوہر کو دیکھنے لگیں۔

”اب تو جب شععی آجائے گا، تب تمہیں یقین آئے گا۔“ چودھری طالب علی نے ہنس کر کہا۔



سب کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ چودھری طالب علی نے بھی یہ سب کچھ سنا اور صوفے کی پشت سے سرٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ ان کی پلکوں کے گوشوں میں ڈھیروں آنسو اٹک گئے اور پھر پلکوں کا بند ٹوٹ گیا اور آنسو گالوں پر اتر آئے۔ چودھری شوکت علی نے ان آنسوؤں کو بہنے دیا۔ یہ تو خوشی کے آنسو تھے، جو بہت عرصے بعد ان کی آنکھوں میں آئے تھے۔ بہت مشکل سے اور بہت لمبی اماوس کاٹ کر انہیں یہ خوشی ملی تھی، جو سنبھالے نہ سنبھال رہی تھی اور وہ اس خوشی کا سوا گت بھی آنسوؤں سے کر رہے تھے۔ یہ خوشی کیا کم تھی کہ انہوں نے شعیبی اور مومو کے ساتھ مل کر چودھری طالب علی کو بھرپور شکست دی تھی۔

(تمت بالخیر)